سب رنگ ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ
بازی گر
پانچواں حصہ
PDFBOOKSFREE.PK
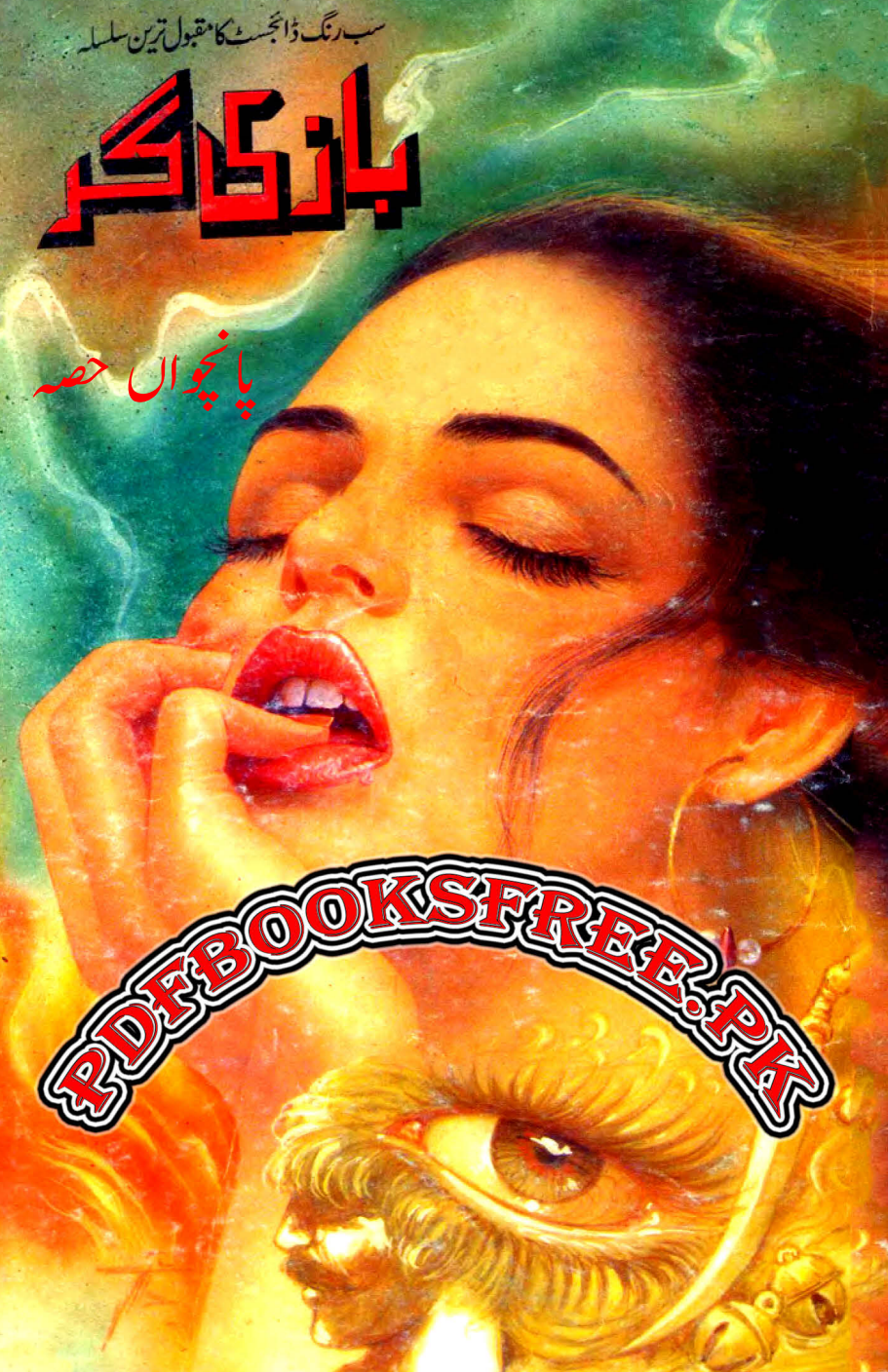
حالات کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ایک نوجوان کی داستان

سب رنگ ڈائجسٹ کا مقبولِ عام سِلسلہ

بازی گر

پانچواں حصہ

راوی : بابر زماں خاں

تحریر : شکیل عادل زادہ

امنگوں حوصلوں آنسوئوں اور آہوں کی داستان

اول شب بنارسی آگیا۔ نو لکھی کی ابتر حالت دیکھ کے اس کی پیشانی شکنوں سے بھر گئی تھی۔ جگنو' دیوا اور پھول وتی' کسی نے اس سے کوئی بات نہیں کی' بنارسی نے ان سے نو لکھی کی خیریت پوچھی۔ وہ دم سادھے کھڑا رہا پھر آہستگی سے بولا کہ سول اسپتال میں وہ ایک ڈاکٹر سے بات کر کے آیا ہے۔ ڈاکٹر نے کل صبح دیکھنے کو کہا ہے۔ ضرورت سمجھے گا تو ڈاکٹر اسی وقت اسپتال میں داخل کر لے گا۔ بنارسی کے کہنے کے مطابق ڈاکٹر نے اسے اجازت دی تھی کہ اس دوران طبیعت زیادہ خراب ہو تو اسے گھر بلا لیا جائے۔ بنارسی نے کہا' اس کے خیال میں نو لکھی اسپتال جانے کے قابل نظر نہیں آتی۔ مناسب یہی ہے کہ ڈاکٹر کو بلا لیا جائے۔ بنارسی کی آواز نسبتاً بدلی ہوئی تھی' قدرے نرم اور اضطراب آمیز۔ تینوں نے اسے ایک نظر دیکھا اور خاموش رہے۔ بنارسی کی تسلی پر کہ گھبرانے سے کچھ نہیں ہوگا' ان سب کو اس وقت سنبھل کر رہنا چاہیے' جگنو کا کہنا تھا۔ میری رگوں میں خون کھولنے لگا تھا' یہی جی کرتا تھا کہ بنارسی پر جھپٹ پڑوں اور چاقو سے اس پر وار کرتا رہوں' اس کا سارا جسم چیر پھاڑ ڈالوں پھر پھول وتی اور دیوا بھی یوں ہی نہیں بیٹھے رہیں گے۔ جگنو نے بہت ضبط کیا اور اپنا ہی خون پیتا رہا۔

"اپن کیا بولتا ہے۔" انہیں چپ دیکھ کے بنارسی نے تلخی سے کہا "سالا خلاص ہو جائیں گا۔ تنک میں ماتا جی تمہارا۔۔۔" اس کے منہ پر گالی آئی تھی جو اس نے روک لی اور بھنچے ہوئے ہونٹوں سے بولا "ابھی ایسا ہی ہاتھ پیر ڈال کے بیٹھا رہیں گا تم لوگ۔۔۔"

"ابھی وید جی گئے ہیں۔" جگنو اور دیوا کے بجائے پھول وتی ہکلاتے ہوئے بولی۔

"کون وید؟" بنارسی چونک کے بولا۔

"ادھر نالا پار کے وید جی' وہ بھی ایسا ہی بولتے تھے۔"

"کیسا؟ کیا بولتا تھا؟" بنارسی نے ترشی سے پوچھا۔

"ایسا!" بنارسی نے سانس بھر کے بولا "اپن کیا بولتا ہے' ابھی وید سے پہلے اپن اسپتال کا پھیرا لگایا تھا' اسی واسطے کو۔ وید کوئی دوا دارو دیا؟"

پھول وتی نے نیچی نظروں سے جواب دیا کہ وید کچھ دوائیں تجویز کر کے گیا ہے۔ پہلی خوراک دے دی گئی ہے۔

"ٹھیک ہے۔ ابھی تھوڑا اس کو دیکھے۔" بنارسی تذبذب سے بولا "یا ابھی' ابھی ڈاکٹر کو بلانے کا ہے؟"

بنارسی کی آمد اور اس کی دخل اندازی پر جگنو اور دیوا کے جسم جل رہے تھے۔ پھول وتی نے اشاروں میں

ن سے تحمل کی التجا کی۔ انہیں تعجب ہوا کہ پھول وتی میں ان سے زیادہ ہوش اور استقامت ہے۔ اس وقت پھول وتی نے جیسے کسی طوفان سے انہیں بچالیا تھا۔ جگنو کہہ رہا تھا' پھول وتی ان سے پارا دھیما رکھنے کی منت نہ کرتی تو نہ جانے کیا ہوجاتا۔ کوئی کتنا ہی ناتواں ہو' ایک آتشِ غضب تو سب میں پنہاں ہوتا ہے اور ایک لمحہ شرط ہے' ایک اندھا' گونگا اور بہرا لمحہ جب آجائے تو آدمی کو بے کراں کردیتا ہے' آدمی نہیں جانتا کہ اس کی آگ کتنی دور تک جائے گی' کون کون اس کی لپیٹ میں آجائے گا اور آگ خود اپنا تن من بھی راکھ کرلے گی۔ جگنو بہت دنوں سے اس لمحے کی تلاش میں تھا۔ یہ لمحہ کئی بار آکے ٹل چکا تھا' اب کے پھول وتی آڑے آگئی۔
بس ایک لمحے کی شعبدہ کاری ہوتی ہے' دوسرے لمحے زندگی غالب آجاتی ہے' آدمی کی آنکھ کھل جاتی ہے' مقابل پھر وہی آئینہ۔ بے ہنری اور بے مائیگی کے سارے احساس پھر رگ وپے سے چمٹ جاتے ہیں۔ دوسرے لمحے جگنو کو احساس ہوا کہ پھول وتی نے کیسا بروقت اسے روک لیا ہے' ادھر نو لکھی نیم جاں پڑی تھی۔ سردست ساری توجہ اسی کو سزا وار تھی۔ اس آتشِ غضب کا جو بھی مال نکلتا' نو لکھی کے لیے کسی طور بہتر نہ ہوتا۔ بعد میں جگنو کو یہ لمحہ ٹل جانے کا کچھ ایسا ملال نہیں ہوا۔

بنارسی نو لکھی کے پاس ٹھہرا رہا پھر پڑوس کی چند عورتیں نو لکھی کو دیکھنے آئیں تو وہ وہاں سے ہٹ کے کمرے میں چلا گیا۔ جگنو اور دیوا بھی کچھ دیر بعد اٹھ گئے لیکن گھر ہی میں رہے۔ رات بڑھ رہی تھی۔ پھول وتی نے کمرے میں جاکے بنارسی سے کھانے وغیرہ کے بارے میں پوچھا' بنارسی نے انکار کردیا۔ اس رات اس نے شراب بھی نہیں پی۔

اتنا وقت نہیں گزرا تھا' عورتیں ابھی موجود تھیں اور سرگوشیوں میں پھول وتی کو طرح طرح کے مشورے دے رہی تھیں کہ نو لکھی کی کرب ناک صداؤں نے سب کچھ منتشر کردیا۔ بنارسی بھی فوراً کمرے سے باہر آگیا۔ نو لکھی کی سانس تیزی سے چل رہی تھی اور پھول وتی کے ہاتھ پیر کام نہیں کررہے تھے۔ پڑوس کی ایک عورت نے اس کی مدد کی اور وید کی ہدایت کے مطابق دوا نو لکھی کو چٹائی' پانی پلانے کی کوشش کی مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔ نو لکھی بری طرح کراہتی رہی تا ایں کہ اسے اس کا بھی یارا نہ رہا۔ بنارسی نے کسی طبیب کے مانند اس کی نبض دیکھی اور متوحش آواز میں جگنو اور دیوا سے کہا کہ وہ فی الفور ڈاکٹر رستوگی کے پاس جائیں۔ اس نے بہ عجلت پتا بتایا اور جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کے کہا کہ وہ روپے پیسے کی فکر نہ کریں' جو بھی سواری ملے' بس جلدی سے ڈاکٹر کے پاس پہنچیں اور اسے یہاں لے آئیں۔

سوچنے سمجھنے کا وقت نہیں تھا۔ جگنو اور دیوا نے ایک نگاہ پھول وتی کو دیکھا اور پھر ایک دوسرے کو۔ جگنو نے رکنا چاہا تھا مگر پھر دونوں کچھ سوچ کے گھر سے نکل پڑے۔ اس وقت پڑوس کی کئی عورتیں گھر میں موجود تھیں۔ بنارسی کی موجودگی میں وہ ان سے کچھ کہہ نہیں سکتے تھے' اس لیے باہر نکلتے ہی انہوں نے برابر کے گھر میں جگت مُوسی سیتا بائی کو آواز دی۔ مُوسی کا ان کے گھر بہت آنا جانا تھا' کچھ دیر پہلے ہی وہ نو لکھی کو دیکھ کے آئی تھی۔ جگنو نے اس سے گزارش کی کہ جب تک وہ واپس نہ آئیں' موسی ان کے گھر رہے۔

انہیں جلد ہی سواری مل گئی۔ بازار بند ہوچکے تھے۔ البتہ سڑکوں پر چہل پہل تھی۔ اسپتال کی گلیوں میں ڈاکٹر رستوگی کا مکان تھا۔ انہوں نے گھوڑا گاڑی چھوڑ دی اور بنارسی کی تاکید کے مطابق ایک گلی کے نکڑ پر واقع پان کی دکان پر ڈاکٹر کا پتا پوچھا۔ بنارسی نے انہیں بتایا تھا کہ پان کی دکان والے کو گھمٹی کاکا کہتے ہیں' وہ سارے علاقے سے واقف ہے۔ ادھر ادھر بھٹکنے کے بجائے وہ سیدھے اس کے پاس پہنچ جائیں' اس کے ذریعے وہ آسانی سے ڈاکٹر کے مکان پر پہنچ سکتے ہیں۔ دکان پر کئی گاہک تھے۔ رات کے وقت پان کی دکانوں پر یوں بھی یار باشوں کا ریٹھان ہوتا ہے۔ دکان سے ملحق ملباری کے ہوٹل کی وجہ سے بھی نکڑ پہ خاصی رونق تھی۔ گھمٹی کاکا مصروف تھا تاہم مشینی انداز میں ہاتھ اٹھا کے اس نے تیسری گلی کے بائیں طرف ساتواں بنگلا بتایا۔ یہ سن کر دکان پر کھڑا ہوا ایک نوجوان جگنو اور دیوا کی طرف متوجہ ہوا' کہنے لگا کہ وہ بھی اسی طرف جارہا ہے اور ڈاکٹر کے مکان تک ان کی رہبری کرسکتا ہے۔ جگنو اور دیوا نے ممنونیت کا اظہار کیا۔ نوجوان نے کھمبے سے ٹیک لگائے ہوئے اپنے ادھیڑ ساتھی کو چلنے کا اشارہ کیا' اس شخص کے کلے میں پان دبا تھا۔ آنکھیں بھی چڑھی ہوئی تھیں' دیوا کی طرف گھور کے اس نے کچھ کہنا چاہا تھا کہ منہ میں بھری ہوئی پیک دیوا کے کرتے پر لوٹ پڑی۔ دیوا کا سارا کرتہ رنگ گیا۔ معذرت کرنے کے بجائے الٹا وہ دیوا اور جگنو کی بدحواسی پر قہقہے لگانے لگا۔ اس کے نوجوان ساتھی نے اس مردم آزاری میں اس کا دل جمعی سے ساتھ دیا۔ دیوا نے بہت سبکی محسوس کی' بے اختیار اس کا ہاتھ ادھیڑ آدمی کے گریبان پر چلا گیا۔ جیسے بھڑوں کا چھتا چھیڑ دیا تھا۔ پہلے تو ادھیڑ آدمی نے مکوں اور ٹھوکروں پر لیا' جگنو بیچ میں پڑا تو دوسری طرف نوجوان نے اسے سنبھال لیا۔ ان کے اور ساتھی بھی ہوٹل میں بیٹھے تھے' وہ کسی تاخیر کے بغیر ہوٹل سے نکل آئے پھر وہی ہوا جو ایسے معاملوں میں ہوا کرتا ہے' کسی نے پیچھے سے جگنو کے بازوؤں میں اس طرح جکڑ بندی کی کہ وہ ضربیں لگانے والے کے اور سامنے ہوجائے۔ ادھر سے کسی نے دیوا کے پیٹ پر لات ماری۔ بس ابتدا کے چند لمحوں میں جگنو اور دیوا نے ذرا سی مزاحمت کی تھی' اس کے بعد دونوں کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ منٹوں میں بہت سے لوگ اکٹھے ہوگئے۔ ہوٹل کے شیشے ٹوٹ جانے اور پان کی دکان کا بعض سامان ٹ پاتھ پر الٹ جانے کا بظاہر کوئی امکان نہیں تھا مگر یہ بھی ہوا۔ کچھ ہی دیر میں پولیس آگئی۔ بہت سے لوگ بھاگ گئے' کچھ لوگ سپاہیوں کے ہاتھ لگ گئے۔ جگنو اور دیوا نے اپنے حواس مجتمع رکھنے کی بہت کوشش کی' وہ مسلسل چیختے چلاتے رہے تاہم ان کی حدود بھی آدمی سے سوا نہیں تھیں۔ ان کی کھال جگہ جگہ سے ادھڑ گئی تھی اور خون بہنے لگا تھا۔ ہڈیوں میں جیسے آگ لگی ہوئی تھی۔

رات کو کسی وقت دیوا کی آنکھ پہلے کھلی اور پہلے اس کی نظر سلاخوں پر پڑی پھر اپنے پہلو میں پڑے ہوئے جگنو پر۔ جگنو کے جسم پر جابجا لال دوا لگی تھی اور پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ یہی حال خود اس کا تھا۔ دیوا نے وحشت کے عالم میں اٹھنا چاہا تو اس کی آنکھوں میں اندھیرا بھر گیا۔ ہر طرف سکوت چھایا ہوا تھا۔ سلاخوں کے پار سنتری تپائی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ دیوا کو دفعتاً سب کچھ یاد آگیا اور اس نے بے تحاشا چیخنا شروع کردیا۔ سارے تھانے میں شور مچ گیا۔ ہر طرف سے سنتریوں نے اس کی کوٹھری کا رخ کیا۔ جگنو بین کرتا رہا کہ ہماری ماں بیمار ہے۔ ہم بے قصور ہیں' ہمارا کوئی قصور نہیں' خدا کے واسطے ہم پر رحم کرو' ہمیں چھوڑ دو۔ سنتریوں نے اندر آکے جبراً اسے چپ کرانا چاہا مگر خود دیوا کی آواز اس کے ڈولتے سفینۂ جاں میں ڈوب گئی۔

سویرے سویرے پھر اس کی آنکھ کھل گئی' جگنو کو بھی ہوش آگیا۔ دونوں نے تھانا سر پر اٹھالیا۔ وہ بار بار خدا کا واسطہ دیتے کیوں کہ ایک ہی واسطہ دنیا میں مشترک ہے مگر تکرار سے شاید اپنی افادیت کھوچکا ہے۔ وہ دہائیاں دیتے کہ اگر گھر نہ پہنچے تو ان کی ماں مرجائے گی۔ لگتا تھا' تھانے کے کسی سپاہی اور افسر کی ماں نہیں تھی یا سب کی مائیں مرچکی تھیں۔ بہرحال ان کی آہ وبکا پر تھانے دار نے انہیں کمرے میں بلالیا۔ دونوں سے چلا نہیں جارہا تھا' خود کو گھسیٹتے' کچھ سپاہیوں کا سہارا لیتے وہ تھانے دار کی خدمت میں حاضر ہوئے اور رو رو کے اسے ساری روداد سنائی۔ تھانے دار انہماک سے سنتا رہا۔ اس نے ضمانت کے لیے پوچھا۔ اتنے بڑے شہر میں کوئی ایسا نہیں تھا جسے وہ ضمانتی کے طور پر پیش کرتے۔ ان پر توڑ پھوڑ' خون خرابے' دنگے فساد قسم کے کئی الزام تھے۔ پان والے گھمٹی کاکا نے ان کے خلاف بیان دیا تھا' ہوٹل والے اور بعض تماشائیوں نے بھی۔ پولیس کے لیے بھی جگنو اور دیوا کوئی اجنبی نہیں تھے' دونوں کئی بار سزا پاچکے تھے۔

ضمانتی کے لیے انہوں نے بنارسی کا نام نہیں لیا' اس لیے کہ ذہنی فشار میں' ذرا دیر سے سہی تاہم سارا ماجرا ان کی سمجھ میں آگیا تھا۔ یہ جان کر کے ان پر کیا کچھ گزری ہوگی' جگنو کو بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ جگنو نے مجھے نہیں بتایا' بس اتنا کہا کہ وہ بلک بلک کر روتے اور دیواروں سے سر پھوڑتے تھے۔ انہوں نے تھانے دار سے درخواست کی تھی کہ کم از کم ان کے گھر اطلاع کرادی جائے کہ ان پر کیا افتاد پڑی ہے اور وہ کیوں واپس گھر نہیں پہنچ سکے۔ شام تک وہ بار بار سنتریوں سے پوچھتے رہے۔ ہر بار انہیں خاموش رہنے کا حکم دیا گیا اور ایک ہی جواب دیا جاتا کہ آدمی بھیج دیا گیا ہے۔ سب نے جیسے انہیں پاگل سمجھا ہوا تھا' کسی نے بھی ان سے ہمدردی نہیں کی' ایک سپاہی برج بابو کے سوا۔ برج بابو نے ان سے وعدہ کیا کہ رات ڈیوٹی ختم کرکے وہ ان کے گھر کی طرف جائے گا اور خیریت معلوم کرکے آئے گا۔ رات بھر وہ زخموں کی تکلیف میں فرش پر لوٹتے رہے۔ آدمی کا ظاہر تو اس کا عشر عشیر بھی نہیں۔ سارا کچھ تو آدمی اپنے اندر سے ہے۔ بیرونی زخم اتنے شدید نہیں تھے جتنے ان کے اندر۔۔۔ ان کی روحیں ایک عذاب سے دوچار تھیں۔ انہیں رات ہی کو کسی وقت برج بابو کی واپسی کی توقع تھی۔ برج بابو صبح ٹھیک اپنی ڈیوٹی کے وقت آیا اور اس نے انہیں صبر و شکر کی تلقین کی اور کہا کہ سب اوپر والے کی مرضی پر ہے۔ جگنو اور دیوا کے دل بری طرح دھڑک رہے تھے' وہ آگے کچھ سننا نہیں چاہتے تھے مگر برج بابو نے انہیں بتایا کہ پرسوں رات جب وہ گھر سے نکلے تھے' اسی رات کے آخری پہر نو لکھی چل بسی۔ جس وقت برج بابو ان کے گھر پہنچا' دروازے کے باہر' گلی میں آٹھ دس آدمی موجود تھے۔ وہ نو لکھی کی آخری رسمیں ادا کرکے آئے تھے۔ اندر سے عورتوں کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ برج بابو وردی میں تھا اس لیے سب اس کی طرف متوجہ ہوگئے لوگوں کے بیچ میں بیٹھا ہوا شخص بنارسی تھا' کسی حد تک پریشان اور برگشتہ سا۔ برج بابو نے اسے فوراً پہچان لیا اور پہلے اسی سے بات کی' اسے جگنو اور دیوا کے بارے

میں بتایا۔ بنارسی نے تلخی سے کہا کہ اسے سب معلوم ہوچکا ہے اور وہ ان دونوں کے متعلق کچھ سننا نہیں چاہتا۔ برج بابو نے شکایت کی کہ ان کی ماں کی موت کی اطلاع تو تھانے پہنچانی چاہیے تھی' یقیناً انہیں ماں کا آخری دیدار کرنے کی اجازت مل جاتی۔ بنارسی بھڑک گیا اور بولا' کیسی اطلاع؟ کس کی ماں؟ وہ ان حرام زادوں کی ماں نہیں تھی' جانے کہاں' کس گھورے پر سے انہیں اٹھالائی تھی۔ وہ اس کے اصل بیٹے ہوتے تو کبھی ایسا نہ کرتے۔ ان کتوں کی وجہ سے نو لکھی اپنی جان سے چلی گئی۔ زندگی بھر وہ اس کا جینا حرام کیے رہے' آخر وقت میں بھی اس کے کام نہ آئے' ایسے وقت انہوں نے جھگڑا کرلیا۔ بنارسی نے مشتعل ہو کے برج بابو سے کہا کہ ڈاکٹر وقت پر پہنچ جاتا تو شاید نو لکھی بچ جاتی۔ بنارسی نے جگنو اور دیوا کے معاملے میں کسی قسم کی اعانت سے انکار کردیا اور کہا کہ وہ ان کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔

برج بابو اور بھی کچھ بہت بتاتا رہا' یہ سوچے بغیر کہ ہر آدمی کی ایک سکت ہوتی ہے' شور سننے اور تماشا دیکھنے کی۔ جگنو اور دیوا کے اعصاب شل ہوگئے تھے۔ پھٹی پھٹی آنکھیں' بے حس و حرکت جسم۔ سپاہی برج بابو انہیں تسلی تشفی دینے لگا کہ حوصلہ رکھو بھائیو! ہمت سے کام لو۔ تم تو نوجوان ہو' ایسے امتحانات آتے رہیں گے۔ جگنو اور دیوا کا سناٹا نہیں ٹوٹا۔ برج بابو تھک کے ان کے پاس سے ہٹ گیا۔ اسے گئے دیر ہوگئی پھر اچانک دیوا کو جیسے کسی نے جھنجوڑا' کسی نے جیسے اس کے سینے میں خنجر اتارا' اور پھول وتی؟ وہ وحشیانہ انداز میں برج بابو کو پکارنے لگا۔ برج بابو دوڑا دوڑا اس کے پاس آیا۔ دیوا نے گڑگڑا کے اس سے پوچھا "اور پھول وتی؟" آگے اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ برج بابو نے مایوسی سے سرہلایا کہ اسے گھر کے اندر کا حال نہیں معلوم۔

اسی روز انہیں مجسٹریٹ کے سامنے پیش کردیا گیا۔ جگنو اور دیوا نے ہاتھ جوڑ کے اپنی روداد سنانے کی کوشش کی مگر پولیس کی رپورٹ ان کے سچ سے زیادہ مدلل تھی۔ ان کے جسم پر چوٹوں کے نشانات' پٹیاں ان کی وحشت' گزشتہ ریکارڈ' انہیں جیل بھیجنے کا فیصلہ کرنے میں مجسٹریٹ کو کوئی زحمت نہیں ہوئی۔

ساتویں دن' جیل میں آنے کے ٹھیک ہفتے بھر بعد انہیں موسی سیتا بائی کی آمد کی اطلاع دی گئی۔ جب تک انہوں نے موسی کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ لیا' انہیں یقین نہیں آیا۔ بہت سے دکھ آدمی کو خود اپنے خیال و خواب دیتے ہیں۔ ایک لمحے کے لیے جگنو اور دیوا کو گمان ہوا کہ موسی کے ساتھ کہیں پھول وتی نہ ہو۔ موسی اکیلی تھی۔ اس نے دونوں کو سینے سے لگالیا۔ وہ ان کی اشک شوئی کے لیے آئی تھی لیکن خود آنسو بہانے لگی۔ اپنے شدید اضطرار کے باوجود انہوں نے موسی سے کچھ نہیں پوچھا۔ انہیں خوب اندازہ تھا کہ موسی کیا جواب دے گی۔ موسی کو بھی جیسے معلوم تھا کہ زنداں کے لوگ سوال نہیں کیا کرتے۔ سو وہ خود ہی بتانے لگی کہ سب دیکھتے رہے "سہارے پاس پڑوس والے دیکھتے رہے۔ کوئی بھی پھول وتی کا کچھ نہیں ہوتا تھا' کوئی کیا کہتا۔" موسی کے بقول' صرف اسی نے جرات کی اور بنارسی سے التجا کی کہ ابھی کچھ عرصے پھول وتی یہیں رہے تو ٹھیک ہے۔ بنارسی برافروختہ ہوگیا کہ پھول وتی گھر میں اکیلی رہے؟ کہنے لگا "یہاں رہے گی تو یہ بھی مرجائے گی۔"

موسی' نو لکھی کی بہت کچھ واقف حال تھی۔ پھول وتی اس کے سامنے بڑی ہوئی تھی اور یہ دونوں بھی۔ غریبی کے رشتے ویسے بھی مضبوط ہوتے ہیں۔ موسی کی آنکھوں سے مسلسل آنسو جاری تھے' گھٹی ہوئی آواز میں اس نے بتایا کہ بنارسی پھول وتی کو لے جارہا تھا اور موسی نے زندگی میں کبھی ایسی بے بسی اور ناداری محسوس نہیں کی تھی۔ پھول وتی کو دیکھا نہیں جاتا تھا' دل کٹا کٹا جاتا تھا۔ ماں کے جانے کے وقت سے اسے چپ لگی ہوئی تھی۔ کوئی تسلی دیتا تو اسے تکتی رہتی۔ اس رات سے بنارسی مستقلاً گھر میں رہا' پھول وتی کا سایہ بنا ہوا۔ موسی کہتی تھی کہ اس کا بس چلتا تو وہ اسی رات پھول وتی کو کہیں چھپا دیتی۔ جب مرد نو لکھی کو جلانے گئے تھے' اس وقت وہ پھول وتی کو کہیں لے جاسکتی تھی مگر کہاں؟ اس کے بازو بہت کمزور تھے۔ موسی نے پڑوس کے کریم بھائی سے مشورہ کیا۔ کریم بھائی ہمت کا آدمی تھا اور خدا ترس بھی کہنے لگا' موسی! یہ بڑا کام ہے۔ نو لکھی نے سارے میں خو[illegible] مشہور کر رکھا تھا کہ پھول وتی' بنارسی سے ہے۔ سچ اور جھوٹ خدا بہتر جانتا ہے۔ بعض سچ بہت برے ہوتے ہیں۔ اگر [illegible] جھوٹ بھی تھا تو اپنی امان کے لیے نو لکھی کو کچھ نہ کچھ تو [illegible] تھا۔ کریم بھائی آہ بھر کے رہ گیا۔ موسی کی عقل میں نہیں [illegible] تھا کہ کیا کرے۔ کبھی جی میں آتا کہ پھول وتی کی شکل ہی بگ[illegible] دے۔ کتنے بدنصیب ہیں وہ' جنہیں اپنی خوبیاں راس نہ[illegible] آئیں۔ نو لکھی نے اپنی گل رنگی کی سزا پائی تھی' اب پھ[illegible] وتی کو بھی یہی سزا مل رہی تھی۔ موسی میں حوصلہ نہیں ہو[illegible] وہ پھول وتی کے گلستاں چہرے پر انگارے پھینک دے۔

اس دن سب بار بار جگنو اور دیوا کو پوچھتے اور [illegible] ہوجاتے۔ ایسے وقت میں جگنو اور دیوا کا روپوش ہوجانا۔ کے لیے تعجب انگیز تھا لیکن دیواروں کے خوف میں آدمی جو کچھ دوسروں سے نہیں کہہ پاتا' خود سے تو کہہ سکتا ہے' خود سے کہہ کے جی ہلکا کرلیتا ہے۔ ہر ایک سمجھ رہا تھا کہ کیا کچھ ممکن ہے' بعد میں جگنو اور دیوا کی تھانے میں موجودگی کی اطلاع ملی تو بہت سوں کو قرار آگیا کہ کہیں سے ان کی خبر تو آئی۔ غریب آدمی کو اپنے آپ ہی سے فرصت نہیں ملتی' اپنے آزار سے' دوسرے کے پھڈے میں کیا ٹانگ اڑائے۔ سب نے خود کو ملامت کی اور کام پر نکل گئے کہ مدتوں سے ان کا یہی معمول تھا۔

موسی کے کہنے کے مطابق' آخری رات وہ نو لکھی کے سرہانے موجود تھی۔ نو لکھی نے وہ رات بہت کرب میں گزاری۔ جب بھی اسے ہوش آتا لگتا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے مگر بے چاری جگنو' دیوا اور پھول وتی کو پکار کے رہ جاتی۔ موسی بتا رہی تھی کہ دم ٹوٹتے وقت نو لکھی کی ویران آنکھیں چاروں طرف منڈلا رہی تھیں' پھر دروازے کی طرف جا کے ایسے ٹھہریں۔۔۔" موسی ہچکیوں سے رونے لگی۔

وہ اپنی رو میں جانے کیا کچھ کہہ گئی۔ جگنو اور دیوا نے دخل نہیں دیا کیونکہ یہ سب ان کے لیے ایسا نیا نہیں تھا۔ تھانے سے جیل تک شب و روز وہ یہی سنتے اور دیکھتے رہے تھے۔ موسی تو بس دہرا رہی تھی۔ ان کے سکوت سے وہ ٹھٹک سی گئی اور دونوں کی بلائیں لے کے بولی۔ نو لکھی مرگئی ہے لیکن اس کی جمن سیتا بائی' تمہاری موسی ابھی زندہ ہے۔ کاش خدا اسے کسی قابل کرتا تو یہ نوبت ہی نہ آتی۔ اس کا دل جتنا بڑا ہے' اتنی ہی یہ بے وست دپا ہے۔ کسی کے کام نہیں آسکتی' اپنے بچوں کے کام نہیں آسکتی۔ کہنے لگی کہ وہ مایوس نہ ہوں۔ خدا نے چاہا تو پھول وتی سکھ سے ہوگی۔ ذرا سوچو کہ بنارسی نہ لے جاتا تو اسے کون لے جاتا۔ کیا عجب' خدا بنارسی ہی کے دل میں نرمی ڈال دے' صبح و شام وہ یہی دعا کرتی ہے۔ آخر پھول وتی سے اس کا کیا تعلق ہے۔ نو لکھی کی آنکھیں بند ہوجانے کے بعد پھول وتی سے اس کا رویہ بہت مربیانہ تھا۔ موسی نے کہا کہ جاتے وقت بنارسی گھر کی چابیاں بھی دے گیا ہے کہ چند دنوں تک موسی ہی گھر کی رکھوالی کرے۔ موسی نے دبے لہجے میں اس سے پوچھا کہ اگر وہ پھول وتی سے ملنا چاہے تو کہاں جائے۔ بنارسی نے کہا کہ ابھی وہ کوئی ٹھکانا نہیں بتا سکتا۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ ایک دو دن میں وہ خود پھول وتی کو لے کے یہاں آجائے گا۔ موسی نے اس سے زیادہ جرح نہیں کی۔ بنارسی سے اتنی بات بھی موسی نے زندگی میں پہلی بار کی تھی کہنے لگی "آج چوتھا دن ہے' بنارسی نہیں آیا' ممکن ہے آج شام یا کل۔۔۔"

سپاہی آکے موسی کو نہ اٹھاتے تو وہ شام تک بیٹھی رہتی جاتے جاتے موسی نے کہا کہ جب بھی موقع ملا' وہ جگنو اور دیوا کے پاس آتی رہے گی۔ انہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتائیں۔ جگنو اور دیوا کون سی چیز طلب کرتے۔ موسی چلی گئی' یہ التجا کرکے اور حکم دے کر کہ جیل سے چھوٹ کے وہ سیدھے اس کے پاس آئیں گے' کہیں اور نہیں جائیں گے' کسی طرف بھی نہیں' اور کوئی ایسا کام نہیں کریں گے جس سے نو لکھی کی روح کو تکلیف پہنچے اور پھول وتی ان سے اور دور ہوجائے۔

موسی دوبارہ نہیں آئی۔ جیل میں جگنو اور دیوا کے پاس اس کے جانے کی خبر چھپی نہ رہ سکی ہوگی۔ موسی کی دوبارہ آمد شاید اسی لیے ممکن نہیں ہوئی۔ تاہم جگنو اور دیوا کی قید و بند میں ڈھائی مہینے سے کچھ اوپر ہوئے تھے کہ ایک وکیل کی کوششوں سے انہیں رہائی مل گئی۔ دونوں کے لیے یہ ناقابل یقین سی بات تھی۔ ان کے اصرار پر بمشکل وکیل نے بتایا کہ اس کے ایک دوست کے ہاں گھریلو کام کرنے والی سیتا بائی نامی عورت اس کے گھر آئی تھی۔ سیتا بائی کے پاس بہت کم روپے تھے' اس نے باقی رقم ادھار کرنے کی درخواست کی اور نہایت دل سوزی سے سارا واقعہ سنایا۔ وکیل نے روپے اسے لوٹا دیے اور اطمینان دلایا کہ وہ ایک کوشش کرکے دیکھتا ہے۔ سیتا بائی بہت خوف زدہ تھی' کسی کو خبر نہ ہوجائے کہ اس نے وکیل سے رابطہ قائم کیا ہے۔ وکیل نے جگنو اور دیوا کو صلاح دی کہ جو کچھ ہوچکا ہے' وہ اسے بھولنے کی کوشش کریں۔ اسی میں ان کی بہتری ہے۔ سمجھ لیں کہ وہ نئے آدمی ہیں' زنداں سے دوسرا جنم لے کے نکل رہے ہیں۔ جگنو اور دیوا نے سر جھکالیا۔ انہوں نے وکیل صاحب سے نہیں کہا کہ نئے آدمی کے لیے دوسرا جنم بھی لازمی ہے۔ وکیل کی ہدایت اپنی جگہ تھی۔ جگنو اور دیوا بھی اپنے آپ سے بہت کچھ کہتے رہے تھے۔ جیل کے دوران وہ گویا طرح طرح کی مشقیں کرتے رہے تھے' لگام تھامنے' آئینہ دیکھنے اور سانس روکنے کی' اپنا چہرہ چھپانے اور سینہ جلائے رکھنے کی مشق۔ سینے کی آگ ان کے زندہ رہنے کے لیے ضروری تھی' باقی اس آگ کو روشن رکھنے کی تدبیریں تھیں۔ وہ ایک دوسرے کے تربیت کار تھے اور مسلسل ایک دوسرے کو نشان دہی کراتے رہتے تھے' نشان دہی اور یاددہانی۔

انہیں اندازہ تھا کہ بنارسی کو اتنی جلد ان کی رہائی پسند نہیں آئے گی۔ البتہ جیل سے نکلنے کے بعد انہیں اتنا موقع'

اتنی مہلت ضرور مل گئی کہ بنارسی ان کے بارے میں کوئی تخمینہ لگا سکے۔ جیل سے وہ سیدھے موسی کے گھر پہنچے۔ موسی انہیں دیکھ کے بے قابو ہوگئی۔ برابر ہی میں جگنو اور دیوا کا گھر تھا۔ وہ اس طرف نہیں گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ اب اس گھر کے دروازے ان کے لیے نہیں کھلیں گے۔ موسی نے ان کی بڑی خاطر مدارات کی۔ اس نے ان کے لیے نئے کپڑے سلوا کے رکھے تھے۔ کچھ روپے بھی اس نے ان کی جیبوں میں ڈال دیے اور کہا کہ اس کا گھر بہت چھوٹا ہے لیکن جیسے تیسے گزر بسر کرلیں گے۔ وہ اب یہیں رہیں۔ ان کے پوچھے بغیر موسی نے یاسیت سے بتایا کہ پھول وتی کو وہ دوبارہ نہیں دیکھ سکی۔ بنارسی ہفتے بھر بعد آیا تھا۔ اس نے موسی سے چابی لی اور مکان کسی کے حوالے کرکے چلا گیا۔ موسی نے پھر جسارت کی اور پھول وتی کے بارے میں لجاجت سے پوچھا کہ کیسی ہے وہ؟ کیوں نہیں آئی؟ اپنی موسی کو بھول گئی؟ اسے دیکھنے کو دل بہت بے چین ہے۔ بنارسی نے مختصر جواب دیا کہ پھول وتی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے اسے پونا بھیج دیا گیا ہے۔ اب وہ واپسی ہی پر موسی سے مل سکے گی۔ جگنو اور دیوا نے خاموشی سے سن لیا۔ بنارسی کا ذکر موسی نے نرمی اور احتیاط سے کیا تھا۔ انہوں نے بھی اسی طرح سنا جس طرح موسی نے کہا تھا۔

کپڑے تبدیل کرکے شام کو وہ جھجکتے جھجکتے گھر سے نکلے۔ موسی نے ان سے وضاحت نہیں کی تھی کہ وہ جیل میں دوبارہ ان سے ملنے کیوں نہیں آسکی۔ یہ بات انہیں پڑوسیوں کی زبانی معلوم ہوئی۔ موسی کے جیل جانے پر دو اجنبی اسے تنبیہہ کرنے آئے تھے کہ وہ اپنی اوقات میں رہے' زیادہ پر پرزے نکالے گی تو جتنے دن رہ گئے ہیں وہ بھی نہیں رہیں گے۔ پڑوسیوں سے انہیں اور بھی کچھ معلوم ہوا' پھول وتی کے فسانے' آس پاس ہر طرف پھول وتی کے چرچے تھے۔ مثلاً بنارسی نے کسی سیٹھ کے ہاتھ پھول وتی کا سودا کردیا ہے اور بہت دولت سمیٹی ہے' بنارسی نے اسے الگ گھر میں رکھا ہوا ہے اور وہ اسے بیٹی تسلیم کرنے سے انکاری ہے' بنارسی نے پھول وتی کو قلبِ ماہیت کے لیے بمبئی سے باہر بھیج دیا ہے۔ پھول وتی کو بالا خانے کی تربیت دی جارہی ہے' پھول وتی اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے' جانے کیسی کیسی باتیں۔ انہیں سن سن کے جگنو اور دیوا کی ہڈیاں چٹخنے لگی تھیں۔ جیل کا سارا آموختہ ایک پہر میں منتشر ہوا جاتا تھا۔ وہ کسی کے پاس رکنا نہیں چاہتے تھے مگر لوگ ان کا راستہ روک روک کے یہ کانٹے چبھوتے تھے۔ زنداں سے باہر آکے انہیں احساس ہوا کہ اس ہجوم میں چہرہ چھپانا کتنا مشکل ہے۔ زنداں میں صرف وہی تھے' صرف ان کا شور۔۔۔ گو انہوں نے کسی بیان پر تبصرہ نہیں کیا تھا لیکن وہ اپنے آپ سے تو خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ بہ عجلت وہاں سے گزر گئے اور جگنو نے دیوا کو مشورہ دیا کہ انہیں سیدھے بنارسی کے پاڑے چلنا چاہیے۔

شام ہورہی تھی۔ ان کی رفتار متوازن تھی جو حواس و اعصاب کے توازن کے بغیر ممکن نہیں۔ پاڑے تک پہنچتے پہنچتے اندھیرا چھا گیا۔ انہوں نے احتیاط کی تھی کہ راستے میں پاڑے کے آدمیوں سے واسطہ نہ پڑے۔ کچھ بڑھتے ہوئے اندھیرے نے ان کا ساتھ دیا۔ وہ ایک بڑا فاصلہ طے کرگئے تھے اور پاڑے کے نزدیک چوراہا عبور کرکے دوسری طرف جانا چاہتے تھے کہ دو آدمی یک بیک ان کے سامنے آگئے۔ انہیں دیکھ کے دونوں داداؤں کو جھٹکا سا لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ حیرانی کا اظہار کرتے یا کوئی بازپرس کرتے' جگنو نے انہیں بتایا کہ وہ بنارسی دادا کے پاڑے جارہے ہیں اور دیوا نے ان سے پوچھا کہ کیا بنارسی دادا پاڑے پر ہے؟ داداؤں نے تذبذب سے اثبات میں سر ہلایا۔ جگنو اور دیوا اپنے لہجے میں اعتماد اور چہروں پر انکسار قائم رکھنے میں کامیاب رہے تھے۔ وہ کسی تاخیر کے بغیر آگے بڑھ گئے۔ انہوں نے مڑ کے نہیں دیکھا مگر انہیں یقین تھا کہ دونوں دادا بھی پلٹ کے ان کے پیچھے آرہے ہوں گے۔

عمارت کے باہر موجود کئی داداؤں کا بھی یہی حال ہوا۔ ان کو جیسے کسی نے چٹکی بھرلی لیکن دوسرے ہی لمحے ان کے ہونٹوں پر استہزائی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ راستے میں مزاحم نہ ہونا بھی حقارت کا اظہار تھا۔ کوئی بھی جگنو اور دیوا کے لیے دیوار نہیں بنا۔ وہ دونوں دروازے میں داخل ہوگئے۔ سامنے دالان کے وسط میں بچھی ہوئی چوکی پر بنارسی بیٹھا ہوا تھا۔ دونوں اکیلے اندر داخل نہیں ہوئے تھے' ان کے پیچھے وہ سارے دادا تھے جو ابھی عمارت کے باہر ملے تھے اور جن سے چوراہے پر آمنا سامنا ہوا تھا۔ جگنو اور دیوا کو اپنی جانب بڑھتا دیکھ کے چوکی پر بنارسی کا پھیلا ہوا جسم سمٹ گیا۔ ان لمحوں کی نزاکت کا جگنو اور دیوا کو اچھی طرح احساس تھا۔ وہ زیادہ آگے نہیں گئے۔ صرف ایک لمحے کے لیے بنارسی کی آنکھوں میں خیرگی اتری' اس کی بھویں تن گئیں۔ جگنو اور دیوا نے اسے سلام کرنے میں دیر نہیں لگائی تاہم بنارسی اپنی یکجائی میں کچھ دیر لگی "کیوں؟ ابھی' ابھی ایدر کیسے حرام کا جنا؟" بنارسی کی گرجتی آواز نے عمارت پر چھایا سکوت توڑا۔

کوئی جواب دینے کے بجائے جگنو اور دیوا سر جھکائے کھڑے رہے۔ اپنے بارے میں مطلوب تاثر قائم کرنے کے لیے انہیں بنارسی کو کچھ اور وقفہ دینا چاہیے تھا۔ ان کی مسلسل خاموشی پر بنارسی جزبز ہوا اور بھڑک کے بولا' اس سے پہلے کہ وہ اپنے آدمیوں کو حکم دے کہ انہیں الٹا لٹکوائے' ان کی کھال کھنچوائے' وہ اس کی نظروں سے دور ہوجائیں۔

"اپن کو معافی دیو دادا!" دیوا نے گھگیا کے کہا "ماں قسم' اپن کا کوئی قصور نئیں تھا۔ اپن سیدھا جارہا تھا۔ ان لوگ سے ڈاکٹر کا پتا پوچھا تھا کہ اپن کے پیچھے پڑگیا۔ سب ایک دم دارو لگائے ہوئے تھے۔ اپن نے کچھ نئیں کیا تھا۔"

"ہو' سالا حرامی۔" بنارسی نے نفرت سے کہا "ابھی ایسا بولنے کو ایدر آیا ہے؟"

"اپن کو جو چاہو سزا دے لو دادا! اپنی نو لکھی' ماں کا قسم کھا کے بولتا ہے۔ اپن سے ابھی۔۔۔"

"اس کا نام ایک دم نئیں لینے کا ہے سور کا اولاد! سالا اردیا اس کو! قسم بھی اس کا کھاتا ہے۔"

"نئیں دادا!" جگنو نے دہائی دیتے ہوئے کہا "ایسا مت بولو' اپن ایسا بھی کرسکتا ہے اپنی ماں کے ساتھ۔ اپن ان لوگ سے بالکل منہ ماری نئیں کیا تھا۔ ان لوگ نے اپن کو بہت مارا' اکھا زخمی کردیا۔ ابھی تھانے والے سے جاکے پوچھو۔ اپن کے ساتھ اودر ہوٹل' پان کا دکان پہ چل کے پوچھ لیو۔ تمہارے آگے وہ جھوٹ نہیں بولے گا۔"

بنارسی نے انہیں جھڑک دیا اور گالیاں دے کے بولا 'سالا مخول کرتا ہے ابھی' اپن ایدر فالتو بیٹھا ہے۔ تیرا باپ کا۔۔۔" بنارسی نے بھنا کے کہا کہ وہ زیادہ بات نہ کریں۔ انہیں یہاں آنے کی جرات ہی کیسے ہوئی۔

"اور ابھی کیدر جاتا! تمہارے سوا اپن کا کون ہے؟"

"اپن' اپن کون ہوتا ہے تیرا۔۔۔" بنارسی گرجنے لگا۔

"ایسا مت بولو دادا! اپن کا مائی باپ ہے تم۔" جگنو نے دبی ہوئی آواز میں کہا کہ انہیں معلوم ہے' بنارسی بہت راص ہے۔ سبھی ان سے برگشتہ ہیں۔ پھول وتی بھی یہی سمجھتی ہے کہ اس رات وہ جان بوجھ کے ان لوگوں سے الجھے تھے۔ پڑوس میں رہنے والی موسی ایک بار انہیں دیکھنے جیل آئی تھی اور یہی کچھ بتاتی تھی۔

بنارسی نے مشتعل لہجے میں کہا کہ ان کی زبان پر دوبارہ پھول وتی کا نام نہ آئے' اسے تو وہ چھوڑ کے چلے گئے تھے' اب مگرمچھ کے آنسو کیوں بہا رہے ہیں۔

دیوا پھر قسمیں کھانے لگا اور ہاتھ جوڑ کے بولا' وہ اپنی بے گناہی کا یقین کس طرح دلائیں۔ کہنے لگا' انہیں امید تھی کہ جلد یا بدیر بنارسی کو اصل بات کا علم ہوجائے گا۔ بنارسی جیسے دادا سے حقیقت ڈھکی چھپی نہیں رہ سکتی۔ جیل میں بھی انہوں نے کئی آدمیوں سے منت کی تھی کہ کوئی بنارسی دادا کو پیغام پہنچادے کہ جگنو اور دیوا کی کوئی خطا نہیں ہے۔ وہ ان لوگوں کو بالکل نہیں جانتے تھے جو اس رات۔۔۔

وہ یہی تکرار کرتے رہے۔ انہیں ہر دم یہی سب دہراتے رہنا تھا' تاوقتیکہ بنارسی انہیں دھکے دے کے باہر نہ نکال دے۔ انہیں خوب اندازہ تھا کہ بنارسی کے پتھر پر اپنے لیے کوئی مثبت تاثر نقش کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ بنارسی کے اثبات کا دارومدار محض اس پر ہے کہ وہ کس حد تک اسے اپنی سادگی و سادہ شعاری کا یقین دلانے کے لیے خود پر جبر کرسکتے ہیں۔ انہیں اپنی آگ' اپنا زہر بہت چھپا کے رکھنا تھا۔ ایک ذرا سی تپش' ایک ذرا سی آلودگی ان کے لب و لہجے میں نہ آنے پائے۔ ان کا کام نہایت صبر آزما تھا۔ اس مرحلے کی آمادگی ہی کے لیے وہ کچھ کم اذیت سے دوچار نہیں ہوئے تھے مگر اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ایک زنداں ابھی اور تھا' بنارسی کا زنداں' یا یوں کہا جائے کہ عدالت سے برائت کے باوجود بنارسی کی توثیق لازم تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ دوبارہ انہیں سامنے دیکھنا بنارسی کے لیے کس قدر بیزاری و برہمی کا سبب ہوگا۔ اس کے خیال میں جیل سے چھوٹنے کے بعد ان کے پاس دو ہی راستے ہوں گے' شہر چھوڑ دینا یا دنیا چھوڑ دینا۔ پھول وتی درمیان میں نہ ہوتی تو جگنو اور دیوا شاید یہی فیصلہ کرتے۔ اپنی آگ میں آدمی خود بھی تو جل جاتا ہے۔ انہیں یہ بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ پھول وتی سے نہیں مل سکیں گے تاہم انہوں نے بنارسی سے فریاد کی کہ صرف ایک بار پھول وتی سے ملنے کا موقع دے دیا جائے' وہ اس کے سامنے جاکے صفائی پیش کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے بنارسی سے کہا' انہیں یقین ہے' پھول وتی انہیں معاف کردے گی۔ وہ دل کی بہت اچھی ہے۔ وہ تو انہیں دیکھ کے خوش ہوگی۔ جگنو اور دیوا' نو لکھی کا بدل تو نہیں ہوسکتے لیکن پھول وتی کے لیے آرام و سکون کا باعث ہوں گے۔ پھول وتی کی خوشی سے زیادہ ان کے لیے کوئی اور چیز نہیں۔ دیوا نے بنارسی سے کہا کہ آخر ایک دن تو پھول وتی کو ان سے جدا ہو ہی جانا تھا۔ صرف ایک بار بنارسی ان پر رحم کرے' انہیں پھول وتی سے ملوا دے۔

ان کی زبان سے پھول وتی کا ذکر بنارسی کی شہ رگ پہ ہاتھ رکھنے کے مترادف تھا۔ وہ دہاڑنے لگا کہ پھول وتی ان کتوں کی صورت دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتی۔ جگنو اور دیوا کو اس جواب سے کوئی مایوسی نہیں ہوئی کیونکہ انہیں اس جواب کا پہلے سے علم تھا۔ بنارسی کا تمام ردعمل ان کی توقع کے مطابق تھا لیکن اتمام حجت تک انہیں یہی التجائیں کرتے رہنا تھا۔ بنارسی کو انہیں باور کرانا تھا کہ وہ پھول وتی کے ایک نہایت ناقص اور مجہول دعوے دار ہیں' دعوے دار کیا' محض فریادی ہیں۔ دروازے پر صدا لگانے والے بھکاریوں سے زیادہ ان کی حیثیت نہیں۔ بنارسی بری طرح گالیاں بکتا رہا اور آخر وہ کسی نتیجے پر پہنچ گیا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ دونوں کو باڑے کے باہر پھینک دیں۔ جگنو اور دیوا نے جھپٹ کے بنارسی کی چوکی پکڑلی اور اپنے سر رگڑتے ہوئے بولے کہ اب وہ کہاں جائیں' ان کا کوئی گھر در نہیں ہے۔ وہی سب کچھ انہوں نے دہرایا جو بہت دن ہوئے' ایک بار پہلے بھی کہہ چکے تھے کہ بنارسی انہیں باڑے میں جگہ دے دے' وہ اس کی خدمت کریں گے' مالش کریں گے اور دارو پلائیں گے۔ بہت کچھ انہوں نے کہا۔ ان کی باتوں کا بنارسی کے آدمیوں پر یقیناً کوئی اثر ہوا کہ دونوں ان کے قریب آکے بھی دست کش رہے۔ ممکن ہے' اس گمان میں کہ شاید بنارسی' جگنو اور دیوا کے بارے میں نظر ثانی کرلے۔ تعمیل میں تاخیر سے بنارسی کا جسم پھڑکنے لگا۔ اس نے پھنکارتے ہوئے ان سے کہا کہ یوں کھڑے منہ کیا دیکھتے ہو' چیاؤں چیاؤں کرتے ان پلوں کو اٹھا کے گھورے پر پھینک آؤ جو ان کی اصل جگہ ہے۔ باڑے کے داداؤں کی دست اندازی سے پہلے جگنو اور دیوا نے ان سے ٹھہر جانے کی عاجزی کی اور آخری امید کے طور پر بنارسی سے کہا کہ اگر اس کے باڑے پر ان کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے تو وہ اپنے کسی دوست دادا ہی سے ان کی سفارش کردے۔ باڑے کے سوا اب ان کے لیے کسی جگہ امان نہیں ہے۔ کوئی بھی انہیں کام نہیں دیتا' سب انکار کردیتے ہیں' کوئی انہیں کسی کام ہی کا نہیں سمجھتا۔

بنارسی کے آدمیوں نے جگنو اور دیوا کو پھر کوئی مہلت نہیں دی۔ انہوں نے دونوں کے بازو پکڑ لیے اور جھٹکے سے کھڑا کردیا لیکن جگنو اور دیوا کو دروازے کی طرف دھکیلنے میں نہ انہوں نے وحشت اختیار کی نہ جگنو اور دیوا نے انہیں اس پر مجبور کیا۔ آدمی میں بہت پتھر ہیں پر سب کے سب پتھر یکساں نہیں ہوتے' اور اپنی اپنی نسبت کی بات ہے۔ جگنو اور دیوا سے بنارسی کی اور ان کی نسبت مختلف تھی۔ دروازے سے باہر آکے انہوں نے دونوں کو چھوڑ دیا۔ جگنو اور دیوا سر جھکائے وہیں کھڑے رہے۔ کئی لمحے گزر گئے' پھر بنارسی کے خاص مقربوں میں سے ایک' روبی دادا نے آگے آکے تند نظروں سے انہیں چلے جانے کا اشارہ کیا۔ روبی دادا کی تند آنکھوں میں تاکید بھی تھی' تنبیہہ بھی۔ اس نے ان کی کمر پر ہاتھ رکھ کر تھپکی دی۔ جگنو اور دیوا آہستہ قدمی سے باڑے کی گلی سے نکل گئے۔

جگنو کی آواز حلق میں پھنسنے لگی تھی' وہ ٹھہر گیا اور مضطرب نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا جیسے کوئی وضاحت نہ کرپایا ہو' کچھ بھول گیا ہو یا اسے یہ سب کچھ سنا کے کوئی پچھتاوا ہو رہا ہو۔ میں نے بے اختیار اس کا ہاتھ اٹھا کے سینے پر رکھ لیا۔ جگنو کی آنکھیں امڈ رہی تھیں۔ میں نے اس کے گلے میں بازو ڈال کے اسے خود سے قریب کیا۔ وہ بری طرح سسکنے لگا۔

کسی وضاحت اور تشریح کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ یہی کرسکتے تھے اور شاید انہیں یہی کرنا چاہیے تھا۔ جگنو نہیں کہہ پا رہا تھا مگر وہ اپنی آگ' اپنا ارادہ لے کر بنارسی کے پاس گئے تھے۔ یہ ارادہ ہی ان کی سپر تھا' یہی آسرا' یہی امید' حقارتیں سہنے اور نفرتیں جھیلنے کی قوت۔ انہیں بنارسی کے در سے کچھ ملنے کی توقع نہیں تھی لیکن وہ بہت کچھ لے کے آئے تھے۔ وہ زندگی لے کے آئے تھے جو ارادے کی شرط ہے' جس کے بغیر کوئی آگ فروزاں نہیں ہوتی۔ یوں وہ بنارسی کے پاس اپنی آگ اپنے ارادے کی تجدید کے لیے گئے تھے پھر کیا ذلتیں اور کیسی رسوائیاں؟ وہ نامراد تو نہیں لوٹے تھے۔

میرے ٹوکنے پر آنسوؤں کے درمیان جگنو نے بتایا کہ وہ واپس موسی کے ہاں نہیں گئے بلکہ پہلے کی طرح مختلف باڑوں کے چکر لگاتے رہے' چھوٹی موٹی چوریاں کرکے' اسٹیشن پر مزدوری کرکے زندگی نمٹاتے رہے۔ اس دوران کئی بار بنارسی کے آدمیوں سے ان کا سامنا ہوا بلکہ وہ دانستہ ان کے سامنے آتے رہے۔ بنارسی کے آدمیوں کا سلوک ان سے کتنا ہی کشیدہ ہو' ایسا معاندانہ نہیں رہا تھا۔ جگنو کے بقول' ان میں سے دو ایک نے تو کئی مرتبہ چوری چھپے پیسوں سے مدد کی۔ جگنو اور دیوا نے ہر بار بسروچشم یہ مدد قبول کی اور اس کے عوض داداؤں کے لیے دعائیں ارزاں کیں کہ دعائیں سخی کا حق ہیں اور لوگ کہتے ہیں کہ بھیک اصل میں دعاؤں کا سودا ہے۔ ابھی بہت دنوں تک جگنو اور دیوا کا وظیفہ وہی رہنا

چاہیے تھا جس کی مشق انہوں نے بنارسی کے پاڑے پر بنارسی کے سامنے کی تھی۔ پاڑے سے انہیں نکال دینے کے بعد' ظاہر ہے' بنارسی نے ان کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کرلی ہوں گی۔ ہرچند اتنے بے حیثیت لوگوں کی بابت پاڑے کے آدمیوں سے باربار اضطراب کا اظہار اس کے لیے سبکی کا باعث ہوگا۔ جگنو اور ردیوا کہ ایسے بے اوقاتوں' بے توفیقوں کے لیے یہ تشویش و تردد بنارسی جیسے اعلا مرتبت دادا کو زیب نہیں دیتا۔ جگنو اور ردیوا کو یقین تھا کہ پاڑے کے کچھ داداؤں نے ضرور ان کی وکالت کی ہوگی۔

بنارسی کے آدمیوں ہی سے پھول وتی کا سراغ مل سکتا تھا مگر کسی کو جیسے کچھ معلوم نہیں تھا یا انہیں کوئی بتاتا ہی نہیں تھا' وہی طرح طرح کی باتیں۔ کبھی کوئی کچھ کہتا' کبھی کچھ۔ جگنو اور ردیوا کسی سے کچھ پوچھ بھی نہیں سکتے تھے لیکن وہ انہی لوگوں کے گرد منڈلاتے رہتے تھے۔ ان کے سامنے کسی نہ کسی طرح وہ پھول وتی کا ذکر لے آتے' پھول وتی کیسی تھی' پھول کی پنی' ریشم کی بنی۔ جگنو اور ردیوا کو کتنا عزیز رکھتی تھی۔ وہ خوابوں اور خیالوں کی طرح اس کی یادیں دہراتے تھے اور اس کے حسن و جمال کا تذکرہ کرکے ان کے شوق کو بھڑکاتے تھے کہ شاید اسی صورت کسی کے منہ سے کچھ نکل جائے اور کوئی ان پر ترس کھا کے کچھ بتا دے' بس ایک اشارہ۔ بمبئی اور گردونواح کے تمام بالا خانے' قحبہ خانے انہوں نے چھان مارے تھے۔ بمبئی کی کوئی گلی' کوئی کوچہ ایسا نہیں تھا جہاں وہ پھول وتی پر نظر پڑنے کے آسرے میں بھٹکا نہ کیے ہوں۔ کسی نے انہیں بتایا تھا کہ بمبئی کے ایک بہت بڑے سیٹھ کے ہاتھ بنارسی نے پھول وتی کو فروخت کردیا ہے۔ انہوں نے اپنی استطاعت کے مطابق ہر سیٹھ کی چھان بین کی جو اپنے نفس کا اسیر تھا۔ بنارسی سے تعلق رکھنے والے سیٹھوں کے علاقوں میں وہ پہروں گھومتے رہتے۔ انہوں نے اپنے طور پر بنارسی کے معمولات کا بھی تعاقب کرنے کی کوشش کی مگر وہ کتنی دیر تک اس کے پیچھے جاسکتے تھے۔ کچھ فاصلہ طے کرتے ہی ان کے پیروں میں زنجیر سی پڑجاتی' بنارسی آگے چلا جاتا پھر انہوں نے بمبئی کے قریبی شہروں کا رخ کیا۔ پیسوں کے بغیر وہ سفر پر نکل کھڑے ہوتے۔ سفر کے دوران انہیں چوریوں کا اچھا موقع ملتا۔ چلتی گاڑی سے اترنے میں انہوں نے خوب مہارت حاصل کرلی تھی اس لیے عموماً رات کو سفر کرتے۔ رات کو مسافروں کا سامان ہتھیانا اور ٹکٹ چیکروں سے بچنا آسان ہوتا تھا۔ انہیں یہ سوچ کر ہر قدم پر اپنا خیال رکھنا پڑتا تھا کہ اگر کہیں وہ پکڑے گئے تو پھول وتی ان سے اور دور ہوجائے گی۔ پھول وتی پھر شاید انہیں کبھی نہ مل سکے۔ لگتا تھا' بنارسی نے پھول وتی کے سلسلے میں اپنے زیادہ آدمیوں کو اعتماد میں نہیں لیا تھا' دو ایک داداؤں کے سوا' اور ان تک جگنو اور ردیوا کی رسائی ممکن نہیں تھی۔ رسائی ہو بھی جاتی تو ان سے کچھ معلوم کرنا کارے دار تھا۔ پھول وتی کی بازیافت وہ اتنی مشکل نہیں سمجھتے تھے جتنا انہیں بعد میں اندازہ ہوا۔ بنارسی نے اسے جانے کون سی کھوہ میں چھپا دیا تھا۔

ان دنوں بمبئی کے سب سے بڑے دادا تیواڑی کے ہاں بنارسی کا بہت آنا جانا تھا۔ جگنو اور ردیوا کو ایک یہ وہم ہلکان کیے دیتا تھا کہ پھول وتی کو بنارسی نے تیواڑی کی خدمت میں نہ پیش کردیا ہو۔ تیواڑی کی خوشنودی کے لیے دادا بڑے بڑے جتن کرتے تھے کیونکہ اس کی قربت کسی دادا کے لیے عزت و مرتبت کی علامت تھی۔ چاقو زنی' زور آوری اور ہیبت و دہشت کے علاوہ تیواڑی کے بارے میں اور بھی بہت کہانیاں مشہور تھیں۔ کہا جاتا تھا کہ شہر میں ہر نئی آنے والی طوائف کو پہلے تیواڑی کے سلام کے لیے ضرور آنا پڑتا ہے اور مشہور تھا کہ بمبئی میں تیواڑی کا ایک گھر نہیں' کئی گھر ہیں' اور ویسے تیواڑی اپنی عمل داری کے علاقوں میں جس گھر کو چاہے' جب تک چاہے' وہ گھر اس کا رہتا ہے۔ جگنو اور ردیوا کو معلوم تھا کہ مہینے کے آخری جمعے کو تیواڑی کے ہاں خاص محفل جمتی ہے۔ پاڑے پر نہیں' کسی اور جگہ' کسی بھی سیٹھ کے ہاں۔ تیواڑی کے خاص آدمیوں' دوسرے پاڑوں کے منتخب داداؤں اور بعض افسروں کے سوا اس ماہانہ جشن میں کسی کو شرکت کی اجازت نہیں ہے۔ جگنو اور ردیوا نے سنا تھا کہ کچھ عرصے سے بنارسی بھی مہینے کے آخری جمعے کو پاڑے پر نہیں رہتا۔ سو اسی بات کا امکان تھا کہ اسے تیواڑی کی محفل میں شرکت کی عزت حاصل ہوگئی ہے۔

جگنو اپنی رو میں تیواڑی کے بارے میں جانے کیا کیا بتاتا رہا۔ وہ بھول گیا اور میں نے بھی نہیں ٹوکا کہ وہ مجھے کیا بتاتا رہا ہے۔ جب بھی تیواڑی کا نام آتا ہے' میرا سینہ دھکنے لگتا ہے۔ اس درندے نے کرشنا جی کو مجھ سے دور کیا تھا۔ ایک مجھے کیا' کرشنا جی تو ایک جہاں کو عزیز تھے۔ بٹھل نے تیواڑی کی ناک اتار لی تھی۔ کہتے ہیں' کسی دادا کے لیے اس سے بڑی سزا کوئی نہیں ہوتی مگر کرشنا جی کے بدل میں تو ہر سزا کم تھی۔ بٹھل بھی اس پر مطمئن نہیں ہوگا۔ جگنو کہہ رہا تھا کہ انہیں یہی وہم ڈسا کرتا تھا کہ اگر پھول وتی تیواڑی کے پار چلی گئی ہے تو پھر خدا ہی اس کی حفاظت کرے۔ وہ تو سات خانوں میں چلی گئی ہے' اور کیا ضروری ہے' تیواڑی نے اسے

اپنے پاس ہی رکھا ہو۔ اس نے پھول وتی کو اپنے کسی مُربّی سیٹھ کی نذر نہ کردیا ہو۔

دن گزرتے گئے اور ان کی آنکھیں ویران ہوتی گئیں۔ وہ نہ پھول وتی کو تلاش کرسکے' نہ کسی پاڑے میں کوئی جگہ حاصل کرسکے اور نہ کوئی ایسی چوری کرسکے جو پھول وتی اور ان کے درمیان فاصلے کم کرنے میں معاون ہوتی۔ کوئی کتنا ہی ناتواں ہو' پیسے سے منزلیں آسان ہوجاتی ہیں۔ پیسہ تو بجائے خود منزل ہے' سب سے بڑی چھت اور سب سے بڑی چھاؤں۔ پیسے سے تو وہ بنارسی کو خرید سکتے تھے' تیواڑی کو خرید سکتے تھے مگر کوئی تقدیر کا کیا کرے۔ کھوٹا سکہ چل جاتا ہے' کھوٹی تقدیر نہیں چلتی۔ کچھ لوگوں کی تقدیر ہی ایسی مٹی ہوتی ہے کہ جتنا پیسے کی ضرورت ہو' جتنا پیسے کی تدبیر کرو' پیسہ اتنا ہی گریزاں رہتا ہے۔ ایک بار ان کے دل میں آیا کہ کیوں نہ پولیس کی مدد لیں' پولیس کے کسی دردمند افسر کے پاس جاکے ساری روداد سنائیں مگر پھر شاید ان کے ہاتھ میں کچھ نہ رہے۔ پولیس کے پاس تو ہر چیز کے لیے پیمانے اور باٹ ہوتے ہیں۔ بہت سی چیزیں ترازو میں نہیں تلتیں' نہ پیمانے انہیں ناپ سکتے ہیں۔ تھانے کی عمارت ابھی دور تھی' وہ بیچ سے لوٹ پڑے۔ بعد میں انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ اتنی بڑی نادانی سے بچ گئے۔

جگنو اور ردیوا کا کہیں جی نہیں لگتا تھا' نہ کپڑوں کا ہوش' نہ کھانے کی فکر' صبح کب ہوئی شام کب۔ شام و سحر بھی ایک گمان ہے۔ زمین کی گردش پوری ہونے پر اجالا ہوجاتا ہے یا اندھیرا مگر فرد کی بھی اپنی گردشیں ہیں۔ دونوں میں کوئی مطابقت لازم نہیں۔ ہر آدمی کے لیے سحر نہیں ہے۔ جس کے وجود پر اندھیرا مسلط ہو' اس کے لیے کیا سحر' کیا شام۔ جتنے دن گزرتے جاتے تھے' جگنو اور ردیوا کا اندھیرا بڑھتا جاتا تھا۔ وہ پھول وتی سے کیا' اپنے آپ سے دور ہوتے جارہے تھے۔ اسی عالم میں ایک دن داور اسٹیشن پر جیل کے ایک شناسا باٹلی والا بھائی سے ان کی ملاقات ہوگئی۔ باٹلی والا' دادا نہیں تھا لیکن داداؤں سے اس کی بڑی راہ و رسم تھی۔ وہ انہیں چھنگا دادا کے پاڑے پر لے آیا۔ چھنگا علاقے کے اعتبار سے اتنا بڑا دادا نہیں تھا جتنا کس بل اور رکھ رکھاؤ کے اعتبار سے تھا۔ وہ دوسرے داداؤں سے کم ہی سروکار رکھتا تھا' نہ کسی کے علاقے پر نظر رکھتا' نہ اپنے علاقے میں دوسروں کو ایسا کرنے دیتا۔ ایک زمانے سے وہ اپنے پاڑے پر جوں کا توں قائم تھا۔ باٹلی والا کی سفارش پر چھنگا انہیں رکھنے کے لیے آمادہ ہوگیا اور گویا جگنو اور ردیوا کو کنارہ نظر آگیا۔ ان سے کوئی بڑی غلطی سرزد ہوجاتی تو دوسری بات تھی ورنہ ایک بار اپنے پاڑے پر انہیں قبول کرنے کے بعد چھنگا بہرحال ان کا امین اور نگراں تھا۔ ادھر جگنو اور ردیوا نے جی جان سے چھنگا دادا کی خدمت کی' چھنگا کے علاوہ دوسرے داداؤں کی بھی۔ وہ یہ موقع ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتے تھے لیکن ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ ایک روز میں پاڑے میں داخل ہوا اور میں نے یعنی راجا دادا نے چھنگا کو پاڑے سے بے دخل کردیا۔

جگنو کے کہنے کے مطابق' انہوں نے کبھی ایسا نہیں دیکھا اور سنا تھا۔ ان کے لیے وہ سارا منظر دیدنی تھا۔ بس اسی دن سے انہیں اپنے دن پھرتے محسوس ہوئے۔ انہوں نے طے کرلیا کہ اب کہیں نہیں جانا۔ ذرا وقت گزر جائے تو وہ راجا دادا کو بیتی ہوئی ہر بات بتائیں گے۔ راجا دادا انہیں بالکل دادا نہیں لگتا تھا۔ میری ناوقت آمد سے جتنے وہ آزردہ ہوئے تھے' چھنگا کی ہزیمت سے انہیں اتنی ہی خوشی ہوئی۔ ان کی کوشش یہی رہتی تھی کہ وہ کسی طور میرے سامنے رہیں۔ چھنگا کی طرح اب وہ میری خدمت کے لیے اشاروں کے منتظر رہتے پھر ایک دن انہوں نے بٹھل کو دیکھا اور دیکھا کہ راجا دادا نے اس کے لیے پاڑے کی چوکی خالی کردی ہے۔ بٹھل کی آمد پر وہ خود کو اور محفوظ و توانا محسوس کرنے لگے۔

اس کے لیے وہی حقہ تیار کرتے تھے اور وہی اس کے پیر دباتے تھے مگر انہیں اپنے دل کی بات کہنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ جگنو ٹھیک کہہ رہا تھا۔ تیواڑی کا سر اتارنے کی جستجو میں مجھے کسی اور طرف دیکھنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ بمبئی میں اچانک بٹھل کی آمد سے وقت کچھ اور تیز ہوگیا تھا۔ بے شک وہ دونوں تیواڑی کا پاڑا نیست و نابود کرنے والے داداؤں میں شامل تھے اور یقیناً پیش پیش بھی ہوں گے۔ تیواڑی کے خاتمے کے بعد بٹھل نے چھنگا کے پاڑے پر چھیدا کو تعینات کردیا تھا اور ہم سب اپنے محسن پیرو دادا کے پاڑے پر بیٹھنے لگے تھے۔ جگنو کہہ رہا تھا کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کس طرح حرف مدعا زبان پر لائیں۔ میری پیروی میں کبھی وہ اس پاڑے جاتے' کبھی اس پاڑے' اور وہ دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے پھر ایک دن انہیں خبر ملی کہ ہم بمبئی سے چلے گئے ہیں۔

جگنو مجھے پہلے ہی بتا چکا تھا کہ پھر میری تلاش میں وہ کہاں کہاں گئے۔ کلکتے اور دوسرے کئی شہروں میں۔ وہ فیض آباد بھی جانے کے لیے تیار تھے لیکن کلکتے میں انہیں تصدیق ہوگئی تھی کہ میں اور بٹھل وہاں بھی نہیں ہیں۔ ہم تبت کی طرف گئے ہوئے تھے۔ جگنو اور دیوا ہماری آس میں بہت دنوں تک کلکتے میں ٹھہرے رہے پھر پھول وتی کے خیال نے

انہیں بد حواس کردیا۔ اس سفر میں انہوں نے ایک اور کام بھی کیا۔ کلکتے تک راستے میں پڑنے والے بیشتر بڑے شہروں میں اتر کے انہوں نے ایک نظر وہاں کے بالا خانوں کو دیکھ لینا مناسب سمجھا۔ لکھنؤ' کان پور' دلی اور آگرے میں تو انہوں نے اس مقصد کے لیے کئی دن صرف کیے۔ کہیں بھی پھول وتی کی سن گن نہ ملی۔ کلکتے میں انہیں کچھ کام مل گیا تھا۔ باقی جگہوں پر انہیں شدید دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پلیٹ فارم اور ریل کے ڈبوں میں چوریوں سے جیسے تیسے انہوں نے سفر جاری رکھا' آخر وہ واپس بمبئی پہنچ گئے اور چھنگا ہی کے پاڑے سے ان کا تعلق رہا لیکن بس رسمی سا۔ پاڑے پر اب ان کا جی ہی نہیں لگتا تھا۔ انہیں میرا انتظار تھا اور چونکہ پیرو دادا ابھی بمبئی میں نہیں تھا اس لیے انہیں میری واپسی کا یقین تھا۔ اس دوران وہ بمبئی کے گلی کوچوں میں پھول وتی کے لیے بھٹکتے' منڈلاتے رہے۔

تیواڑی کے خاتمے کے بعد بمبئی میں بہت کچھ بدل چکا تھا۔ تمام پاڑے اب پیرو دادا کے پاڑے سے جڑے ہوئے تھے' بنارسی کا پاڑا بھی۔ بنارسی کا رخ اب کلیتا ماہم کے پاڑے کی طرف تھا۔ جگنو اور دیوا کو یہ جان کے حیرت بھی ہوئی اور موہوم سی مسرت بھی کہ ماہم کے پاڑے سے الحاق کرنے میں بنارسی آگے آگے تھا۔ بنارسی اور تیواڑی کے ربط ضبط کا علم پیرو اور دوسرے داداؤں کو ضرور ہوگا لیکن سبھی نے اسے نظر انداز کردیا۔ انہیں یہی کرنا چاہیے تھا۔ بنارسی سے براہ راست پرخاش بھی نہیں تھی اور بنارسی کا موجودہ رویہ' اس کا تپاک اور سرخوشی کا اظہار مجوبیت اور معذرت کے مترادف تھا۔

بمبئی میں اب سبھی کچھ الٹ چکا تھا مگر جگنو اور دیوا کے لیے کچھ نہیں بدلا تھا۔ ان کے لیے وہی سحر تھی' وہی شام' وہی اندھیرا' وہی دھوپ اور وہی بنارسی۔ وہ دوبارہ بنارسی کے پاس نہیں گئے اس لیے کہ وہاں سے کچھ حاصل ہونے کا امکان نہیں تھا لیکن وہ اس کے بعض آدمیوں کی خدمت میں پابندی سے حاضری دیتے رہے کیونکہ بنارسی کو اپنی فردتنی اور فرمائیگی کی یقین دہانی انہی آدمیوں کے ذریعے ممکن تھی۔ اس یقین دہانی کی ضرورت ختم نہیں ہوئی تھی۔ دوسرے جگنو اور دیوا کو ابھی تک کوئی امید تھی کہ شاید کبھی کسی آدمی کی زبان بہک جائے۔ پھول دتی کے بارے میں کوئی سراغ مل جائے۔ اسی آسرے میں انہوں نے تیواڑی کے خاتمے کے بعد اس کے پاڑے کے منتشر ہوجانے والے داداؤں سے سلام دعا شروع کی مگر وہ بھی بنارسی کے آدمیوں کی طرح انجان تھے۔

جگنو کی آواز ڈوب ڈوب جاتی تھی۔ وہ چپ ہوگیا۔ اب شاید کہنے کو کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ پہلے کی طرح بکھر گیا اور اپنے چہرے پر چٹکیاں بھرنے لگا۔

"حوصلہ رکھو۔" میں نے بمشکل کہا اور مجھے اپنے ہی لفظ بہت حقیر لگے۔

○☆○

دور دور تک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دیر تک کوئی گاڑی بھی نہیں گزری تھی۔ رات کا آخری پہر ہوگا۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ گھر بھی جانا تھا۔ میرے گھر نہ پہنچنے پر وہ سب کیسے بے حال ہوں گے۔ میری نظریں ان دونوں پر جمی ہوئی تھیں۔ دونوں کے شانے ڈھلکے ہوئے تھے اور وہ اپنا چہرہ مجھ سے چھپائے ہوئے تھے۔ کوئی خیال نہیں کرتا کہ اس کے پاس سے گزرتا ہوا راہ گیر کتنی دور سے چل کر آرہا ہے اور کتنی دور اسے جانا ہے۔ کون کتنا اجیرن ہے اور کتنا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے۔ دیر تک میں گنگ بیٹھا رہا۔ میری رگوں میں چنگاریاں سی لپکتی تھیں۔ مجھے ان سے کیا کہنا چاہیے۔ اتنا سن کے کوئی کسی سے کیا کچھ کہہ سکتا ہے اور کیا کرسکتا ہے۔ اسے آنسو بہا کے گزر جانا چاہیے کہ اپنا راستہ ہی کم نہیں ہوتا۔ لمحوں تک میں اپنے آپ سے دو چار رہا' کسی محبس میں بیٹھا ہاتھ پاؤں مارتا رہا پھر جیسے میرے سینے کی دھند چھٹنے لگی' کوئی گم شدہ چیز مل جانے پر آدمی کو جو سکون نصیب ہوتا ہے۔ ارادہ بھی تو کھو جاتا ہے۔ میں نے جگنو سے پوچھا کہ یہاں سے بنارسی کا پاڑا کتنی دور ہے؟

دونوں اچھل سے گئے اور میری صورت دیکھنے لگے

"جاستی دور نئیں۔" دیوا اضطراری لہجے میں بولا "مگر کیوں' کیوں دادا؟"

"ٹھیک ہے۔" میں نے نسبتاً ٹھہری ہوئی آواز میں کہا "وہیں چلتے ہیں' پہنچتے پہنچتے سویرا ہوجائے گا۔"

میری توقع کے خلاف دونوں نے ہاتھ جوڑ لیے "نئیں دادا نئیں۔"

"ایک بار چل کے دیکھتے ہیں۔"

"نئیں دادا۔" جگنو عاجزی سے بولا "آپ نئیں جاؤ گے۔"

"میں اکیلا جاؤں گا۔"

"یہ بات نئیں دادا۔" جگنو نے میرے پیر پکڑ لیے "ایسی بات نئیں ہے۔"

"پھر' پھر کیا ہے؟" میں نے بے چینی سے کہا "پھر کیسے۔۔۔؟"

"آپ کو اور نئیں جانتے کا نا۔" جگنو نے اٹکتی زبان سے کہا "ابھی ایسا کرنے کا ہوتا تو اپن خود بھی اس کے سامنے اودر پاڑے پر گیا تھا۔ پہلی بار میں نئیں تو اپن دوسری بار کو بھی جاسکتا تھا۔"

میں نے اس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کی اور تذبذب سے سرہلایا۔

"آدی کو خلاص کرنے کا کیا ہے دادا۔ اپن کبھی بھی اس کا خون پی لیتا۔ ابھی کچھ نئیں تو پیچھے سے چاقو ڈال دیتا' تیزاب مار دیتا اس کتے پر۔ بعد کو اپن کا جو بھی ہونے کا تھا' اس خواری سے جاستی نئیں ہوتا۔ اپن کو پتا تھا' اپن بھی خلاص ہوجاتا پر ایسا بار بار کو تو نئیں مرتا سالا۔"

"اچھا ہوا جو تم نے ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا۔" میں نے نرمی سے کہا "میں سمجھ رہا ہوں' تم نے بہت تحمل کیا' غالباً اس وجہ سے کہ ایک یہ فیصلہ تو تم ہر وقت کرسکتے تھے لیکن اب کچھ نہیں' میں جاکے اس سے بات کرتا ہوں۔"

"آپ کیا بات کروگے دادا؟"

"پہلے پھول وتی کے بارے میں پوچھیں گے۔"

"اگر وہ کچھ نئیں بولا؟"

"بول وے گا۔"

"اپنے کو معافی دو دادا۔" جگنو جھجک کے بولا "اگر وہ منع کردیا؟"

"ایسا ممکن نہیں ہے پھر دوسرے طریقے ہیں۔ یہ بات وہ بھی جانتا ہوگا۔"

"اور اگر اس نے آپ کو پھول وتی کے بارے میں بول دیا؟"

"یہی تو ہم چاہتے ہیں۔"

"پھر کیا ہوئے گا دادا؟"

"پھر' پھر؟" میں نے ترشی سے کہا "پھر تم کیا چاہتے ہو؟"

"اپن کو پتا ہے دادا! ابھی پھول دتی اپن سے دور چلی گئی ہے' ایسا لوٹ کے اپن کو نئیں ملنے کا۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔"

"دادا!" جگنو نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا "اپن پہلے بولا تھا' اپن خود بنارسی کے پاس جانے کا ہے۔"

"تم' تم؟" میں نے حیرت سے کہا "تم جاؤ گے؟"

"آپ چاہوگے تو ضرور جائیں گا۔"

"میں چاہوں گا!" میں نے الجھی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں دادا! آپ ساتھ رکھو گے تو ضرور جائیں گے۔"

میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ دونوں کی بھیگی آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ تھیں۔ میں نے یہ یقین کرلینے کے لیے توقف کیا کہ جو کچھ میں سمجھ رہا ہوں' کیا وہی ان کے چہروں پر لکھا ہے اور جیسے جیسے ان کے چہرے مجھ پر روشن ہوتے گئے' مجھے ندامت کا احساس ہوتا گیا اور طمانیت کا بھی۔ میں خاموش بیٹھا انہیں دیکھتا گیا۔

"آپ سمجھتے ہو دادا!" دیوا نے لجاجت سے کہا۔

"ہاں ہاں۔" میں سرہلا کے رہ گیا۔

انہوں نے وضاحت کی کوشش نہیں کی۔ کیونکہ بہت سی باتیں وضاحت کے لیے نہیں ہوتیں' اور وہ تو سب کچھ پہلے ہی کہہ چکے تھے۔ بے شک زنداں سے نکل کے پھول دتی کی تلاش میں وہ رات دن ایک کیے رہے مگر وہ ایک اور بات کہہ رہے تھے۔ پھول وتی کی بازیابی اور بنارسی سے اپنے معاملے کو انہوں نے الگ الگ کردیا تھا کیونکہ پھول دتی بنارسی سے ان کے معاملات کا محض ایک جزو تھی۔ اگر وہ اس پر قناعت کرجاتے تو شاید اب تک زندہ نہ ہوتے۔ پھول وتی کے چھن جانے کے بعد موت ہی میں ان کے لیے امان تھی' ایک اور پرسکون موت کی صورت یہ تھی' جیسا کہ جگنو کہہ رہا تھا کہ وہ زنداں سے نکل کے بنارسی کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیتے۔ نشانے پر چاقو پھینکنے کی انہیں کم از کم اچھی شدبد ہوگئی تھی لیکن یہ فیصلہ کسی بھی لمحے ان سے دور نہیں تھا۔ زنداں میں رہ کے وہ مسلسل ایک دوسرے سے برسرپیکار رہے تھے اور وہاں سے خالی ہاتھ واپس نہیں آئے تھے۔ زنداں میں انہوں نے خود شناسی کی مشق کی تھی۔ کوئی خواب نہیں' وہ اپنا ارادہ ساتھ لے کے نکلے تھے۔ جبر سہنے کی انہیں عادت تھی اور سزاوار تعبیر ہونے تک انہیں اپنے ارادے کا جبر سہنا تھا یا جب تک وہ نامرادی کے آخری نتیجے پر پہنچ نہ جائیں۔

پھول دتی کو دیکھنے کے لیے ان کی آنکھیں ترستی تھیں۔ اس کی تلاش میں انہوں نے کسی لمحے کی کوتاہی نہیں کی تھی لیکن صرف پھول وتی ان کی منزل نہیں تھی' ان کی منزل تو بنارسی پر جاکے ختم ہوتی تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ پھول وتی ان سے بہت دور جاچکی ہے۔ وہ ہر دم کسی کرشمے کی آرزو کرتے تھے کہ کبھی کسی دروازے سے پھول وتی کی آواز سنائی دے جائے' کہیں کسی دریچے سے اس کی جھلک دکھائی دے جائے۔ اس دوران پھول وتی انہیں نظر آجاتی تو کیا بات تھی۔ وہ اپنی قسمت پر جتنا بھی ناز کرتے' کم تھا۔ تاہم پھول

وتی کی بازیابی کا بنارسی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ انہیں کسی نہ کسی دن بنارسی کے پاس تو پھر بھی جانا تھا۔

انہیں یقین ہوگا کہ میں بنارسی کے ہاں جا کے پھول وتی کے بارے میں کوئی سرا حاصل کیے بغیر واپس نہ آتا اور میرا نام ان کے لیے ہر قسم کے تحفظ کی ضمانت بھی ثابت ہوتا۔ انہیں یہ تحفظ نہیں چاہیے تھا اس لیے کہ یہ تو انہیں کسی نہ کسی طور اب بھی حاصل تھا۔ یوں مانگے کی زندگی تو وہ کب سے بسر کر رہے تھے۔ ممکن ہے، میرے پہنچنے کے بعد بنارسی پاڑے پر باقی نہ رہتا۔ دادا کا پاڑا کھو بیٹھنا، زندگی ہار جانے کے مترادف ہے۔ ممکن ہے، بنارسی زندگی ہار بیٹھتا۔ جگنو کے بقول یہ کام تو وہ خود کر سکتے تھے۔ بنارسی کے سینے پر میرے چاقو کے یا اس کی پیٹھ پر جگنو اور دیوا کے چاقوؤں کے نشانات ایک ہی حیثیت رکھتے تھے۔

انہوں نے یہ صراحتیں مجھ سے نہیں کی تھیں لیکن پھر انہوں نے اور کیا کہا تھا۔ ان کے ایک ایک لفظ کی بازگشت میرے دل و دماغ میں گونج رہی تھی۔ اندھیرے کا رنگ بدلنے لگا تھا، دونوں نظریں جھکائے بیٹھے رہے۔ میں نے ان سے کہا "ٹھیک ہے، پھر جیسا تم کہتے ہو، ٹھیک ہے مگر دوسری باتوں پر تم نے دھیان نہیں دیا۔ یوں بہت دیر لگ سکتی ہے۔"

"ہو سکتا ہے۔" دیوا بے تابی سے کہنے لگا کہ انہیں یقین ہے، میری توجہ رہی تو کوئی وقت نہیں لگے گا۔

میں ان سے کہنا چاہتا تھا کہ صرف جستجو نہیں، اور بھی چیزیں ہوتی ہیں، بعض لوگوں کی عمریں گزر جاتی ہیں۔ یہ ایسا آسان نہیں جیسا وہ سمجھ رہے ہیں۔ سب پاڑے کے آدمی نہیں ہو سکتے، جیسے پاڑے کا ہر آدمی پاڑے کی چوکی پر نہیں بیٹھ سکتا۔ ہنر کے لیے یک سوئی، صحت، تجربہ اور بھی بہت سی باتیں لازم ہیں مگر میں ان سے کچھ نہ کہہ سکا۔

"ابھی تیم کا کیا۔ اپن کو ابھی کیدر جانا کہ آنا مانگتا ہے۔" جگنو نے مایوسی سے کہا، پھر اسے فوراً کچھ خیال آیا، کہنے لگا کہ یہ سب تو مجھ پر منحصر ہے کہ میرے پاس ان کے لیے کتنا وقت ہے، میں ان پر کتنی نوازش کرتا ہوں۔ میں خاطر جمع رکھوں کہ وہ تا وقت مجھے کوئی زحمت نہیں دیں گے۔

"مگر، مگر۔۔۔" میں نے منتشر لہجے میں کہا "میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا ہے کہ ہم سب پیرو دادا کے گھر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ جانے ہمیں وہاں کب تک رہنا پڑے۔ وہاں پہلے سے بہت لوگ موجود ہیں اور گھر کی فضا ہی دوسری ہے۔ ایسے میں میرا تمہیں اپنے ساتھ وہاں لے جانا۔۔۔"

"اپن باہر پڑا رہنے کا ہے دادا!" جگنو بے کلی سے بولا اور ہیجانی انداز میں یہی دہرانے لگا کہ وہ کسی کو کوئی تکلیف نہیں دیں گے، ہر ایک کی خدمت کریں گے اور میں کہوں گا تو کوئی بھی ان پر انگلی نہیں اٹھائے گا، بٹھل بھی نہیں جہاں اتنے لوگ ہیں، وہاں دو نوکر اور سہی۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن ابھی کچھ بکھرا پڑا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تمہیں کیا وقت دے سکوں گا۔ کچھ نہیں معلوم کہ کب کہاں جانا پڑے۔ میں سوچتا ہوں یہ وقت نہایت نامناسب ہے۔"

"اپن بولا دادا۔" دیوا تڑختی آواز میں کہنے لگا "اپن کو کوئی جلدی نئیں ہے۔ ابھی آپ مل گیا تو اپن کو اکھا چیز مل گیا۔ ابھی سب ٹھیک ہو جائیں گا۔"

"میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں۔ میں مل گیا ہوں تو اب سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو۔ میں اگر آج تمہیں نہ ملتا تو تم کچھ اور انتظار کرتے نا؟"

"ضرور دادا! پر ابھی آپ مل گئے ہو، اپن کیا بولے، ابھی اوپر والا اکھا دیکھتا پڑا ہے، اپن نے ایک ایک پل کیسا کاٹا ہے۔"

میں نے ان سے کہا کہ زندگی ہمیشہ محدود ہوتی ہے۔ پہلے ہی بہت وقت نکل چکا ہے۔ آگے نہ معلوم کیا حالات پیش آئیں۔ میری مانو تو مجھے بنارسی کے پاس جانے دو۔

"دادا!" جگنو گھگیاتے ہوئے بولا کہ میری ہر بات ان کے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے۔ کہنے لگا کہ مجھے بنارسی کے پاس بھیجنا مقصود ہوتا تو اتنا کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ بنارسی کے پاس مجھے بھیجنے کے لیے پیرو دادا کا نام کافی ہوتا۔

"پیرو دادا کا نام؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"آپ سمجھتے ہو، جارجی ابھی اکیلا تھا کیا؟"

"کیا مطلب؟"

"جارجی اکیلا نہیں تھا دادا!" جگنو کی عاجزی میں بڑ[illegible] تلخی تھی۔

"اور کون تھا؟" میں نے متوحش لہجے میں پوچھا۔

جگنو کے کچھ کہنے سے پہلے دیوا نے اسے روک دیا ا[illegible] جھجکی آواز میں بولا کہ بمبئی سے پیرو کے جانے کے بعد پاڑوں کے دادا ایک دوسرے کے پاس کثرت سے آ[illegible] جانے اور ملنے بیٹھنے لگے تھے۔ خاص طور پر وہ دادا جو تیوا[illegible] کے رفیق تھے۔ انہوں نے ماہم کے پاڑے کی مرکزی حیثی[illegible] اس لیے قبول کر لی تھی کہ وقت کا یہی تقاضا تھا۔ پیرو کو گئے ہو گئی تو ان داداؤں کو اور ہوا ملی۔ کچھ یہ تاثر بھی عام ہو گ[illegible] کہ پیرو دادا کسی بڑے چکر میں پھنس گیا ہے، اس کی جلد وا[illegible]

کی توقع نہیں، ممکن ہے، اب وہ کبھی نہ آئے۔ پیرو کی عدم موجودگی میں اس کی چوکی پر بیٹھنے والے ماچھی کو بہت سی باتوں کی خبر ہونی چاہیے۔ یقیناً وہ بے خبر نہیں ہوگا لیکن اس نے پیرو کے انتظار میں توقف کیا۔ ادھر کچھ بعد دیگرے تین داداؤں نے ماہم کے پاڑے پر بھتا بھیجنا بند کر دیا۔ اندھیری کے راجن، بائی کلا کے دینا اور قلابے کے جارجی نے۔ یہ گویا ماہم کے پاڑے سے تعلق ختم کرنے کا صریح اعلان تھا۔ بعد میں دوسرے پاڑے بھی اندھیری، بائی کلا اور قلابے کی پیروی کرتے لیکن وہ کوئی جلدی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ماچھی کی خاموشی سے ایک طرف ان کی حوصلہ افزائی ہوئی تھی تو دوسری طرف ماچھی کا سکوت ان کے لیے تردد و تذبذب کا سبب بھی بن گیا تھا۔ انہیں شبہ ہو گیا تھا کہ پیرو دادا بمبئی واپس آنے والا تو نہیں ہے؟ اور پیرو ایک دن واقعی بمبئی آ گیا۔

دیوا کہہ رہا تھا کہ گزشتہ تین چار دنوں میں ماہم کے پاڑے پر پیرو دادا کے سوگ میں بیٹھے ہوئے ہجوم میں بنارسی بہت واویلا مچا رہا تھا۔ جگنو اور دیوا ایک کونے میں دبکے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ بنارسی بہت مضطرب تھا کہ وہ کسی طرح پیرو دادا سے اپنے دیرینہ مراسم، اپنی گہری وابستگی کا اظہار کرے۔ اس کی آواز بھرا بھرا جاتی۔ اس نے بٹھل سے تلخی بھی کی تھی کہ اگر بٹھل نے اپنے دوست پیرو دادا کی چوکی نہ سنبھالی تو شہر کا اتنا بڑا پاڑا انتشار کی نذر ہو جائے گا۔ جیل سے آنے کے بعد پھول وتی کی تلاش میں جگنو اور دیوا کا ایک ہی کام رہ گیا تھا کہ وہ بنارسی کے سایوں کا تعاقب کریں۔ جارجی [illegible]ور بنارسی، دینا اور دوسرے کئی دادا اندھیری میں راجن کے [illegible]ڑے پر عموماً ملتے تھے۔ پاڑے کی عمارت کے بجائے نزدیک [illegible]کے ایک گھر میں رات کو وہاں محفل جمتی تھی۔ جارجی نے [illegible]ساحل پر جوئے، شراب اور عورتوں کا اڈا کھولا تو بنارسی وہاں [illegible]آنے جانے لگا۔ دیوا نے بتایا کہ جس رات پیرو دادا نے [illegible]یرے اور بٹھل کے ساتھ جارجی کے قحبہ خانے پر چھاپہ مارا [illegible]تھا، اتفاق سے اس رات بنارسی وہاں نہیں تھا۔ ہوتا بھی تو [illegible]شاید پیرو دادا کی اس پر نظر نہ پڑتی۔ رات خاصی ہو گئی تھی [illegible]ور بہت سے لوگ شراب پی کے مختلف کوٹھریوں یا عشرت [illegible]خانوں میں بند ہو چکے تھے۔ پیرو صرف جارجی کی کوٹھری تک [illegible]گیا تھا۔ اس رات بنارسی اندھیری کے پاڑے پر راجن کے [illegible]ساتھ تھا۔ جس نے ایک کم تر درجے کا ایسا ہی اڈا اندھیری [illegible]میں کھول لیا تھا۔ بنارسی نے ماہم کے پاڑے کا بھتا بند کرنے [illegible] فیصلہ خود کیوں نہیں کیا؟ ظاہر ہے، بنارسی بینائی کا ایسا [illegible]م زور نہیں تھا۔ اس نے پیرو کے خاص آدمی جارجی کو آگے بڑھایا اور دیوا کے بقول باقی کتوں کو یہ تاثر دیا کہ اسے پیرو کے پاڑے پر ماچھی کا ردعمل جاننے، ماہم کے پاڑے کی سن گن لینے کے لیے کھلا چھوڑ دینا چاہیے۔ بنارسی کا عذر معقول تھا۔ کسی شک اور اعتراض کی گنجائش نہیں تھی۔ سب کو تیواڑی کی بارگاہ میں بنارسی کی حضوری کا اچھی طرح علم تھا اور تیواڑی کی معزولی کے بعد پیرو کے پاڑے سے اس کے بغض و عناد کا اندازہ تھا۔ ادھر بنارسی نے ماچھی کو بھی کچھ یہی تاثر دیا ہوگا کہ تینوں منحرف داداؤں سے اس کا رابطہ قائم ہے بلکہ وہ ان تینوں پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ ہو سکتا ہے، یہ وہی ہو جس نے ماچھی کو، پیرو کے بمبئی آنے تک جارجی، دینا اور راجن کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے روکے رکھا ہو۔

اور کسی پیشگی اطلاع کے بغیر ایک روز پیرو دادا بمبئی میں وارد ہو گیا، اور اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ بٹھل بھی تھا، میں تھا اور دوسرے کئی اور۔ پیرو کے ساتھ ہماری موجودگی مستزاد تھی۔ بٹھل اور میں بمبئی میں ایسے اجنبی نہیں تھے۔ پیرو کی آمد پر سارے خواب الٹ گئے۔ ایک رات صرف کچھ دیر کے لیے پیرو، جارجی اور دینا کے پاڑوں پر گیا تھا۔ دونوں پر جیسے بجلی گر گئی تھی۔ اندھیری وہاں سے دور تھا۔ اس رات پیرو کو راجن کے پاس اندھیری جانے کی مہلت نہ مل سکی اور اگلی دن راجن نے پیرو کو اپنے پاڑے پر آنے کی زحمت ہی نہیں اٹھانے دی۔ اگلے صبح وہ بھتا لے کے ماہم کے پاڑے پر خود حاضر ہو گیا اور پیرو کے پیروں سے لپٹ گیا۔ جارجی تو اس کے بعد جیسے قلابے کا راستہ ہی بھول گیا تھا۔ جب دیکھو، پیرو کے پاڑے پر بیٹھا نظر آتا۔ دینا اور راجن بھی زیادہ وقت وہیں گزارتے تھے اور بنارسی بھی۔ پیرو کے خلاف کوئی نئی وضع ایجاد کرنے کے لیے پیرو کے پاڑے سے بہتر جگہ کیا ہو سکتی تھی۔ ہر چند کہ بمبئی آنے کے بعد پیرو کو جم کر پاڑے پر بیٹھنے کا وقت ہی کم ملتا تھا۔ بمبئی آتے ہی کانتے چلا گیا تھا۔ اتنے دنوں باہر رہنے کے بعد گھر والوں کو بھی کچھ وقت دینا چاہیے تھا۔ آخری دنوں میں راجن پر افتاد ٹوٹ پڑی۔ وہ اپنی محبوبہ کے قتل کے الزام میں گرفتار ہو گیا تو پیرو کا زیادہ وقت اندھیری کے پاڑے پر گزرنے لگا لیکن بنارسی، جارجی اور دینا باقاعدگی سے پیرو کے پاڑے آتے رہے اور پیرو کے لیے نت نئے بہانے تراشتے رہے۔ دیوا کے کہنے کے مطابق، کوئی بعید نہیں کہ انہی میں سے کسی نے راجن کی محبوبہ کو چارہ بنا لیا ہو تاکہ ادھر راجن جیل جائے، ادھر پیرو کے روز و

شب منتشر ہوں۔ لازماً پیرو کو اپنے دست نگر پاڑے کی خبر
گیری کے لیے اندھیری کا رخ کرنا چاہیے تھا۔ صرف پاڑے
کی نہیں، اصل واقعے کی چھان بین کے لیے بھی۔ پیرو
اندھیری چلا گیا اور وہ اس کے راستوں پر زاویے آزماتے
رہے۔ آخر ایک دن پیرو ہدف میں آگیا۔ انہیں توقع ہوگی کہ
اس وقت بٹھل یا میں، کوئی بھی پیرو کے ساتھ ہو سکتا ہے۔
ہمیں ایک اطمینان حاصل تھا کہ پیرو سے ہماری وابستگی اور
بمبئی میں ہماری موجودگی کے باعث پہلا شک ہم ہی پر جائے
گا۔ ایک بار ہم پولیس کے نرغے میں آگئے تو باہر ہمارے
خلاف شوشہ طرازیاں کرنے میں وہ پوری طرح آزاد ہوں گے
اور اگر اتفاق سے، پولیس کی نظر چوک گئی اور ہم سامنے کے
آدمی، سامنے کی حقیقت کی طرح اوجھل رہے تو بھی کوئی
مضائقہ نہیں، دوسرے موجود ہیں۔ پولیس ان نامعلوم لوگوں
کی کھوج میں منڈلاتی رہے گی جنہوں نے مبینہ طور پر راجن کی
محبوبہ کا خون کرکے پھندا راجن ہی کے گلے کی طرف بڑھا دیا
تھا۔ دو تین دن کی دوڑ دھوپ سے پیرو، راجن کی گردن
بچانے میں بڑی حد تک کامیاب ہو گیا تھا۔ پولیس کی دانست
میں پھر وہی لوگ پیرو دادا کی دیوار ہٹانے میں سب سے زیادہ
بے چین ہوں گے جن کے خلاف پیرو اندھیری میں گواہیاں
اور ثبوت بٹور رہا تھا۔ گویا سب رل مل جائے گا اور کوئی کسی
نتیجے پر نہیں پہنچ سکے گا۔ جارجی بھی کھلا رہے گا، اس کے
ساتھ سر ملانے والے بھی۔ سبھی کچھ خانوں کے مطابق تھا،
خانے سے باہر کوئی چیز نہیں تھی لیکن وہ بھول گئے کہ بٹھل
دادا زندہ رہ گیا ہے اور یہ سچ اپنی جگہ ہے کہ دادا کا بل صرف
ہاتھ پیر کی پختگی کا نہیں ہوتا، اس کے اور بھی بل ہوتے ہیں۔
دیوا کو اس رات ہمارے تھانے جانے کی خبر تھی لیکن
اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ پولیس کی نظروں میں آنے اور
تھانے جانے کے لیے ہم نے خود پہل کی تھی۔ اسے یہ علم بھی
نہیں تھا کہ ہم تھانے سے اتنی جلدی کیسے واپس آگئے۔
پوری رات بھی ہم نے وہاں نہیں گزاری، بہرحال میں نے
درمیان میں کوئی تائید یا تردید نہیں کی۔ دیوا کم و بیش وہی کچھ
بتا رہا تھا جو بٹھل نے، شکلا نے اور میں نے اخذ کیا تھا۔ دیوا
کے لہجے میں بہت وثوق تھا جیسے وہ ہر واقعے کا شاہد رہا ہو۔
اس کے بیان میں کوئی بے ربطی اور ابہام نہیں تھا مگر جیسے
کسی دور دراز اندیشے نے یکایک اسے آگھیرا، اس کی آواز
ٹھٹک گئی۔ میرے چہرے پر چھائی ہوئی حیرت نے اسے اور
مضطرب کیا۔ چند ثانیوں کے سکوت کے بعد وہ اضطراری
انداز میں بولا کہ ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں۔ ممکن ہے، یہ
سب کچھ ان کے وہم و قیاس پر مبنی ہو اور اس طرح نہ پیش
آیا ہو، سو انہیں اس پر ایسا اصرار بھی نہیں ہے۔

میری آنکھیں بہت جل رہی تھیں۔ یقیناً جارجی کے
ساتھ گوا سے آئے ہوئے اس کے دوست وکی اور ٹامی ہی
نہیں ہوں گے۔ شہر کے مختلف داداؤں کی پشت پناہی کے
اعتماد کے بغیر وہ اتنی بڑی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی بیوی
ماری نے بنارسی کا نام نہیں لیا تھا مگر ایک خانہ دار عورت کو
اپنے شوہر کے بیرون خانہ معاملات و مشاغل کے بارے میں
کتنا کچھ معلوم ہو سکتا تھا۔ بعد میں جب جارجی نے ساحل پر
اڈا کھولا تو ماری کو کاؤنٹر پر بٹھا دیا تبھی بہت سی حیران کن
حقیقتیں اس پر منکشف ہوئیں۔ ماری کس کس کا نام لیتی۔
ایک بنارسی کی کیا تخصیص تھی، بنارسی کی طرح وہاں بہت
سے تماش بین دادا آتے تھے۔ ایسی صورت میں خود بنارسی
بھی تو کنارے کنارے رہتا ہوگا۔ ماری نے کسی خاص دادا کا
نام لیے بغیر کہا تھا کہ بمبئی سے پیرو کے جانے کے بعد جارجی کا
دماغ بالکل پھر گیا تھا۔ وہ دن دن بھر، رات رات بھر گھر سے
پاڑے سے غائب رہنے لگا تھا۔ جانے کس کس دادا سے اس
کی آشنائی تھی۔ اڈا کھولنے کے بعد تو اس کے پاؤں زمین پر
ٹکتے ہی نہیں تھے، دادا سے وہ سیٹھ بن گیا تھا۔

میری خاموشی پر جگنو دیوانہ وار بولا "جارجی ابھی ایک
دم پلا تھا سالا، کھوٹا سکہ مافک، پیرو دادا کے نام پر چلتا تھا، اتنا
آگے کو کبھی نئیں جا سکتا تھا۔" جگنو کہنے لگا کہ بے شک ان
کے پاس کوئی ثبوت نہیں لیکن بنارسی تو بجائے خود ایک
ثبوت ہے۔ ان سے زیادہ اسے کوئی نہیں جانتا۔ تمام آدمی جو
آدمی کے قالب میں نظر آتے ہیں، آدمی نہیں ہوتے۔ بعض
جانوروں کو بھی آدمی کا قالب مل جاتا ہے، کہنے لگا۔ ابھی ایک
دن پیچھے کی بات ہے، شام کو تھانے سے لوٹ کے جب بٹھل
ماہم کے پاڑے پر آیا تھا اور آکے اس نے سب کو بتایا کہ
جارجی کی بیوی ماری نے پیرو دادا کے خون کے جرم میں اپنے
شوہر جارجی کو ختم کر دیا ہے تو وہ دونوں وہیں بیٹھے ہوئے تھے۔
یہ سن کے ان کی نظریں سیدھی بنارسی پر گئیں۔ بنارسی پر
سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ اس کا چہرہ لمحہ بہ لمحہ رنگ بدل رہا
تھا۔ جگنو نے مضطربانہ مجھ سے پوچھا کہ کیا میں نے اس وقت
بنارسی کو دیکھا تھا؟

میں نے اسے دیکھا تھا لیکن بٹھل کی زبانی جارجی کا نام
سن کے تو ہر شخص پر سناٹا چھا گیا تھا۔ گزشتہ رات تک جارجی
ان کے درمیان بیٹھا پیرو کے سوگ میں ٹسوے بہا رہا تھا۔
جگنو کی نظریں تائید طلب تھیں۔ میں نے غیر ارادی طور پر

اثبات میں سر ہلا دیا۔ جگنو کے لہجے میں اور تندی آگئی۔ کہنے
لگا کہ بنارسی کیسا پاگل بنا ہوا تھا۔ بٹھل کے پاڑا چھوڑنے
کے اعلان پر سب سے زیادہ وحشت کا اظہار بھی وہی کر رہا
تھا۔ جگنو کی زبان اس کے قابو میں نہیں رہی۔ وہ بنارسی کو
مغلظات سنانے لگا پھر دیوا نے اشارہ کیا ہوگا، وہ بوکھلا سا گیا
اور اس کی آواز ایک دم ماند پڑ گئی، لجاجت سے بولا "اپن کو
اکھا ابھی، ابھی ایسا ہی جان پڑتا ہے دادا!"

انہوں نے یہی کہا تھا کہ اگر انہیں بنارسی کے پاس مجھے
بھیجنا مقصود ہوتا تو صرف پیرو دادا کا حوالہ کافی تھا لیکن شدت
بیان میں انہیں خیال نہیں رہا کہ وہ کس بات سے مسلسل
اجتناب کر رہے تھے، یہ کوتاہی ان سے سرزد ہو گئی تھی۔ اتنا
کچھ جان کے تو اب مجھے سیدھے بنارسی کی طرف جانا چاہیے
تھا۔ میرا دل یہی کہہ رہا تھا، جسم و جاں میں بار بار تلاطم سا
اٹھتا کہ اب دیر کی کیا ضرورت ہے؟ میری آنکھوں میں اترتا
ہوا خون جگنو اور دیوا کی بے چین نظروں سے چھپا نہیں رہا
ہوگا۔ وہ بہت شکستہ نظر آرہے تھے، لٹے لٹے سے۔ دونوں بد
حواسی سے مجھے دیکھتے رہے اور چپ بیٹھے رہے۔ اپنی خاموشی
انہیں پہاڑ لگ رہی ہوگی۔ آخر جگنو بے بسی سے بولا "دادا!
اپن ابھی کیا بولے، اوپر والا اکھا جانتا ہے، اپن ایک دم سچ
بولنے کا ہے، پر ابھی اپن سے کوئی غلطی ہو گیا ہو تو۔۔۔"

اس سے پہلے کہ دونوں اور بے حال ہوتے، میں
چبوترے سے اٹھ گیا۔ وہ بھی ہڑبڑا کے کھڑے ہو گئے۔

میرا رخ بنارسی کے پاڑے کی طرف نہیں تھا۔

کچھ ہی دور جا کے میری رفتار معتدل ہو گئی، یہ غالباً اپنے
فیصلے کی درستی کا اطمینان تھا۔ پیرو کی موت کے حوالے سے
انہوں نے اگر بنارسی کے متعلق کوئی اشارہ کیا تھا تو وہ صرف
میری استواری کے لیے۔ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ میں
ان سے ان کی آگ ہی چھین لوں، اس کے بغیر ان کے پاس
کیا رہ جاتا۔ مجھے باور کرنا چاہیے تھا کہ انہوں نے اپنے لیے
ایک دشوار راستہ منتخب کیا ہے۔ دوسری صورتیں تو ان کے
لیے بہت آسان تھیں۔ ان کا ارادہ ہی تو انہیں زندہ رکھے
ہوئے تھا۔ اس ارادے کے بہت سے نام ہیں۔ یہ آدمی کو
آدمی سے اور آدمی کو جانور سے ممیز کرتا ہے۔

دونوں میرے ساتھ چلتے رہے۔ اب اس تکرار سے بھی
کیا حاصل ہوتا کہ میں انہیں سردست اپنے ساتھ پیرو کے گھر
نہ چلنے پر زور دوں اور کہوں کہ بس کچھ دن کے لیے اور ٹھہر
جاؤ۔ اس صورت حال میں تمہارا میرا ساتھ جانا مناسب
نہیں ہے۔ میں نے ان سے کچھ نہیں کہا۔

اندھیرا اور سمٹ گیا تھا۔ ہم بڑی سڑک سے آگے
اقامتی علاقے میں داخل ہوا چاہتے تھے کہ جمرو اور شامو نکڑ
پر نظر آگئے۔ انہوں نے بھی مجھے اسی لمحے دیکھ لیا۔ دونوں
اچھل پڑے اور بے تحاشا میری جانب دوڑے "لاڈلے!"
جمرو نے کسی پاگل کی طرح مجھے دبوچ لیا "کہاں، کہاں کو کھو گیا
تھا بھیا؟" وہ اکھڑی ہوئی سانسوں سے بولا۔

دونوں نے ایک سانس میں کتنے ہی سوال کر ڈالے۔
میں ابھی کوئی جواب نہیں دے پایا تھا کہ ان کی نظریں میرے
پہلو میں کھڑے ہوئے جگنو اور دیوا پر پڑیں۔ دیوا کے چہرے کا
زخم دیکھ کے اس کی وحشت اور سوا ہونی چاہیے تھی۔ شامو
میرے بازو ٹٹولنے لگا "کیا بات ہے لاڈلے! سب ٹھیک تو
ہے؟"

"ہاں، ہاں۔ کوئی ایسی بات نہیں" میں نے بہ عجلت
انہیں سمجھانے کی کوشش کی "کوئی جھگڑا وگڑا نہیں ہوا۔ کچھ
نہیں ہے۔ یہ دیوا جو ہے، اسے چوٹ لگ گئی تھی۔ ساری
رات بس ایسے ہی گزر گئی۔"

"ساری رات لاڈلے؟" وہ حیرت سے بولا۔

گھر زیادہ دور نہیں رہ گیا تھا۔ انہوں نے دائیں بائیں
طرف سے میرے بازو جکڑ لیے اور جو میں جانتا تھا، شامو وہی
بتانے لگا کہ کوئی بھی رات بھر ایک پل نہیں سو سکا۔ وہ رات
گئے تک تو میرا انتظار کرتے رہے پھر گھر سے مختلف سمتوں
میں نکل کھڑے ہوئے۔ ابا جان کی موٹر بھی رات بھر سڑکوں پر
گھومتی رہی۔ وہ ماہم کے پاڑے پر بھی گئے۔ کیلاش اسپتال
میں تھا اور گو کہ انہوں نے وہاں میرے بارے میں کچھ نہیں بتایا
لیکن رما کھٹک گئی۔ رما نے اپنے بھائی کو فون کر دیا۔ وہ ڈیوٹی
چھوڑ کے اپنی موٹر میں گھر آگیا اور شامو کے کہنے کے مطابق
کیلاش اب بھی میری تلاش میں نکلا ہوا تھا۔ چند دنوں کی
بات تھی، پیرو بھی اس رات اسی گھر سے نکلا تھا۔ صبح اس کی
لاش آئی۔ پیرو کے ساتھ تو ماچی بھی تھا۔ میں نے تو بالکل
اکیلا تھا اور کسی سے کچھ کہہ کے بھی نہیں گیا تھا۔ مجھے
اندازہ تھا کہ وہ سب کیسے کیسے اندیشوں سے دوچار ہوئے
ہوں گے۔ میں جمرو اور شامو سے کیا عذر پیش کرتا، ان کا
ہذیان سنتا سر جھکائے بڑھتا رہا۔

دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ دربان باہر ہی ٹہل رہا تھا۔ ابا
جان، منیر علی، مولوی اکرم اور بٹھل سب کے سب
باہر سبزے پر موجود تھے۔ برآمدے میں لوہے کی جالیوں کے
پیچھے جوگین، گیتا، فرخ، فریال، چمپا بیگم اور گیتا کی ماں رانی کے
جلتے بجھتے چہرے بھی مجھے نظر آئے۔ میری زندہ سلامت واپسی

ان کے لیے کسی کرشمے کے مانند ہوگی۔ جیسے ہی ان کی نظریں مجھ پر پڑیں' ایک شور سا اٹھا۔ سب بے تابانہ میری طرف لپکیں اور انہوں نے مجھے گھیرے میں لے لیا۔ فرخ' فریال تو بری طرح مجھ سے چمٹ گئی تھیں۔ ان میں گیتا بھی تھی۔ وہ نہ جانے کب سے خود کو روکے بیٹھی تھی کہ میرے پہلو سے لگی ہوئی ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ میرے ہاتھ پیر شل ہوگئے۔ کچھ سجھائی نہیں دیا کہ ان سے کیا کہوں' انہیں کیا بتاؤں کہ میں کہاں تھا۔

منیر علی سجدے میں چلے گئے تھے' مولوی اکرم زور زور سے دعائیں پڑھنے لگے۔ کسی نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا شاید اس لیے کہ پہلے انہیں میری موجودگی کے یقین کے لیے کچھ مہلت درکار تھی۔ میں بت کے مانند ان کے درمیان خاموش کھڑا تھا۔ ابا جان نے یقیناً میری بے بسی محسوس کرلی تھی' جبھی انہوں نے گیتا' فرخ اور فریال کو میرے پاس سے ہٹادیا اور مجھ سے کہا کہ اندر جاکے لباس تبدیل کرلو۔ مجھے اپنے لباس کی شکستگی کا دھیان ہی نہیں رہا تھا۔ ایک رات میں کپڑے کیا سے کیا ہوگئے تھے۔ سوکھی کیچڑ سے پائنچے کالے کالے' گریبان اور آستینوں پر جابجا دیوا کے خون کے دھبے پڑے ہوئے تھے' بہتر یہی تھا کہ میں اندر چلا جاؤں۔ اس طرح میں ان کے سوالوں سے بھی بچ سکتا تھا۔ میں نے جلدی سے برآمدے کی طرف قدم بڑھادیے۔ برآمدے کی سیڑھیاں طے کرکے اپنے کمرے میں جاتے جاتے یکایک مجھے جگنو اور دیوا کا خیال آیا۔ میں نے سوچا' پہلے اندر جاکے حلیہ ٹھیک کرلوں لیکن میں پلٹ کے پھر نیچے آگیا۔ وہ ایک کونے میں دبکے کھڑے تھے۔ میرے وہاں سے ہٹنے کے بعد سبھی کی نظریں ان پر مرکوز تھیں "یہ جگنو اور دیوا ہیں" میں نے سیدھے بٹھل کے سامنے جاکے کہا "چھنگا دادا کے باڑے پر یہ... ان کے ساتھ..."

بٹھل کی آنکھیں دہک رہی تھیں۔ مجھ سے آگے کچھ نہ کہا جاسکا۔ جگنو اور دیوا جیسے بس اشارے کے منتظر تھے' انہوں نے جھپٹتے ہوئے بٹھل کے پیر پکڑلیے "کیا ہے رے!" یقیناً بٹھل کو ان کی مستعدی ناگوار گزری ہوگی۔ میری طرف سے بھی کچھ کم غبار نہیں بھرا ہوگا۔ اس نے ٹھوکر مار کے انہیں خود سے دور کردیا۔

جگنو اور دیوا وہیں سبزے پر سکڑے سمٹے بیٹھے رہے' کانپتے ہوئے سے۔ انہیں اٹھنے کا بھی یارا نہیں تھا۔ میں نے اپنے اوسان مجتمع کیے اور کہا "یہ اب یہیں رہیں گے" میں نے بہت کوشش کی تھی لیکن اپنے لہجے کی تندی میرے اختیار میں نہیں تھی۔ اور خود مجھے ایسا لگا جیسے میں نے کوئی بہت ناروا اور بے محل بات کہہ دی ہے۔ میں نے بٹھل کا ردعمل دیکھنے کے لیے سر نہیں اٹھایا اور وہیں سے برآمدے کی طرف مڑ گیا۔

کمرے میں' میں اکیلا آیا تھا' میرے پیچھے جمرو اور شامو بھی آگئے۔ چند لمحوں بعد مارٹی اور ٹنگو بھی۔ وہ ان دونوں کو تنہا چھوڑ آئے تھے۔ "ان کا خیال رکھنا ہے جمرو بھائی!" میں نے جمرو سے کہا۔

"کون ہیں یہ لیچڑ سے؟"

"اپنے ہی آدمی ہیں۔"

"کانجی ہاؤس کی طرف کو نکل گیا تھا کیا؟"

"ایسا مت کہو" میں نے ترشی سے کہا "کسی کے بارے میں کچھ جانے بغیر ایسا نہیں کہتے۔"

"بالکل چڑی مار ہیں' ایمان سے۔"

"بہت لٹے ہوئے ہیں وہ۔"

"یہ تو اندھا بھی ٹیپ لے گا' پر تو کدھر سے اٹھالایا ان کو؟"

"راستے میں مل گئے تھے۔"

"پہلے سے جان کاری تھی کیا؟ اپنے کو اسی کھونٹے کے جان پڑتے ہیں۔"

"ہاں' یہیں کے ہیں" میں نے دھیمی آواز میں کہا "بٹھل بھائی بھی انہیں جانتے ہیں' ذرا ذہن پر زور دیں گے تو انہیں یاد آجائے گا۔"

"پر بات کیا ہے؟"

"لمبی بات ہے جمرو بھائی! چھپانے کی نہیں ہے مگر اس وقت کچھ مت کہو۔ بس تمہیں ان کا خیال رکھنا ہے' بھائیوں کی طرح۔ یہ میری تم سے' تم سب سے التجا ہے۔ میں انہیں یہاں لانا نہیں چاہتا تھا لیکن شاید اس کے بغیر کوئی..."

جمرو' شامو' مارٹی اور ٹنگو متردد نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے کہ فرخ کی آواز پر سب چونک پڑے۔ فرخ اندر نہیں آئی۔ دروازے ہی پر اس نے میرے لیے جمرو کو کپڑے دے دیے "پہلے نہالے لاڈلے! پہچان میں نہیں آرہا اپنے کو' پھر کچھ دیر کو سولینا" جمرو نے کپڑے میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا "میں ذرا باہر جاکے ان کو دیکھتا ہوں۔"

جمرو کے ساتھ مارٹی' شامو اور ٹنگو بھی باہر نکل گئے۔ سارے جسم میں چپ چپاہٹ سی ہورہی تھی۔ ان کے جاتے ہی میں نے غسل خانے کا رخ کیا۔ پانی بھی کیا چیز ہے' آدمی کو نیا کردیتا ہے۔ کپڑے بدل کے میں باہر آیا تو جسم کا کوئی وزن نہیں لگ رہا تھا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ دیر تک تو میں بستر پر کروٹیں بدلتا رہا' پھر ایسی آنکھ لگی کہ کچھ ہوش ہی نہیں رہا۔

اور کمرے میں کوئی نہیں آیا یا مجھے خبر نہیں ہوئی۔ میری آنکھ کھلی تو میں نے حیرت سے دیوار پر لٹکی ہوئی گھڑی دیکھی۔ ساڑھے تین بج رہے تھے۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا لیکن گھڑی بند نہیں تھی۔ کمرے میں دھیمی دھیمی روشنی تھی۔ دونوں کھڑکیوں کے پردے گرے ہوئے تھے۔ سامنے کا دروازہ بھی بند تھا اور اس کا پردہ بھی گرا ہوا تھا۔ میں نے بستر سے اٹھنے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کی۔ تین چار چھپکے مار کے میں نے تولیا سے منہ خشک کیا اور باہر نکلنے ہی والا تھا کہ انہیں میرے جاگنے کی خبر ہوگئی۔ فرخ اور شہ پارہ نے پہلے دروازے سے جھانک کے میرے جاگنے کی تصدیق کی پھر جھجکتی ہوئی اندر چلی آئیں۔ ان کے چہرے کھلے ہوئے تھے۔ وہ کھانے کے لیے پوچھنے آئی تھیں اور ان کے کہنے کے مطابق' دوپہر کو سب نے وقت پر کھانا کھالیا تھا لیکن بٹھل کی ہدایت پر مجھے نہیں جگایا گیا۔ اب مجھے واقعی بھوک لگ رہی تھی' ان کی ترغیب سے اور چمک اٹھی۔ میری ہاں پر نہ جانے کیوں وہ بہت خوش ہوئیں اور لپکتی جھپکتی واپس چلی گئیں۔ دوسرے ہی لمحے مجھے جگنو اور دیوا کی طرف سے بے کلی ہوئی اور بے ارادہ میرے قدم باہر کی جانب اٹھ گئے۔ گھر میں ایسی چہل پہل نہیں تھی۔ سہ پہر کے وقت یوں بھی سارے گھر کچھ اداس سے ہوجاتے ہیں۔ جمرو' شامو' مارٹی میں سے کوئی بھی مجھے نظر نہیں آیا۔ کونے ہی پر بیٹھک تھی' وہاں بٹھل کی موجودگی کا امکان تھا۔ اندر سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ شاید بٹھل بھی نہیں ہے؟ یہ جاننے کے لیے میں کمرے میں داخل ہوگیا تو میرے پاؤں ٹھٹک کے رک گئے۔ سامنے گدیلے پر بٹھل کروٹ سے لیٹا ہوا تھا اور صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس جگنو اس کے پیر دبا رہا تھا۔ کمرے میں ان دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ مجھے دیکھ کے جگنو منتشر ہوگیا۔ اس سے پہلے کہ بٹھل کروٹ بدل کے دیکھتا' میں نے اشارے سے جگنو کو خاموش رہنے اور اپنا کام جاری رکھنے کی تاکید کی اور دبے قدموں لوٹ آیا۔ ایک پہر میں جگنو کا رنگ ہی بدل گیا تھا۔ مجھے اپنی بینائی پر شبہ ہورہا تھا۔ لوگ سچ کہتے ہیں' بعض مناظر آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتے ہیں' مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں نے کوئی منزل سر کرلی ہے۔

وہ ابھی کمرے میں واپس نہیں آئی تھیں۔ کوئی دس منٹ گزر گئے۔ پھر.. آئیں تو بھرے ہوئے طشت ان کے

ہاتھوں میں تھے۔ شہ پارہ نے فرش پر چٹائی بچھادی اور دسترخوان بچھادیا "ارے شہ پارہ!" میں نے تعجب سے کہا "ایک آدمی کے لیے اتنا لاؤ لشکر!"

"ایک آدمی کیوں، ہم دو بھی تو ہیں" شہ پارہ شگفتگی سے بولی۔

"کیا مطلب؟ تم لوگوں نے کھانا نہیں کھایا؟"

"اس وقت کچھ جی نہیں چاہ رہا تھا" شہ پارہ کے بجائے فرخ نے بدبداتے ہوئے جواب دیا۔

وہ نیچی نظریں کیے تن دہی سے پلیٹیں اور قابیں رکھتی رہیں۔ شہ پارہ کھنکتی آواز میں بولی "ناشتا بھی تو بہت دیر سے کیا تھا۔"

"اب بسم اللہ کیجئے بابر بھائی، کھچڑی ویسے ہی ٹھنڈی ہوگئی ہے" فرخ کی آواز امی کی آواز سے بہت ملتی تھی۔ کھانا چن جانے کے بعد وہ ہمیں پکارتی رہتی تھیں، ارے بھئی آجاؤ! کھانا مٹی ہوجائے گا۔ وہی لب ولہجہ، لفظوں کی وہی نشست وبرخاست، جیسے امی کی روح فرخ میں مجسم ہوگئی ہو۔

فرخ کے دوبارہ ٹوکنے پر میں نے جلدی سے ہاتھ بڑھایا۔ کھانا اقسام میں اتنا زیادہ نہیں تھا جتنا مقدار میں تھا۔ مونگ کی دال کی کھچڑی، آلو کا رائتہ، بھنڈی قیمہ اور روٹیاں، سرکے کا اچار بھی تھا۔ سب کچھ بہت لذیذ تھا۔ ہاں اگر کچھ بے ذائقہ تھا تو وہ خاموشی تھی۔ اسے دور کرنے کے لیے میں نے اٹکتی زبان سے کہا "گھر میں کچھ سناٹا سا نہیں ہے کیا؟"

"بہت ہے" شہ پارہ یاسیت سے بولی "گھر میں لوگ بھی کم ہیں، اور جو ہیں وہ آرام کررہے ہیں۔"

میں تو بالکل بھول گیا تھا کہ سب رات بھر کے جاگے ہوئے ہیں۔ فرخ نے مجھے بتایا کہ اباجان، منیر علی اور مولوی اکرم ناشتے کے بعد گھر سے نکل گئے تھے اور کہہ گئے تھے کہ اب شام ہی کو واپسی ہوگی نیز جولین اور چمپا بیگم مارٹی کے ساتھ اپنے گھر کی طرف گئی ہیں۔ وہ بھی شام تک آنے کا کہہ گئی ہیں۔ جمرو، شامو وغیرہ پیچھے والان میں سورہے ہیں۔ صبح ڈاکٹر کیلاش نے از سرنو دیوا کی مرہم پٹی کردی تھی۔ مجھے ڈھونڈتا ہوا کیلاش کوئی نو بجے واپس آیا تھا اور گیارہ بجے تک میرے جاگنے کا انتظار کرتا رہا۔"

میں نے ندامت کا اظہار کرنا چاہا لیکن ان دونوں کے سامنے جواز پیش کرنے سے حاصل بھی کیا تھا، میں چپ رہا۔

"گیتا کا برا حال تھا، رات بھر روتی رہی" شہ پارہ ڈوبے ہوئے لہجے میں بولی "آپ کو دیکھ کے اس کے چہرے پر کچھ اجالا سی آئی ہے۔"

میں کیا وضاحت کرتا، انہیں بھی احساس ہوگیا کہ رات کا ذکر میرے لیے وحشت اور خجالت کا باعث ہوسکتا ہے۔ شاید اسی لیے انہوں نے کوئی اور لفظ نہیں کہا، جلدی جلدی برتن سمیٹے اور کمرے سے چلی گئیں۔ میں پھر تنہا رہ گیا اور کھلی آنکھوں سے دیواریں تکتا رہا اور اپنے آپ کو بھی۔ آدمی کبھی خود سے بھی اوجھل ہوجاتا ہے اور اپنی تلاش میں بھٹکتا رہتا ہے۔

میں نے اسی شام جمرو اور شامو کو دیوا اور جگنو کے بارے میں بہت کچھ بتادیا۔ میں نے بنارسی کا ذکر نہیں کیا بلکہ ان سے بہانہ بنایا کہ کرشنا جی کے جدا ہوجانے کے بعد جب مجھے ایک پاڑے کی ضرورت تھی اور میں نے چنگا دادا کا پاڑا حاصل کرلیا تھا تو جگنو اور دیوا نے میرا بہت ساتھ دیا تھا۔ میں نے اس وقت ان سے وعدہ کیا تھا کہ جو کچھ مجھے آتا ہے، انہیں ضرور سکھاؤں گا۔ لیکن پھر وقت ہی نہیں ملا، ہمیں بمبئی سے جانا پڑا۔ پھر ہم لوگ تبت چلے گئے۔ جگنو اور دیوا اس دوران میں مجھے شہروں شہروں ڈھونڈتے رہے۔ وہ بہت اندھیروں میں گھرے ہوئے تھے اور انہیں میری ضرورت تھی۔ دنیا میں آدمیوں کی کمی نہیں ہے لیکن کبھی ایک آدمی دوسرے آدمی سے ایسا بندھ جاتا ہے، دوسرے پر ایسا تکیہ کرلیتا ہے کہ کسی اور کی طرف نہیں دیکھتا یا کسی اور جانب اسے کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ وہ شدت سے میری بمبئی واپسی کے منتظر تھے۔

مجھے جمرو اور شامو کو کچھ نہ کچھ تو ضرور بتانا تھا۔ گزشتہ رات اپنی گمشدگی اور دیوا اور جگنو کو ساتھ لانے کے بارے میں وضاحت ضروری تھی۔ میں خاموش رہتا تو بے شک وہ میری خاطر کچھ پوچھنے پر اصرار نہ کرتے لیکن پھر جگنو اور دیوا کے لیے ان کے رویے میں مغائرت سی رہتی۔ میں نے انہیں بتایا کہ ہمارے بمبئی آنے کی خبر جگنو اور دیوا کو چوتھے پانچویں روز ہوگئی تھی۔ مگر ساتھ ہی انہیں کانتے کے رخصت ہوجانے کی اطلاع ملی۔ انہیں کانتے سے میرے اور ہم سب کے رشتے کا علم تھا چنانچہ وہ ٹھہرے رہے کہ ذرا کانتے کی افتاد کا صدمہ کم ہو اور مجھے یک سوئی نصیب ہو تو میرے پاس آئیں اور اپنے زخم دکھائیں۔ وہ مسلسل میری ٹوہ میں رہے۔ کانتے کے ٹھیک دس دن بعد پیرو چلا گیا۔ اس لیے انہیں اب کچھ اور انتظار کرنا تھا تاہم کل رات ان کے بہ قول ان کی قسمت نے یاوری کی اور میں انہیں تنہا نظر آگیا۔ ان سے برداشت نہیں ہوا۔ وہ میرے پیروں پڑگئے۔ پھر اتفاق سے دیوا ٹھوکر کھاکے گرپڑا۔ بس یوں دیر ہوتی چلی گئی۔

میں نے مزید کچھ نہیں کہا اس لیے کہ مجھے اور کچھ نہیں کہنا تھا۔ جمرو اور شامو نے بھی دیوا اور جگنو سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی ہوگی اور مجھے یقین تھا کہ انہوں نے بھی یہی کچھ بتایا ہوگا۔ انہوں نے نولکھی اور پھول وتی کا تذکرہ نہیں کیا ہوگا، بنارسی کا بھی نہیں۔ اگر شامو اور جمرو کی جستجو اتنی عذر خواہی کے بعد بھی کم نہیں ہوئی تو یہ ان کا قصور تھا۔ انہیں سمجھنا چاہیے تھا کہ باقی ناگفتنی ہوگی، باقی پندار کی بات ہوسکتی ہے۔ انہیں خاطر جمع رکھنی چاہیے کہ میں یوں ہی کسی کو سڑک سے اٹھا کے گھر نہیں لے آیا ہوں۔ وہ ضرور اس کے حاجت مند ہوں گے" وہ بہت دکھی ہیں۔ جمرو بھائی!" میں نے جمرو سے کہا۔

"اپنے کو بھی تھوڑا بہت دکھائی دیتا ہے لاڈلے!"

میں نے عاجزی سے کہا "انہیں سنبھالنا تمہی کو ہے۔ میں بھی اپنی سی کوشش کروں گا۔ وہ کچھ سیکھنا چاہتے ہیں۔"

"کیا، کیا سیکھنا۔۔؟"

"یہی جو، جو مجھے اور تمہیں آتا ہے" میں نے جھجک کے کہا۔

"دادا بننے کو بولتے ہیں کیا؟"

"ہاں جمرو بھائی!"

"پر کیوں لاڈلے!" شامو بے رخی سے بولا۔

"کچھ ایسا ہی ہے۔"

"تم نے بولا نہیں، اس میں کیا دھرا ہے سالا۔"

"بہت کچھ کہا" میں نے آہستگی سے جواب دیا "لیکن ان کی یہی خواہش ہے اور ایسی غلط بھی نہیں ہے۔"

"تو بھی یہی بولتا ہے؟" میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

جمرو نے ماتھے پر ہاتھ مارا "اپنے کو کچھ پلے نہیں پڑرہا۔"

میں نے الجھ کے کہا "دادا بننا چاہتے ہیں اور بس۔۔!"

"ٹھیک ہے، پر لاڈلے!" شامو کچھ کہتے کہتے رہ گیا اور جمرو کی طرف دیدے نچاتے ہوئے بولا "دیکھا جمرو بھائی! ہم کیا بولے تھے! خالی نہیں ہیں، پٹلیا دبائے ہوئے ہیں بھیتر۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم؟" میں نے تندی سے کہا۔

"اس کا مطلب ہے" جمرو بل کھاکے بولا "اندر بہت کچھ چھپائے ہوئے ہیں۔ گانٹھ لگی ہے اندر میں۔"

"ہاں! شاید یہی کچھ ہے۔"

دونوں متوحش نظروں سے مجھے دیکھتے رہے پھر شامو مضطرب ہوکے بولا "ایسا ہے تو اپنے لوگ میں سے کوئی کام نہیں آسکتا؟"

جمرو نے اسے جھڑک دیا "کیا سالا چمار پنے کی بوتا ہے، یہ بات تو لاڈلے نے پہلے ہی ان کو بولی ہوگی، کیوں لاڈلے؟"

"ہاں! میں نے ان سے کہا تھا۔"

دیر تک دونوں گم صم رہے اور جیسا کہ مجھے توقع تھی، انہوں نے میری ناراضگی کے خیال سے مزید کسی تردد اور تکدر کا اظہار نہیں کیا۔ جمرو نے موضوع بدل دیا اور معنی خیز لہجے میں بولا "لگتے اصیلے ہیں لاڈلے!"

"اڈوں پاڑوں سے ان کا کچھ نہ کچھ واسطہ رہا ہے۔"

"سچ، سویرے تو بہت مردار دکھائی پڑتے تھے، ایک دم چونگھٹ۔" جمرو پلکیں پٹپٹاتے ہوئے بولا "پر ایسا نہیں ہے، پورے پکے ہوئے ہیں۔"

"اتنی جلدی کوئی رائے قائم نہیں کرنی چاہیے۔"

"اپنے کو بولو، کیا کرنا ہے لاڈلے!" شامو تیزی سے بولا۔

"کچھ نہیں، بس ان کا خیال رکھنا ہے۔ میں نے کہا نا، میں تو اپنی سی کروں گا ہی، کچھ تمہیں بھی ان پر نظر رکھنی ہے۔ اچھی طرح۔ تھوڑا بہت جانتے ہیں وہ، لیکن سرے سے چلنا ہوگا۔"

"پر دیری بہت ہوسکتی ہے لاڈلے!"

"انہیں اس کی فکر نہیں ہے۔"

"ایسی دیری بھی نہیں لگے گی جمرو بھائی!" شامو مچل کے بولا "استاد بولتا ہے، یہ تو سالا سب اپنے پہ ہے۔ لگی ہوئی کی ساری بات ہے۔"

"ان کے ہاں اس کی کمی نہیں ہے۔"

"پر زیادہ لگی ہوئی بھی ٹھیک نہیں ہوتی" جمرو کے کہا۔ "آدمی خود جھلس جاتا ہے کبھی۔"

جمرو ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں نے تبصرہ نہیں کیا کہ پھر کوئی ملال بھی نہیں ہوتا۔ آدمی کو یہ سکون تو رہتا ہے کہ اس نے اپنے سارے اختیار تمام کیے تھے، ہم اطراف کی گلیوں میں ٹہلتے ہوئے جلد ہی گھر لوٹ آئے۔ مارٹی اور ٹنگو ہمارے ساتھ ہوتے تو اور اچھا تھا لیکن مجھے اطمینان تھا کہ جمرو اور شامو اب دیوا اور جگنو کے لیے ان سے خود ہی کچھ کہہ سن لیں گے اور بٹھل کے سامنے زبان کھولنے کی ابھی ایسی ضرورت نہیں تھی۔ جگنو اور دیوا کی سوختہ جانی اس کی نظروں سے چھپی نہیں رہنی چاہیے۔ جگنو اور دیوا کی بے زبانی بھی تو کچھ کہے گی۔

سبھی لوگ گھر آچکے تھے۔ اباجان، منیر علی، مولوی اکرم، جولین اور چمپا بیگم وغیرہ۔ مارٹی اور ٹنگو بھی موجود تھے۔ جگنو اور دیوا بھی تھے۔ اب وہ گھر میں ایسے اجنبی نہیں لگ رہے

تھے۔

کھانے سے پہلے کیلاش آگیا۔ اس نے آتے ہی مجھے گلے سے لپٹالیا اور زور زور سے بھینچتا رہا۔ میں نے معذرت کرنی چاہی کہ گزشتہ رات اسے میری وجہ سے خواہ مخواہ اتنی زحمت اٹھانی پڑی۔ وہ مجھ سے خفا ہونے لگا کہ یہ میں کیسی باتیں کررہا ہوں۔ وہ آج بھی اس کے ساتھ نہیں آئی تھی۔ میرے استفسار پر کیلاش نے بتایا کہ رما کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے تشویش ہوئی۔ میں نے بیماری کے بارے میں پوچھا تو وہ شانے اچکا کے بولا "گھبرایئے نہیں' وہ خود بھی ایک اچھی ڈاکٹر ہے' اپنا علاج کرسکتی ہے۔"

مجھے شبہ ہوا کہ کہیں رما میرے کسی رویے سے ناراض تو نہیں ہوگئی؟ یا پھر اس کی طبیعت زیادہ خراب ہے اور کیلاش مجھ سے چھپا رہا ہے ورنہ وہ ضرور آتی۔ آج تو بہ طور خاص' میری صحت یابی کی مبارک باد دینے "کوئی خاص بات تو نہیں؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"اوہ' نہیں" کیلاش مستعدی سے بولا "وہی عام بیماری' نزلہ' زکام' بخار' جسم کی ٹوٹن وغیرہ۔ بمبئی کا تحفہ۔ گھر میں خاموشی اور رما کے کمرے کا بند دروازہ دیکھ کے پہلے مجھے بھی خدشہ ہوا تھا کہ رما پھر اپنی پرانی بیماری کی زد پر ہے لیکن شکر ہے کہ ایسا نہیں تھا۔

"پرانی بیماری؟"

"آپ کو نہیں معلوم' اس پر ایسے ہی کبھی کبھی اپنے آپ میں گم ہوجانے کے دورے پڑتے ہیں۔ ہم ڈاکٹر لوگ اسے خود غرضی کی بیماری کہتے ہیں۔"

"یہ کون سی بیماری ہے؟" میں نے چونک کر کہا۔

"ہاں!" وہ مسکرانے لگا "یہ بہت عجیب بیمار ہے' بہت مشکل اور پریشان کن۔ اب دیکھیے نا' آدمی بس اپنے آپ میں ڈوبا رہے' نہ کسی کی سنے' نہ کسی سے بات کرے۔ ساری دنیا سے کٹ کے رہ جائے تو اسے آپ کیا کہیں گے۔ سال میں رما پر دو ایک بار ایسے دورے پڑتے ہیں کہ وہ سب سے بے گانہ ہوجاتی ہے گو یہ کیفیت زیادہ دیر نہیں رہتی لیکن جب تک رہتی ہے' قریبی لوگوں کے لیے کم از کم بہت تکلیف دہ ہوتی ہے۔ آپ اسے ایک ایسی بیماری بھی کہہ سکتے ہیں جو لگتی کسی کو ہے' اذیت کسی اور کو بلکہ اوروں کو ہوتی ہے۔"

مجھے ایسا لگا جیسے کیلاش کنایوں میں بات کررہا ہے' اس کی گفتگو رمزیت سے عاری نہیں۔ ایک مہذب آدمی کا یہی طور ہوتا ہے مگر کیلاش کی آنکھوں میں وہ چمک نہیں تھی جو استعاروں اور کنایوں کے وقت خود بخود نمودار ہوجاتی ہے۔

میں نے فوراً اپنی بدگمانی کی تردید کی تاہم میرے چہرے پر ایک لمحے کے لیے جو دھند سی چھاگئی تھی' وہ کیلاش کی جز بیں نگاہوں سے مخفی نہ رہ سکی۔ وہ کسی قدر مضطرب ہوگیا اور ہونٹ چبانے لگا۔ میں نے اس کی مشکل حل کی اور شائستگی سے کہا "کل میں اس طرف آؤں گا۔"

"ہماری طرف' کیا خوب!" وہ لپکتی ہوئی آواز میں بولا "کس وقت آیئے گا؟ مجھے یقین ہے کہ رما کی آدھی بیماری تو آپ کے آنے سے دور ہوجائے گی' آپ نہیں جانتے' وہ آپ کا کتنا ذکر کرتی ہے اور اس سارے گھر میں خود کو کیسا شامل سمجھتی ہے۔ وہ اپنی بیماری کو برا بھلا کہہ رہی تھی کہ یہ کیسی ناوقت ہے۔ میں نے کہا "بیماری بھی کیا وقت اور اجازت لے کر آئے گی۔ بہرحال اس وقت اسے یہاں آنا تھا مگر اسپتال میں ایک مریض کی حالت نازک تھی' میری کال آگئی۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ اسپتال سے آکے تمہیں لے جاؤں گا لیکن وقت زیادہ لگ گیا اس لیے سیدھا اسی طرف چلا آیا۔ اب گھر واپسی پر مجھے کیسی کیسی تاویلیں پیش کرنی ہوں گی۔۔۔ آپ کو رات کا قصہ معلوم ہے؟"

مجھے جمرو نے بتایا تھا کہ رات وہ کیلاش کے گھر مجھے ڈھونڈنے گئے تھے تو رما بدحواس ہوگئی تھی۔ یہی بات ہوگی' میں نے کیلاش کو نہیں بتایا اور متجسس لہجے میں پوچھا "کیسا قصہ؟"

"کل رات اسے معلوم ہوا کہ آپ گھر نہیں پہنچے ہیں تو اس نے اسی وقت اسپتال فون ملایا اور ضد کرنے لگی کہ میں اسے بھی ساتھ لیتا چلوں۔ میں نے منع کردیا۔ رات زیادہ ہوگئی تھی اور موٹر بھی گھر میں نہیں تھی' میرے پاس تھی ورنہ وہ چل پڑتی۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ رات بھر نہیں سوپائی۔ باربار اسپتال فون کرتی رہی۔ مجھے بھی خیال نہیں رہا' کہیں سے اسے فون کردیتا۔ صبح گھر کے قریب سے گزرتے وقت میں نے سوچا کہ اسے بتاتا چلوں' کپڑے بھی بدل لوں گا۔ میں گیا تو وہ کوریڈور میں کرسی ڈالے میرا انتظار کررہی تھی۔ ٹیلی فون پاس رکھا تھا اور نگاہ دروازے پر لگی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ برسنے لگی کہ کیلی! تم کیسے غیر ذمے دار آدمی ہو۔ اس کی بے چینی دیکھ کے میں نے جھوٹ بولا کہ آپ گھر آگئے ہیں۔ پھر تھوڑی دیر بعد میں دوبارہ گھر سے چل دیا۔ میں نے اس سے بہانہ کیا کہ ایک ایمرجنسی کے سبب مجھے پھر اسپتال جانا ہے وہ شک میں پڑگئی اور مجھے ماں جی کی قسم کھانی پڑی تب اسے یقین آیا۔ شاید یہی وقت تھا' عجیب اتفاق ہے' جب میں نے قسم کھائی تھی' ٹھیک اسی وقت آپ گھر واپس آگئے" وہ ہنس کے بولا "کاش' میں ماں جی کو پہلے ہی داؤ پر لگادیتا۔"

میرے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ پھیل گئی "معلوم نہیں اس آدمی کے لیے یہ امر راحت کا باعث ہے یا کلفت کا جس کے اتنے نگہ دار ہوں۔ وہ آدمی تو بہت مجبور ہونا چاہیے۔ میں سنتا رہا۔ اتنا کچھ کہنے کے باوجود کیلاش نے یہ نہیں پوچھا کہ میں کل رات آخر کہاں کھوگیا تھا۔ اتنے دنوں میں اسے اچھی طرح اندازہ ہوجانا چاہیے تھا کہ اڈے پاڑے کے لوگوں سے ایسی باتیں نہیں کی جاتیں۔ ان سے سوالات کرنے میں احتیاط برتنی چاہیے۔ میں خود بھی کوئی صفائی پیش نہ کرسکا۔

کیلاش رات گئے تک رہا۔ اندر جا کے اس نے گیتا اور رانی کی دل جوئی کی' کچھ دیر ابا جان سے باتیں ہوتی رہیں۔ کھانا بھی اس نے ہمارے ساتھ کھایا۔ چلتے وقت اسے یاد تھا کہ میں نے کل آنے کا وعدہ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ شام کو کسی وقت آؤں گا۔

وعدے کے مطابق دوسرے دن میں اس کے ہاں جانے کے لیے تیار تھا مگر عین وقت جب میں گھر سے نکل رہا تھا' کیلاش کے بھیجے ہوئے ایک آدمی نے آکے مجھے روک دیا۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ کیلاش کے والد کے کسی قریبی دوست کے اچانک انتقال کی وجہ سے سب لوگ پونا چلے گئے ہیں۔

میرا خیال تھا کہ پونا اتنی دور نہیں ہے لہٰذا رات کو کسی وقت کیلاش واپس آجائے گا مگر اگلے دن دوپہر تک اس کی کوئی خبر نہیں ملی تو جولین کو بتا کے میں نے کیلاش کے گھر کا خ کیا۔ جمرو میرے ساتھ تھا' یہی بہتر تھا کہ باہر جانے کی ورت میں گھر کا کوئی نہ کوئی آدمی میرے ساتھ ہو۔

کیلاش کے ہاں اب تک کوئی واپس نہیں آیا تھا۔ ایک ازم سے صرف اتنا معلوم ہوسکا کہ مرنے والا کوئی جج تھا۔ ازم کہنے لگا کہ صاحب بہت بڑے آدمی تھے۔ اسے یہ بتانے ی ضرورت نہیں تھی۔ ظاہر ہے' کسی ایسے ویسے کا تعلق لیلاش کے خاندان سے اتنا گہرا نہیں ہوسکتا۔ لوگ شعوری غیر شعوری طور پر اپنے ہی سے مشابہ لوگوں کی طرف قدم ٹھاتے ہیں۔ ہمارا معاملہ تو ایک استثنا تھا۔ ہم شام سے پہلے گھر لوٹ آئے۔

جولین نے مجھے بتایا کہ پیرو کے دسویں کے بعد سب رگ ابا جان کی نئی خریدی کوٹھی میں منتقل ہوجائیں گے۔ گیتا اور رانی نے آمادگی ظاہر کردی ہے۔ آمادگی کا جولین نے خوب کہا' گیتا اور رانی کے پاس انکار کا حوصلہ ہی کہاں تھا۔ معذور تو بیساکھی اور لاٹھی کے سہارے ہی چلتے ہیں۔ تمام عذر اپنی جگہ کہ اس منتقلی سے گیتا اور رانی کچھ بہل جائیں گی' اتنے لوگوں کی موجودگی میں یہ مکان چھوٹا پڑ رہا ہے' محلے والے جان گئے ہیں کہ اس مکان کا تعلق ماہم بلکہ بمبئی کے سب سے بڑے دادا سے تھا۔ ہر بات اپنی جگہ درست تھی لیکن جانے کیوں مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا' لگتا تھا کہ ابا جان سے کوئی عجلت ہورہی ہے۔ جولین بھی شاید یہی سمجھتی تھی' یہ اطلاع دیتے ہوئے اس کی آواز مرجھائی ہوئی سی تھی۔ میں نے صرف سن لیا۔ میں نے اپنے کسی موہوم گمان کی تائید جولین سے نہیں چاہی' اس نے اس بابت مجھ سے کچھ کہا۔ اس کے کہنے کے مطابق ابا جان نے صراحت کردی تھی کہ وہ اس یک جائی میں سب کی بہتری سمجھتے ہیں۔ ہوسکتا ہے' وہ غلطی پر ہوں' چنانچہ تینوں مکان جوں کے توں برقرار رہیں گے۔ دل جمعی نہ ہونے کی صورت میں جولین' مولوی اکرم' گیتا اور رانی اپنے اپنے گھر واپس جاسکتے ہیں۔ پھر ابا جان ان سے اصرار نہیں کریں گے اور سب خاطر جمع رکھیں کہ ابا جان کی پیشانی پر کوئی شکن نہیں آئے گی۔ ابا جان کو اپنا گھر بہت یاد آتا ہوگا۔ یوں ایک بڑا گھر بسا کے شاید وہ کوئی مداوا کررہے تھے۔

چند ہی دنوں میں جگنو اور دیوا بہت پرانے ہوگئے جیسے برسوں سے وہاں مقیم ہوں اور ہر ایک سے ان کی شناسائی ہو۔ صبح سویرے سے رات گئے تک وہ سارے گھر میں پھرکی کی طرح گھومتے رہتے تھے' اشاروں کے منتظر' ہر ایک کی خدمت کے لیے ہمہ دم تیار۔ بٹھل کے حقے کی تیاری' اس کے جسم کی مالش' ابا جان' منیر علی کے پیر دبانا' گھر کا سودا سلف لانا' بکھری ہوئی چیزیں' جگہوں پر رکھنا' اندر سے چائے لانا' رکابیاں اٹھا کے رکھنا اور کچھ نہیں تو کھڑکیوں کے شیشے صاف کرنا۔ مجھے حیرت تھی کہ گزشتہ چار دنوں میں ایک مرتبہ بھی انہوں نے مجھ سے اپنے بارے میں لب کشائی نہیں کی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انہوں نے پہلی بار کوئی گھر دیکھا ہے اور یہاں آکے سب کچھ بھول گئے ہیں۔ میں نے انہیں نہیں ٹوکا کہ وہ ان کاموں کے لیے یہاں نہیں آئے ہیں۔ انہیں اپنے ہوش و حواس مجتمع کرنے میں کچھ دنوں کی مہلت ضرور ملنی چاہیے تھی۔ یہی سوچ کے میں رہ گیا اور ایک بار تو انہیں یوں گم دیکھ کے میرے جی میں آیا کہ اچھا ہے' اسی طور انہیں قرار آجائے۔ پھر میں بنارسی کے پاس جاسکوں گا۔ بنارسی کے پاس خود جانے کے لیے میرے سینے میں باربار ہوک سی اٹھتی تھی۔ کبھی سوچتا تھا' جگنو اور دیوا کو قائل کرنے کی ایک اور

کوشش کروں کہ انہیں بہت وقت لگ سکتا ہے۔ نئے ماحول میں شاید انہیں اپنے ارادوں پر نظرثانی کا موقع ملا ہو۔ میں انہیں پھول دتی کا واسطہ دوں گا کہ ہر گزرتا لمحہ انہیں پھول دتی سے دور کر رہا ہے۔ ایسا ہی ہے تو میں بنارسی کولا کے ان کے سامنے کھڑا کردوں گا۔ وہ جس طرح چاہیں اس سے بازپرس کریں۔ کوئی درمیان میں نہیں بولے گا لیکن یہ سب میرا قیاس تھا۔ خواہشیں ساون کے اندھے کی طرح ہوتی ہیں۔ اسی رات جمرو نے مجھے بتایا کہ جگنو اور دیوا کو ایسی دیر نہیں لگے گی، ان کی انگلیوں میں لچک، بازوؤں میں پھرتی ہے۔ نگاہوں میں بھی اچھا جماؤ ہے، سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی طلب سچی ہے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا، جمرو اور شامو نے مجھے بتایا کہ جب بھی موقع ملتا ہے، وہ جگنو اور دیوا کو وقت دے رہے ہیں۔ ابا جان کی کوٹھی میں منتقل ہوجانے کے بعد یہ بے ترتیبی ختم ہوجائے گی، پھر کچھ زیادہ وقت مل سکے گا۔ مجھے خیال نہیں رہا کہ گھر کے مشاغل میں جگنو اور دیوا کی شمولیت بھی ان کے مقصد کا ایک حصہ ہے۔ اسی گھر سے ان کا راستہ نکلتا ہے۔ یہاں کے لوگوں کی آسودگی سے ان کی آسودگی مشروط ہے یوں وہ بٹھل کا پتھر بھی موم کر رہے تھے۔ یہ سب جان کے مجھے کچھ سکون ہوا کہ جگنو اور دیوا کا ارادہ ایسا خام اور ناتمام نہیں ہے۔

پیرو کے دسویں پر ابا جان نے خاص اہتمام کیا تھا۔ صبح سے گلی میں شامیانے تن گئے تھے۔ اور دیگیں پکنی شروع ہوگئی تھیں۔ دھوپ نکلنے کے ساتھ ہی سائکلوں کا ہجوم جمع ہونے لگا۔ پاڑے کے لوگوں کو بھی جانے کیسے خبر ہوگئی تھی۔ گیارہ بجے سے مختلف علاقوں کے دادا لوگ آنے لگے۔ سبزے پر دریاں اور چاندنیاں بچھادی گئی تھیں۔ لوگ آکے خاموشی سے بیٹھ جاتے۔ کچھ دیر بعد پانڈے اور بالے دادا کے آنے پر اندر تل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔ پانڈے دادا کے ساتھ ماہم کے پاڑے کے بہت سے لوگ تھے۔ گلیا، بچھی، سکندر، زورا، چھیدا وغیرہ۔ بہت سے لوگ تھے جن کی شکلوں سے میں واقف تھا، ناموں سے نہیں۔ ان میں کتنوں کی آنکھیں امڈ رہی تھیں۔ بٹھل نے خیریت پوچھی تو وہ سسکنے لگے۔ پانڈے دادا تو بہت ہی دل گرفتہ آیا تھا۔ بٹھل سے گلے مل کے وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا "اپن کو معافی دیو دادا!" وہ ہاتھ جوڑ کے بولا "کیدر اپن کو چھوڑ کے چلا گیا۔ ماں قسم، ابھی اپن لوگ سے ایک دم نئیں بیٹھا جاتا اودر۔" ایک پانڈے دادا نے کیا گلہ کیا سب کو زبان مل گئی۔ بٹھل پہلے تو خاموشی سے سنتا رہا پھر انہیں تسلیاں دینے لگا کہ وہ پاڑے پر

ضرور آئے گا، اس دوران میں وہ ایک دوبار کے سوا گھر سے باہر ہی نہیں نکلا، وہ دادا کی ایک چوکی پر نہیں تو دوسری چوکی پر موجود ہے جہاں اس کی ضرورت زیادہ ہے۔ بٹھل نے بکھری ہوئی آواز میں ان سے کہا "وہ اب کدھری کو جائیں دادا!" اس کی مراد گیتا اور رانی سے تھی۔

وہ یہی باتیں کر رہے تھے کہ دروازے پر کھڑے ہوئے لوگ ایک دوسرے کو پیچھے ہٹانے لگے۔ وہ دینا، لال خان اور بنارسی تھے جن کی آمد پر یہ انتشار ہوا تھا۔ بنارسی ان میں سب سے آگے تھا۔ اسے دیکھ کے میرے سارے جسم میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ اردگرد بیٹھے ہوئے لوگوں نے ان کے لیے جگہ بنائی۔ ادھر سے پانڈے دادا نے آواز لگائی "آؤ، آؤ۔ ایدر آکے بیٹھ جاؤ، دیری کردیا اتنا!"

تینوں ٹھس ٹھسا کے بٹھل اور پانڈے کے پاس بیٹھ گئے۔ بنارسی کو میرے سامنے ہی جگہ ملی تھی۔ چند لمحوں بعد اس کی نظر مجھ پر پڑی اور اس نے ہونٹوں اور پلکوں کی جنبش سے مجھے سلام کیا۔ میں اضطراری انداز میں سرہلا کے رہ گیا۔ دوسرے لمحے وہ پانڈے دادا کی طرف متوجہ ہوگیا۔ میرا سر دھمک رہا تھا، کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے جھپٹ کے اس کا گلا دبوچ لوں یا گلیا، بچھی، زورا وغیرہ کو اشارہ کرکے اسے باہر پھنکوادوں یا مجھے خود یہاں سے اٹھ جانا چاہیے۔ میری نظریں اسی پر ٹکی ہوئی تھیں۔ اسے میں نے پہلے کئی بار دیکھا تھا۔ بہت قریب سے بھی لیکن جیسا کہ لوگ کہتے ہیں، دل اور دماغ کے بغیر آنکھ کا دیکھا ادھورا ہے ادھورے سے بھی کم۔ آج سے پہلے میں نے جیسے بنارسی دیکھا ہی نہیں تھا۔ گٹھا ہوا جسم، اتنا کھنچا ہوا نہیں جتنا پھیلا ہوا، ابلی ہوئی آنکھیں۔ سامنے سے سر کے بال اڑجانے کے باوجود پیشانی تنگ تھی اور اس پر چاقو کا نشان واضح تھا گالوں پر بھی ایک دو جگہ کچیاں پڑی تھیں۔ شکل سے چالیس سے کم کا لگتا تھا۔ نشست میں مستعدی، نگاہوں میں بے قراری تھی۔ میں نے سنا، وہ پانڈے دادا سے کہہ رہا تھا کہ پیرو دادا کیا گیا، ساری بمبئی سونی ہوگئی ہے۔ پاڑے پر جی ہی نہیں لگتا، کسی کو بھی دھندے میں مزہ نہیں آرہا۔ کہہ رہا تھا کہ ابھی تک یقین نہیں آتا کہ پیرو دادا ہمیشہ کے لیے جدا ہوگیا ہے۔ لگتا ہے، ہم سب کو دھوکا ہوا ہے۔ کسی دن بھی وہ کہیں سے، کسی دروازے سے چلا آئے گا اور سب کو حیران کردے گا۔ زبان چلانی بھی اسے اچھی طرح آتی تھی۔ کوئی صورت نہیں تھی کہ میں بٹھل کو ٹوک سکوں کہ وہ کتے کی باتوں پر ذرا دھیان نہ دے، یہ بہت بڑا کمینہ

بٹھل کو اگر میں پہلے بنارسی کے بارے میں کچھ بتادیتا تو ٹھیک تھا، پھر بنارسی کی اس غم زدگی پر نہ جانے اس کا کیا تاثر ہوتا مگر اب بھی کچھ مختلف نہیں تھا۔ وہ بہروں کی طرح سنتا رہا۔ اس کی اس بے جنبشی پر بنارسی کو مضطرب ہونا چاہیے تھا۔ اس نے براہ راست بٹھل کو مخاطب کیا "دادا! اپن لوگ کو کچھ بول، ابھی پیرو دادا کا بٹی اور بیوی کے لیے اپن کیا کرسکتا ہے۔ اپن کو بھی تھوڑا شریک کرو۔"

"ٹائم آئے گا تو بول دیں گے رے" مجھے تسلی ہوئی کہ بٹھل کے لہجے میں کوئی اثرپذیری نہیں تھی۔ نتیجتاً بنارسی کو خاموش ہوجانا پڑا۔

کھانے کے وقت تک کچھ اور لوگ بڑھ گئے تھے۔ دسترخوان کی ترتیب کی وجہ سے سب ادھر ادھر ہوگئے اور اچھا ہوا جو بنارسی مجھ سے دور ہوگیا۔ بہت دیر سے میری نگاہیں جگنو اور دیوا کی ٹوہ میں بھٹک رہی تھیں۔ آمنے سامنے وہ مجھے کہیں نظر نہیں آئے۔ صبح سے وہ کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ پاڑے کے لوگوں کو آتا دیکھ کے یقیناً انہوں نے گھر کے اندر رہنا یا کسی طرف نکل جانا ہی مناسب جانا ہوگا۔ سہ پہر تک کھانے کی بیٹھکیں جاری رہیں۔ اندر پاڑے کے لوگ تھے، باہر سائیکلوں کا اژدہام تھا۔ یہ بس آخری دن تھا، اس کے بعد پیرو دادا کے لیے آنا تھا۔ مرا ہوا آدمی جلدی پرانا ہوجاتا ہے۔ رفتہ رفتہ ساری بھیڑ چھٹ جاتی ہے، صرف چند لوگ رہ جاتے ہیں اور رسمیں رہ جاتی ہیں، پھر یہ بھی نہیں رہتا۔ آدمی کا جیسے کبھی کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ اندھیرا ہوجانے پر گھر صرف گھر والوں تک محدود رہ گیا۔ بنارسی آخر تک بیٹھا رہا تھا۔ پانڈے دادا اور ماہم کے پاڑے کے لوگوں کے ساتھ ہی وہ اٹھا اور چلتے وقت بھی بٹھل سے عاجزی کرنا نہیں بھولا۔ کہنے لگا، پاڑے پر بھی پیرو دادا کی بہت سی ولادیں ہیں۔ بٹھل انہیں اس طرح نظرانداز نہ کرے اور بھی بہت کچھ اس نے کہا تھا۔ بٹھل نے جواب میں اس کی کمر پر ہاتھ رکھ کے دروازے کی جانب اشارہ کیا۔ میرے سست دبازو چٹختے رہے۔ بنارسی نے میرے سامنے سے دروازہ عبور کیا۔ میں دیکھتا رہ گیا۔ جگنو اور دیوا رات ہی کو پھر مجھے نظر آئے۔ نہ معلوم انہوں نے دن بھر اپنی روپوشی کا کیا جواز پیش کیا ہوگا۔ اتنے لوگ تھے، ہوسکتا ہے کسی کو ان کی طرف دھیان کرنے کی فرصت ہی نہ ملی ہو۔

میرا جسم ٹوٹ رہا تھا اس لیے میں اول وقت ہی اپنے کمرے میں جاکے لیٹ گیا۔ جولین سے میں نے کہہ دیا کہ میں رات کا کھانا نہیں کھاؤں گا، ہاں کیلاش کے آنے پر مجھے ضرور اطلاع دے دی جائے۔ وہ اس روز بھی نہیں آیا۔ صبح جولین نے مجھے بتایا کہ رات گئے شکلا آیا تھا۔ زیادہ دیر نہیں ٹھہرا اور بٹھل سے مل کے چلا گیا۔ اس کے منع کرنے پر مجھے نہیں اٹھایا گیا۔ صبح باہر نکلنے پر مجھے معلوم ہوا کہ بٹھل گھر میں نہیں ہے، جمرو بھی اس کے ساتھ گیا ہوا ہے۔ رات شکلا کی آمد بے سبب نہیں ہوگی۔ میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ واپس آنے پر جمرو نے مجھے بتایا کہ وہ ابا جان کی موٹر میں پہلے شکلا کے گھر گئے تھے۔ وہاں سے تھانے، پھر کچھ دیر کے لیے عدالت گئے۔ جمرو مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ یہ شکلا کیسا آدمی ہے۔ وہ ایک اجنبی عورت کے لیے کتنا فکرمند ہے۔ کسی طرح بھی وہ پولیس کا آدمی نہیں لگتا۔ میں نے کہا کہ تم نے کرشنا جی کو نہیں دیکھا، وہ شکلا کو کتنا پسند کرتے تھے، اسے انہوں نے ہی تراشا ہے۔ جمرو کے کہنے کے مطابق وہ صبح ہی گھر سے نکل گئے تھے۔ شکلا وکیل کے ساتھ بیٹھا بٹھل کا انتظار کررہا تھا۔ کوئی گھنٹے بھر وہ ایک دوسرے کو دلیلیں دیتے رہے اور طے پایا کہ ماری پولیس میں دیے ہوئے بیان سے منحرف ہوجائے۔ انحراف کا مطلب یہ نہ ہو کہ ماری اپنے شوہر جارجی اور اس کے عزیزوں کے قتل سے یکسر انکار کردے بلکہ اس کے پہلے بیان میں صرف اتنی سی تبدیلی کی جائے گی کہ ماری کے پاس اس رات اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

شکلا کے گھر سے وہ تھانے پہنچے۔ جمرو کو معلوم نہیں تھا، وہاں ماری سے بٹھل کی کیا بات چیت ہوئی۔ اس دوران میں جمرو تھلے کی راہداری میں بینچ پر بیٹھا رہا۔ پھر اس نے ماری کو عدالت میں دیکھا۔ جمرو بتا رہا تھا کہ وہ بالکل گم صم تھی۔ ایسی لٹی پٹی کہ دیکھی نہیں جاتی تھی۔ بکھرے ہوئے بال، وحشت زدہ آنکھیں، گرد آلود چہرہ، تمام وقت وہ گردن ڈالے ہوئے بیٹھی رہی۔ شکلا نہ تھانے آیا تھا، نہ عدالت میں دکھائی دیا، وکیل وہاں پہلے سے موجود تھا۔ بٹھل نے اسے ماری کی حالت سے آگاہ کیا۔ اور کہا کہ ماری سوال وجواب اور بیان وغیرہ کے قابل نہیں ہے۔ وکیل نے کسی تشویش کا اظہار نہیں کیا تھا، کہنے لگا، اس کی خاموشی بہتر ہے۔ اس نے ماری کی طرف سے لکھا ہوا بیان داخل کیا اور عدالت سے درخواست کی کہ اس کی مؤکلہ شدید ذہنی ابتری میں ہے، عدالت فوراً اس کے ڈاکٹری معائنے کا حکم دے اور مناسب علاج کا بندوبست کرے۔ جج نے اس کی درخواست منظور کرلی اور انہماک سے سارے کاغذات کا مطالعہ کرتا رہا۔

بٹھل اور وکیل کی گفتگو سے جمرو کو تھوڑا بہت اندازہ لگانے کا موقع مل گیا تھا۔ وکیل نے عدالت سے مطالبہ کیا کہ

ایک منصفانہ فیصلے کے لیے پس منظر کی تحقیق لازم ہے اور پس منظر سارا آئینے کی طرح ہے۔ جمرو کا خیال تھا کہ وکیل نے اپنے طویل بیان میں تقریباً ہر پہلو کا احاطہ کیا ہے۔ وکیل کا کہنا تھا کہ پہلے ہی مرحلے میں تمام ممکنہ گوشے عدالت کے علم میں آجائیں تو مخالف وکیل کو کھل کھیلنے، غیر ضروری طور پر معاملہ الجھانے یا سنسنی پھیلانے کا موقع نہیں ملتا اور عدالت کا کام آسان ہوجاتا ہے۔ ماری کی پچھلی زندگی میں قدم قدم پر پیرو کی اعانت، پیرو کے ایما پر جارجی سے شادی، ایک باپ کی طرح پیرو کے لیے ماری کا احترام، شہر کے سب سے بڑے دادا پیرو کی بمبئی سے طویل غیر حاضری اور ان بدخواہوں کی جانب سے اس کے مرنے کی قیاس آرائیاں اور کسی تصدیق کے بغیر جارجی کا ان افواہوں پر یقین کرلینا اور پر پرزے نکالنا اور اپنے گوا سے آئے ہوئے عزیزوں کی شہ پر بمبئی کی ایک ساحلی بستی میں جوئے، شراب اور عورتوں کے اڈے کا قیام، پھر ایک دن اچانک پیرو دادا کی بمبئی میں آمد اور جارجی کے خفیہ اڈے پر چھاپا۔ وکیل نے تفصیل سے یہ ساری روداد بیان کی تھی۔ اس نے عدالت پر واضح کیا تھا کہ جارجی بھی پیرو کا پروردہ تھا اور اسی کے بل پر قلابے کے اہم پاڑے پر بیٹھا ہوا تھا۔ جوئے اور شراب کے اڈے سے جارجی کے ہاں سونے چاندی کی بارش ہونے لگی تھی۔ زندگی بھر جارجی نے پیسے کی ایسی ریل پیل نہیں دیکھی تھی۔ پیرو نے آکے جارجی کے سارے خواب اجاڑ دیے۔ پیرو کے حکم پر دوسرے دن اسے اڈے کا دھندا بند کرنا پڑا۔ یہ حادثہ جارجی کے لیے ایک بڑے سانحے سے کم نہیں تھا۔

وکیل نے عدالت کو بتایا کہ اس کی موکلہ عرصے سے اپنے شورہ پشت شوہر کا جبر سہ رہی تھی۔ جارجی نے اس کی مرضی کے خلاف اسے اپنے کاروباری اڈے کے کاؤنٹر پر بٹھادیا۔ ماری اس وقت بہت بے دست و پا تھی۔ ایک پیرو دادا ہی اس کی سپر تھا۔ بمبئی سے پیرو کی عدم موجودگی میں وہ بڑی بے امان ہوگئی تھی۔ کسی تماشائی کی طرح وہ جارجی کو فیل بدمست کی طرح سرکشی کرتے دیکھتی رہی۔ پیرو نے بمبئی واپس آنے میں بہت دیر کردی۔ جارجی نے اڈا ضرور بند کردیا تھا لیکن وہ بہت آگے جاچکا تھا۔ ماری کو پہلے سے دھڑکا تھا کہ جارجی کا واپس آنا مشکل ہے مگر اس کے سان گمان میں نہ تھا کہ جارجی اتنا اندھا ہوچکا ہے کہ اسے پیرو کی موت کے سوا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ پیرو دادا کے قتل کی رات جارجی ماہم کے پاڑے پر بیٹھا رہا تاکہ کوئی اس پر انگلی نہ اٹھاسکے۔ اس رات کیا وہ شب و روز کئی دنوں سے پیرو دادا کی خوشنودی کے لیے ماہم کے پاڑے پر جما ہوا تھا۔ گھر اور ا
پاڑے پر اس کا آنا جانا واجبی سا رہ گیا تھا۔ اس رات وکی ا
ٹائی نے، ہوسکتا ہے، ان کا کوئی اور بھی شریک ہو، ایک
تاریک گلی میں پیرو دادا اور اس کے دست راست ماچھی د
پر پیچھے سے حملہ کردیا۔ پیرو اور ماچھی نے مرتے مر
مزاحمت کی اور وکی کو زخمی کردیا۔ وکی زخمی نہ ہوتا تو گوا
طرف بھاگ جاتا۔ ادھر جارجی مستقل طور پر ماہم کے پاڑ
پر بیٹھا اپنی گواہی بنا ہوا تھا۔ دونوں اس معاملے میں بے د
رہتے لیکن مکافات عمل بھی کوئی چیز ہے۔ زخمی ہوجانے
سبب وکی کو بمبئی میں ٹھہرنا پڑا اور جارجی کے گھر پناہ لینی پڑ
ماری نے اس کی مرہم پٹی کی۔ ماری کو اس وقت کچھ علم
تھا، دوسرے دن جب اسے پیرو دادا کی موت کی خبر ملی تو ا
شبہ جڑ پکڑنے لگا۔ پیرو دادا کی موت پر ماری کا بے حال ہ
عین فطری تھا۔ پیرو کی ارتھی اٹھتے وقت اپنے مربی کا
دیکھنے وہ اس کے گھر گئی تھی۔ وہاں سے وہ اور تنہا اور رو
لوٹی۔ آس پاس کوئی بھی اس کے غم میں شریک نہ تھا
آکے وہ آنسو بہاتی اور خود کو صبر و ہمت کی تلقین کرتی ر
اسے جارجی کا انتظار تھا۔

جارجی دو راتوں بعد گھر آیا۔ وکی پہلے سے وہاں
دونوں نے شراب کی بوتل سے پیرو کی موت کا جشن منا
بھول گئے کہ گھر میں پیرو دادا کا ایک سوگوار بھی موجو
ماری وہاں ہے اور ان پر نگاہ رکھے ہوئے ہے۔

جارجی کے گھر آنے پر اب کوئی حجت باقی نہیں تھی۔ ماری نے اپنی آنکھوں سے ان کی بدمستیاں دیکھیں
اپنے کانوں سے ان کی ہرزہ سرائیاں سنی تھیں۔ اس
برداشت نہیں ہوا، وہ ہذیان بکنے لگی اور اس نے اپنے
کو مجبور کیا کہ اچھا ہے، وہ پولیس میں جاکے اپنے
اقرار کرلے ورنہ۔۔۔

وکیل نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ اندازہ لگایا جا
کہ ایسی صورت میں جارجی اور وکی کا ردعمل کیا ہوسک
دونوں نشے میں چور تھے، دو طرح کا نشہ، فتح اور شراب
لیے ماری ان پر حاوی آگئی۔ بہ صورت دیگر دونوں
چابک دست اور ہنرمند تھے کہ راتوں رات تمام نشا
ڈالتے، ماری کی خاک بھی نہ ملتی۔

وکیل نے اپیل کی تھی کہ اس کی مؤکلہ کی راس
اور نیکوکاری کے گواہ کم نہیں ہیں۔ اس کے بچوں
سامنے ہے۔ اعلیٰ تعلیم دلانے کے لیے اس نے انہیں
ایک اچھے اسکول میں داخل کرایا ہے۔ پاڑے کے
ی ہونے کے باوجود وہ پاڑے سے کنارہ کش رہتی تھی، اس
ھر صاف ستھرا تھا، لباس بھی اجلا اور شریفانہ پہنتی تھی۔ وہ
سیوں سے کم واسطہ رکھتی تھی، پڑوسی بھی جارجی دادا کی
ہ سے گریزاں رہتے تھے۔ تاہم اس کے لہجے کی نرمی اور
ں کے اطوار کی شائستگی کے سبھی قائل تھے۔ ضرورت پڑی
وہ چند لوگ بھی گواہی دینے آئیں گے جن سے ماری نے
مدد موقعوں پر اچھا سلوک کیا ہے اور عدالت کو برابر بطور خاص
ظ رکھنا چاہیے کہ ماری خود تھانے آئی تھی۔ یہ اس کی
دگی کا ایک اور ثبوت ہے۔ واردات کے بعد وہ اپنے گھر
ے بھاگ سکتی تھی یا فیل مچاتی، پولیس اسٹیشن وارد ہوتی،
ئیاں دیتی کہ رات اسے کمرے میں بند کرکے، بے دست و پا
رکے اجنبیوں نے اس کے شوہر اور وکی کو ختم کردیا ہے۔ یہ
ہر میاں بیوی میں کوئی ایسا اختلاف بھی نہیں تھا جو ماری پر
ب کرنے کا عذر بنتا۔ پاڑے کے داداؤں کی ہلاکت پر پولیس
تنی متوحش بھی نہ ہوتی۔ پیرو دادا دو دن پہلے گزر چکا تھا،
ے بھی گزشتہ سے پیوستہ واقعہ جان کے پولیس اپنے جتن
رتی رہتی۔ ماری کو کچھ ایک عورت ہونے کی رعایت ملتی،
ھ اس کے واقف حال مدد کو آتے اور وہ صاف بچ جاتی
ن ماری نے ایسا نہیں کیا۔ وہ سیدھی تھانے چلی آئی۔ وہ
چھی طرح جانتی تھی کہ اس سے ایک بڑا جرم سرزد ہوگیا
ہے، اپنے لٹ جانے کا احساس مستزاد تھا۔ وہ تو بالکل ٹوٹ
ی تھی۔ عدالت سمجھ سکتی ہے کہ ماری کی ذہنی حالت کس
ـجے ناگفتہ بہ ہوگی۔ شکستگی، خانماں بربادی کا یہی احساس تھا
ر اس نے پولیس میں آکے صاف اپنے جرم کا اقرار کرلیا،
رے ہوئے جواری کی طرح۔ اس نے پولیس سے کہا کہ میں
نے پیرو دادا کے خون کا بدلہ لے لیا ہے۔ ممکن ہے، ہتھیار
ھاتے وقت یہ جذبہ بھی اس کے لاشعور میں موجزن رہا ہویا
کن ہے، بعد میں اسے اس کا احساس ہوا ہو کہ اس نے ایسا
ھ غلط بھی نہیں کیا۔ پیرو کے زندگی بھر کے احسانات اسی
رح چکائے جاسکتے تھے۔ وہ اپنے بچوں سے غافل نہیں تھی۔
رے وہ زیورات اور نقدی سے بھری ہوئی ایک پوٹلی ساتھ
ئی تھی جو اس نے بٹھل نامی پیرو کے ایک محترم دوست کے
الے کردی اور پیرو کو واسطے دیے کہ بٹھل اس کے بچوں
و اپنی تحویل میں لے لے، اب وہ کس منہ سے اپنے بچوں کا
امنا کرے گی، اب وہ ان کے لیے کچھ بھی نہیں رہی ہے،
ں کو بتایا بھی نہ جائے کہ ان کی ماں کا کیا انجام ہوا؟ وہ بہت
معصوم ہیں اور اس نے پھولوں کی طرح ان کی نگہداشت کی
ہے۔ ان سے کچھ بھی کہہ دیا جائے کہ ان کی ماں اچانک
مرگئی۔ عدالت یہ نکتہ بھی پیش نظر رکھے کہ ماری واردات سے پہلے بھی پولیس میں آسکتی تھی۔ اس صورت میں وہ قطعی محفوظ تھی۔ جارجی اور وکی کے ملوث ہونے کی بین شہادتیں اس کے پاس تھیں، باقی پولیس کی کوشش سے جارجی اور وکی اقرار کرلیتے اور یوں ماری کو اپنے محسن پیرو کی روح کے سامنے سرفرازی کا موقع مل جاتا مگر ماری کو وقت ہی نہ مل سکا۔ اس سے صرف اتنی نادانی ہوئی، اس نے اپنی نفسی افراتفری میں دونوں مجرموں پر یہ ظاہر کردیا کہ وہ ان کے خونیں کارنامے سے واقف ہے۔ اس کے بعد ان دونوں کو لازماً ماری کے راستے بند کردینے چاہیے تھے۔ یہ یقین کرلینے کے بعد کہ وہ جارجی اور وکی اور ان کے ساتھیوں کے سوا کوئی نہیں تھا، ماری خود پر کچھ جبر کرلیتی اور چپ چاپ پولیس اسٹیشن چلی آتی تو آج وہ سلاخوں کے پیچھے نہ ہوتی۔ ایک عورت کو اس کی اس نادانی کی سزا بے شک عدالت دے سکتی ہے۔

شکلا نے یقیناً کوئی قابل وکیل ہی منتخب کیا ہوگا۔ بس یہی ایک گوشہ نکلتا تھا۔ وکیل کو کسی حاشیہ آرائی کے بغیر ساری روداد بے کم و کاست یوں ہی بیان کرنی تھی۔ تحقیق و تفتیش کے لیے اب عدالت کے پاس کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ تصدیق کرنے پر سب کچھ سچ ہی نکلتا اور اس سچ کے تسلسل میں وکیل کا یہ عذر بھی تسلیم کرلیا جاتا کہ ماری نے جو کچھ کیا ہے، وہ اپنے دفاع میں کیا ہے۔ یہ سب کچھ سنا کے وکیل نے صرف ایک نکتے پر عدالت کی توجہ مرکوز کردی تھی کہ آیا ماری نے عمداً یہ سنگین جرم کیا ہے یا وہ ایسا کرنے پر مجبور تھی؟ گویا پولیس کو دیے جانے والے پہلے بیان پر یقین کیا جائے یا اب عدالت میں اس کا تازہ بیان سچ سمجھا جائے۔ دوسرے بیان کے استرداد کے لیے عدالت کے پاس معقول وجوہات ہونی ضروری تھیں اور یہ وکیل کا کام تھا کہ وہ ان وجوہات کی وضاحت عدالت سے طلب کرے۔

بٹھل اور شکلا نے وکیل کو کسی پہلو سے بے خبر نہیں رکھا تھا۔ اور اتنی جزئیات صرف بٹھل ہی جانتا تھا۔ شکلا سے اب کچھ چھپا نہیں رہا تھا۔ میرے بارے میں بہت سی باتیں اسے کھٹکتی تھیں، اب کوئی وحشت باقی نہیں رہ گئی ہوگی۔ جمرو کی زبانی یہ باتیں جان کے مجھ پر حیرت طاری تھی، اتنے کم عرصے میں بٹھل اور شکلا کس قدر دوڑ دھوپ کرچکے ہیں۔ مجھے بھی ان کے ساتھ ہونا چاہیے تھا مگر یہ تو انہی پر منحصر تھا، وہ میری ضرورت سمجھتے تبھی تو میں ان کے لیے کسی کام کا نہیں ہوں گا اس لیے انہوں نے مجھ سے کوئی

سروکار نہیں رکھا۔ جمرو کہہ رہا تھا کہ وکیل بہت پرامید ہے گو جج کا رویہ بے حد سپاٹ تھا۔ "قسم سے لاڈلے!" جمرو بے چینی سے بولا "اپنے سے ماری کو دیکھا نہیں جاتا تھا' جی کرتا تھا' ابھی اس کو ادھر سے اٹھا لے جاؤں۔ استاد اپنے کو اشارہ کرے' تھانے سے اٹھا کے نہ لاؤں تو اپنی ماں کا دودھ پیا۔"

"فضول باتیں کیوں کر رہے ہو؟" میں نے تلخی سے کہا "بٹھل بھائی کیا یہ بات نہیں جانتے تھے' مجھے یاد ہے' انہوں نے شکلا جی سے ایک بار کہا تھا' بولو تو اس کو تھانے سے اٹھوا لیں؟"

"استاد نے بولا تھا ایسا؟" جمرو تعجب سے بولا "پھر شکلا صاحب نے کیا جواب دیا؟"

"شکلا جی ایک پولیس افسر ہیں' وہ کیا جواب دیتے؟"

"لیکن مطلب تو ان کا بھی یہی ہے۔ وہ بھی تو یہی کر رہے ہیں۔ ایسے میں بہت دیر لگے گی' عدالت کا کچھ پتا نہیں' اتنے میں وہ ابھاگن مر جائے گی' اپنے کو ڈر ہے لاڈلے! وہ زندہ نہیں رہنے کی۔"

"زیادہ دیر نہیں لگے گی جمرو بھائی!"

"تیرا مطلب ہے' ماری کا کوئی مخالف نہیں ہے' اور جیسا تم نے بتایا' وکیل نے بہت سوچ سمجھ کے بیان داخل کیا ہے۔"

"پر جج اڑ بھی سکتا ہے' اپنے کو بالکل پتھر لگتا ہے وہ۔"

"لیکن آدمی ہی ہے اور ماری سے اس کی کوئی خاندانی دشمنی نہیں ہے' ماری کے بچوں کا اسے بھی کوئی خیال ہونا چاہیے۔"

"پر اتنے میں ماری نے کوئی الٹا سیدھا بول دیا تو؟"

"وکیل نے اسی لیے اس کے علاج معالجے کا مطالبہ کیا ہے۔ وہ عدالت کو یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ ماری کے حواس درست نہیں ہیں' اودھر بٹھل بھائی بھی ماری کو کچھ سمجھائیں گے۔ بجھائیں گے' کم سے کم ان کی بات وہ ضرور سنے گی۔"

"تو بولتا ہے تو ٹھیک ہے پر اپنے کو آگے بہت چکر دکھائی دیتا ہے۔"

"چکر تو ہوگا' خون کا مقدمہ ہے۔"

"یہی تو بولتا ہوں' عدالت میں برس برس خرچ ہو جاتے ہیں' الٹا بھی ہو سکتا ہے سب۔"

"پھر! پھر کیا صورت ہے۔ تم ماری کو اٹھا لاؤ گے؟ یہی کہہ رہے ہو نا تم۔ پھر۔ پھر کیا ہوگا؟" اس نے درشتی سے کہا "کہاں لے جاؤ گے اسے؟"

"بہت بڑی دنیا ہے۔"

"چھپاتے پھرو گے سارے میں' بچوں سمیت' یہ بھی کوئی زندگی ہے؟"

"پولیس شروع میں زور کرے گی' پھر سب بھول جائے گی۔"

"کیسی بچوں کی سی باتیں کر رہے ہو' ہر وقت خوف' ہر لمحے دھڑکا۔ وہ عزت سے' سکون سے رہ سکے گی کہیں؟ اس زندگی سے موت بہتر ہے۔ بال بچے خوش رہیں گے کہ ان کی ماں تو ان کے ساتھ ہے مگر آج تو وہ چھوٹے ہیں' بعد میں کیا ہوگا؟ یہی ایک مناسب طریق کار ہے جو شکلا جی اور بٹھل بھائی کر رہے ہیں۔ ورنہ ہم لوگ مر تو نہیں گئے' بچوں کو ان کی ماں تو نہیں دے سکتے لیکن شاید انہیں کوئی کمی بھی نہ ہو' ان کا اللہ مالک ہے۔"

جمرو چپ بیٹھا رہا۔

O☆O

اس روز میرا ارادہ کیلاش کی خیروعافیت معلوم کرنے اس کے گھر جانے کا تھا۔ پھر خیال آیا' دسواں گزر گیا ہے' آج کسی وقت گھر والوں کو ابا جان کی کوٹھی میں منتقل ہو جانا چاہیے۔ شام ہو رہی تھی اور کسی کو کوئی جلدی نہیں معلوم ہوتی تھی' میں دیر تک گیتا کے پاس بیٹھا رہا' وہاں فرخ فریال' جولین اور شہ پارہ بھی تھیں۔ ان سے معلوم ہوا کہ ابھی دو چار روز کی اور دیر ہے۔ نئی جگہ پر کچھ کام باقی رہ گیا ہے۔ ابا جان نہیں چاہتے کہ وہاں جا کے کسی کو پریشانی ہو۔ اندھیرا گہرا ہونے پر ابا جان بھی واپس آ گئے۔ بار بار میرا دھیان کیلاش کی طرف جاتا' موٹر موجود تھی مگر جمرو دن بھر کا تھکا ہوا تھا۔

میں نے مارٹی کو ساتھ لیا۔ ابا جان سے میں نے پوچھ لیا تھا کہ انہیں کوئی کام نہ ہو تو میں کیلاش کے ہاں جانے کے لیے موٹر لے جانا چاہتا ہوں۔ ابا جان اور منیر علی بھی جانا چاہتے تھے لیکن پھر جانے کیا سوچ کے رک گئے۔ ابھی موٹر چلی ہی تھی کہ میں نے ڈرائیور سے ٹھہر جانے کو کہا۔ مجھے یاد آیا کہ میری جیب بالکل خالی ہے' احتیاطاً کچھ پیسے پاس ہونے چاہئیں۔ مارٹی سے پوچھنا اچھا نہیں لگا۔ اندر جا کے میں نے جولین سے کچھ پیسے مانگے۔ وہ مسکرانے لگی اور الماری سے اپنا پرس لا کے میرے سامنے کر دیا۔ دس روپے کے دو نوٹ نکال کے میں نے جیب میں رکھ لیے۔ موٹر کی وجہ سے ہم جلد منزل پر پہنچ گئے۔ اس بار بھی ملازموں ہی سے ہمارا استقبال ہوا۔ ابھی تک کوئی پونا سے واپس نہیں آیا تھا۔

ہراساں ہراساں لگتے تھے۔ مجھے بھی تشویش ہوئی۔ کئی دن گزر گئے تھے۔ پونا ایسا دور نہیں تھا۔ اب تک انہیں واپس آجانا چاہیے تھا۔ میں نے ملازموں سے پتا پوچھنے کی کوشش کی مگر کسی کو ٹھیک طرح کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔ ڈاک کا پتا مختلف ہوتا ہے۔ وہ گلیوں کے موڑ اور نشانیاں بتاتے رہے تھے۔ پھر ان سے معلوم ہوا کہ آں جہانی کی ایک کوٹھی باندرے میں بھی ہے۔ باندرا نزدیک ہی تھا۔ منٹوں میں ہم وہاں پہنچ گئے۔ وہاں بھی سناٹا تھا۔ ایک دو ملازموں کے سوا اتنی بڑی کوٹھی میں کوئی نہیں تھا تاہم وہاں سے اصل پتا معلوم ہوگیا۔ اس وقت میری سمجھ میں یہی آیا کہ مجھے تار دینا چاہیے اگر ہوسکے تو پونا بھی جانا چاہیے۔ صبح جاکے میں رات کو واپس آسکتا ہوں۔ گھر جانے کے بجائے میں نے ڈرائیور سے بمبئی سینٹرل کی طرف چلنے کو کہا۔ کبھی کسی نے مجھے بتایا تھا کہ اسٹیشن سے تار جلدی پہنچ جاتا ہے۔ جولین کے دیے ہوئے پیسے اس موقع پر کام آئے۔ میں نے ارجنٹ تار دیا اور جوابی تار کے پیسے بھی ادا کیے۔ گھر آکے میں نے بتایا تو سبھی پریشان ہوگئے۔ کیلاش رکنے والا نہیں تھا۔ اسپتال میں اس کی ضرورت ہوگی۔ وہ نہیں آسکتا تھا تو گھر کے دوسرے افراد آجاتے۔ مولوی اکرم کی اطلاع کے مطابق رات کو بھی ایک گاڑی پونا جاتی تھی۔ سب کی یہی رائے تھی کہ کسی کو وہاں جاکے خیریت پوچھنی چاہیے۔ ابھی گاڑی کا وقت تھا۔ میں جانے کے لیے تیار تھا لیکن بٹھل نے منع کردیا کہ پہلے تار کے جواب کا انتظار کرلیا جائے۔ میں نے یہ بات تار میں لکھ دی تھی کہ اگر میری یا ہم میں سے کسی کو ضرورت ہو تو کوئی بھی پہلی گاڑی سے آسکتا ہے۔ علی الصباح تار کا جواب آگیا۔ کیلاش نے لکھا تھا کہ اسے رابطہ نہ رکھنے کا افسوس ہے لیکن آں جہانی کی اچانک موت نے سب کو امتحان سے دوچار کردیا ہے باقی باتیں تفصیلی ملاقات پر۔ دو ایک روز میں بکھرے ہوئے معاملات سمٹ جانے کی توقع ہے۔ ابھی حالات قابو میں ہیں، کسی کی ضرورت پڑی تو یقیناً زحمت دوں گا۔ تار سے اطلاع کردوں گا۔ آخری سطر میں کیلاش نے شکریہ ادا کیا تھا اور سب کے لیے دعائیہ کلمات لکھے تھے۔ میں نے بٹھل سے کہا کہ میں کیلاش کے جواب سے مطمئن نہیں ہوں۔ یہ بہت مبہم ہے۔ ہوسکتا ہے، اسے ہماری ضرورت ہو اور وہ تکلف کررہا ہو۔ بٹھل مجھ سے متفق تھا لیکن اس نے مجھے پونا جانے کی اجازت نہیں دی۔ میں نے کہا، ایسا ہے تو تم چلے جاؤ، بٹھل اس پر بھی آمادہ نہیں ہوا۔

دسویں کو چار روز گزر چکے تھے۔ صبح ہی سے گھر منتشر نظر آنے لگا۔ ابا جان نے کہا تھا کہ کپڑوں اور ضروری سامان کے سوا سارا گھر جوں کا توں رہنے دیا جائے۔ شبتی چاچا کو بڑی مشکل سے راضی کرلیا گیا تھا کہ وہ گھر کی نگرانی کرتے رہیں گے۔

ناشتے کے وقت کوئی کسی سے نظر نہیں ملا رہا تھا۔ سب گم صم سے تھے۔ میں تو ناشتے کے بعد ہی گھر سے نکل گیا تھا۔ گھر چھوڑتے وقت گیتا اور رانی کے چہرے دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ اپنا گھر چھوڑنا ویسے بھی آسان کام نہیں ہے۔ درودیوار سے آدمی آنکھیں چراتا ہے۔ وہ تو پیرو کے گھ[...] سے جارہی تھیں۔ کہتے ہیں، آدمی مرجاتا ہے، اس کی بازگشت باقی رہتی ہے۔ جانے والا کسی نہ کسی طور پر موجود رہتا ہے۔ اس کی آہٹیں، صدائیں، اس کے نقوش زند[ہ] رہتے ہیں اور اس کے لیے مخصوص اشیا اور مخصوص محل وقوع کی ضرورت نہیں۔ اس کا تعلق تو نہاں خانے [سے] ہے۔ گیتا اور رانی پیرو کے گھر سے جارہی تھیں لیکن پیرو تو ا[ن] کے ساتھ تھا۔ پیرو سے ان کا تعلق اشیا اور درودیوار [کے] حوالے سے نہیں، براہ راست تھا۔ کسی نے ضرور انہیں باو[ر] کرایا ہوگا کہ کل کوئی دوسرا اس مکان میں آئے گا تو پیرو کوئی صدا، کوئی آہٹ اسے سنائی نہیں دے گی۔ جولین [نے] صبح مجھے بتایا تھا کہ ادھر ایسی دیر نہیں تھی، کچھ کام ہمار[ے] جانے کے بعد بھی ہوسکتا تھا لیکن ابا جان نے منتقلی کا ارا[دہ] چند روز کے لیے دانستہ ملتوی کردیا تھا تاکہ گیتا اور رانی ا[س] دوران میں خود کو استوار کرسکیں۔ سب انہیں طرح ط[رح] قائل کرتے رہے ہوں گے۔ گیتا اور رانی خاموش ہوگئیں [مگر] اپنے دل کا حال کچھ وہی جانتی ہوں گی۔ دلیل گم کا علاج [نہیں] ہے، دلیل کوئی تریاق نہیں ہے۔

جمرو میرے ساتھ تھا۔ مارٹی سے میں نے کہہ دیا ت[ھا] کوئی پوچھے تو کہہ دینا، میں سیدھا ابا جان کی کوٹھی پر جاؤں گا۔ جمرو اور میں سہ پہر تک سڑکوں پر گھومتے ر[ہے]۔ کھانا بھی ہم نے ایک ہوٹل میں کھایا۔ کچھ دن کا وقت [تھا] اور کچھ اتفاق، راستے میں کئی جگہ اڈے پاڑے کے لو[گوں] سے ہماری مڈبھیڑ ہوئی۔ مجھے علم نہیں تھا کہ بمبئی میں ا[...] چھپانے کی مشکل بھی پیش آئے گی۔ وہ میرے لیے اجنب[ی] مگر میں ان کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ مجھے دیکھ کے د[...] ہوئے میرے پاس آتے۔ میں سلام دعا کے سوا ان سے بات نہ کرتا، اس طرح ان سے جلد چھٹکارا مل جاتا۔

شام کو پانچ بجے ہم ابا جان کی وسیع وعریض کوٹھ[ی میں] داخل ہوئے۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کسی اور جگہ آگیا [ہوں]۔ وہاں سب کچھ بدلا ہوا تھا۔ سفید اور لال اینٹوں کے رنگین امتزاج سے عمارت کسی مغل محل کا حصہ نظر آتی تھی۔ چمکتے ہوئے نیلگوں شیشے، کھڑکیوں پر لہراتے ہوئے ریشمی پردے، اردگرد ترشا ہوا، دھلا ہوا سبزہ، عمارت کے سامنے سبزے کے چوڑے دائرے میں فوارہ ابل رہا تھا۔ لگتا تھا، رات دن لوگ کام کرتے رہے ہیں۔ دولت ہو تو آدمی کو کیا کمی، دولت وقت پر بھی حاوی آجاتی ہے۔ کسی نے کہا ہے، دولت مند آدمی زیادہ وقت گزارتا ہے، دگنی، تگنی، دس گنی زندگی۔ بہت سوں کو ایک جیسا وقت ملتا ہے پر سب ایک جیسا وقت نہیں گزار پاتے۔ زندگی کا طور ہر ایک سے جدا ہے، کسی کو کم وقت ملے اور زندگی اس پر مسلسل مہربان رہے، کسی کو بہت وقت ملے اور زندگی اس سے مستقل روٹھی رہے۔ زندگی کی پیمائش کے لیے وقت کا پیمانہ نہایت فرسودہ اور غیر معیاری ہے۔ ابا جان نے ایک محل حیدر آباد میں خریدا تھا، اب ایک بمبئی میں لے لیا۔ زندگی کا اگلا پچھلا بہت سا حساب انہیں بے باق کرنا تھا اور ابا جان کو بہت کچھ وصول کرنا تھا، ایک ایک لمحے کا حساب، امی کا، فہمیدہ کا، اپنے آبائی گھر کا، اعزا و اقربا کا حساب۔ رات کے مقابلے میں دن کے خواب بہت شدید ہوتے ہیں۔ ابا جان نے اس تعبیر کے لیے اپنی عمر کے کتنے سال ارزاں کردیے تھے مگر جتنا بڑا حوصلہ، اتنا بڑا انعام۔ جتنا بڑا داؤ، اتنی بڑی جیت اور جتنا بڑا خواب، اتنی بڑی تعبیر۔ دولت کی بڑی خوبی اس کی زرخیزی ہے۔ اور جیسے زرخیز زمین کے لیے ہنر لازم ہے، دولت کو بھی ایک سلیقہ چاہیے۔ کہتے ہیں، دولت خود سب سے بڑا ہنر ہے۔ سلیقہ خود بہ خود آجاتا ہے۔ ابا جان تو گزشتہ دس سال سے یہی مشق کررہے ہیں۔

پہلی مرتبہ ہم یہاں آئے تھے تو پیرو بھی موجود تھا اور اس نے ابا جان سے کہا تھا کہ بابا! یہ تو پورا محل ہے۔ اس وقت ابا جان نے خواہش ظاہر کی تھی کہ کیا ہی اچھا ہو، پیرو بھی یہیں رہے۔ پیرو نے کسی رد و قدح کے بغیر جواب دیا تھا کہ اس سے بڑی خوشی اس کے لیے اور کیا ہوسکتی ہے۔ نہ ابا جان کی پیش کش تکلفانہ تھی نہ پیرو کی قبولیت رسمی۔ پیرو زندہ ہوتا تو آج شاید یہیں ہوتا۔ ابا جان کی بات ٹالنا اس کے لیے [وی]سے بھی ممکن نہیں تھا۔ یہ تو اس کے لیے عین راحت کی [با]ت تھی کہ گیتا اور رانی اتنے بڑے گھر میں سب کے ساتھ [رہی]ں۔ جہاں بٹھل اور ابا جان ہوں، فرخ، فریال، فارہہ اور [جول]ین وغیرہ ہوں اور جہاں میں ہوں، ادھر فیض آباد میں [...]یں کی حویلی میں جاکے وہ بہت مچلتا تھا۔ بٹھل سے اس [نے] متعدد بار کہا کہ یہاں سے اب کہیں اور جانے کو دل نہیں چاہتا، جی کرتا ہے کہ گیتا اور رانی کو بھی یہیں بلالوں اور یہ بات تو طے ہی تھی کہ وہ کچھ عرصے کے لیے گیتا اور رانی کو فیض آباد بھیج دے گا۔ کاش پیرو کو ذرا سا وقت اور مل جاتا صرف چند روز گیتا اور رانی کو وہ خود یہاں چھوڑ کے جاتا تو بات اور تھی۔

کوٹھی کا خاص دروازہ ایک کشادہ ہال میں کھلتا تھا۔ وہاں کے اطراف کئی دروازے تھے، عمارت کے مختلف حصوں سے آنے کے راستے۔ اوپر کی منزلوں سے آنے کے لیے روایتی چکر وار زینہ بنا ہوا تھا۔ فرش کے وسط میں قالین بچھا تھا اور گنبد کی شکل میں بنی ہوئی اونچی چھت میں بہت بڑا فانوس لٹک رہا تھا۔ گنبد کی گولائی میں ہر طرف شیشے جڑے ہوئے تھے اور پھول پتیاں بنی تھیں۔ ابا جان نے پہلے سے موجود بہت سارے ساز و سامان سمیت عمارت کا سودا کیا تھا۔ نئے رنگ و روغن سے فرنیچر کی شکل نکل آئی تھی۔ ہر چیز ایسی ترتیب سے رکھی تھی جیسے اسی جگہ کے لیے بنی ہو، اسی جگہ کا حصہ ہو۔ وسطی ہال سے عمارت کے دائیں بائیں جانب ترچھی طرز کے دو حصے تھے۔ دونوں حصوں میں دو منزلیں، فرشی اور پہلی منزل کے علاوہ دوسری منزل پر بھی ہوا خوری کے لیے کشادہ سائبان اور چند کمرے بنے ہوئے تھے۔ مولوی اکرم، ان کی بیٹی ریحانہ، جولین اس کی ماں اور چمپا بیگم، ابا جان، فرخ، فریال، فارہہ اور اکبر، گیتا اور رانی کے علاوہ اور بھی کئی گھر کوٹھی میں آباد ہوسکتے تھے اور جیسا کہ ابا جان نے پہلے کہا تھا، سب ساتھ رہ کے بھی الگ رہ سکتے تھے۔ اپنے اپنے گھروں میں اور سب کے ساتھ پیچھے ایک بڑا مہمان خانہ تھا، ملازموں کے کمرے، باغ، گھوڑا گاڑیاں اور موٹر کھڑی کرنے کی جگہیں۔ یہاں پہلے کوئی بڑا خاندان ہی رہتا ہوگا۔ جس نے بھی یہ عمارت بنائی تھی، اس کے پاس صرف دولت نہیں تھی، خیال آفرینی اور خوش ذوقی کی خوبیاں بھی اس کے پاس خوب تھیں جنہیں دولت کے بغیر زنگ لگ جاتا ہے اور جو دولت سے اور پختہ ہوجاتی ہیں۔ ملازموں کی بھی عمارت میں کمی معلوم نہیں ہوتی تھی، بڑے گھروں کی زینت کا ایک سبب ملازم بھی ہوتے ہیں۔ کٹھ پتلیوں کی طرح اشارے پر دوڑتے، یہاں سے وہاں تک تھرکتے پھرتے ملازم۔

سب لوگ دوپہر ہی کو وہاں پہنچ گئے تھے۔ نچلی منزل کی بڑی نشست گاہ میں فرخ اور شہ پارہ مجھے دیکھتے ہی شکایت کرنے لگیں کہ میں کہاں رہ گیا تھا؟ اتنی دیر کہاں لگادی؟ میرا جواب سنے بغیر فرخ ہمکتے لہجے میں بولی "بابر بھائی! دیکھا آپ نے یہ سارا۔۔۔؟"

"ہاں!" میں نے گہری سانس لے کے کہا "دیکھ رہا ہوں۔"

"سبھی کو پسند آیا ہے۔"

"بہت اچھا ہے" میں نے چاروں طرف نظریں گھماتے ہوئے کہا "کہاں ہیں سب لوگ؟"

"یہاں تو ڈھونڈنا پڑے گا" فرخ مسکراتے ہوئے بولی "ابھی تو کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔ یہ سارا تو بھول بھلیوں سا ہے۔ کہیں دو ایک روز میں راستوں اور دروازوں کا ٹھیک سے اندازہ ہوسکے گا۔"

وہ دونوں سامنے کھلے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔ میں نے بھی ان کی پیروی کی۔ اندر چمپا بیگم' جولین کی ماں' فریال' فارہہ اور ریحانہ بیٹھی تھیں۔ کمرے کی نشست فرشی تھی اور دیواروں سے گاؤ تکیے لگے تھے۔ مجھے دیکھ کے سب اٹھ گئیں۔ غیر ارادی طور پر میری منڈلاتی ہوئی نظریں گیتا اور رانی کی طرف گئیں اور مجھے اپنے سینے' اپنی آنکھوں میں ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ اتنے دنوں بعد دونوں کے چہرے کچھ نکھرے ہوئے نظر آرہے تھے۔ گیتا کو اپنے پاس لپکتے ہوئے آتے دیکھ کے بے اختیار میرے بازو پھیل گئے' میں نے اسے اپنے پہلو میں سمیٹ لیا "کیسی ہو گیتا تم؟" میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ میں اس سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا کہ وہ بس حوصلہ قائم رکھے۔ ایک پیرو' اس کا باپ چلا گیا ہے لیکن ابھی بہت سے ہیں اور بے شک وہ پیرو نہیں ہیں' پھر بھی ان میں باقی کوئی کمی نہیں ہے۔ وہ پیرو ہی طرح ان پر اپنا حق جتا سکتی ہے۔ مجھے خیال آیا کہ یہ سب تو کم و بیش میں اس سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ بار بار اعادے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر یہ کچھ بھول رہی ہے تو اسے پھر سے سب یاد آنے لگے گا۔ لفظ ہی اظہار کا ایک ذریعہ نہیں ہیں۔ لفظوں کے بعد جس چیز کی ضرورت پڑتی ہے' لفظ نبھانے کی' اصل تو وہی کچھ ہے۔ گیتا میرے پہلو میں سمٹی کھڑی رہی۔ میں نے کچھ نہیں کہا۔ میں اس سے یہ بھی نہ پوچھ سکا کہ اسے اپنا یہ نیا گھر پسند آیا؟ یہ سوال بھی مجھے قبل از وقت معلوم ہوتا تھا۔ فرخ نے اس موقع پر میری مدد کی اور تجسس آمیز لہجے میں بولی "بابر بھائی! آپ نے اوپر کی منزل دیکھی؟ پورا باغ ہے۔"

"اچ۔۔۔چھا" میں نے اشتیاق سے کہا "میں نے اسے نہیں بتایا کہ یہ عمارت میں پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔ فرخ ہی نے ہماری رہبری کی۔ اس کے اور گیتا کے علاوہ فریال' فارہہ' ریحانہ اور شہ پارہ بھی ہمارے ساتھ تھیں۔ فرخ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اوپر کا منظر ہی کچھ اور تھا۔ میں پہلے اس طرف نہیں آیا تھا۔ چھت کے ایک بڑے حصے پر سبزہ بچھا ہوا تھا اور ہر طرف پھولوں کے گملے کثرت سے کھلے تھے۔ درختوں سے جھانکتی ہوئی آس پاس کی بہت سی عمارتیں وہاں سے نظر آتی تھیں اور دور سمندر کے کنارے کی سفید لکیر۔ اوپر آسمان پر بدلیاں چھائی ہوئی تھیں۔ نظارے کی دل کشی پر شام کے وقت کا سحر مستزاد تھا۔ مجھے خیال ہوا ساری عمارت میں اس سے خوب صورت جگہ کوئی نہیں ہوگی۔ سبزے کے پیچھے سائبان میں بیٹھ کے بارش کا لطف لیا جاسکتا تھا۔ سائبان سے ملحق رنگین شیشوں کے روشن دانوں اور محرابوں کی شکل والے دریچوں کے کمرے آگے پیچھے بنے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے سے فاصلے پر اس طرح کہ ہر کمرا جداگانہ حیثیت رکھتا تھا۔ وہ خراماں خراماں ادھر ادھر گھومتی گھامتی' سبزے پر رکھی ہوئی بید کی کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ میں ان سے پوچھنے ہی والا تھا کہ اتنے میں جولین آگئی۔ سرتاپا سفید لباس میں' ساڑھی میں وہ ہمیشہ کھنچی ہوئی' تراشی ہوئی سی لگتی تھی۔ سبزے کے رنگ میں اس کے لباس کا سفید رنگ کچھ اور نمایاں ہوگیا۔ جولین بھی نسبتاً ٹھہری ہوئی سی معلوم ہورہی تھی۔ اس کے آجانے سے سب کے چہرے چمکنے لگے۔ سب نے تپاک سے اس کا خیر مقدم کیا۔ جولین کے اشارے پر ملازم نے چائے کی پیالیاں میز پر سجادیں۔ چائے کے ساتھ پھلوں سے بھرا ہوا طشت بھی تھا۔ فرخ' فارہہ' شہ پارہ مجھے عمارت کے ایک ایک گوشے کی تفصیل بڑی حیرانی سے سناتی رہیں۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ عمارت میں نہانے کا تالاب بھی ہے۔ ٹینس کورٹ بھی ہے' ایک گھوڑا گاڑی بھی پچھواڑے کی طرف کھڑی ہے۔ اتنی جلدی انہیں باغ میں درختوں کی اقسام بھی معلوم ہوچکی تھی۔ ان کی آسودگی کے لیے میں پورے انہماک سے سنتا رہا۔ اندھیرا ہونے پر بڑے بڑے قمقمے روشن ہوگئے۔ نزدیک و دور عمارتوں کی روشنیاں بھی جل گئیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہم ستاروں کے جھرمٹ میں بیٹھے ہوں مگر اول شب ہی اوس پڑنے لگی۔ خنکی بھی زیادہ تھی اس لیے ہم وہاں سے اٹھ آئے۔ جولین کو رات کے کھانے کا انتظام دیکھنے کی بے چینی ہورہی تھی۔ کئی بار اٹھی' ہر بار اسے انہوں نے روک لیا تھا۔

اس رات کیلاش بھی آگیا۔ دو روز سے میں اس کی ر[اہ دیکھ رہا] تک رہا تھا۔ تار کی اطلاع کے مطابق اسے دو روز پہلے آجا[نا] چاہیے تھا۔ رات ہی میں نے پھر بٹھل سے اشارتاً اپ[نے] اندیشے کا اظہار کیا تھا کہ کیلاش ضرور کسی پریشانی میں گھ[را] ہوا ہے' کہیں تکلف نہ کررہا ہو مگر بٹھل نے سنی ان سـ[ـنی]

[ہو گئی] تھی۔ دوپہر کو بھی میں اور جمرو احتیاطاً اس کے گھر کی [ط]رف گئے تھے' میں نے طے کرلیا تھا کہ اگر آج رات وہ نہ [آ]یا تو صبح میں کسی کو بتائے بغیر پونا نکل جاؤں گا۔ میں جیسے ہی [نی]چے آیا' شامو مل گیا۔ وہ کیلاش کی آمد کی اطلاع دینے کے لیے مجھی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ نچلی منزل کا [یہ]یاں حصہ مردانے کے لیے مخصوص کردیا گیا ہے۔ شامو مجھے [اپ]نے ساتھ اسی طرف لے گیا۔ پہلے ہی کمرے میں سب [مو]جود تھے' ابا جان' منیر علی' مولوی اکرم' جمرو' مارٹی' جگنو۔ [س]امنے کے تخت پر کیلاش' بٹھل کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ مجھے [دی]کھتے ہی وہ تخت سے اٹھ کھڑا ہوا اور بے تحاشا گلے لگ گیا۔ [اس] کے بازوؤں کی گرفت اس کی بے تابی کی مظہر تھی "نیا گھر [م]بارک ہو" اس نے تمتماتی آواز میں کہا۔

"اتنے دن کہاں لگ گئے؟" میں نے شکایتی لہجے میں [پو]چھا۔

"کیا بتاؤں" وہ آہ بھر کے بولا "بڑی لمبی کہانی ہے۔ آپ [بت]ایئے' کیسا لگا یہ گھر؟ یہ تو' یہ تو بہت عجیب ہے۔ نہایت شان[دا]ر' خواب جیسا۔ سب کو یہاں دیکھ کے مجھے بہت خوشی [ہو]ئی۔"

میں نے آنکھیں میچ کے ممنونیت ظاہر کی اور پوچھا کہ [یہ]اں آنے میں اسے کوئی دشواری تو نہیں ہوئی؟"

"ذرا سی' پہلے میں اسی طرف گیا تھا' وہاں تبھی چاچا نے [مح]ل پتا بتایا' پھر میں سیدھا یہیں آکے ٹھہرا۔"

"پونا سے کس وقت آنا ہوا؟"

"ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے' نہانے اور کپڑے تبدیل کرنے میں [ک]چھ دیر لگ گئی" وہ تیز آواز میں کہنے لگا "رما بھی آنے کو تیار [تھ]ی' میں نے اسے روک دیا۔ پونا میں دن رات سب برابر [ہو] گئے تھے۔ سچ پوچھئے تو ایک رات بھی ٹھیک سے نہ سوسکے" [پھر] انگریزی میں بولا "اٹ داز اے ہاری بل ایکس پی[ری]ینٹس۔"

"معلوم ہوا تھا' جج صاحب تمہارے عزیز تھے؟"

"عزیز سے بہت زیادہ' عزیز تو دور کے تھے۔ پتا جی سے [ا]ن کی بچپن کی دوستی تھی۔ دونوں گھر ایک جیسے تھے۔ پونا میں [ا]ن کے تبادلے کے بعد تھوڑی دوری ہوگئی تھی۔"

"کیا بیمار تھے؟" میں نے دبے لہجے میں پوچھا۔

"بیمار تو ایسے نہیں تھے' یہی کہنا چاہیے کہ وقت آگیا [تھ]ا۔ رات بالکل ٹھیک تھے' صبح زندہ نہیں تھے۔"

"ایسی کیا بات' دل کا مرض تھا؟"

کیلاش نے یاسیت سے سر ہلایا' ایک لمحے تذبذب کے بعد کھوئے ہوئے لہجے میں بولا "کچھ ایسا ہی۔"

اس سے پہلے کہ وہ کچھ بتاتا' بٹھل نے اس سے بیٹھ جانے کو کہا۔ ہم دونوں کو احساس ہی نہیں رہا کہ اور لوگ بھی موجود ہیں اور سب کی نظریں ہم پر مرکوز ہیں۔ ہم دونوں بٹھل کے پاس ہی تخت پر بیٹھ گئے لیکن ہمیں فوراً اٹھنا پڑا۔ کھانے کا وقت ہوگیا تھا۔ جولین نے آکے بتایا تو سبھی اٹھ گئے۔ میرا خیال تھا کہ عمارت کی مناسبت سے کھانے کے لیے بھی اب میز کرسی کا اہتمام ہوگا مگر ایسا نہیں تھا۔ قریب کے ایک کمرے میں فرش پر دسترخوان بچھا ہوا تھا۔ صرف اتنا فرق تھا کہ دو ملازم مضطرب انداز میں تیار کھڑے تھے۔ گو جولین اور شہ پارہ نے انہیں ہاتھ پاؤں ہلانے کا موقع کم ہی دیا۔ کھانے میں بھی کوئی ایسا تکلف نہیں تھا۔ کیلاش بھی ہمارے ساتھ بیٹھ گیا' میرے بالکل برابر' مجھے کچھ گمان ہوا کہ کیلاش پوری طرح شامل نہیں ہے یا مجتمع نہیں ہے۔ میں نے پہلے اسے سفر کی تھکن پر محمول کیا۔ اس نے پہلے بعد دیگرے سب سے سلام دعا کی تھی' گیتا اور رانی سے بطور خاص۔ اس کی نشست و برخاست میں نہ شائستگی کی کمی تھی نہ لب و لہجے میں سرگرمی کی کمی۔ تاہم کوئی بات ضرور تھی۔ ممکن ہے میری طرح اوروں نے بھی یہ محسوس کیا ہو۔ آج اس میں پہلے جیسی بے ساختگی نہیں تھی۔ وہ کسی کوشش میں مصروف نظر آتا تھا' مہذب آدمیوں کا طور ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے خیال سے اپنا سارا غبار و فشار خود تک محدود رکھتے ہیں' دوسرے کو اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتے۔

کھانے کے بعد جیسے ہی سب دسترخوان سے اٹھ کے منتشر ہوئے' میں نے اسے باہر چلنے کا اشارہ کیا اور اس سے پہلے کہ جمرو اور شامو میں سے کوئی دانستہ نادانستہ ہمارے پیچھے آتا' میں اسے عمارت کے پچھواڑے لے گیا۔ باغ کے نزدیک ہمیں نسبتاً ایک خاموش جگہ مل گئی۔ "لگتا ہے' سب کچھ ٹھیک نہیں ہے" میں نے کسی تمہید کے بغیر اس سے کہا "مناسب ہو تو مجھے کچھ بتاؤ۔" اس نے پھیلی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور بھنچی ہوئی آواز میں بولا "چھپانے کی کوئی بات نہیں ہے اور آپ سے کیا چھپانا۔"

"اتنے دن تمہارے نہ آنے سے طرح طرح کے اندیشے گھیرے رہے۔ میں تو آرہا تھا مگر بٹھل بھائی نے روک دیا۔"

"میں نے بھی کئی بار سوچا کہ آپ کو تار دے دوں لیکن پھر یہ خیال کرکے رہ گیا کہ آپ کی ضرورت یہاں زیادہ ہے۔"

"ایسا بھی کیا' یہاں بہت سے لوگ تھے' بٹھل بھائی نے تو اس وجہ سے منع کردیا تھا کہ کوئی ایسی ویسی بات ہوگی تو تم کوئی جھجک محسوس نہیں کروگے" میں نے نرمی سے کہا "بات کیا ہے؟"

"یوں تو لمبی داستان ہے" وہ بوجھل آواز میں بولا "جج صاحب' طبعی موت نہیں مرے' انہیں زہر دیا گیا تھا۔"

"زہر!" میں اچھل پڑا "تمہارا مطلب ہے یہ۔۔۔؟"

"ہاں' یہ ایک صاف سا قتل کا واقعہ ہے۔"

"ارے!" میں نے سٹپٹا کے کہا "مگر کس نے اور کیوں؟"

"کچھ نہیں معلوم' رات کو وہ روزانہ کی طرح اسٹڈی کر کے سوئے تھے۔ صبح دیر ہوگئی' وہ نہیں اٹھے تو نوکروں کو پریشانی ہوئی۔ انہوں نے ڈاکٹر کو بلایا مگر کچھ رکھا نہیں تھا۔"

میں خاموش بیٹھا اس کی صورت تکتا رہا۔

"ہم ذرا دیر سے پہنچے تھے۔ پوسٹ مارٹم کیا جاچکا تھا اور ڈاکٹروں نے زہر کی قسم کے بارے میں بھی بتادیا تھا۔ دوسرے دن صبح کریا کرم کردیا گیا۔"

"مگر کس نے؟" میں نے اضطراب سے پوچھا "آخر کون ان کا دشمن تھا؟"

"پولیس کا خیال ہے' تمام مجرم کسی بھی با اصول' انصاف پسند جج کے دشمن ہوتے ہیں۔ ان کی عدالت میں سیاسی قیدیوں کے بھی مقدمات تھے اور قتل و خون کے مجرموں کے بھی۔ گوروں کے خلاف آزادی کی جنگ لڑنے والوں کے بیشتر مقدمات میں ان کا فیصلہ قانون کے مطابق تھا اور سرکار کے حق میں جاتا تھا۔ وہ جج کی کرسی پر بیٹھ کے اپنے آپ کو بالکل بھول جاتے تھے' صرف قانون بن جاتے تھے۔ نجی زندگی میں بھی وہ بہت اصول پسند تھے۔ پتا جی کے سوا کسی سے ان کی دوستی نہیں تھی۔ پتا جی کے جانے کے بعد وہ سب سے بالکل الگ تھلگ ہوگئے تھے۔ صبح و شام لائبریری میں بیٹھے رہتے۔ دو پشتوں سے وہ بڑے رئیس تھے۔ کسی زمانے میں گوروں نے ان کے دادا کے کسی کارنامے سے خوش ہو کے انہیں بڑی جاگیر بخشی تھی' وہ ساری کی ساری ان کے باپ کے حصے میں آئی۔ باپ نے اور اضافہ کر کے یہ ترکہ اپنے دو بیٹوں کو منتقل کردیا۔ جج صاحب کے چھوٹے بھائی اپنے حصے کی رکھوالی نہ کرسکے اور تقریباً سب کچھ ہاتھ سے نکل گیا۔ جج صاحب نے اپنے بھائی کو سنبھالا دینے کی بہت کوشش کی لیکن جب کسی کی قسمت ہی ساتھ نہ دے تو کوئی کیا کرسکتا ہے۔ جج صاحب کی اولاد میں ایک بیٹی' دو بیٹے ہیں۔ بڑا بیٹا تعلیم کے لیے لندن گیا تھا۔ وہاں اس نے کسی فرنگن سے شادی کرلی۔ جج صاحب ایسے ناراض ہوئے کہ پھر بیٹے کی شکل بھی دیکھنا گوارا نہیں کیا۔ دوسرا بیٹا ایک دو برس پہلے انگلستان سے پڑھ کے آیا ہے اور دلی میں سول سروس کے امتحان کی تیاری میں مصروف ہے۔ بیٹی سب سے چھوٹی ہے' پہلے بمبئی میں' پھر پونا میں پڑھتی رہی' ان دنوں شملہ میں تھی۔ جج صاحب کی موت کے وقت تینوں میں سے کوئی ان کے پاس نہیں تھا۔ بڑے کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ بعد میں دلی اور شملے سے دونوں بھائی بہن آگئے۔ جج صاحب کی بیوی شروع ہی میں ان سے جدا ہوگئی تھیں۔ تینوں بچوں کو جج صاحب نے ماں کی طرح پالا پوسا تھا اور ادھر تاجی نے ان کا بوجھ بانٹ رکھا تھا۔ جج صاحب مجھے اور رما کو بھی اپنی اولاد کی طرح سمجھتے تھے۔ رما کو تو وہ بہت پسند کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ رما کو دیکھ کے مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں رہتی' بہرحال۔۔۔" کیلاش رک گیا۔ شاید اسے احساس ہوا تھا کہ کہیں وہ غیر ضروری باتیں تو نہیں کررہا ہے یا اسے میری توجہ کی کمی کا شک گزرا ہوگا۔ اس نے بس ایک لمحے توقف کیا اور گھٹی ہوئی آواز میں بولا "پولیس کا خیال ہے' دولت مند کے رشتے دار بھی کچھ کم اس کے دشمن نہیں ہوتے۔ سو ان کا شبہ سب پر تھا' خصوصاً بیٹے' بھائی' بھائی کی اولاد اور مجھ پر۔۔۔"

"تم پر!" میں نے حیرت سے کہا "تم پر کیوں؟"

"موت سے چند روز پہلے جج صاحب نے وصیت لکھی تھی۔ انہوں نے اپنی جائداد وغیرہ چار برابر حصوں میں تقسیم کی ہے۔ بڑے بیٹے کا نام وصیت میں نہیں ہے۔ چار حصوں میں سے ایک چھوٹا بیٹا اور بیٹی' دوسرے دو حصے میرے اور رما کے نام ہیں۔"

"خوب! اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تم دونوں سے کس درجے محبت کرتے تھے۔"

"بے شک' انہوں نے دو گھروں کو بھی دو گھر نہیں جانا مگر۔۔۔" وہ ہچکچاتے ہوئے بولا "مگر وصیت میں انہوں نے ایک شرط رکھی ہے۔"

"کیسی شرط؟"

"وصیت کے مطابق ان کے بیٹے کمل سے رما کی اور ان کی بیٹی کوشلی سے میری شادی کی صورت میں ہم ترکے کے حق دار ہوں گے ورنہ نہیں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے الجھ کے کہا "ورنہ؟"

"ورنہ سرکار کے حوالے۔"

"یہ کیسی بات ہے؟"

"انہوں نے وصیت میں لکھا ہے' ان کی خواہش ہے کہ دونوں گھر ہمیشہ کے لیے ایک ہوجائیں اور سب ایک گھر میں محفوظ رہیں۔ سوچنے کے لیے انہوں نے اپنی موت کے بعد پورے ایک سال کا وقت دیا ہے۔ سال بھر جائداد جوں کی توں رہے گی اور نقدی منجمد ہوگی۔ بیٹی اور بیٹے کے اخراجات کے لیے انہوں نے ایک لاکھ روپے کی رقم چھوڑی ہے اور ڈیڑھ لاکھ روپے مزید کوشلی کے لیے الگ رکھے ہیں۔ اگر کوشلی کی شادی مجھ سے نہ ہوسکی تو یہ رقم کوشلی کے جہیز اور شادی کے اخراجات میں صرف کی جائے گی۔ اس سارے کام کی نگرانی کے لیے انہوں نے اپنے ایک پارسی دوست جسٹس ڈین شا کو ٹرسٹی مقرر کیا ہے۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ یہ سب کچھ تو عجیب وغریب ہے۔" میں نے بے ربطی سے کہا۔

"جج صاحب کی وصیت کا علم ان کی موت کے بعد ہوا۔ جسٹس ڈین شا نے تیسرے روز ہمیں جمع کیا اور وصیت کے کاغذات دکھائے۔"

"کمل اور کوشلی کیا کہتے ہیں؟"

"کیا کہتے' دونوں چپ تھے۔"

"اور۔۔۔ اور رما؟"

"اس کا بھی یہی حال تھا' بالکل گم صم' ہم کبھی سوچتے ہی نہیں کہ ہمارے عزیز ترین رشتے ناتے کیسے ناپائیدار ہوتے ہیں۔ رما کے لیے تو وہ مثال تھے۔ ہر مہینے' ڈیڑھ مہینے بعد رما ان سے ملنے کے لیے پونا جاتی تھی اور تین چار دن ان کے ساتھ گزار کے آتی تھی۔ پچھلے سال سے جج صاحب کو دل کی شکایت ہوگئی تھی۔ رما کچھ اس لیے بھی باقاعدگی سے انہیں دیکھنے جاتی تھی اور ان پر حکم چلاتی تھی کہ وہ کھانے پینے' چلنے پھرنے' سونے اور مطالعے کے شیڈول پر نہیں چلیں گے تو سزا کے طور پر وہ ان سے ناراض ہوجائے گی۔ جج صاحب نہایت پابندی سے اس کی بات پر عمل کرتے تھے۔ ہر معاملے میں قاعدہ قانون تو ویسے بھی ان کی زندگی میں شامل تھا۔ گورے افسروں سے ان کے اچھے تعلقات تھے اور وہ علاج کے لیے انہیں انگلستان بھیجنا چاہتے تھے۔ جج صاحب کچھ تیار نہیں تھے۔ احتیاط اور علاج سے وہ یہیں خاصے بہتر ہوگئے تھے۔ عدالت کا کبھی ناغہ نہیں کیا۔ رما بہت پر امید تھی اور اب وہ انگلستان جانے کے لیے ان پر زور نہیں دیتی تھی مگر اچانک سب کچھ اجڑ گیا۔ رما کا حال پھر آپ جان سکتے ہیں' کمل اور کوشلی تو یوں بھی جج صاحب کا خون ہیں۔ کوئی تصور نہیں کرسکتا تھا کہ وہ اس طرح سب سے بچھڑ جائیں گے۔ کوئی راون انہیں ہم سے جدا کردے گا۔ سبھی گنگ تھے کہ یہ کیا ہوگیا۔ کچھ دکھائی سجھائی نہیں دیتا تھا' کون کسے سنبھالے' دوسری طرف دیکھے یا خود پر نظر رکھے۔" کیلاش کی آواز رندھنے لگی۔ میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے صبر کی تلقین کرنی چاہی تو وہ اور اجڑ سا گیا' کہنے لگا "ادھر پولیس نے پریشان کرنا شروع کردیا' پھر یہ وصیت نامہ۔ جسٹس ڈین شا کو بھی اپنا فرض ادا کرنے کی بہت جلدی تھی۔"

"پولیس کیوں؟ اسے کسی بات پر شبہ تھا؟"

"آپ تو مجھ سے زیادہ جانتے ہیں پولیس کیسی۔۔۔" معاً وہ سٹپٹا گیا اور ندامت زدہ لہجے میں بولا "معاف کیجئے' میرا مطلب ہے' پولیس کے تو اپنے طور تیور ہوتے ہیں۔"

"تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ میں یقیناً پولیس کو تم سے زیادہ جانتا ہوں' آئے دن ان سے واسطہ پڑتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ انہیں جج صاحب کے اتنے قریب لوگوں پر آخر کیوں شبہ تھا؟"

"ان کے تجربے کی بات ہوگی' ایسا اندھیرا انہوں نے پہلے کبھی دیکھا ہوگا جبھی۔۔۔ پولیس افسروں کے بقول انہیں ہر طرف نظر رکھنی پڑتی ہے۔ کہتے تھے' اگر ہم نے ان کی مدد نہ کی تو وہ اصل مجرم تک شاید نہ پہنچ سکیں۔ سنا تھا' اوپر سے پولیس پر بہت دباؤ ہے۔ تفتیش میں گورے افسروں کی شمولیت کی وجہ سے پولیس خاصی چوکس ہوگئی تھی اور بدحواس بھی۔ ان کے کہنے کے مطابق' جج صاحب کی عدالت میں پیش ہونے والے تمام اگلے پچھلے مقدموں کی چھان بین کی جارہی ہے اور ایسے تمام مجرموں کی فہرست الگ بنائی گئی ہے' جنہیں جج صاحب کی عدالت سے سخت سزائیں ملی تھیں یا جن کے فیصلے ہونا ابھی باقی ہیں اور انہیں جج صاحب سے کسی رعایت کی توقع نہیں تھی۔ جیسا کہ میں نے آپ کو پہلے بتایا' پولیس کے خیال میں درپردہ تحریکوں کے انقلابی بھی جج صاحب سے ناراض ہوسکتے ہیں۔ جج صاحب بہرحال ان کی راہ میں رکاوٹ کا سبب بنے ہوئے تھے۔ جج صاحب کے بے لچک فیصلوں سے انتہا پسند سیاسی کارکنوں کی حوصلہ شکنی ہوتی تھی اور آزادی کی جدوجہد متاثر ہوتی تھی۔ کچھ افسروں کی رائے میں ذاتی رنجش بھی اس قتل کی وجہ ہوسکتی ہے۔ جج صاحب کی بے اندازہ دولت پولیس کے شبے کی بنیاد ہے۔ اپنے کسی عزیز کی دولت قریبی رشتے داروں کو زیادہ کھٹکتی ہے۔ جبھی انتقام اور لالچ کے بدترین واقعات رشتے داروں کے مابین کثرت سے ہوتے ہیں۔ لندن میں مقیم جج صاحب کا بڑا بیٹا بھی اپنا حصہ وصول کرنے کے لیے' وہیں بیٹھے بیٹھے

باپ کو ختم کرنے کا انتظام کرسکتا ہے۔ جج صاحب اپنی اولاد کو ہمیشہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا درس دیا کرتے تھے۔ تعلیم اور لگے بندھے ضروری اخراجات کے علاوہ اولاد پر مزید ایک پائی خرچ کرنے کے روادار نہیں تھے۔ بارہا انہوں نے بیٹوں اور بیٹی کو جتایا تھا کہ میرا کام تمہیں اعلیٰ تعلیم دلانے کے بعد ختم ہوجاتا ہے۔ باقی تمہیں خود سب کرنا ہے۔ کئی بار انہوں نے ٹرسٹ بنانے کی خواہش کا اظہار بھی کیا تھا۔ ٹرسٹ بنانے کا مطلب لاکھوں روپے کی جائداد سے اولاد کی محرومی تھی۔ پولیس اس پہلو پر غور کررہی تھی کہ باپ کو اس اقدام سے باز رکھنے کا سودا تو کسی کے سر میں نہیں سماگیا۔ پاگل پنے کے لیے کوئی وقت تو طے نہیں ہے' کسی وقت بھی کسی کا دماغ پھر سکتا ہے۔"

"وہ تو سب ٹھیک ہے۔" میں نے اضطراب سے کہا "مگر تم کہہ رہے تھے کہ پولیس کو تم پر بھی شبہ تھا۔"

"ہاں' وہی میں آپ کو بتارہا تھا۔" وہ شکستہ لہجے میں بولا "یہ سوال میں نے ایک پولیس افسر سے بھی کیا تھا' اس نے مجھ سے معذرت چاہی اور کہنے لگا کہ بعض اوقات ہمیں بہت سے مفروضے سامنے رکھنے پڑتے ہیں۔ شریف آدمیوں کے گریبان پر ہاتھ ڈالنا پولیس کے لیے کوئی پسندیدہ کام نہیں ہے لیکن کیا کریں' پولیس کو مروت راس نہیں آتی۔ ظاہر ہے' کوئی ایک ضرور مجرم ہے۔ وہ مجھ سے پوچھنے لگا کہ آپ ہی بتائیے پھر ہم کون سا طریقہ اختیار کریں۔ اس نے بتایا کہ میں اور رما پولیس کی نظروں سے محفوظ کیوں نہیں ہیں۔ کوئی بعید نہ تھا کہ ہمیں جج صاحب کی وصیت کا پہلے سے علم ہو۔ جج صاحب کی اس فیاضی کا ہم نے کبھی خواب میں بھی تصور نہیں کیا ہوگا۔ گھر بیٹھے کسی کو اتنی بڑی دولت ملنے کا آسرا ہوجائے تو وہ یہ آسرا اور یقینی بنانے میں کوئی جتن باقی نہ چھوڑے گا۔ پولیس افسر نے مجھ سے کہا۔ فرض کیجیے کہ وہ آپ نہیں ہیں' آپ کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہے اور اسے کسی طرح وصیت کا علم ہوجاتا ہے تو اس کا یہ خدشہ قطعاً بے جا نہیں ہوگا کہ جج صاحب کا۔۔۔ کسی وقت غیر معمولی حادثہ جج صاحب کے فیصلے میں ردوبدل کا باعث بن سکتا ہے۔ وہ ایک قانونی آدمی تھے۔ وصیت بدلنے کے لیے کوئی قانونی عذر تلاش کرنا ان کے لیے مشکل نہیں تھا اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ وصیت پر جج صاحب کی زندگی کے بعد عمل ہونا تھا۔ چنانچہ میرے اور رما کے دماغ میں جج صاحب کی زندگی کی موت کم کرنے اور وصیت یقینی بنانے کا سنگدلانہ خیال آنا بعید از امکان نہیں تھا۔ پولیس افسر کے کہنے کے مطابق قتل کے لیے آسمان سے کوئی اور مخلوق نہیں اترتی' ہم ہی جیسے لوگ قتل کرتے ہیں اور کوئی شخص ہر وقت قاتل نہیں ہوتا۔"

"تم نے اس سے نہیں کہا کہ تمہیں دولت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے پاس خود۔۔۔" میں نے تلخی سے کہا اور مجھے فوراً احساس ہوا کہ میں فضول بات کررہا ہوں۔

"میں نے اس سے پہلے بہت کچھ کہا لیکن وہ اپنی جگہ قائم رہا۔ پولیس نے جج صاحب کی موت سے پہلے بمبئی میں ہماری مصروفیات' جج صاحب کے ملازموں سے ہمارے تعلق' ہمارے کردار اور مشاغل کے بارے میں نہایت شرمناک سوالات کیے۔ رما تو بالکل ڈھے گئی' ایک موقع پر وحشت میں اس نے ایک پولیس افسر کو ڈانٹ دیا کہ پولیس کے جو جی میں آئے کرے' اب وہ کسی سوال کا جواب نہیں دے گی۔ ہم سب نے اسے سمجھایا کہ اس کے اس رویے سے پیچیدگی بڑھ جائے گی لہٰذا بہتر یہ ہے کہ وہ خود کو قابو میں رکھے۔ صرف ہم ہی نہیں تھے' کمل اور کوشلی سے بھی پولیس کا یہی سلوک تھا۔ کسی ملازم سے پولیس کو معلوم ہوا تھا کہ جج صاحب نے حال ہی میں اپنے قلاش بھائی کو مزید مدد کرنے سے انکار کردیا تھا اور ان کے دو بیٹوں کو سخت سست کہا تھا۔ سو جج صاحب کے بھائی اور بھتیجوں سے پولیس کا رویہ اور سفاکانہ تھا۔ ہم سب ایک دوسرے کا منہ دیکھا کرتے۔ ورنہ ہمارے سامنے پولیس ایسے ایسے نکتے وضع کرتی تھی کہ کبھی ہمیں خود ایک دوسرے سے بدگمانی ہونے لگتی۔ ملازموں کو انہوں نے الگ ہراساں کر رکھا تھا۔ باہر پولیس والوں کو کوئی سراغ نہ مل سکا' وہ گھوم پھر کے جج صاحب کے گھر آجاتے اور ہم سب کو کریدنے' کھکھوڑنے لگتے۔ میرے اور رما کے ڈاکٹر ہونے اور جج صاحب کو دیے جانے والے زہر میں بھی انہوں نے ایک نسبت ڈھونڈ ماری۔ ان کا کہنا تھا کہ وقوعے کے روز واردات کی جگہ قاتل کا موجود ہونا ضروری نہیں' یہ کام تو اپنے کسی معتمد اہلکار سے بھی انجام دلوا سکتا ہے۔" کیلاش اپنا مافی الضمیر ادا کرنے میں مشکل پیش آتی تو وہ انگریزی سہارا لیتا۔ وہ بظاہر بہت سمٹا ہوا' بندھا ہوا بیٹھا تھا لیکن اس کی آواز بکھر بکھر جاتی۔ کہنے لگا "ہمیں ایسا تجربہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس سے زیادہ اذیت کی بات کیا ہوگی کہ وہ ہم پر شک کررہے تھے۔ جو شخص ہمیں جان سے زیادہ عزیز تھا' وہ ہم اس کی موت کا الزام عائد کرنے کے لیے بے چین نظر آتے تھے' یہ سب کچھ بہت عذاب ناک تھا۔ ستم یہ تھا کہ وہ اس سوہان روح رویے پر بار بار شرمندگی کا اظہار بھی کرتے تھے۔"

"مگر یہ کیسی بات ہے' تم نے اتنی باتیں اس آسانی سے کیسے سن لیں؟" کوشش کے باوجود میں اپنے لہجے کی تلخی دور نہ کرسکا "تم نے مجھے کیوں نہیں بلایا؟ کچھ اور نہیں تو اس مشکل وقت میں' میں تمہارے قریب رہتا' تمہارا بوجھ کسی قدر ہلکا کرنے کا سبب بنتا اور شاید پولیس سے بات کرنے میں تمہاری کچھ مدد کرپاتا۔"

"ہمارے ساتھ آپ بھی پریشان ہوجاتے' آپ آتے تو وہ آپ کو بھی ہم میں شامل کرلیتے۔"

"پھر کیا ہوتا؟" میں نے تندی سے کہا "مجھ پر کیا اثر پڑتا! مجھے حیرت ہے کہ تمہیں پہلے ہی' جب انہوں نے تم پر شبہ ظاہر کیا تھا' کہنا چاہیے تھا کہ وہ صاف صاف الزام عائد کریں' ہم قانونی چارہ جوئی کا حق محفوظ رکھتے ہیں۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔"

"آپ درست کہہ رہے ہیں لیکن ذرا سوچیے' ان دنوں ہماری کیا حالت ہوگی۔ سب کچھ اچانک ہوا تھا' پولیس کی آمد اور پوچھ گچھ' وصیت کا انکشاف۔ جج صاحب کی موت کا صدمہ کیا کم تھا کہ اس افتاد نے سب کو بدحواس کردیا تھا۔ پولیس کا کیا جاتا ہے۔ سب بڑوں نے یہی مشورہ دیا کہ بہتر ہے' پولیس کی غلط فہمی گھر کے اندر ہی دور ہوجائے' گھر کی بات باہر نہ جائے۔ ہوگا تو کچھ نہیں مگر رسوائی بہت اٹھانی پڑے گی' جج صاحب کے خاندان کی رسوائی۔ جب تک لوگ حقیقت جانیں گے تب تک جانے کیسی کیسی باتیں عام ہوجائیں۔ پولیس تو بعد میں بڑی معصومیت سے معافی مانگ لیتی' معذرت کے دو بول' بول کے الگ ہوجاتی۔ ماتاجی خاص طور پر سب کو روکتی رہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ پولیس سے ہم نے تعاون کیا ہے۔ ان کی ہر بات کا تحمل سے جواب دیا ہے' اس لیے جلد ہی وہ مطمئن ہوجائیں گے یہ وقت گزر جائے گا۔"

"پولیس تحمل کا کبھی کبھی غلط مطلب بھی لینے لگتی ہے۔"

"یہی ہوا' عاجز آکے ہمیں ان سے کہنا پڑا کہ وہ ان بے سروپا تاویلوں' آزار سوالوں سے اجتناب کریں اور یہی کرنا ہے تو ہمیں حوالات بھیج دیں۔ اب جواب ہم وہیں دیں گے۔ آخر ان کے لہجے میں کچھ نرمی آئی یا وہ خود مایوس ہوگئے تھے' انہیں کوئی شکن جو کہیں نظر نہیں آئی تھی۔ یوں سمجھیے کہ اتنے دن تک ایک طرح سے گھر میں نظربند رہے۔ میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ میں تو پہلے چلا آتا لیکن انہوں نے مجھے اور رما کو روک لیا تھا۔ آخر میں نے ان سے کہا کہ میں ایک اسپتال سے وابستہ ہوں اور آج مجھے بہرحال واپس جانا ہے۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ رما کا برا حال تھا۔ میں رما کو ساتھ لے آیا۔ ماتاجی اور چھوٹی انو وہیں ہیں۔"

اس کے چپ ہوجانے پر میں بے سدھ سا بیٹھا رہا۔ کئی باتیں میرے دماغ میں گردش کررہی تھیں مگر مجھے مباحثے اور نکتہ چینی سے اجتناب کرنا چاہیے تھا۔ اس طرح وہ الجھنے لگتا۔ اس وقت تو مجھے اس کی دل جوئی کی کوشش کرنی چاہیے تھی۔ مجھے مناسب لفظ نہیں مل رہے تھے۔ ایسے لفظ شاید سب سے مشکل ہوتے ہیں' آدمی کو یاد نہیں رہتے۔ تا دیر خاموشی رہی پھر دماغ مجھے رما کا خیال آیا "رما' اب کیسی ہے؟" میں نے بظاہر ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"یہاں آکے تو ایسا محسوس ہورہا ہے کہ ہم کسی قید خانے سے نکل آئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اتنے دنوں بعد آج رما کچھ سکون سے سوسکے گی۔"

"واقعی تمہارے لیے یہ سب کچھ بہت اذیت ناک ہوگا۔" میں نے زیرلبی سے کہا "مگر خیر' جو ہونا تھا' ہوگیا۔ برا وقت گزر گیا' اسے ایک برا خواب سمجھ کے تمہیں سب کچھ بھول جانا چاہیے۔"

"ہاں۔" اس نے ڈوبتی آواز میں کہا "یہی مناسب ہے۔" اس کے لہجے میں بہت بے یقینی اور ناتوانی تھی۔

میں نے پوچھا "کیا تم فکر مند ہو کہ وہ دوبارہ تمہیں پریشان کرسکتے ہیں؟"

"نہیں' ایسی کوئی بات نہیں۔"

"بے شک وہ دوبارہ آسکتے ہیں۔ اتنا کچھ سن کے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا شبہ گہرا تھا۔ کوئی اور جگہ ہوتی تو وہ یہ لحاظ و مروت قطعاً نہ کرتے' اپنے طریقوں سے بات کرتے۔ پولیس مجرم سے بھی آدمی دیکھ کے بات کرتی ہے۔ ان کی تاویلیں جیسا کہ تم نے بتایا ہے' ایسی خام بھی نہیں تھیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ انہیں ان کا معقول جواب مل گیا ہوگا۔ ممکن ہے' وہ پھر آجائیں لیکن ہوا میں وہ کب تک تیر چلاتے رہیں گے۔ کاغذ کی ناؤ تو کاغذ ہی کی ہوتی ہے۔ تھک ہار کے آخر انہیں لوٹ جانا ہے۔ رہا بدنامی وغیرہ کا اندیشہ تو راہ راست پر چلنے والوں کو اس کی ایسی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ تمہیں کم سے کم اپنا اطمینان تو حاصل ہے اور تمہارا ہی اطمینان سب سے بڑی چیز ہے۔"

"ہاں' آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" وہ گہری سانس لے کے بولا "لیکن یہی کچھ تو نہیں۔"

"اور کیا ہے؟"

"وہ وقت تو جیسے تیسے گزر گیا لیکن آگے کچھ کم آزمائش

نہیں ہے۔"
"کیسی آزمائش!" میں نے تنک کر پوچھا۔
"آپ نے غور نہیں کیا۔" وہ جکڑی ہوئی آواز میں بولا
"جج صاحب بھی تو بیڑیاں ڈال گئے ہیں۔"
"نہیں! ایسا کیوں کہتے ہو۔ تم دونوں بھائی بہنوں سے وہ اپنی محبت اور شفقت کا اس سے بڑا ثبوت کیا دے سکتے تھے؟"
"لیکن انہوں نے سب کچھ منتشر کر دیا۔"
"کیا؟ تمہیں یہ سب کچھ اچھا نہیں لگا؟"
"ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔"
"کیا جج صاحب یہ بات نہیں جانتے تھے۔ وہ ایک دوربیں شخص تھے' انہوں نے یقیناً کچھ سوچ سمجھ کے یہ فیصلہ کیا ہوگا' اپنی اور تم سب کی خوشی کے لیے۔"
"صرف اپنی خوشی کے لیے' کاش وہ ایک بار ہم سے بھی پوچھ لیتے۔"
"یوں سمجھو کہ وہ تم پر اپنا حق سمجھتے تھے۔"
"تو وہ ویسے ہی حکم دے سکتے تھے' کسی شرط کے بغیر۔"
"تعمیل تو تمہیں ویسے بھی کرنی پڑتی' شرط تو انہوں نے یوں ہی رکھ دی۔ تم اسے ان کی طرف سے ایک تحفہ بھی سمجھ سکتے ہو۔"
"ایسا نہیں ہے۔" اس کی آواز میں ترشی آگئی "آپ کیوں نہیں سمجھ رہے' ہم یہ نہیں چاہتے تھے۔"
"لیکن اس میں حرج بھی کیا ہے۔"
"کوشلی بہت اچھی لڑکی ہے' صورت' تعلیم اور کئی اعتبار سے اچھی لیکن میں نے اس کے لیے کبھی اس طرح نہیں سوچا تھا۔ شاید اس نے بھی نہیں سوچا تھا۔ وہ ایک بالکل مختلف لڑکی ہے۔ اس کی فکر اور انداز میری افتادِ طبع سے مطابقت نہیں رکھتے۔ یہی صورت رما کے ساتھ ہے۔ اس نے بھی کمل کے بارے میں کبھی اس طرح نہیں سوچا تھا۔ عمر' خاندان' تعلیم اور تہذیب کے سوا ان دونوں میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔"
"ایسا ہے تو تم انکار کر سکتے ہو؟"
"کیسے کر سکتے ہیں؟"
"کیوں' کوئی چیز قبول کرنا نہ کرنا تمہارے اختیار میں ہے۔"
"آپ نے شاید توجہ نہیں کی' ہم تو انکار کر دیں گے لیکن ان دونوں پر کیا گزرے گی' کمل اور کوشلی پر؟ ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ اپنے باپ کی خواہش پر عمل کریں اور ہمیں بھی اس پر مجبور کریں۔"
"ان سے تمہاری کوئی بات ہوئی؟"
"موقع ہی کہاں ملا۔ سوگ کی فضا تھی۔ عزاداروں آ رجا رہی تھی' یہ سلسلہ آج تک جاری تھا۔ موت کی رسمیں اور پولیس کی دخل اندازی۔ ایسے میں ان سے کیا بات ہو اور ہم بات بھی کیا کرتے۔ ہمیں معلوم تھا کہ وہ کیا جواب دیں گے۔ ہمارا کیا ہے' ہم انکار کر دیں۔ وہ دونوں یا تو اصرار کریں گے یا چپ رہیں گے۔ یہ سوچنا تو ہمارا کام ہے ہمارے انکار کی صورت میں ان کی کتنی بڑی حق تلفی ہو گی ہم انہیں ان کے باپ کی لمبی چوڑی جائداد سے محروم کر دی گے' وہ دولت جو نسلیں کو آسودہ رکھ سکتی ہے۔ اس سے محرو معمولی بات نہیں ہے۔ آپ نے اس پیچیدگی پر دھیان نہ دیا۔"
"واقعی' اس کا تو مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا۔ تمہارے پاس کہنے کے لیے کچھ ہے' نہ اس کے پاس۔ ا لیے نہیں تو تمہیں ان کی خاطر یہ سب کچھ قبول کرنا ہوگا۔"
"اور ساری زندگی۔" وہ بے قراری سے بولا " ساری زندگی کا معاملہ ہے۔ ساری زندگی آپ کو اس شخ کے ساتھ بسر کرنی ہے جس سے آپ کوئی رغبت نہ رکھتے۔"
"ہاں۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا "مگر سنا ہے' رغ ہو جاتی ہے' ساتھ رہنے سے خود ہو جاتی ہے۔ تم نے بتایا کہ کوشلی ایک مہذب' تعلیم یافتہ اور شکل صورت کی ا لڑکی ہے' ایسی لڑکیاں صرف اپنے گھر' شوہر اور بچوں ہو جاتی ہیں۔ ممکن ہے' ابتدا میں تمہیں مفاہمت میں مشکل پیش آئے گی مگر ایک تعلیم یافتہ لڑکی سمجھ سکتی ہے۔ اس کے گھر کے لیے کون سی بات بہتر ہے۔ کوشلی بہ ایک ہندوستانی لڑکی ہے۔"
"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔" وہ بچوں کی ناراضی سے بولا "آپ نے اسے دیکھا نہیں' وہ دو مزاج کی لڑکی ہے۔ مجھے وہ پسند نہیں ہے۔"
"ممکن ہے' اس کی بھی تمہارے لیے یہی رائے ہو"
"بالکل' بالکل۔" اس کی آواز اونچی ہو گئی "یہ ممکن ہے بلکہ یہی ہونا چاہیے۔"
"تو مفاہمت اسے بھی کرنی پڑے گی۔"
"مگر ہم دونوں ہی ایسا کیوں کریں گے۔"
"دیکھو نا' کسی مقصد کے لیے کچھ نہ کچھ تو ترک ہے اور شادی تو تمہاری لڑکی ہی سے ہوگی۔ بعد

تمہاری توقع پر پوری نہ اتری یا تم اس کی امیدوں پر پورے نہ اترے تو؟ آدمی بھی موسموں کی طرح بدلتا ہے۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ آج جو آدمی۔۔۔"

اس نے مجھے بات پوری کرنے نہیں دی' وحشت سے بولا "آپ سچ بتایئے' میری جگہ اگر آپ ہوتے تو کیا کرتے؟"

"ہاں۔" مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا' میں نے کسمساتے ہوئے کہا "شاید کوئی کسی کی جگہ نہیں لے سکتا۔ ہر آدمی بس اپنی جگہ ہوتا ہے۔"

"میرا مطلب ہے' آپ اس صورت میں۔۔۔"

"میری بات جانے دو۔" میں نے جھنجھناتی آواز میں کہا "شاید میں بھی اسی خلفشار سے دوچار ہوتا۔"

"یہی تو میں آپ سے کہہ رہا ہوں' میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔"

"شروع میں تو وہ بالکل پتھرہی ہوئی تھی مگر اب اس نے فیصلہ کرلیا ہے' اس لیے وہ کسی عذاب میں نہیں ہے۔"

"کیسا فیصلہ؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"اس نے اپنے طور پر طے کرلیا ہے کہ وہ انکار کردے گی۔"

"انکار کردے گی؟"

"ہاں' سفر کے دوران میری اس سے بات ہوئی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ اس میں اپنی مرضی کے بغیر اتنی دور تک چلنے کی استطاعت نہیں ہے۔ اس نے کمل کو کبھی اس نظر سے نہ دیکھا ہے' نہ دیکھنا چاہتی ہے۔ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ کمل کے سامنے ایک بہترین مستقبل ہے۔ دولت بجائے خود سب سے بڑی ضمانت ہے جو رما کے مثبت فیصلے سے مشروط ہے لیکن یوں کہئے کہ جس طرح اس نے میرے بارے میں اس حیثیت سے کبھی نہ سوچا۔ اسی طرح کمل کے سلسلے میں بھی اس قسم کا کوئی خیال اس کے دماغ میں کبھی نہیں آیا۔"

"تمہاری بات دوسری ہے' تم ان کے بھائی ہو۔"

"کمل کو بھی وہ بھائی ہی سمجھتی ہے۔"

"لیکن وہ ان کا بھائی ہے نہیں۔" میں نے زور دے کر کہا۔

"رما ایک ہوش مند لڑکی ہے۔ اپنی زندگی کے اہم فیصلے وہ خود کرسکتی ہے۔ وہ پوری طرح اس کی اہل ہے۔"

"میں جانتا ہوں لیکن دوسرے بھی کسی کے لیے بہتر انداز میں سوچ سکتے ہیں۔"

"بے شک لیکن پھر یہ ملال تو نہیں ہوگا کہ ہمیں اپنا حق حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ شریک زندگی کے لیے ہر ایک کے اپنے معیار اور تصورات' اپنے خواب ہوتے ہیں' فرض کیجئے کہ آپ کے ذہن میں پہلے سے کوئی شخص ہے پھر؟ فرد بھی کسی دولت سے کم نہیں ہوتا۔"

"ہاں' ہاں۔" میں نے اضطراری لہجے میں کہا "تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ آدمی کا کوئی معمول نہیں ہوتا۔ کسی کے لئے کوئی آدمی سب سے بڑی جاگیر ہوتا ہے' کہیں تم یہ کہنا تو نہیں چاہتے کہ تم نے اور رما نے اپنی منزلیں یا اپنی تعبیریں ڈھونڈلی ہیں؟"

"رما کا مجھے نہیں معلوم۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا "ممکن ہے ایسا ہو۔ یہ رما کا حق ہے۔"

"اور تم!" میں نے مضطربانہ پوچھا "کہیں تم نے۔۔۔ میری مراد یہ ہے کہ کیا تم نے پہلے سے کچھ سوچ رکھا ہے؟"

"جی!" وہ کسی قدر گھبرا گیا اور بے کلی سے بولا "میر[illegible] واضح کردوں کہ ایسا کوئی امکان جج صاحب کی خواہش یا حکم ک[illegible] تعمیل میں حارج نہیں ہے۔"

"گویا امکان ہے۔" میں نے اشتیاق سے پوچھا "کو[illegible] ہے وہ؟"

جہاں ہم بیٹھے تھے' وہاں اتنی روشنی نہیں تھی تاہم میں اس کا چہرہ بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ اس کی پلکوں کا انتشار' اس [illegible] ہونٹوں کا ارتعاش اور چہرے کا رنگ۔ اس نے کئی پہلو بد[illegible] اور جھجکتے ہوئے بولا "ابھی یہ بہت قبل از وقت ہے۔" پھ[illegible] کہنے لگا "ہاں' میں نے ایک شخص کے لیے محسوس کیا ہے ا[illegible] نہیں کہہ سکتا کہ وہ بھی' اس نے بھی مجھے۔۔۔ میرا مطلب [illegible] ابھی تک اس سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ ابھی یہ امر مجھ [illegible] تک محدود ہے اور جو اختیار اسے حاصل ہے' وہ اسے حاص[illegible] ہے۔ میں نہیں جانتا' اس کا جواب اثبات میں ہوگا یا [illegible] میں۔" اس کی آواز دھڑک رہی تھی۔

"تمہاری اس سے کوئی بات نہیں ہوئی؟" میں [illegible] تعجب سے پوچھا۔

"نہیں! وقت ہی کتنا ہوا ہے۔ ابھی تو میں نے ا[illegible] تلاش کیا ہے۔" وہ اپنے ہونٹ کاٹنے لگا اور حسرت آمیز [illegible] میں بولا "کیا معلوم' اس کے بھی اپنے خواب ہوں۔ اس [illegible] پہلے سے کوئی بت بنا رکھا ہو۔ میں نے کہا نا' ابھی یہ بہت [illegible] از وقت ہے۔"

جانے کیوں میری رگوں میں خون رکنے لگا۔ میں ا[illegible] سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے؟ لیکن جیسے کسی نے [illegible] روک دیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے یہ جاننے کے لیے مجھے اپنے د[illegible] دماغ کی یکجائی کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے' یہ میرے لیے

بڑی حیرت کا باعث ہو۔ مجھے یہ معاملہ نہیں جاننا چاہیے' مبادا مجھے اپنا ردعمل ظاہر کرنے میں دشواری پیش آئے۔ جانے کیوں' دوسرے ہی لمحے مجھے یہ گمان ہوا کہ میں جانتا ہوں' اس کا اشارہ کس طرف ہے۔ خنکی کے باوجود میرے مساموں سے پسینہ پھوٹنے لگا۔ میں نے اس سے دوبارہ کچھ نہیں پوچھا۔ ویسے بھی اسے از خود بتانا چاہیے تھا۔ ہوسکتا ہے' جیسا کہ وہ کہہ رہا تھا' سردست وہ یہ بات خود ہی تک محدود رکھنا مناسب سمجھتا ہو اس لیے میرے لیے بھی یہی مناسب ہے۔

مجھے خاموش دیکھ کر وہ تیزی سے بولا "اور میں آپ کو بتاؤں کہ مجھے کسی کے مثبت یا منفی جواب کا انتظار بھی نہیں ہے۔"

"وضاحت کیوں کررہے ہو' میں سمجھتا ہوں۔ آدمی کو اپنا ارادہ سب سے زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ وہ اسے اپنی ہی تحویل میں رکھنا چاہتا ہے۔" میں نے نرمی سے کہا "پھر کیا مشکل ہے۔ رما کی طرح تم بھی کسی وقت اپنے فیصلے سے دور نہیں ہو۔ بس ایک جرأت کی ضرورت ہے۔"

"یہ ایسا آسان نہیں ہے۔" وہ پژمردگی سے بولا "رما کو بھی نہیں معلوم کہ یہ ایسا آسان نہیں ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی یہاں آزاد نہیں ہے۔ ہمارے حوالے ہمیں ہر طرح سے جکڑے رہتے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آگے کون کون ہمارے خیر طلب کس کس روپ میں ہمارے پاس آئیں گے اور ہم سے ہمارا ارادہ چھیننے کی کوشش کریں گے۔ غصہ' انتباہ اور عاجزی' طرح طرح کے واسطے۔ وہ کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے۔ مال و زر کے اتنے بڑے خزانے سے دستبرداری کا حوصلہ کمل اور کوشلی میں نہیں ہے۔ وہ اپنی انا کی پامالی کی حد تک ہماری منت کریں گے اور سب ان کے ساتھ ہوں گے۔ ماتا جی' چھوٹی انو' پتا جی مدت سے اپنے گھر سے بے نیاز بریڈ فورڈ میں مقیم ہیں' وہ بھی ہمیں ہماری نادانی اور ناپختہ کاری سے باز رکھنے کے لیے جلد از جلد ہندوستان واپسی کا پروگرام بنالیں گے۔ رما کو اس کا اندازہ نہیں ہے۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں اسے کیا تسلی دیتا' کیا تائید' کیا تردید۔ ہر آدمی کی زندگی کے اہم فیصلے۔۔۔۔ صرف ایک دیوار کے پار ہوتے ہیں مگر وہ دیوار عبور نہیں ہوپاتی۔ زندگی جتنی گھٹتی جاتی ہے' دیوار اتنی ہی اونچی ہوتی جاتی ہے پھر کوئی تناسب نہیں رہتا اور آدمی دیوار کے دوسری طرف دم توڑ دیتا ہے۔

خاصا وقت گزر گیا۔ ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے پھر جب تک جمرو اور شامو ہمیں ڈھونڈتے ہوئے ادھر نہ آنکلے' ہم وہاں سے نہیں اٹھے۔ انہیں دیکھ کر کیلاش نے اپنے چہرے پر شگفتگی بکھیرنے کی ناکام کوشش کی اور دونوں سے نئی جگہ کے بارے میں ان کا تاثر پوچھتا رہا۔ رات خاصی ہوگئی تھی۔ وہ اندر نہیں گیا' باہر ہی سے روانہ ہوگیا۔ میں نے اسے کچھ دیر اور رکنے کو بھی نہیں کہا۔ ایک بار میرے جی میں آئی تھی کہ اس سے کہوں' میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں لیکن بس سوچ کے رہ گیا۔ میں اس سے یہ پوچھنا بھی بھول گیا کہ اب پھر کب آنا ہوگا۔

ہم تینوں خاص دروازے کے سامنے حوض کی منڈیر پر بیٹھے رہے۔ آسمان پر کالی گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ جمرو اور شامو بمبئی کے بے قرار موسم کی باتیں کرنے لگے کہ صبح کچھ ہوتا ہے اور شام کچھ' اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ جمرو کو فیض آباد اور لکھنؤ کی یاد ستارہی تھی اور شامو کو کلکتے کی۔ میرا دماغ جانے کہاں کہاں بھٹک رہا تھا۔ میں ہوں ہاں کرتا بظاہر ان میں شامل رہا۔

وہ ابھی اور بیٹھتے مگر بوندا باندی ہونے لگی۔ ہمیں اٹھنا پڑا۔ کسی کے جاگنے کا امکان نہیں تھا۔ شامو نے آہستگی سے دروازہ کھولا۔ انہی کو معلوم تھا کہ کس طرف جانا ہے اور ہمیں کون سے کمرا یا کمرے تفویض کیے گئے ہیں۔ وہ پہلے ایک ڈیوڑھی جیسے کمرے سے گزر کے دائیں طرف جانا چاہتے تھے' اچانک جمرو ٹھٹک گیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے ٹھٹکنے کی وجہ سمجھ میں آگئی۔ بائیں طرف کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر تیز روشنی میں جولین صوفے پر بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی۔ میرے لیے یہ منظر ایسا تھا جیسے آدمی جو سوچ رہا ہو' وہی ایک دم سامنے آجائے اور گویا اسے بھی خبر تھی کہ میری نظریں اسی کو ڈھونڈ رہی ہیں' اسے مجھ سے اوجھل نہیں رہنا چاہیے۔ وہ ہلکے آسمانی گاؤن میں ملبوس تھی۔ گلے میں ہرا دوپٹا تھا۔ جیسے سبز پتوں کے درمیان گلاب کھلا ہو۔ ہماری آہٹ پر وہ فوراً کھڑی ہوگئی اور لپکتی ہوئی سیدھی ہماری طرف آئی "آپ ابھی تک جاگتی ہو دیدی؟ شامو نے حیرانی سے کہا۔

نیند ہی نہیں آرہی۔" وہ مسکرا کے بولی۔

"نئی جگہ پر کدھر آتی ہے۔"

"کہاں تھے آپ لوگ؟"

"ایسے ہی ادھری گپ مارتے تھے بیٹھ کے۔" شامو سر جھٹک کے بولا "سمجھو کہ ٹیم پاس کررہے تھے۔"

"کیا یہاں جی نہیں لگ رہا ہے؟"

"نہیں' ایسی کوئی بات نہیں۔" شامو مچلتی آواز میں

بولا۔

"یہ گھر بھی دو آدمی لوگ کی طرح ہوتے ہیں' ایک سے دوسرے کو سمجھنے میں تھوڑی دیر لیتے ہیں۔" جمرو نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہاں جمرو بھائی! اچھی بات کہی آپ نے۔"

جمرو کا جسم اکڑ گیا' آواز بھی تن گئی "اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہو جولی بہن! یہ بال کوئلے سے کالے نہیں کیے ہیں۔"

جولین کے ہونٹوں پر ہنسی بکھر گئی۔ ہنسی سب پر پھبتی ہے مگر کچھ لوگوں پر تو بہت زیادہ بھلی لگتی ہے' ان کا سارا بدن چٹک سا جاتا ہے۔ جولین کو میں نے شاذ شاذ ہی کھل کھلاتے دیکھا تھا۔ میری نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ مجھے بالکل نئی لگ رہی تھی۔

"کیلاش کب گئے؟" اس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

وہ مجھ سے مخاطب تھی لیکن میں بس اسے دیکھے گیا۔ میرے بجائے جمرو نے جواب دیا "ابھی تھوڑی دیر پہلے۔"

"باہر ہی سے چلے گئے؟"

"دیر بہت ہو گئی تھی۔" میں نے بدبداتے ہوئے کہا۔

"آج کیلاش بہت پریشان لگ رہے تھے۔" اس کی آواز میں فکرمندی بھی تھی' افسردگی بھی۔

"حادثہ ہی ایسا تھا۔ طبعی موت آدمی جلدی قبول کرلیتا ہے لیکن ایسی موت۔۔۔! پھر پولیس کے چکر۔۔۔"

جمرو اور شامو بھی چونک پڑے۔ میری زبان سے نکل گیا تھا یا خبر سنانے کا کوئی شوق اور اس کا تاثر دیکھنے کی کوئی جستجو اس حقیقت بیانی کی محرک تھی۔ مجھے بتانا پڑا کہ پونا میں کیلاش اور رمانے کیسے مضطرب دن گزارے ہیں۔ البتہ میں نے جج صاحب کی وصیت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ وہ گم کھڑی سنتی رہی پھر بجھے ہوئے لہجے میں بولی "کچھ اندازہ ہو رہا تھا کہ کوئی اور بات بھی ہے۔"

"دونوں بہت بکھرے ہوئے ہیں۔"

"اس وقت انہیں ہماری ضرورت ہوگی۔" وہ بے چینی سے بولی۔

"لازماً۔ میں نے رما کو تو نہیں دیکھا لیکن کیلاش کی حالت سے اس کی کیفیت کا اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے۔"

"مجھے معلوم ہوتا تو میں بھی رما کے پاس جاتی۔"

"مجھے بھی ابھی معلوم ہوا۔ میں نے کیلاش کے ساتھ جانے کا ارادہ کیا تھا لیکن پھر رہ گیا۔ خیر سویرے سہی۔"

"یہاں سے تو سبھی کو جانا چاہیے۔"

میں نے کوئی رائے نہیں دی۔ دیر تک بوجھل سی خاموشی رہی پھر میں نے آہستگی سے کہا "جانا چاہیے لیکن انہیں اس وقت آرام کی ضرورت ہوگی اور آرام کے لیے تنہائی کی۔ ویسے بھی ہمارے درمیان رسمی وضع داری وغیرہ کا کوئی تکلف نہیں ہے۔"

"کیا کیلاش نے اس قسم کی کوئی بات کہی ہے؟"

"کیسی بات؟"

"کہ ہمارا وہاں جانا' ہمدردی کرنا مداخلت کا۔۔۔"

"نہیں بالکل نہیں۔ یہ سوچنا بدگمانی ہوگا۔ بھلا کیلاش ایسی بات کہہ سکتا ہے۔ یہ تو میرا خیال ہے اس لیے کہ میں نے ساری روداد سنی ہے۔ وہ سب تھکے ہوئے ہیں۔"

وہ جانے کیا سمجھی' گھبرا کے بولے "لگتا ہے' کچھ اور بھی ہے۔"

"کچھ اور کیا ہوتا۔"

"وہ مطمئن نہیں ہوئی' متجسس نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی پھر اس نے جمرو اور شامو کی طرف دیکھا "ٹھیک ہے۔" وہ سمٹی ہوئی آواز میں بولی "صبح جانا ہو تو مجھے بھی لیتے چلنا۔"

شامو کئی جماہیاں لے چکا تھا۔ جولین نے مشورہ دیا کہ اب ہمیں اپنے کمرے میں جاکے آرام کرنا چاہیے۔

جمرو اور شامو تو اشارے کے منتظر تھے' فوراً تیار ہو گئے "آپ بھی تھوڑی کمر نکالو جولی بہن!" جمرو نے مشفقانہ لہجے میں کہا "رات بہت اوپر ہو گئی ہے۔"

"آپ لوگ جائیں' مجھے تو بالکل نیند نہیں آ رہی۔"

"ایسا کیسے۔" جمرو مچل کے بولا "بولو تو ادھری بیٹھیں' ماں قسم' ساری رات ہم لوگ ابھی پورے تین دن کو جاگ سکتے ہیں۔"

وہ مسکرانے لگی "مجھے معلوم ہے۔"

"مجھے بھی نیند نہیں آ رہی ہے۔" میں نے کسمساتے ہوئے کہا۔

"پھر کیا ہے۔" جمرو تیزی سے بولا "پھر تم بیٹھو جولی بہن کی دسراہٹ کے لیے ہم لوگ چلتے ہیں۔"

میں بھی یہی چاہتا تھا۔ جولین سے مجھے بہت سی باتیں کرنی تھیں مگر یہ کچھ اچھا نہیں لگتا تھا کہ میں انہیں چھوڑ کے جولین کے پاس بیٹھا رہوں لہٰذا میں نے ان سے کچھ دیر اور ٹھہر جانے کو کہا۔ انہوں نے کچھ نہیں سنا' ایک دم کمرے سے نکل گئے۔

میں بھی ان کے پیچھے چلا لیکن ابھی میں نے دروازہ عبور بھی نہیں کیا تھا کہ ارادہ بدل لیا اور پلٹ کے جولین کے

سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر تلاطم نمودار ہوا مگر صرف چند لمحوں کے لیے "کیلاش نے مجھے اور بھی کچھ بتایا ہے۔" میں نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔

"مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ تم کچھ چھپا رہے ہو۔" میری توقع کے خلاف وہ ٹھہری ہوئی آواز میں بولی۔

"تمہیں کیسے شبہ تھا؟"

"بس ہو گیا۔" وہ بال درست کرنے لگی "تمہیں بھید چھپانا خوب آتا ہے۔ سمندر کی طرح لیکن آج ایسا نہیں تھا۔"

"آج کیا تھا؟"

"آج تمہاری آنکھیں' تمہارا چہرہ جو کچھ کہہ رہا تھا۔"

"کیا کہہ رہا تھا؟"

"یہی کہ تم پر کوئی بوجھ ہے۔" وہ دبی زبان سے بولی "مگر کوئی بہت اہم بات نہیں ہوگی۔"

میں نے تعجب سے پوچھا "اہم کیوں نہیں؟"

"اوہ۔" میرا منہ بن گیا "یہ بھی خوب ہے' میں کسی سے کیا چھپاتا ہوں۔"

"یہ اپنے آپ سے پوچھو۔" وہ نیچی نظروں سے بولی اور اس سے پہلے کہ میرے لہجے کی تندی گہری ہوتی' معذرت خواہانہ بولی "تم کیا کہہ رہے تھے؟"

"میرا دماغ منتشر ہو گیا تھا۔ اس نے کچھ دیر انتظار کیا۔ میں چپ ہی بیٹھا رہا تو اس نے یاد دلایا کہ میں کیلاش کے بارے میں کچھ بتا رہا تھا۔ مجھے بھی یاد تھا لیکن سرا کہیں کھو گیا تھا۔ اس کی نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں' میں نے بے ترتیبی سے کہا "جج صاحب نے ایک وصیت بھی چھوڑی ہے۔"

"وصیت؟"

اس کے چہرے کی تمازت دیکھ کر میرا حوصلہ فزوں ہوا۔ میں نے مختصراً اسے جج صاحب کے زر و مال اور موت سے چند دن قبل لکھی جانے والی وصیت کے بارے میں بتایا۔ اس کی آنکھیں بتدریج پھیلتی گئیں' تاہم اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا "کیلاش اس صورت حال سے بہت پریشان ہے۔" میں نے کہا "نہ رما جج صاحب کی خواہش کی تکمیل پر آمادہ ہے نہ کیلاش۔"

جولین نے وہی بات کہی جو میں نے کیلاش سے کہی تھی اور کیلاش کا جواب بھی جولین کو بتایا۔ وہ غائب سی ہو گئی۔

"کیلاش کے انکار کی وجہ تو یہ ہے کہ کوشلی سے اس کی کوئی مناسبت نہیں' دوسری وجہ یہ ہے۔" میں نے کن انکھیوں سے اس کی جانب دیکھا کہ "اس کی نگاہ کا مرکز کوئی اور ہے۔"

مجھے حیرت ہوئی۔ جولین نے کسی اضطراب کا اظہار نہیں کیا۔ جس طرح میں نے کیلاش سے نہیں پوچھا تھا' جولین نے بھی جاننا نہیں چاہا کہ وہ کون ہے۔ وہ پتھرائی بیٹھی رہی۔

"میں نے محسوس کیا ہے کہ کیلاش بہت دکھ میں ہے' اس پر شدید مایوسی طاری ہے۔" میں نے دھیرے سے کہا۔

"تم نے کیا رائے دی؟" وہ تیکھے لہجے میں بولی۔

"میں کچھ بھی نہ کہہ سکا' تمہیں بتاؤ' کیا کہتا۔"

"یہ تو کیلاش پر منحصر ہے کہ اس کی ترجیحات کیا ہیں؟" وہ جھجکتے ہوئے آدھی انگریزی میں بولی۔

"ظاہر ہے اس کی ترجیحات میں سب سے مقدم وہ خود ہے۔ یہ مسئلہ ایسا آسان نہیں' ساری زندگی کا معاملہ ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ایک مطلوب شخص مل جائے تو اس سے بڑی دولت کیا ہے اور کہہ رہا تھا کہ اسے ایک شخص کی صورت میں اپنے خوابوں کی تعبیر نظر آتی ہے۔ وہ شخص اس کے لیے کسی منزل کی حیثیت رکھتا ہے۔"

"اتنی باتیں!" وہ جھپکتی پلکوں سے بولی۔

"میں صرف دہرا رہا ہوں۔"

"میں اعتراض نہیں کر رہی۔" وہ تیورا کے بولی۔

"کیلاش کے بقول اس کا اس لڑکی سے کبھی تعلق نہیں رہا۔ کوئی رسم و راہ بھی ان کے مابین نہیں' ابھی سب کچھ صرف کیلاش تک ہے۔"

میں نے دیکھا کہ جولین کی آنکھوں کی چمک تیز ہو گئی ہے۔

"اس نے مجھے نہیں بتایا کہ وہ کون ہے' نہ میں نے پوچھنا مناسب سمجھا۔ مجھے یقین ہے کہ کیلاش جیسے خوش وضع نوجوان کی نظر کسی مثالی لڑکی پر ہی گئی ہوگی۔"

جولین کے سراپا میں جنبش نہیں ہوئی۔

"ساتھ ہی کیلاش کو یہ دھڑکا بھی لگا ہوا ہے کہ اس لڑکی کے بھی اپنے ارادے' اپنے معیار ہو سکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں' یہ محض کسرِ نفسی ہے۔ بھلا کون لڑکی کیلاش جیسے باصلاحیت' تعلیم یافتہ اور نفیس شخص کے سلسلے میں انکار کر سکتی ہے' کیوں؟"

"ہاں شاید۔۔۔" وہ چرمراتی آواز میں بولی۔

"میں نے محسوس کیا کہ کیلاش اس لڑکی کے خیال و تصور میں کتنی دور جا چکا ہے۔ جب وہ یہ سب کچھ بتا رہا تھا تو اس کی اندرونی کیفیت کا اندازہ اس کے چہرے سے کیا جا سکتا

تھا۔ کیسی عجیب بات ہے کہ کسی رابطے اور سلسلے کے بغیر اس نے ایک بت بنالیا ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے نا؟ کوئی کسی کو یک طرفہ طور پر اپنے آپ سے اتنا قریب محسوس کرنے لگے؟"

"ہوں۔" جولین کی آنکھیں جل بجھ رہی تھیں۔

"ایک بات کیلاش نے اور کہی۔ جج صاحب کی وصیت کی قبولیت اور نا قبولیت اس لڑکی کے اقرار و انکار سے مشروط نہیں ہے۔"

"میں سمجھی نہیں۔" وہ الجھ کے بولی۔

میں جو بات کہنا چاہتا تھا' وہ میری زبان سے ادا نہیں ہو رہی تھی "مطلب یہ کہ۔۔۔" میں نے ہچکچاہٹ سے کہا "اگر وہ لڑکی اقرار کرلیتی ہے تو کیلاش کے لیے اس سے بڑی مسرت کوئی نہیں ہوگی۔ بصورت دیگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کوشلی سے مفاہمت کرلے۔ کوشلی کے ساتھ زندگی بھر کی رفاقت' کیلاش کے کہنے کے مطابق' ایک مسلسل جھوٹ ہوگا۔"

"تو الجھن کاہے کی ہے؟" وہ بے ساختہ بولی "فیصلہ تو کرلیا گیا ہے۔"

"ہاں ہاں۔" میں نے سر ہلا کے کہا "کسی حد تک یہ بات درست ہے لیکن فیصلہ تو ابھی صرف کیلاش کی حد تک ہے۔ کوئی شخص اکیلا نہیں ہوتا' بہت سے دوسرے بھی اس میں شامل ہوتے ہیں۔ آدمی کتنا مختار اور کتنا مجبور ہوتا ہے' یہ تو تم اچھی طرح جانتی ہو۔ کوئی کم' کوئی زیادہ مگر سب ہی جکڑے ہوئے ہیں۔"

"پھر' پھر کیا صورت ہے؟" وہ تذبذب سے بولی۔

"ایسے میں اس لڑکی کے اقرار کا گداز کیلاش کے لیے توانائی کا باعث ہوگا۔"

"اور انکار۔۔۔؟" وہ چبھتی ہوئی آواز میں بولی۔

"انکار سے کیلاش پر جانے کیسا عالم طاری ہو۔"

"اس لڑکی سے بات کی جائے؟"

اس کے لہجے میں طنز کی صاف آمیزش تھی میں نے تقریباً بد حواسی سے کہا "ہاں' یہی بات ہے۔"

"اور اگر اس نے انکار کردیا؟"

"کر سکتی ہے لیکن آخر کیوں کرے گی؟ اس کے سامنے کوئی ایرا غیرا نہیں' ایک ایسا نوجوان ہے جس کے آگے ایک یقینی مستقبل ہے۔ اس کا خاندان بڑا ہے اور عادت و اطوار شائستہ ہیں۔ غرض ہر پہلو سے وہ ایک مکمل آدمی ہے۔ دردمندی کی خوبی بھی اس میں کمال کی موجود ہے۔"

"ممکن ہے' وہ لڑکی بھی ان خوبیوں کی معترف ہو۔ اس کے باوجود خود کو آمادہ نہ کرپائے۔ شاید تم ہی نے کبھی کہا تھا کہ ہر جگہ ترازو نہیں چلتا کیوں کہ ترازو میں بہت سی چیزوں کا وزن نہیں ہوپاتا۔"

"شاید میں نے کہا ہو اور یہی اب بھی کہہ رہا ہوں مگر پھر کیلاش کا کیا ہوگا؟ وہ تو بالکل اجڑ جائے گا۔"

"دوسرے لفظوں میں اس لڑکی کو کیلاش کی خاطر اپنے خوابوں کا ایثار کرنا چاہیے یا یوں کہو کہ وصیت سے ملنے والی دولت کی محرومی میں وہ کیلاش کے لیے مداوا ثابت ہوگی۔"

جولین کے لفظوں کی تلخی مجھے کچھ دیر میں محسوس ہوئی' میں بے خیالی میں کہہ چکا تھا کہ ہاں کیلاش کے لیے وہ لڑکی بجائے خود ایک بڑی دولت ہے۔

اور اس طرح ایڈ جسٹ منٹ ہوجائے ورنہ ہر صورت میں محرومی رہے گی۔" وہ دہکتی آواز میں بولی۔

"اس طرح کیوں سمجھ رہی ہو۔" میں نے بہت کوشش کی لیکن اپنی آواز کی درشتی میرے بس میں نہیں تھی۔ میں نے کہا "وصیت کا اس سے کیا تعلق' میں نے تمہیں بتایا نہیں کہ وصیت کی تعمیل کا اس معاملے پر دارومدار نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے۔ وصیت کے ذکر سے صرف یہ بتانا مقصود تھا کہ کیلاش کو ان دنوں کسی آزمائش کا سامنا ہے۔ وصیت تو چند روز پہلے کی بات ہے' جج صاحب کی موت کے بعد اسے یہ علم ہوا تھا کہ اس لڑکی کو تو اس نے وصیت سے کہیں پہلے دیکھا تھا اور خواب دیکھنے شروع کردیے تھے۔ تم نے نجانے کا کیا مطلب لے لیا۔"

جولین کچھ نہیں بولی' بس چمکتی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی۔ میرے ذہن میں سب رُل مل گیا کہ میں کیا کہنا چاہتا اور کیوں جمرو اور شامو کے ساتھ جانے کے بجائے اتنی رات کو اس کے پاس ٹھہر گیا تھا۔ خاموشی کے اس وقفے میں بہرحال مجھے اپنے آپ کو مجتمع کرنے کا موقع مل گیا۔ میں نرمی سے کہا "جانے بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ مجھے صرف کیلاش کا حال بتانا تھا۔ کیلاش نے یہ سب کچھ کہا مجھے بہت محسوس ہوا۔ اتفاق ہے کہ تم اس وقت مل گئیں میں یہ باتیں جمرو اور شامو سے نہیں کرسکتا تھا مگر ایسا لگتا کہ تم نے کوئی توجہ نہیں دی؟"

"نہیں۔" وہ سیدھی ہو کے بولی "میں نے پوری توجہ سے سنا ہے۔"

"کیلاش نے کسی مجبور کی طرح مجھ سے بات کی ہے۔"

"سنا ہے' ایسا آدمی مجبور ہی ہوتا ہے۔"

"نامرادی کی صورت میں آدمی کی پوری زندگی اکا۔۔۔ چلی جاتی ہے۔"

"سب ہی کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا۔" وہ مدھم لہجے میں بولی "وقت آدمی کے لیے اگر زخم ہے تو مرہم بھی ہے۔"

"مگر وقت کبھی کسی سے زندگی بھر نامہربان بھی رہتا ہے۔ وقت کا سلوک ہر ایک سے الگ ہے' بہرحال۔" میں نے کہا "کیلاش ایک اچھا آدمی ہے۔ اچھا آدمی بھی ایک دولت ہوتا ہے۔"

"اس سے کون انکار کرسکتا ہے۔"

"پھر یہ دولت اس لڑکی کے نصیب میں ہی تو آئے گی جو کیلاش سے وابستہ ہوگی۔"

"یقیناً' بشرطیکہ وہ حاجت مند ہو' وہ اگر خود مالا مال ہے تو اسے کسی طرف دیکھنے' کسی اور طرف نظر رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"ہاں' تم ٹھیک کہتی ہو۔" میں نے شکستگی سے کہا۔

"ویسے ہمدردی اور ایثار کی بات دوسری ہے۔"

"زندگی بھر کے لیے شاید کوئی اتنا بڑا ایثار نہیں کرپاتا۔"

"کیوں نہیں کرپاتا۔ ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں۔"

"تم جو کہہ رہی ہو وہ بڑی حد تک درست ہے لیکن میں سوچتا ہوں' بقول تمہارے' کوئی پہلے سے اتنا آسودہ' ایسا مشروط یا پابند نہ ہو تب۔۔۔" میں نے منتشر آواز میں کہا "اگر یہ سب نہ ہوا تو کیا کوئی لڑکی کیلاش کو مسترد کرسکتی ہے۔"

"شاید نہیں۔۔۔" وہ جیسے اپنے آپ سے بولی۔

"فرض کرو۔" میری آواز حلق میں پھنسنے لگی لیکن میں نے کہہ دیا "فرض کرو' وہ لڑکی تم ہو۔" اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور ہونٹ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

میں نے بہ عجلت صراحت کرنی چاہی مگر مجھ سے کوئی بات نہ بن سکی' میں نے معذرت طلب لہجے میں کہا "یہ محض ایک مفروضہ ہے لیکن۔۔۔" جولین کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ کہیں میری زبان سے کوئی ایسی ویسی بات نہ نکل جائے اس لیے میں نے خود کو روک لیا۔ اس پر سکتہ طاری تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کون سی حالت ہے۔ یہ کسی دل خوش کن بات کا فطری رد عمل ہے یا کوئی طلسم خیال ٹوٹ جانے کا صدمہ؟ ہر آدمی اپنے شیش محل میں رہتا ہے۔ چند لمحوں کے جمود میں میرے سینے میں تلاطم سا اٹھا۔ مجھے یہ اخذ کرنے میں دیر نہیں لگی کہ جولین کی حالت تو خانہ بدری کی سی ہے۔ ایک گھر ہر آدمی کے اندر بسا ہوا ہوتا ہے یا کسی گھر میں بسا ہوا جو آدمی ہوتا ہے' وہ اس کے خیالوں اور خوابوں کا گھر ہے۔ اس کے لیے نہ چونے کی ضرورت پڑتی ہے' نہ گارے کی۔ وہ تو شیش محل ہے' وہ تو راج محل ہے۔ کوئی ایک دم' ناگہاں یوں ویران نہیں ہوجاتا۔ ایسا لٹا لٹا اور اجڑا اجڑا جیسے میں نے جولین کو گھر سے بے گھر کردیا ہو۔ کسی نے کہا ہے' کبھی ایک حرف نامہرباں بھی سنگ گراں کا اثر رکھتا ہے۔ اس کی آنکھیں چھلک رہی تھیں۔ میں نے خفت سے کہا "تمہیں بتایا نا کیلاش نے کسی کا نام نہیں لیا ہے لیکن یہ ممکن تو ہے۔"

"خدا کے لیے کچھ مت کہو۔" وہ ہیجانی آواز میں بولی۔

"نہیں نہیں' میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں تم سے کیا کہوں' تمہارے لیے میرے دل میں۔۔۔ مجھے غلط مت سمجھو۔" میں نے عاجزی سے کہا "ضروری نہیں کہ وہ تم ہی ہو اور اگر ایسا ہے بھی تو یہ کوئی الزام نہیں ہے۔ تم ایک پڑھی لکھی' سیاہ و سفید میں تمیز کرنے والی لڑکی ہو اور مختار بھی۔۔۔"

میرے لہجے کی منت رائگاں نہیں گئی۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی گھٹا کسی قدر کم ہوئی "کیا تم اتنی دیر سے یہی جتانے کی کوشش کررہے تھے؟" اس نے بوقت کہا۔ اس کی آواز ڈول رہی تھی۔

"ہاں' یہ غلط بھی نہیں ہے لیکن یہ سب میرا قیاس ہے۔ سیدھے لفظوں میں' میں تو صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ ایسی صورت میں تمہارا کیا جواب ہوگا۔ میری بات سے تمہیں دکھ پہنچا ہے تو میں اپنا کہا سنا واپس لیتا ہوں۔ میرا مقصد کسی طرح تمہیں دکھ پہنچانا نہیں تھا۔"

"تم' تم کیا سمجھتے ہو؟" وہ ناتوانی سے بولی۔

"مجھے کیا سمجھنا ہے۔"

"تمہاری بھی تو کوئی رائے ہوگی؟"

"میری رائے!" میں سٹپٹا گیا "میری رائے کچھ نہیں۔"

"تم بھی تو میرے لیے فیصلہ کرسکتے ہو۔"

"ہاں ہاں' کیوں نہیں۔" میں نے کسی تاخیر کے بغیر کہا۔

"سو اگر تم یہی سمجھتے ہو تو' تو۔۔۔" وہ لرزتے ہوئے ہونٹوں سے بولی۔

"میں تو تم سے پوچھ رہا ہوں۔"

"مجھ سے کچھ مت پوچھو۔" وہ کٹی پھٹی آواز میں بولی "میں' میں کیا کہہ سکتی ہوں۔"

"یقیناً' تمہیں یہ سب کچھ اچھا نہیں لگا' مجھے بھی نہیں لگا۔ میں بھی کیسا پاگل ہوں۔ تم سے اب کچھ پوچھنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں کیلاش کی وکالت کررہا تھا لیکن میں تم سے پھر کہوں گا کہ یہ کوئی برائی نہیں ہے۔ کوئی بھی کسی کی آرزو کرسکتا ہے۔ کیلاش کا حال جان کر

مجھے جانے کیوں بہت وحشت ہوئی تھی اسی لیے تو میں نے تم سے اتنی بات کی۔ کوئی جلدی نہیں ہے۔ غور و خوض اور کسی بہتر فیصلے تک پہنچنے کے لیے بہت وقت پڑا ہے۔"

"میرے پاس کوئی وقت نہیں ہے۔"

"کیا مطلب! کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"کچھ نہیں' میں اپنے حال میں ٹھیک ہوں۔ میرے لیے ہر وقت ایک جیسا ہوگا۔" اس کی آواز جیسے کہیں دور سے آرہی تھی "اور اگر یہی ہے تو سب کچھ تم پر ہے' تم جتنا چاہو وقت لگاؤ اور جو چاہو فیصلہ کردو۔"

"لیکن ظاہر ہے' میں تمہاری مرضی کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا۔ میں کیا' کوئی بھی۔"

"میری مرضی کوئی نہیں' میرے پاس سوچنے کے لیے کچھ نہیں۔"

"ایسا کیا' تم یہ کیوں کہہ رہی ہو' تم ایک' ایک۔۔۔" میں نے ملائمت سے کہا "دیکھو نا' کبھی نہ کبھی تو ہر ایک کو کسی نتیجے پر پہنچنا پڑتا ہے۔ کوئی فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ تمہیں ایک بھرپور زندگی گزارنی ہے۔ یہ تمہارا حق ہے' یہی ہونا چاہیے اور خدا کرے ایسا ہی ہو۔"

"مجھے اس کی ایسی فکر نہیں ہے۔" وہ آزردگی سے بولی۔

"کیوں نہیں' تمہیں نہیں تو دوسروں کو تو ہے۔"

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں۔ انہیں ہے تو وہ حکم سنادے گا۔"

"تم کیسی باتیں کررہی ہو؟" میں نے مضطربانہ کہا "ٹھیک ہے پھر' مجھے کچھ اور نہیں کہنا۔ میں نے پہلے ہی شاید تم سے سب کچھ کہہ دیا ہے۔ ہوسکے تو دوبارہ غور کرلینا۔"

"میں نے بھی تم سے کچھ کہا ہے۔" اس کی آواز بھری ہوئی تھی۔

میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس کا سلگتا چہرہ' اس کا بکھرا بکھرا سراپا۔ وہ بہت شکستہ و شکست خوردہ نظر آرہی تھی۔ میرا حال بھی اس سے اتنا مختلف نہیں تھا۔ میں نے اس سے کہنا چاہا کہ کسی سے وابستگی سے مراد اپنی دولت چھن جانا نہیں ہے۔ یہ دولت نہ تو چوری ہوتی ہے' نہ اسے کوئی غصب کرسکتا ہے۔ یہ تو زنجیروں میں بھی باقی رہتی ہے مگر میں کچھ نہ کہہ سکا۔ وہ ایک ذہین لڑکی تھی۔ اسے جواب دینے میں دیر نہ لگتی کہ اس دلیل کا اطلاق تم پر بھی ہوتا ہے۔

میں کرسی سے اٹھ گیا کیونکہ رفتہ رفتہ مجھ پر ہول سا طاری ہونے لگا تھا۔ کچھ اس کے اضطراب انگیز سکون سے' کچھ اپنے آپ سے' اپنے اندر بڑھتے ہوئے اندھیرے سے۔ مجھے لفظ ہی سجھائی نہیں دے رہے تھے جو میں اس سے کچھ کہتا۔ آدمی اندھیرے میں جیسا اندھا ہوجاتا ہے۔ میں اس سے کچھ کہے سنے بغیر دروازے کی طرف بڑھ گیا لیکن باہر جاتے جاتے میں نے غیر ارادی طور پر مڑ کے دیکھا۔ وہ اسی طرح سر جھکائے بیٹھی تھی۔ میرا دل اس کے لیے بری طرح اڈنے لگا۔ اسے کوئی مژدہ سنانے' اس کا چھنا ہوا سکون لوٹانے' اسے کوئی مسرت دینے کے لیے میرا دل بے قرار تھا۔ بے اختیار میں اس کے قریب جا پہنچا۔ وہ چونک پڑی اور اس نے سر اٹھا کر بے تابانہ میری جانب نظر کی۔ اس کی سرخ آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ مجھے کچھ یاد نہیں رہا۔ میرے ہاتھ پاؤں ہی شل ہوگئے۔ ایسا لگا جیسے میں اس کے اور قریب ہوجاؤں گا تو میرے بچے کھچے حواس بھی جاتے رہیں گے۔ مجھے جیسے موت آجائے گی۔ مجھ سے یہ مذاق بھی نہ ہوسکا کہ یہ سب تو اسے چھیڑنے' اس سے لطف لینے کے لیے تھا۔ اس ستم سے تو بے زبانی ہی بہتر تھی۔ میں لمحوں تک اس کے سامنے بے حس و حرکت کھڑا رہا پھر میں وہاں نہیں ٹھہرا اور پلٹ کر تیزی سے کمرے سے باہر آگیا۔ ایک دست نگر کسی کی کیا دستگیری کرسکتا ہے۔ اپنی بے بسی' بے مائیگی [illegible] خیال مجھے اس کے پاس جاکے آیا۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ جمرو اور شامو کس طرف گئے ہیں۔ پہلے کمرے میں داخل ہونے پر مجھے ایک دیوان نظر آگیا۔ میں وہیں پڑا رہا۔ میرے مساموں سے پسینہ پھوٹ ر[illegible] تھا۔ رات کا آخری پہر ہوگا۔ ایک لمحے کے لیے میری آنکھ نہیں لگی۔ اپنے وجود پر چھائے ہوئے سناٹے کا سبب میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا' کون سی بات میرے وہم و گمان سے سوا تھی۔ میں جولین سے اور کیا جاننا چاہتا تھا؟ اور [illegible] لمحہ' جولین کا عزم و ارادہ جان کے .... میرے سینے میں طمانیت کی ایک لہر اٹھی تھی' کوئی جھماکا سا ہوا تھا۔ وہ لمحہ کہاں گم ہوگیا؟ ساری رات میں جیسے کسی آئینے کے مقابل کھڑا اپنی شکل دیکھتا رہا۔ اپنے آپ کو پہچاننا بھی کبھی آدمی کے لیے ایسا مشکل ہوجاتا ہے۔

○☆○

صبح فرخ نے مجھے اٹھایا اور اوپری منزل کے ایک کمرے میں لے گئی۔ اس کا انداز حاکمانہ تھا۔ اسے جیسے ... علم تھا میں رات بھر جاگتا رہا ہوں' ممکن ہے' جولین ہی نے اسے [illegible] ہو۔ کمرے میں نرم بستر کی مسہری موجود تھی۔ میرا جسم [illegible] بھی ٹوٹ رہا تھا' کسی چوں چرا کے بغیر فرخ کی ہدایت پر

وہیں لیٹ گیا۔ اس نے میرے سینے تک چادر پھیلا دی اور سرہانے بیٹھ کے سر دبانے لگی۔ اس کی انگلیوں میں بہت نرمی تھی اور لپک بھی۔ جذب ہونے یا جذب کرلینے کی کو شاید لپک کہتے ہیں۔ میری آنکھیں گھٹنے لگیں' امی بالکل اسی طرح سر دباتی تھیں' میرے کہے بغیر' از خود۔ وہ میری پیشانی پر کوئی شکن دیکھ کر سمجھ جاتی تھیں کہ آج میرا جی ٹھیک نہیں ہے۔ فرخ بھی چپ چاپ آہستہ آہستہ سر دباتی رہی۔ دیر ہوگئی تو اس نے یہ سمجھ کے کہ شاید میری آنکھ لگ گئی ہے' اپنے ہاتھ اٹھالیے اور بے آواز قدموں سے کمرے سے نکل گئی مگر اس کے جانے کے بعد بھی میں دیر تک جاگتا رہا پھر جانے کس وقت مجھے نیند آگئی اور میں دوپہر تک سوتا رہا۔

دوپہر کو سب نے ایک ساتھ کھانا کھایا اور وہیں میں نے جولین کو دیکھا۔ وہ معمول کے مطابق بظاہر پوری تن دہی سے کاموں میں مصروف تھی لیکن اس کا چہرہ صاف چغلی کھا رہا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ رات اس نے میرے ساتھ رما کے ہاں جانے کو کہا تھا۔ کھانے کے بعد میں نے اس سے پوچھا' نہ اس نے مجھے ٹوکا۔ میں نے بھی پھر ارادہ ملتوی کردیا اور ادھر ادھر گھومتا ہوا' اس کے کمرے کی طرف جا نکلا جہاں جمرو اور شامو نے ڈیرا جمایا ہوا تھا۔ مارٹی بھی وہاں موجود تھا۔ انہی کے ساتھ میں باہر نکل گیا۔ مارٹی کو راستوں کا اچھی طرح علم تھا۔ دو ایک گلیوں بعد ہی ایک پر رونق سڑک تھی۔ جہاں بڑی بڑی آراستہ و پیراستہ دکانیں بنی ہوئی تھیں۔ ہوٹل اور چائے خانے بھی سارے بمبئی سے الگ تھے۔ عام آدمیوں کا گزر اس بازار میں مشکل ہی سے ہوتا ہوگا۔ بازار کے پاس کچھ آگے سمندر کا کنارہ تھا لیکن ہم زیادہ دور نہیں گئے اور اندر ہی اندر چند گلیوں کا چکر کاٹ کر واپس آگئے۔ بڑے دروازے کے سامنے ایک نئی لمبی چوڑی' کالے رنگ کی موٹر گاڑی دیکھ کر ہم چاروں ہی ٹھٹک گئے تھے۔ کون مہمان اس موٹر میں آسکتا ہے۔ ابھی ہم یہ سوچ ہی رہے تھے کہ ٹنگو اچھلتا کودتا ہماری طرف آیا اور اس نے جوش و خروش سے بتایا کہ ابا جان نے ایک نئی موٹر گاڑی خریدی ہے۔

"ہائیں!" جمرو' شامو اور مارٹی دیدے نچاتے اور سیٹیاں بجاتے ہوئے موٹر کی طرف لپک پڑے۔ میں نے بھی قریب جاکے دیکھا' بالکل نئی گاڑی تھی۔ کالا رنگ ایسا چم چما رہا تھا کہ آدمی اپنی شکل دیکھ سکتا تھا۔ جمرو اور شامو دروازے کھول کر نشستوں کے گدوں پر اچھلنے لگے۔ شامو تو باقاعدہ ڈرائیور کی جگہ بیٹھ کے موٹر چلانے والا پہیا گھمانے اور ہارن بجانے لگا۔

شام کو اکبر کی زبانی معلوم ہوا کہ صبح جب میں سو رہا تھا تو بٹھل' ابا جان' منیر علی اور مولوی اکرم' تعزیت کے لیے کیلاش کے ہاں گئے تھے۔ فرخ' شہ پارہ' فریال' چمپا بیگم اور جولین کی ماں بھی ان کے ساتھ تھیں۔ ایک موٹر میں جگہ کم پڑ گئی ہوگی غالباً اسی لیے ابا جان نے دوسری موٹر خرید لی۔ پیسے پاس نہ ہوں تو ارادے کو دیر لگتی ہے اور پیسے پاس ہوں تو ارادہ خود بہ خود پیدا ہوجاتا ہے۔ اکبر نے جولین کا نام نہیں لیا۔ یہ سن کے میں سوچتا رہا' کہیں جولین میری منتظر نہ ہو۔ وہ ایک متحمل مزاج لڑکی ہے۔ تعزیت کی بات الگ ہے اور کم از کم رما کی خیر خبر لینے تو اسے ضرور جانا چاہیے۔ میں خود بھی اس سے پوچھ سکتا تھا لیکن جانے کیوں میں نے فرخ کی مدد لی۔ جولین نے طبیعت کی ناسازی کا عذر کردیا پھر اکیلے جانا مجھے اچھا نہیں لگا۔ جمرو اور شامو عقبی حصے کے ایک کمرے میں جگنو اور دیوا کو مشق کرا رہے تھے۔ میں بھی وہیں چلا گیا۔ جگنو کے ہاتھ میں کھلا چاقو تھا اور وہ بڑھ بڑھ کے' پینترے بدل بدل کر جمرو پر وار کررہا تھا۔ نہتا جمرو' جگنو کے داؤ پر پھرتی سے پہلو بچا جاتا۔ جگنو کے جسم میں بجلی کم نہیں تھی۔ مجھے دیکھ کے اس کے ہاتھ پیر کچھ اٹکنے لگے اور جمرو اس کے پنجے پر ہاتھ ڈالنے میں کامیاب ہوگیا۔ میں نے جگنو کو سمجھایا کہ نگاہ بھٹکنے سے سارا معاملہ ہی چوپٹ ہوجاتا ہے۔ آدمی کو چاقو کی گرفت سے زیادہ نگاہ گرفت میں رکھنی پڑتی ہے اور نگاہ کا ارتکاز' ذہنی ارتکاز کے بغیر ممکن نہیں۔ چاقو آزمائی کے وقت آدمی کو اپنے تمام حواس' سننے اور دیکھنے کی ساری قوت بس مقابل پر مرکوز کردینی چاہیے اور کوشش کرنی چاہیے کہ کسی طور پر اس کی توجہ ہٹ جائے۔ اچانک ادھر ادھر دیکھنے اور خواہ مخواہ چونک پڑنے سے بھی ناپختہ کار مقابل منتشر ہوسکتا ہے۔ میں نے بٹھل کی زبانی سنی ہوئی بہت سی باتیں انہیں بتائیں پھر میں خود ان کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ شروع شروع میں وہ جھجکتے رہے لیکن میں جان بوجھ کر طرح دیتا رہا۔ ان کے جسم کھلتے گئے۔ دونوں میں پھرتی تھی۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ چاقو میرے جسم سے مس ہوتے ہوتے رہ گیا اور اتنے مشاق ہونے کے باوجود جمرو اور شامو اپنی سسکاریاں نہ روک سکے۔ عین موقع پر میں کسی نہ کسی حربے سے جگنو اور دیوا سے دور ہوجاتا یا انہیں گڑبڑا دیتا۔ وہ آپس میں الجھ جاتے پھر ہانپنے لگتے اور ہنسنے لگتے۔ میں نے بہت دنوں بعد چاقو کا سامنا کیا تھا۔ ہم سب پسینے پسینے ہوگئے۔ ان کی آزمائش سے اندازہ ہوا کہ انہیں مسلسل ریاضت کی ضرورت ہے لیکن زیادہ وقت نہیں لگے گا' ان کے دست و

بازو میں اعتماد آجائے گا۔ اعتماد کی ان میں بڑی کمی تھی اور بٹھل کے بقول سب سے بڑی ریاضت تو اعتماد ہی ہے۔ مقصد کی ان کے پاس کثرت تھی جس سے جوش و غضب طے ہوتا ہے۔ بٹھل کا کہنا تھا کہ مقصد پاس ہو تو آدمی کی طاقت سوا ہو جاتی ہے۔ اسی شہر میں جگنو اور دیوا نے عمریں گزاری تھیں لیکن اب آب و ہوا بدلنے کا اتنا فرق نہیں پڑتا جتنا لوگوں کی تبدیلی کا۔ آدمی خزاں' آدمی بہار ہے۔ ان کے چہروں سے برسوں کی جمی ہوئی دھند اتر رہی تھی۔ اتنے کم دنوں میں رنگ نکھر گیا تھا۔ لہجوں میں بھی ٹھہراؤ آگیا تھا۔ میں نے طے کیا کہ اب میں روزانہیں کچھ نہ کچھ وقت ضرور دیا کروں گا۔ بنارسی کے سامنے جانے کا جتنا جنون انہیں تھا' اتنا ہی مجھے بھی تھا۔

رات کے کھانے میں ابھی وقت تھا۔ جمرو اور شامو کے اصرار پر بٹھل کو بتا کے ہم سب گھر کے قریب ساحل کی طرف چلے گئے۔ ہوا میں خنکی تھی' لیکن سکون بہت تھا۔ سمندر کے شور میں بھی کیسا سکوت ہوتا ہے۔ جگنو اور دیوا ہمارے ساتھ نہیں آئے تھے۔ ایک تو انہیں بٹھل کی خدمت گزاری کا خیال تھا کہ اسے کسی چیز کی ضرورت نہ پڑ جائے' دوسرے وہ اپنے آپ کو لوگوں کی نظروں سے زیادہ سے زیادہ دور رکھنا چاہتے تھے۔ مبادا بنارسی تک خبر پہنچ جائے کہ وہ کن لوگوں کے ساتھ ہیں۔ یہی اندیشہ پیرو کے دسویں پر انہیں لاحق تھا۔ شاید ان کے لیے یہی مناسب بھی تھا کہ سردست وہ کسی پیچیدگی سے بچیں۔ ساحل پر اندھیرا گہرا تھا۔ بادلوں نے آسمان ڈھانپ رکھا تھا۔ سمندر کے سامنے آدمی کو آزادی کا احساس ہوتا ہے' آزادی کا بھی اور کم تری کا بھی۔ سمندر دنیا کی ہر چیز سے بڑا ہے۔ ہمیں اڈے پاڑے کا کوئی آدمی دکھائی نہیں دیا۔ اس طرف شہر کے دوسرے ساحلوں جیسی بھیڑ بھاڑ نہیں تھی۔ ہم کنارے کنارے کہیں سے کہیں نکل گئے۔ کانتے کی موت کے بعد سب نے بہت محبوس وقت گزارا تھا۔ پیرو کے جانے کے بعد رات دن اور پہاڑ ہو گئے تھے۔ ابا جان ٹھیک کہتے تھے' گھر بدلنے سے کم از کم اس ہانپتے رینگتے وقت سے کسی قدر نجات کا گمان ہوتا تھا۔ میں نے اسی لیے انہیں نہیں روکا کہ اچھا ہے' کچھ وقت وہ اپنے ساتھ بھی گزار لیں۔ لوٹ کے آخر انہیں پھر گھر ہی جانا ہے۔ بے شک مکان وہ نہیں ہے' مکیں وہی ہیں' وہی حسرت و یاس سے ایک دوسرے کی صورت دیکھتے ہوئے لوگ۔ آدمی کا یہی ہے کہ اسے لوٹ کے اپنے مسکن کی طرف جانا پڑتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا کہ آدمی آگے ہی آگے چلتا رہتا' ایک پڑاؤ کے بعد دوسرا پڑاؤ' ایک منزل کے بعد دوسری منزل۔ اسے پچھلی منزل پر لوٹنا نہ پڑتا تو جانے آدمی کیسا مختلف ہوتا۔

ہم کنارے کی نم زمین پر اپنے نقش چھوڑتے ہوئے بڑھتے رہے اور لہریں ہمیں چھو چھو کر لوٹتی رہیں اور سارے نقش مٹاتی گئیں' وقت کی طرح۔ وقت بھی پچھلے نقش مٹا دیتا ہے۔ آگے لکڑی اور بانس کے بنے ہوئے ایک صاف ستھرے ہوٹل سے اٹھنے والی' تلی ہوئی مچھلی کی خوشبو پر شامو پھیل گیا۔ کھانے میں اور دیر ہو گئی۔

واپسی میں ہوٹل کے نزدیک ایک طرف چیخ و پکار ہو رہی تھی اور لوگ دائرے کی صورت میں اکٹھے تھے۔ یقیناً کوئی حادثہ ہو گیا تھا۔ مارٹی اور شامو وہاں جانے کے لیے پھڑکنے لگے۔ میں نے تلخی سے منع کر دیا۔ ان کی سمجھ میں جلد ہی آگیا کہ کنارہ کشی ہی عافیت کی ایک صورت ہے۔ بھیڑ میں صرف تماشا ہی نہیں ہوتا تماشائی بھی کبھی تماشا بن جاتا ہے۔ بھیڑ تو جنگل کی' دلدل کی طرح ہے۔ جنگل میں راستہ نہیں ملتا' دلدل میں آدمی دھنستا چلا جاتا ہے۔

ہم بوجھل قدموں سے گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ کیلاش اور رما بھی ابھی ابھی آگئے ہیں۔ کھانا بھی انہوں نے یہیں کھایا تھا۔ فرخ نے بتایا کہ شکلا بھی آیا تھا اور ابا جان کے ساتھ سارا مکان دیکھ کے گیتا اور رانی کی سوا فرداً فرداً سب کو مبارک باد دے گیا ہے۔ داد و ستائش امارت کا لازمی جزو ہیں اس کے بغیر امارت کا لطف آدھا رہ جاتا ہے۔ ابا جان نے ایک ایک چیز تفصیل سے دکھائی ہو گی۔ شکلا بہرحال ایک پولیس افسر تھا۔ اتنا کچھ دیکھ کے ضرور اسے بے چینی ہونی چاہیے تھی کہ ابا جان آخر کہاں کے رئیس تھے۔ ممکن ہے' اسے یہ بدگمانی ہوئی ہو کہ کہیں میں نے کرشنا جی کا ترکہ تو ٹھکانے نہیں لگا دیا؟

جولین مجھے آمنے سامنے کہیں نظر نہیں آئی۔ میں نے فرخ سے پوچھنا چاہا لیکن خاموش رہا۔ جمرو اور شامو جس کمرے میں سونے کے لیے گئے تھے' میں بھی وہیں چلا گیا اور کسی وقت مجھے نیند آگئی۔

ہمیں نئی جگہ آئے ہوئے تیسرا دن تھا۔ اس دن سرشام ابا جان نے سب کو جمع کیا پھر گیتا اور رانی کے آگے کاغذات کا ایک پلندا رکھ دیا۔ ابا جان نے محمد علی روڈ کے گنجان آباد علاقے میں گیتا کی ماں رانی کے نام سے ایک پانچ منزلہ عمارت خریدی تھی۔ ہر منزل پر بارہ فلیٹ تھے اور فرشی منزل پر آٹھ دکانیں تھیں۔ ابا جان کے کہنے کے مطابق عمارت تعمیر ہوئے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ پوری عمارت میں کرائے دار بسے ہوئے تھے اور تبدیلی پر ہر مرتبہ رسید بدلوائی کی ایک مخصوص رقم الگ ملتی تھی۔ امکان یہ تھا کہ آئندہ پچاس سال تک عمارت میں کسی بڑی مرمت کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ کرائے کی وصولی اور کرائے داروں سے دیگر معاملات نمٹانے کے لیے ابا جان نے عارضی طور پر ایک ذمے دار آدمی کا تقرر بھی کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے گیتا کے جہیز کے لیے ایک لاکھ روپے بینک میں جمع کرائے تھے۔

دونوں گنگ بیٹھی سنتی رہیں۔ ابا جان نے انہیں کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ کہنے لگے کہ وہ کوئی احسان نہیں کر رہے ہیں' یہ ان کا فرض بھی ہے اور پیرو کا حق بھی۔ پیرو انہیں ایک بزرگ کا مرتبہ دیتا تھا اور وہ اسے چھوٹا سمجھتے تھے۔ گویا یہ چھوٹے بڑے بھائی کا معاملہ ہے۔ ابا جان نے وضاحت کی کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ گیتا اور رانی کے فرض سے سبکدوش ہو گئے ہیں۔ رشتوں میں سبک دوشیاں نہیں ہوتیں۔ گیتا اور رانی ان کے لیے فرخ' فریال اور فارہہ کے مانند ہیں۔ جس طرح فرخ' فریال اور فارہہ اس گھر میں شریک ہیں' گیتا اور رانی کی بھی ان کی نظر میں یہی حیثیت ہے۔ کہنے لگے' اس کاغذی کارروائی کی ایسی ضرورت نہیں تھی لیکن کل کا کیا بھروسا؟ وہ اپنی زندگی کی سرحدوں پر آچکے ہیں لہٰذا انہوں نے خوب سوچ سمجھ کے گیتا اور رانی کے تحفظ اور اپنے اطمینان کے لیے یہ قدم اٹھایا ہے۔ خدا بہتر جانتا ہے' ان کے پاس جو کچھ ہے' اس میں پیرو کی اعانت کا کس قدر حصہ ہے۔ پیرو کی محبت اور اس کے سلوک کی یہ کوئی قیمت نہیں ہے۔ وہ اصل قیمت ادا کر ہی نہیں سکتے۔ ابا جان نے دل سوزی سے کہا کہ کاش وہ پیرو کو واپس لا سکتے۔ یہ ممکن ہوتا تو وہ اپنا سب کچھ نچھاور کر کے اسے لے آتے۔

گیتا اور رانی پتھر کی طرح ساکت بیٹھی رہیں۔ سب کا یہی حال تھا۔ ابا جان نے بتایا کہ وکیل اور دو ایک سرکاری کارندے باہر انتظار کر رہے ہیں۔ کاغذات کی قانونی تکمیل کے لیے وہ گیتا اور رانی سے دستخط لیں گے۔ گیتا اور رانی کے جسموں میں پہلی بار جنبش ہوئی۔ دونوں کی حیران و پریشان نظریں سیدھی بٹھل کی طرف گئیں۔ بٹھل نے آنکھیں میچ کے گویا اپنی طرف سے اقرار کا اظہار کیا۔ یقیناً ابا جان نے اس سے پہلے بات کر لی ہو گی۔ ابا جان کی ہدایت پر جمرو باہر بیٹھے ہوئے آدمیوں کو بلا لایا۔ وہ تعداد میں چار تھے۔ ابا جان نے شیروانی کی جیب سے قلم نکال کر رانی کے سامنے رکھ دیا۔

○☆○

نئے گھر میں سب ہفتے بھر میں پرانے ہوگئے تھے۔ ان کے قدموں میں تیزی آگئی۔ قدموں میں تیزی اور روانی سے مراد ہے کہ قدم فاصلوں سے مانوس ہوگئے ہیں۔ اجنبی درو دیوار میں آدمی سمٹتا ہوا، جھجکتا ہوا چلتا ہے۔ آوازوں کا بھی یہی ہے، ان کی آوازیں بھی اونچی ہونے لگی تھیں۔ ہر ایک نے اپنے لیے کوئی نہ کوئی گوشہ منتخب کرلیا تھا لیکن زیادہ تر شب بسری کے لیے دن بھر وہ نچلی منزل کے چند بڑے کمروں تک محدود رہتے۔ دائیں جانب کا حصہ کسی حد تک مردانے کے لیے مخصوص ہوگیا تھا۔ وہاں کسی کے آنے جانے پر پابندی نہیں تھی مگر سب خود ہی خیال رکھنے لگے تھے۔ کوئی کہاں ہوگا، کسے کہاں آواز دینی چاہیے؟ ابتدائی چند دنوں میں سب ایک طرح سے عمارت میں مقید رہے تھے، اب باہر بھی نکلنے لگے۔ باغ میں خاص طور پر۔ انہوں نے اپنی پسند کے مطابق گھر کی سجاوٹ میں ترمیمیں شروع کردی تھیں۔ رنگ برنگے تازہ پھولوں کے گلدان جا بجا میزوں اور دریچوں پر نظر آنے لگے تھے۔ گھر میں رہنا اور گھر میں شامل ہونا الگ الگ بات ہے۔ گھر کی سجاوٹ پر توجہ کا بھی شاید یہی مطلب ہے کہ مکینوں کو گھر سے رغبت ہورہی ہے۔ اس عرصے میں ملازموں کی تعداد میں کچھ اور اضافہ ہوگیا تھا۔ حکم پر، پندرہ منٹ میں گھوڑا گاڑی تیار ہوجاتی تھی۔ گھوڑا بھی خاص نسل کا اور آزمودہ کار معلوم ہوتا تھا۔ دو ایک مرتبہ چمپا بیگم اور جولین کی ماں، شہ پارہ اور فرخ کے ساتھ گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کر بازار گئی تھیں اور لدی پھندی واپس آئی تھیں۔ ادھر گیتا اور رانی بھی اپنی آنکھوں کا دریا خشک کرنے کی کوشش کررہی تھیں۔ دوسروں کی خاطر غمزدگان کو ایک جبر یہ بھی سہنا پڑتا ہے۔ ویسے کوئی بھی ان دونوں کو اکیلا نہیں چھوڑتا تھا۔ تنہائی غم کے لیے اور ستم ہوتی ہے۔ گیتا کا تو وہ خاص خیال رکھتی تھیں۔ فرخ، فریال، فارہہ، ریحانہ، شہ پارہ اور جولین میں سے کوئی نہ کوئی ہر وقت گیتا کے ساتھ رہتا تھا۔

ایک روز جمرو اور شامو شام کے وقت سب کو موٹر میں بٹھا کے سمندر کے کنارے لے گئے۔ جولین کی ماں، چمپا بیگم اور رانی ان کے ساتھ نہیں تھیں۔ وہاں جا کے ان سب کو بہت اچھا لگا۔ وہ کنارے کنارے سیر کرتی رہیں۔ انہیں ہم سے اتنا آگے نہیں جانا چاہیے تھا۔ انہیں اکیلا سمجھ کے چند شہدے ان کے قریب جا کے بے ہودہ گوئی کرنے لگے۔ دور سے یہی لگتا تھا، وہ گھبرا کے پیچھے ہٹ گئیں اور پلٹ کے سب نے ہماری طرف دیکھا۔ ہم خاصے فاصلے پر بیٹھے ہوئے تھے لیکن جمرو اور شامو کی نظریں انہی کی طرف تھیں۔ انہوں نے شہدوں کو تاک لیا اور اٹھ کے بے تحاشا جولین اور فرخ وغیرہ کی طرف بھاگنا شروع کردیا۔ وہ لوگ تعداد میں پانچ تھے، پہلے تو وہ بوکھلائے لیکن پھر یہ دیکھ کے کہ جمرو اور شامو صرف دو آدمی ہیں، وہ ڈھٹائی پر اتر آئے اور ٹھہر گئے۔ مارٹی نے بھی اٹھ کے جمرو اور شامو کے ساتھ بھاگنا چاہا تھا۔ میں نے اسے روک لیا۔ مجھے یقین تھا کہ جمرو اور شامو کافی ہوں گے اور یہی ہوا بھی۔ جمرو اور شامو نے ان سے کوئی سوال جواب نہیں کیا، ایک لمحہ ضائع کیے بغیر انہوں نے دو کو نپی تلی ضربوں سے پلے ہی ہلے میں ریت پر لوٹا دیا۔ گردن پر ترچھے ہاتھ کی ضرب ٹھیک سے پڑ جائے تو آدمی کے قدم جمے نہیں رہ سکتے۔ کسی کو بھی ان سے اس تیزی کی توقع نہیں ہوگی۔ باقی تین کو چونکنے کا موقع ضرور ملا تھا، سنبھلنے کا نہیں۔ جمرو اور شامو ان پر جھپٹ پڑے اور انہوں نے دیوانوں کی طرح بے دریغ ان پر ضربیں لگانا شروع کردیں۔ ان کے ہاتھ بھی چل رہے تھے، پیر بھی۔ ایک کو چھوڑ کر فوراً دوسرے کے سامنے آجاتے۔

میں اور مارٹی دور سے دیکھتے رہے۔ ان میں سے دو تو بھاگ کھڑے ہوئے، تیسرا بھی بھاگ جاتا مگر عین وقت پر شامو نے اس کی گردن پیچھے سے دبوچ لی۔ شامو کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ جگہ بنا کے اس کی کمر پر گھٹنا مارنا چاہتا ہے۔ اگر یہی بات تھی تو شامو کو خود کو پیچھے ہٹانے کے علاوہ جھٹکا دے کے اس کے جسم کو بھی تھوڑا سا خم دینا چاہیے تھا۔ اس طرح کہ اس کے پیر اور سر سیدھ میں ہوجائیں اور جسم کا درمیانی حصہ کچھ آگے نکل جائے اور کمر کی جانب سر اور ٹانگوں کے درمیان خلا پیدا ہوجائے۔ اس صورت میں جسم کچھ اکڑ سا جاتا پھر اوپر گردن پر گرفت، ادھر دو قدم پیچھے ہو کے شامو کے گھٹنے کی ضرب اسے بے حال کردیتی مگر جمرو اور شامو کو اس کارروائی کی مہلت نہیں دی۔ وہ دور بھاگے ہوئے آدمیوں سے نمٹ کے جیسے ہی شامو کی طرف پلٹا، اس نے آگے سے شامو کی گرفت میں اکڑے ہوئے آدمی کے پیٹ پر ٹھوکر مار دی۔ ناٹے قد کے شہدے کے جسم کا سامنے والا حصہ شامو کی کوشش سے آگے نکلا ہوا تھا۔ شامو کو خود قابو پانا مشکل ہوگیا ہوگا، وہ پوری طرح تیار تھا۔ اگر اس کی ضرب بھی کمر پر لگ جاتی تو آگے پیچھے پے در پے شدید ضربوں سے اس نابکار کی سانس واپس نہ آتی۔ شامو نے اس کی گردن چھوڑ دی، جمرو کی ٹھوکر سے وہ پیٹ پکڑے بلبلاتا ہوا ریت پر لوٹنے لگا۔

اس اثنا میں پہلے دو آدمی اٹھ کھڑے ہونے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کھلے چاقو دیکھ کر جولین، گیتا

فرخ سب ہی کی چیخیں نکل گئیں۔ میرے پاس بیٹھا ہوا مارٹی بھی پھڑکنے لگا تھا۔ میں نے اسے پھر بھی نہیں جانے دیا۔ مارٹی کو جمرو اور شامو کی چابک دستی کا صحیح اندازہ نہیں تھا۔ جمرو اور شامو پھرکی کی مانند ادھر ادھر گھومنے لگے۔ آناً فاناً وہ رخ بدل لیتے تھے۔ ان کی پھرتی اور چستی سے دونوں چاقو برداروں کا منتشر ہوجانا لازمی تھا۔ جمرو اور شامو اسی طور کسی ایک رخ سے ان کی کلائیوں پر پنجہ ڈال سکتے تھے۔ چاقو نکالنے والے کو اس حقیقت کا احساس ہر دم رہنا چاہیے کہ کوئی اوچھا وار خود اس کے لیے بہت مہلک ہوسکتا ہے اسی لیے کہتے ہیں کہ چاقو نکالنے سے پہلے مقابل کے بارے میں ایک اندازہ کرلینے کی احتیاط بہتر رہتی ہے۔ جمرو اور شامو مسلسل انہیں بھبکیاں دے رہے تھے۔ مقابل کے اس اعتماد سے ماہر چاقو باز بھی ایک وقت کو متزلزل ہوجاتا ہے۔ وہ بری طرح سٹ پٹا گئے پھر جمرو اور شامو کو جلد ہی موقع مل گیا۔ مجھے پہلو بدلنے کی دیر لگی کہ دونوں چاقو برداروں کی کلائیاں جمرو اور شامو کے پنجوں میں جکڑی ہوئی تھیں۔ ایسے وقت میں جولین اور فرخ کو الگ الگ ہی رہنا چاہیے تھا۔ مگر یہ منظر دیکھ کے ان کے اوسان جاتے رہے ہوں گے۔ ان کی دخل اندازی سے جمرو اور شامو کسی قدر متذبذب ہوگئے۔ وہ چاقو بازوں کو اتنی جلدی نہیں چھوڑتے، کچھ دیر کے لیے انہیں ہلکان ضرور کرتے۔ وہ ایسے کم عقلے نہیں تھے کہ ان کے جسموں پر چاقو کی لکیریں ڈال کر اپنے لیے خواہ مخواہ کی الجھنیں پیدا کرتے۔ جولین، فرخ، گیتا کی موجودگی میں خون خرابے کی بات سے انہیں بہر طور اجتناب کرنا تھا لیکن جولین اور فرخ یہ سب کچھ نہیں جانتی تھیں۔ ان کا دہشت زدہ ہوجانا بھی اپنی جگہ بالکل درست تھا۔ انہیں کیا اندازہ ... کہ جمرو اور شامو کا چاقو سے کیا واسطہ رہا ہے۔ بچپن سے ان دونوں نے ایک ہی کام کیا ہے، چاقو سدھانے کا یا یہ کہنا مناسب ہوگا کہ چاقو کے لیے وہ اپنے آپ کو سدھاتے رہے ہیں اور چاقو پر دسترس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آدمی ساری باتوں سے نچنت ہوگیا اور اس کے پاس چاقو ہے اس لیے اسے جوش و غضب کے اظہار کی کھلی چھٹی مل گئی۔ اڈے پاڑے کا آدمی کتنا ہی مشتعل اور برہم ہو، اسے اپنی لگام کھینچ کے رکھنا پڑتی ہے۔ چاقو کے ساتھ آدمی کے لیے خود پر بھی قابو رکھنے کی مہارت ضروری ہے۔ وہ غیر ضروری طور پر چاقو نہیں نکالتا، چاقو پاس رکھتا ضرور ہے۔ جولین اور فرخ، جمرو اور شامو نے بہ عجلت اپنے پنجوں میں دو آدمیوں کی جکڑی ہوئی کلائیوں پر گرفت ڈھیلی کرکے خود کو اوپر اچھالا۔ چند انچ زمین سے اچھل کے وہ اپنے ہاتھوں پر تمام کا سارا زور دینا چاہتے تھے تاکہ کلائی پر جھٹکا زیادہ سے زیادہ موثر ہو۔ پلک جھپکتے میں وہ اچھلے اور دوبارہ دوسرے لمحے ان کے قدم زمین پر ٹکے تو دونوں آدمیوں کی چیخ بھی نہ نکل سکی۔ کلائی کی ہڈیاں ٹوٹی نہیں ہوں گی تو بل یقیناً گئی ہوں گی۔ دونوں کے ہاتھوں سے چاقو چھوٹ گئے۔ وہ بلبلا کے ایک طرف بھاگے پھر انہوں نے پلٹ کے بھی نہیں دیکھا۔

جمرو اور شامو نے ان کے چاقو اٹھا کے جیب میں رکھ لیے۔ جولین، فرخ ایک دوسرے سے پیوست دبکی کھڑی تھیں۔ میں اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ان کی کیفیت کا اندازہ کرسکتا تھا۔ ان سب کی آنکھیں پھٹی ہوئی ہوں گی۔ جولین اپنی گلی میں مارٹی اور اس کے ساتھیوں سے ایک بار مجھے چاقو آزمائی کرتے تو دیکھ چکی تھی۔ شہ پارہ کے لیے بھی یہ کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن پہلے دیکھے ہوئے کسی منظر کا تجربہ، قلب و نظر کی پختگی کا ثبوت نہیں ہے۔ ان سب پر پُراسرار سراسیمگی طاری ہوگئی۔

جمرو اور شامو کو پلٹ کر ان کا سامنا کرنے میں ندامت سی ہورہی ہوگی مگر وہ اور کیا کرسکتے تھے۔ انہیں بالکل توقع نہیں تھی کہ بات اتنی بڑھ جائے گی، چاقو کھلنے کی نوبت آجائے گی۔

میں اٹھ گیا۔ میرے ساتھ مارٹی بھی اٹھا۔ ہم دونوں تیز قدموں سے ان کے پاس پہنچ گئے۔ جاتے ہی میں نے جمرو اور شامو کی پیٹھ تھپکی اور دونوں کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ وہ بہت گھبرائے ہوئے تھے، میں اسی طرح ان پر چھائی ہوئی پشیمانی دور کرسکتا تھا۔ اب وہ سب گھر واپس چلنے کو کہہ رہی تھیں لیکن بہتر تھا کہ ابھی کچھ دیر وہ یہیں رہیں اور اپنا تردد اور تکدر دور کرکے گھر جائیں۔ میں نے مسکرا کے ان سے کہا "ارے! کیا صورتیں بنا رکھی ہیں۔ ایسی کیا بات تھی۔ کوئی بھوت تو نہیں تھے وہ، حوصلے سے کام لینا چاہیے تھا۔ ذرا سی جرات دکھاتیں تو وہ بے ہودہ لوگ ویسے ہی بھاگ کھڑے ہوتے۔"

"وہ برے لوگ تھے بابر بھائی! ان کے پاس چاقو تھے۔" فریال سہمی ہوئی آواز میں بولی۔

"ہاں، ہاں۔" مجھ سے کوئی بات نہ بن پڑی۔ چاقو میری جیب میں بھی تھا۔ جمرو، شامو اور مارٹی بھی خالی نہیں ہوں گے۔ ان تینوں کی نظریں بیک وقت مجھ پر منڈلانے لگیں اور ان کے شانے ڈھلک گئے۔ "وہ تم پر کبھی چاقو نہ نکالتے۔" میں نے بوجھل آواز میں کہا "چاقو تو انہوں نے جمرو اور شامو بھائی کو خوف زدہ کرنے کے لیے نکالے تھے۔ میرا خیال ہے،

انہیں مغالطہ ہوا تھا کہ جمرد اور شامو بھی ان کی طرح تمہارے لیے اجنبی ہیں اور تمہاری نظروں میں اپنا مرتبہ بڑھانے' تمہیں احسان مند کرنے کے لیے بیچ میں آگئے ہیں جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے۔"

فریال کچھ اور کہنا چاہتی تھی مگر جولین نے کہنی مار کے اسے منع کیا۔ میں نے بھی پھر خاموشی مناسب سمجھی۔ ہم ان کے ساتھ کنارے کنارے چلتے رہے۔ وہ سب چپ چپ تھیں۔ چلتے چلتے ہم اس ہوٹل کے پاس پہنچ گئے جہاں چند روز پہلے ہم نے مچھلی کھائی تھی۔ ہوٹل والے نے ہمیں پہچان کے باہر میز اور تپائیاں رکھ دیں۔ وہ بچھا جا رہا تھا۔

"آپ کو کوئی ڈر نہیں لگا جمرو بھائی؟" یکایک فارہہ نے پٹ پٹائی پلکوں سے پوچھا۔

"کیوں بھنو!" شامو جھجکتے ہوئے بولا "ڈر کا ہے کا' اپنے کو پتا ہے' وہ دونوں بس چاقو رعب مارنے کو رکھتے ہیں' ایسے ہی شوبازی ہے۔"

"کوئی پکا آدمی اتنی جلدی چاقو نہیں کھولتا' چاقو تو بہت آگے کی بات ہے۔" جمرو نے اٹکتی زبان میں کہا۔

"ہمارا تو دم نکل گیا تھا۔" فریال نے گہری سانس بھری۔

"ایسے ہی۔" جمرو پھیکی ہنسی سے بولا "آپ لوگ تھوڑی آنکھ دکھاتے تو اپنے کو آنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ ایسے ٹائم آدمی کو اوسان پاس رکھنے چاہئیں۔ ان کو فالتو میں کھونا نہیں چاہیے۔"

"لیکن چاقو کے سامنے؟" فریال ٹھنک کے بولی۔

"چاقو تو ان لوگ نے پہلے نہیں نکالا تھا اور چاقو کوئی چیز نہیں ہے اگر' اگر۔" جمرو کو خیال آگیا کہ یہ موضوع طویل نہیں کرنا چاہیے۔ وہ بھن بھناتی آواز میں بولا "چھوڑو بھنو! مٹی ڈالو' کوئی ایسی بڑی بات نہیں تھی۔ ادھر کی مچھلی کھا کے دیکھو' ایک دم تازی تازی۔"

فارہہ کی وحشت کم نہیں ہوئی تھی۔ "اگر آپ میں سے کسی کو چاقو لگ جاتا تو خدا ناخواستہ۔"

"نہیں لگتا بیٹا!" جمرو نے تنک کر کہا۔ اس سے برداشت نہیں ہوا' وہ زور دے کر بولا "اپنے کو ایک دم نہیں لگتا۔ ہم کو چاقو کا کھیل آتا ہے' ایسے لوگوں کو ہی بھگتانے کو ہم نے چاقو کا کرتب سیکھا تھا' اپنے پاس بھی۔۔" عجب نہ تھا کہ وہ کچھ اول فول بکنے لگتا' میں نے اس کا ہاتھ دبا کے ٹوکا تو اسے کچھ ہوش آیا۔ اچھا ہوا کہ اسی وقت ہوٹل والا اور اس کے ملازم تازہ گرم پراٹھے اور مچھلی لے کے آگئے' چٹنی بھی ساتھ تھی۔ جمرو اور شامو حکم پہ حکم دینے لگے "اور کیا ہے تمہارے ہوٹل میں؟ یہ لے آؤ' وہ لے آؤ۔ وہ بھی لے آؤ۔" ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ سارا ہوٹل منگوالیں۔ جتنی اقسام کے کھانے تیار تھے' انہوں نے سب طلب کرلیے تھے۔ ہوٹل کا مالک کشمیر کا رہنے والا تھا۔ اس نے پستے' بادام اور کشمش ملی ہوئی کشمیری چائے بنوائی تھی۔ چائے پیے بغیر اس نے ہمیں نہیں اٹھنے دیا۔ رفتہ رفتہ سب کے چہرے بحال ہونے لگے۔ اس میں جولین کے سلیقے اور تدبیر کا بھی بڑا دخل تھا۔ وہ انہیں بمبئی کے کھانوں' خصوصاً بمبئی میں پکائی جانے والی مچھلی کی بے شمار اقسام کے بارے میں بتاتی رہی۔ کچھ دیر پہلے بیتے ہوئے واقعے کا ذکر ہی نہیں آیا۔ جولین نے انہیں اس کی مہلت ہی نہیں دی۔

ہر سو اندھیرا چھا گیا تھا مگر سمندر کو اندھیرے سے سروکار نہیں ہے۔ سمندر کبھی نہیں سوتا' اندھیرے میں تو وہ اور بیدار اور پرجلال ہو جاتا ہے۔ ہوا میں سردی کی آمیزش تھی۔ اب انہیں ایسی جلدی نہیں تھی۔ موٹریں دور کھڑی تھیں۔ ہم آہستہ آہستہ ان تک پہنچے۔ فارہہ چونک کے بولی "جمرو بھائی! آپ ان کے چاقو پانی میں پھینک دیجیے۔"

"ہاں ہاں' کیوں نہیں۔" جمرو اور شامو نے بڑبڑاتے ہوئے جیب سے چاقو نکال کے فارہہ کے آگے ہاتھ پھیلا دیے۔

فارہہ پیچھے ہٹ گئی جیسے جمرو اور شامو نے چاقو نہیں' بچھو اس کے سامنے کر دیے ہوں۔ جمرو ہنسنے لگا اور اس نے شامو سے کہا کہ وہ فارہہ کو ساتھ لے کر چاقو سمندر برد کر آئے۔

"اور اگر انہیں مچھلیوں نے نگل لیا تو؟" جولین مسکرا کے بولی۔

"بند چاقو مچھلیوں کا کچھ نہیں بگاڑیں گے' مچھلیوں کے پیٹ میں وہ زیادہ محفوظ رہیں گے۔" فریال نے چہکتی آواز میں کہا۔

گھر واپس آ کے وہ خاصی سنبھل چکی تھیں۔ میرے ساتھ وہ پہلی بار کسی ایسی جگہ گئی تھیں۔ وقت ہی کہاں ملا تھا انہیں کہیں لے جانے اور گھمانے پھرانے کا۔ اس وقت یہی کچھ ممکن تھا۔ میں نے طے کیا کہ کل یا پرسوں انہیں پھر کہیں لے جائیں گے۔ آج کی کسر پوری ہو جائے گی۔ اب تو موٹریں بھی موجود ہیں' ہم دور تک جا سکتے ہیں۔ گھر سے باہر نکل کے یقیناً ان کی گھٹن دور ہوگی اور کچھ حوصلہ بھی بڑھے گا۔ کم از کم گیتا کے لیے تو یہ بہت ضروری ہے۔ اس کے دل میں زندگی کی ہمک پیدا ہوگی۔ گھر آ کے وہ بہت ہلکی پھلکی نظر آ رہی تھیں۔

بعض لوگوں کی طرح زمین کے بعض حصوں پر بھی خدا نے خاص مہربانی کی ہے۔ کرشنا جی مجھے بمبئی کے کئی ایسے مقامات پر لے گئے جہاں مٹی نظر نہیں آتی' زمین پر سبزہ ہی سبزہ بچھا ہے' سبزہ زمین سے پھوٹ رہا ہے۔ ہر طرف جنگل جیسا نظارہ جھیلیں' پہاڑیاں جا بجا پھولوں سے ڈھکے ہوئے کنج' درمیان میں بنے ہوئے لکڑی کے مکانات' اونچی نیچی سڑکیں' چائے خانے اور جانے کیا کیا۔۔ ایک جگہ تو اچھی طرح میرے ذہن پر نقش ہے۔ وہاں بمبئی کے بڑے بڑے لوگ موجود تھے۔ ساز گونج رہے تھے اور رنگ برنگی دھیمی دھیمی روشنیاں جھل مل جھل مل کر رہی تھیں اور فضا میں خوشبو بسی ہوئی تھی۔ میں اس وقت بہت گھبرایا ہوا تھا۔ پہلے میں کسی ایسی جگہ گیا بھی نہیں تھا۔ لگتا تھا' کسی اور دنیا میں آگیا ہوں۔ وہاں کسی شخص کو جیسے کوئی دکھ ہی نہیں تھا۔ کسی کے گھر میں جیسے کوئی بیمار نہیں ہوتا تھا' نہ موت ہوتی تھی۔ وہاں داخلہ بھی خاص خاص آدمیوں کو ملتا تھا مگر خاص آدمی کے سر پر سینگ نہیں ہوتے۔ خاص آدمی بننے میں کیا دیر لگتی ہے۔ روپیہ سب سے بڑا ذریعہ اور سب سے بڑا واسطہ ہے۔ میں نے سوچا' ایک بار تو میں انہیں وہاں ضرور لے جاؤں گا۔ ان کے لیے یہ سب کچھ نیا ہوگا۔ وہاں کے لوگ دیکھ کے ان میں اعتماد پیدا ہوگا۔ ایسی جگہیں اسی لیے بنائی جاتی ہیں کہ آدمی کو زندگی کی ترغیب ملے۔ مجھے اور کام بھی کیا ہے۔ میں کچھ اور نہ سہی' یہ تو کر سکتا ہوں۔ جولین نے مجھ سے یہی تو کہا تھا کہ اگر آدمی اپنے لیے کار آمد نہ ہو تو دوسروں کے لیے سود مند ہو سکتا ہے۔ آدمی جب دوسروں کو بھول سکتا ہے تو اپنے آپ کو کیوں نہیں بھول سکتا۔ آدمی خود کو یکسر فراموش کیوں نہ کر دے اور ہو سکے تو بس دوسروں کو یاد رکھے۔ آدمی کا اپنے آپ سے واسطہ نہ رہے تو کوئی مشکل باقی نہیں رہتی۔ بھلا یہ کوئی ضروری ہے کہ آدمی اپنی ہی زندگی گزارے۔ راستے بھر اور پھر گھر جا کے میں اپنا ارادہ مصمم کرتا رہا مگر میں نے کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا۔

کیلاش اور رما ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ کیلاش افسوس کرنے لگا کہ وہ کچھ پہلے آجاتے تو ہمارے ساتھ ہی چلتے۔ اس کے تاسف پر مجھے بھی ندامت ہوئی اور وضاحت کرنی پڑی کہ بس اچانک جمرو اور شامو کے دل میں سمائی اور دیکھتے ہی دیکھتے سب تیار ہو گئے۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ آئندہ سب ساتھ ہی کہیں چلا کریں گے۔ گزشتہ ہفتے کیلاش اور رما نے شاید ہی کسی دن ناغہ کیا ہو۔ رات کا کھانا وہ عموماً یہیں کھاتے تھے۔ ان کی ماں اور بہن ابھی تک پونا ہی میں تھیں۔ رات کو وہ دونوں دیر سے گھر جاتے۔ اس دن کے بعد کیلاش سے پونا کے بارے میں میری کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ نہ اس نے زبان کھولی' نہ میں نے تجسس ظاہر کیا۔ وہ دونوں ہی بجھے بجھے' کھوئے کھوئے سے رہتے تھے اور چھپانے کی کوشش کرتے تھے' دوسروں کے علاوہ شاید اپنے آپ سے بھی۔ اپنے آپ سے بھی تو آدمی بہت کچھ چھپاتا ہے۔ کیلاش کچھ زیادہ دل گرفتہ نظر آتا تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے کھو جاتا پھر آپ ہی آپ چونک پڑتا اور زیادہ تن دہی و مستعدی ظاہر کرنے لگتا۔ ارادے کی پختگی اپنی جگہ مگر آدمی کی ناتوانی اپنی جگہ ہے۔ وہی بات جو کیلاش خود مجھ سے کہہ رہا تھا' آدمی دوسروں کا پابند جو رہتا ہے' عزیزوں کا' دوستوں کا' رسم رواج کا۔ دوسروں کی رفاقت سے جہاں توانائی بڑھتی ہے' وہاں توانائی بھی کم نہیں ہوتی۔ رما کو اس ناگفتنی کا احساس تھا تو اس کی وجہ اپنے آپ پر یقین کے علاوہ حقیقتوں سے ناآگہی بھی ہو سکتی ہے۔ سچ ہمیشہ دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک اپنا سچ' ایک دوسروں کا۔ یعنی آدمی کے گردوپیش کا سچ۔ ایک اپنے حوالے سے' دوسرا دوسروں کے حوالے سے۔ کبھی اپنا سچ غالب آجاتا ہے' کبھی دوسروں کا مگر بیشتر جیت دوسروں کے سچ کی ہوتی ہے۔ ہجوم میں گھرا ہوا آدمی آخر کہاں تک اپنے سچ پر اصرار کرے۔ رما زندگی کی اس نیرنگی سے شاید ناواقف تھی اور وہ بظاہر آسانی سے پسپا ہونے والی لڑکی نہیں تھی لیکن وضع و مروت کی اس میں بھی کمی نہیں تھی جو ذات کی ناتوانی کا اشارہ ہے۔ اتفاق سے اس دوران میں مجھے اس سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ خود میں نے بھی اجتناب کیا کہ اس کا بتایا ہوا کیلاش سے کیا مختلف ہوگا اور میں کیا اس کی دل جوئی یا اشک شوئی کر سکوں گا۔ اسے شاید معلوم نہیں تھا کہ کیلاش نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ ممکن ہے' جولین سے رما نے اپنا حال بیان کیا ہو۔ پونا سے آنے کے بعد زیادہ تر جولین ہی سے اس کا ربط و ضبط رہا تھا اور ہو سکتا ہے یہ رما کی صاف دلی' اس کی زبانی سنے ہوئے احوال کا اثر تھا یا جولین نے از خود اپنے رویے میں نظر ثانی کی تھی' وہ بڑی حد تک متوازن نظر آتی تھی۔ مجھے اس سے مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اس کی سمجھ میں آگیا تھا کہ کیلاش سے مغائرت کا رویہ کیلاش کے اضطراب کے لیے مہمیز ثابت ہو سکتا ہے' ایک طرح سے یہ کیلاش کی آنکھوں میں اٹڈتے ہوئے خوابوں کی پذیرائی ہے۔ غالباً یہی سبب تھا کہ وہ رما سے تعزیت کرنے اس کے گھر بھی جا چکی تھی' میرے بغیر حالانکہ طے یہ ہوا تھا کہ وہ میرے ساتھ وہاں جائے گی۔

اس دن رما سادہ لباس میں تھی۔ بجھے ہوئے سے گیروے رنگ کی ساڑی میں ملبوس، کناروں پر بڑے بڑے پھول کڑھے ہوئے تھے۔ اس سادگی میں بھی بہت دیدہ زیبی تھی۔ ہر بار یہی گمان ہوتا تھا کہ یہ لباس اس کے بدن کا حصہ ہے۔ ہر بار اس سے اس کے سراپا میں لباس شامل سا لگتا تھا۔ کانوں میں سفید آویزے لٹک رہے تھے۔ کانوں سے الگ ہوں تو کان سونے ہو جائیں۔ چہرہ دہک رہا تھا جیسے آگ اندر جل رہی ہو۔ میں کیلاش کے پاس بیٹھا تھا کہ وہ میرے پاس چلی آئی اور کھنکتی ہوئی آواز میں بولی "آپ تو آتے ہی نہیں!"

یوں اچانک اس کے سامنے آجانے پر میرا جسم اکڑ سا گیا۔ میں نے منتشر لہجے میں کہا "بس آتے آتے رہ جاتا ہوں۔"

"اب تو بہت کچھ ٹھیک ہو گیا ہے۔" وہ نظریں گھماتے ہوئے شائستگی سے بولی "آپ آ سکتے ہیں۔"

"ضرور آؤں گا۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"جانے کیوں مجھے انتظار سا رہتا ہے کہ آپ کسی بھی وقت اچانک چلے آئیں گے۔" وہ چمکتی آنکھوں سے بولی۔ دو دن پہلے بھی وہ کہہ چکی تھی کہ گھر میں سارے دن اکیلے رہتی ہوں، کیلاش اسپتال چلا جاتا ہے، آپ اگر کوئی کام نہ ہو تو چلے آیا کیجئے۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا اور مجھے یاد بھی تھا کہ لیکن میں سوچ کے رہ گیا۔

"آپ ہی ادھر آجایا کیجئے۔" میں نے مسکرا کے کہا "صبح کے وقت بھی تو آپ آسکتی ہیں۔ یہاں آپ کا دل بہلا رہے گا اور سب ہی خوش ہوں گے۔"

"میں نے رما سے یہی بات کہی تھی کہ تم کچھ دن کے لیے یہاں آجاؤ۔" کیلاش سر جھٹک کر تیزی سے بولا۔

"صبح میں پینٹنگ کرتی رہتی ہوں یا کتابیں پڑھتی ہوں۔ وقت گزر جاتا ہے لیکن یہ اچھا مشورہ ہے۔" وہ انگریزی میں بولی "کسی دن آجاؤں گی۔"

"کسی دن کیوں، آپ ابھی سے رہ جائیے۔"

وہ مسکرا دی "یہ بھی ٹھیک ہے مگر آپ کیوں نہیں آتے؟ میں شرط لگاتی ہوں کہ آپ کا دل نہیں اکتائے گا۔"

"مجھے یقین ہے۔" میں نے جھجکتی آواز میں کہا۔

"تو آپ ہی آئیے نا، کتنے دن ہو گئے آپ سے باتیں کیے ہوئے۔ گھر میں نہیں تو کہیں اور چلے جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے، میں ضرور آؤں گا۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"کل آئیے گا؟" وہ سرگوشیانہ لہجے میں بولی۔

"دیکھیں شاید، کل ہی مگر انتظار مت کیجئے گا۔ ویسے آپ تو شام کو آئیں گی ہی۔"

"انتظار تو میں نے ابھی سے شروع کر دیا ہے۔" وہ لہکتی آواز میں بولی "جانے کتنی باتیں اکٹھی ہو گئی ہیں۔"

"یقیناً نہایت دل کش اور اہم باتیں ہوں گی۔" میں نے بے ساختہ کہا۔

اس کے چہرے کی سرخی گہری ہو گئی۔ چمپا بیگم نے درمیان میں آکے اسے بھٹکا دیا۔ وہ پان دان لے کر آئی تھی۔ رما کو اس کے ہاتھوں کی گلوریاں بہت پسند تھیں۔ گلاب کے عرق میں بسی ہوئی چاندی کے ورق میں لپٹی ہوئی۔ پان رما پر رچتا بھی خوب تھا۔ گلوری کھا کے اس کے ہونٹ سرخ ہو جاتے تھے، مہندی لگے ہوئے یا خون میں ڈوبے ہوئے۔ وہ پان نہیں کھاتی تھی لیکن جب بھی چمپا بیگم سامنے آتی، رما اس سے گلوری کی فرمائش کرنے لگتی۔ اس نے ایک مرتبہ چمپا بیگم سے کہا تھا، لگتا ہے آپ گلوریاں تراشتی ہیں، فن کار کی طرح۔ رما کو کیا معلوم تھا کہ چمپا بیگم سے زیادہ کون اس فن سے واقف ہوگا۔ ہاں، میں نے یہ ضرور دیکھا تھا کہ رما کی بات سن کر چند لمحوں کے لیے چمپا بیگم کا چہرہ بجھ سا گیا تھا مگر وہ جلد ہی سنبھل گئی کیونکہ رما کی توصیف میں کوئی آلودگی نہیں تھی۔

کیلاش کو اسپتال میں کسی مریضہ کو دیکھتے ہوئے گھر جانا تھا اس لیے وہ دونوں نسبتاً کچھ جلدی چلے گئے۔

○☆○

دوسرے دن ہم ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ زورا آگیا۔ وہ پہلے پرانے گھر گیا تھا۔ وہاں شبی چاچا نے بہت منتوں کے بعد اسے یہاں کا پتا بتایا۔ زورا نے آتے ہی بٹھل اور ابا جان کے پیر پکڑ لیے اور عاجزی سے کہنے لگا "اب و پاڑے واپس نہیں جائے گا، یہیں کونے میں اسے بھی جگہ دے دی جائے، وہ سب کی خدمت کرتا رہے گا۔ اس کا وعد ہے، کسی کو بھی اس سے شکایت نہیں ہوگی۔" کہنے لگا کہ اس کا دل پاڑے پر بالکل نہیں لگتا۔

ابا جان نے اسے اٹھا کے گلے لگا لیا اور کہا کہ وہ خود اس کی طرف سے فکر مند تھے اور انہوں نے بٹھل سے کہا تھا زورا کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اسے بھی یہیں بلا لیا جائے ماہم کے پاڑے سے کنارہ کشی کرتے وقت بٹھل نے زورا پاڑے پر چھوڑ دیا تھا اور ہدایت کی تھی کہ وہ ماہم کے پاڑ پر پانڈے دادا کی اعانت کرتا رہے۔ زورا، پیرو کے دسویں

بھی آیا تھا۔ اس روز وہ بہت اداس اور دل گیر نظر آتا تھا۔ یں نے سوچا تھا کہ اسے روک لوں گا۔ ایک دو دن کے لیے ہی لیکن وہ مجھ سے ملے بغیر چلا گیا۔ اس وقت بناری کو سامنے دیکھ کے میری آنکھوں میں ریت بھری ہوئی تھی۔ زورا مارے ساتھ ابا جان کی تلاش میں تبت گیا تھا۔ وہ بھی ہماری طرح اپنے آپ کو داؤ پر لگائے رہا اور زندگی تھی کہ نشانوں سے بچا رہا پھر حیدر آباد میں جب ایک رات مسلح آدمیوں نے ابا جان کی نو خرید حویلی میں نقب لگائی تو زورا ان کے سامنے دیوار بن کے کھڑا ہو گیا تھا، وہ یہ بھول گیا تھا کہ دیوار کی بھی ایک استطاعت ہوتی ہے۔ اس اندھیری رات میں زورا ہمارے ساتھ تھا۔ زورا، چھنگا کے پاڑے کا خاص آدمی تھا۔ پہلی مرتبہ میری اس سے وہیں ملاقات ہوئی تھی۔ چھنگا دادا کا بڑا ہاتھ میں آنے کے بعد میرے قدم پاڑے پر جمانے میں اس کا اور چھیدا کا بڑا دخل تھا۔ وہ دونوں سائے کی طرح میرے ساتھ رہتے۔ زورا کوئی چھوٹا موٹا دادا نہیں تھا۔ جسم کا مضبوط، ارادے کا مضبوط، وہ بولتا کم، سنتا اور سمجھتا زیادہ تھا۔ چاقو پر اسے پہلے ہی اچھی مہارت تھی۔ بعد میں کچھ میری توجہ، کچھ اپنی لگن سے اس کا ہاتھ اور صاف ہو گیا تھا۔ ماہم کے پاڑے پر پیرو دادا سے ہماری شناسائی کے بعد اس کا بیشتر وقت پیرو کے ساتھ گزرتا تھا۔ میرے لیے وہ کسی طور جمرو، شامو اور مارٹی وغیرہ سے کم نہیں تھا۔ تبت سے کلکتے، کلکتے سے فیض آباد اور فیض آباد سے حیدر آباد اور پھر واپس بمبئی تک وہ مسلسل ابا جان کی خدمت کرتا رہا تھا، ابا جان کی اور بٹھل کی۔ اس کے ساتھ نہ رہنے پر مجھے کوئی خلش سی تھی۔ اچھا ہوا کہ وہ خود آگیا۔ ابا جان کی مرضی دیکھ کے بٹھل نے بھی کچھ نہیں کہا۔

زورا کی زبانی معلوم ہوا کہ پاڑے پر سب ہی بکھرے ہوئے ہیں۔ پانڈے دادا چوکی پر بیٹھا ہاتھ پاؤں دبواتا رہتا ہے اور بات بے بات، بکتا جھکتا اور لوگوں کو جھڑکتا رہتا ہے۔ لے کا دل بھی وہاں نہیں لگ رہا ہے۔ صبح و شام لوگ بندی سے آتے ہیں اور سر جھکائے بیٹھے رہتے ہیں۔ بٹھل نے زورا کی باتوں پر دھیان نہیں دیا۔ آخر زورا بھی چپ ہو گیا۔

اس کی آمد پر جمرو، شامو، مارٹی اور ٹنگو تو دیوانے سے ہو گئے تھے جیسے زمانوں کا بچھڑا ہوا کوئی ملا ہو۔ جگنو اور دیوا کے بارے میں، میں نے زورا کو جتا دیا تھا کہ یہ دونوں اپنے ساتھ ہی ہیں۔ انہیں گھر میں دیکھ کر وہ حیران رہ گیا تھا۔ وہ ان سے اچھی طرح واقف تھا۔ جگنو اور دیوا جب پاڑے پاڑے ٹھوکریں کھا رہے تھے تو چھنگا دادا نے انہیں پناہ دی تھی، زورا اور چھیدا چھنگا دادا کے دست راست تھے۔ بناری سے جگنو اور دیوا کی نسبت کے متعلق زورا کو کچھ ایسا علم نہیں تھا۔ میں نے بھی تفصیل نہیں جانی۔ میں نے اس سے کہا کہ ان کا خیال رکھنا اور ان پر اور محنت کرنی ہے، کیوں اور کس لیے سے زورا کو غرض نہیں تھی۔ میرا اتنا کہہ دینا اور اس کا اتنا سن لینا ہی بہت تھا۔

میرا ارادہ رما کی طرف جانے کا تھا لیکن زورا کی وجہ سے میں نے جانا ملتوی کر دیا۔ زورا اپنے ساتھ کچھ نہیں لایا تھا۔ میں نے اسے میرے کپڑے دیے۔ سہ پہر کو درزی نے آکے اس کا ناپ لیا۔ ابا جان نے درزی کو تین دن کا وقت دیا تھا۔ ان کا حکم تھا کہ اس عرصے میں درزی کوئی اور کام نہ کرے، زورا کے لیے جتنے بھی جوڑے ممکن ہوں، تیار کر کے لے آئے۔

نہا دھو کے زورا کا رنگ روپ نکل آیا۔ شام کو جمرو اور شامو اسے ساحل کی طرف لے گئے۔

اس روز کیلاش اور رما نہیں آئے۔ رات گئے تک سب ہی ان کا ذکر کرتے رہے پھر غیر متوقع طور پر کیلاش کے ایک ملازم نے آکے مجھے کیلاش کا رقعہ دیا۔ رقعہ انگریزی میں تھا، لکھا تھا کہ پہلی گاڑی سے انہیں پونا جانا پڑ رہا ہے۔ ابھی ٹھیک سے کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن امید ہے کہ چند روز میں واپسی ہو جائے گی۔ کیلاش نے معذرت کی تھی کہ تار ملنے کے بعد اتنا وقت نہیں کہ وہ مجھ سے مل لے۔ میں نے کئی بار کیلاش کی تحریر پڑھی اگرچہ کوئی اور بات اس نے نہیں لکھی تھی۔ سب کو سلام اور سب کے لیے نیک خواہشات کے رسمی جملے کے سوا۔ ظاہر ہے کوئی اہم بات ہوگی جو اسے اتار دے کے بلوایا گیا تھا۔ پولیس نے جج صاحب کے قتل کا سراغ لگا لیا ہوگا یا کمل اور کوشلی کا کوئی معاملہ تھا۔ کوئی اور بات بھی ہو سکتی تھی۔ مجھے دیر تک تشویش رہی۔

دن ایسے ہی گزر گیا، کچھ اندر گھر میں، کچھ بٹھل کے پاس، کچھ جگنو اور دیوا کے ساتھ اور کچھ اکبر کے ساتھ۔ اکبر نے باغ سے ملحق ٹینس کورٹ ٹھیک کروا لیا تھا۔ یہ کھیل میں نے کبھی اسکول میں کھیلا تھا۔ بس سرسری انداز میں۔ آج اکبر کے اصرار پر میں اس کے مقابل کھڑا ہو گیا پھر جمرو، شامو، مارٹی اور زورا بھی آگئے۔ انہیں ٹینس کھیلنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ میں نے اپنی شدبد کے مطابق انہیں کھیل کا طریقہ سمجھایا۔ نگاہ کے سب تیز تھے۔ جسموں میں پھرتی تھی، بازوؤں میں بل تھا اور ذہن کی فراغت بھی میسر تھی۔ چنانچہ

ذرا سی دیر میں ان کا ہاتھ چلنے لگا۔ اکبر کو بھی دسراہٹ کی کمی نہ رہی پھر میں کرسی پر بیٹھا کھیل دیکھتا رہا۔ کچھ وقت اس طرح گزر گیا اور شام ہونے لگی۔

مجھے بے کلی سی ہو رہی تھی۔ کچھ اور سمجھ میں نہیں آیا تو میں نے جولین اور فرخ سے کہا کہ وہ کہیں چلنا چاہتی ہوں تو چلیں، مجھے شبہ تھا کہ شاید وہ کوئی عذر کردیں گی لیکن وہ تو جیسے اشارے کی منتظر تھیں۔

ہم موٹروں میں بیٹھے شہر کی سڑکوں پر گھومتے رہے۔ یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں۔ سانتا کروز سے قلابے تک راستے میں روشنیاں جل گئی تھیں۔ اردگرد اندھیروں کے بیچ میں روشنیوں کے منظر ہی کچھ اور ہوتے ہیں۔ اندھیرے میں کم سے کم عیب پوشی کی خوبی تو ہے۔ شہر کی کتنی بدنمائیاں اندھیرے میں شامل ہوگئی تھیں۔ اندھیرا بھی سمندر کے مانند ہے، اندر کا کچھ نظر نہیں آتا۔ اس شام موسم بھی اچھا تھا۔ دھیمی دھیمی ہوا چل رہی تھی۔ سڑکوں پر بہت اژدحام تھا جیسے سارے گھر خالی ہوگئے ہوں اور سارا شہر شور مچا رہا ہو، ہر طرف مقامی ریل گاڑیوں، موٹروں، ٹراموں اور گھوڑا گاڑیوں کا غل اٹھ رہا تھا۔

گیٹ وے آف انڈیا پر سب اتر گئے۔ رات کا منظر وہاں بہت دل کش ہوتا ہے۔ مارٹی نے سب کو ناریل کا پانی پلایا اور قلفی، چاٹ مسالا وغیرہ الگ کھلایا۔ بندر اور بھالو والا ایک مداری ہمارے سامنے آکے تماشا دکھانے لگا۔ بندر نے اپنی حرکتوں سے سب کو بے حال کردیا تھا۔ مارٹی اور جمرو نے ان پر بے تحاشا روپے لٹانے شروع کیے تو بندر اور مستانے ہوگئے۔ جانوروں کو بھی روپے کی قدر و قیمت معلوم ہے۔ آدمی کی صحبت کا کچھ تو اثر ہونا چاہیے۔ بندر اور بھالو روپے اٹھا کے سلام کرتے، سیلوٹ مارتے، کھولے مٹکاتے، پتلیاں گھماتے اور دانت دکھاتے تو جمرو اور شامو کے ہاتھ بے اختیار جیبوں میں چلے جاتے۔ مداری کی ڈگڈگی پر بندر اور بھالو کا رقص ناقابل یقین تھا۔ جمرو اور شامو تو جیسے کسی مجرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سب کی جیبیں بھری تھیں۔ لگتا تھا، ابا جان نے انہیں ڈھیروں روپے دیے ہیں۔ سب بادشاہ بنے ہوئے تھے۔ روپیہ بس ان کی جیبوں میں ہونا چاہیے تھا پھر وہ کل کی فکر نہیں کرتے تھے۔ شامو کی خواہش تھی کہ بھنڈی بازار میں وہ سب کو چوڑیاں اور چزیاں پہنائے مگر جولین نے اسے گیتا کی موجودگی کا احساس دلایا تو وہ سر پیٹنے لگا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ گیتا اس وقت پاس نہیں تھی۔ قلابے کے بازار میں ایک جگہ موٹر رکوا کے جولین اتر گئی۔ وہ کتابوں اور رسالوں کے انبار خرید لائی تھی۔ جمرو بھی چپکے سے اس کے پیچھے چلا گیا تھا، یقیناً اس نے جولین کو پیسے نکالنے کا موقع نہیں دیا ہوگا۔

میرے لیے یہ طمانیت کی بات تھی کہ وہ خوش خوش گھر آئیں۔ مقصود بھی یہی تھا کہ وہ ذرا مختلف وقت گزاریں اور دیکھ سکیں کہ ان کے اطراف زندگی کیسی زندہ اور روشن ہے۔ روز لوگ مرتے ہیں پھر بھی بے شمار لوگ اور بستیاں رواں دواں رہتی ہیں۔ زندگی کا دریا کبھی خشک نہیں ہوتا۔ سب ہی نے ان کا خیال رکھنے کی کوشش کی تھی خصوصاً گیتا کا۔ اس سے زیادہ شاید ممکن نہیں تھا۔ میں تو مستقل انہی کی طرف متوجہ رہا، غالباً کسی بھی لمحے انہیں میری شمولیت میں کوتاہی کی شکایت نہ ہوئی ہو۔ جب تک خود انہوں نے گھر چلنے کی خواہش کا اظہار نہ کیا، کسی نے واپسی کے لیے ایک لفظ منہ سے نہیں نکالا۔

گھر آکے مجھے تھکن سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں اوپری حصے کے ایک کمرے میں لیٹ گیا۔ یہاں تنہائی بہت تھی اور کسی کی دخل اندازی کا امکان نہیں تھا۔ میں کچھ دیر اپنے ساتھ بھی رہنا چاہتا تھا۔ لوگوں کے ساتھ اس تن دہی سے رہنے کی مجھے عادت جو نہیں تھی۔ کسی نے آکے مجھے نہیں پوچھا۔ رات میں وہیں رہ گیا اور کسی وقت مجھے نیند آگئی لیکن صبح وہی صورت تھی۔ جسم جیسے ٹوٹ پھوٹ رہا ہو۔ میں نے کسی پر ظاہر نہیں کیا۔ میں نے ان سب کے ساتھ معمول کے مطابق ناشتا کیا اور عمارت کے اندر اور باہر چکر لگاتا رہا، کبھی اس کے پاس، کبھی اُس کے پاس۔ ناشتے کے بعد جولین نے گزشتہ رات لائی ہوئی کتابوں میں سے تین کتابیں مجھے دی تھیں، دو انگریزی ناول تھے، ایک کتاب زندگی کے متعلق تھی۔ یہی تھا کہ ادھر ادھر گھومنے پھرنے کے بجائے میں کتابیں پڑھ رہوں۔ میں پھر اوپری منزل کے کمرے میں چلا گیا اور دوپہر کے کھانے تک ورق گردانی کرتا رہا، کہتے ہیں، کتاب سے اچھا دوست نہیں ہوتا مگر دوستی بھی تو بٹھل کے بہ قول تالی کی طرح ہوتی ہے۔ یہ تو آدمی پر منحصر ہے کہ وہ دوستی کے لیے آمادہ ہے یا نہیں۔ میں نے دل جمعی کی کوشش کی۔ جب صفحات پڑھ چکا... تو پھر میرا دماغ بھٹکنے لگا۔ میں نیچے آگیا۔

کئی دن اسی طرح گزر گئے۔ دس گیارہ بجے کے قریب میں گھر سے نکل کھڑا ہوتا اور آس پاس کا ایک چکر کاٹ کے واپس آجاتا۔ یوں کچھ اور نہیں تو مکان کے اردگرد کی گلیوں سے مجھے واقفیت ہوگئی۔ شام کو جمرو اور شامو میں سے کوئی کسی طرف جاتا تو میں بھی ان کے ساتھ ہولیتا۔ کئی بار میں نے ارادہ کیا، بٹھل سے بات کروں کہ اس نے کیا سوچا ہے

فیض آباد میں بھی کوئی رہتا ہے۔ زریں کو خط بھیج دیا گیا تھا لیکن وہ تو دن گن رہی ہوگی، ادھر خانم کو بھی حیدر آباد سے واپس آنا ہے۔ وہ کیا سوچتی ہوگی، ہم نے پلٹ کے خبر بھی نہ لی۔ اب تو بہت وقت ہوگیا ہے۔ وہ کب تک وہاں ٹھہری رہے گی۔ جہاں تک مجھے علم تھا، اسے تو کوئی خط بھی نہیں لکھا گیا۔ بٹھل دن بھر اپنے کمرے میں پڑا حقہ گڑگڑاتا رہتا۔ وہ ناشتے دوپہر کے کھانے اور رات کے وقت باہر نکلتا یا شام کو عمارت کے پچھلے حصے کے چبوترے پر جا کے بیٹھ جاتا اور سب اس کے اطراف اکٹھے ہوجاتے۔

دو دن پہلے رات کو شکلا دوسری بار آیا تھا۔ گھنٹوں بیٹھا رہا۔ اس نے ہدایت کی ہوگی جبھی بٹھل کل صبح جمرو کو ساتھ لے کے عدالت گیا تھا۔ جمرو کے کہنے کے مطابق عدالت میں ماری پیش کی گئی تھی۔ اس کی حالت نہایت ابتر تھی۔ عدالت نے ماری کے لیے درپردہ شکلا کی طرف سے کیے گئے وکیل کی درخواست آخر منظور کرلی اور ماری کو جیل سے اسپتال منتقل کرنے کا حکم جاری کردیا۔ گویا شکلا اپنی تگ و دو میں کم سے کم اس حد تک تو کامیاب ہوگیا تھا۔ بٹھل اور شکلا کو ماری کے بچوں کا انتظام کرنے پونا بھی جانا تھا۔ اگر بٹھل ماری کے مقدمے اور اس کے بچوں کی وجہ سے ٹھہرا ہوا تھا تو آخر کیوں؟ پونا جانے اور آنے میں وقت ہی کتنا لگتا ہے۔ جانا ہوتا تو اسے کبھی اب تک آنا ہوچکا ہوتا۔ ماری کی خبر گیری کے لیے ادھر شکلا اور اس کا وکیل کافی تھا اور ایسا ہی تھا تو بٹھل کچھ دنوں بعد پھر بمبئی واپس آسکتا تھا مگر نہ جانے اس کے دل میں کیا تھا۔

ادھر ابا جان بھی مستقل اپنا نیا گھر جما رہے تھے۔ روز نئی نئی چیزیں آرہی تھیں۔ فانوس، قالین، نئی طرز کا فرنیچر۔ ملازموں کے حصے کی مرمت کی جا رہی تھی اور ان کے کمرے کشادہ اور روشن کیے جا رہے تھے۔ حوض کے لیے نادر قسم کی رنگ برنگی مچھلیاں منگوائی گئی تھیں۔ رات کو سبزہ زار پر چمکنے کے لیے تیز روشنیوں والے بڑے بڑے قمقمے نصب کیے جا رہے تھے۔ صبح ناشتے کے بعد ابا جان اور منیر علی موٹر میں بیٹھ کے نہ معلوم کہاں جاتے تھے، واپسی کبھی دوپہر کے کھانے کے وقت ہوتی، کبھی شام کو۔ منیر علی کو بھی شاید بمبئی بہت پسند آیا تھا۔ اپنا گھر بار چھوڑے ہوئے وہ یہاں باغ میں لگے ہوئے تھے۔ چار دیواری کے بڑے دروازے سے عمارت تک کے راستے میں انہوں نے اشک بار اشوک، اور درخت کے ان گنت پودے لگوا دیے تھے، سرو کی طرح ایک قطار میں، کسی کو بھی کوئی جلدی معلوم نہیں ہوتی تھی۔

جمرو اور شامو کو بھی نہیں۔ انہیں تو جیسے فرصت ہی نہیں تھی۔ ٹینس کورٹ میں ان کا جی بھی لگ گیا۔ ہاں، صبح و شام وہ جگنو اور دیوا کو وقت ضرور دیتے پھر سیدھے ٹینس کورٹ کا رخ کرتے اور بلا مبالغہ پہروں کھیلتے رہتے۔ کھیلتے کھیلتے پسینے پسینے ہوجاتے۔ زورا، مارٹی اور ٹنگو بھی پورے ذوق و شوق سے ان کے ساتھ جتے رہتے۔

روز صبح کچھ دیر کے لیے میں بٹھل کے پاس جا کے بیٹھ جاتا۔ کچھ اسے پوچھنے، اس کا حال جاننے اور کچھ سن گن لینے کے لیے بھی۔ ایسا نہیں تھا کہ میں بٹھل کو ٹوک نہ سکتا ہوں، اس سے کچھ پوچھ نہ سکتا ہوں مگر جب بھی میں یہ ارادہ کرتا، مجھے اپنی لب کشائی بے محل معلوم ہونے لگتی۔ کہیں میں جلد بازی تو نہیں کر رہا ہوں۔ بٹھل کون سا یہاں اپنی مرضی سے بیٹھا ہوا ہے۔ زریں، اپنی بٹیا تو اسے اچھی طرح یاد آرہی ہوگی۔ زریں ایسی نہیں ہے جسے کوئی آسانی سے بھلا دے۔ خانم کی طرف سے بھی وہ غافل نہیں ہوگا۔ وہ چاروں طرف آنکھیں کھلی رکھتا ہے۔ مجھے شبہ تھا کہ وہ جھڑک دے گا کہ تجھے آخر ایسی کیا بے چینی ہے۔ تیرا کون سا گاؤں زد پر ہے۔ جب دیکھو، منہ بنانے، فیل مچانے لگتا ہے۔ یہی سوچ کے میں خاموش ہوجاتا ہوں۔ واقعی مجھے کاہے کی جلدی تھی؟ کہاں جانا تھا؟ کوئی جلدی مجھ ہی کو کیوں ہو رہی ہے۔ بٹھل مناسب سمجھتا تو مجھ سے کہہ سکتا تھا کہ میں فیض آباد چلا بھی جاتا تو فرق کیا پڑتا۔ میرے لیے تو ہر جگہ ایک جیسی ہے، میں آخر کیوں گھٹا جا رہا ہوں۔ کون سے نقصان کا اندیشہ مجھے ایسا بے کل کیے ہوئے ہے۔

ابا جان کو اپنے ایک اور بیٹے جہاں گیر کی فکر نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ جہاں گیر فیض آباد میں کسی پریشانی سے دوچار ہے۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں، خود دیکھ کر آئے ہیں کہ زریں کی حویلی میں جہاں گیر نہایت آرام سے ہے اور تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ ابا جان خود بھی جہاں گیر کی ایسی نگہداشت نہیں کرسکتے۔

کل رات، کھانے کے دوران میں دسترخوان پر بریانی کی قاب دیکھ کر منیر علی کو زریں یاد آنے لگی، کہنے لگا "ہائے ہائے، زریں کے ہاتھ میں اللہ نے کیا لذت دی ہے۔ آدمی کا دل سیر ہی نہیں ہوتا۔" جولین، فرخ، شہ پارہ اور گیتا کو مخاطب کرکے وہ بولا "میں تو کہتا ہوں، تم سب بچیاں زریں سے یہ ہنر اصرار سے سیکھنا۔" مجھے گمان ہوا کہ کہیں ابا جان زریں وغیرہ کو تو یہاں نہیں بلا رہے ہیں؟ زریں، نیساں، جہانگیر اور منیر علی کے خاندان کو؟ بمبئی سے حیدر آباد بھی

نسبتاً قریب ہے پھر تو خانم بھی یہیں آسکتی ہے لیکن کوئی ایسی بات ہوتی تو ابا جان یا منیر علی کی زبان پر ضرور آتی' کم از کم فرخ' فریال' فارہہ اور اکبر کو وہ ان کے بچھڑے ہوئے بھائی جہانگیر کی آمد کا مژدہ سنانے میں تامل نہ کرتے۔ یوں بھی ابا جان زریں کی حویلی خالی کیسے چھوڑ سکتے تھے' وہاں ان کی کائنات مدفون تھی۔ تبت سے لائے ہوئے لعل و جواہر کے صندوق اور نوادر تو وہ حویلی کے تہ خانے میں چھپا کے آئے ہیں۔ چلتے وقت وہ تہ خانے کے تمام دروازوں اور راستوں کے آگے دیواریں چن کے آئے تھے۔ انہوں نے مزدوروں کا خطرہ مول نہیں لیا تھا' یہ کام ابا جان' منیر علی' پیرو' کانتے اور میں نے راتوں رات انجام دیا تھا۔ تبت میں زخمی ہوجانے کے باعث بٹھل کے پیر میں تکلیف تھی' اس لیے ابا جان نے اسے زحمت نہیں دی تھی۔ ابا جان کا کل اثاثہ تو وہیں محفوظ تھا' ہیروں کی جو پوٹلی اپنے ساتھ لائے تھے' وہ اس کی عشر عشیر بھی نہیں تھی۔

میں نے جولین کی دی ہوئی تینوں کتابیں دو دن میں ختم کردیں۔ گلیاں اور بازار ناپنے اور گھر میں مٹر گشت کرنے سے دل گھبرانے لگتا تو کچھ دیر کے لیے آنکھیں بند کرلیتا۔ میں نے خود کو قائل کرنا شروع کیا کہ مطالعہ سب سے اعلیٰ مشغلہ ہے اور میں نے یہ اقوال تازہ کرنے شروع کیے جو کتاب کی فضیلت کے بارے میں بڑے لوگوں سے منسوب ہیں۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ہر کتاب ایک سفر کے مانند ہے' ایک تجربہ' ایک سیرگاہ' گھر بیٹھے دنیا کا نظارہ۔ مطالعہ سے کچھ جاتا نہیں' آتا ہی ہے اور کتاب اور قاری میں جلعت روا رجاحت مند کا تعلق ہے۔ سو کتاب کے سامنے قاری کو ایک سائل ہی ہونا چاہیے' وغیرہ۔ رفتہ رفتہ مطالعے میں میرا جی لگنے لگا تھا یا یوں کہنا چاہیے کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا' اس سے بہتر کوئی چیز نہیں تھی۔ کتابوں کے ساتھ تو عمر گزاری جاسکتی ہے۔ ایک دن میں خود بازار جاکے بہت سی کتابیں خرید لایا۔ چند ایک اپنے پاس رکھ کے باقی جولین کے حوالے کردیں۔ اس کے چہرے کی تابانی دیدنی تھی۔ اس نے سب کو منع کردیا کہ کوئی اوپر کے کمرے میں بلا ضرورت نہ جایا کرے۔ جولین خود بھی نہیں آتی تھی۔ دوپہر ٹھیک گیارہ بجے اور شام پانچ بجے کسی ملازم کے ذریعے وہ مجھے چائے بھجواتی' کبھی نمک پاروں' پاپڑ' کبھی نمکین کاجوؤں کے ساتھ۔ کبھی سنگترے اور اناس کا رس ملازم لے آتا۔ کئی روز اسی طرح گزر گئے۔

ایک روز دوپہر کے کھانے کے بعد ابا جان نے مجھ سے کہا کہ وہ کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے بڑی حیرت ہو ان کے پیچھے پیچھے نشست گاہ میں چلا آیا۔ ابا جان تمہید کے بغیر مجھ سے پوچھا کہ آگے میرا کیا ارادہ ہے؟

میں نے اپنے اوسان درست کرنے اور یہ کوشش کی کہ ان کا اشارہ کس طرف ہے' وہ کو ارادے کے بارے میں معلوم کررہے ہیں؟ لمحوں تذبذب میں رہا پھر ابا جان نے خود ہی صراحت کی۔ سے بولے "میرا مقصد ہے' تم نے کچھ سوچا ہے؟" جواب دیتا' سر جھکائے مضطرب بیٹھا رہا۔

وہ کہنے لگے "میرا مشورہ ہے کہ تمہیں کسی مصروف ہوجانا چاہیے۔ گو اللہ کا بڑا کرم ہے۔ ضرورت بھی نہیں ہے لیکن آدمی کچھ نہ کچھ کر مصروف رہے تو اچھا رہتا ہے۔ ان کے لہجے میں تشویش نہیں تھی' حکم بھی نہیں تھا۔ میرے دل کی معمول پر آنے لگی "تم کچھ بھی کرسکتے ہو' کسی با نہیں ہے۔" ابا جان نے کہا "کپڑے کی ایک مل میں میری بات چیت مکمل ہوگئی ہے۔ تم چاہو تو ا بھی دلچسپی لے سکتے ہو۔ کام تو دوسرے لوگ ہی نگرانی البتہ تمہاری رہے گی۔ ذرا توجہ دو گے تو سب میں آجائے گا۔ اس میں تمہارا دل نہیں لگتا تو او کام ہیں۔ میں یہاں تجارتی نوعیت کی چند عمارتیں ہوں۔ ان سے ہر مہینے مستقل اور معقول آمدنی ہو اور اصل میں اضافہ الگ ہوتا رہے گا۔ بمبئی شہر رہا ہے۔ ہم خود نئی عمارتیں بنوا سکتے ہیں۔ اس طرف نے تھوڑی بہت جستجو کی تو اندازہ ہوا کہ یہ نہایت منافع بخش کام ہے۔ کوئی خاص دیدہ ریزی بھی نہ سے کچھ دور زرعی زمین کی بھی میں نے بات کی۔ ایکڑ پر ہے۔ اردگرد سرسبز پہاڑیاں ہیں۔ بیچ میں موتی جھیل بھی ہے' واللہ اعلم۔ میں نے دیکھی تو دلال بہت تعریف کررہا تھا' کہتا تھا سونا اگلتی ہے چل کے دیکھو۔"

انہوں نے چند لمحے توقف کیا اور ٹھنڈی دھیمے لہجے میں بولے "جو وقت گزر گیا' گزر گیا' ا ہی اچھا ہے۔ کبھی آدمی کے بس میں کچھ نہیں نے کوئی جواب نہیں دیا' کہنے لگے "تمہارے پڑی ہے۔ نہیں معلوم میرے پاس کتنا وقت ہے زیادہ تو نہیں رہ گیا ہے۔ اب تم ہی کو سنبھالنا کہتے ان کی آواز جھرجھرانے لگی۔

میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن میری زبان نے ساتھ نہیں دیا "اور اگر تم مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہو تو شوق ہے۔ اس سے اچھی بات تو کوئی نہیں۔ یہاں نہیں تو تم ولایت جاسکتے ہو۔ بیرسٹری کرکے واپس آسکتے ہو۔ بہرحال سب کچھ تمہارے سامنے ہے۔ وہ کٹھن وقت گزر گیا' اللہ اور آزمائشوں سے بچائے....."

دیر تک خاموشی رہی۔ انہیں میرے جواب کا انتظار ہوگا۔ میں گنگ بیٹھا رہا پھر وہ یکایک اٹھ گئے اور تھکی تھکی آواز میں بولے "کوئی عجلت نہیں۔ سوچنے کے لیے وقت ہے۔ ذہن پر بالکل بوجھ مت ڈالو۔ یہ میری منشا تھی کہ جو مناسب سمجھو' مجھے بتا دینا۔"

انہوں نے میرے پاس آکے میرے سر پر ہاتھ رکھا تو مجھے ایسے لگا جیسے میرا سارا جسم بکھر جائے گا۔ میں نے دزدیدہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ ابا جان کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

دوسرے لمحے وہ کمرے سے چلے گئے۔

رات ہوگئی۔ میں اوپری حصے کے کمرے میں مسہری پر پڑا رہا۔ مجھ سے کتاب بھی نہیں پڑھی گئی۔ میرا دل ڈوب رہا تھا۔ میرا سارا وجود ہی ڈوب رہا تھا۔ رات کے کھانے کے وقت ملازم اطلاع دینے آیا تو میں نے منع کردیا۔ میں نے غلط نہیں کہا تھا' مجھے واقعی بھوک نہیں تھی لیکن مجھے خیال آیا' یہ سن کے وہ سبھی اوپر آجائیں گے اور طرح طرح کے سوالات کرنے لگیں گے۔ اس لیے میں نیچے آگیا اور ان کے ساتھ بیٹھا لقمے ٹونگتا رہا۔ کھانا ختم ہونے پر میں پھر اوپر چلا گیا۔ ساری رات ایسے ہی گزر گئی۔

اپنی ناتوانی و نیم جانی کا سبب مجھے خود معلوم نہیں تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ابا جان نے آخر ایسی کون سی بات کہی ہے جو مجھ پر یہ سوگ سا طاری ہے۔ پسپائی کا کوئی احساس یا توہین و ذلت کا۔ ابا جان جیسے مجھ سے کچھ پوچھنے کے درپے تھے۔ انہوں نے بیک جنبش لب جیسے سب کچھ منہدم کرنے کا حکم صادر کردیا ہو۔ انہوں نے میرے بارے میں غلط سمجھا یا اب تک میں خود کو غلط سمجھتا رہا۔ میں انہیں کیا جتلانا چاہتا تھا جو نہ جتا سکا اور میں ان سے کیا سننا چاہتا تھا' جو وہ نہ کہہ سکے۔ میں سوچتا تھا کہ صرف اتنا ہی ہے جو ابا جان نے کہا۔ کیا یہی حال ہے جس کے لیے اتنے دن خاک ہوئے۔ جو گزر گیا' وہ محض خواب تھا' محض سراب تھا اور سب کچھ بس یہیں تک تھا۔ گزشتہ شب اکارت گئی۔ اس کے بعد کچھ نہیں' اس سے سوا کچھ نہیں۔ میں ابا جان سے کیوں نہ کہہ

سکا کہ میرے پاس تو کرشنا جی کے ترکے کے لاکھوں روپے پہلے سے موجود ہیں۔ لوٹ پھیر سے تو ان میں اب تک اور اضافہ ہو چکا ہوتا۔ میں ابا جان سے تبھی کچھ کہتا جب میں خود کو کوئی جواب دے چکا ہوتا۔ پہلے تو آدمی خود کو ہی جواب دیتا ہے۔ مجھے اس کے سوا خود کچھ معلوم نہیں تھا۔ آئینے میں خود مجھے اپنی شکل صاف نظر نہیں آتی ہے۔ میں اس غبار اور فشار کا عادی ہو گیا ہوں تو یہ میری کوتاہی ہے۔ ابا جان نے کچھ بے جا نہیں کہا تھا۔ یہی دنیا کے اصول و قواعد ہیں۔ یہی زندگی کے آداب ہیں۔ آدمی انہی راستوں پر چلتا ہے جو پہلے سے متعین کر دیے گئے ہیں۔ بے شک آدمی اپنے راستے خود ہی بناتا ہے لیکن میں نے کون سا جتن نہیں کیا۔ میری تو ہر کوشش رائگاں گئی۔ پس یہی مناسب ہے کہ مجھے خود کو ترک کر دینا چاہیے۔ ابا جان کو اپنے بیٹے کی پہچان نہیں ہے تو میں خود کو کتنا جانتا، پہچانتا ہوں۔ میرے سامنے پھر کون سی منزل ہے؟

مجھے شاید اسی بات کا ملال تھا کہ میں خود بھی کچھ نہیں جانتا تھا۔ ابا جان سوال نہ کرتے تو سوال تو اپنی جگہ ہیں۔ ان کے جواب تو مجھ پر کب سے قرض ہیں۔ میں ان سے کب تک نظریں بچاتا رہوں گا، کس آسرے پر۔ میرے پاس اپنے اصرار کی کون سی دلیل ہے۔ اپنے آپ کو ترک کرنے کا فیصلہ تو میں نے پہلے بھی کیا تھا۔ جولین کے کہنے پر اور اپنے آپ کے کہنے پر لیکن اس سبک دوشی میں ایسی بے امانی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وجہ شاید صرف اتنی تھی کہ جولین نے مجھے دوسروں پر خود کو ترک کرنے کا مشورہ دیا تھا، ابا جان نے خود پر۔ ابا جان کی بات بھی میری سمجھ میں خوب آتی تھی لیکن ساتھ ہی میرا جسم اکڑنے، اینٹھنے لگتا تھا۔ مجھے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا تھا۔

اس روز کیلاش پونا سے آگیا، پورے دس دن بعد۔ اس کی ماں پر ملیریا کا شدید حملہ ہوا تھا جو بعد میں ٹائیفائڈ میں بدل گیا۔ دونوں ڈاکٹر بھائی بہن اپنی ماں کی پائنتی سے لگے رہے۔ کیلاش کے کہنے کے مطابق اس کی ماں خود سے ناامید ہو گئی تھی اور مصر تھی کہ اس کے سامنے کمل اور کوشلی سے رما اور کیلاش کی رسمیں ادا ہو جائیں۔ جج صاحب کی روح کو قرار آجائے گا، وہ بھی سکون سے مر سکے گی۔ کمل اور کوشلی کی بھی یہی خواہش تھی۔ ایسی صورت میں رما اور کیلاش کے لیے انکار بہت مشکل ہو گیا تھا۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن جیسی صورت حال سے وہ دوچار تھے۔ ان کے پاس ایک ہی مجہول عذر تھا کہ ابھی تو جج صاحب کی موت کو چالیس دن بھی نہیں گزرے ہیں۔ ماں نے یہ عذر مسترد کر دیا تھا کہ جج صاحب کی خواہش کی تکمیل بجائے خود جج صاحب سے محبت و احترام کی مظہر ہے۔ کیلاش کے بقول اس دوران ماں کی حالت سدھرنے لگی اور اسی نسبت سے اس کے اصرار میں بھی شدت نہ رہی۔ رما اور کیلاش پر جاں کنی کا یہ وقت سردست کسی طرح گزر گیا۔

کیلاش اپنے چہرے پر اور غبار منڈھ کے آیا تھا۔ اس کی حالت اضطراری تھی۔ ٹھیک طرح بات بھی نہیں ہو پا رہی تھی۔ تاہم اسے اپنی روداد سنانے کی ایسی بے تابی تھی کہ مجھے سب کے درمیان سے اٹھا کے باہر لایا تھا۔ کہنے لگا کہ رما بہت اپنے عزم میں پرجوش تھی، اپنے تصور و خیال میں مست۔ اسے بھی اب احساس ہو گیا ہے کہ آدمی کے حوالے اسے کتنا نادار کر دیتے ہیں ماں کی بیماری پر یہ آزمائش مستزاد تھی۔ رما تو بالکل ہی نڈھال ہو گئی تھی۔ جتنے دن پونا میں رہی بہت ویران رہی۔ ماں اسے روک رہی تھی، کیلاش ضد کر کے لے آیا اور یہاں آکے ہی رما کے ہوش و حواس کچھ درست ہوئے۔ کیلاش نے بتایا کہ اس کی ماں اور چھوٹی بہن انو، جج صاحب کے چالیسویں تک پونا میں رہیں گی۔ چالیسویں پر رما اور کیلاش کو پھر وہاں جانا پڑے گا۔ چالیسویں میں ابھی کئی دن پڑے تھے، کیلاش ابھی سے ہول رہا تھا۔

"رما نے تو کہہ دیا ہے، وہ اب پونا نہیں جائے گی۔" کیلاش برگشتہ آواز میں بولا "بیماری کا بہانہ کر دے یا کچھ اور۔۔۔۔ ٹھیک ہے، نہیں جائے گی مگر اس کے بعد تایا جی تو یہیں آجائیں گی۔ کمل اور کوشلی بھی ضرور ان کے ساتھ ہوں گے، پھر کیا ہوگا۔ میں نے رما سے یہی کہا تھا۔ وہ پھر ضد کرنے لگی کہ وہ صاف منع کر دے گی۔ آپ نے دیکھا! پونا کے تجربے کے باوجود وہ کہتی ہے کہ انکار کر دے گی۔ میں نے اس سے کہا، پونا کی طرح یہاں بھی ایسی کوئی صورت پیش آسکتی ہے تب! آپ کو معلوم ہے، اس نے کیا جواب دیا؟"

"انہوں نے کہا ہوگا کہ دیکھا جائے گا۔" میں نے کسمساتے ہوئے کہا۔

"بالکل!" وہ تیزی سے بولا "آپ نے ٹھیک اندازہ لگایا۔ بعض اوقات تو وہ بالکل بچی بن جاتی ہے۔ کہنے لگی، ٹھیک ہے۔ وہ لگن منڈپ میں بیٹھ جائے گی۔ پھیرے بھی پڑ جائیں گے۔ کمل کو اس طرح اپنے باپ کی دولت مل جائے گی۔ دولت ہی اسے چاہیے نا! جج صاحب کی وصیت میں صرف شادی کے بارے میں لکھا ہے۔ شادی ہو جائے گی چاہے وہ لگن منڈپ اور پھیروں تک ہو۔ شادی کے جاری رہنے کے لیے وصیت میں کچھ نہیں لکھا ہے۔ کہتی ہے کہ وہ

پنا حصہ کمل کو دے دے گی۔ کمل چوتھائی دولت کے لیے شادی کر سکتا ہے تو چوتھائی دولت کے لیے شادی ختم بھی کر سکتا ہے۔ دیکھا آپ نے شادی کو اس نے کوئی کھیل سمجھ رکھا ہے، گڑیا گڈے کا کھیل۔ کتنی آسانی سے اس نے فیصلہ سنا دیا۔ سارا کچھ نمٹا دیا۔"

میں سرہلا کے رہ گیا۔ کیلاش کو بھی معلوم تھا کہ میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ میری خاموشی کو غالباً اس نے اپنے اندیشوں کی توثیق جانا اور یوں اسے کچھ سکون حاصل ہوا۔ اس کی وحشت میں کسی حد تک کمی ہو گئی۔ رما کو بھی کچھ دیر پہلے میں نے دیکھا تھا۔ وہ ایسی آشفتہ حال نظر نہیں آتی تھی۔ گزشتہ مرتبہ نام لیے بغیر کیلاش نے جس لڑکی کا تذکرہ مجھ سے کیا تھا، لگتا تھا، کیلاش اسی کی آرزو کا اسیر ہے۔ رما کے دل میں کوئی گرہ نہیں پڑی ہوئی تھی۔ اس لیے وہ اتنی مضطرب و منتشر معلوم نہیں ہوتی تھی مگر میں یہ بات کیلاش سے نہ کہہ سکا۔

ہم جلد ہی اندر آگئے۔ سب نشست گاہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ رما سب کے درمیان، مجھے حیرت ہوئی، وہ تو چہچہا رہی تھی۔ اس کے بالوں میں گلاب کا تازہ پھول اٹکا ہوا تھا۔ خود بھی وہ کسی پھول کے مانند کھلی ہوئی تھی۔ کچھ دیر میں وہ میرے پاس آکے بیٹھ گئی اور چہکتی آواز میں بولی "آپ کہاں ہیں؟"

"میں، میں کہاں ہوتا۔" میں نے مسکرا کے کہا۔

"سنا ہے آج کل خوب کتابیں لوٹ رہے ہیں۔"

"خوب کیا، بس ایسے ہی۔۔۔"

"کون کون سی کتابیں پڑھ ڈالیں؟" وہ اشتیاق سے بولی۔

"ادھر ادھر کی، جو بھی سامنے آگئی۔"

"میں آپ کو کچھ کتابیں دوں گی۔"

"شکریہ! دیکھیے جی بھی کب تک لگے۔"

وہ پہلو بدل کے سرگوشیانہ لہجے میں بولی "مجھے آپ کو بتانا تھا کہ میں اب آگئی ہوں۔"

"میں دیکھ رہا ہوں۔" میں نے جھپکتی آنکھوں سے کہا۔

وہ کھل کھلا پڑی "پھر کب آرہے ہیں ہماری طرف؟"

"دیکھیے۔" میں نے تذبذب سے کہا "جس دن آنے کا ارادہ تھا، اس دن آپ پونا چلی گئیں۔"

"اب میں کہیں نہیں جا رہی۔" اس کی آواز میں اعتماد تھا "ہو سکے تو کل ہی آئیے۔"

"مناسب ہے۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"مجھے آپ کی ضرورت ہے۔" وہ زیر لبی سے بولی۔

"میری!" میں نے تعجب سے کہا "میں کیا کام آسکتا ہوں۔"

"کوئی ایسی بات نہیں، ضرورت کا مطلب کام ہی نہیں ہے۔ اچھا وقت گزارنا بھی آدمی کی ضرورت ہے۔"

"اوہ! میں سمجھا، جانے کیا بات ہے۔"

"یہی کچھ کہنا پڑے گا۔" وہ شگفتگی سے بولی "ویسے تو آپ آتے نہیں۔"

"کل تو آپ گھر پہ ہی رہیں گی۔"

"سارا دن، مجھے کیا کام ہے۔"

"ٹھیک ہے، پھر میں کل کسی وقت آؤں گا۔"

"کچھ سویرے آئیں تو اور اچھا رہے۔ کھانا پھر وہیں کھائیں۔ میں بری ڈشز نہیں بناتی۔"

"مجھے معلوم ہے، خوش سلیقگی یک رخ نہیں ہوتی۔"

اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ ابا جان کی آمد پر خاموش ہو گئی بلکہ منتشر سی ہو گئی۔ اس نے کھڑے ہو کے انہیں آداب کیا۔ ابا جان نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کے دعائیں دیں۔

وہ اسی دن شام کو پونا سے آئے تھے، اس لیے جلدی چلے گئے۔ ان کے آنے سے لگتا تھا جیسے کوئی دریچہ سا کھل گیا ہے اور تازہ ہوا جسم و جاں میں در آئی ہے۔ دس دن کے عرصے میں ان کی کوئی خیر خبر ہی نہیں ملی تھی۔ مجھے فکر ہو رہی تھی۔ مجھے کیا بھی اور بھی ان کے آنے سے خوش ہوئے تھے۔ ابا جان نے تو انہیں دیکھ کے برملا کہا کہ گھر میں اداسی ہو رہی تھی۔ دوسرے دن صبح جگنو اور دیوا کو کچھ وقت دے کے میں نشست گاہ میں آکے بیٹھا تھا کہ جولین آگئی اور اس نے مجھے یاد دلایا کہ میں نے رما سے وعدہ کیا ہے۔ مجھے یاد تھا۔ جولین نے مجھ سے لباس تبدیل کرنے کو کہا۔ میں نے صبح ہی کپڑے بدلے تھے۔ جولین سوٹ کے لیے کہنے لگی، کوئی تین دن پہلے درزی سوٹ اور شیروانی کی ٹرائی کرنے آیا تھا۔ ہفتے بھر سے اوپر ہوا وہ سب کے ساتھ میرا ناپ بھی لے گیا تھا۔ مجھے اس وقت کچھ اندازہ نہیں تھا کہ درزی سے میرے لیے کون کون سے کپڑوں کی فرمائش کی گئی ہے۔ وہ ناپ لیتا رہا، میں چپ چاپ کھڑا رہا۔ وہ تو جب ٹرائی کے لیے آیا تو مجھے معلوم ہوا، اس نے میرے لیے دو سوٹ اور دو شیروانیاں تیار کی ہیں۔ یقیناً وہ جولین ہی ہوگی۔ وہ پہلے بھی مجھے ٹوک چکی تھی کہ کرشنا جی کے بنوائے ہوئے میرے کئی سوٹ اس کے پاس محفوظ رکھے ہیں، میں انہیں کیوں نہیں پہنتا۔

"یہ کپڑے بھی ٹھیک ہیں' میں کسی تقریب میں تو نہیں جارہا۔"

"وہ بھی تو پہننے کے لیے ہیں' وہ ان سے اچھے لگیں گے۔"

"اچھا کیا! لباس سے اتنا کچھ تو نہیں ہوتا۔"

"کچھ تو ہوتا ہے۔"

"مجھے اچھا نہیں لگتا کہ وہاں کسی خاص لباس میں جاؤں۔"

"یہی سوچتے رہے تو پھر ان کا نمبر تو کبھی نہیں آئے گا۔"

"پھر کبھی سہی' اس وقت تو جی نہیں چاہ رہا۔"

"رما کہہ رہی تھی کہ شاید وہ کلب کی طرف جائے۔"

"کلب کی طرف!" میں نے تنک کے کہا "مجھ سے تو اس نے کچھ نہیں کہا۔ میں وہاں جا کے کیا کروں گا۔"

"سنا ہے' بہت اچھی جگہ ہے' بوٹنگ' فشنگ' سوئمنگ' ان ڈور گیمز اور جانے کیا کیا....."

"تم اسی لیے کپڑے بدلنے کو کہہ رہی ہو۔"

"نہیں' صرف اس لیے نہیں۔ کہتے ہیں' آدمی کو اچھا کھانا' اچھا پہننا چاہیے۔"

"اچھا بولنا' اچھا سننا اور اچھا سوچنا بھی۔"

"وہ تو سب موجود ہے۔" وہ مسکرانے لگی اور اس نے مزید بحث نہیں کی۔ مجھے گمان ہوا' کہیں میری حجت اسے گراں نہ گزری ہو۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ ایسا ضروری سمجھتی ہے تو میں جو وہ کہے پہن لیتا ہوں "پھر سہی۔" وہ خوشگواری سے بولی "مگر واسکٹ کے بغیر مت جانا۔"

اس نے اندر سے مجھے نئی واسکٹ لا کے دی اور مجھ سے پوچھا کہ میری جیب میں روپے ہیں یا نہیں۔ میرے ہاتھ فوراً جیبوں کی طرف گئے اور مجھے یاد آیا کہ ابا جان کے دیے ہوئے سارے روپے تو میں نے جولین ہی کے حوالے کر دیے تھے۔ وہ روپے بھی ساتھ لائی تھی۔ جانے کتنے نوٹ تھے۔ میں نے گنے بغیر جیب میں رکھ لیے۔

جولین نے مجھ سے موٹر لے جانے کو کہا تھا لیکن میں ایسے ہی گھر سے نکل آیا۔ کچھ دور بعد مجھے گھوڑا گاڑی مل گئی۔

○☆○

رما اپنی کوٹھی کے برآمدے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور بے تابانہ سیڑھیاں اتر کے میری طرف بڑھی۔ وہ گلابی رنگ کے گاؤن میں ملبوس تھی۔ اسی رنگ کی ریشمی ڈوری کمر سے بندھی ہوئی تھی۔ بال کھلے ہوئے تھے اور کسی شعر کے مانند جو میں نے کبھی پڑھا تھا' سیاہ بالوں میں اس کا چہرہ ماہ تاب کی طرح دمک رہا تھا "واقعی آپ آگئے۔" وہ پلکیں پٹ پٹاتے ہوئے بولی۔

"آپ کو شبہ تھا؟"

"نہیں' مجھے یقین تھا کہ آج آپ ضرور آئیں گے۔"

"اور یقین تھا تو اتنا کیسے؟"

"بس تھا' مجھے نہیں معلوم۔" وہ لہک کر بولی "ویسے میں جولی سے کہہ کے آئی تھی کہ صبح آپ کو یاد دلا دے۔"

"اس نے مجھ سے کہا تھا لیکن مجھے خود یاد تھا۔"

"اچھا ہوا' آپ آگئے۔" وہ دمیدہ آواز میں بولی "کیلی اسپتال چلا جاتا ہے میں یہاں دن بھر اکیلی رہتی ہوں' کچھ اور نہیں تو نوکروں سے باتیں کرتی رہتی ہوں۔"

"آدمی' آدمی سے بیزار ہے اور آدمی کو آدمی کے بغیر چین بھی نہیں۔" میں نے یوں ہی کہہ دیا۔

"اور آدمی کہاں ملتا ہے۔" وہ گہری سانس بھر کے بولی "آدمی جتنے زیادہ ہیں اتنے ہی کم بھی۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" میں نے اس کے پہلو بہ پہلو برآمدے کی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے کہا "آپ سے تو سب نے کہا تھا' جب تک ماں جی پونا میں ہیں' آپ ہماری طرف آجائیے۔ وہاں آپ کا دل شاید بالکل نہ گھبرائے۔"

"گھر کو بھی کچھ دیکھنا پڑتا ہے۔ پیچھے نوکروں کی فوج تھی۔ یہاں آ کے دیکھا تو سارا اجاڑ پڑا ہوا تھا۔ جدھر دیکھیے' دھول' گرد جمی ہوئی تھی۔ معلوم ہے آپ کو' ان لوگوں نے میری ایک بہت قیمتی' انمول مورتی توڑ دی۔ بہت نازک تھی وہ۔ میں نے ہزار منتوں کے بعد کشمیر میں ایک پنڈت سے حاصل کی تھی۔" یک بارگی اس نے سر جھٹکا۔ جھٹکنے سے اس کے بال ادھر ادھر ہوگئے۔ اس نے بہ عجلت انہیں اپنے چہرے سے ہٹایا اور مضطرب لہجے میں پوچھنے لگی کہ میں کہاں بیٹھنا چاہوں گا' وہیں برآمدے میں یا اندر۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا' اس نے کہا "اندر بہت سکون ہے' وہیں چلتے ہیں' اور ہاں' ایک بات آپ سے کہنی ہے' آپ کوئی تکلف نہیں کریں گے جس وقت بھی جس چیز کی ضرورت ہو' بے جھجک کہہ دیجیے گا۔ شاید مجھے جتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ کوئی دوسرا گھر نہیں ہے۔"

"تکلف تو آپ خود کر رہی ہیں۔ آپ کی یہ وضاحت سب سے بڑا تکلف ہے۔"

"تو اسے' اسے میرا آخری تکلف سمجھیے۔" وہ ہنس بولی۔

ہم دروازہ عبور کر کے بائیں جانب کے ایک کمرے میں آگئے۔ وہ ایک آراستہ وہ پیراستہ کمرا تھا۔ در و دیوار سے شان و شوکت ٹپک رہی تھی۔ سارے فرش پر قالین بچھا تھا اور دیواروں کے ساتھ قدیم طرز کے صوفے لگے تھے۔ ایک طرف صوفوں کے بیچ میں دیوان رکھا ہوا تھا۔ ہر کونے میں سنگ مرمر کے مجسمے استادہ تھے' نیم عریاں ملبوسات میں سوچتی ہوئی' انگڑائی لیتی ہوئی اور نیم پلکوں سے لجاتی' بل کھاتی عورتوں کے مجسمے۔ اوپر دیواروں پر کسی پختہ مصور کی بنائی ہوئی مختلف مناظر کی تصویریں آویزاں تھیں۔ وسط میں نیلگوں پتھر سے تراشی ہوئی میز پر تازہ گل دستہ سجا ہوا تھا۔ کمرے میں روشنی کم تھی۔ رما نے قمقمے روشن کر دیے' سارا کمرا جگمگانے لگا۔

"کیا پئیں گے آپ؟" وہ سامنے کے دیوان پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"جو جلد سے جلد میسر ہو جائے۔"

"کیوں؟ کوئی جلدی ہے آپ کو؟" وہ گھبرا کے بولی۔

"بالکل نہیں' آپ کا خیال ہے کہ آپ کو کم سے کم زحمت ہو اور آپ زیادہ سے زیادہ آزاد رہ سکیں۔" مجھے فوراً احساس ہوا کہ آزاد کے بجائے مجھے کوئی دوسرا لفظ کہنا چاہیے تھا۔

"میں ہمیشہ آزاد رہتی ہوں۔" وہ اونچی آواز میں بولی۔

میں نے کہنا چاہا کہ یہاں کوئی آزاد نہیں ہے۔ سب ایک دوسرے کے اسیر ہیں' آزاد تو شاید وہ ہوتا ہے جو محض اپنا اسیر ہو مگر میں چپ رہا۔

"پھلوں کے رس میں دیر لگے گی' چائے' کافی اور....." وہ جھجکتے ہوئے بولی "شراب بھی موجود ہے۔ مجھے یقین ہے' آپ نہیں پیتے۔ یہاں بھی کوئی نہیں پیتا لیکن مہمانوں کے لیے انتظام رکھنا پڑتا ہے۔"

"میرا خیال ہے' کسی ملازم سے چائے کے لیے کہہ دیجیے۔"

اسے قرار نہیں تھا۔ مجھ سے معذرت کر کے وہ فوراً کمرے سے چلی گئی۔ میں اٹھ کے اس دوران مجسمے کو دیکھتا رہا اور دیواروں پر لگی ہوئی پینٹنگز۔ چند منٹ ہی میں وہ واپس آگئی اور مجھے بتانے لگی کہ پچاس برس کے قریب ہوئے' اس کے دادا نے بنگال کے ایک مفلس مجسمہ ساز سے یہ مجسمے حاصل کیے تھے' کوئی انگریز بہت پیچھے پڑا رہا' ہزاروں کی پیشکش ہوئی۔ دادا انہیں خود سے جدا کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے اور خود ان سے جدا ہوگئے۔ اتنی دیر میں ایک ملازمہ چائے لے کے آگئی۔ چائے کے ساتھ نمک آلودہ کاجوؤں کی طشتری بھی تھی۔ میں نے پینٹنگز میں دلچسپی ظاہر کی اور اس سے پوچھا کہ اپنی بنائی ہوئی تصویریں اس نے کہاں چھپائی ہوئی ہیں' کہنے لگی' وہ تو شوقیہ ہیں' ایسی دیکھنے کی چیز نہیں تاہم میرے اصرار پر وہ مجھے اوپر ایک کمرے میں لے گئی اور میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ وہ تو پورا نگار خانہ تھا۔

ہر طرف' ہر گوشے میں چھوٹی بڑی تصویریں آویزاں تھیں اور بے شمار فریم اوپر نیچے دیواروں سے ٹکے ہوئے تھے۔ تمام تصویروں میں ایک بات مشترک تھی' پھول' پتے اور شعلے۔ شعلوں میں جلتے ہوئے پھول' شعلوں میں کھلتے ہوئے پھول۔ بقول شخصے تخلیق اپنے خالق کے باطنی رنگ روپ کا آئینہ ہوتی ہے تو رما کی تصویروں میں اس کا نہاں خانہ بہ تمام و کمال عیاں تھا۔ ان میں تیزی تھی' تندی' شدت' نفاست' سلیقہ اور خوب صورتی اور ان سب کا ایک توازن۔ اتفاق سے میں نے ابھی دو ایک روز پہلے ایک ناول میں تصویر اور مصور کے بارے میں بہت کچھ پڑھا تھا۔ وہ ایک مصور کی کہانی تھی۔ اس نے اپنے شاگرد سے کہا تھا کہ مصوری محض ہنر نہیں۔ علم' خیال' احساس اور فکر کے بغیر یہ ہنر ممکن نہیں۔ مصور کے لیے مشاہدہ ہی نہیں' تجربہ اور مطالعہ بھی اتنا ہی لازم ہے اور ان سب سے بڑھ کے جستجو ہے۔ جستجو تخلیق کی نشانی ہے۔ ہر تخلیق ایک جرات ہوتی ہے۔ اس نے اپنے شاگرد کو یک سوئی انہماک اور جستجو کی تلقین کی تھی اور کہا تھا کہ یک سوئی ایثار ہے' انہماک ایثار ہے۔ زندگی کی ہشت سمت ترغیبوں کو ٹھکرانے کا ایثار۔ یہ سطریں پڑھ کے میرا دھیان چاتو کی طرف چلا گیا تھا۔ چاتو اور تصویر کی کوئی نسبت نہیں مگر بٹھل بھی کچھ ایسی ہی باتیں کیا کرتا تھا۔ گویا کوئی کسی ہنر میں یکتا و یگانہ ہے۔ تو اپنی خداداد صلاحیتوں کے علاوہ کم و بیش انہی خوبیوں کے سبب سے ہے۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ ساری تصویریں رما نے بنائی ہیں۔ ایک تصویر میں عورتوں کے نیلام کی منظر کشی کی گئی تھی۔ چبوترے پر پابہ زنجیر' سرتاپا عریاں کئی نوجوان لڑکیاں سکڑی سمٹی کھڑی تھیں اور دو مرد فیتوں سے ایک لڑکی کی پیمائش کر رہے تھے' لڑکی شرم سے پانی پانی ہوئی جا رہی تھی۔ چبوترے کے نیچے بے حال ہجوم ہاتھ اٹھا اٹھا کے شور کر رہا تھا۔ پہلو میں ایک اور تصویر بھی آویزاں تھی۔ اس پر میری نظریں جم کے رہ گئیں۔ یہ بھی ایک نوجوان لڑکی کی تصویر تھی۔ لڑکی فٹ پاتھ پر نوکیلے' کھردرے پتھروں کی دیوار کے سہارے حسرت و یاس کے انداز میں بیٹھی تھی۔ اس کے بدن پر چیتھڑے جھول

رہے تھے اور کچھ ایسی صورت تھی کہ ناکافی لباس سے وہ بدن کا ایک حصہ چھپانے کی کوشش کرتی تو دوسرا حصہ نمایاں ہوجاتا۔ اس کے پاس ایک کشکول رکھا تھا۔ کشکول میں نہ سکے تھے نہ روٹی۔ ہاں، گلاب کا ایک پھول پڑا تھا۔ میں دیر تک یہ منظر دیکھا کیا۔ بعض چیزوں کا لفظوں میں اظہار ممکن نہیں، انہیں صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔

"کہاں کھوگئے آپ؟" مجھے گم دیکھ کے اس نے ٹوکا۔

"میں، میں یہ تصویر دیکھ رہا تھا۔" میں نے اٹکتی آواز میں کہا "آپ نے تو کمال کیا ہے۔"

"یہ تصویر مجھے بھی پسند ہے، بس بن گئی۔"

"یہ واقعی متاثر کن ہے۔ میں مصوری کے بارے میں کچھ نہیں جانتا لیکن یہ تصویر دیکھ کے عجیب قسم کا احساس ہوتا ہے۔"

"اور لگتا ہے، آپ مصوری کے لیے ہی بنی ہیں۔"

"مجھے تو کچھ بھی نہیں آتا، آپ یورپ جائیں اور وہاں گیلریز دیکھیں تو یہ سب کچھ ہیچ لگے گا۔"

"میرا خیال ہے، یہ بھی کچھ کم نہیں۔ یہ تصویریں دیکھ کے مجھے حیرت بھی ہوئی خوشی بھی۔ آپ تو ڈاکٹر ہیں، آپ نے یہ کیسے بنالیں؟"

"اتفاق کہیے، ڈاکٹر بھی میں اتفاق سے ہوں۔"

"کیسا اچھا اتفاق ہے۔" میں نے ہنس کر کہا "ایک فرسودہ سا جملہ لوگ اکثر بولتے ہیں کہ زندگی اتفاقات کا مجموعہ ہے۔ آدمی بہت کچھ اتفاق سے ہوتا ہے۔ کسی حد تک یہ غلط بھی نہیں تاہم خداداد صلاحیت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ اس کے بغیر آدمی گا تو نہیں سکتا، مصوری تو نہیں کرسکتا اور شاعر تو نہیں بن سکتا۔"

"خداداد صلاحیت بھی خام مال کی طرح ہوتی ہے، بے ترشے ہوئے پتھر کی طرح۔" وہ نہایت شستہ اور رواں انگریزی بول رہی تھی، کہنے لگی "پتھر تراشنے کے لیے مہارت کی ضرورت پڑتی ہے اور مہارت، ریاضت، لگن سے ممکن ہے اور جدت، خیال آفرینی سے۔ شاید ہر شخص میں کوئی نہ کوئی خداداد صلاحیت ہوتی ہے اور اسے اپنے جوہر کا خود علم نہیں ہوتا۔ ہر شخص ابتدا میں گنگناتا ہے بلکہ گانا گانا چاہتا ہے، ہر شخص دیواروں پر نقش و نگار بناتا ہے اور اسے جلد ہی اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ سُر سے محروم ہے اور اس کی انگلیاں شکل کشی کے لیے موزوں نہیں اور جن کے گلے میں سُر چھپا ہے، جن کی انگلیاں دائرے اور زاویے تراشنے کی لچک رکھتی ہیں، انہیں کوئی سازگار وقت یا ماحول مل جائے، رہبری مل جائے یا وسائل میسر آجائیں تو وہ کچھ کر گزرتے ہیں پھ[illegible] گڑ ڈالنے کی بات ہے، آدمی جتنی گہرائی میں جائے گا، ا[illegible] بیش بہا سیپیاں لائے گا۔"

اسے شاید میری توجہ میں کمی کا شبہ ہوا کہ وہ ٹھہر [illegible]

"آپ چپ کیوں ہوگئیں؟" میں نے بے تابی سے کہا "کی[illegible] سچی اور اچھی باتیں کررہی ہیں آپ! آپ بالکل ٹھیک کہ[illegible] ہیں، خواہش، صلاحیت نہیں، صلاحیت اور چیز ہے خواہ[illegible] اور چیز۔ آدمی کو خود علم نہیں ہوتا کہ اس میں کیسا جوہر چ[illegible] ہے۔"

"آپ نے سنا ہوگا کہ فلاں شخص بننا کچھ چاہتا تھا، [illegible] کچھ گیا۔ گویا دیر میں اس کی مخصوص صلاحیت کو اپنی منز[illegible] نظر آئی اور ضروری نہیں کہ آدمی ایک ہی طرح کی صلاحی[illegible] سے متعلق ہو۔ بیک وقت کئی قسم کی صلاحیتیں بھی اس م[illegible] چھپی ہوسکتی ہیں۔ یہ اتفاق ہے کہ اسے کس قسم کا ماحو[illegible] نصیب ہوتا ہے۔ عموماً آدمی کو اپنے حصار سے نکلنے کی فرص[illegible] نہیں ملتی، چنانچہ زردوز کا بیٹا کسی غیر معمولی صلاحیت کا ا[illegible] ہے تو بے چارہ زردوزی ہی میں کچھ الٹا سیدھا ملتا رہے گ[illegible] ہاں کبھی اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔ زردوز کا بیٹا ایک ا[illegible] شاعر اور مصور بھی بن جاتا ہے اور یہ بھی ہوتا ہے کہ کو[illegible] بیک وقت بہترین شاعر، مصور اور گلوکار ہو۔ جیسے خیام، ک[illegible] داس، اور بھی بہت سے نامور لوگ لیکن کتنے، بے شمار ا[illegible] ہوں گے جنہیں اپنے مصائب و آلام ہی سے مہلت نہ ملی جو زندگی بھر گردشوں کے اسیر رہے۔ خداداد صلاحیت [illegible] ساتھ آمادگی بھی لازم ہے۔ کوئی اپنا جوہر اجاگر کرنے پر آ[illegible] ہی نہ ہو۔ کوئی شخص بے حد سُریلا ہو اور گانے کا شوق نہ ر[illegible] ہو، اپنی صلاحیت کا عرفان ہونے کے باوجود اس کا برملا اظ[illegible] اسے ناپسند ہو یا وہ اپنا جوہر ہی حقیر سمجھتا ہو۔"

میں انہماک سے سن رہا تھا۔ یکایک وہ چونک سی پڑی ا[illegible] خفت سے بولی "جانے میں کہاں بھٹک گئی۔ بات کہاں سے تھی، کہاں پہنچ گئی۔"

"بات کہیں بھی نہیں پہنچی، وہیں پر ہے جہاں سے تھی۔" میں نے اشتیاق سے کہا "میں آپ کو سچ بتاؤں، کچھ حاصل کررہا ہوں۔"

"نہیں!" اس کی آواز بل کھاگئی "میں تو یوں ہی۔ اس کے رخساروں کی سرخی گہری ہونے لگی "آپ بھی کہتے ہوں گے۔ چلیے، نیچے چلتے ہیں۔"

"چلیے، لیکن آپ اپنا سلسلہ جاری رکھیے۔ یق[illegible] جانیں، مجھے بہت اچھا لگا۔ میں پوچھنا چاہ رہا تھا کہ آپ کی[illegible]

چاہتی تھیں؟"

"سچ پوچھیے تو مجھے خود نہیں معلوم۔"

"پھر بھی...!"

"یوں کہیے کہ سبھی کچھ..." وہ چہکتی آواز میں بولی۔

"اوہ نہیں۔" اس نے آنکھیں میچ لیں "ان تصویروں پر مت جائیے، یہ مصوری نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے، یہ کتنی ادھوری ہیں۔ میں اسی لیے انہیں بہت کم کسی کو دکھاتی ہوں۔ اب تو بہت دنوں سے میں ادھر آئی بھی نہیں ہوں۔ کبھی جی چاہا تو کچھ بنالیا، بس اتنا ہی ہے۔ اسے کسرِ نفسی مت سمجھیے۔"

میں نے اسے اس ناول کے بارے میں بتایا جو ابھی میں نے ختم کیا تھا۔ میں نے کہا "اس میں لکھا تھا کہ خداداد صلاحیت بھی مستقل نہیں ہوتی۔ ایک تخلیق کار مسلسل تخلیقی حالت میں نہیں رہتا۔ کبھی وہ بنجر ہوجاتا ہے، زمین کی طرح یا موسم خزاں کی طرح اور خزاں کا یہ موسم برسوں پر محیط ہوسکتا ہے۔ اس میں لکھا تھا کہ تخلیق کے دورے پڑتے ہیں۔ تخلیق کار کے پاس سب کچھ ہے، یکسوئی، آمادگی، مہارت اور وقت مگر خیال قابو میں نہیں آرہا۔ خیال کہیں گم ہوگیا ہے۔ تخلیق کار کے لیے یہ وقت بڑے کرب کا ہوتا ہے۔ اس کے جوڑ جوڑ میں ٹیسیں اٹھتی ہیں۔ اس پر ایک دیوانگی سی طاری رہتی ہے، وہ غصے میں کبھی رنگ لوٹ دیتا ہے، برش توڑ دیتا ہے، کینوس پھاڑ دیتا ہے، اور کچھ نہیں ہوتا تو اپنے آپ کو کھسوٹنے لگتا ہے۔"

"کون سی کتاب تھی وہ؟" وہ تجسس سے بولی۔

"میں آپ کو پیش کروں گا لیکن آپ نے اس مصنف سے کچھ کم فکرانگیز باتیں نہیں کیں۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ ناول کے متن اور آپ کے بیان میں کیسی مشابہت ہے، یہ درد مشترک کی بات ہے شاید۔"

"اوہ نہیں! میں، میں کسی زمرے میں نہیں آتی۔" وہ بے بسی کے انداز میں بولی "مجھے اپنی بساط، اپنی حدود اچھی طرح معلوم ہیں۔"

"اس کا فیصلہ دوسرے کرتے ہیں۔" میں نے تیکھے لہجے میں کہا "میں سمجھتا ہوں کہ خداداد صلاحیتوں سے پہلے اور بعد میں سب سے اہم چیز ذہانت ہے، مثال کے طور پر چاقو بازی کے فن میں..." میرے منہ سے نکل گیا۔ میں نے اپنی زبان کو لگام دینا چاہی لیکن یوں تو وہ جانے کیا سمجھتی، میں نے بات پلٹاتے ہوئے کہا "چاقو بازی یا کوئی بھی "حربی فن" مراد ہے مہارت کتنی بھی ہو، ذہانت کے بغیر سب کچھ ناتمام ہے۔"

"یقیناً، یقیناً۔" اس نے شدت سے میری تائید کی "ذہانت تو پہلی شرط ہے۔ مہارت تو ریاضت، لگن اور کثرت کار سے حاصل ہوجاتی ہے اور صاف، سجل پہلے سے بہتر نمونے بھی تو سامنے آسکتے ہیں۔ مہارت سے رفتار میں اضافہ ہوتا ہے لیکن ذہانت کی بات ہی اور ہے۔ ذہانت تخلیق کار کو بے قرار کیے رہتی ہے اور تجربے کی جرات پیدا کرتی ہے۔ ممکن ہے بعض تخلیقی نمونے کبھی اونچان کے وجود میں آگئے ہوں لیکن ان کا تواتر و تسلسل تو فکر سے ہی ممکن ہے۔"

باتوں میں سیڑھیاں اترنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ ہم نیچے ایک کشادہ کمرے میں آگئے۔ وہ سونے کا کمرا تھا اور ایک طرح کی نشست گاہ بھی تھی۔ ہر قسم کا سازوسامان وہاں موجود تھا، مسہری، میز، کرسیاں، سنگھار میز گراموفون ریکارڈ، ریڈیو، کتابیں اور شیشے کی الماری میں چینی کے برتن اور آرائشی چیزیں۔ رما نے بتایا کہ یہ مہمانوں کا کمرا ہے، رشتے داروں اور عزیزوں کے لیے مخصوص۔ ویسے اصل مہمان خانہ کوٹھی سے الگ ایک حصے میں ہے۔

میں آرام کرسی پر بیٹھ گیا، وہ بھی میرے برابر بیٹھ گئی اور کہنے لگی کہ مجھے آرام کی خواہش ہو تو بے تکلفی سے بتادوں۔ میں نے بے ساختہ کہا کہ اس بیداری سے زیادہ کیا آرام ہوسکتا ہے۔ البتہ اسے کچھ کام ہو تو میں اطمینان سے یہاں بیٹھا رہ سکتا ہوں۔

"آپ کہیں تو کہیں اور چلیں۔" وہ مچلتی آواز میں بولی۔

"جہاں آپ کہیں مگر کیا یہاں سکون کم ہے۔"

"یہ تو ہے، میں تو آپ کی وجہ سے کہہ رہی تھی۔" وہ تیزی سے بولی "کچھ منہ چلتا رہے تو اور لطف آئے گا۔ میں آپ کے لیے پکوڑے بنا کے لاتی ہوں، پنیر کے پکوڑے، آپ کو پسند ہیں نا!" کیا خیال ہے۔"

"پکوڑے پسند ہیں لیکن خیال اچھا نہیں، آپ کو یہاں بیٹھے ہوئے برا لگ رہا ہے کیا! براہ مہربانی تسلی سے بیٹھی رہیے۔" میں نے منت کے انداز میں کہا "کھانے کے وقت ہی کچھ کھائیں پئیں گے۔ کیا پکایا ہے آپ نے؟"

"آپ کو کیا پسند ہے؟"

"تقریباً ہر اچھی بنی ہوئی چیز۔"

"پھر بھی کوئی خاص؟"

"میں کہوں گا تو آپ مذاق سمجھیں گی۔"

"دال کو تو آپ نہیں کہہ رہے؟"

مجھے ہنسی آگئی۔ وہ بھی ہنسنے لگی۔ ہم دونوں دنیا جہاں کی

باتیں کرتے رہے لیکن اس نے پونا کا ذکر کیا، نہ میرے بارے میں کچھ پوچھا۔ گھڑی نے ایک بجایا تو وہ فوراً اٹھ گئی۔ ابھی وہ گئی تھی اور میں آنکھیں موندے آرام کرسی پر دراز تھا کہ کچھ دیر میں کیلاش کی آواز آئی۔ وہ اچھلتا، شور مچاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور میرے گلے سے لگ گیا۔ کہنے لگا "رما سے میری شرط لگی ہوئی تھی کہ آج بھی آپ شاید نہ آئیں۔ رما کو یقین تھا۔ میں پورے سو روپے ہار گیا۔"

"مگر تمہیں شک کیوں تھا؟"

"میرا خیال تھا، آج بھی آپ کہیں گھر نہ جائیں۔ وسیوں کام نکل آتے ہیں۔" وہ میرا... بازو پکڑتے ہوئے بولا "مگر مجھے اپنے ہار جانے کی بہت خوشی ہے۔" اس کی خوشی اس کی آواز سے ظاہر تھی۔ اس کی آنکھوں سے ظاہر تھی "کب آئے آپ؟"

"میں نے اسے بتایا کہ دیر ہوگئی۔"

کیلاش کے آجانے سے گھر میں ایک دم چہل پہل سی ہوگئی۔ اس نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا۔ اتنی دیر رما اور ملازمہ نے کھانے کی میز چن دی۔ کھانے میں زیادہ اہتمام نہیں تھا، ہلکی پھلکی غذائیں تھیں لیکن سب کچھ نہایت لذیذ۔ ٹماٹر کا سوپ تو بہت اچھا تھا۔ میں نے سیر ہو کر کھایا اور طبیعت بھی بوجھل نہیں ہوئی۔ کھانے کے بعد کیلاش نے انگریزی دھنوں کے ریکارڈ لگا دیے۔ وہ دونوں بھائی بہن ایک دوسرے سے نوک جھونک کرتے رہے۔ کیلاش اسپتال آنے والے مریضوں کے بارے میں بتانے لگا کہ بعض دن تو جیسے مریض ڈاکٹروں کی آزمائش کے لیے منتخب کر لیتے ہیں۔ آج دن بھر تانتا بندھا رہا، حادثات کے مریض تو مسلسل آتے رہے اور اتنے شدید حادثوں کے کہ ایک طرف توجہ دیجیے تو دوسرے سے ناانصافی۔ پھر کیلاش نے ایک عورت کے بارے میں بتایا کہ وہ کئی دن سے پولیس کی نگرانی میں زیر علاج ہے۔ اس پر اپنے شوہر اور اس کے دوست کے قتل کا الزام ہے۔ یہ سن کر میرا ماتھا ٹھنکا "کون ہے وہ؟" میں نے متوحش لہجے میں پوچھا۔

"مجھے زیادہ تفصیل نہیں معلوم۔" کیلاش نے افسردگی سے کہا "پونا سے آنے کے بعد میں نے آج ہی اسپتال جوائن کیا ہے۔ میں راؤنڈ پر تھا کہ ایک کمرے میں سپاہی دیکھ کر میں چونکا۔ وارڈ بوائے سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ایک قاتل عورت اندر موجود ہے۔ مجھے بے چینی ہوئی، اس طرف میری ڈیوٹی نہیں تھی۔ ممکن ہے سپاہی مجھے روک دیتے لیکن اس سے پہلے کہ وہ رکاوٹ بنتے، میں سیدھا کمرے میں داخل ہوگیا۔"

"لیکن پولیس کسٹڈی کے مریضوں کے لیے نرسیں اور ڈاکٹر بھی طے ہوتے ہوں گے۔" رما الجھ کے بولی "اس طرح تو کوئی بھی اندر جا سکتا ہے۔"

"میرے گلے میں اسٹیتھسکوپ لٹکا ہوا تھا۔ اپر کوٹ بھی پہنے ہوئے تھا۔ کوئی ڈاکٹر ہی لگ رہا تھا۔"

"مگر یہ حلیہ تو کوئی بھی اختیار کر سکتا ہے۔" رما نے تنک کر کہا۔

"کچھ شخصیت کی بھی بات ہوتی ہے۔" کیلاش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہا!" رما چمک کے بولی اور تالی بجانے لگی "لگتا ہے تمہارے آئینے پر دھول خاصی جمی ہوئی ہے۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کے بولی "دیکھا آپ نے! ڈاکٹر صاحب کو کیسی خوش فہمی ہے، سامنے کون بیٹھا ہے، یہ دیکھے بغیر...."

"بابر بھائی کی بات اور ہے۔ اپر کوٹ اور اسٹیتھسکوپ کے بغیر بھی چلے جائیں تو سپاہی دروازے سے ہٹ جائیں گے۔"

"جی ہاں۔ بالکل!" میں نے گہری سانس لی "مجھے آگے جاننے کی تشویش تھی، میں نے کسمساتے ہوئے پوچھا "مگر تم نے یہ بتایا ہی نہیں کہ اندر جا کے تم نے کیا دیکھا؟"

"وہ ایک سیدھی سادی عورت ہے۔" کیلاش کے لہجے میں سنجیدگی آگئی۔ وہ گم صم بستر پر نیم دراز تھی۔ پھٹی پھٹی سی آنکھیں، سامنے دیوار کی جانب گھورتی ہوئی۔ میری آہٹ پر اس نے دروازے کی طرف مڑ کے دیکھا بھی نہیں۔ دیکھنے سے کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس نے کسی کا خون کیا ہوگا اور ایک کے بجائے دو خون..."

"میں پوچھتے پوچھتے رہ گیا کہ اس کا نام کیا ہے۔ وہ بدنصیب ماری کے سوا اور کون ہو سکتی تھی۔ اب کیسی ہے وہ؟" میں نے پژمردگی سے پوچھا۔

بے ارادہ میرے منہ سے اب نکل گیا تھا۔ کیلاش نے توجہ نہیں دی کہنے لگا "ویسے تو بالکل ٹھیک معلوم ہوتی ہے لیکن صاف لگتا ہے کہ دل و دماغ پر گہرا اثر ہے۔ وہ بہت نڈھال تھی جیسے برسوں کی بیمار ہو اسے دیکھ کر مجھے ترس آیا۔"

"مگر اس نے اپنے شوہر کو آخر کیوں قتل کر دیا؟" رما حیرت سے بولی "کوئی بہت سنگین بات ہی ہوگی کہ اسے یہ قدم اٹھانا پڑا۔"

"کیا کہہ سکتا ہوں، میں نے بتایا نا کہ مجھے تفصیل نہیں معلوم۔ آج شام کچھ دیر کے لیے اسپتال جانا ہے، دیکھو شاید ...ل بات پتا چلے۔"

"کیا عمر ہوگی۔" رما کے لہجے میں دل سوزی تھی۔

"ایسی زیادہ نہیں۔"

میں خاموش بیٹھا رہا اور یہی بہتر ہوا۔ رما نے خود ...ضوع بدل دیا۔ اس نے کیلاش سے پوچھا کہ شام کو اس کا ...ا ارادہ ہے؟

"کلب چلیں گے۔" کیلاش نے کسی تامل کے بغیر کہا۔

"مگر تم تو کہہ رہے تھے کہ تمہیں اسپتال بھی جانا ہے؟"

"تھوڑی دیر کے لیے بس! کچھ سیریس کیس ہیں۔"

"پہلے اسپتال جائیے۔" میں نے نرم روی سے کہا ...ب پھر کسی دن چلیں گے۔ میں تو ایسے ہی کپڑے پہن کے ...آیا۔"

"یہ تو نہایت عمدہ لباس ہے۔ بال روم اور ڈنر میں ...وص لباس کی قید ہوتی ہے۔ ہم اس طرف جائیں گے ہی ...۔ آپ چل کے دیکھیے، دلچسپ جگہ ہے۔" رما نے کچھ ...ے منت کش لہجے میں کہا کہ کچھ اور نہ کہہ سکا۔ ویسے بھی ...کوئی اعتراض نہیں تھا۔ میں تو آیا انہی کے خیال سے ...

شام کو پانچ بجے سے کیلاش نے شور مچانا شروع کر دیا۔ ...ا دیر میں وہ تیار ہوتے رہے، میں مہمانوں کے کمرے میں ...ں پھیلائے کرسی پر ستاتا رہا۔ ملازمہ وہیں چائے لے آئی۔ ...ے سے ملحق غسل خانہ تھا۔ میں ادھر ہاتھ منہ دھو کے باہر ...۔ ادھر وہ بھی آگئے۔ کیلاش عنابی رنگ کے سوٹ میں ...ں تھا۔ رما نے بھی اسی سے ملتے جلتے رنگ کی ساڑی پہنی ...۔ قد اس کا ویسے بھی نکلتا ہوا تھا، ساڑی میں کچھ اور کھنچ ...۔ کانوں میں طلائی ٹاپس تھے اور گلے میں سفید موتیوں کا ... اس سادگی میں بھی بڑی زیبائش تھی۔

دھوپ چھتوں پر جا چکی تھی۔ گھر سے نکلتے نکلتے چھ بج ...۔ ہمیں زیادہ دور نہیں جانا پڑا۔ یہی کوئی آدھ گھنٹے کا سفر ...۔ کیلاش نے مجھے اور رما کو کلب کے احاطے میں وسیع ...ن سبزہ زار پر چھوڑ دیا اور ڈیڑھ گھنٹے کی مہلت لے کے ...ے لوٹ گیا۔

ہر سو سرمئی سا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ سبزہ زار شاید روز ...ا جاتا ہوگا۔ جیسے سبز مخمل زمین پر بچھا دی گئی ہے۔ مخملی ...ا میں جس طرح بیل بوٹے بنے ہوتے ہیں، بالکل اسی ... سبزہ زار میں فاصلے فاصلے سے رنگ برنگے پھول کھلے ...۔ سامنے مٹیالے پتھروں سے بنی ہوئی قدیم طرز کی ایک پرشکوہ عمارت کھڑی تھی۔ وسیع برآمدے کا فرش سرخ تھا اور اس پر سفید کرسیاں اور میزیں سلیقے سے رکھی تھیں۔ تمام کھڑکیوں اور دروازوں کے شیشے بلور کے مانند چمک رہے تھے۔ برآمدے کی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے میرے قدم اگر اٹک نہیں رہے تو جھجک ضرور رہے تھے۔ فرش ایسا چکنا تھا کہ ذرا سی بے احتیاطی سے آدمی توازن کھو بیٹھے۔ کرسیوں پر اکا دکا لوگ بیٹھے تھے، عورتیں اور مرد دونوں۔ انہوں نے ایک نظر ہماری جانب دیکھا، ایک عورت نے ہاتھ کے اشارے سے رما کے لیے خوشی کا اظہار کیا۔ رما نے بھی اسی انداز میں اسے جواب دیا اور درمیانی دروازہ عبور کر کے ایک لمبی چوڑی راہداری میں داخل ہوگئی۔ راہداری کے دونوں طرف ہال تھے۔ میں نے رما کی رفتار کا ساتھ دینے کی کوشش کی۔ اندر منظر ہی کچھ اور تھا۔ سوئمنگ پول، جمنازیم، ٹینس کورٹ اور فٹ بال کا میدان۔ عمارت کے پچھلے حصے میں ناریل کے درختوں کی کثرت تھی اور اونچی نیچی زمین پر دور تک سبزہ زار پھیلا ہوا تھا اور جنگل کا سا نقشہ تھا۔ بیچ بیچ میں کہیں کہیں لال پیلی چھتریاں نصب تھیں اور ان کے سائے میں کرسیاں رکھی تھیں۔ اتفاق سے کوئی وہاں بیٹھا ہوا نہیں تھا۔ رما سبزے کے درمیان پتھروں کے راستے سے گزر کے اونچائی پر آگئی۔ آگے ایک بڑا چبوترہ تھا اور چبوترے کا فرش پختہ نہیں تھا۔ اس کے ایک طرف سفید جنگلا بنا تھا اور جنگلے کے پار ساحل۔ ہم وہیں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اندھیرا تیزی سے بڑھ رہا تھا اور ساری روشنیاں جل گئی تھیں۔ ہم سے قدرے فاصلے پر کچھ اور لوگ بھی بیٹھے تھے۔ "کیسی جگہ ہے؟" رما نے پرشوق آواز میں پوچھا۔

"نہایت دلچسپ۔" میں نے ادھر ادھر نظر گھماتے ہوئے کہا۔

"آپ پہلے تو اس طرف نہیں آئے؟"

"میں کہاں!" میرے ہونٹ سکڑ گئے "عرصہ ہوگیا، ایسے ہی ایک کلب میں جانا ہوا تھا۔ وہ بھی بہت بڑی جگہ تھی مگر ایسی نہیں تھی۔ ساحل بھی نہیں تھا۔ یہاں کا تو سماں ہی کچھ اور ہے۔"

"ویسے تو دن بھر یہاں لوگ آتے جاتے رہتے ہیں لیکن شام کو تو کلب کے کسی ممبر کا جیسے گھر میں جی لگتا ہی نہیں۔ سب ادھر کا رخ کرتے ہیں اور رات گئے واپس جاتے ہیں اور چھٹی کے دن تو میلا سا لگا رہتا ہے۔ کلب چھوٹا پڑ جاتا ہے۔"

"جگہ ہی ایسی ہے۔ یہاں ایسا کوئی تکلف بھی مجھے نظر

نہیں آیا۔ میں نے ساحل کی نم ہوا سینے میں بھرتے ہوئے کہا "لوگ آزادانہ جدھران کا جی چاہے' گھوم پھر سکتے ہیں اور واقعی آپ ٹھیک کہتی ہیں' یہاں لباس کی بھی کوئی پابندی نہیں۔"

"کلب اس لیے بنائے جاتے ہیں کہ آدمی کچھ دیر آزاد فضا میں سانس لے سکے۔ یہاں لوگ ایک دوسرے سے بہت کھلے ملے اور ایک دوسرے سے بہت الگ تھلگ رہتے ہیں۔ بہت مشکل سے کلب کی ممبر شپ ملتی ہے۔ بعض اوقات برسوں انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اونچی اونچی سفارشیں چلتی ہیں۔ اچھی طرح چھان پھٹک کر ممبر بنایا جاتا ہے۔"

"سب سے بڑی سفارش تو خود دولت ہے۔"

"بے شک' پہلی شرط یہی ہے۔" وہ کشادہ آواز میں بولی "یہاں چھوٹے امیر کی بھی گنجائش نہیں۔ راجے' مہاراجے' اعلیٰ حکام اور اعلیٰ تاجر وغیرہ۔ کوئی چیز یہاں اعلیٰ سے کم نہیں ہے۔"

"اگر کوئی امیر سے غریب ہو جائے۔۔؟" میں نے جھجک کر کہا۔

"اس کی ممبر شپ تو قائم رہتی ہے کیونکہ ایک دفعہ کوئی ممبر بن گیا تو بن گیا' چاہے وہ بعد کو غریب ہو جائے۔ وہ کلب کی سالانہ فیس ادا کرتا رہے۔ کلب کے قواعد پر عمل کرتا رہے تو ممبر شپ جاری رہے گی لیکن اس کے علاوہ دیگر اخراجات بھی تو ہوتے ہیں۔ ملنے جلنے میں کچھ خرچ تو ضرور ہوتا ہے۔ شکست خوردہ آدمی تو ویسے بھی کم تری کے احساس کا شکار ہو جاتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے' ایسے لوگوں کا کلب میں آنا جانا خود ہی ختم ہو جاتا ہے۔"

اندھیرے میں ساحل بالکل چھپ گیا تھا اور کلب کی روشنیاں اور نمایاں ہو گئی تھیں۔

رمانے خدمت گار کو جانے کس وقت اشارہ کیا تھا کہ وہ صاف و شفاف گلاسوں میں سنگترے کا رس لے آیا۔ اس کے طور طریق میں عاجزانہ تپاک تھا۔ انکار تو جیسے وہ جانتا ہی نہیں تھا۔ ہر بات میں سر جھکاتا بلکہ دہرا ہو جاتا۔ برف کی قاشیں گلاس میں ڈال کے اس نے رس کی چسکی لی۔ ذرا سا ترش تھا لیکن مزے کا تھا۔ میں آدھا گلاس پی گیا۔ آپ تو یہاں خوب آتی ہوں گی؟" میں نے آہستگی سے کہا۔

"اب تو کبھی کبھی۔" وہ کھوئی کھوئی آواز میں بولی "زیادہ دنوں کی بات نہیں' امتحان کے فوراً بعد مجھے ایک عرصے تک کلب کا دورہ پڑا رہا۔ ہر شام یہیں گزرتی تھی لیکن پھر آنا کم ہو گیا۔"

"کیوں؟ پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتی کہ اس کی وجہ کیا تھی۔ یہ مجھے بہت پسند ہے پھر آدمی جائے بھی کہاں۔" وہ تذبذب بولی "اصل میں' شاید بات یہ ہے کہ جگہ کا تعلق منا نہیں' لوگوں سے بھی ہے۔"

"ہاں ہاں۔" میں نے یونہی سرہلا کے تائید کردی میں مجھے احساس ہوا کہ اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ یہاں آپ کو اچھے لوگ ملے؟" میں نے بے ربطی سے پوچھا۔

"نہیں' یہ زیادتی ہوگی۔" اس کے ہونٹوں پر تبسم گیا "ایسا نہیں ہے کہ یہاں برے لوگ آتے ہیں' برے سبھی۔ یہ کلب کب سے قائم ہے۔ اچھے' پڑھے خشک مزاج اور بے تپاک لوگ ہیں یہ' ہنستے بولتے رہتے ہنسنے بولنے کے لیے یہاں آتے ہیں۔"

"پھر' پھر کیا بات ہوئی؟"

"اس کی وضاحت مشکل ہے۔" وہ ہچکچانے لگ خیال ہے' یہ میری ہی کوئی خامی ہوگی کہ میں ان کے قر آسکی' کوشش کے باوجود یوں سمجھئے۔۔"

"مگر انہوں نے تو آپ کی قربت کی خواہش کی؛ میں نے اس کی بات کاٹ کے جلدی سے کہا اور مجھے ا عجلت پر خفت ہوئی۔

"ہاں شاید' انہوں نے مجھے یہ عزت دینا چاہی تھ میں نے کہا نا کہ میں اس کی متحمل نہیں ہو سکی۔" د سے بولی۔ میری خاموشی پر وہ کچھ سنجیدہ ہو گئی اور زیر بولی "وہ سب ایک جیسے ہیں' ایک جیسی باتیں کرتے بڑے محدود لوگ ہیں۔ لوٹ پھر کے ان کی توجہ کا مرکز ہی رہتی ہے۔"

"تو برا کیا ہے' دولت اتنی حقیر چیز نہیں بڑی م ملتی ہے اس سے۔"

"دنیا یہی سمجھتی ہے' اتنے بہت سے لوگ غل سمجھتے ہوں گے۔ دولت آدمی کو طاقت ور تو ضرور؛ جبھی لوگ اس کی طرف بھاگتے ہیں۔"

"لیکن صرف دولت ہی تو سب کچھ نہیں اور چ بھی زندگی ہے' دولت مند آدمی بظاہر بہت پھیلا ہو ہے لیکن وہ ہوتا بہت محدود ہے۔ اس پر دولت کا طلسم طاری رہتا ہے کہ اسے اس کے سوا کچھ دکھا دیتا۔ اس کی بیش تر توانائیاں اس میں صرف ہو جاتی کہیں رکتا نہیں' بس بھاگتا رہتا ہے' بھاگتا رہتا ہے

وقت یہ خوف لاحق رہتا ہے کہ یہ سرفرازی اس سے چھن نہ جائے۔ چاہے کوئی کتنا ہی بڑا دولت مند ہو' ایک سہما ہوا آدمی ہوتا ہے۔ چاروں طرف چھائی ہوئی بھیانک غربت اسے دولت پکڑنے' جکڑنے پر مجبور کیے رہتی ہے۔ اور وہ جانتا ہے کہ دولت صلاحیت سے زیادہ اتفاق ہے' حادثہ ہے اور جسے ورثے سے نہیں' اپنی جدوجہد سے دولت ملی ہو' وہ تو اور اس سے چمٹا رہتا ہے اور وہ خوف زدہ رہتا ہے۔"

"آپ صحیح کہہ رہی ہیں لیکن آپ نے غریبی کہاں دیکھی ہے۔ غریبی تو بہت بڑی قید ہے۔ یہ تو آدمی کو امیری سے کہیں زیادہ محدود کردیتی ہے۔"

"میں نے غریبی دیکھی نہیں' سنی اور پڑھی ضرور ہے۔ غریبی بری چیز ہے اور امیری بے شک اچھی چیز لیکن میں ایک اور بات کہہ رہی ہوں۔" اس کی آواز تمتمانے لگی "میری مراد روپے سے ہے۔ دولت کی اتنی طلب سے آدمی خود کو کھودیتا ہے۔ آدمی' آدمی نہیں رہتا' کچھ اور بن جاتا ہے۔"

تیز ہوا سے اس کی ساڑی کا پلو اڑا اڑ جاتا تھا۔ اس کے بال بھی اڑ رہے تھے۔ وہ کبھی پلو درست کرتی تھی' کبھی بال۔ "چھوڑیے بھی۔" اس نے گلاس میں بچا کھچا رس ایک گھونٹ میں ختم کردیا اور بے قراری سے بولی "آپ یہیں بیٹھے رہیں گے؟ کسی اور طرف کیوں نہ چلیں؟ اب کلب جاگنے لگا ہے۔ میں آپ کو گھماتی ہوں۔ ذرا دیکھئے گا' یہاں آکے لوگ کیسے دیوانے ہوجاتے ہیں۔"

میں نے اسے یاددلایا کہ کیلاش اب آتا ہی ہوگا' ہم اِدھراُدھر ہوگئے تو اسے دشواری ہوگی۔

"ڈھونڈ لے گا۔ اسے یہاں کے سب ٹھکانے معلوم ہیں۔" وہ بے نیازی سے بولی۔ اس نے خدمت گار کے لائے ہوئے بل پر دستخط کیے اور کچھ روپے بھی رکھے اور کرسی سے اٹھ گئی۔ ہم جس جگہ بیٹھے تھے' وہ سب سے اونچی تھی' کلب کی عمارت کا عقبی حصہ' سبزہ زار' سوئمنگ پول وغیرہ خاصے نیچے تھے۔ اونچائی پر جاکے چیزیں کتنی چھوٹی نظر آتی ہیں۔ ایک طرف گہرا اندھیرا مسلط تھا' سمندر کی طرف باقی تینوں اطراف شہر کی روشنیاں بکھری ہوئی تھیں جیسے ستارے زمین پر آگئے ہوں۔ راستے میں روشنی زیادہ نہیں تھی۔ وہ آگے آگے تھی' میں ایک قدم پیچھے۔ اونچے نیچے پتھروں سے بنی ہوئی سیڑھیاں اترتے وقت اس نے ساڑی سینڈل سے کچھ اوپر کرلی اور احتیاط سے قدم رکھتی رہی۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ گر نہ جائے۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھادیا۔ میں نے بے اختیار اسے تھام لیا۔ کوئی ریشم سا میری مٹھی میں بھر گیا مگر دوسرے ہی لمحے میرا وجود تپ ہوگیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے قدم زمین پر اکھڑ رہے ہوں جیسے مجھے خود سہارے کی ضرورت ہو۔ کوئی لمحہ جائے گا کہ میں سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا نیچے چلا جاؤں گا۔ مجھے نہیں معلوم کہ باقی سیڑھیاں میں نے کس طرح طے کیں اور کب اس ہاتھ چھوڑا یا اس نے چھڑالیا۔ چند ثانیوں تک میں اپنے آپ سے بچھڑا رہا لیکن جلد ہی میں خود کو نظر آگیا۔ اپنی بازیابی پر میں نے سکون کی سانس لی۔ نیچے آکے اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور مجھ سے پوچھنے لگی کہ کیوں نہ سمندر کی سیر کریں۔

یہ گزشتہ لمحوں کی ناتوانی ہی تھی کہ میں کوئی جواب نہ دے سکا اور اضطراری انداز میں سرہلا کے رہ گیا۔ وہ پگڈنڈی جیسے راستے سے نیچے اترتی رہی۔ کچھ دیر میں ہم اس برآمدے میں آگئے جہاں سے کشتیوں میں سوار ہوا جاتا تھا۔ وہاں کئی کشتیاں کھڑی تھیں۔ کئی آدمی ہماری طرف لپکے۔ رما ان پر توجہ دیے بغیر نیچے اتر گئی۔ ملاح تیزی کے ساتھ ہم سے آگے بڑھ گئے۔ انہوں نے مجھے اور رما کو اپنے ہاتھ کے سہارے سے زینے اور کشتی کے درمیان کا فاصلہ عبور کرایا۔ وہ ایک بادبانی کشتی تھی' سفید براق بادبان پر لال لال دھاریاں پڑی تھیں' مسلسل دو ملاحوں نے جاں فشانی سے کشتی گھاٹ کے زینے سے جدا کردی۔ وہ کچھ دور تک چپو چلا کے کشتی بڑھاتے رہے پھر انہوں نے بادبان کھول دیا۔ درمیان میں سازوسامان کے لیے بنی ہوئی جگہ سے کشتی دو حصوں میں منقسم ہوجاتی تھی۔ ہم جس حصے میں آکے بیٹھے تھے' وہ غالباً سیربینوں کے لیے مخصوص تھا۔ وہاں صاف ستھرے پھول دار گدے بچھے تھے' پاؤں پھیلا کے بیٹھیے یا لیٹ جائیے۔ دونوں طرف تختوں کی بنچ جیسی نشست نصب تھی۔ اس پر بھی نرم گدے بچھے تھے۔ کلب کے معززین ہی اس کشتی میں سیر کرتے ہوں گے اسی لیے ایسا اہتمام تھا۔ یہ سمندر ہی حصہ تھا مگر کسی بڑی جھیل کے مانند۔ اس طرف پانی میں زوروشور نہیں تھا مگر جیسے جیسے کشتی آگے بڑھتی گئی' پانی تندوتیز ہوتا گیا۔ ٹھٹکی ہوئی چاندنی ہرسو بکھری ہوئی تھی آسمان پر رواں دواں بدلیاں چاند چھپالیتیں تو اندھیرا ہوجاتا۔ تیز ہوا چل رہی تھی' کشتی کی رفتار بھی تیز تھی۔ رما کے اڑتے ہوئے بال بھی بدلیوں کی طرح بار بار اس کے چہرے پر چھاجاتے' وہ بے خودی کے سے عالم میں تختے پر بیٹھی تھی۔ مجھے بھی یہ سب کچھ عجیب سا لگ رہا تھا' خواب خواب' تصویر تصویر۔ رما تختے سے اٹھ کے گدے پر چلی گئی اور تکیے کے سہارے ترچھی ہوکے نیم دراز ہوگئی۔ اس نے مجھے بھی وہیں آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے کسی معمول کی طرح اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ میں بھی اس کے قریب گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کے اور پاؤں پھیلا کے بیٹھ گیا "آپ خاموش کیوں ہوگئے؟ کیا اچھا نہیں لگ رہا؟" وہ لہرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"بہت' بہت اچھا۔" میں نے ہڑبڑا کے کہا "یہ تو عجیب ہے۔ رات کو تو سمندر اور سحرانگیز ہوجاتا ہے۔"

"مجھے رات ہی کو سمندری سیر کی سوجھتی ہے۔ چاندنی میں تو اور مزہ آتا ہے۔ سمندر بپھرا ہوا ہوتا ہے۔ یہ شاید آٹھویں نویں کا چاند ہے۔ چار پانچ دن بعد اُدھر آکے دیکھئے گا' کیسا پاگل بنا ہوا ہوگا' پانی۔"

کبھی کبھی کشتی بہت ہچکولے کھانے لگتی' لگتا تھا' کوئی جھولا جھلا رہا ہے۔ ایک گھن گھنا تا سناٹا ہر طرف طاری تھا۔

"کیا سوچ رہے ہیں۔" وہ لپکتی آواز میں بولی۔

"کچھ نہیں۔" میں نے تن وہی سے کہا "بس ایسے ہی۔ سوچ رہا تھا کہ ہم اتنی دیر وہاں ٹیلے پر کیوں بیٹھے رہے۔ میں نے رات کے وقت اس طرح پہلی بار سمندر کا نظارہ کیا ہے' سمندر کے اندر جاکے۔"

"ایک بات پوچھوں؟"

"ضرور!" میں نے حیرانی سے کہا "کیا بات ہے؟"

"یہ آپ اتنے بند بند سے کیوں رہتے ہیں؟"

"نہیں تو۔" میں نے سٹپٹا کے کہا "آپ کو کیسے اندازہ ہوا؟"

"لگتا ہے' آپ کا کوئی دوست نہیں ہے شاید۔"

"نہیں میرے بہت دوست ہیں۔"

"دوست سے مراد وہ دوست جس سے آپ سب کچھ کہہ سکیں۔ آخر مجھے بھی اتنے دن ہوگئے دیکھتے ہوئے' مجھے شبہ ہے کہ شاید ایسا کوئی نہیں ہے۔"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" میں نے گھٹی آواز میں کہا "مجھے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔"

"ہوسکتا ہے۔" وہ شائستگی سے بولی اور اچانک سسکاری بھری۔ کشتی بری طرح اچھلنے لگی۔ کوئی بڑی کشتی قریب سے گزری تھی اسی لیے لہریں متلاطم ہوگئیں۔ رما بھی لڑھک گئی۔ مجھے بھی تختہ پکڑ کے اپنا توازن قائم رکھنا پڑا۔ اسی اثنا میں کسی تیز لہر کے چھینٹے اندر تک آگئے اور ہم دونوں کو بھگو گئے۔ دوسری کشتی دور چلی گئی تو ہماری کشتی کی رفتار معمول پر آئی "آپ کو کسی پر بھروسا نہیں ہے کیا؟" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

"آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

"اپنے آپ پر اعتماد کی کمی سے بھی ایسا ہوتا ہے۔"

"ممکن ہے' ایسا ہی ہو۔" میں نے اضطراب سے کہا "لیکن آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟"

"بہت کچھ۔" وہ ٹھنڈی سانس بھر کے بولی "کہنا بھی اور سننا بھی۔ میں جانتی ہوں' یہ آپ کے لیے بہت مشکل ہے کیونکہ آپ عمداً ایسا نہیں کرتے لیکن شاید آپ کو اندازہ نہیں کہ اس طرح کیسی کیسی گانٹھیں پڑجاتی ہیں۔ آدمی دوسروں سے تو کیا' خود سے بھی دور ہوجاتا ہے۔ آپ کے دلدار' جاں نثار کم نہیں ہوں گے لیکن ان میں سے کوئی بھی شاید آپ کو نہیں جانتا۔ کوئی دوست ہوتا تو آپ میں اتنا غبار نہ ہوتا۔ دوست صرف غم گساری ہی نہیں کرتا' آپ کو اچھے مشورے بھی دیتا ہے' بعض اوقات دوسرے زیادہ بہتر مشورے دے سکتے ہیں۔"

میں گنگ بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔

"میری کوئی بات گراں گزرے تو مجھے معاف کردیجئے۔"

"نہیں نہیں۔" میں نے منتشر لہجے میں کہا "مگر آپ کو' آپ کو اچانک یہ خیال کیسے آیا؟"

"اچانک نہیں' بہت دن سے اور شاید پہلے دن سے جب آپ کیلی کے ساتھ گھر آئے تھے۔ یہ ایک روایتی سا اظہار ہے مگر ایسا ہوتا تو ہے۔ انسانوں کے مابین یہ واقعہ بار بار پیش آتا ہے کہ کسی اجنبی سے مل کے آپ کو یہ گمان ہو' کوئی بچھڑا ہوا مل گیا ہے۔ اس احساس کی منطقی وجہ موجود ہے۔ وہ اجنبی آپ کے ذہن میں بنی کسی تصویر کے مطابق ہو' آپ کو اس کی موہوم سی تلاش ہو' اور وہ اچانک آپ کو کہیں نظر آجائے' وہی یا اس سے ملتا جلتا' ہوتا ہے نا ایسا؟"

"جی' جی ہاں۔"

"یہ بھی ممکن ہے کہ تصوروخیال میں بنی تصویر سے بڑھ کے کوئی مثال سامنے آجائے لیکن المیہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنے خیال' اپنے خواب رکھتا ہے۔ دو آدمیوں کے درمیان مطابقت شاذ ہی ہوتی ہے۔ مجھے معلوم کہ مجھے دیکھ کے آپ کے ہاں وہ شوق بیدار نہیں ہوا جو آپ کو دیکھ کر میرے دل میں گونجا تھا۔"

میں نے دھڑکتی آواز میں کہنا چاہا "یہ بات نہیں ہے' آپ سے مل کے میں نے ایک خوش گوار تاثر لیا تھا۔ مجھے خوشی ہوئی تھی کہ میں ایک خوش طبع' فکر اور۔۔۔" حسین کہتے ہوئے میری زبان لکنت کرنے لگی لیکن میں نے کہہ دیا اور

میں نے کہا "یقین کیجئے آپ کو دیکھ کے مجھے بھی کچھ حاصل کرنے کی سرخوشی حاصل ہوئی۔"

"میں جانتی ہوں' آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ زیرلب تبسم میں بولی "لیکن پہلے مجھے کہنے دیجئے اور سمجھ لیجئے کہ میرا کوئی ہے میں صرف آپ کے حوالے سے کہنا چاہتی ہوں' اپنے حوالے سے نہیں۔ بہتر ہوگا کہ میری بات جانے دیں۔ اتنے دنوں میں آپ کو یہ اندازہ تو ہوگیا کہ میرے ہاں اقدار کا اپنا ایک نظام ہے۔ کسی نہ کسی حد تک ہر شخص کے ہاں ہوتا ہے لیکن سماجی دہشت کی وجہ سے وہ اسے خود تک محدود رکھتا ہے۔ میں بھی اس سماجی دباؤ سے بری الذمہ نہیں ہوں کیونکہ میں بھی اسی زنداں کی اسیر ہوں لیکن جیسا کہ قیدی قیدی میں فرق ہوتا ہے۔ میری مثال اس قیدی کی سمجھئے جو کبھی اونچی آواز میں بات کہنے کی جرات کرلیتا ہے۔ چاہے اسے یہ جرات کتنی مہنگی پڑے مگر زنداں زنداں ہے اور قیدی تو قیدی ہے۔ ہم سب قیدی ہیں اور نجات کی ایک ہی صورت ہے کہ خود کو زنداں کے سپرد کردیا جائے' زنداں کے رحم وکرم پر۔ اچھے قیدیوں کی طرح زنداں کے آداب و قواعد پر عمل کیا جائے' کچھ رعایتیں مل جاتی ہیں۔ جانے کب سے یہ رد عمل انسانوں کے درمیان رائج ہے۔ ایک' فرد کا شعور ہے کہ کیا اچھا ہے' کیا برا' کیا ہونا چاہیے' ایک گروہی یا اجتماعی شعور ہے یا ضابطہ حدود کہ کیا لازم ہے۔ دونوں میں ایک کشمکش رہتی ہے اور طاقت ور کی جیت ہوتی ہے۔"

"معًا وہ رک گئی اور چند لمحوں کے تردد آمیز سکوت کے بعد بولی "میں دور چلی گئی' جانے میں کیا کہہ رہی تھی؟"

میں سوچ رہا تھا کہ اسے کہاں سے یاد دلاؤں کہ وہ خود ہی بے تابی سے بولی "ہاں' میں اپنے بارے میں وضاحت کررہی تھی کہ آپ اطمینان رکھیں' میں فرد کے داخلی سچ اور خارجی سچ کے تضاد کا پورا شعور رکھتی ہوں۔ دونوں سچ ہیں کہ دونوں موجود ہیں اور جہاں تک میرا معاملہ ہے' میں فرد کے داخلہ سچ کے سلسلے میں بہت حساس ہوں لیکن ہر زمانے میں انہیں انگلیوں پر گن لیجئے جو محض فرد کو ترجیح دیتے ہیں۔ تقریبًا تمام لوگ اپنی ذات کا سچ گروہی یا اجتماعی سچ پر قربان کردیتے ہیں۔ میرے کہنے کا مقصد ہے کہ آپ کے قریب کوئی ایسا ہے جس سے آپ اپنی ذات کا سچ بول سکتے ہیں۔ میں آپ کے پاس ہوں' ہم کیوں نہ ایک دوسرے سے سچ بولیں اور جتنا سکھ ممکن ہے' اسے سمیٹیں' آپ ایک صاحب دل' صاحب فکر نوجوان ہیں' مجھے بتائیے' یہ گھٹا کیسی ہے جو آپ کے چہرے پر اُمڈی رہتی ہے۔ کون سی کمی ہے جو آپ کو اتنا اجیرن کیے ہوئے ہے؟ کسی نے آپ کو آپ سے چھن رکھا ہے۔ مجھے بتائیے کہ یہ سب کیا ہے' کس لیے ہے؟"

اس کے لہجے کی دل سوزی سے میرا سینہ کٹنے لگا۔ میں نے جھرجھرائی آواز میں کہا کہ کیا بتاؤں کچھ بتانے کو ہو تو بتاؤں بھی۔"

"میں سمجھ سکتی ہوں کہ آدمی کا دکھ ہی کبھی اس کی متاع بن جاتا ہے۔ اس کی انا اس کا سرمایہ پھر آدمی کو گردوپیش کی ترغیبات سے کوئی غرض نہیں رہتی۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ یہ سرمایہ ضائع نہیں ہوگا۔ ہوسکتا ہے' ہم کسی نتیجے پر پہنچ سکیں' کوئی تدبیر نکل آئے۔ سنا ہے' کسی کی شرکت سے بار کچھ کم ہوجاتا ہے۔ میں پوچھتی ہوں' وہ سرمایہ ہی کیا جس کے چھن جانے اور لٹ جانے کا اتنا ڈر ہو۔ کچھ بعید نہیں کہ یہ احوال خود میرے لیے کسی اذیت کا باعث ہو مگر یہ خلش تو مجھے اور بے کل کیے رہے گی کہ میں ایک شخص سے قلبی اور ذہنی رفاقت کے باوجود اس سے کیسی اجنبی ہوں۔"

"خدا کے لیے زیادہ کچھ مت کہئے۔" میں نے کٹی پھٹی آواز میں کہا "مجھ سے دہرایا نہیں جاتا۔ میری آواز ہی میرا ساتھ نہیں دیتی۔"

"اسی لیے تو میں یہ بنتی کررہی ہوں' آپ نے سب کچھ خود تک جو چھپا رکھا ہے۔" وہ عاجزی سے بولی "کسی کو شامل کردیکھئے اور باور کیجئے کہ مجھ میں دوستی کی اعلیٰ صلاحیت موجود ہے۔ میں آپ کی بہترین دوست ہوں۔"

"میں' میں آپ کو دشمن کب سمجھتا ہوں۔"

"مگر دوست بھی کہاں سمجھتے ہیں۔ مجھ سے زیادہ تو کیلی آپ کا دوست ہے۔ آپ اس سے یہ تکلف برتتے۔ اسے تم کہہ کے مخاطب کرتے ہو۔"

"وہ اور بات ہے۔" میں نے کسمساتے ہوئے کہا "میں آپ کو بھی تم کہہ سکتا ہوں لیکن ایک خاتون کو۔۔۔"

"کیا ایک خاتون ایک مرد کی طرح کسی مرد کی دوست نہیں ہوسکتی۔" وہ جھپٹی آواز میں بولی "میرا مطلب ہے' دو مردوں اور دو عورتوں میں جس طرح کی دوستی ہوتی ہے جس طرح کیلی آپ کا دوست ہے' میں کیوں نہیں ہوسکتی؟"

"جی' جی ہاں بالکل۔" میں نے منتشر لہجے میں کہا۔

"مگر ایسا نہیں ہوتا۔ جانے کیوں ایک مرد' ایک عورت دو مردوں اور دو عورتوں کی طرح نہیں ہوپاتے۔ ان دونوں کا باہمی تعلق ہمیشہ ایک مخصوص تناظر میں دیکھا جاتا ہے لیکن ہو ضرور سکتا ہے' نہ ہوسکنے کی کوئی مضبوط دلیل کم سے کم میری سمجھ میں نہیں آتی' ایسا ہونا چاہیے نا؟"

"جی ہاں۔" میں نے مضطربانہ تائید کی۔

"تو میں آپ سے یہی تو کہہ رہی ہوں۔ مجھے آپ اپنا ایسا ہی دوست سمجھئے جیسے کیلی ہے' کیلی کی طرح مجھے آپ کی ضرورت ہے' آپ کو بھی کیلی کی طرح میری ضرورت ہے۔ کیلی کے پاس مجھ سے زیادہ نہیں ہے۔ میرے پاس اس سے زیادہ چھاؤں' اس سے زیادہ ریشم ہے۔" وہ بہت بے چین نظر آرہی تھی کہنے لگی "اچھا ایک بات بتائیں' میں آپ کو کیسی لگتی ہوں؟"

میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن میرے ہونٹ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

"کوئی مشکل بات نہیں ہے' سچ بولنا اتنا دشوار نہیں ہوتا' جتنا سچ سننا۔"

"آپ' آپ یہ کیوں پوچھ رہی ہیں۔"

"میں آئینہ دیکھنا چاہتی ہوں' اصل آئینہ تو دوسروں ہی کے پاس ہوتا ہے' خود کو کتنا نظر آتا ہے۔"

"مگر' مگر اس میں جاننے کی کیا بات ہے؟" میں نے بے ربطی سے کہا "آپ کو نہیں معلوم۔"

"میری خوش گمانی بھی ہوسکتی ہے۔"

"کیسی باتیں کررہی ہیں آپ پھر ہم یہاں' یہاں کیوں۔" میں نے کٹی پھٹی آواز میں کہا "تائید کی کیوں ضرورت محسوس ہوئی آپ کو؟ میرے دل میں آپ کے لیے بہت عزت ہے' آپ ایک نہایت نفیس' ذہین اور دردمند خاتون ہیں اور کیا کہوں۔"

"میں ایک خوب صورت لڑکی نہیں ہوں کیا؟"

"جی' جی ہاں یقینًا۔" میں نے بدحواسی سے کہا۔

"مجھے دیکھ کر آپ کے دل میں نرم لطیف احساسات نہیں ابھرتے۔"

"کیوں نہیں' کیوں نہیں۔"

"گیتا کے گھر اس دن میں نے آپ سے یہی کہنے کی کوشش کی تھی۔ شاید آپ بھول گئے۔"

"نہیں' مجھے یاد ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔"

"یاد ہے تو آپ نے توجہ نہیں کی۔ میں نے کہا تھا کہ بڑی چھاؤں کی آس میں آدمی راستے کی چھوٹی بڑی چھاؤں سے کیوں کنارہ کیے رہے اور میں نے کہا تھا کہ تیسرے یا چوتھے آدمی کی شمولیت کوئی حق تلفی یا بدعہدی نہیں ہے۔ وفا ایک اعلیٰ ترین قدر ہے مگر یہ کوئی معاہدہ نہیں۔ معاہدے صرف تجارتی' سیاسی اور سماجی ہوتے ہیں۔ وفا کوئی معاہدہ نہیں' معاہدہ مشروط ہوتا ہے۔ وفا دونوں جانب سے اثبات کا ایک عمل ہے' یہ پابند نہیں' بے اختیار ہے۔ ایک جانب سے بھی کبھی یہ ممکن ہے؟ لیکن آدمی دریا نہیں جو ایک طرف بہتا ہے' بہتا چلا جاتا ہے۔ آدمی پر مختلف اوقات میں مختلف کیفیات طاری ہوتی ہیں اور چوں کہ ایک فطری مظہر ہے' اس لیے اپنی بدلتی ہوئی کیفیتوں کے دوران میں آدمی سے وفا کی پاس داری مشکل ہوجاتی ہوگی اور یہ دورانیہ کشمکش میں گزرتا ہوگا۔ میرا خیال ہے' وفا میں جہاں سے جبر شروع ہوا' وہ وضع ہوگئی۔ زندگی بھر آدمی وضع نبھائے جاتا ہے اور اپنے جسم وجاں میں ابلتی اُمڈتی نوبہ نو تحریکیں تابع کیے رہتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ پاس وضع سے ہونے والی سرخوشی بیش ہوتی ہے یا خود پر عائد کیے جانے والا جبر زیادہ جاں گسل ہوتا ہے۔ یقینًا پاس وضع میں کوئی اطمینان نصیب ہوتا ہوگا کہ آدمی اصرار کیے جاتا ہے یا یہ ضد کی کوئی حالت ہے۔ ضد بھی استقامت دیتی ہے۔ میری رائے میں وضع ایک اچھی چیز ہے۔ آدمی پر آدمی کے اعتبار کی علامت لیکن یہ بھی تو اپنی جگہ طے ہے کہ آدمی پر مختلف موسم طاری ہوتے رہتے ہیں۔ وضع کا پاس احساسات وجذبات کی قیمت پر نہیں ہونا چاہیے۔ تشنہ لبی اور تلاطم کے کسی موسم میں آدمی کو دریا کا رخ کرنے یا ساحل کی جستجو کرنے کی رعایت ملنی چاہیے۔ مخالف سمت میں اپنی ذات کے سفر سے تو آدمی میں دراڑیں پڑجاتی ہوں گی۔" معًا وہ کچھ گھبرا سی گئی اور مسکرا کے بولی "آپ سوچتے ہوں گے کہ میں کتنی دور دور چلی جاتی ہوں۔ مجھے صرف اتنا کہنا تھا کہ زندگی اس قدر نہیں ہے' جتنی آپ نے طے کر رکھی ہے اور دنیا ایک آدمی سے دوسرے آدمی تک ہی نہیں ہوتی۔"

میں سمجھتا ہوں' آپ کو کیا بتاؤں کہ میں خود پر کوئی جبر نہیں کرتا۔" میں نے بکھری ہوئی آواز میں کہا "جو کچھ بھی ہے' وہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔"

"ہوسکتا ہے' ضرور یہی ہوگا لیکن کیا یہ ستم نہیں کہ آپ کے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔ آپ کہیں گے کہ آپ کو کسی ستم یا جبر کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ نہیں ہوتا ہوگا۔ ترک اختیار بھی بعض حوصلہ مندوں کا شیوہ بن جاتا ہے۔ امید ٹوٹ جائے تو بھی لوگ اپنی وضع نہیں بدلتے اور جہاں تک میرا اندازہ ہے' آپ کی امید قائم ہے اس لیے آپ کی آنکھوں میں آگ سی جلنے لگتی ہے جن کی امید ختم ہوجائے' ان کا عالم دوسرا ہوتا ہوگا۔ میں نے وہ لوگ دیکھے نہیں' کہانیوں میں پڑھے ہیں۔ سنا ہے' ان میں کئی اپنے آپ سے دست بردار ہوجاتے ہیں۔ اختیار ترک دنیا نہیں ہے

لیکن پھر اور کیا ہے؟ میں سمجھتی ہوں' یہ آخری درجے کی شکست خوردگی ہے۔ بہرحال میں تو اس شخص کی بات کررہی ہوں جس کی امید قائم ہے اور جس کے خوابوں کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا ہے جس کی آنکھیں پوری طرح کھلی ہیں اور مناظر کے ساتوں رنگ پوری طرح اخذ کرتی ہیں۔ وہ شخص جو چوراہے پر ایک سمت نظر ٹکائے کھڑا ہے۔ اس کی نظر تو ایک سمت ہے مگر راستے اسے اور بھی نظر آرہے ہیں۔ وہ ان راستوں کا رخ نہیں کرتا مگر راستے اس کی آنکھوں سے مسدود نہیں ہوئے ہیں۔ مجھے تسلیم ہے کہ آپ کو اپنی یک سوئی اور ارتکاز تلاش اور انتظار سے یک گونہ آسودگی ملتی ہے اور یہ محض وضع و مروت نہیں ہے۔ اسے وضع و مروت سے موسوم کرکے ارزاں نہیں کیا جاسکتا۔ یہ مسلسل سوزش کسی گہری ذہنی اور قلبی واردات کے بغیر ممکن نہیں۔ اس کا تعلق جسم سے اتنا نہیں جتنا ماورائے جسم سے یعنی روح سے ہے۔ کوئی شخص جو روح میں اتر گیا ہے' ایک شخص جو ریشہ و رگ میں سما گیا ہے' یہ کوئی فسانہ نہیں' ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے لیکن آپ ایک حساس اور ذی ہوش انسان ہیں' ہر اعتبار سے ایک مکمل آدمی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کبھی کسی لمحے آپ کو اپنے گردوپیش اور اپنی طرف دیکھنے کی فرصت نہ ملتی ہو۔ آپ آئینہ نہ دیکھتے ہوں۔ میں انہی سرکش و سرگرداں لمحوں کی طرف اشارہ کررہی ہوں کہ آخر آپ ان کا کرب کیوں سہتے ہیں۔ ایسے میں ٹھنڈک کا کوئی گوشہ میسر آتا ہے تو اسے غنیمت جانیئے اور اگر' اگر یہ سب کچھ میرا گمان ہے تو پھر یہ گرد کیسی ہے؟" وہ الجھی ہوئی آواز میں بولی "چہرے پہ بادل کیوں چھائے ہوئے ہیں' سمجھ رہے ہیں آپ؟"

"ہاں' ہاں۔" میں نے بے قراری سے کہا۔

وہ رک گئی اور چند لمحوں کے سکوت کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی "سنئے! میں جو اتنا کچھ کہہ رہی ہوں' اسے کوئی شکوہ یا اعتراض مت جانئے۔ آپ مجھے ایک ہوش مند لڑکی سمجھتے ہیں تو میرا بیان توجہ اور اعتنا کا سزاوار ہے۔ میری غرض کیا ہے؟ میری غرض و غایت صرف آپ ہیں۔ یہ میرے لیے اتنا نہیں جتنا آپ کے لیے ہے۔ میرے لیے صرف اتنا ہے کہ میں آپ کو بطور خاص خوش دیکھنے کی آرزو مند ہوں۔ میں آپ سے کیا کہوں اور کس قدر کہوں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں آپ کے کسی کام آؤں۔ یہ خدا ترسی نہیں۔ نہ آپ نے کوئی سوال کیا ہے۔ نہ مجھے کسی چارہ گری اور جادوگری کا دعوا ہے۔ ہر ایک کا جادو ہر ایک کے لیے کارگر نہیں ہوتا اور اپنی اپنی نسبت کی بات ہے۔ میں بھی ایسی کوئی نسبت اپنی رگوں میں محسوس کرتی ہوں کہ آپ میرے لیے اس تصویر کے مانند ہیں جو میں نہ بنا سکی لیکن آپ سے میری کوئی نسبت سر بہ سر میرا معاملہ ہے اور آپ کے اثبات سے مشروط نہیں۔ میرے نزدیک دوستی میں تجارت کی طرح لین دین نہیں ہوتا۔ یہ تو حساب پیمانے سے سوا کوئی چیز ہے' اور پسند اور شوق کی بات ہے۔ میں آپ کو کیا بتاؤں' میں نے خود سے پوچھا تھا کہ میں کون ہوں' میرا کیا جواز ہے۔ میں اس قدر کیوں متوحش ہوں۔ مجھے اطمینان ہوگیا تھا کہ میرا جواز میرا احساس ہے۔ میرا جواز وہ تاثر ہے جو ایک آدمی دوسرے آدمی سے قبول کرتا ہے اور یہ کوئی وحشت نہیں' یہ تو ایک بے کنار جذبہ ہے۔ یوں کہئے کہ ایک شاہکار تصویر کو گردوغبار کی جگہ کے بدلے محفوظ دیوار پر آویزاں دیکھنے کی تمنا نے خود کو باور کرانے کی کوشش کی کہ کہیں یہ جسارت مداخلت بے جا تو نہیں' کنکر پھینکنے کے مترادف' میری انا کی کوئی سازش میرے جسم و جاں کی کوئی شورش' ایک طالع آزما امیر کا شوق معرکہ آرائی' شغل کوچہ گردی۔ یہ کیا ہے؟ یہ کوئی نفسی گرہ ہے؟ مجھ میں کوئی سودا سمایا ہے؟ میں نے اچھی طرح مطمئن ہونے کے بعد ہی سلسلۂ جنبانی کی ہے۔ میں نے خود کو یقین دلایا کہ میرا ارادہ نہایت متوازن ہے۔ میرا مقصد ایک عزیز ترین اور نفیس ترین دوست کی دل جوئی اور دلداری ہے اور کوئی نقش رگ و ریشہ میں پیوست ہے تو اندیشہ زیاں فضول ہے۔ اس میں کسی کا حرج نہیں۔ نہ میرا نہ آپ کا۔ اس میں دونوں کا بھلا ہے کہ دو آدمی اس جنگل میں اپنے راستے ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور جب تک راستے عیاں نہیں ہوجاتے' ایک دوسرے کا سہارا بنے ہوئے ہیں۔ میں نے اتنی صراحتیں یوں کی ہیں کہ کوئی ابہام نہ رہے۔ آپ کو اعتبار آجائے کہ آپ کا کوئی ضرر نہیں ہے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" میں نے ہیجانی آواز میں کہا۔

"اعتبار کا لفظ غالباً بے محل ہے مگر پھر مجھے اور کیا کہنا چاہیے۔" وہ تیورا کے بولی "بہرحال اسے ایک تجویز سمجھئے۔ معتبر دوست کی طرف سے ایک تجویز۔ ممکن ہے' میں نے کچھ زیادہ ہی اخذ کرلیا ہو اور یہ سب کچھ میری فہم سے متجاوز ہو۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ پھر یہ کیا ہے؟ آپ مجھے شامل کریں گے تو میرے لیے سرخوشی کی بات ہوگی۔ آپ کے لیے اسے دہرانا مشکل ہے تو میں اصرار نہیں کروں گی پھر اس محبت کو تبادلۂ خیال سے زیادہ وقعت نہ دیجئے۔ میں آپ کے سامنے موجود ہوں اور کسی وقت بھی آپ سے دور نہیں ہوں اور ہمارے پاس مال و دولت کی طرح وقت کی بھی قلت نہیں ہے۔ مجھے اس کے سوا کچھ اور نہیں کہنا ہے کہ آپ کی دانست میں میرے پاس کوئی نرمی' حلاوت و گداز ہے تو آپ کو کیا عار ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرے پاس آپ کے لیے بہت کچھ ہے۔"

"جی' جی ہاں۔" میری آواز لڑکھڑا رہی تھی "مجھے کوئی' مجھے کوئی عار ہوتا۔ یہ تو میرے لیے....." مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔ میں نے بہ مشکل کہا "کون کس کے لیے اتنا سوچتا ہے۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ آپ میرے لیے اس قدر....."

"نہ' نہ خدا کے لیے کسی ممنونیت کا اظہار مت کیجئے۔ یہ میرے لیے کسی صدمے سے کم نہیں ہوگا۔" وہ احتجاجی لہجے میں بولی "کیا میری گزارش کا اتنا ہی خلاصہ ہے۔"

"پھر' پھر میں آپ سے کیا کہوں۔" میں نے گھٹی ہوئی از میں کہا۔

"ہوسکے تو مجھے شریک کیجئے' مجھے کچھ بتایئے۔"

"کیا بتاؤں' آپ نے سبھی کچھ تو خود کہہ دیا ہے۔"

"کوئی کھو گیا ہے کیا؟" وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ لمحوں تک مجھ پر کوئی سناٹا ری رہا۔ جیسے میرے جسم و جاں میں جان ہی نہ رہی ہو۔ میں ت کی طرح اسے گھورتا رہا۔

یکایک اس نے میرے ہاتھ تھام لیے اور اضطراری راز میں انہیں دباتے ہوئے بولی "کون تھا ایسا؟ کس نے' ں کس پہ ستم کیا۔"

میں نے اسے کچھ بتانا چاہا لیکن ایسا لگا جیسے دوسرے ے مجھ پر کوئی بجلی گر جائے گی اور معاً میرے جی میں آیا کہ ں کشتی سے کود جاؤں۔ میں سمندر کی گہرائیوں میں خود کو ق کردوں۔ اس نے میرے ہاتھ زور سے جکڑ رکھے تھے۔ ن کی تپش سے میرا سارا جسم ہی پگھلنے لگا تھا۔ میں نے اس ے اپنی آنکھیں چھپانی چاہیں' اپنے آپ کو بھی چھپانا چاہا ین مجھے اپنا یارا ہی نہیں رہا تھا۔ جانے مجھے کیا ہوا' میری نکھوں سے بے تحاشا آنسو بہنے لگے۔

"اوہ' نہیں نہیں۔" وہ ہذیانی انداز میں بولی اور اس نے میرے ہاتھ اپنی آنکھوں سے مس کرلیے۔ وہ مضطربانہ نہیں چومنے لگی "کچھ مت کہئے' کچھ بھی نہیں۔" وہ بے راری سے بولی اور مجھے تسلی و تشفی دینے لگی۔ اس نے رومال سے میرے آنسو خشک کرنے کی کوشش کی لیکن میری آنکھوں سے تو ایک سیل جاری تھا۔ جتنا وہ میری پرسش کرتی' میرا سینہ اور گرجنے اور امڈنے لگتا "ٹھیک ہے پھر.....! جانے کب کا سمندر ہے' مت روکے اسے۔" اس نے تھکتی آواز میں کہا اور میرا سر اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

مجھے چکر سا آنے لگا۔ میں نے اپنے آپ کو مجتمع کرنے کی کوشش کی لیکن میرے پاس تو کچھ بھی نہیں رہا تھا' میرے ہاتھ پیر' میرا جثہ و قامت' سارا بل زور دیکھنے کا تھا' وہ تو کوئی سراب تھا۔ میرے جسم پر تو جا بہ جا آبلے پڑے ہوئے تھے۔ نس نس میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ میری حالت اس خاک بسر دشت نورد کی تھی' بے شمار سورج گزرنے کے بعد جیسے کوئی دیوار دکھائی دے اور وہ اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھے۔ چھاؤں میں آکے اس کے دست و بازو اینٹھنے' اکڑنے لگے ہوں' جیسے سارا وجود ریزہ ریزہ ہوجائے۔ رما کے ہاتھوں میں ایسی نرمی اور لپک تھی' ایسی شفقت اور تپاک تھا کہ آدمی کو ڈھیر کردے' آدمی کا دم نکل جائے۔ وہ میرے سارے آنسو' سارا درد جیسے اپنے اندر جذب کرنے کے لیے بے کل تھی۔ میں بچوں کی طرح اس کی بانہوں میں بلکتا رہا۔ مجھے کچھ خبر نہیں کہ اس نے کیا کہا' میں نے کیا سنا اور خود میں کیا ہذیان بکتا رہا' جانے کتنی دیر مجھ پر وحشت کا یہ عالم' یہ خفقان طاری رہا۔ مجھے کچھ نہیں معلوم کہ کب اس نے میرا سر اپنے شانے سے ٹکا لیا تھا' تلاطم کے یہ لمحے' یہ سیلاب بلا گزرا تو میں کسی لاچار کے مانند اس کے حصار میں تھا اور جیسے جیسے میری بینائی واپس آتی رہی' میرے رگ و پے میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ وہ مجھے اپنے پروں میں چھپائے ہوئے تھی' ریشم کے پروں میں۔ میں نے نکلنا چاہا تو اس نے اپنی گرفت اور مضبوط کرلی۔ میں نے کوئی مزاحمت نہیں کی کہ اس شکستہ حالی اور تن دریدگی میں اس کا حلقہ میرے لیے گوشۂ راحت بنا ہوا تھا۔ اس کے لمس' اس کے زیر و زبر انفاس میں بہت ٹھنڈک تھی لیکن یہ چند لمحوں کا خواب تھا کہ مجھ پر میرے حواس غالب آگئے۔

میری مضطرب نظریں اس کے چہرے پر منڈلانے لگیں۔ اس کے لبوں کے گوشے پھڑک رہے تھے اور اس کی آنکھیں کچھ زیادہ بڑی' گہری اور چمکیلی لگ رہی تھیں۔ ڈوبی ڈوبی آنکھیں' کسی تکدر یا تردد کے بجائے اس کے چہرے پر سکون چھایا ہوا تھا' کھلا کھلا چہرہ مجھے ندامت نے آگھیرا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا تو اس نے میرے ہونٹوں پر انگلیاں رکھ دیں اور سرسراتی آواز میں بولی "میں آپ کی بہترین دوست

ہوں۔"

بے اختیار میرا جی چاہا کہ اسے گلے لگالوں' اسے خوب پیار کروں۔ میرے دل میں اس کے لیے بے پناہ پیار اُمڈا لیکن میں گم صم بیٹھا رہا۔

"میرے لیے کچھ نیا نہیں تھا" چند لمحوں کے سکوت کے بعد وہ جھلملاتی سی آواز میں بولی "مجھے اس کا اندازہ تھا اسی لیے تو میں آپ سے کہہ رہی تھی مگر آپ رک کیوں گئے؟"

"مجھے جانے کیا؟"

"آپ نے مجھے مان دیا" وہ میری بات کاٹ کے تیزی سے بولی۔

میں نے سر جھکالیا۔

اس نے میری کمر سے تکیہ ٹکادیا اور مجھے آرام سے بیٹھ جانے کی ہدایت کی "مجھے کسی ردوقدح کا یارا نہیں تھا۔ وہ دیر تک خاموش رہی پھر پلکیں پٹ پٹاتے ہوئے بولی "کیسے ہیں آپ؟"

"میں' میں ٹھیک ہوں" میں نے خفت سے کہا۔

وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے خوابیدہ لہجے میں بولی "اچھے دوست بھی ہم زاد کی طرح ہوتے ہیں' امانت دار' پاسبان اور......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی پھر چونک کے بولی "سچ بتایئے' کیسا لگ رہا ہے؟"

"بہت' بہت اچھا" میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"پھر اسی طرح رہیے' کوئی مدافعت مت کیجیے۔ جب تک میرے ساتھ ہیں' اپنے آپ کو میری تحویل میں رہنے دیجیے۔" وہ شگفتگی سے بولی "ادھار کی طرح۔"

"میں آپ ہی کے پاس ہوں" میں نے بہ عجلت کہا۔

اس کے بالوں کی گرہ کھل گئی تھی اور ہوا سے بال لہرا رہے تھے۔ وہ سر جھٹک کے انہیں باربار چہرے سے ہٹاتی تھی۔ پھر اس نے گرہ باندھ لی اور سکون کا سانس لیا "بادل آپ کے برسے ہیں اور جی میرا ہلکان ہوا ہے" وہ لہراتی ہوئی آواز میں بولی۔

کشتی دھیمی دھیمی رفتار سے چل رہی تھی۔ ہم نہ جانے کتنی دور آگئے تھے۔ تاہم ابھی تک دور ساحل کی روشنیاں ٹمٹماتی نظر آرہی تھیں۔ رما نے مینچوں کے درمیان لٹکی ہوئی کوئی ڈوری کھینچی تھی کہ دوسری طرف سے ایک ملاح نمودار ہوا۔ رما نے اسے کوئی اشارہ کیا تو وہ سر جھکائے لوٹ گیا اور پلک جھپکتے میں غائب ہوگیا۔ رما میرے اور قریب آگئی۔ اس کی مسکراتی نظریں مجھ پر بکھری ہوئی تھیں۔ اس نے ہاتھ بڑھا کے میرے بال درست کرنے چاہے تو میں اچھل سا گیا۔

دوسرے لمحے مجھے اپنے غیر ارادی رویے پر پشیمانی ہوئی۔ رما کو میرے اضطرار کا احساس نہیں ہوا یا اس نے دانستہ درگزر کردیا۔ وہ میرے الجھے ہوئے بال درست کرتی رہی۔ میری رگوں میں خون جمنے لگا تھا۔ میں دیکھتا رہا' کسی تماشائی کی طرح۔ اس نے میرا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ میرے ہاتھ پاؤں پھر سن ہونے لگے۔ یکبارگی میں نے اٹھنا چاہا لیکن میں نے ارادہ ترک کردیا۔ وہ میرے بالوں میں آہستہ آہستہ انگلیاں پھیر رہی تھی اور آہستہ آہستہ میرے سارے جسم میں نرم ولطیف لہریں اٹھنے لگی تھیں' یہ سرور آگیں گداز میرے سان وگمان میں بھی نہ تھا۔ وہ سب کچھ میرے لیے بالکل نیا نیا سا تھا۔ جیسے میں بے وزن ہوگیا ہوں' میرا وجود پھیلتا جارہا ہو اور ہوائیں' مجھے اڑائے لے جارہی ہوں۔

چند ثانیوں کے لیے جو ایک شور سا میرے سینے میں برپا ہوا تھا اور اس ہاؤ ہو میں میرے اختیار کی ڈوری مجھ سے چھن گئی تھی' میں نے کسی طور اس پر دست رس حاصل کرلی۔ میں نے خود کو ٹھوکے دیے کہ میں تو ایک مہربان شخص کی پناہ میں ہوں۔ آدی کے لیے آدی کا اس سے اعلیٰ وظیفہ کیا ہوسکتا ہے۔ اس کا مقصود میری دل بستگی ودلداری ہے اور کیا میں واقعی کسی لطف وانبساط سے ہم کنار نہیں؟ وہ راحت مجھ تک منتقل نہیں ہورہی جس کے لیے وہ کوشاں ہے؟ تو مجھے کیا عار ہے؟ وہ ایک نرم ونازک لڑکی ہے' ایک حسین' ماہ جبیں لڑکی۔ وہ کسی گوشہ گلستاں سے کم نہیں۔ اس کے قرب کی تو لوگ تمنا کرتے ہوں گے۔ کون سے وسوسے اور اندیشے میرے درپے ہیں؟ مجھے اس لطف وعنایت کا کوئی مول چکانا ہے یا یہ میری عقل وفہم سے بعید کوئی طور ہے؟ یہ کوئی احسان ہے جس کی گراں باری کا اندیشہ مجھے ستائے ہوئے ہے یا یہ سب کچھ کسی ہم درد طبیب کی طرح چارہ گری کا ایک قرینہ ہے' مگر وہ تو ایک آئینہ مثال لڑکی ہے۔ اس کی رفاقت ونفاست میں کوئی کلام نہیں۔ تکلف وتصنع اور چیز ہے جو اس میں دور دور تک بھی نہیں۔ ہوتا تو ڈھکا چھپا نہیں رہتا۔ اس کے اظہار میں بے ساختگی ہے اور سوزش ہے۔ اس کے رخساروں پر تو شفق سی چھا جاتی ہے۔ اور یہ ساری نوازش میری دہائی اور دادخواہی پر کب ہے۔ اسی کے بہ قول میں نے کوئی دست سوال کب دراز کیا ہے۔ وہ خود بھی تو یہی کچھ کہہ رہی تھی۔

میں نے اپنا جسم کشتی کے گدے پر بکھیر دیا تھا۔ اس دمکتا ہوا چہرہ مجھ پر جھکا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں محبت ومسرت سے لبریز تھیں۔ اس کی نظریں کبھی اتنی تیز ہوجاتیں کہ مجھ سے نگاہ نہیں ملائی جاتی' میں آنکھیں موندلیتا' کبھی وہ خود ہی میری پلکیں بند کردیتی۔ نشہ کچھ یہی ہوتا ہوگا' نیند کے مانند' نیند آبھی رہی ہے اور جسم جاگ بھی رہا ہے۔ جسم جاگ بھی رہا ہے اور کوئی بوجھ بھی نہیں۔ بہت دیر بعد اس نے زبان کھولی اور مہکتی آواز میں بولی "وہ کتنا خوش قسمت ہے جس کے لیے کوئی اتنی آگ لیے پھرتا ہے؟"

میرے جی میں آیا کہ کہوں' اور وہ کتنا بدنصیب ہے جو اس کے باوجود نامراد ہو' میں خاموش ہورہا۔

وہ سرگوشی کے انداز میں بولی "میں نے سب احترام سے دیکھا اور سنا ہے۔"

میں نے کچھ نہیں کہا۔

پھر کہنے لگی "اب کے کسی طرف جانا ہو تو مجھے ساتھ لے چلیں' دونوں مل کے اسے دیکھیں گے۔"

میں گہری سانس بھر کے رہ گیا۔

آسمان پر بدلیاں چھاگئی تھیں اور ہر سو اندھیرا مسلط ہوگیا تھا۔ اندھیرا بھی کبھی کیسا سہانا لگتا ہے۔ جانے کتنی رات ہوگئی تھی۔ مجھے اچانک کیلاش کا خیال آیا' وہ کلب میں ہمیں ڈھونڈ رہا ہوگا' ممکن ہے' گھر لوٹ گیا ہو مگر میں نے رما کو ٹوکا نہیں۔ کشتی ہچکولے کھاتی ہوئی ہولے ہولے چلتی رہی۔

گھنٹی بجنے پر میں چونک پڑا۔ رما نے بھی جھرجھری سی لی۔ میں نے نظریں گھما کے دیکھا تو گھاٹ قریب تھا اور کلب کی روشنیاں سامنے نظر آرہی تھیں۔ ملاحوں نے ہمیں مطلع کرنے کے لیے گھنٹی بجائی۔ رما نے آہستگی سے میرے شانے پر دستک دی۔ میں اس کا مقصد سمجھ گیا تھا لیکن اٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ کچھ دیر میں یہ سارا منظر بکھر جانے کو تھا۔ میں نے چند لمحوں کو بچی کھچی راحت سمیٹنے کے لیے آنکھیں بند کرلیں۔ کشتی کی رفتار اور سست ہوگئی۔ میں اٹھنے کا ارادہ کررہا تھا کہ رما نے میری پیشانی کو بوسہ دیا اور میری پلکوں کو اور مجھ سے اس وقت تک نہیں اٹھا گیا جب تک کشتی گھاٹ کے زینے سے نہ لگ گئی۔

کلب کے ٹاور میں ڈیڑھ بج رہا تھا۔ کلب ابھی تک جاگ رہا تھا۔ سوئمنگ پول اور اس کے گردونواح میں پھیلے ہوئے وسیع سبزہ زاروں کی طرف سناٹا تھا۔ اکا دکا لوگ ہی نظر آئے۔ رما میرے پہلو سے لگی عمارت کی طرف بڑھتی رہی۔ ہماری رفتار نسبتاً تیز تھی۔ درمیان میں ایک بڑا فاصلہ تھا۔

اس نے مضبوطی سے میرا ہاتھ تھام رکھا تھا اور یوں اس کے ساتھ چلتے ہوئے مجھے عجیب سا لگ رہا تھا۔ جیسے میرا قد بڑھ گیا ہے' جیسے میری طاقت دوچند ہوگئی ہے۔ سوئمنگ پول کے قریب ہم نے سبزہ زار کی پگڈنڈی عبور کی تھی کہ نہ جانے کس طرف سے بھاری جسم اور اوسط قد کا ایک ادھیڑ عمر شخص ہمارے سامنے آکے کھڑا ہوگیا۔ وہ سوٹ بوٹ میں ملبوس تھا' چہرے سے امارت ٹپک رہی تھی۔ حلیہ بگڑا ہوا تھا۔ ٹائی کی گرہ کھلی ہوئی' بال بکھرے ہوئے' پٹ پٹاتی پلکوں سے پہلے اس نے رما کو گھورا پھر اس کی نظریں مجھ پر مرکوز ہوگئیں۔ وہ ہمیں پہچاننے کی کوشش کررہا تھا اور اچانک اس نے رما کی کلائی پکڑلی "کدھر پھر رہی ہو تم' اور یہ کون ہے؟" اس نے انگریزی میں کہا۔ اس کی تلخ وترش آواز جیسے ناک سے نکل رہی تھی۔

مجھے حیرت ہوئی' میں نے پریشان ہوکر رما کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھلی ہوئی تھی "یہ میرے دوست ہیں مسٹر بابر!" رما نے شائستگی سے کہا اور مجھ سے کسی قدر اور قریب ہوکے بولی "ہم سمندر کی طرف نکل گئے تھے۔"

"ہا! سمندر کی طرف" اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور وہ گرجتے دہاڑتے ہوئے بولا "مجھ کو بتائے بغیر!"

"تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں تھی" رما نے شوخی سے کہا "تم ابھی بار میں جاکے ایک پیگ اور پیو' میری طرف سے میرا جام صحت' اتنی دیر میں ان کے ساتھ ہوں۔"

مجھے اندازہ ہوا کہ یہ شخص تو سر بہ سر ڈوبا ہوا ہے' اس سے تو سیدھی طرح کھڑا بھی نہیں ہوا جارہا' یکایک اس پر وحشت طاری ہوئی' مجھے یہی ڈر تھا' اس نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔ میرے جی میں آئی کہ اس کی گردن دبوچ لوں لیکن وہ تو کسی قابل ہی نہیں تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے گریبان سے ہٹانے کے لیے ایک ذرا اس کی کلائی پر پنجہ ڈالا تھا کہ وہ پیر پٹخنے اور فیل مچانے لگا۔ میں نے فوراً چھوڑ دیا۔ اس سے کچھ بعید نہیں تھا' ممکن تھا کہ وہ رما سے بھی دست درازی کرے اور ادھر ادھر سبزہ زاروں میں لوٹتے ہوئے لوگ ہماری طرف متوجہ ہوجائیں۔ اچھا ہوا کہ رما نے اس کی غلط فہمی دور کردی۔

اسے یقین نہیں آیا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں "پھر وہ کدھر ہے؟ میری بیوی کہاں ہے؟ آپ لوگوں نے اس کو دیکھا ہے؟" وہ احمقوں کی طرح پوچھنے لگا۔

"وہ ادھر پول میں نہارہی ہے" رما نے اسے بتایا۔ وہ کچھ

سوچے سمجھے بغیر لڑکھڑاتے قدموں سے سوئمنگ پول کی طرف دوڑ پڑا۔ رما بالکل بچی بن گئی' زور زور سے تالی بجانے اور کھل کھلانے لگی۔

"یقیناً وہ بے چارہ چھلانگ لگائے بغیر باز نہیں آئے گا" میں نے کہا۔

"نشہ تو اتر جائے گا۔"

"اور اگر اسے تیرنا نہ آتا ہو تو؟"

"کلب میں تیراکی جاننا پہلی شرط ہے۔"

"مگر وہ اپنے آپے میں کہاں ہے؟"

"زندگی ہاتھ سے جانے لگی تو اچھی طرح ہوش میں آجائے گا" میں سوئمنگ پول کی طرف جاکے اسے دیکھنا چاہتا تھا لیکن رما بے نیازانہ آگے چل پڑی۔ اندر کلب کی عمارت میں لوگوں کی بڑی تعداد موجود تھی' عورتیں اور مرد۔ رما ہال کی طرز کے ایک کمرے میں داخل ہوئی۔ وہاں بہت سرگرمی تھی' اندر روشنی بھی تیز تھی اور رولے کے گرد بھیڑ جمع تھی۔ جوئے کا پہیا گھوم رہا تھا اور لوگوں کی قسمت بھی گھوم رہی تھی۔ ہم پر کسی کی نظر نہیں پڑی کیونکہ سبھی لکشمی کی جستجو میں تھے۔ یہ حقیقت جاننے کے باوجود ہر ایک اس کی آرزو میں تھا کہ لکشمی اپنے سارے آرزومندوں سے یکساں سلوک نہیں کرتی۔ سگار اور سگریٹوں کے دھوئیں سے کمرے میں کہر سی پھیلی ہوئی تھی۔ رما نے اشارہ کیا کہ مجھے شوق ہو تو میں بھی کچھ داؤ پر لگاؤں۔ میں نے کہا' مجھے جوئے سے کبھی رغبت نہیں رہی۔ میں نے اسے ایک مقولہ سنایا کہ جواری آخر ایک دن خود کو بھی ہار دیتا ہے۔ "وہ کہانی تو پڑھی ہوگی" میں نے کہا "جب ایک شخص کے پاس ہارنے کے لیے کچھ نہ رہا تو اس نے اپنی بیوی کو داؤ پر لگادیا اور اسے بھی ہار گیا۔"

کہنے لگی "میں نے بھی یہ کہانی پڑھی ہے۔ لیکن کبھی کبھی منہ کا ذائقہ بدلنے میں کوئی حرج نہیں۔"

میں نے کہا "اس کی خواہش ہو تو وہ ضرور کچھ داؤ پر لگائے لیکن رما کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ تو میری خاطر کہہ رہی تھی' کیلاش وہاں نہیں تھا۔ ہم کچھ دیر ٹھہر کے دوسرے دروازے سے نکل گئے۔ رما مجھے ایک اور ہال میں لے آئی۔ یہاں کا منظر ہی اور تھا۔ دھیمے دھیمے سُر ہال میں گونج رہے تھے اور رنگ برنگی' ہلکی ہلکی روشنیوں سے لگتا تھا جیسے قوس قزح کے رنگ گڈمڈ ہوگئے ہوں اور جیسے رنگ بھی وسطی فرش پر ایک دوسرے میں گم جوڑوں کے ساتھ ناچ رہے ہوں۔ اطراف میں لگی ہوئی بیش تر میزیں بھری پڑی تھیں۔ ہم نے کیلاش کو کئی جگہ تلاش کیا' کافی ہاؤس میں' بلیرڈ روم میں'

ڈائننگ ہال بند ہوچکا تھا۔ کیلاش ہمیں لابی میں بیٹھا نظر آیا۔ وہ شطرنج کھیل رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کے ایک دم کھڑا ہوگیا او اس کے چہرے پر کئی رنگ آئے لیکن اس سے پہلے کہ و برہمی کا اظہار کرتا' رما نے اسے اور تنگ کیا "آہ کیلی! ہ سمندر میں دور تک نکل گئے تھے۔" وہ دیدے نچاتے ہو۔ بولی۔

"معلوم ہے' میں کب کا اسپتال سے آگیا تھا؟" کیلاش نے کاٹ کھانے والے انداز میں کہا۔

"تم نے گھنٹے دو گھنٹے کے لیے کہا تھا" رما سادگی سے بولی۔

"میں ٹھیک گھنٹے بھر بعد آگیا تھا۔"

"مجھے یہی اندیشہ تھا کہ تم جلد واپس نہ آجاؤ۔"

"کیا مطلب؟" کیلاش بدحواسی سے بولا۔

"پھر تم بھی ساتھ چلتے اور لطف آدھا رہ جاتا۔ آد میں تم شریک ہوجاتے۔"

کیلاش نے رما پر مکا تان لیا۔ رما جلدی سے میرے پیچ ہوگئی "آپ کا خیال ہے ورنہ...!" وہ مجھ سے مخاطب ہو۔ بولی۔ اس کے تیور یہی بتارہے تھے کہ میری موجودی مانع ہوتی تو وہ رما کی اچھی طرح خبر لیتا مگر یہ میرا گمان تھا۔ دوسر۔ ہی لمحے وہ مجھے مسکراتا نظر آیا اور مچل کے بولا "دیکھا آ نے؟"

"دیکھ رہا ہوں۔" میں نے ندامت آمیز شگفتگی سے "واقعی' بہت دیر ہوگئی۔ بس ہم نکل گئے اور وقت کا احسا ہی نہیں ہوا۔"

"جب آپ کہیں نظر نہ آئے تو میں سیدھا گھاٹ پر گ وہاں مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ ایک دیسی میم صاحب ا صاحب ابھی ابھی کشتی میں نکلے ہیں۔ میں نے سوچا کہ کروں لیکن پھر میں اس طرف چلا آیا' جب سے اب مسرا جی سے بازیاں جم رہی ہیں اور میں مسلسل ہار رہا ہوں

"لگتا ہے' ابھی ڈاکٹر گیم بھول گیا ہے یا جان بوجھ ہارتا ہے" کیلاش کے سامنے بیٹھے ہوئے معمر آدمی نے آد ہندوستانی' آدھی انگریزی میں کہا "ابھی کیا بات ہے ڈارلنگ! اس کا دل و دماغ اپن کو ٹھکانے پر نہیں لگتا۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں" رما نے بے ساختہ کہا "کیا دماغی حال آج کل ٹھیک نہیں ہے۔ کچھ دنوں کے لیے ا اگر...!"

مسرا نے قہقہہ لگایا "نہیں نہیں' ابھی اتنا نہیں پر ا تھوڑا نظر رکھنے کا ہے۔ نوجوان آدمی کھونٹے پہ بھی بدکن

ہے۔"

مسرا اٹھ کھڑا ہوا۔ کیلاش نے معذرت کی کہ وہ میرا تعارف کرانا تو بھول ہی گیا۔ اس نے وارفتہ لفظوں میں مسرا کو میرے بارے میں بتایا۔ مسرا نے بھی گرم جوشی کا اظہار کیا اور مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی' کہنے لگا "وہ ہمیشہ نوجوانوں کے ساتھ رہتا ہے۔

رما نے لقمہ دیا "اور نوجوان جب نوجوان نہیں رہتے؟"

"تو دوسرے نوجوان لوگوں کو شکار کرتا ہوں۔"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی مسرا جی! ایک دن آپ ہم سے بھی منہ پھیرلیں گے۔"

مسرا پہلے تو لاجواب سا دکھائی دیا' پھر شانے اچکا کے بولا "یہ تو تم پر ہے ڈارلنگ! ابھی کتنی دیر تم خود کو نوجوان سمجھتی ہو' یاد رکھو۔ جوانی' نوجوانی کا تعلق عمر سے نہیں ہے۔ اپن کی طرح" مجھے یاد آیا' چند دن ہوئے' کسی اور نے بھی کہا تھا کہ عمر کا تعلق تو ارادے سے ہے۔ مسرا جی بھی یہی بات کہہ رہا تھا۔ کہنے لگا "ابھی میرے کو دیکھو' اپن تم کو کتنا ہی کھوسٹ دکھائی دے' ایک نمبر نوجوان آدمی ہوں اور تم سے عشق کرنے کو ہر دم تیار رہوں۔"

"واقعی!" رما اچھل پڑی اور کھل کھلا کے بولی "میرے خدا! میری تو آج سے نیند گئی۔"

مسرا ہنستا' قہقہے لگاتا ہوا چلا گیا۔ ہم تینوں نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ جمی ہوئی بازی منتشر کرچکا تھا۔ اسے رقص گاہ جانے کی بھی جلدی تھی حالانکہ رقص کی محفل اب تمام ہوا چاہتی تھی۔ اس کے بہ قول چند منٹ رقص کیے بغیر وہ ٹھیک طرح سو نہیں پاتا۔ مسرا کے جانے کے بعد کیلاش کو جیسے فرصت ملی' وہ مجھے دیکھنے لگا' ہمکتی نگاہوں سے' پھر اس نے میرے بازو پکڑ لیے "آپ نے اچھا کیا" وہ تمتماتی آواز میں بولا "کشتی کی سیر کلب کی سب سے بہترین تفریح ہے۔ کیسے تازہ تازہ لگ رہے ہیں آپ! مجھے تو پہچاننے میں دشواری ہورہی تھی۔ سچ پوچھیے تو آپ کا چہرہ دیکھ کے ساری کوفت دور ہوگئی۔ اس نے آپ کو زیادہ پریشان تو نہیں کیا؟"

"جی یہ تو نہایت...." میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہوں' میں بل کھا کے رہ گیا۔ کیلاش نے مجھے وضاحت بھی نہیں کرنے دی۔ اسے بھوک لگ رہی تھی' بے چینی سے بولا "آپ نے کچھ کھایا پیا بھی؟ یہ رما تو ہوا پہ زندہ ہے۔ یاد نہ دلاؤ تو برسوں تک نہ کھائے۔ مجھے یقین ہے' اس نے آپ

ے پوچھا تک نہیں ہوگا۔ میرا تو برا حال ہے' بتائیے' کیا کھائیں گے آپ؟"
"اب کیا ملے گا یہاں؟" رما چہک کر بولی "اب تو شاید بینگن بھی نہ ملیں' سیدھے گھر کیوں نہ چلیں؟"
"سیدھے گھر کیوں نہ چلیں" کیلاش نے منہ بنا کے کہا "گھر تک پہنچتے پہنچتے تو دیہانت ہوجائے گا" اس نے کسی تاخیر کے بغیر بیرے کو حکم دیا کہ جو کچھ بھی جلد سے جلد لاسکتے ہو' لے آؤ۔"
تھوڑی دیر میں دو بیروں نے پلیٹیں اور ڈشیں میز پر چن دیں۔ زیادہ تر خشک چیزیں تھیں۔ کیلاش سے برداشت نہیں ہورہا تھا۔ میری بھوک بھی کھلی ہوئی تھی۔ تینوں نے سیر ہوکے کھایا۔ کھانا تو خیر جیسا تھا' عمدہ تھا۔ کھانے کے دوران میں ان دونوں کی نوک جھونک کا لطف مستزاد تھا۔
سڑکوں پر خاموشی چھائی ہوئی تھی' گھر پہنچتے پہنچتے تین بج گئے۔ دونوں مصر تھے کہ آج رات میں انہی کے گھر ٹھہر جاؤں' باقی رات باتیں کریں گے۔ صبح سویرے وہ مجھے گھر چھوڑ آئیں گے۔ صبح میں خود بھی جاسکتا تھا لیکن میں جولین کو یا کسی اور کو بتا کے آتا تو ٹھیک تھا۔ میں نے یہی عذر کیا۔ دربان جاگ رہا تھا۔ مجھ سے رخصت ہونے کے لیے دونوں موٹر سے اترے تو مجھے خیال آیا کہ اتنی رات گئے' ویران سڑکوں پر ان کا سفر کرنا مناسب نہ ہوگا۔ بمبئی کا کوئی بھروسا نہیں۔ کوئی ہتھیار وغیرہ بھی ان کے پاس نہیں ہے۔ میں نے جھجکتے ہوئے ان سے کہا کہ وہ بھی تو یہاں ٹھہر سکتے ہیں۔ اب صبح میں وقت ہی کتنا رہ گیا ہے۔ یہ بھی گھر ہے۔ یہاں تک آگئے ہیں تو اب صبح ہی جائیں' ناشتا وغیرہ کرکے۔ کیلاش سے میں نے اپنے کسی دور دراز اندیشے یا احتیاط کی تلقین کا اظہار نہیں کیا تھا مگر وہ سمجھ گیا اور ہنسنے لگا۔ اور اسے شاید اندازہ ہوگیا کہ اس کے اعتماد سے میری تسلی نہیں ہوئی ہے' اس نے کوٹ کے اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کے باہر نکالا تو اس کا ہاتھ خالی نہیں تھا۔ مجھے تعجب ہوا' وہ درمیانے سائز کا ریوالور تھا۔ میں نے کہنا چاہا کہ ہتھیار کے لیے ارادے کی پختگی بھی شرط ہے لیکن میں خاموش رہا۔ یہی بہت تھا کہ کیلاش کے پاس کچھ موجود تو تھا۔
گھنٹی بجانے کے بجائے میں نے عقبی حصے کے ایک کمرے کی کھڑکی پر دستک دی۔ مارٹی کی آنکھ سب سے پہلے کھلی' اس نے دروازہ کھولا۔ میں وہیں مسہری پر دراز ہوگیا۔ رات کا آخری پہر تھا۔ میں نے آنکھیں بند کرنے کی کوشش کی لیکن نیند ہی نہیں آرہی تھی۔ ابھی تک سمندر کا شور کانوں میں گونج رہا تھا اور لگتا تھا جیسے ابھی تک میں ڈوبتی' ابھرتی کشتی میں سوار ہوں اور بھینی بھینی سی خوش بو میرے اطراف پھیلی ہوئی ہے۔ بازگشت آواز ہی کی نہیں ہوتی' اور بازگشت بھی ایک حقیقت ہے۔ اور یوں حقیقت بھی ایک سراب ہے اگر آدمی شامل نہیں ہے۔ مجھے نیند نہیں آرہی تھی لیکن بیداری کی کوئی خاص گرانی بھی نہیں تھی۔ شاید کچھ ایسا ہے' رات کتنی ہی سیاہ اور نامہرباں ہو' دن کی نسبت آدمی کو اپنی سی محسوس ہوتی ہے اور دن کتنا ہی شگفتہ اور سایہ دار ہو' آدمی کے لیے پرایا پرایا سا ہوتا ہے۔ دن سبھی کی ملکیت ہوتا ہے' سڑک یا سرکاری باغ کی طرح جن پر سب کا حق ہے اور کسی کا بھی نہیں۔ صبح پرندوں کی چہچہاہٹ پر مجھے گھبراہٹ ہوئی۔ اندھیرا ٹوٹ رہا تھا۔ پھر کسی وقت میری آنکھ لگ گئی۔
کسی نے مجھے نہیں اٹھایا۔ میری آنکھ کھلی تو کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ گیارہ بج چکے تھے۔ منہ ہاتھ دھوکے میں فرخ اور جولین کی طرف جانے کے لیے کمرے سے نکل گیا تھا' راستے میں ایک ملازم مل گیا۔ وہ مجھ ہی کو دیکھنے آرہا تھا کہ میں جاگ گیا ہوں یا ابھی تک سو رہا ہوں۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ چمپا بیگم' جولین کی ماں اور رانی کے سوا گھر میں کوئی نہیں ہے' باقی سب خریداری کے لیے گئی ہوئی ہیں۔ ممکن ہے' بازار سے وہ جولین کے پرانے گھر جائیں یا کہیں اور۔ اب شام تک ہی ان کی واپسی ہوسکے گی۔ یہ سن کے میں نے اس طرف جانے کا ارادہ ملتوی کردیا۔ ملازم کے مطابق جولین میرے لیے ناشتے کا اہتمام کرنے کی تاکید اسے کرگئی تھی۔ اب ناشتے کا وقت کہاں رہ گیا تھا۔ میں نے ملازم سے صرف چائے کے لیے کہا۔ وہ اونچا نہیں سنتا تھا مگر ناشتے کا پورا خوان اٹھالایا۔ سیب کا مربا' پھل' انڈے' پراٹھے' آلو کی سبزی اور چائے۔ میں نے ہر چیز ذرا ذرا سی ٹونگی' پھر ہاتھ نہیں رکا۔ میں نے تقریباً سارا خوان خالی کردیا۔ شکم سیر ہو۔ مجھے پھر باہر نکلنے کا خیال آیا مگر کس طرف؟ میں سوچتا رہا کہ اب مجھے کس طرف جانا اور کیا کام کرنا ہے۔ میرے پاس کوئی کام ہی نہیں ہے۔ ابا جان اس دن یہی تو کہہ رہے تھے اس دن مجھے ان کی باتیں عجیب سی لگی تھیں۔ مجھے سبکی محسوس ہوئی تھی لیکن انہوں نے وضع کے خلاف کیا کہا تھا یہی ہوتا ہے۔ ہر شخص کوئی نہ کوئی کام کررہا ہے۔ ہر شخص کو کوئی نہ کوئی کام کرنا چاہیے' چاہے اسے کام کی ضرورت نہ ہو۔ لوگ کہتے ہیں کہ سویا مرا برابر ہے اور خالی آدمی سوئے ہوئے آدمی میں کیا فرق ہے؟ لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں

گے مگر اس میں میرا کیا قصور ہے؟ مجھے کسی اور طرف نظر کرنے کا وقت ہی کہاں ملا تھا۔ گھر سے نکلنے کے چند ہی دن بعد سزا ہوگئی تھی۔ سات برس کی جیل میں بھی میں نے کتنا وقت گنوایا! زنداں میں رہنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی منجمد ہوگیا۔ زنداں کی نذر ہونے والا' پورا وقت اس کی زندگی سے منہا کردیا جائے مگر میں تو جیل میں دیواریں چاٹنے اور ہاتھ پیر توڑ کے بیٹھنے کے بجائے کچھ کرتا ہی رہا تھا' انٹر بی اے اور ایم اے تو میں نے وہیں سے کیا تھا۔ اس کے بعد مسلسل آج یہاں' کل وہاں لیکن اب کیا ہے؟ اب مجھے کہاں جانا ہے' کون سی سمت کا رخ کرنا ہے۔ دوسروں کی طرح مجھے بھی کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ خود میری عقل کام نہ کرتی ہو تو مجھے کسی سے مشورہ کرنا چاہیے۔ پہلے کی طرح میرے دماغ پر ایسا بوجھ بھی نہیں ہے تاہم اب نہیں تو پھر کسی نہ کسی وقت مجھے کوئی تو فیصلہ کرنا ہی ہے۔ ابا جان نے سب کچھ مجھی پر چھوڑ دیا تھا۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر میں مزید تعلیم حاصل کرنا چاہوں تو ولایت چلا جاؤں ورنہ یہاں بھی ڈاکٹریٹ کرسکتا ہوں۔ یہی کچھ میرا جی بھی کہتا تھا۔ میں نے سوچا بٹھل سے بات کرکے دیکھتا ہوں۔ اسے بھی تو میری فکر ہوگی۔ ممکن ہے' مجھ سے زیادہ ہو۔ کبھی کبھی خود آدمی سے زیادہ دوسروں کو اس کی فکر ہوتی ہے۔
بٹھل کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ میں نے جھانک کے دیکھا' اندر بھی کوئی نہیں تھا۔ ابا جان' منیر علی اور مولوی اکرم بھی شاید گھر میں نہیں تھے۔ میں بے ارادہ ادھر ادھر گھومتا ہوا دوبارہ عقبی حصے کی طرف پہنچا۔ شامو' جمرو اور مارٹی وغیرہ مجھے ایک کمرے میں نظر آئے۔ وہاں تو اکھاڑا جما ہوا تھا۔ وسط میں جگنو اور دیوا چاقو لیے شامو کو نشانہ بنائے ہوئے تھے۔ دونوں پسینے پسینے تھے اور طرح طرح سے شامو پر وار کرنے کی کوشش کررہے تھے' شامو ان کے وار بچا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کے ان کے ہاتھ رکنے لگے۔ میں نے انہیں اشارہ کیا کہ وہ اپنا کام جاری رکھیں۔ میں زورا اور مارٹی کے پاس بیٹھا توجہ سے دیکھتا رہا۔ جگنو اور دیوا کے ہاتھ پیر اچھے کھل گئے تھے۔ چاقو پر گرفت مضبوط ہوجائے تو جسم بھی کھلنے لگتا ہے۔ وہ چاقو اچھال کے' چشم زدن میں' جس ہاتھ میں چاہتے' منتقل کرلیتے۔ مقابل پر اپنی مہارت کا سکہ جمانے کے لیے یہ حربے کارگر ہوتے ہیں۔ بٹھل کے بہ قول ہاتھ اور چاقو ایک دوسرے کی آنکھ' ایک دوسرے کی زبان بن جائیں تبھی بات بنتی ہے۔ بٹھل کے گھر میں نہ ہونے کی وجہ سے جگنو اور دیوا بھی خوب فارغ لگ رہے تھے۔ پھر مجھ سے بھی بیٹھا نہ رہا گیا۔ میں بھی ان میں شامل ہوگیا لیکن وہ تھک گئے تھے یا میرے سامنے آنے کی وجہ سے ان کا ارتکاز قائم نہ رہا۔ میں نے جگنو اور دیوا کو بٹھادیا پھر زورا اور مارٹی سے کہا کہ ان کی جگہ وہ فرش پر آجائیں۔ مارٹی تو ایسے موقع کی تلاش میں رہتا تھا۔ چاقو کھول کے فوراً میرے مقابل آگیا۔ یہ لگن کی بات تھی ورنہ چاقو اب مارٹی کے اشارے پہچاننے لگا تھا۔ مارٹی نے مشق اتنی نہیں کی تھی جتنی توجہ سے وہ دوسروں کو دیکھتا رہا تھا۔ بٹھل یہی کہتا تھا کہ مشق کرنے سے زیادہ دیکھا کرو اور دیکھنے سے زیادہ سوچا کرو۔ ہر کامیاب ہنرمند کی ریاضت ہمہ وقت جاری رہتی ہے۔ عمل ختم ہوجائے تو بھی ذہن مصروف رہتا ہے۔ ذہن میں بساط بچھی رہتی ہے۔ ذہن' پینترے بدلتا رہتا ہے۔ مارٹی میں سنجیدگی بھی بہت آگئی تھی۔ وہ اب عموماً کم بولتا تھا۔ ضروری تو نہیں لیکن میرا قیاس ہے کہ ذلت کے اعتماد اور کم گوئی میں کوئی تعلق ضرور ہونا چاہیے۔
زورا اور مارٹی جانتے تھے کہ وہ مجھ سے کوئی رو رعایت کریں گے تو میں دست بردار ہوجاؤں گا۔ اڈوں باڑوں میں دو طرح کی مشقیں ہوتی ہیں۔ ایک محض سیکھنے سکھانے کے لیے' دوسری دست و بازو کی چستی' حواس اور اعصاب کی یک جائی' چاقو کی روانی و صفائی کے لیے اور نئی سے نئی آزمائش سے دوچار ہونے کے تجربے کے لیے۔ اس دوسری مشق میں بس آخری لمحے ایک دوسرے سے کچھ رعایت کی جاتی ہے ورنہ لحاظ و مروت سے نہ ہاتھ پیر ٹھیک طرح کھل سکتے ہیں' نہ مشق کا کوئی نتیجہ برآمد ہوسکتا ہے۔ بے شک زچ کردینے کے مرحلے پر چاقو پھینک دیے جاتے ہیں یا ہاتھ اٹھالیے جاتے ہیں لیکن اس سے پہلے کسی کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ زورا اور مارٹی آزمودہ کار تھے۔ زورا بل میں مارٹی سے کچھ بہتر تھا۔ چاقو پر گرفت میں قریب قریب دونوں یکساں تھے۔ انہوں نے متعدد مرتبہ مجھے مشکل میں ڈالا۔ بار بار مجھے زاویے بدلنے پڑے۔ مقابلے پر جب ایک سے زیادہ لوگ ہوں تو ہر ایک کو مختلف تاثر دینے کی کوشش کرنی چاہیے۔ زورا اور مارٹی کو بھی یہ بات اچھی طرح معلوم تھی۔ دونوں نے مجھ پر' میری نقل و حرکت پر نگاہیں جمائے رکھیں۔ دیر تک میں انہیں طرح دیتا رہا۔ وہ بھی مجھے چکما دینے کی ٹوہ میں رہے۔ بیش تر زور آزمائی ذہنی ہوتی ہے۔ آخر وہ میرے داؤ میں آگئے۔ میں نے تیز رفتاری سے ادھر ادھر گھوم کے پہلے انہیں ایک دوسرے سے خاصی دور کیا اور پیچھے ہٹتے ہٹتے ذرا فاصلے پر آکے میں ایکبارگی بے تحاشا زورا کی طرف جھپٹا۔ یہ

دیکھ کے مارٹی کو مجھ پر وار کرنے کے لیے دیوانہ وار میری طرف بڑھنا چاہیے تھا۔ اس نے یہی کیا لیکن اس سے اندازے کی ذرا سی لغزش ہوگئی۔

مجھے یقین تھا کہ میرے اچانک جھپٹنے پر چاقو سے مسلح ہونے کے اعتماد کے باوجود زورا چند قدم پیچھے ہٹے گا' دائیں بائیں ہوجائے گا اور یوں میرا اس کا فاصلہ چند قدم اور بڑھ جائے گا مگر مجھے اس کی طرف جانا ہی نہیں تھا' درمیان سے پلٹ کے مجھے اپنی طرف بڑھتے ہوئے مارٹی سے بھڑجانا تھا۔ سب کچھ اسی طرح ہوا۔ زورا اضطراری انداز میں پیچھے ہٹا۔ ادھر سے مارٹی میری طرف لپکا لیکن زورا کی طرف جاتے جاتے ناگہاں میں مارٹی کی جانب پلٹ پڑا۔ مارٹی منتشر ہوگیا۔ اسے فوراً اپنا زاویہ بدلنا چاہیے تھا۔ اس کے پاس پیچھے ہٹنے یا ادھرادھر ہوجانے کی مہلت زیادہ نہیں تھی' لیکن تھی ضرور۔ حواس اور زورکی یہی تو آزمائش ہوتی ہے۔ دوسرے ہی لمحے میں اس کے اتنے قریب پہنچ گیا کہ وہ کوئی دوسرا فیصلہ نہ کرسکا۔ چاقو اس کے ہاتھ میں تھا۔ ہتھیار بھی کبھی بوجھ بن جاتا ہے۔ میں نے آناً فاناً جھکائی دے کے اس کی کلائی پر ہاتھ ڈال دیا۔ مجھے پوری طاقت سے مارٹی کو ضرب پہنچانی تھی تاکہ چاقو اس کے ہاتھ سے چھوٹ جائے اور وہ اسے چند لمحوں کے لیے اٹھانے کے قابل بھی نہ رہے۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس کے ہاتھ سے گرا ہوا چاقو اٹھانے کا وقت میرے پاس نہیں ہوگا۔ اتنی دیر میں زورا میرے سر پر پہنچ جائے گا۔ زورا نے زیادہ پھرتی دکھائی۔ میں ابھی مارٹی کی کلائی پر پنجہ ڈالنے میں کامیاب ہوا ہی تھا کہ زورا جست لگا کے تیر کی طرح مجھ تک پہنچ گیا۔ نتیجتاً مجھے مارٹی کو آگے کرنا پڑا۔ مجھ سے بھی غلطی ہوئی' زورا سے بھی۔ زورا کسی وحشی کی طرح اُمڈتا ہوا آیا' بالکل اندھوں کے مانند۔ جیسا کہ اسے توقع تھی' سامنے میں نہیں تھا۔ میں نے مارٹی کو آگے کردیا۔ زورا نے کوشش کی تھی کہ اپنے پیروں میں زنجیر ڈال سکے اور عین موقع پر وہ ترچھا بھی ہوگیا تھا۔ میں نے بھی یہی دیکھ کے مارٹی کو اپنی طرف کھینچا تھا مگر اسی اثنا میں زورا کا کھلا ہوا چاقو مارٹی کی پسلی چیرتا ہوا گزر گیا۔

سب کچھ پلک جھپکتے ہوگیا۔ پہلے مارٹی کا کرتا لال ہوا پھر فرش۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ خون مارٹی کی پسلی سے ابل رہا تھا۔ تسلی دلاسے کا وقت نہیں تھا۔ بائیں طرف سے ہاتھ بھر کے قریب مارٹی کی کھال کھل گئی تھی۔ شامو نے اپنا کرتا اتار کے خون روکنے کی ناکام کوشش کی۔ سبھی کے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے تھے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ لمحوں میں یہ کیا ہوگیا ہے۔ اور اب کیا کرنا چاہیے۔ میں نے چیخ کے شامو سے موٹر لانے کو کہا۔ دونوں موٹریں گھر میں نہیں تھیں۔ ایک جولین لے گئی تھی' دوسری ابا جان کے پاس تھی۔ یہ ایسا زخم تھا جو لیپاپوتی' ٹونے ٹوٹکے سے مندمل نہیں ہوسکتا تھا۔ اس طرح تو کچھ اور خرابی ہوجاتی۔ گھر میں ایک ٹم ٹم بھی تھی۔ اس کی تیاری میں کچھ دیر لگتی۔ چند ثانئے تذبذب میں گزر گئے تاہم پھر میں نے ایک لمحے کی تاخیر نہیں کی۔ یہاں سے دروازے تک اور دروازے کے باہر سڑک تک خونم خون مارٹی پر سبھی کی نگاہیں جاتیں۔ میری ہدایت پر دیوا اندر جاکے جو بھی چادر سامنے پڑی' اٹھالایا۔ ہم نے نڈھال مارٹی کا جسم چادروں سے ڈھانپ دیا اور میں نے بہ عجلت اسے کندھے پر ڈال کے دروازے کی طرف بھاگنا شروع کردیا۔ کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ جگنو اور دیوا بھاگتے ہوئے آگے چلے گئے۔ زورا اور شامو نے مارٹی کو مجھ سے لینا چاہا لیکن مارٹی ویسے ہی ہلکا پھلکا تھا۔ مجھے اس کے وزن کا کچھ احساس ہی نہ تھا۔ میں تو بس جلد سے جلد باہر نکل جانا چاہتا تھا۔ کئی ملازموں نے ہمیں مارٹی کو اٹھائے بھاگتے ہوئے دیکھا ہو' لیکن وہ کیا کرسکتے تھے۔

آگے گلی خالی تھی۔ دور دور تک گھوڑا گاڑی یا موٹر نظر نہیں آرہی تھی۔ بڑی سڑک گلی کے بعد تھی۔ دن کی تیزی کا وقت تھا۔ امید یہی تھی کہ جگنو اور دیوا کو سواری مل جائے گی۔ اگر جگنو اور دیوا کو جلد کوئی سواری نہ ملی تو؟ اس خیال سے میرے پیر لڑکھڑانے لگے۔ میں جیسے تیسے خاص سڑک پر آگیا۔ ہر طرف گھوڑا گاڑیوں' موٹروں اور دیگر سواریوں کا شور گونج رہا تھا۔ قریب سے جگنو اور دیوا مختلف سمتوں میں گھوڑا گاڑیوں کے پیچھے بھاگتے' آوازیں دیتے نظر آئے۔ کوئی بھی نہیں رک رہا تھا۔ ساری گاڑیاں بھری ہوئی تھیں۔ آخر زورا نے ایک ٹم ٹم کے ساتھ ساتھ کچھ دور دوڑ کے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں۔ ساتھ ہی اس نے مجھے اشارہ کیا۔ گاڑی میں ایک عمر رسیدہ پارسی عورت بیٹھی تھی۔ زورا کوچوان اور بوڑھی خاتون سے حجت کررہا تھا کہ اتنی دیر میں میں پہنچ گیا۔ خاتون نے چیخنا چلانا شروع کردیا تھا مگر شامو نے کچھ کہنے سننے کے بجائے چادر ہٹا کے مارٹی کا حال دکھایا۔ خاتون کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ وہ فوراً گاڑی سے اتر گئی۔ شامو اور زورا نے میری مدد کی۔ ہم نے احتیاط سے مارٹی کو بڑی نشست پر لٹادیا۔ کیلاش کا اسپتال دور تھا۔ میری نظر چاروں طرف کسی ڈاکٹر کے بورڈ کے لیے منڈلا رہی تھیں۔

زورا کو معلوم تھا کہ کچھ فاصلے پر ایک ڈاکٹر کا مطب ہے۔ اس نے پتھروں کی بنی ہوئی ایک سہ منزلہ عمارت کے سامنے ٹم ٹم رکوادی۔

نچلی منزل پر ڈاکٹر ڈیسائی کا مطب تھا۔ عمارت کا اندرونی حصہ پرانی طرز کے کسی مکان جیسا تھا۔ صحن کے بعد برآمدہ' اس کے بعد بڑا کمرا۔ دونوں طرف گولائی میں دو کمرے اور برآمدے' صحن کے اطراف کئی کمرے۔ ایک کے سوا سارے کمرے بند تھے۔ اندر عمارت میں بھی خوب صفائی ستھرائی تھی۔ ٹائلز کا فرش' دیواروں پر تازہ رنگ روغن' کھڑکیوں کے چمکتے شیشے۔ برآمدے کے کھلے کمرے کے سامنے کرسیوں پر چند مریض دوا کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ ادھیڑ کمپاؤنڈر دوا بنانے میں منہمک تھا کہ زورا کی آواز پر چونک پڑا۔ اس نے مڑ کے ایک نظر زورا کو دیکھا پھر اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ ابھی ٹائم ختم ہوگیا ہے۔ اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا "چند منٹ ہوئے ڈاکٹر اوپر اپنے گھر جاچکا ہے۔ اب شام پانچ بجے ملاقات ہوسکتی ہے" زورا کی منت پر نرمی کے بجائے کمپاؤنڈر الٹا ناراض ہونے لگا کہ کیا زورا نے سنا نہیں' اس نے کیا کہا ہے' کیا زورا بہرا ہے۔ وہ آنکھیں نکال کے تلخی سے بولا کہ اس وقت ڈاکٹر کا نیچے آنا ممکن نہیں ہے۔ ڈاکٹر وقت اور ضابطے کے معاملے میں نہایت سخت ہے۔ مقررہ وقت پر چاہے کوئی مریض نہ ہو' وہ مطب آجاتا ہے اور کتنے ہی مریض بیٹھے ہوں' اپنے وقت پر اٹھ جاتا ہے۔ زورا کے ساتھ شامو بھی شامل ہوگیا۔ دونوں نے کمپاؤنڈر کو مارٹی کے حال کی تفصیل بتانی چاہی اور عاجزی کی کہ وہ کسی طرح ڈاکٹر کو اطلاع کردے۔ انہیں یقین ہے' مریض کا حال سن کے ڈاکٹر نیچے آجائے گا۔ بس کچھ دیر کے لیے اسے بلوالیا جائے۔ فیس کی کوئی فکر نہیں ہے۔ دگنی' چوگنی' دس گنی فیس بھی دی جاسکتی ہے۔ فیس کے ذکر سے کمپاؤنڈر بالکل اکھڑ گیا۔ غصے سے بولا "کتنی فیس دے گا ابھی تم؟ تم کوئی ادھر لاٹ صاحب لگا ہے کیا۔ جاؤ کسی اور ڈاکٹر کے پاس جاکے ایسا اونچا بولو۔ یہ ڈاکٹر ڈیسائی کا کلینک ہے۔"

زورا نے اس کا گریبان پکڑلیا۔ برآمدے میں شور مچ گیا۔ مریض بھی کمپاؤنڈر کی واویلا میں اس کا ساتھ دینے لگا۔ مگر زورا پر دیوانگی سی طاری تھی۔ ممکن ہے وہ کمپاؤنڈر کو اندر سے گھسیٹ کے برآمدے کے فرش پر پٹخ دیتا لیکن جلد ہی اس کی سمجھ میں آگیا کہ اس طرح وہ اور وقت ضائع کررہا ہے۔ اس نے کمپاؤنڈر کو چھوڑدیا اور پلٹ کے سیدھا صحن کے بائیں جانب والے زینے پر چڑھ گیا۔ کمپاؤنڈر بھی کمرے سے نکل کے زورا کے پیچھے پیچھے زینے کی طرف بھاگا۔ شامو نے اس کا راستہ روک لیا اور اس کے مزید غل مچانے سے پہلے شامو نے اسے جکڑ کر اس کے منہ پر ہتھیلی کس دی۔ کئی مریض کمپاؤنڈر کی مدد کے لیے دوڑے تھے مگر جگنو اور دیوا کی دیوار کے آگے بے بس رہ گئے۔ اوپر جاکے زورا نے جانے کیا کچھ کیا ہوگا یا یہ نچلی منزل کی چیخ پکار کا اثر ہوگا' دو تین منٹ بعد ہی گنجے سر' سانولی رنگت کا ایک پستہ قامت عمر رسیدہ شخص زورا کے ساتھ بدبداتا ہوا زینے سے برآمد ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک نوجوان لڑکا اور ایک نوجوان لڑکی بھی نیچے آئے۔ تینوں تیزی سے سامنے کے بڑے کمرے میں چلے گئے۔ زورا کی ہدایت پر میں نے مارٹی کو "بستر میز" پر لٹادیا۔ ڈاکٹر کے تیور ویسے ہی خراب معلوم ہوتے تھے' زخم دیکھ کے اس کی پیشانی پر اور بل پڑ گئے' وہ پوچھنے لگا کہ یہ سب کس طرح ہوا؟ "چاقو لگ گیا صاحب!" زورا نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔

"لڑائی جھگڑا میں؟" ڈاکٹر درشتی سے بولا "ابھی پولیس میں رپورٹ کرایا؟"

"کیا بولتا ہے تم' اپن پہلے پولیس میں جاتا یا ابھی ایدر کو آتا" زورا نے جھلا کے کہا۔

ڈاکٹر نے صاف انکار کردیا کہ جب تک پولیس میں رپورٹ درج نہیں کرائی جاتی' وہ مارٹی کو ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔

"تم' تم کیسا آدمی ہے ڈاکٹر صاحب! تم کو اس کا حال دکھائی نئیں دیتا۔ اندھا ہے کیا تم؟"

ڈاکٹر کا چہرہ بگڑ گیا۔ نوجوان لڑکے اور لڑکی کی آنکھوں میں بھی خون اتر آیا "یہ تو پیشہ ور مجرم معلوم ہوتے ہیں" نوجوان غصے سے انگریزی میں بولا "ہمیں فوراً پولیس کو اطلاع دینی چاہیے۔"

"تم کو بولنے کا نئیں' پولیس کے پاس اپن خود جائے گا۔" زورا نے سینے پر ہاتھ مار کے دہاڑتے ہوئے کہا۔ زورا نے صرف پولیس کے لفظ سے اخذ کرلیا تھا کہ نوجوان نے ڈاکٹر ڈیسائی کو کیا مشورہ دیا ہے۔ میں نے زورا کو روکنا چاہا لیکن اس نے میری نہیں سنی' بھڑکتی آواز میں ڈاکٹر سے بولا کہ وہ کیا سمجھتا ہے' ہم نے جان بوجھ کے مارٹی کو چاقو مارا ہوتا تو اب تک جانے کہاں نکل گئے ہوتے۔ اس نے ڈاکٹر کو باور کرانے کی کوشش کی کہ یہ ایک اتفاقی حادثہ ہے۔

"ہا! اس کو چاقو لگا ہے اور تم بولتا ہے کہ یہ۔۔۔" نوجوان مشتعل لہجے میں بولا۔

"اپن جو بولتا ہے' ایک دم ٹھیک ہے۔ اور ابھی تم ایسا ہی سمجھو۔ اس کو جو کچھ بھی ہوا' اپن نے اس کو مارا یا کسی اور نے۔ اپن تمہارے پاس جس واسطے اس کو بلایا ہے تم وہ کام کرو۔ ہم ایدری بیٹھا ہے۔ بعد کو تم پولیس بلا کے اپن کو پھانسی چڑھادینا۔ اپن لوگ کا پولیس سے پرانا یاری ہے' سمجھا! تمہاری دیری میں اس کو کچھ ہوگیا تو۔۔۔" زورا نے ڈاکٹر اور نوجوان کو کچھ کہنے نہیں دیا اور جیب سے چاقو نکال کے بولا "تم نئیں دیکھے گا تو ہم ابھی تم کو بھی ایسا بنائے بنا ایدر سے جائے تو اپن باپ کا نئیں' حرامی ہوگا سالا۔"

نوجوان نے شعلہ بار نظروں سے ایک بار ڈاکٹر ڈیسائی کو دیکھا' پھر اپنے ساتھ والی لڑکی کو۔ لڑکی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کے تحمل کی تلقین کی "یہ لوگ تو بالکل داداگیر ہیں۔" وہ انگریزی میں بولا "یہ کتے ہمیں دھمکی دے رہے ہیں۔"

میں نے دخل دینا چاہا لیکن اسی لمحے ڈاکٹر ڈیسائی نے کمپاؤنڈر کو اشارہ کردیا۔ کمپاؤنڈر نے کسی معمول کے مانند سر کو جنبش دی اور کمرے سے نکل گیا۔ ڈاکٹر ڈیسائی مارٹی پر جھک گیا تھا۔ اس نے ہم سب کو کمرے سے چلے جانے کا حکم دیا۔ زورا وہیں ٹھہرا رہنا چاہتا تھا۔ میں اسے بھی بہ دقت باہر لے آیا۔ ہم سب برآمدے میں رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کمپاؤنڈر اوپر سے ایک اور لڑکی کو بلا لایا تھا۔ اس نے مریضوں سے معذرت کی کہ انہیں کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ دو ایک مرتبہ لڑکی اور کمپاؤنڈر روئی اور دواؤں وغیرہ کی ٹرے اٹھائے لپکتے جھپکتے قدموں سے اندر آتے جاتے دکھائی دیے پھر خاموشی چھاگئی۔ کسی نے کسی سے کوئی بات نہیں کی۔

دیر ہوگئی۔ بار بار ہماری نگاہیں برآمدے کی گھڑی پر جم جاتیں۔ اندر کے کمرے میں جھانکنے کے لیے کوئی جھری اور سوراخ بھی نہیں تھا اور اس سے حاصل بھی کیا تھا۔ ہم سب ہاتھ پاؤں جکڑے بیٹھے رہے' آدھ گھنٹا گزر گیا۔ کوئی پون گھنٹے بعد وہی نوجوان باہر نکلا جو ڈاکٹر ڈیسائی کے ساتھ نیچے آیا تھا۔ کمپاؤنڈر اس کے ساتھ تھا۔ نوجوان ڈاکٹروں والا گاؤن پہنے ہوئے تھا اور ڈاکٹر ہی معلوم ہوتا تھا۔ غصے کے بجائے اس کے چہرے پر فکر و اضطراب کی لکیریں نمایاں تھیں۔ ہم نے جھٹ کے اسے گھیرے میں لے لیا۔ وہ ہمارے ہی پاس آیا تھا کسی کو اس سے کچھ پوچھنے کا یارا نہیں تھا تاہم شامو نے جرات کی اور ہکلاتی آواز میں مارٹی کا حال پوچھا۔ جواب میں نوجوان آنکھیں میچ کے اور سرہلا کے رہ گیا۔ اس نے صرف اتنا کہا کہ مریض کو خون کی ضرورت ہے۔ سب نے ایک ساتھ اپنے ہاتھ اس کی طرف بڑھادیے۔ خون کا صرف رنگ ایک ہوتا ہے۔ معلوم نہیں' خون کی مختلف قسموں سے آدمی آدمی میں کتنا فرق پڑتا ہے۔ نوجوان نے ہمیں بتایا کہ مارٹی کو خون کے جس گروپ کی ضرور ہے' اس کے مطابق ہم میں سے کسی کا کوئی خون ہو تو ٹھیک ہے ورنہ باہر سے حاصل کرنا پڑے گا۔ یہ بات ہم سبھی کو معلوم تھی لیکن کسی کو اپنے خون کا گروپ معلوم نہیں تھا۔ نوجوان نے کمپاؤنڈر کی مدد سے ہمارے بازوؤں میں سوئیاں گھونپ کے ہمارا خون سرنجوں میں بھرلیا۔ سب اس کے چہرے پر کچھ پڑھنے' اس سے کچھ جاننے کے لیے بے چین تھے۔ تسلی کے صرف دو لفظ۔ نوجوان ڈاکٹر شیشوں میں خون منتقل کرتا اور ہمارے نام لکھتا رہا۔

"اپنا سارا خون لے لو صاحب!" شامو وحشت زدہ لہجے میں بولا "اپنے ماسٹر کو بچالو۔"

ڈاکٹر کو جلدی تھی۔ اس نے کچھ سنا ہی نہیں' تیزی سے اندر چلا گیا۔ زورا نے اپنا سر پکڑلیا۔ سب دوبارہ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میرے جسم میں تو جیسے جان ہی نہیں رہی تھی۔ ایک ایک پل کاٹنا مشکل ہورہا تھا۔ ان کا بھی یہی حال تھا۔ جگنو اور دیوا کے چہرے تو زرد پڑگئے تھے۔ کوئی دس منٹ بعد اندرونی کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور دوسرے لمحے ڈاکٹر ڈیسائی کے دکھائی دینے پر سبھی بوکھلا کے اٹھ گئے۔ ڈاکٹر ڈیسائی بہت تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ ہم نے چند قدموں کا فاصلہ تقریباً بھاگ کے طے کیا۔ عرصۂ مرگ کی اذیت یہی کچھ ہوسکتی ہے۔ ڈاکٹر کے سکوت کے چند لمحے ہم پر موت کی طرح گزرے۔ کسی نے کوئی سوال نہیں کیا۔ سب مجرموں کے مانند اس کے سامنے کھڑے رہے۔ ڈاکٹر نے گاؤن اتار کے اپنے ساتھ آنے والی لڑکی کے سپرد کیا۔ اسے ہمارے حال پر ضرور ترس آیا تھا کیونکہ اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ زورا نے اس کے پیر پکڑلیے "ٹھیک ہے' ابھی ٹھیک ہے بابا!" ڈاکٹر ایک قدم پیچھے ہٹ کے بوجھل آواز میں بولا "ہم لوگ نے اپنا کام کردیا ہے۔ ٹانکا لگادیا ہے۔"

"ابھی اکھا ٹھیک ہے نا ڈاکٹر صاحب!" زورا کسی بچے کی طرح گھگیا کے بولا۔

"تھوڑا دیری ہوجانے سے سب خراب ہوجانے کا تھا" ڈاکٹر نے تنک کے کہا۔ کسی نے اسے نہیں ٹوکا کیونکہ ہم بھی تو اس سے یہی کہہ رہے تھے "ابھی خون کا اور کڑی دیکھ بھال کی ضرورت ہے" وہ کبیدہ آواز میں کہنے لگا کہ عرصہ ہوا' اس

نے کلینک میں مریضوں کے قیام کا سلسلہ بند کردیا ہے۔ دن میں دوبار مختصر وقت میں وہ مریض دیکھتا اور دوائیں تجویز کردیتا ہے۔ بہتر ہوتا کہ مارٹی کو کسی باقاعدہ اسپتال میں منتقل کردیا جاتا لیکن اس کی حالت ایسی نہیں ہے کہ اسے قریب ترین اسپتال میں لے جایا جاسکے۔ کم از کم تین دن تک تو مارٹی پر ہمہ وقت نگاہ رکھنی لازم ہے۔ اس نے کمپاؤنڈر کو حکم دیا کہ کلینک کا کوئی کمرا کھلوا کے اور صفائی کرا کے مارٹی کو عارضی طور پر وہاں منتقل کردیا جائے۔ وہ انگریزی میں کمپاؤنڈر سے مخاطب تھا۔ میں سنتا رہا۔ اس نے کمپاؤنڈر کو گلوکوز کی بوتل لگانے اور مارٹی کی نگرانی کے لیے بملا نامی کسی نرس کو بلوانے کی بھی تاکید کی۔

زورا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ شامو بھی اپنے آپ کو بہت روکے ہوئے تھا۔ وہ بھی سسکنے لگا۔ ڈاکٹر ڈیسائی کے پتھر چہرے پر طمانیت کی ایک جھلک ڈھونڈ کے میرے رگ وپے کی برف بھی پگھلنے لگی۔ اتنی دیر تک میرا دم مسلسل گھٹتا رہا تھا۔ میں نے اپنے ہوش و حواس بہت قائم رکھے تھے۔ اب جیسے سب کچھ میرے اختیار سے باہر ہوا جارہا تھا۔ میں نے ڈاکٹر ڈیسائی سے تشکر کے اظہار کی کوشش کی لیکن مجھے ہر لفظ ادھورا اور بے معنی سا لگا۔ میں بس وحشت زدہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا تاایں کہ وہ آہستہ روی سے زینے کی جانب بڑھ گیا۔ پھر ابھی اس نے چند قدموں کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ ٹھہر گیا اور پلٹ کے بولا "اپنا نام پتا ادھر لکھوادو' اور جیسا تم لوگ پیچھے بولا تھا' ابھی پولیس کو بھی رپورٹ کرود۔"

"اپن کو یاد ہے صاب!" زورا نے ہاتھ جوڑ کے کہا "آپ کا حکم ہے تو ضرور پولیس میں چلا جائے گا لیکن یہ پولیس کیس نہیں ہے صاب! اپن آپ لوگ سے پہلے بولا تھا' اپن کا پولیس کچہری سے روز کا منہ ماری ہے۔ اپن دادا لوگ ہے صاب' پاڑے کا آدمی ہے۔ روز پاڑے میں کھلا چاقو سے آنکھ مچولی کرتا ہے۔ آج سالا ہاتھ تھوڑا تیزی دکھاگیا' پولیس کا آپ جانتے ہو مائی باپ' اس کو ابھی دن ہو کہ رات' اکھا کالا ہی کالا دکھائی دیتا ہے۔ ایدر سے اپن کا گھر جاستی دور نئیں ہے۔ تھوڑا آپ کو تکلیف ضرور دے گا' اپن کے ساتھ چل کے اپنی آنکھ سے دیکھ لو' آپ نئیں جاسکتا تو اور کسی کو بھیج دو کہ اپن آدمی ہے کہ کتے کا اولاد۔ ابھی ذرا ماسٹر کی آنکھ کھل جائے تو اس سے بھی آپ کچھ پوچھ لینے کا ہے۔ اپن پولیس پاس چلا گیا تو اور کچھ نئیں ہوئے گا' ایسا ٹیم اپن ماسٹر سے دور ہوجائے گا۔ اپن کا ضرورت' آپ سمجھتا ہے کہ ایدر ایک دم نئیں ہے تو اپن ابھی چلا جاتا ہے۔ ماں قسم' ابھی جیسا آپ بولتے ہو۔۔۔ اپن آپ کا غلام ہے۔"

ڈاکٹر ڈیسائی خاموشی سے زورا کا ہذیان سنتا رہا۔ نوجوان اور اس کی ساتھی لڑکی' ڈاکٹر کے پہلو میں کھڑے تھے۔ اس نے ایک نظر ان کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں ساکت کھڑے رہے۔ ڈاکٹر ڈیسائی سر جھکائے زینے کی جانب چل پڑا۔

آدھ گھنٹے کے اندر مارٹی کو ایک کشادہ اور ہوا دار کمرے میں منتقل کردیا گیا۔ کچھ دیر پہلے کا ہنستا کھیلتا مارٹی بے حال' بے حرکت بستر پر پڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ سفید پڑگیا تھا۔ مجھ سے تو اس کی طرف دیکھا بھی نہیں گیا۔ ڈاکٹر ٹھیک کہہ رہا تھا۔ مارٹی کو صرف دواؤں اور دیکھ بھال ہی کی نہیں' دعاؤں کی بھی ضرورت تھی۔ ٹھیک چار بجے بملا نامی نرس آگئی۔ اس نے کمرے میں کسی کو رہنے کی اجازت نہیں دی لیکن زورا ضد کرکے وہیں ٹھہرا رہا۔ میں' شامو' جگنو اور دیوا باہر آکے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

کلینک کا صدر دروازہ کب کا بند ہوچکا تھا۔ کمپاؤنڈر کچھ دیر کے لیے گیا تھا کہ پھر واپس آگیا۔ اس کے تیور پہلے جیسے نہیں تھے۔ اس نے نرمی سے ہمیں مشورہ دیا کہ ہمارے ٹھہرے رہنے سے کچھ حاصل نہیں مگر وہاں سے اٹھنے کو کسی کا دل نہیں مانتا تھا۔ کمپاؤنڈر نے اصرار نہیں کیا۔ وہ ہمارے پاس ہی بیٹھا رہا۔ اس نے ہمارے لیے چائے منگوائی' چائے کے ساتھ بسکٹ بھی۔ کسی کو بھی بھوک پیاس نہیں لگ رہی تھی۔ شامو نے دبے لہجے میں کمپاؤنڈر کو جتانا چاہا کہ روپے پیسے کی ہمارے پاس کوئی کمی نہیں ہے۔ مزید نرس' دوائیں اور دوسرے کسی بھی خرچ کے لیے ہم تیار ہیں۔ زورا نے چونکہ سب کو پیشہ ور دادا اور اڈوں پاڑوں سے سب کی وابستگی ظاہر کی تھی اس لیے یہ وضاحت اور ضروری تھی۔ کمپاؤنڈر عرصہ دراز سے ڈاکٹر ڈیسائی کے ساتھ کام کررہا تھا۔ وہ کہنے لگا کہ اب ڈاکٹر کو روپے پیسے سے ایسی دلچسپی نہیں رہی۔ جب سے اس کی نوجوان بیٹی سمندر میں نہاتے ہوئے ڈوبی ہے' ڈاکٹر بالکل بدل گیا ہے۔ نہ کہیں آتا ہے' نہ جاتا ہے۔ یہ عمارت ہی اس کی دنیا ہے۔ آج سے چند برس پہلے یہ کلینک شہر کا سب سے مہنگا اور اعلیٰ کلینک تھا۔ ڈاکٹر ڈیسائی کا سارے شہر میں طوطی بولتا تھا۔ دور دور سے لوگ اس کے پاس علاج کے لیے آتے تھے' گورے تو خاص طور پر۔ سارے شہر میں مشہور تھا کہ ڈاکٹر ڈیسائی کے ہاتھ میں شفا ہے۔ مزاج کا وہ پہلے ہی تند و ترش تھا' بیٹی کی موت کے بعد اور چڑچڑا ہوگیا' جنونی سا۔ اس نے لوگوں سے ملنا جلنا تقریباً بند کردیا تھا۔ مریض آتے اور مایوس لوٹ جاتے۔ بہرحال چند

برس گزر جانے کے بعد پرانے دوستوں نے اسے کسی طور آمادہ کرلیا کہ دن میں کچھ دیر کے لیے وہ چند ایک مریضوں کی حد تک کلینک کھلا رکھے۔ انہوں نے اس کی بیٹی کا واسطہ دیا جس کے جدا ہوجانے سے ڈاکٹر کا یہ حال ہوگیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ اس طرح اس کی بیٹی کی روح بہت ناخوش رہتی ہوگی۔ وہ ایک قابل ترین ڈاکٹر کی حیثیت سے اپنے باپ پر ناز کرتی تھی اور اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کررہی تھی۔ کمپاؤنڈر نے کہا کہ اب تو ڈاکٹر ڈیسائی بہت سنبھل چکا ہے۔ جیسا کہ میرا اندازہ تھا۔ کمپاؤنڈر نے بتایا کہ جو نوجوان ڈاکٹر ڈیسائی کے ساتھ بھی نظر آیا تھا' وہ اس کا بیٹا شوچندر ڈیسائی ہے۔ اسے گھر میں گیا اور باہر جونیئر ڈیسائی کہتے ہیں۔ کوئی ڈیڑھ برس پہلے شیوا ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم کے بعد ولایت سے واپس آیا ہے اور جو خوش ادا لڑکی اس کے ساتھ نیچے آئی تھی' اور وہ بھی ڈاکٹر ہے۔ شیوا کی بیوی ہے۔ دو مہینے پہلے ان کی شادی ہوئی تھی۔ بیٹے کی ولایت سے واپسی اور گھر میں بہو کی آمد سے ڈاکٹر ڈیسائی اب خاصا پرسکون ہوگیا ہے۔ شیوا اور اس کی بیوی ہی اب کلینک دوبارہ باقاعدگی سے کھولیں گے۔ ابھی تو وہ دونوں ہنی مون منا کے دار جلنگ سے واپس آئے ہیں۔ ہمارے پوچھے بغیر کمپاؤنڈر دیر تک ڈاکٹر ڈیسائی کی باتیں کرتا رہا۔ دل جوئی کے علاوہ ہماری توجہ مبذول کرنا بھی اس کا مقصود ہوگا۔ گو ہماری نگاہیں مسلسل مارٹی کے کمرے کی طرف تکی ہوئی تھیں تاہم ڈاکٹر ڈیسائی کے بارے میں اتنا کچھ جان لینا ہمارے لیے بہتر ہی تھا۔ اس دوران میں ڈاکٹر شیوا چند منٹ کے لیے ایک مرتبہ نیچے آکے مارٹی کا معائنہ کرچکا تھا۔

پانچ بجے کے قریب صدر دروازہ کھول دیا گیا۔ مریضوں کی آمد شروع ہوگئی۔ ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ ٹھیک پانچ بجے ڈاکٹر ڈیسائی نیچے آگیا۔ ہمیں وہاں بیٹھا دیکھ کے وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا پھر سیدھا مارٹی کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ ہم بھی اس کے ساتھ اندر جانا چاہتے تھے لیکن کمپاؤنڈر نے روک دیا۔ ڈاکٹر کے باہر آجانے پر ہم اس کے سامنے ہی کھڑے تھے "ابھی تم لوگ ادھر کیوں بیٹھا ہے؟" وہ ترشی سے بولا "اپن لوگ ادھر ہے۔"

"تم' تم کیا کرے گا؟" ڈاکٹر ڈیسائی کی آواز بھر گئی۔

شامو کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ جگنو نے ہمت کی اور لجاجت سے بولا "مائی باپ! ابھی اکھا خیر ہے نا۔"

"اپن پہلے تم کو کیا بولا!" ڈاکٹر نے تلخی سے کہا "اپن نے اپنا کام کردیا ہے' آگے کا سارا ابھی اوپر والے پر ہے۔"

میں بھی ڈاکٹر سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر مجھے خود معلوم نہیں تھا کہ کیا پوچھنا اور کیا جاننا ہے۔ میں سوچتا ہی رہ گیا۔ ڈاکٹر ڈیسائی بڑبڑاتا ہوا اپنے خاص کمرے میں چلا گیا۔ شامو نے پھٹی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ واقعی اتنے لوگوں کا مطب میں مستقل بیٹھے رہنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے جگنو' دیوا اور شامو سے کہا کہ وہ گھر چلے جائیں۔ میں اور زورا یہیں رہیں گے۔ ابھی تو کوئی خاص وقت نہیں گزرا ہے لیکن جتنی دیر ہوگی' گھر میں ہمارے نہ پہنچنے پر سب کی پریشانی بڑھتی جائے گی۔ بٹھل کی آج گھر واپسی کا تو کوئی امکان نہیں تھا۔ صبح بٹھل' جمرو اور ٹنگو گھر میں نہیں تھے۔ میں سمجھا تھا' ماری کے سلسلے میں کچہری یا اسپتال گئے ہوں گے' دوپہر تک آجائیں گے لیکن کچھ دیر پہلے شامو نے مجھے بتایا کہ وہ تینوں ماری کے بچوں کی خیر خبر لینے صبح صبح پونا روانہ ہوگئے ہیں۔ شامو کو معلوم نہیں تھا کہ شکلا بھی ان کے ساتھ گیا ہے یا نہیں۔ دو دن سے پہلے بٹھل کی واپسی شاید ممکن نہ ہو لیکن اب شام ہورہی ہے۔ گھر کے دوسرے لوگ اب گھر آچکے ہوں گے۔ ہوسکتا ہے' کسی ملازم نے دوپہر ہمیں مارٹی کو کندھے پر اٹھائے بھاگتے ہوئے دیکھ لیا ہو۔ کسی نے ابا جان کو کچھ الٹ سلٹ بتادیا تو وہ اور منتشر ہوجائیں گے۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ گھر میں کسی کو کچھ نہ بتایا جائے' مارٹی کے اچانک غائب ہوجانے کے سو بہانے تراشے جاسکتے ہیں لیکن پھر مارٹی کی حالت دیکھ کے میں نے ارادہ بدل دیا۔ اب شاید گھر کے کسی فرد سے ہمارے اور باڑے کا تعلق ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ یہی ٹھیک تھا کہ کسی سے کچھ نہ چھپایا جائے' سب سے صاف کہہ دیا جائے کہ ہم تو محض مشق کررہے تھے۔ باڑے کے لوگوں کا یہی معمول ہے۔ چاقو ان کا پیشہ ہے' شوق بھی ہے اور کھیل بھی۔ اور کھیل میں یہی کچھ ہوتا ہے' کبھی جیت کبھی ہار۔ کھلاڑی کو چوٹ بھی لگ سکتی ہے۔ زورا کا ہاتھ ذرا سا چوک جاتا' ترچھا ہونے کے بجائے چاقو سیدھا رہتا تو مارٹی کا اتنا آسرا بھی نہ ہوتا۔ یہ سب جان کے ہر ایک کو دکھ ہوگا لیکن ہمارے مسلسل جھوٹ کی اذیت اس سے سوا ہوگی۔ سو جھوٹ سے ایک سچ کا زہر یقیناً کم ہونا چاہیے۔

شامو' جگنو اور دیوا سر جھکائے کھڑے رہے۔ کوئی بھی جانا نہیں چاہتا تھا "تھوڑی دیر بعد پھر آجانا۔" میں نے بوجھل آواز میں کہا "یہاں سے گھر اتنی دور نہیں ہے۔ پیدل کا راستہ ہے۔"

"اپنے کو ادھری رہنے دے لاڈلے!" شامو ویرانی سے بولا "ویسے بھی گھر جاکے سب کو کیا بولیں گے؟"

میرا سر چکرا رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے بھی وہاں سے ہٹنے کو جی نہیں کرتا تھا لیکن اصرار کا کیا محل تھا۔ میں رہوں یا شامو' بات ایک ہی تھی اور گھر جاکے سب کچھ سنانے کا عذاب شامو ہی کیوں بھگتے۔ میں نے جگنو اور دیوا کو اشارہ کیا۔ کلینک کا دروازہ عبور کرتے ہوئے میرے قدم پھر اٹکنے لگے۔ پلٹ کے میں نے مارٹی کے کمرے میں جاکے ایک نظر اسے دیکھا۔ وہ ویسا ہی بے حس و حرکت پڑا تھا۔ ایک کونے میں ٹکٹکی باندھے زورا دبکا بیٹھا تھا۔ جگنو اور دیوا کو ساتھ لے کے میں کلینک سے نکل آیا۔ مارٹی کے خون نے کئی جگہ سے میری قمیص لال کردی تھی۔ جگنو نے میرے جسم پر چادر لپیٹ دی۔ سورج غروب ہوچکا تھا مگر سڑک پر جیسے دن نکلا ہوا تھا' فٹ پاتھ پر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہم تینوں جلد ہی گھر پہنچ گئے۔ گھر کی ساری روشنیاں جل چکی تھیں۔ میں پچھلے حصے کی طرف چلا آیا۔ اچھا تھا کہ کوئی مجھے اس حال میں نہ دیکھ پائے اور اپنا حلیہ کچھ درست کرکے ہی میں ان کے سامنے آؤں۔ جگنو نے سامنے سے جاکے اپنے کمرے کا عقبی حصے کی طرف کھلنے والا دروازہ میرے لیے کھول دیا۔ وہی جولین سے میرے لیے کپڑے لایا۔ جسم بھگونے کی حد تک میں نے غسل کیا اور نئے کپڑے پہن کر باہر آگیا۔ جگنو نے مجھے بتایا کہ ابھی لوگ گھر میں موجود ہیں۔ کچھ دیر ہوئی' ابا جان' منیر علی اور مولوی اکرم بھی واپس آچکے ہیں اور بے چینی سے ہمارے منتظر ہیں۔ وہی ہوا جس کا مجھے خدشہ تھا۔ دوپہر کسی ملازم نے ہمیں افراتفری کی حالت میں گھر سے نکلتے دیکھ لیا تھا۔ جگنو کہہ رہا تھا کہ جولین بہت سراسیمہ تھی اور اس سے طرح طرح کے سوال کررہی تھی۔ جگنو اسے کیا بتاتا' پہلے وہ دائیں بائیں شائیں کرتا رہا پھر کوئی جواب بن نہ پڑا تو اس نے سب کچھ مجھ پر ڈال دیا کہ میں بس اندر آیا ہی چاہتا ہوں۔ مناسب ہوگا' جولین مجھ ہی سے کچھ پوچھے۔ جگنو' جولین کو اور پریشان کر آیا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق جولین کو اصل بات کا علم نہیں تھا ورنہ وہ مارٹی کا نام ضرور لیتی۔ اس سے پہلے کہ کوئی مجھے پوچھتا ہوا آجاتا' میں کمرے سے نکل گیا۔ ابا جان اور منیر علی ملاقاتی کمرے میں موجود تھے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے "کیا ہوا؟" انہوں نے میرے سلام کا جواب دینے اور میرے بیٹھنے کا بھی انتظار نہیں کیا "باقی لوگ کہاں ہیں؟" وہ منڈلاتی آواز میں بولے۔

میں نے اپنے حواس بجا رکھنے کے لیے چند لمحے توقف کیا۔ "مارٹی زخمی ہوگیا تھا' اسے اسپتال پہنچادیا ہے" میں نے بظاہر تحمل کی کوشش کی۔

"کیسے! کیا ہوا اسے؟" ابا جان بے قراری سے بولے۔

"اسے چاقو لگ گیا تھا" میں نے آہستگی سے کہا۔

"چاقو لگ گیا تھا؟" ان کی آواز حلق میں پھنس گئی۔

"ہاں' بس یوں ہی' کسی کے سان و گمان میں نہ تھا کہ ایسا ہوجائے گا۔ مارٹی ہی سے کچھ چوک ہوئی' اندازے کی غلطی۔۔۔"

ابا جان گنگ رہ گئے۔ ہرچند ان ثانیوں کا جبر میرے لیے کسی بڑی سزا سے کم نہیں تھا۔ جیسا کہ مجھے اندازہ تھا' ابا جان کے مزید سوالات سے بچنے کے لیے مجھے اس کے سوا کوئی صورت نظر نہ آئی کہ میں ازخود سب کچھ بے کم و کاست بیان کردوں۔ میں نے ان سے صاف کہہ دیا کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہم ایسی مشقیں کرتے رہے ہیں۔ یہ سن کے ابا جان کو تفصیل سے اجتناب کرنا چاہیے تھا لہٰذا انہوں نے پھر ایک لفظ نہیں کہا۔ منیر علی بھی گم صم بیٹھے رہے' میں بھی چپ رہا۔

"اب' اب کیسا ہے وہ؟" خاصی دیر بعد ابا جان ہڑبڑاتے ہوئے بولے۔

"ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ڈاکٹر ڈیسائی ایک تجربہ کار ڈاکٹر ہے۔ ہم یہی کرسکتے تھے کہ مارٹی کو جلد سے جلد اسپتال پہنچادیں۔ گھر میں موٹر نہیں تھی لیکن شاید کوئی ایسی دیر بھی نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اب صرف دعا کی ضرورت ہے۔"

"میرے خدا!" ابا جان صوفے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ "بدنصیب لڑکا' وہ کیسا سعادت مند' سادہ طبیعت بچہ ہے۔" ابا جان کی آواز نہیں نکل رہی تھی "مجھے ابھی اسپتال لے چلو۔" انہوں نے اضطراب سے کہا۔

"ابھی وہ ہوش میں نہیں ہے۔ شامو اور زورا اس کے پاس ہیں۔ آپ ضرور چلیے لیکن ابھی آپ کے جانے سے کچھ حاصل نہیں ہے۔ اسے ذرا ہوش آجائے تو سرہانے آپ کی موجودگی یقیناً اس کے لیے تسلی و تشفی کا باعث ہوگی۔"

"ڈاکٹر نے کچھ اور نہیں بتایا؟" منیر علی نے دھڑکتی آواز میں پوچھا۔

میرے ہونٹ پھڑپھڑا کے رہ گئے۔

"آہ' خدا خیر کرے" ابا جان آہیں بھرنے لگے "خدا اس پر رحم کرے۔ اسے سلامت رکھے' اس نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے؟"

"پروردگار نے چاہا تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔ وہ بڑا کارساز ہے۔ اس سے خیر کی طلب کرنی چاہیے" منیر علی کی

آواز کپکپا رہی تھی "مگر یہ تو۔۔۔ یہ تو۔" وہ جھکتے ہوئے بولے "یہ تو پولیس کا بھی۔"

"ڈاکٹر نے اسی لیے انکار کردیا تھا۔ ہم نے کسی طور اسے راضی کرلیا۔ پولیس تو بعد کی بات ہے" میں نے بمشکل کہا "مارٹی اچھا ہوجائے' پولیس سے بھی نمٹ لیا جائے گا۔"

ابا جان نے اپنا چہرہ چھپالیا۔

"میرا خیال ہے' ہمیں ابھی اسپتال چلنا چاہیے" منیر علی نے ابا جان کی طرف دیکھتے ہوئے تذبذب سے کہا۔

"ہاں ہاں' چلنا چاہیے' ضرور ضرور" ابا جان پر ہیجان سا طاری تھا۔

"بتھل بھی نہیں ہیں اس وقت" منیر علی نے وحشت سے کہا "خدا جانے کیا ہورہا ہے یہ سب۔ ہم سے کون سی لغزش ہوگئی ہے۔"

"تم نے ڈاکٹر سے کہا کہ وہ روپے پیسے کی کوئی پروا نہ کرے جتنا بھی چاہے' جتنا بھی۔۔۔" ابا جان کو فوراً احساس ہوگیا کہ یہ دعویٰ تو ہم نے بھی طمطراق سے کیا ہوگا "میرا مطلب ہے" انہوں نے ہچکچاتے ہوئے صراحت کی "ہمیں کسی اور بڑے ڈاکٹر کو بھی تلاش کرنا چاہیے۔ تم نے کیلاش سے مشورہ کیا؟"

"اس کا وقت ہی کہاں ملا" میں نے ناتوانی سے کہا۔ یوں بھی نوجوان ڈاکٹر کیلاش کی دخل اندازی آزمودہ کار ڈاکٹر ڈیسائی کو گراں گزر سکتی تھی" میں نے ابا جان سے نہیں کہا کہ مجھے کئی بار کیلاش کا خیال آیا تھا۔ میں اگر خود نہیں جاسکتا تھا تو پھر اسے کلینک بلا سکتا تھا' پہلے نہیں تو بعد میں لیکن کوئی ایک بات نہیں تھی جس نے مجھے روکے رکھا۔ مجھے وضاحتیں کرنے کا یارا نہیں تھا۔ جس طرح ابا جان نے سب کچھ اخذ کرلیا ہے' ضروری نہیں تھا کہ کیلاش بھی اسی صبروضبط کا متحمل ہوتا۔ بہت کچھ سامنے ہونے کے باوجود کوئی ایک گوشہ تو ابھی باقی ہے یا محفوظ ہے۔ یہ پردہ ابا جان کو مجھ سے زیادہ عزیز ہوگا۔ ڈاکٹر ڈیسائی کے آمادہ ہوجانے کے بعد کیلاش کی اتنی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ہوتی تو کوئی اندیشہ زیاں مارٹی' ایک آدمی کے زیاں سے بڑا نہیں تھا' بڑا نہیں ہے۔

منیر علی نے کچھ دیر کے لیے ابا جان سے اجازت چاہی۔ وہ نفلیں پڑھنے اور منت مانگنے گئے ہوں گے۔ ان کے جانے کے بعد میں اور ابا جان خاموش بیٹھے رہے' پھر معاً ابا جان بھی مجھ سے کچھ کہے بغیر اٹھ کے چلے گئے' میں کمرے میں تنہا رہ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اندر جولین اور وہ سب شدت سے میری منتظر ہوں گی۔ اندر جاکے ان کا سامنا کرنے کے تصور ہی سے میری رگیں کھنچی جاتی تھیں۔ ابا جان کی بات اور تھی۔ جولین' فرخ' فریال وغیرہ کے سامنے مجھے ان کی استطاعت کے مطابق ہی زبان کھولنی تھی۔ جولین کمرے کے اردگرد ہی کہیں منڈلا رہی تھی۔ ابا جان کو گئے چند ثانئے گزارے ہوں گے کہ جانے کس طرف سے اچانک وہ میرے سامنے آکے کھڑی ہوگئی۔ فرخ' فریال کی طرح وہ چوڑی دار پاجامے' کرتے اور دوپٹے میں ملبوس تھی اور بہت نکھری نکھری' اجلی اجلی لگ رہی تھی۔ اسے دیکھ کے ایک لمحے کے لیے جیسے سب کچھ مجھ سے اوجھل ہوگیا' جیسے اندھیرے میں روشنی کی ایک لہر سی گزر جائے مگر وہ بس ایک جھماکے کی چاندنی اور ایک جھونکے کی تازہ ہوا تھی کہ میرے وجود پر پھر اندھیرا چھانے لگا۔ جولین کی آنکھوں میں تابندگی اور چہرے پر شگفتگی تھی۔ میں نے جان لیا کہ یوں وہ مجھے اپنی استقامت کا ثبوت دینا چاہتی ہے اور یہ ارادی خوش گواری میری دل داری' میرے حوصلے کی استواری کے لیے ہے۔ کسی ہم دم و ہم نفس کا یہی شیوہ ہوتا ہے مگر وہ تادیر خود سے مدافعت نہ کرسکی۔ آخر اس کے چہرے پر اس کے اندر کا تلاطم غالب آگیا۔ "کیا بات ہے؟" وہ اُمڈتی آواز میں بولی۔

"کیا بتاؤں؟" میں نے تقریباً کراہتے ہوئے کہا۔

اس نے کسی قدر تامل کیا اور زیر لبی سے بولی "میں کسی کام نہیں آسکتی۔"

"سردست تو نہیں" میں نے شکستہ لہجے میں کہا اور مختصراً اسے مارٹی کا حال بتایا۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ میں نے اس سے گزارش کی کہ وہ مجھ سے اس وقت جزئیات نہ پوچھے۔

اس نے ضد نہیں کی اور کہنے لگی "کیا میں کلینک جاسکتی ہوں؟"

"جاسکتی ہو' مگر کیا کروگی جاکے' اسے تو اپنی کوئی سدھ بدھ ہی نہیں ہے۔"

"اسے میرا بڑا لحاظ ہے" وہ دبی زبان سے بولی "شاید میری موجودگی سے وہ۔۔۔" وہ کہتے کہتے رک گئی۔

میری نگاہیں یک بارگی اس کے چہرے پر گئیں اور مجھے یاد آیا کہ مارٹی سے میری پہلی مڈبھیڑ جولین ہی کے واسطے سے ہوئی تھی۔ جب وہ کرشنا جی کے گھر مجھے انگریزی پڑھانے آئی تھی اور ایک روز میں اسے اس کے گھر پہنچانے گیا تھا تو گلی میں ماسٹر مارٹی مجھ سے بھڑ گیا تھا۔ جولین کو میرے ساتھ دیکھ کے مارٹی کو بہت طیش آیا تھا۔ وہ گلی کا شہدا تھا' چاقو نکال کے میرے راستے کا پتھر بن گیا' مارٹی کو اس روز بہت ندامت اٹھانی پڑی۔ پھر اس نے وہ گلی ہی چھوڑ دی۔ وہ دوبارہ اپنے علاقے میں سر اٹھا کے کس طرح جاتا جہاں ایک ہجوم کے سامنے اس کا چاقو گرا لیا گیا تھا اور اس نے ضربیں الگ کھائی تھیں' مارٹی پھر میری تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا اور ایک روز میں اسے نظر آگیا۔

اس کے بعد مارٹی گویا دوبارہ پیدا ہوا۔ تمام شہدا پن' اٹھائی گیری چھوڑ کے وہ باقاعدہ دادا بن گیا۔ ایک بار میں نے بالم خاں کے اڈے پر قبضہ کرکے مارٹی کو نگراں بنادیا تھا مگر اسے اڈوں پاڑوں سے طبعاً کوئی مناسبت نہ تھی۔ وہ ان بے شمار تیرہ نصیبوں میں سے تھا جن سے ان کا سایہ' ان کا کنارہ ابتدا ہی میں کہیں کھو جاتا ہے۔ اور کوئی دیوانہ ہوجاتا ہے' کوئی وحشی' جنگلی۔ کوئی اپنے آپ کو ترک کرکے کشکول اٹھالیتا ہے اور کسی کو ایک عرصہ انتظار کی دہشت راستے ہی میں تمام کردیتی ہے۔ مارٹی کو اس کا کچھ کھویا ہوا واپس مل گیا تھا اسی لیے اس نے سر اٹھا کر پھر کسی اور طرف نہیں دیکھا۔ وہ جولین کا کوئی ایسا خطاکار نہیں تھا لیکن اس کے اندر کا شیشہ بہت ثابت و سالم تھا۔ وہ تو جیسے جولین کو عزت و مرتبت دے کے مسلسل کوئی تلافی کررہا تھا۔ جب میں بمبئی میں نہیں تھا اور جولین اپنی ماں اور چمپا بیگم کے ساتھ کرشنا جی کے دیے ہوئے موجودہ مکان میں رہتی تھی تو گھر کی نگرانی اور خدمت گزاری کے لیے صبح و شام حاضری مارٹی کا معمول تھا۔ میں نے کبھی اس جانب ایسی توجہ ہی نہیں کی کہ مارٹی اور جولین میں ایک نسبت تو بہرحال رہی ہے۔ مارٹی نے بھی کسی وقت مجھے اس کا گمان نہیں ہونے دیا۔ جولین کو ضرور کچھ اندازہ تھا جبھی وہ کلینک جانے کو کہہ رہی تھی۔

یہ سن کر مجھ پر حیرت سی طاری رہی اور میں نے خود کو ملامت کی کہ کبھی مارٹی کو سینے سے لگا کے میں نے اس کا سمندر جھانکنے کی کوشش کیوں نہیں کی مگر یہ میری کوئی کوتاہی نہیں تھی۔ کچھ جان کے بھی میں کیا کرلیتا۔ یہ سفارش و گزارش کا معاملہ نہیں ہے۔ یہ تو جولین پر تھا کہ وہ کیلاش کے لیے کتنے دریا اور مارٹی کے لیے کتنے صحراؤں کا فاصلہ مقرر کرتی ہے اور کسی اور کے لیے کیا۔۔۔! آدمی منزل کی طرح نہیں ہوتے کہ ایک متعین فاصلے پر ممکن ہوجاتی ہے اور یہ تو کسی کی طلب و جستجو پر منحصر ہے کہ کسی منزل مراد کے لیے وہ کتنا سفر طے کرنے کے حوصلہ رکھتا ہے اور اس میں منزلیں قریب کرنے کی قوت و قدرت کتنی ہے۔ مجھے کچھ نہیں معلوم تھا کہ جولین نے مارٹی کے لیے کوئی منصب تجویز کیا ہے یا نہیں۔ البتہ مارٹی کے روز و شب سے بظاہر یہی نظر آتا تھا کہ

اس نے ایک بے ہنر و بے مایہ' ایک شکستہ شخص کی طرح خود کو اپنی لکیروں اور گردشوں کے سپرد کردیا ہے۔ اسے اچھی طرح احساس ہوگا کہ اپنی منزل تک اس کی رسائی کتنی مسافت پر ہے اور خود اس کی قامت اور دسترس کیا ہے۔ یہ پسپائی ایک طرح کی عاجزی بھی ہے' ہوش مندی بھی۔ تاہم نسبت کی بات اپنی جگہ ہے۔ مارٹی کی حالت میں نے جولین کو بتادی تھی۔ وہ ایک ذہین اور ایثار پیشہ لڑکی تھی۔ مارٹی کی رگوں میں جمی ہوئی برف پگھلانے کے لیے بے شک یہ حربہ کارگر ثابت ہوسکتا ہے اگر واقعی یہی کچھ ناگفتنی ہے تو اس موقع پر اس حرماں نصیب کے لیے جولین کی معیت' جولین کا قرب' کسی کرشمے کے مانند ہوگا۔ ڈاکٹر ڈیسائی کی مسیحائی پر مستزاد۔ کہتے ہیں' مریض کے خواب دیکھنے کا عمل جاری رہنا چاہیے۔

جولین میرے سامنے بیٹھی تھی اور میرا ذہن طرح طرح سے کسی کنایہ و رمز کی تشریح و تعبیر میں الجھا ہوا تھا۔ میں نے خود کو ٹوکا' مجھے باور کرنا چاہیے کہ کوئی بھی نسبت صرف مارٹی کی طرف سے تھی۔ جولین کو اس سے مطلق سروکار نہیں تھا اور ممکن ہے' اتنا کچھ بھی نہ ہو جتنا میں آڑی ترچھی لکیریں کھینچ کے کوئی شکل وضع کرنے کے لیے سر کھپا رہا ہوں۔ ہوسکتا ہے' جولین کی تشویش' گھر کے ایک فرد مارٹی کے لیے محض وضع و مروت اور نفسی شرافت پر مبنی ہو۔ جولین نے لحاظ کی بات کہی تھی۔ ضروری نہیں کہ لحاظ سے مراد نسبت ہی ہو۔ مارٹی تو سبھی کا لحاظ کرتا ہے۔ فرخ' فریال' گیتا' ابا جان وغیرہ میں سے کوئی بھی اس کے سامنے آجائے' اس کا بس نہیں چلتا کہ وہ کسی طرح کوئی خدمت بجا لائے۔ اور جولین نے سوچا ہوگا اگر ایسی کوئی بات ہے تو مارٹی کے نہاں خانے میں سوئی ہوئی راکھ جگانے کی تدبیر سے مثبت نتیجہ ضرور حاصل ہوجائے گا مگر پھر جولین کا کیا طور رہے گا؟ دریچہ کھلا رہے گا کیا؟ بصورت دیگر مارٹی تو بہت عاجز ہوجائے گا۔ آدمی پتھر نہیں ہوتے کہ بار بار موسم کی نیرنگی کا ستم سہتے رہیں' آدمی تو ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔ اچھا ہوا جو مجھے کچھ اور سوچنے' الجھنے اور اپنی اس بے محل خیال کاری پر پراگندہ ذہنی سے نجات مل گئی۔ ابا جان اور منیر علی تیار ہو کے کمرے میں آگئے۔ میں نے گہری سانس بھر کے جولین سے کہا "دیکھو' پھر وہاں جاتے ہیں' شاید کوئی اچھی خبر لے کے آئیں" وہ شامو اور زورا کے لیے کھانا بھیجنے کو پوچھنے لگی۔ میرے ہونٹوں پر پھیکی پھیکی مسکراہٹ پھیل گئی "کیا کھانا پینا! دوپہر بھی کسی نے کچھ نہیں کھایا تھا' ایسے میں کسی کو کیا بھوک پیاس۔۔۔"

میں نے جولین سے کہا "کلینک اتنا دور نہیں ہے۔ شامو زورا چاہیں تو کسی وقت گھر آسکتے ہیں۔ ان کی جگہ میں رہ جاؤں گا۔"

باہر موٹر تیار کھڑی تھی۔ اکبر نے ہمارے ساتھ چلنے کے لیے اصرار کیا۔ مگر ابا جان نے منع کردیا۔ جس وقت دروازے سے نکل رہے تھے' مہر بہ لب وہ سبھی وہاں کھڑی تھیں۔ چمپا بیگم' گیتا کی ماں رانی' فرخ' فارہہ وغیرہ۔ ابا نے اندر جا کے انہیں سارا کچھ بتادیا ہوگا۔ منیر علی نے تسلی دی اور دعا کی تلقین کی' کہنے لگے "کون جانے بارگاہ خداوندی میں کس کی آواز رسا ہو جائے۔"

رات اتنی گہری نہیں ہوئی تھی۔ موٹر نے چند منٹوں میں کلینک کا فاصلہ طے کرلیا۔ بڑا دروازہ بند ہوچکا تھا اور چوکی دار پہرا دے رہا تھا۔ وہ ہمارے راستے میں مزاحم ہونے کے لیے بڑھا تھا لیکن نہ جانے کیا سوچ کے پیچھے ہٹ گیا۔ موٹر سے اترے تھے۔ ابا جان اور منیر علی مکلف شیروانی پہنے ہوئے تھے' تیور بھی مکلف تھے۔ ابا جان نے تو جیسے دیکھا ہی نہ تھا یا جیسے دروازے پر اس کا وجود ہی نہ تھا۔ قدم رکھتے ہوئے میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ مجھے شامو بھی کہیں نظر نہیں آیا۔ ہم سیدھے مارٹی کے کمرے کی طرف گئے۔ زورا اور شامو کو وہاں دیکھ کے میری جان میں جان آئی۔ نرس بملا بھی کمرے میں موجود تھی۔ مارٹی اسی طرح اکڑا پڑا تھا۔ ابا جان دم بخود سے ہوگئے۔ منیر علی کا بھی یہی حال تھا لیکن انہوں نے کچھ پڑھ کے مارٹی کے اوپر پھونکا۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے اور بال درست کرتے رہے۔ پھر انہوں نے اس کی پیشانی کا بوسہ لیا اور اضطراب کے انداز میں ابا جان کی طرف دیکھنے لگے۔

میرا خیال تھا ابا جان بملا سے مارٹی کا حال دریافت کریں گے۔ مجھے حیرت ہوئی جب انہوں نے سسٹر کے لقب سے بملا کو مخاطب کرکے ڈاکٹر ڈیسائی کے بارے میں پوچھا۔ بملا بے نیازانہ مارٹی کے دائیں جانب اسٹینڈ سے لٹکی ہوئی خون کی بوتل ٹھیک کررہی تھی' وہ سنبھل گئی اور اس نے کسی قدر متردد لہجے میں بتایا کہ ڈاکٹر ڈیسائی اور ڈاکٹر شیوا ابھی مارٹی کا معائنہ کرکے اوپر گئے ہیں۔ ابا جان کے مطابق وہ ڈاکٹر سے ملنا چاہتے ہیں' بملا نے صاف انکار کردیا کہ اس وقت یہ ممکن نہیں ہے۔ ڈاکٹر کی ہدایت ہے کہ اشد ضرورت کے وقت ہی اسے زحمت دی جائے۔ ابا جان نے خود کو مارٹی کا باپ بتایا اور بملا کی بات سنی ان سنی کرکے بولے کہ ضروری ہے' اوپر جا کے ڈاکٹر ڈیسائی کو مطلع کردیا جائے۔ اگر اس وقت ان کا نیچے آنا ممکن نہیں ہے تو ہمیں اوپر بلالیں۔ ہم زیادہ وقت نہیں لیں گے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ابا جان یہ کیا کررہے ہیں؟ کون سی کسر رہ گئی ہے' کون سی ایسی التجا تھی جو ہم نے ڈاکٹر ڈیسائی سے نہ کی ہو۔ کلینک آتے ہوئے میں نے ڈاکٹر کے بارے میں اچھی طرح ابا جان کو بتادیا تھا۔

ابا جان کے لہجے میں شائستگی بھی تھی' حکم بھی تھا۔ نرس بملا کی آنکھیں سکڑ گئی تھیں لیکن وہ شانے اچکا کے کمرے سے نکل گئی۔ میری دخل اندازی سے اب کچھ حاصل نہیں تھا۔ بملا جا چکی تھی اور مجھے اندازہ تھا کہ وہ کس قسم کا جواب لے کے آئے گی۔ اسے واپس ہونے میں دیر لگ گئی۔ مجھے تعجب ہوا' آکے اس نے ابا جان سے کہا کہ ہم اوپر جاسکتے ہیں۔

بملا کے پیچھے پیچھے ایک نوجوان لڑکی بھی آئی تھی۔ اسے میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ اس کی رہبری میں زینہ عبور کرکے ہم ایک کشادہ اور روشن کمرے میں آگئے۔ قدیم وجدید سازوسامان سے آراستہ یہ کمرا مکینوں کی خوش ذوقی کا مظہر تھا۔ لڑکی نے ہمیں دس منٹ انتظار کرنے کو کہا۔ مجھے بڑی گھبراہٹ ہورہی تھی۔ میں ابا جان کو ٹوکتے ٹوکتے رہ جاتا تھا کہ ڈاکٹر سے زیادہ نوک جھونک نامناسب ہوگی۔ وہ ایک ترش زباں اور تند خو شخص ہے۔ ابھی ہمیں وہاں بیٹھے ہوئے دس منٹ بھی نہیں ہوئے ہوں گے کہ ڈاکٹر ڈیسائی اندر آگیا۔ کبیدگی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ ابا جان' منیر علی اور میں نے اٹھ کے اسے تعظیم دی' ہاتھ ملایا "ابھی کیا بات ہے؟" ڈاکٹر ڈیسائی صوفے پر بیٹھتے ہوئے بے زاری سے بولا۔ ابا جان نے پہلے بے وقت آمد کی معذرت کی اور شکریہ ادا کیا کہ ڈاکٹر نے ان کے معنوی بیٹے مارٹی پر کمال مہربانی کی' خدا اسے اس کار خیر کی جزا دے گا۔ میرے سینے کا بوجھ کچھ کم ہوا۔ ابا جان کا لب و لہجہ سکون آمیز تھا۔ ان کی معذرت اور ان کے تشکر پہ ڈاکٹر ڈیسائی بت کی طرح ساکت بیٹھا رہا۔ ابا جان نے اس سے کہا کہ وہ اس کے پاس مشورے کے لیے آئے ہیں' صرف چند باتیں کرنے۔ ان کا مقصد صرف اتنا جاننا ہے کہ مارٹی کے لیے اس سے بہتر کوئی صورت ہو تو ڈاکٹر ان کی رہنمائی کرے۔

ڈاکٹر ڈیسائی پلکیں جھپکانے لگا "کیا مطلب ہے آپ لوگ کا؟ ابھی تھوڑا صاف بولو۔"

"ہماری مراد ہے کہ کوئی کسر نہ رہ جائے" ابا جان نے نرمی سے وضاحت کی "ہمیں معلوم ہے کہ آپ ایک تجربہ کار اور لائق ترین ڈاکٹر ہیں۔ آپ کی لیاقت اور مہارت میں کوئی کلام نہیں لیکن مزید کسی تبدیلی اور احتیاط سے اور اچھے نتائج کی توقع ہو تو ہمیں بتایا جائے۔"

"اس کے اوپر کیا!" ڈاکٹر ڈیسائی تنک کے بولا "ابھی لندن لے جائے تو ٹھیک ہے۔"

"آپ کا مشورہ ہوا تو ہم اسے لندن بھی لے جاسکتے ہیں" ابا جان نے اطمینان سے کہا۔ ان کی آواز میں غیر معمولی اعتماد تھا "آپ نے توجہ نہیں کی ڈاکٹر صاحب! اکثر ایسا ہوتا ہے' بہت سے معاملات میں بعد کو ہم سوچتے ہیں کہ اگر ایسا ہوجاتا' یہ' یہ چیزیں اور فراہم ہوجاتیں تو کیا اچھا ہوتا۔ میں کہنا چاہتا ہوں' کیا اس کے سوا مارٹی کے لیے اور کچھ نہیں کیا جاسکتا؟"

ڈاکٹر نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"ہم اس کے لیے آخری امکان تک جانا چاہتے ہیں۔"

"آپ اس کے کیا ہوتے ہو؟"

"میرا خیال تھا' نرس نے آپ کو بتادیا ہوگا۔" ابا جان نے نسبتاً اونچی آواز میں کہا "وہ میرا بیٹا نہیں ہے لیکن بیٹے سے زیادہ ہے۔"

ڈاکٹر کے ہونٹ پھیل گئے اور چہرے پر جال سا بن گیا۔ ہم نے اسے بتایا تھا کہ ہمارا تعلق اڈے پاڑے سے ہے۔ زورا نے شروع میں شور بھی بہت مچایا تھا' اس کے سوا چارہ بھی کوئی نہیں تھا۔ یقیناً ڈاکٹر ڈیسائی سوچ رہا ہوگا کہ ہم نے اس سے جھوٹ بولا تھا یا ابا جان غلط بیانی کررہے ہیں۔ وہ ہم میں اور ابا جان میں کوئی مطابقت ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کررہا ہوگا۔ میں یہی بات ابا جان سے کہنا چاہتا تھا کہ ان کی مداخلت اور تشویش کا اظہار ڈاکٹر کے لیے اسرار انگیز ہوسکتا ہے۔ ڈاکٹر معنی خیز اور خشونت آمیز نظروں سے ہمیں گھورتا رہا پھر بھاری آواز میں بولا "ابھی آپ کیا چاہتے ہو؟"

"ہم تو اس کی جلد از جلد صحت یابی چاہتے ہیں اور اس کے لیے جو کچھ ہمارے بس میں ہے' ہمیں بتایئے۔ ہم سے پوچھئے تو ہم اسے اپنے گھر لے جانا چاہتے ہیں۔ اپنے گھر میں ہم وہ تمام انتظامات فی الفور کرسکتے ہیں جو اس جیسے کسی مریض کے لیے ضروری ہیں۔ ڈاکٹر' نرسیں اور سازوسامان۔ ہم سمجھتے ہیں' وہ اپنے شناسا چہروں کے درمیان رہے گا تو اچھا اثر پڑے گا۔ ہمیں بھی آسانی ہوگی۔ یہ ممکن نہیں تو کوئی دوسری صورت آپ کے ذہن میں ہوگی' کوئی اور بہتر جگہ" ابا جان کا دھیما لہجہ تندہی سے عاری نہیں تھا۔

"ابھی اس کا ادھر سے لے جانا ٹھیک نہیں ہے۔"

"مناسب ہے" ابا جان نے کسی تامل کے بغیر کہا "جب آپ فرمائیں لیکن پھر ہماری درخواست ہے' ہمہ وقت دیکھ بھال کے لیے جتنی نرسوں اور جتنے ڈاکٹروں کی ضرورت پڑے' انہیں کسی بھی معاوضے پر طلب کرلیا جائے۔ ہماری خواہش ہے کہ ہروقت ماہر ڈاکٹر اس کے سامنے رہیں۔ یہ کلینک آپ نے عرصے سے بند کیا ہوا ہے اور اس کی حیثیت اب کلینک کی کم' گھر کی سی زیادہ ہے۔ ہوسکے تو جتنے دن مارتی یہاں سے رہے' پہلی منزل کو عارضی طور پر باقاعدہ کلینک کا درجہ دے دیا جائے تاکہ کسی روک ٹوک کے بغیر ہم یہاں آجاسکیں۔ آپ ہماری گزارش پر غور کررہے ہیں جناب؟"

ڈاکٹر متذبذب انداز میں سر ہلانے لگا۔

"بات تو اچھی نہیں ہے لیکن معاملے کی ہے۔ معاملے کی ہر بات جتنی ہلکی ہوتی ہے۔ اتنی بوجھل بھی۔ ہم اس نوازش کے لیے کوئی بھی رقم خرچ کرنے کو آمادہ ہیں۔"

"آپ کے پاس بہت روپیہ پیسہ ہے کیا؟" ڈاکٹر کی بھنچی ہوئی آواز میں پولا طنز صاف نمایاں تھا۔

"روپیا پیسا کیا چیز ہے صاحب!" ابا جان جیسے اس سوال کے لیے تیار تھے' کہنے لگے۔ "ہم پھر کس طرح آپ کو یہ باور کرائیں گے کہ وہ ہمیں کتنا عزیز ہے۔ کسی بھی مال و دولت کے مقابلے میں ہمیں اس کی زندگی پیاری ہے۔"

"روپیا پیسا زندگی کا مول نہیں ہے' بڑے صاحب!"

"بے شک نہیں ہے۔" ابا جان نے ایک لمحے کا توقف نہیں کیا' کہنے لگے "دولت سے زندگی نہیں خریدی جاسکتی۔ دولت سے وقت بھی نہیں خریدا جاسکتا۔ آدمی نیلام ہوجاتے ہیں۔ چونکہ بولی آدمی کے مابین لگتی ہے۔ یہ کوئی نیلام نہیں ہے۔ جناب' اس لیے کہ بولی آدمی کی لگتی ہے' زندگی کی نہیں۔ زندگی کی لگام اسی کے ہاتھ ہے جو دنیا جہاں کا مالک ہے۔ یہ بھی سب اسی کی دولت ہے جس کی ملکیت کے میں اور آپ گمان میں رہتے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ آپ ہمارا مقصد نہیں سمجھ رہے ہیں یا میں کہہ نہیں پارہا۔ ہوسکتا ہے' آپ کو خدا نے بہت کچھ دیا ہو۔ سب سے بڑھ کے تو دل ہوتا ہے۔ خدا نے ایک دل کشادہ دے دیا تو سبھی کچھ دے دیا۔ یہ کوئی سودے بازی نہیں ہے ڈاکٹر صاحب! ہمیں معلوم ہے' آپ اتنا ہی کرسکتے ہیں جتنا آپ کے اختیار میں ہے۔ ہم تو ایک اور بات کہہ رہے ہیں۔ دولت کے ذکر سے کوئی ضمانت ہمیں مطلوب نہیں ہے۔ یہ ضمانت آپ دے بھی نہیں سکتے لیکن اتنا تو آپ کو خوب اندازہ ہوگا کہ کبھی ذرا سی غفلت یا ناداری کی وجہ سے کتنے مریض طبیب کے پاس نہیں پہنچ پاتے' اچھے طبیب' بروقت علاج اور دیگر نگہداشت وغیرہ سے فرق تو کوئی پڑتا ہے ورنہ۔۔۔" ابا جان نے ٹھہر کے کہا "ہم اس کے علاج کے تمام امکانات کی ضمانت چاہتے ہیں اور بس۔۔۔ باقی سب خدا کے حوالے۔۔۔"

ڈاکٹر ڈیسائی خاموش بیٹھا رہا۔

ابا جان نے کہا کہ انہیں اور کچھ نہیں کہنا۔ انہوں نے کسی گراں بات کے لیے ڈاکٹر سے معذرت چاہی۔

"نہیں' نہیں" ڈاکٹر کرسی پر سیدھا ہوکے بولا "ایسا نہیں ہے' ایسا بات نہیں ہے' اپن سوچتا ہے کہ ابھی اور کیا کیا جاسکتا ہے؟" اس نے مضطرب نظروں سے ہم تینوں کو دیکھا اور خودکلامی کے انداز میں کہنے لگا کہ ہر زخم کے اندمال کے لیے ایک وقت لازم ہے۔ کسی ڈاکٹر کے پاس جادوئی چھڑی نہیں ہوتی۔ ابھی ابھی اپن کیا کرے؟" وہ الجھتے ہوئے بولا۔

"یہ آپ کا کام ہے ڈاکٹر صاحب' ہم تو آپ کے منتظر ہیں۔" ابا جان نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے' ابھی تھوڑا وقت دیوا اپن کو۔"

ابا جان نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اجازت چاہی۔

ڈاکٹر کو جیسے ابا جان کے اس طرح اٹھ کے جانے کی توقع نہ تھی "ایسا کیسے!" وہ چونک سا پڑا اور ماتھے پر ہاتھ رکھ کے پشیمانی سے بولا "آپ لوگ سے چائے پانی کو تو پوچھا ہی نہیں۔"

"شکریہ جناب! اس وقت تو کسی چیز کو جی نہیں چا[ہ] رہا۔"

"آپ بولو' ابھی کیا پیئیں گے' چائے' کافی بھی بن سک[تی] ہے۔"

"پھر سہی ڈاکٹر صاحب" منیر علی نے لجاجت سے کہا۔

"آپ لوگ گھر آیا ہے" یہ کہتے ہی اس نے ڈولی کے نا[م] سے کسی کو آواز دی۔ وہ خادمہ تھی اور قریب ہی کہیں تھی' پہلی ہی آواز پر آگئی۔ ابا جان اور منیر علی کے کئی بار منع کر[نے] کے باوجود ڈاکٹر نے ڈولی سے چائے لانے کو کہا اور اپنے [بیٹے] بہو کے بارے میں پوچھا۔ ڈولی کے بتانے پر کہ وہ دونوں ا[پنے] کمرے میں ہیں' ڈاکٹر نے انہیں یہاں آنے کی ہدایت ک[ی]۔ خادمہ کے جانے کے بعد وہ گپ چپ بیٹھا رہا۔ ابا جان[بھی] چپ رہے۔ ڈاکٹر شیوا اور اس کی بیوی فوراً ہی اندر آگئے۔ شیوا نے گھر کا لباس نہیں بدلا تھا۔ اس کی بیوی نیلے رنگ [کا] گاؤن پہنے ہوئے تھی۔ گلے میں سرخ رنگ کا پھول دا[ر] رومال لپٹا ہوا تھا۔ سہ پہر سے وہ بالکل مختلف نظر آرہی تھ[ی]

[تر و تا]زہ' کھلی کھلی اور بڑی بڑی سی۔ دونوں کسی قدر بدحواس [تھ]ے۔ ڈاکٹر نے ابا جان سے ان کا تعارف کرایا۔ اس سے پہلے [ان سے] ابا جان کا تعارف کراتے ہوئے وہ کسی کشمکش سے دوچار [تھا]۔ ابا جان نے اپنا منیر علی کا اور میرا نام بتایا۔ میرا نام [انہ]وں نے بابر بتایا تھا' پھر انہیں خیال آیا کہ بمبئی میں تو میرا [نا]م کچھ اور ہے "ظہیر' یہ ظہیر ہے" انہوں نے جلد ہی ترمیم [کی]۔ انہیں میرا لقب' راجا دادا' یاد نہیں آیا۔ ہمیں نمسکار [کر]نے کے بعد شیوا اور اس کی بیوی صوفے پر بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر [نے] اپنی بہو کو پرتی کے نام سے پکارا تھا۔ اس نے بیشتر [انگ]ریزی میں شیوا کو مارتی اور ابا جان کے تعلق کے بارے [میں] بتایا اور مختصراً ساری بات دہرائی۔ شیوا سعادت مندانہ [انداز] سے سنتا رہا۔ درمیان میں وہ کچھ کہنا چاہتا تھا' اپنے باپ [کی] قطع کلامی کے خیال سے ہکلا۔۔۔ کے رہ گیا۔ شیوا اور پرتی [کی] نگاہیں مسلسل بھٹک رہی تھیں۔ کبھی وہ ایک دوسرے کو [دیک]ھتے تھے' کبھی ہم سب کو اور کبھی ڈاکٹر ڈیسائی کو۔ دوپہر [انہ]وں نے مجھے زورا اور شامو وغیرہ کے ساتھ دیکھا تھا۔ سو [ان] کا وہی حال ہونا چاہیے تھا جو منیر علی اور ابا جان کے ساتھ [انہیں] دیکھ کے ڈاکٹر ڈیسائی کا ہوا تھا۔ ممکن ہے' ڈاکٹر ڈیسائی کی [شائس]تگی' بے ساختگی بھی شیوا اور پرتی کے حیرت و تجسس میں [اض]افہ ہو۔ وہ کسی پرانے شناسا کی طرح ابا جان سے محو کلام [تھا]۔ باتوں باتوں میں ابا جان اسے بتا چکے تھے کہ ان کا محل [نم]ا مکان کلینک سے کتنا قریب ہے۔ مکان کے سابق مکینوں [سے] ڈاکٹر کی رسم و راہ تھی۔ وہ اپنے بیٹے اور بہو کو اس مکان [کی] منفرد عمارتی نوعیت اور طول و عرض کے بارے میں بتانے [لگا]۔ شیوا اور پرتی شائستہ لوگوں کی طرح پھیلی ہوئی آنکھوں [سے] یہ تفصیل سنتے رہے۔ اتنی دیر میں پھلوں' بسکٹوں' چائے [او]ر چینی کے برتنوں سے بھری ہوئی ٹرالی آگئی۔ چائے کے [دو]ران میں ابا جان نے براہ راست پرتی کو مخاطب کیا اور کہا' [سن]ا ہے' ان کی شادی کو زیادہ وقت نہیں گزرا۔ کوئی جواب [د]ینے کے بجائے پرتی شرما گئی۔ میں دیکھتا رہ گیا' چائے ختم [ک]رنے کے بعد ابا جان نے پرتی کو اپنے پاس بلایا۔ پہلے تو وہ [بہ]ت حیران و پریشان ہوئی' اس نے اپنے شوہر اور خسر کو [دیک]ھا۔ ابا جان کے مشفقانہ انداز میں تحکم بھی تھا۔ پرتی [اٹھ]ی' جھجکتی ہوئی ان کے سامنے پہنچ گئی۔ ابا جان نے اس [اثن]ا میں اپنے دستی چرمی بیگ سے ایک چھوٹی مخملی ڈبیا نکال لی [تھ]ی۔ انہوں نے پرتی کے سر پر ہاتھ رکھا اور ڈبیا اس کے ہاتھ [میں] تھمادی۔

"یہ' یہ کیا ہے؟" پرتی کے جیسے کسی نے چٹکی بھرلی ہو' وہ بری طرح گھبرا گئی "یہ تمہارے لیے ہے' سمجھ لینا کہ تمہاری رونمائی کا تحفہ ہے' تمہارے کسی بڑے کی طرف سے" ابا جان نے گونجتی آواز میں کہا۔

پرتی نے اضطراری حالت میں ڈبیا کھول کے دیکھی۔ وہ ہیرا جڑی انگوٹھی تھی۔ کمرے کی روشنی میں اس کا ہیرا دمک رہا تھا۔ پرتی کی بڑی بڑی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ ابا جان نے کوئی منتخب ہیرا ہی انگوٹھی میں جڑوایا ہوگا۔ چند لمحوں کے سکتے جیسے سکوت کے بعد پرتی کو کچھ ہوش آیا۔ اس نے انگوٹھی ابا جان کو لوٹانی چاہی۔ شیوا اور ڈاکٹر ڈیسائی نے بھی شدومد سے اس کی ہم نوائی کی۔ ابا جان نے کچھ سنا ہی نہیں "یہ اس کی خوبصورت انگلیوں میں خوب سجے گی" انہوں نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا "بیٹیاں' باپ کی دی ہوئی چیزیں لوٹایا نہیں کرتیں۔"

پرتی وہیں کھڑی رہ گئی۔

ابا جان اور منیر علی زینے کی جانب بڑھ گئے۔ ہمارے نیچے اترتے ہی ڈاکٹر ڈیسائی اور شیوا بھی پیچھے پیچھے چلے آئے۔ نرس بملا مارتی کے کمرے کے باہر ہی موجود تھی۔ ڈاکٹر ڈیسائی کو دیکھ کے اس کے ڈھلکے ہوئے شانے سیدھے ہوگئے۔ اس نے ڈاکٹر کو بتایا کہ کچھ دیر پہلے مارتی نے آنکھ کھولی تھی لیکن پھر اس پر غشی طاری ہوگئی۔ ڈاکٹر ڈیسائی اور شیوا فوراً اندر چلے گئے۔ منیر علی اور ابا جان بھی۔ میں باہر کھڑا رہا۔ شامو اور زورا بھی باہر آگئے۔ ایک پہر میں دونوں کھنڈر ہوگئے تھے' میرے جسم سے چمٹ گئے۔ میں نے انہیں اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا تھا۔ میں تسلی دینا چاہتا تھا لیکن مجھ سے ایک لفظ بھی نہ کہا جاسکا۔ شامو تو سسکنے لگا۔ اچھا ہوا' ابا جان اور ڈاکٹر جلد ہی باہر آگئے اور شامو کو سنبھل جانا پڑا۔ دیر تک کمرے سے باہر ایک کونے میں ابا جان' منیر علی' ڈاکٹر ڈیسائی اور شیوا جانے کیا سرگوشیاں کرتے رہے۔ پھر ڈاکٹر ابا جان کو موٹر تک رخصت کرنے آیا۔ موٹر میں بیٹھنے سے پہلے میں نے ابا جان کو روک کے کہا کہ وہ شامو اور زورا سے گھر جانے کے لیے کہیں۔ دونوں کچھ دیر آرام کرکے اور کپڑے بدل کے پھر واپس آسکتے ہیں۔ میں ان کی جگہ رک جاتا ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے کہنے سے وہ نہیں مانیں گے۔ ان دونوں نے ہاتھ جوڑ کے ابا جان سے التجا کی کہ انہیں وہیں رہنے دیا جائے۔ میں نے بھی ابا جان سے انکار کردیا تھا لیکن انہوں نے ساتھ چلنے کا حکم دیا تو میں نے ضد بھی نہیں کی۔ موٹر ابھی چلی نہیں تھی کہ ڈاکٹر ڈیسائی نے ڈرائیور کو کچھ توقف کرنے کی ہدایت کی۔ میری طرح ابا جان کو بھی توقع نہ

ہوگی' ڈاکٹر نے ان سے پولیس کے متعلق پوچھا۔

"میرا خیال ہے' اس کی ضرورت نہیں" ابا جان نے کسی قدر بے اعتنائی سے کہا۔

"جیسا آپ مناسب سمجھیں" ڈاکٹر انگریزی میں بولا "یوں ہی حفظ ماتقدم کے لیے مجھے خیال آیا" ڈاکٹر کے لہجے میں طنز کی آلودگی نہیں تھی۔

ابا جان نے سرہلانے پر اکتفا کیا اور ڈرائیور کو موٹر چلانے کا اشارہ کیا۔ سڑک پر بھیڑ کچھ کم ہوگئی تھی۔ ہم نے منٹوں میں گھر کا فاصلہ طے کرلیا۔ ملاقاتی کمرے میں سبھی ہمارے منتظر تھے۔ موٹر کی آواز سن کے سبھی باہر آگئے۔ ابا جان اور منیر علی کے پاس چھپانے اور ظاہر کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ تسلی تشفی کے دو ایک رسمی جملے ادا کرتے ہوئے دونوں اندر چلے گئے۔ راستے بھر مجھے رما اور کیلاش کا دھڑکا لگا رہا تھا۔ عموماً یہی وقت ان کے آنے کا ہوتا ہے۔ وہ وہاں نہیں تھے لیکن کسی وقت بھی آسکتے تھے۔ میرا دل اس وقت کسی سے بات کرنے کو نہیں چاہ رہا تھا' اپنے آپ سے بھی نہیں۔ آدمی سب سے زیادہ تو خود سے مخاطب رہتا ہے۔ ابا جان کے جانے کے بعد ان سب کی نگاہیں مجھ پر مرکوز ہوگئی تھیں۔ وہ مجھ سے کچھ جاننے کے لیے مضطرب تھیں لیکن انہیں سنانے کے لیے ابا جان اور منیر علی سے سوا میرے پاس بھی کیا تھا۔ جولین نے قریب آکے مجھے بتایا کہ زورا اور شامو کے لیے ناشتے دان اور کپڑے لے کے جگنو اور ردیوا اسپتال جارہے ہیں' کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو ساتھ کردی جائے؟ میرے ہونٹ لٹک کے رہ گئے۔ یہی ٹھیک تھا کہ جگنو اور ردیوا کے ساتھ میں بھی کلینک واپس چلا جاؤں۔ میں نے کئی بار ارادہ باندھا اور ملتوی کردیا۔ جگنو اور ردیوا کو چار دیواری تک رخصت کرکے میں پھر لوٹ آیا اور میرے قدم اوپری منزل کے ہوادار کمرے کی طرف اٹھ گئے۔ نسبتاً ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اس کمرے کے در و دیوار مجھ سے تھوڑے بہت مانوس ہوگئے تھے۔ یہاں کی خاموشی میں مجھے سکون سا محسوس ہوا لیکن پھر میرا دل ڈوبنے لگا۔ میں جبر کرکے بستر پر پڑا رہا اور یہ جبر بھی میرے اختیار میں نہ رہا۔ نیچے آکے گھر میں کسی طرف جانے کے بجائے میں نے باغ کا رخ کیا۔ ادھر خاصا اندھیرا تھا۔ پیڑوں کی اوٹ میں کوئی بھی مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا مگر میں تو اپنے سامنے موجود تھا۔ آدمی سات تہ خانوں میں بھی اپنے آپ سے نہیں چھپ سکتا۔ کہتے ہیں' ایسی بے بسی یا بے کلی تبھی ہوتی ہے جب دست وپا اور دل و دماغ کی روشنی کے باوجود آدمی کچھ کر نہیں پاتا' اور کہتے ہیں کبھی آدمی سے اپنی پہچان بھی مشکل ہوجاتی ہے۔ آدمی اپنے لیے بھی اجنبی بن جاتا ہے۔ خود کو ڈھونڈتا رہتا ہے کہ وہ کہاں ہے' وہ کون ہے اور اس کا منصب کیا ہے؟ مجھے بھی یہ سب کچھ معلوم تھا مگر اس جاننے نہ جاننے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ علم سے مراد آدمی کا قرار نہیں ہے۔ میں بار بار خود سے پوچھتا تھا کہ مجھے اس وقت کیا کرنا چاہیے۔ میں کیا کرسکتا ہوں۔ یہ احساس ہر لحظے میرے سینے میں کھٹکتا تھا کہ مجھ سے کوئی بھول' کوئی چوک ہورہی ہے۔ باغ میں پتھر کی بینچ پر بیٹھے ہوئے جانے کتنا وقت گزر گیا تھا کہ جگنو کی آمد پر میں چونک پڑا۔ "تم تو ایدر ہے راجا بھائی!" وہ حیرت سے بولا "اپن' اکھا جگہ ڈھونڈتا پھریلا ہے۔"

"کیا بات ہے؟" میں نے ہکلاتے ہوئے پوچھا "تم کب واپس آئے؟"

جگنو نے مجھے بتایا کہ اسے اور ردیوا کو آئے ہوئے پندرہ بیس منٹ کے قریب ہورہے ہیں۔ یہ معلوم ہونے پر کہ میں ان کے ساتھ کلینک نہیں گیا ہوں اور گھر میں بھی کہیں نہیں ہوں' ابا جان کو پریشانی ہونے لگی۔ مجھے تلاش کرتا ہوا جگنو آخر اس طرف آنکلا "تم ابھی اکیلا ایدر کیسے بیٹھا ہے راجا بھائی!" جگنو بدحواسی سے بولا۔

"بس' ایسے ہی" میں نے ناتوانی سے کہا "کیسا ہے مارٹی؟"

"ابی تو ویسا ہی ہے" جگنو کی آواز ڈھلک گئی "پر ابھی اور دوسرا ڈاکٹر اور نرس لوگ آیا ہے' بڑا ڈاکٹر بھی ان کا ساتھ تھا۔"

"اور ڈاکٹر بھی آگئے ہیں" میں بینچ سے اٹھ گیا "انہوں نے کچھ بتایا؟"

جگنو کو زیادہ کچھ معلوم نہیں تھا۔ بیرونی کمرے میں ابا جان موجود تھے۔ مجھے دیکھ کے انہوں نے کوئی سوال نہیں کیا۔ بس گہری سانس بھر کے رہ گئے۔ انہیں اپنی صورت دکھا کے میں جگنو کے ساتھ گھر سے نکل آیا۔ دوسری موٹر بھی وہیں کھڑی تھی۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ ڈرائیور کو جگانے میں جتنی دیر لگتی' اتنی دیر میں ہم نے راستہ پیدل ہی طے کرلیا۔ کلینک کا دربان ہمیں دیکھ کے کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور کسی ردوقدح کے بغیر اس نے چھوٹا دروازہ کھول دیا۔ اندر داخل ہوکے مجھے یہ گمان ہوا کہ میں کسی دوسری جگہ آگیا ہوں۔ آمنے سامنے کئی کمرے کھلے ہوئے تھے اور دالان' صحن کے سارے قمقمے روشن تھے۔ زورا اور شامو صاف ستھرے کپڑے پہنے دالان میں آرام کرسیوں پر بیٹھے تھے جیسے انہوں نے بہت دنوں بعد مجھے دیکھا ہو' دونوں بے تحاشا میری جانب لپک پڑے۔ ان سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کی سرخ آنکھیں ہی سب کچھ بتارہی تھیں۔ میں نے مارٹی کے کمرے کی طرف جانے کا ارادہ کیا اور میں کمرے میں داخل ہوا چاہتا تھا کہ اندر سے کیلاش کو برآمد ہوتا دیکھ کے مجھے جھٹکا سا لگا۔ وہ کیلاش ہی تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اپنے حواس مجتمع کرکے اس سے پوچھتا کہ وہ یہاں کس طرح پہنچ گیا' وہ مجھ سے لپٹ گیا اور دل گیر لہجے میں بولا "مجھے یقین تھا کہ کچھ دیر میں آپ سے ملاقات ہوگی۔"

مجھے خفت ہونے لگی اور میں نے کھسیائی ہوئی آواز میں کہا "مگر تم' تم یہاں کیسے۔"

"میں تو اور پہلے آجاتا۔" وہ بے تابی سے بولا "شام کو اسپتال سے گھر پہنچا تو رما آپ کی طرف جانے کے لیے تیار تھی۔ اسی وقت پونا سے ٹیلی گرام آگیا۔ وقت کم تھا۔ میں اور رما کو شلی کو لینے اسٹیشن پہنچے۔ ٹرین لیٹ تھی۔ گھر واپسی پر مجھے اسپتال کے انچارج اور اپنے استاد ڈاکٹر بھارگو کا پیغام ملا کہ مجھے فوراً ڈاکٹر ڈیسائی کے کلینک پہنچنا ہے۔ ڈاکٹر ڈیسائی اور بھارگو ایک ساتھ کام کرچکے ہیں۔ یہاں آکے میں ناقابل بیان حیرت سے دوچار ہوا۔ یہ تو اپنا مارٹی۔۔۔" وہ ایک ہی سانس میں کہتا گیا۔ پھر ٹھہر کے دل گرفتہ لہجے میں بولا "یہ کیا ہوگیا بابر بھائی!"

"کیا بتاؤں۔۔؟" میری آواز حلق میں ٹوٹ گئی۔

"میں نے سب دیکھ لیا ہے" وہ میری کیفیت سمجھ گیا۔ اور تیزی سے بولا "ڈاکٹر بھارگو اور اسپتال کے ایک بڑے سرجن ڈاکٹر برٹن میرے آنے سے پہلے یہاں آکے جاچکے ہیں۔ ڈاکٹر ڈیسائی خود ایک ماہر ڈاکٹر ہیں اور اس معاملے میں انہوں نے وہی کچھ کیا ہے جو ان حالات میں کوئی بھی ڈاکٹر کرسکتا ہے۔ ڈیسائی صاحب میڈیکل کالج میں پروفیسر بھی رہ چکے ہیں۔ ان کے بعد کسی ڈاکٹر کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ سن کے کہ مجھے ڈیسائی صاحب کے کلینک جانا ہے' سچ پوچھیے تو بڑی حیرت ہوئی۔ گھر سے نکلنے سے پہلے میں نے احتیاطاً بھارگو جی کو فون کرلیا تھا کہ کہیں مجھے دیر تو نہیں ہوگئی۔ انہوں نے مجھے جلد سے جلد یہاں پہنچنے کا حکم دیا۔ یہ ان کی شفقت ہے کہ وہ مجھ جیسے ناپختہ ڈاکٹر کو بعض پیچیدہ معاملوں میں شامل کرلیتے ہیں۔ بہرحال میرے تعجب پر ڈاکٹر بھارگو نے بتایا کہ مریض کے اعزا محض ڈاکٹر ڈیسائی پر تکیہ کرنا نہیں چاہتے۔ ان کا اصرار ہے کہ دوسرے ڈاکٹر بھی ڈیسائی صاحب کی مدد کے لیے موجود رہیں۔ ڈاکٹر بھارگو کا کہنا تھا کہ ہم لوگ معذرت کرلیتے مگر ہمیں کلینک میں بلانے کی درخواست خود ڈاکٹر ڈیسائی نے کی ہے' راستے بھر میں سوچتا رہا کہ وہ کون سا ایسا مریض ہے جس کے اعزا اتنے بے چین ہیں' کس گھر سے اس کا تعلق ہے۔ یہاں آکے معلوم ہوا کہ یہ تو' یہ تو اپنے گھر' محبت والوں کے گھر کا آدمی ہے۔ میری رائے میں یہ سب کچھ' کچھ زیادہ ہے لیکن ایسا غلط بھی نہیں۔ ڈیسائی صاحب کا کلینک عرصے سے غیر آباد ہے اور خود ڈیسائی صاحب ڈاکٹری کیا' اپنے آپ سے بھی اکتائے ہوئے ہیں۔ میں آپ کو یہ بتاؤں' ایک حادثے نے ان کا۔۔"

"مجھے معلوم ہے" میں نے اس کی بات کاٹ کے کہا۔

"آپ کو معلوم ہے" وہ پٹپٹاتی پلکوں سے بولا "تو پھر آپ کو یہ بھی پتا ہوگا کہ ڈاکٹر ڈیسائی نے خود کو کیسا سمیٹ لیا ہے۔ سرجن کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنا کام کرتا رہے۔ ڈاکٹر ڈیسائی کی پریکٹس عملاً ختم ہوچکی ہے۔ انہوں نے میرا خیال ہے' ایک مدت بعد رفوگری کی ہے اور کیا ماہرانہ کام کیا ہے" کیلاش میرا بازو تھامے ہوئے مجھے مارٹی کے کمرے سے ملحق ایک دوسرے کمرے میں لے آیا۔ وہاں دو ادھیڑ عمر آدمی اور ڈاکٹر شیوا پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ کیلاش نے انگریزی میں ان سے میرا تعارف کرایا۔ وہ دونوں بھی ڈاکٹر تھے اور کیلاش کے کہنے کے مطابق اپنے ہنر میں یکتا تھے۔ "اور یہ نوجوان ڈاکٹر شیوا!" کیلاش نے شیوا کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے کہا "ڈاکٹر ڈیسائی کے بیٹے ہیں۔ ہم دونوں نے ساتھ ہی تعلیم حاصل کی ہے۔ پھر شیوا لندن چلے گئے۔ وہاں سے بہت بڑے ڈاکٹر بن کے لوٹے ہیں۔ یہ مجھے بہت پیچھے چھوڑ گئے۔"

میں نے دھیمی آواز میں کیلاش کو بتایا کہ میں ڈاکٹر شیوا سے پہلے مل چکا ہوں۔

"اوہ ہاں!" کیلاش سر جھٹک کے بولا "مجھے تو دھیان ہی نہیں رہا کہ آپ لوگ تو پہلے مل چکے ہوں گے۔"

ڈاکٹر شیوا مجھ سے مصافحے کے لیے کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور متجسس نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ اس کا چہرہ تمتما گیا تھا۔ شاید مجھے انگریزی بولتا ہوا دیکھ کے۔ "کیلی کے توسط سے اس بار آپ سے مل کے اور خوشی ہوئی" اس نے لپکتی آواز میں کہا۔

"شیوا! یہ میرے دوست ہی نہیں' بھائی بھی ہیں" کیلاش مجھے بازو میں بھینچتے ہوئے بولا "میں سوچتا ہوں' بابر بھائی سے ملنے سے پہلے میں کتنا ادھورا تھا۔"

میں نے سر جھکا لیا۔

"بابر صاحب کے متعلق کچھ اور نہیں بتاؤ گے؟" شیوا

نے اشتیاق آمیز لہجے میں کہا۔

"ہاں ہاں" کیلاش گھبرا سا گیا اور سنبھل کے بولا "اس کے لیے وقت پڑا ہے۔ بس اتنا سمجھو کہ بابر بھائی ایک تہ در تہ نوجوان ہیں۔"

"وہ تو میں بھی کچھ سمجھتا ہوں" شیوا نے اپنے لہجے کا تیکھا پن دور کرنے کی پوری کوشش کی تھی "میری مراد ہے کیا کرتے ہیں آپ؟" اس نے شائستگی سے کہا۔

کیلاش نے جواب دینے کے بجائے میری طرف دیکھا اور مسکرا کے بولا "بہت کچھ' خاندانی آدمی ہیں۔ زمینیں ہیں' بزنس ہے۔"

شیوا تذبذب سے سہلا کے رہ گیا۔

"میں ایک بے کار آدمی ہوں" میں نے زہرخند سے کہا۔

"میں سمجھ گیا" شیوا ہنس کے بولا "کاش ایسی بے کاری ہم سب کو نصیب ہو۔"

"بابر بھائی ایک شاندار آدمی ہیں" کیلاش نے والہانہ انداز میں کہا اور میرا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیا "سچ پوچھو تو میرے پاس لفظ نہیں کہ میں بابر بھائی کو بیان کرسکوں۔"

"تمہاری آنکھیں بیان کررہی ہیں" شیوا نے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا "حیرت ہے' تم تو بہت ناپ تول کے آدمی تھے۔ شکی' وہمی' جزئیات ہیں۔ آڈیٹوریم میں تم احتراماً کبھی تالی بجایا کرتے تھے اور وہ بھی بہت آہستہ۔ یاد ہے' لڑکوں نے تمہیں کیا خطاب دیا تھا؟"

"یاد ہے لیکن تب تک مجھے کوئی آدمی نہیں ملا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ آدمی' آدمی کے لیے کتنا اہم ہوسکتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ رشتے کیا ہوتے ہیں اور سب سے بڑا رشتہ کون سا ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ پیمانہ تو صرف آدمی کا قد ناپ سکتا ہے' آدمی کا طول وعرض۔ تب تک میں نے بابر بھائی کو تلاش نہیں کیا تھا۔"

مجھے گھٹن ہونے لگی۔ میں نے بہ مشکل کہا "کیا کوئی اور وقت اس موضوع پر گفتگو کے لیے مناسب نہ ہوگا۔"

جیسے ان سے کوئی بڑی غلطی ہوگئی ہو' دونوں مجھ سے معذرت کرنے لگے اور کیلاش نے مجھ سے کہا کہ دوپہر سے اب تک میں نے ایک پل کے لیے آرام نہیں کیا ہوگا۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں گھر جاکے آرام کروں' وہ اور اس کے ساتھی ڈاکٹرز رات بھر کلینک میں رہیں گے۔ شیوا بھی ہے۔ ان کی موجودگی میں مجھے کسی قسم کا تردد نہیں کرنا چاہیے۔ دونوں ڈاکٹروں نے بھی اس کا ساتھ دیا اور ان میں سے ایک کہنے لگا کہ ہم آج شیوا کے مہمان ہیں۔ شیوا اور بھابی نے یہاں ہمارے قیام کے عمدہ انتظامات کیے ہیں۔ کی ہی اچھا ہوتا کہ آپ بھی ہمارے ساتھ رہتے لیکن بہتر ہوگا کہ گھر جاکے آپ ایک لمبی نیند لیں۔ میں کیا کہتا کہ ایسے میں کسے نیند آسکتی ہے۔ کیلاش نے مجھے کچھ کہنے کی مہلت بھی نہیں دی اور مجھے لیے ہوئے کمرے سے باہر آگیا۔

کیلاش کو کلینک میں دیکھ کے مجھے بے چینی ہوئی تھی اور ایک تسلی بھی۔ میں اس سے ایک بات پوچھنے کے لیے متوحش تھا کہ وہ مجھے مارنی کے بارے میں صحیح صحیح بتادے۔ میں یہ جاننا بھی چاہتا تھا اور مجھ میں کوئی ایسی ویسی بات سننے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ پھر میں نے خود قیاس کیا کہ کیلاش مارنی کی طرف سے مطمئن ہوتا تو ازخود مجھے سو طرح کے دلاسے آسرے دیتا اور ان ڈاکٹروں کی موجودگی کا سبب یہ نہیں کہ ڈاکٹر ڈیسائی جیسے صاحب حیثیت ڈاکٹر نے انہیں طلب کیا اور انہیں کسی بڑے معاوضے کی ترغیب دی ہے۔ مارنی کو دیکھ کے انہوں نے یہاں ٹھہرے رہنا ضروری سمجھا ہوگا ورنہ وہ واپس چلے جاتے۔ کیلاش نے جن دو ڈاکٹروں سے میرا تعارف کرایا تھا' انہوں نے بھی مارنی کے لیے ایک تشفی آمیز لفظ نہیں کہا تھا۔ وہ تو ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے' جیسے مجھے بہلا رہے ہوں۔

کیلاش کے اشارے پر میں اس کے ساتھ کسی معمول کی طرح کلینک کے ایک گوشے میں چلا آیا۔ مجھے شبہ ہوا اور میرا دل بیٹھنے لگا کہ شاید وہ مارنی کے متعلق مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتا ہے لیکن وہ سرگوشی میں کہنے لگا کہ کوشلی کی اچانک آمد نے اسے بہت منتشر کیا ہوا ہے۔ میں نے کسی بہرے کی مانند توجہ سے اس کی بات سننے کی کوشش کی۔ اس کے شکستہ لہجے سے ظاہر تھا کہ اسے گداز کی ضرورت ہے اور وہ مجھ سے مشورے کا طالب ہے۔ کہنے لگا' ایسی صورت میں' جب اس کی ماں اور چھوٹی بہن کوشلی کے باپ کے سوگ میں مستقلاً پونا میں مقیم ہیں' کوشلی کا بمبئی آجانا ناقابل فہم ہے۔ اسے تو ابھی اپنے گھر سے نہیں نکلنا چاہیے تھا۔ میں خاموش کھڑا سوچتا رہا کہ اس سے کیا کہوں۔ ایک اشک بار دوسرے اشک بار کی کیا دل جوئی کرسکتا ہے۔ کیلاش نے یہ ذکر دل گرفتہ انداز میں کیا تھا کہ جیسے کوشلی کی بمبئی میں آمد' کوئی حادثہ یا سانحہ ہے۔ یہ تو اپنے اپنے احساس کی بات ہے۔ اچانک پڑجاتی ہے۔ آدمی کا نفس اس کا زنداں ہے۔ ایک بار آدمی اس زنداں میں آجائے تو نکلنے کے راستے اس کے بس میں نہیں ہوتے۔ مجھے باور کرنا چاہیے کہ اس رات جج صاحب کی وصیت کے حوالے سے کیلاش نے اپنا جو احوال بیان کیا تھا' وہ اس پر کتنا طاری ہے۔ دوسرے کا احساس آدمی کو ارزاں کیوں معلوم ہوتا ہے۔ یکایک جولین میری آنکھوں میں سمٹ آئی اور مجھے سامنے کے کمرے میں دراز بے حال مارنی کا خیال آیا۔ میرے دماغ میں الٹے سیدھے دائرے بننے لگے۔ آدمی' بساط کے مہروں کی طرح کیسے ایک دوسرے کے سامنے آجاتے ہیں۔ کیلاش' مارنی کی مسیحائی کے لیے کلینک میں ٹھہرا ہوا ہے۔

میری خاموشی پر کیلاش کہنے لگا کہ رما بھی کوشلی کی غیر متوقع آمد سے بے کل ہوگئی ہے۔ شام سے وہ کئی بار اسپتال فون کرچکی تھی کہ کیلاش جلد آجائے تو دونوں ہمارے ہاں آسکیں۔ پھر کہیں اور نکل جائیں گے۔ بمبئی سے کچھ دور۔ کل رات کلب سے واپسی پر وہ دونوں جاگتے رہے اور میرا ہی ذکر کرتے رہے۔ کیلاش کے بقول اس نے بہت دنوں بعد رما کو اتنا سرشار دیکھا تھا۔ وہ کسی سحر کی سی کیفیت میں تھی' کہتی تھی کہ آج اسے ایسا لگا جیسے اس نے کوئی کھوئی ہوئی چیز حاصل کرلی ہو' کوئی سراغ پالیا ہو' کسی خزانے تک پہنچ گئی ہو۔ اور بھی بہت کچھ۔۔۔ کوشلی کے ٹیلی گرام پر وہ بہت برگشتہ ہوگئی تھی۔ اسٹیشن جانے پر بھی تیار نہ تھی بلکہ اکیلے ہی ہمارے ہاں آنے کی ضد کررہی تھی۔ یہ ایک نہایت ناروا بات تھی۔ کیلاش نے اسے سمجھایا کہ کوئی اجنبی نہیں' کوشلی آرہی ہے جو گھر کے ایک فرد کی حیثیت رکھتی ہے۔ یوں بھی کوشلی سے رما کی اچھی دوستی ہے۔ کیلاش نے بتایا' وہ کوشلی سے اس کا مقصد تو نہیں پوچھ سکتے تھے۔ ایک طرح سے وہ اپنے دوسرے گھر میں آئی تھی اور کسی وقت بھی اطلاع کے بغیر آسکتی ہے۔ ممکن ہے وہ پونا کی سوگوار فضا سے بے زار ہوگئی ہو اور کچھ دن کشادہ ماحول میں رہنے کی ضرورت محسوس کرتی ہو۔ وہ بہت تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔ پریشان پریشان سی۔ کیلاش سے وہ پہلے کی طرح پیش آئی۔ اس کے چہرے بشرے سے ایسی کوئی بات واضح نہیں ہورہی تھی۔ کیلاش کی توقع کے خلاف اس میں کوئی مصنوعی یا مبالغہ آمیز تپاک نہیں تھا۔ کیلاش کہہ رہا تھا' اس کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ وہ کوشلی کے لیے کیا رویہ اختیار کرے اور کوشلی کے کسی مثبت رویے کا کیا جواب دے؟ کوشلی اب یہاں موجود رہے۔ آج نہیں تو کل کسی وقت جج صاحب کی وصیت کا ذکر آئے گا۔ پھر کیلاش کو کوشلی پر کیا ظاہر کرنا چاہیے؟

میں اسے کیا بتا سکتا تھا تاہم اس کی خاطر عزیز تھی۔ جو کچھ وہ کہتا رہا' میں سر جھکائے پوری تن دہی سے سنتا رہا اور میں نے چاہا بھی کہ اس کی گراں باری کم کرنے کے لیے جھوٹے سچے لفظ کہوں مگر کون سے لفظ؟ پھر وہ خود ہی خاموش ہوگیا۔ اس کا غبار یوں ہی کم ہوگیا۔ اسے اندازہ ہوگیا کہ میں کیا' کوئی بھی اس نازک معاملے میں سرسری رائے نہیں دے سکتا۔ ہوسکتا ہے' اسے خیال آگیا ہو کہ ایسے وقت مجھ سے کسی رائے کی توقع فضول ہے۔ ہم دونوں زورا' شاموا اور جگنو کے پاس دالان میں رکھی ہوئی آرام کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میرا دماغ بھٹکنے لگا تھا۔ کیلاش کو شاید کوئی شافی جواب مطلوب بھی نہ تھا۔ اسے تو اپنا اظہار مقصود تھا۔ کبھی کبھی سامنے کی بات میری نظروں سے اوجھل ہوجاتی ہے۔ مجھ دیر فہم کو بعد میں احساس ہوا کہ کیلاش تو یوں مجھے ٹوکنا اور ٹٹولنا چاہتا ہے۔ اس رات اس نے مجھ پر اعتبار کرکے' مجھے کوئی واسطہ سمجھ کے اپنی جاں سوزی کا جو حال بتایا تھا اور کوئی عرض گزاری تھی' میں نے اس طرف کچھ توجہ کی یا نہیں؟ میرے جی میں آئی اسے صاف بتادوں کہ کوئی واسطہ کام نہیں آتا۔ آدمی اپنی سفارش آپ ہوتا ہے۔ اسی رات مجھے موقع مل گیا تھا اور میں نے کیلاش کا احوال جولین کو منتقل کرنے میں شاید کوئی کوتاہی نہیں کی تھی۔ میں کیلاش کو بتا سکتا تھا کہ اس رات جولین سے کیا بات ہوئی تھی۔ یہ سب کچھ سن کے تو وہ تمام ہوجاتا۔ اس کی آواز کی تپش میں نے اپنے رگ وریشے میں محسوس کی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں میں کدورت کا اندھیرا سا اٹھا تھا کہ میں نے خود کو ملامت کی۔ میں بھول گیا کہ کیلاش تو ایک مجبور آدمی ہے۔ وہ کوشلی کی آمد پر اپنی وحشت کا اظہار کرکے مجھ سے کسی ہمدردی کا خواہاں ہے تو کیا غیرفطری ہے۔ ایسے عالم میں وقت کی موزونی ناموزونی کا کیسے ہوش رہتا ہے۔ اس تلاطم میں' میں ہی اس کے لیے ایک کنارہ ہوں۔ میرے سوا چارہ گری کے لیے اس کے سامنے پھر اور کون ہے مگر میں اس کے لیے کیا کرسکتا تھا۔ کوئی بھی کچھ نہیں کرسکتا۔ ہرچند جولین نے مجھ سے کہا تھا۔ اگر میری یہی خواہش ہے تو اس کے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے۔ پھر کہنے سننے کو کیا رہ گیا تھا۔ میں جانتا ہوں' وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ میرا اشارہ ہی کافی ہوتا مگر کوئی کسی کو یہ حکم کیسے صادر کردے۔ کسی کو ایسے ایثار کی آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہیے۔

دو سے اوپر ہوچکے تھے۔ ایک دوسرے کمرے میں نرسوں کا انتظام کیا گیا۔ کمپاؤنڈر بھی جاگتا رہا۔ شیوا کچھ دیر کے لیے اوپر' اپنے گھر گیا تھا کہ واپس آگیا۔ دونوں ڈاکٹر اور نرسیں وقفے وقفے سے مارنی کے کمرے میں آتے جاتے رہے

تھے۔ کیلاش دیر سے خاموش تھا۔ ہم دونوں ابھی دالان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یکایک ایک نرس مضطربانہ انداز میں مارٹی کے کمرے سے برآمد ہوئی اور برابر کے کمرے میں چلی گئی۔ کیلاش فوراً اٹھ گیا۔ اس کے ساتھ میں بھی اٹھا۔ زورا' شامو اور جگنو سبھی نے مارٹی کی چیخ سنی تھی۔ ہم سب اس کے کمرے کی طرف دوڑے' برابر کے کمرے سے دونوں ڈاکٹر بھی لپکے۔ ان کی ساتھ ہم بھی اندر جانا چاہتے تھے کہ ایک ڈاکٹر نے ہمیں روک دیا۔ اندر سے مارٹی کے کراہنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ کوئی اجنبی سنتا تو اس کا سینہ بھی پھٹنے لگتا۔ مارٹی شدید تکلیف میں تھا۔ زورا چوکھٹ سے سر پھوڑنے لگتا۔ شامو اور جگنو نے اسے تھاما اور کمرے سے دور لے گئے۔ دروازے پر اب ڈاکٹرز کی دیوار حائل نہیں تھی۔ میں اندر جاسکتا تھا مگر وہیں کھڑا مارٹی کی آہیں سنتا رہا۔ کیلاش اور شیوا' دونوں ڈاکٹر اور نرسیں اندر موجود تھے۔ رفتہ رفتہ مارٹی کی کراہیں کم ہونے لگیں' پھر خاموشی چھا گئی اور کیلاش' شیوا کے ساتھ باہر نکلا۔ میرا گلا خشک ہوگیا تھا۔ میں نے پھٹی ہوئی آنکھوں سے کیلاش کو دیکھا.... میں نے کچھ پوچھنا چاہا مگر میری زبان پتھرا گئی۔ میرا سارا جسم پتھر کا ہوگیا تھا۔

"کوئی ایسی بات نہیں" اس نے میرا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔ "پہلی رات ذرا بھاری ہوتی ہے۔ اس کی بے ہوشی ختم ہوگئی تھی اور درد جاگنے لگا تھا۔ ضروری غذا میں اور دوا میں پلا کے اسے پھر سوئی لگادی گئی ہے۔"

"سب ٹھیک تو ہے نا؟" میں نے جھرجھراتی آواز میں پوچھا۔

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں' خدا سے بہتری کی امید کرنی چاہیے۔" اس نے جلدی سے کہا۔ اس کے لہجے میں زور نہیں تھا۔ میں نے خود کو دلاسا دیا کہ اس کی وجہ تھکن بھی ہوسکتی ہے اور ڈاکٹر تو ویسے ہی محتاط لہجے کے عادی ہوتے ہیں۔ کیلاش نے موضوع بدل کے مشورہ دیا کہ بہتر ہے ہم سب اب گھر چلے جائیں۔ یہاں ہمارے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں۔

"اپنے کو جانے سے بھی کیا ہے ڈاکٹر صاحب!" شامو تندی سے بولا۔

کیلاش نے نرمی سے اسے سمجھایا کہ کئی ڈاکٹر اور نرسیں یہاں موجود ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ ممکن نہیں ہے۔ ہم لوگ صبح تک آرام کرکے پھر واپس آسکتے ہیں۔ وہ سب میری طرف دیکھنے لگے۔ میں خود بھی جانا نہیں چاہتا تھا لیکن زورا' شامو اور جگنو کے خیال سے میں نے کہا کہ ہاں' جیسا تم کہتے ہو' ٹھیک ہے۔ زورا پھر بھی آمادہ نہیں ہوا۔ اس سے ضد کرنا بے کار تھا۔ میں' شامو اور جگنو کو لے کے کلینک سے نکل آیا۔ کیلاش بھی ہمارے ساتھ باہر آیا۔ ہم نے بہت منع کیا لیکن اس کے اصرار پر ہمیں اس کی موٹر میں بیٹھنا پڑا۔ گھر کے دروازے پر ہمیں پہنچا کے وہ فوراً واپس چلا گیا۔

راستے بھر وہ چپ بیٹھا رہا تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ کسی لمحے کہیں وہ مجھ سے پوچھ نہ لے کہ سب سے پہلے اسے اطلاع کیوں نہیں دی گئی۔ اس وقت یہ ممکن نہیں تھا تو رات گئے تک اسپتال یا اس کے گھر ہم کسی قاصد کو بھیج سکتے تھے۔ اگر ڈاکٹر ڈیسائی طلب نہ کرتا تو شاید اسے خبر بھی نہ ہوتی۔ کیلاش نے ایسی کوئی شکایت نہیں کی' نہ اس نے مارٹی کے زخم کا سبب جاننے کی جستجو کی۔ جیسے اسے معلوم ہو کہ سب کچھ کس طرح پیش آیا ہوگا۔ ہوسکتا ہے' ڈاکٹر ڈیسائی' شیوا یا زورا اور شامو میں سے کسی نے اسے کچھ نہ کچھ بتادیا ہو۔ خود اس نے بھی زخم کی نوعیت دیکھی تھی تاہم اس نے مجھے کسی مشکل میں نہیں ڈالا۔ اسے اب جاننا بھی کیا تھا۔ سب کچھ تسلسل سے اس کے سامنے ہی ہورہا تھا۔ کوئی عرصہ نہیں گزارا' کانتے کے دریدہ جسم کا وہ عینی شاہد تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کانتے کس وجہ سے جاں بر نہ ہوسکا اور پیرو کو گولی کیوں لگ گئی۔ پیرو کی ارتھی کے اژدحام میں کون لوگ بین کررہے تھے اور شہر میں کیسے کیسے فسانے عام ہورہے تھے۔ کسی نے کیا اسے نہیں بتایا ہوگا کہ پیرو' ماہم کی چوکی پر بیٹھنے والا' بمبئی کا سب سے بڑا دادا تھا۔ کیلاش تناسب و توازن کا آدمی تھا۔ اسے اچھی طرح شدبد تھی کہ دوستوں سے اتنے ہی سوال کرنے چاہئیں جتنوں کے وہ جواب دے سکیں۔ باقی اس نے اپنے طور پر تشریح کرلی ہوگی۔ ممکن ہے' اسے یہ بھی احساس ہو کہ جو کچھ ہوا' اس میں میری یا کسی اور کی نیت کا دخل نہیں تھا۔ اس نے میرے یا زورا اور شامو وغیرہ کے بارے میں کوئی بدگمانی نہیں کی ہوگی۔

سارے گھر پر سناٹا چھایا ہوا تھا مگر شاید کوئی بھی نہ سویا ہوگا۔ ہم عقبی راستے سے اندر داخل ہوئے۔ دیوا ہماری آہٹ پر کمرے سے باہر نکل آیا۔ میں' جگنو اور شامو کے ساتھ انہی کے کمرے میں لیٹ گیا لیکن وہاں میرا جی نہیں لگا۔ میں اٹھ کے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ صبح کاذب کے وقت شاید چند لمحوں کے لیے میری آنکھ لگی تھی کہ میں ہڑبڑا کے اٹھ گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری ذرا سی غفلت سے کوئی بڑا نقصان ہوجائے گا۔ میرا جاگتے رہنا ہی ٹھیک ہے۔ بیداری میں آدمی امید کا پہرا تو دے سکتا ہے' کچھ

اور نہیں تو آدمی دعا تو کرسکتا ہے۔ میرا سارا جسم دکھ رہا تھا اور سینے میں ہوک سی اٹھتی تھی جیسے موت آرہی ہو۔ موت آجائے تو آدمی کو قرار آجاتا ہے مگر یہ اذیت تو موت سے بھی شدید ہوتی ہے۔ یہ تو باربار کی موت ہے۔ آدمی کا جسم' قد کا ٹھ' چوڑا چکلا سینہ' مضبوط ہاتھ پیر' علم' منصب' مال وزر' ارادے' خواہشیں' خواب' سارے سراب ہیں۔ یہ طلسم ٹوٹتا ہے تو ساری حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ آدمی تو ریت کے ڈھیر پر کھڑا ہے اور آدمی تو بس ریت کا بنا ہوا ہے۔ اکارت زندگی موت کے برابر ہے' بے بسی' موت سے بڑی اذیت ہے' کہتے ہیں جو شخص دوسروں کے لیے کچھ نہیں کرسکتا' وہ مردہ آدمی کے مترادف ہے اور کہتے ہیں صرف اپنے لیے زندگی کوئی زندگی نہیں ہے مگر آدمی زندگی کا مختار ہی کتنا ہے اور موت پر بھی اسے کس قدر اختیار ہے۔ موت بھی اتنی آسانی سے نہیں آجاتی۔ کاش ایسا ہوا کرتا کہ مال وزر سے اپنے غریب اور نادار عزیزوں اور رفیقوں کی اعانت کی طرح لوگ اپنے اپنے وقت اور اپنی اپنی عمروں کی اعانت پر بھی قادر ہوا کرتے۔ اگر ایسا ہوتا تو ایک میں ہی نہیں' گھر کا ہر فرد اپنے حصے کی کچھ عمر مارٹی کو نذر کرنے میں کوئی تامل نہ کرتا۔ معلوم نہیں' کتنا سچ ہے' کتنا جھوٹ ہے۔ بابر بادشاہ کے متعلق مشہور ہے' اس نے اپنے جواں سال جاں بلب بیٹے ہمایوں کے لیے دعا مانگی تھی کہ خدا اس کی زندگی کے بدلے ہمایوں کو زندگی دے دے۔ خدا نے اس کی دعا قبول کرلی۔ ابا جان اپنی بے اندازہ دولت مارٹی پر نچھاور کرنے کے لیے آمادہ تھے۔ کیلاش کے بہ قول' اس سے زیادہ کچھ ممکن نہیں ہے۔ اس سے زیادہ ایک ہی بات ممکن تھی' بابر اور ہمایوں والی صورت۔ مجھ بے حیثیت اور بے ہنر کے پاس اپنی جان کے سوا کچھ نہیں تھا لیکن خدا کو بھی ایک مجہول اور معطل آدمی سے کیا غرض ہوسکتی ہے۔ وہ تو بادشاہ اور شہزادے کا معاملہ تھا۔ میں تو کسی گنتی میں نہیں آتا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو بہت ٹٹولا' کریدا کہ میری نیت میں کون سا نقص اور میرے ارادے میں کیا کمی ہے؟ آدمی اپنے لاشعور کے فتور سے واقف نہیں ہوتا' خود کو دھوکا دیتا رہتا ہے۔ یقیناً میری خواہش میں کوئی آلودگی ہوگی جو اسے سودا منظور نہیں تھا۔

دھوپ کمرے میں اتر آئی تھی۔ میں آنکھیں کھولے بستر پر پڑا رہا۔ آنکھیں بند کرنے سے مجھے ڈر لگنے لگتا تھا۔ کسی نے دروازے پر دستک نہیں دی۔ کوئی آیا بھی ہوگا تو میرے آرام کی خاطر بند دروازے سے لوٹ گیا ہوگا۔ کئی بار میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا لیکن اس خوف نے مجھے باندھے ا جکڑے رکھا کہ نیچے کوئی اچھی خبر تو میری منتظر ہوگی نہیں دیوار پر گھڑی نے نو بجائے تو میرے لیے کمرے میں ٹھ مشکل ہوگیا۔ میں چوروں کی طرح نیچے آیا۔ سب سے مجھے فریال دکھائی دی۔ اس کے چہرے کا ٹھہراؤ دیکھ کے مِ سانسیں استوار ہوئیں۔ فرخ بھی وہیں کہیں ستون کی آڑ تھی' میری آہٹ سن کے وہ سامنے آگئی۔ دونوں میری طر امڈ کے آئیں اور میں نے بے اختیار انہیں اپنے پہلو سمیٹ لیا۔ فرخ کی زبانی معلوم ہوا کہ ابا جان صبح ہی شامو' جگنو اور دیوا کے ساتھ کلینک گئے تھے' ابھی ابھی وا آئے ہیں۔ جگنو اور شامو تو وہیں رہ گئے ہیں' دیوا آگیا۔ ان سے کچھ پوچھنا مناسب نہ معلوم ہوا۔ میں نے ان دو سے کہا کہ ابھی واپس آتا ہوں اور دیوا کے کمرے کا رخ وہ مجھے راستے ہی میں مل گیا۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی آواز میں کہ مارٹی نے رات بہت تکلیف میں گزاری ہے۔ بے ہ کی دواؤں کے باوجود وہ وقفے وقفے سے چیختا چلاتا رہا۔ البتہ اسے کچھ سکون آگیا۔ نرسیں' ڈاکٹر کیلاش اور دوسر ڈاکٹر رات بھر جاگتے رہے۔ ڈاکٹر ڈیسائی بھی نیچے تھا۔ چ ڈاکٹر بھی مارٹی دیکھنے آئے تھے۔ دیر تک وہ اس کے کم میں رہے۔

میں وہیں سے کلینک نکل جانا چاہتا تھا کہ فرخ دروازے پر مجھے روک لیا۔ اس کا لہجہ قطعاً حاکمانہ تھا' لگی کہ ناشتا کیے اور کپڑے بدلے بغیر میں کہیں نہیں جا گا۔ میں سنی ان سنی کرکے نکل جاتا لیکن فرخ نے کہا کہ گیتا اور جولین بھی میرے ساتھ کلینک جارہی ہیں۔ میں کو سمجھا سکتا تھا کہ سرِدست کلینک جانے سے کیا حاصل۔ مارٹی کو تو اپنی سدھ بدھ ہی نہیں ہے' وہ اسے دیکھ کے پریشان ہوں گی' مگر مجھے ٹھہر جانا پڑا۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ جواباً فرخ بھی مجھ سے یہی کچھ کہہ سکتی تھی۔ جولین کا سن کے میرے اندھیرے وجود میں کوئی چراغ سا روشن ہ ٹوٹکے بھی کبھی کارگر ہوجاتے ہیں۔ جولین کی صورت میں دور دراز امکان ہے تو کسی پس وپیش کا وقت نہیں ہے۔ فرخ کے ساتھ اندر چلا آیا۔ انہوں نے پہلے سے سارا ا کر رکھا تھا' ناشتے اور کپڑوں کا۔ فرخ کی ہدایت پر میں جلدی جلدی غسل کیا اور کپڑے بدلے۔ پراٹھے کے نوا نہیں نگلے جارہے تھے لیکن فرخ پھر ضد کرنے لگتی۔ میں تھوڑا بہت ناشتا زہرمار کیا۔ چائے بھی پی۔ اتنی دیر بھورے رنگ کی ساڑھی پہنے جولین اور فرخ کی طرح کر

تنگ مہری کے پاجامے اور دوپٹے میں ملبوس گیتا بھی اندر آگئیں۔

کلینک کے دروازے پر ہاتھ سے لکھا ہوا گتے کا بورڈ آویزاں تھا۔ انگریزی میں لکھا ہوا تھا کہ تا اطلاع ثانی کلینک بند ہے' صرف زیر علاج مریض کمپاؤنڈر سے رابطہ کرکے دوا بنواسکتے ہیں۔ جیسے ہی ہماری موٹر رکی اور دربان کی نظر ہم پر پڑی' اس نے چھوٹا دروازہ کھول دیا۔

مارٹی کے کمرے میں جانے کی ممانعت تھی۔ فرخ' گیتا اور جولین کو نرسوں کے لیے مخصوص کیے گئے کمرے میں انتظار کرنا پڑا۔ میں' زورا اور شامو وغیرہ کے ساتھ بیٹھا رہا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہمیں اندر جانے کی اجازت ملی۔ دونوں ڈاکٹر باہر آگئے تھے۔ یہ دونوں وہی تھے جن سے رات کیلاش نے میرا تعارف کرایا تھا۔ مجھے دیکھ کے وہ سیدھے میری طرف بڑھے۔ ان میں سے ایک نسبتاً سن رسیدہ ڈاکٹر نے انگریزی میں مجھ سے کہا "بہتر ہوگا کہ خواتین اندر جاکے ضبط وحوصلہ رکھیں۔ وہ اس وقت ہوش میں ہے لیکن غنودگی کی حالت میں۔"

"اب' اب کیسا ہے؟" میں نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

"کیا بتائیں آپ کو؟" وہ گہری سانس بھر کے بولا۔

"کیوں' ایسی کیا بات ہے ڈاکٹر صاحب؟" میرا سر گھومنے لگا "مجھے صاف بتایئے۔"

"صرف زخم کا معاملہ نہیں ہے۔"

"پھر! اور۔۔۔ اور کیا ہے؟"

"اور بھی پیچیدگیاں ممکن ہیں۔"

"اور کیا ڈاکٹر صاحب!" میں نے سراسیمگی سے کہا۔

"یہاں ایکس رے کے آلات قریب قریب ناکارہ ہوچکے ہیں۔ کچھ دیر میں بہرحال یہاں تمام انتظامات ہوجائیں گے۔ ڈاکٹر بھارگو کا خیال ہے' ہمیں کئی ایکس رے لینے پڑیں گے۔"

"کیوں؟ اس کی ضرورت کیوں ہے؟"

"شبہ ہے کہ اس کے دیگر جسمانی نظام بھی متاثر ہیں" ڈاکٹر کسمساتے ہوئے بولا۔

"کیا مطلب؟ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"صورت یہ ہے جناب کہ اس کی آنتوں میں سوزش کا مرض بھی خارج از امکان نہیں۔ اس کے سینے کا بھی ایکس رے لیا جائے گا' ممکن ہے وہ السر زدہ ہو۔"

جولین' گیتا اور فرخ میرے عقب میں سمٹی ہوئی کھڑی تھیں۔ "ہمیں ٹھیک سے بتایئے گا ڈاکٹر صاحب!" یکایک جولین نے آگے آکے مداخلت کی معذرت کی اور شکایتی لہجے میں بولی "اس حادثے سے پہلے اسے کوئی مرض نہیں تھا۔ وہ تو بالکل ایک نارمل آدمی تھا۔"

ڈاکٹر سنبھل سا گیا۔ جولین اس سے انگریزی میں مخاطب تھی۔ "تب تک اس کی قوت مدافعت اچھی تھی" ایک لمحے کے توقف کے بعد ڈاکٹر نے نرمی سے جواب دیا۔

"آپ کچھ چھپا تو نہیں رہے؟" جولین سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔

"نہیں میڈم!" ڈاکٹر نے شائستگی سے کہا "سچ تو یہ ہے' ابھی صاف طور سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ آج سویرے ہم اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہمیں کسی دوسری خرابی کی طرف بھی نظر رکھنی چاہیے۔ زخم بے شک بہت گہرا تھا۔ خون بھی بہت نکل گیا تھا لیکن یہ ایسا پیچیدہ معاملہ نہیں تھا جتنا ہوتا جارہا ہے۔"

"پھر ڈاکٹر صاحب!" میری آواز ڈگمگانے لگی۔

"خدا پر بھروسا رکھیے اور یقین کیجیے' جس قدر ممکن ہے' ہم سب کررہے ہیں۔"

"مگر ڈاکٹر ڈیسائی نے پہلے اس طرف۔۔۔" جولین اضطراری نظروں سے میری طرف دیکھ کے کچھ کہتے کہتے چپ ہوگئی۔

"ڈاکٹر ڈیسائی کے پاس چارہ بھی کیا تھا۔ عام حالات میں ڈاکٹر' مریض کے مختلف معائنے کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ڈیسائی کو زخم کی رفوگری فوراً کرنی چاہیے تھی اور انہوں نے مشاقی سے یہ کام انجام دیا۔"

میں گم صم ڈاکٹر کی صورت دیکھتا رہا جولین بھی مبہوت کھڑی تھی۔ ڈاکٹر نے میرا شانہ تھپکا اور جانے کیا کیا رسمی لفظ کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

مارٹی کے کمرے میں جاتے ہوئے میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے' دبے قدموں ہم اندر داخل ہوئے۔ خون کی بوتل ابھی تک اسٹینڈ پر لٹک رہی تھی۔ دو نرسیں اندر موجود تھیں اور ایک طرف مارٹی بستر پر دراز تھا۔ ہم چاروں اس کے سامنے چپ کھڑے تھے۔ مارٹی کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ ایک دن میں وہ بالکل ہی بدل گیا تھا۔ نرسیں ہمارے قریب آگئیں اور ایک سرگوشی میں بولی "ابھی کچھ سکون ہے ورنہ رات تو۔۔۔"

وہ اپنا جملہ مکمل نہ کرسکی تھی کہ مارٹی کی پلکوں میں ارتعاش ہوا اور اس کے چہرے پر شکنیں پڑگئیں "مارٹی! مارٹی!" میں نے بہت دھیمی آواز میں اسے مخاطب کیا "یہ میں

ہوں، تمہارا۔"

اس کی آنکھیں کھل گئیں اور اس کی بے قرار پتلیاں ادھرادھر گھومتی ہوئی میرے چہرے پر آکے ٹھہر گئیں۔ جیسے وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کررہا ہو اور اس نے مجھے پہچان لیا ہو، اس کی آنکھیں ٹمٹمانے لگیں "دیکھو، دیکھو۔ کون آیا ہے، یہ فرخ، گیتا اور۔ اور جولین بھی۔"

مارٹی کے جسم میں اضطراب کی لہر اٹھی۔ اس نے اٹھنا چاہا لیکن دوسرے لمحے وہ پسپا ہوگیا۔ مجھے شبہ ہوا، انہوں نے شاید اس کا جسم باندھ دیا ہے یا اس میں کچھ بھی طاقت نہیں رہی تھی۔ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ وہی مارٹی ہے جو کم وبیش کل اسی وقت چاقو کھولے چوکڑیاں بھر رہا تھا۔ پل میں پینترا بدل لیتا تھا۔ لگتا تھا، سب جھوٹ ہے۔ کوئی موذی خواب دیدوں سے چمٹ کے رہ گیا ہے۔ فرخ اور گیتا نے لرزتے ہونٹوں سے اسے سلام کیا اور مسکرانے کی کوشش کی۔ پشیمان اور پریشان مسکراہٹ۔ مارٹی کی آنکھیں ایک ثانئے کے لیے بند ہوئی تھیں پھر کھل گئیں۔ وہ ممنونیت کا اظہار کرنا چاہتا تھا یا اپنی اذیت کا حال بیان کرنا، مگر اسے گویائی کا یارا ہی نہ تھا۔ اس کے ہونٹ سسک کے رہ گئے۔ کہتے ہیں، اپنوں کو سرہانے دیکھ کے مریض کا دل بڑھتا ہے مگر اپنے ہی ویران ہوں تو مریض تو اور ہلکان ہوجاتا ہوگا۔ مارٹی کو صبر و ہمت کی تلقین کے لیے پہلے مجھے خود کو استوار کرنا چاہیے تھا۔ چارہ گری بھی ایک ہنر ہے۔ ہر چارہ گر کو ہمیشہ اپنے آنسو چھپانے اور شگفتگی اور امید کا تاثر دینے کے دشوار مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے حالانکہ جو تسلی اور دلاسے کے سوا کچھ نہ کرسکتے ہوں، ایسے چارہ گروں کا مریض پر اثر ہی کتنا ہوتا ہوگا۔

بستر کے اس طرف کھڑی ہوئی جولین کی آواز پر میں چونک پڑا۔ وہ جولین ہی تھی۔ اس نے بکھرے ہوئے لہجے میں کہا "ہر کوئی تمہارے لیے دعا کررہا ہے۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ یہ برا وقت بھی۔۔" جولین نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

مارٹی کو کوئی شبہ تھا کہ جولین اس سے مخاطب ہے۔ وہ پلکیں پٹپٹانے لگا اور اس کی آنکھیں جلنے بجھنے لگیں۔ طمانیت، شوق، امید، حسرت دیاس کی جانے کیسی کیسی کیفیتیں ایک لمحے میں اس پر طاری ہوئیں۔ پھر گھٹا سی اس کے چہرے پر امڈ آئی۔ یقیناً اپنی ناتوانی اور محرومی کا احساس مارٹی پر غالب آگیا تھا۔ اس کے نتھنے پھول گئے، وہ بچوں کی طرح منہ بسورنے لگا۔ میرا دل بھی بھر آیا تاہم جولین کے سلسلہ جنبانی سے کچھ میری ہمت بڑھی۔ بستر پر اس کے بازو میں بیٹھ کے میں نے کہا "تم تو لڑتے ہی رہے ہو، یہ مقابلہ بھی تمہیں جیتنا ہے اور۔ اور تم ضرور جیتو گے" میری زبان نے ساتھ نہیں دیا۔ میری آواز جھرجھرا رہی تھی۔ میں نے جھک کے اس کی پیشانی چوم لی اور چادر ہٹا کے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں جکڑ لیا۔

بستر کے دوسری جانب فرخ اور گیتا نے بھی میری تقلید کی اور انہیں بھی معلوم ہوگیا کہ مارٹی کے ہاتھ تو بندھے ہوئے ہیں۔ جولین بے حس وحرکت نظریں نیچی کیے، گم کھڑی تھی۔ مارٹی کی نگاہیں بار بار اس کے چہرے پر بھٹکتی تھیں۔ آنکھیں بند کرتا اور کھولتا تھا، جیسے یقین کررہا ہو کہ جولین اس کے سامنے ہے اور خواب سے تعبیر جدا نہیں ہے خواب بجائے خود تعبیر ہے اور تعبیر بجائے خود خواب۔ مارٹی کا یہ حال دیکھ کے میرا جسم اکڑنے لگا تھا۔ اپنی کم نگاہی، غصہ، اپنی کج فہمی کی ندامت۔ مارٹی تو بہت کچھ چھپائے ہوئے تھا۔ یہ تو عالم ہی کچھ اور تھا۔ کوئی کتنا ہی کرب ونزع سے دوچار ہو مگر یہ تو تارِ نفس کی بات ہے اور ماورائے جسم معاملہ ہے۔ ہر آدمی کی استقامت بہ قدر ظرف ہوتی ہے۔ ایک طویل اندھیری رات کے بعد اپنے کسی گم گشتہ خواب کی تعبیریوں جلوہ گر ہو، کوئی یوں رگِ جاں چھیڑ دے تو آدمی بکھر ہی جائے گا۔ مارٹی کا پیمانہ چھلک رہا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں مارٹی کے بستر پر دراز ہوں۔ اس کی آنکھیں، میری آنکھیں اور اس کا چہرہ، میرا چہرہ ہے اور میری رگوں میں چنگاریاں سی لپکتی ہیں اور شگوفے سے پھوٹتے ہیں۔ میں ہواؤں میں اڑ رہا ہوں اور میرا وجود تو تار تار ہے۔

مارٹی کی لرزتی پلکیں بھیگنے لگی تھیں۔ یہ کسی آسودگی کے آنسو تھے یا بے چارگی کے یا دونوں کے۔ اس کی سینے میں رہ رہ کے تموج سا اٹھتا تھا۔ وہ کچھ کہہ نہ سکتا تو کراہنے اور کراہیں دبانے کی کوشش کرتا تو اس کا چہرہ دھواں دھواں ہوجاتا۔ نرس نے مجھے اشارہ کیا کہ اس طرح تو ہم اسے پریشان کررہے ہیں۔ دونوں نرسیں درمیان میں آگئی تھیں۔ انہوں نے مارٹی کی چادر درست کی اور پیشانی چھو کے دیکھی۔ انہوں نے زبان سے کچھ نہیں کہا لیکن ان کا مدعا ظاہر تھا۔ میں اور بیٹھا رہتا لیکن میں اکیلا نہیں تھا، اور شاید مارٹی اس آزمائش کا متحمل بھی نہیں تھا۔ میں نے اسے تسلی دی کہ میں یہیں ہوں، زورا، شامو، جگنو اور دیوا بھی۔ ڈاکٹر کیلاش بھی۔ میری نگاہ بے اختیار جولین کی طرف گئی اور میں نے مارٹی سے کہا "گھر میں سبھی تمہارے منتظر ہیں۔ تمہاری دیکھ بھال کے لیے ہر کوئی یہاں آنے کے لیے بے چین ہے" میں اور کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن جیسے کسی نے مجھے روک لیا۔

مارٹی کی پتلیاں اس کی ویران آنکھوں میں بھٹکتی رہیں اور اس کے ہونٹ پھڑکتے رہے۔

○☆○

میں نے مارٹی سے کہا تھا کہ میں کلینک میں موجود ہوں لیکن میرا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ فرخ، گیتا اور جولین کے ساتھ میں گھر واپس آگیا۔ دوپہر کو جگنو اور دیوا کھانا لینے کے لیے آئے تو ان کے چہرے نسبتاً کھلے ہوئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ مارٹی نے نہایت خاموشی سے وقت گزارا ہے اور ڈاکٹروں نے اس کے متعدد ایکسرے لیے ہیں۔ ناشتے وان لے کے وہ فوراً واپس چلے گئے۔ فرخ اور جولین نے دسترخوان پر کھانا چن دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ کھانا کھا کے میں کلینک ہی کی طرف چلا جاؤں گا اور بیشتر وقت وہیں رہوں گا لیکن کھانا کھانے کے بعد آنکھیں مچنے لگیں۔ کچھ دیر کمر ٹکانے کے ارادے سے میں اوپر کمرے میں آگیا اور ایسی آنکھ لگی کہ شام تک کچھ ہوش ہی نہ رہا۔ کسی نے مجھے جگایا بھی نہیں۔ چھ بج رہے تھے۔ دھوپ چھتوں پر چلی گئی تھی۔ منہ ہاتھ دھو کر میں جلدی جلدی نیچے آیا تو جیسے اندھیرے سے روشنی میں اور دھوپ سے سائے میں پہنچ گیا۔ فرخ کی زبانی معلوم ہوا کہ ابا جان، منیر علی اور مولوی اکرم کلینک سے خاصے مطمئن واپس آئے ہیں۔ گھر میں جگنو اور دیوا وغیرہ میں سے کوئی نہیں تھا۔ چائے پی کے میں نے ایک لمحے کی تاخیر بھی نہیں کی۔

سڑکوں پر اندھیرا اتر رہا تھا لیکن ابھی روشنیاں نہیں جلی تھیں۔ مجھے ایسی جلدی نہیں تھی۔ میں خود کو بہت ہلکا پھلکا لگ رہا تھا۔ میانہ رفتار سے میں نے راستہ طے کیا، مجھے امید تھی کہ کلینک جا کے اچھی ہی خبر سننے کو ملے گی۔

یہی ہوا، دروازے سے جگنو، شامو، زورا اور دیوا مجھے دکھائی دیے۔ ان کی چستی اور تروتازگی دیکھ کے میرا سینہ اور کشادہ ہوا۔ زورا کی آنکھیں بھی خوب چمک رہی تھیں۔ شامو نے مجھے بتایا کہ کیلاش نے ان کے لیے ایک الگ کمرے کا انتظام کردیا ہے۔ اس کے اصرار پر شامو اور زورا دوپہر کے کھانے کے بعد دو گھنٹے کے قریب سوتے رہے۔ ڈاکٹر کیلاش کا نام ان کے ورد زبان تھا۔ ان کے کہنے کے مطابق کیلاش صرف دو ڈھائی گھنٹے کے لیے صبح گھر گیا تھا۔ اتنی سی دیر میں اس نے کیا آرام کیا ہوگا۔ ساری رات وہ جاگتا رہا ہے۔ وہ بار بار مارٹی کے کمرے میں جاتا ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی دونوں ڈاکٹر اور نرسیں بھی پوری توجہ دے رہے ہیں۔ رات کو ٹھہرنے والے دونوں ڈاکٹر جا چکے ہیں۔ ان کی جگہ دوسرے آگئے ہیں۔ کیلاش ابھی تک موجود ہے۔ کیلاش اس وقت مارٹی کے کمرے میں تھا۔ میں اندر جاسکتا تھا لیکن ایک تو ڈاکٹروں کی موجودگی میں میری مداخلت نامناسب تھی، دوسرے جانے کیوں مجھے مارٹی کا سامنا کرتے ہوئے خوف آرہا تھا۔ میں باہر بیٹھا کیلاش کا انتظار کرتا رہا۔ وہ چند منٹ بعد ہی باہر آگیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کس طرح اس کا شکریہ ادا کروں۔ ہر ایک سے شکرگزاری کا اظہار نہیں کیا جاسکتا۔ اس نے میرے بازو جکڑ لیے اور کہنے لگا "کیسے ہیں آپ! معلوم ہوا، آپ لوگ صبح آئے تھے؟"

"صبح تو نہیں" میں نے مسکرا کے کہا "دوپہر اور صبح کے درمیان کہو۔ گیتا، فرخ اور جولین بھی ساتھ تھیں۔"

"میں اس وقت گھر گیا تھا" وہ معذرت کے انداز میں بولا۔

"تمہیں جانا چاہیے تھا۔"

"جانا تو کیا چاہیے تھا" وہ ترشی سے بولا "ادھر اسپتال میں ایک مریض کے سلسلے میں ہدایت دینی تھی۔ اسے ایک دوسرے ڈاکٹر کی نگرانی میں دے کے میں گھر کی طرف نکل گیا اور وہاں کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے ہی ٹھہرا ہوں گا۔"

"کوشلی کیا کہتی ہوں گی۔"

"وہ کیا کہتی، کچھ بھی کہے" اس کے لہجے میں تندی آگئی۔

"مجھے تو رما کی فکر تھی۔ سچ پوچھئے تو کوشلی کے آجانے کے بعد وہ اور اکیلی ہوگئی ہے۔ پہلے یہ حال تھا کہ کوشلی کبھی آجاتی تھی تو گھر میں چہل پہل ہوجاتی تھی۔ رما کے تو شب و روز اسی کے ساتھ گزرتے تھے۔ وہی کوشلی اب ایسی اجنبی لگتی ہے۔ رشتے بھی کیسے مشروط ہوتے ہیں۔ کچھ رما کو مطمئن کرنا تھا اور کپڑے وغیرہ بدلنے تھے، اس لیے گھر جانا پڑا۔"

"رما تو، اس کا مطلب ہے، بہت الجھ رہی ہوگی۔"

"نہیں، بالکل نہیں۔ میں نے اسے ساری بات، ساری صورت حال سمجھائی تو وہ بے چین ہوگئی۔ کہنے لگی کہ مجھے کلینک میں زیادہ سے زیادہ وقت دینا چاہیے۔ کہہ رہی تھی، کوشلی نہ آتی تو وہ بھی کلینک آکے ہاتھ بٹاتی۔ وہ بھی تو ایک ڈاکٹر ہے۔"

"ہاں ہاں، بالکل" میں نے تذبذب سے تائید کی "میرا خیال ہے، کیوں نہ رما اپنی مہمان کے ساتھ جولی اور فرخ کے پاس چلی جائیں۔ وہاں ان کا دل لگا رہے گا۔"

"کوشلی ساتھ نہ ہوتی تو میں رما سے یہی کہتا" وہ تلخی آمیز ادا سے بولا "مگر اسے ایک طرح کا احساس ملکیت

کہیے یا خود غرضی، رما سے میری بات تو نہیں ہوئی لیکن رما بھی نہیں چاہے گی کہ آپ کے گھر، ہمارے دوسرے گھر کو شلی بھی دخیل ہو۔ آپ سمجھ رہے ہیں؟"

"ہاں ہاں" میں نے بے سوچے سمجھے سرہلا دیا۔

"رشتے تو ملکیت ہوتے ہیں۔ کرشلی کو اس اثاثے کا حصے دار بنانا یا اس سے رفاقت کی کوئی نئی فضا قائم کرنا کس حد تک مناسب ہے، یہ آپ سمجھ سکتے ہیں۔ وہ وہاں جائے گی اور سب سے ملے گی تو وہ تو بالکل۔۔۔" وہ رک گیا اور جھجکتے ہوئے بولا "یہ تو حوصلہ افزائی ہے، کوئی اور وقت ہوتا تو ٹھیک تھا لیکن اب۔۔۔ اب یہی بہتر ہے کہ کوشلی جلد از جلد پونا واپس چلی جائے۔"

میں سوچتا رہا کہ کیا رائے زنی کروں۔ چند ثانیوں کے شش و پنج کے بعد میں نے پوچھا "کچھ معلوم ہوا، کوشلی کیوں آئی ہیں؟"

"کہتی ہے، وہاں پونا میں بہت منتشر تھی۔ ہوسکتا ہے، یہی کچھ ہو" وہ تنک کے بولا "مگر مقصد تو واضح ہے، اس کے سوا اور کیا۔۔۔" وہ جھنجلا سا گیا اور خفت زدہ مسکراہٹ سے بولا۔ "جانے دیجیے۔ یہ ذکر ہی تکلیف دہ ہے۔ آپ بتائیں، اس وقت تو آپ خوب تروتازہ نظر آرہے ہیں۔"

"ہاں" میں نے ہنس کے کہا "تیمار دار بھی مریض سے بندھے ہوتے ہیں۔ سنا ہے، اب اس کا حال کچھ ٹھیک ہے۔"

"یقیناً! خدا کرے ایسا ہی رہے۔"

کیلاش کی آواز میں بے ساختگی نہیں تھی "ایکس رے رپورٹ آگئی؟" میں نے بے کلی سے پوچھا۔

"ابھی نہیں لیکن ڈاکٹر بھارگو کا اندازہ ہے کہ اس کا سینہ متاثر ہے۔ السر بھی، شاید وہ۔ ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔"

"مگر اب تو، اب تو وہ سکون سے ہے۔"

"یہ ایک اچھی علامت ہے۔ یہ ہماری توقع سے زیادہ ہے۔ کاش ہمارے تمام خدشات غلط ہوں۔ مارٹی ایک عمدہ نوجوان ہے۔ بہت پیارا، سادہ اور معصوم۔ مجھے تو وہ پہلے سے پسند ہے۔ اس کی آنکھیں چمکتی رہتی ہیں اور ان میں ہمیشہ ایک تپاک ہوتا ہے گو میری اس سے بات چیت کم ہوئی ہے لیکن جب بھی وہ ملا، جی چاہا اس سے دوبارہ بھی مڈبھیڑ ہو۔ میں نے دیکھا ہے، وہ ہردم کچھ سوچتا رہتا ہے اور سامنا ہونے پر چونک پڑتا ہے۔ ابھی تو مارٹی کو دنیا دیکھنی ہے۔ اسے زندہ رہنا ہے، زندہ رہنا چاہیے۔"

"اس نے پہلے تو کبھی کسی بات کی شکایت نہیں کی۔ یہ اچانک اتنی بہت سی چیزیں۔۔۔" میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور مجھے یاد آیا، یہی بات صبح جولین نے ایک ڈاکٹر سے کہی تھی۔ اس نے جو جواب دیا تھا، وہی کچھ کیلاش نے کہا کہ اس وقت مارٹی کی قوت مدافعت بہتر تھی۔

میرے چہرے پر اٹھتا ہوا غبار دیکھ کے کیلاش مجھے سمجھانے لگا "میرا مقصد محض آپ کو حقیقت سے آگاہ کرنا ہے، کچھ اور نہیں۔ ہمیں پوری امید ہے کہ ہم اس کے بڑھتے ہوئے ممکنہ خطروں پر قابو پالیں گے۔ باقی تو وہی ایک آخری بات ہے کہ سب کچھ کسی اور کے ہاتھ میں ہے" میں چپ رہا تو وہ موضوع بدل کے بولا "کوشلی نہ ہوتی تو میں آپ سے کہتا کہ آپ گھر چلے جائیں اور کچھ وقت رما کے ساتھ گزاریں مگر ایسا ہوتا تو رما خود یہاں آجاتی۔ یقین کیجیے، وہ باربار آپ کا ذکر کرتی تھی، آپ کا حال پوچھتی تھی۔ اس نے کہا بھی تھا کہ ہوسکے تو انہیں یہاں بھیج دوں۔ میں نے منع کردیا کہ اس وقت نہ بابر بھائی آسکیں گے، نہ کوشلی کی موجودگی میں تم ڈھنگ سے ان کا ساتھ دے سکوگی۔"

ہم دونوں چند قدم دور لان میں رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے اور کیلاش نے مجھ سے پوچھا "چائے کیوں نہ پی جائے؟" میں نے انکار کیا نہ اقرار۔ اس نے کمپاؤنڈر کو آواز دے کے چائے لانے کی ہدایت کی۔ میری نگاہیں مسلسل مارٹی کے کمرے کے دروازے پر مرکوز تھیں۔ ہم نے ابھی چائے ختم نہیں کی تھی کہ ایکس رے رپورٹ آگئی۔ کیلاش مجھ سے معذرت کرکے ڈاکٹروں کے لیے مخصوص کمرے میں چلا گیا۔ میرے پاس شامو اور زورا آکے بیٹھ گئے۔ مارٹی کے کمرے میں خاموشی تھی۔ نرسیں آتی جاتی رہیں۔ کلینک کی ساری روشنیاں جلادی گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد کیلاش، ڈاکٹر شیوا کے ساتھ کمرے سے نکلا۔ اس کے ہاتھ میں وہی بڑے بڑے لفافے تھے جو ہرکارہ چند منٹ پہلے لایا تھا۔ میری طرف دیکھے بغیر شیوا اور کیلاش اوپر کی منزل کی طرف چلے گئے اور آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا۔ میرے جسم میں کانٹے اگنے لگے تھے۔ اس دوران میں دو مرتبہ میں مارٹی کے کمرے میں جھانک آیا تھا۔ وہ سکون سے تھا۔ نرسوں نے بھی ہاتھ کے اشارے سے مجھے یہی بتایا۔ کیلاش اور شیوا نیچے نہیں اترے تھے کہ سانولی رنگت کا ایک پستہ قد، بھاری بھرکم، معمر اور مستعد شخص کلینک کے دروازے پر نمودار ہوا اور سیدھا ڈاکٹروں کے کمرے میں چلا گیا۔ اس کی آمد پر شامو اور زورا کھڑے ہوگئے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ یہی ڈاکٹر بھارگو ہے۔ وہ ہماری طرف سے گزرا تو زورا، شامو، جگنو اور دیوا کے ساتھ میں نے بھی اسے سلام کیا۔ اس نے سر کی خفیف جنبش سے جواب دیا اور اوپری منزل جانے والی سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ وہ چاروں سراسیمہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگے تاہم ڈاکٹر بھارگو جلد ہی نیچے آگیا۔ اس کے پیچھے کیلاش بھی تھا۔ اس بار کیلاش میری طرف دیکھنا نہیں بھولا اور آنکھوں آنکھوں میں تحمل کی تلقین کرتا ہوا ڈاکٹر بھارگو کے ساتھ مارٹی کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ پھر ڈاکٹر بھارگو کو کلینک کے دروازے پر رخصت کرکے ہی وہ میرے پاس آیا اور میرے کسی استفسار سے پہلے اس نے پژمردگی سے بتایا "ڈاکٹر بھارگو کا اندازہ درست تھا۔"

میری آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے" وہ جلدی سے بولا "شکر ہے، دونوں امراض درجے کے اعتبار سے ابتدائی مرحلے میں ہیں۔ ان پر قابو پایا جاسکتا ہے" اس کی آواز الجھ گئی، کہنے لگا "ایکس رے کے علاوہ ہم نے رطوبت اور دیگر چیزیں بھی ٹیسٹ کے لیے بھیجی تھیں۔ ان کی رپورٹ ذرا دیر سے آتی ہے لیکن ڈاکٹر بھارگو کی ہدایت پر تمام کام نہایت عجلت سے کیے گئے۔ احتیاطاً ہم نے پہلے جو دوائیں تجویز کی تھیں، وہی جاری رہیں گی۔ ڈاکٹر بھارگو نے البتہ چند دواؤں کا اور اضافہ کیا ہے۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ مارٹی سکون سے ہے حالانکہ ہم نے خواب آور دواؤں کی مقدار کم کردی تھی، آگے اور کم کرکے دیکھیں گے۔ جیسا کہ میں نے آپ سے کہا تھا، ڈاکٹر بھارگو کی رائے بھی یہی ہے کہ مارٹی کا اعصابی سکون توقع سے کہیں سوا ہے اور بہت خوش آئند ہے۔"

مجھے ایسا لگا جیسے میں کوئی بچہ ہوں جسے کیلاش بہلا رہا ہے۔ میں نے اس سے جرح نہیں کی۔ جرح کا محل بھی کیا تھا۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔ رات کے کھانے کا انتظام شیوا کی طرف سے کیا گیا تھا۔ ٹھیک نو بجے جگنو اور دیوا بھی گھر سے کھانا لے آئے، اور اتنا کھانا ہوگیا کہ کیلاش، شیوا، دونوں ڈاکٹرز، نرسیں اور ہم پانچوں کے بعد بھی بچ رہا۔ میرا ارادہ تھا کہ ساری رات کلینک میں رہوں گا۔ کیلاش ہے تو مجھے بھی وہیں ٹھہرنا چاہیے لیکن گزشتہ رات کے طرح گیارہ بجے سے اس نے مجھے ٹوکنا شروع کردیا۔ اس عرصے میں مارٹی کے کمرے سے کوئی آہ اور کراہ بلند نہیں ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ کیلاش اور شیوا کے چہروں پر طمانیت کے آثار نمایاں ہورہے تھے۔ میں یہ سوچ کے پھر اٹھ گیا کہ کیلاش کا ساتھ میں اتنا نہیں دے سکوں گا جتنا میری موجودگی اس کا دھیان بٹائے رہے گی۔ بہتر ہے کہ اس کی ساری توجہ مارٹی پر مرکوز رہے۔

زورا نے پھر گھر جانے سے انکار کردیا۔ دیوا کو اس کی دسراہٹ کے لیے چھوڑ کے، ایک بجے کے قریب میں، شامو اور جگنو کے ساتھ گھر چلا آیا۔ ساری رات ایسے ہی کٹ گئی، کبھی آنکھ لگ جاتی، کبھی کھل جاتی۔ جگنو اور شامو کا بھی یہی حال تھا۔ صبح میں جلدی گھر سے نکل جاتا لیکن مجھے بتائے بغیر شامو منہ اندھیرے کلینک ہو آیا تھا۔ پھر صبح ہونے پر ابا جان اور منیر علی بھی وہاں گئے اور تمتماتے چہروں سے واپس آئے۔ جیسے مجھے کوئی شبہ تھا اور تبھی یقین آیا جب میں نے خود کلینک جاکے تصدیق کرلی۔ مارٹی، اس وقت سو رہا تھا۔ اسے جگانے کے بجائے میں دبے قدموں کمرے سے لوٹ آیا۔ کیلاش وہاں نہیں تھا لیکن شیوا موجود تھا۔ اس کے لہجے کے اعتماد اور اطمینان سے میں نے خود کو اور توانا محسوس کیا۔ گھر سے چلتے وقت ابا جان نے ایک ایسا کام میرے سپرد کردیا تھا جو مجھے بالکل نہیں آتا تھا مگر دوسرے اور کام بھی مجھے کتنے آتے تھے۔ ابا جان کے حکم کی تعمیل میں مجھے آدھے گھنٹے کے اندر گھر واپس آنا پڑا۔ میں جانتا تھا، ابا جان کا مقصد محض مجھے مصروف رکھنا ہے۔ عمارت کے عقبی حصے میں دیگیں چڑھی ہوئی تھیں۔ ابا جان کی ہدایت تھی کہ جیسے ہی کھانا تیار ہوجائے، میں دیگیں یتیم خانوں اور جھونپڑیوں کے علاقے میں پہنچانے کے کام کی نگرانی کرتا رہوں۔ سارے انتظامات موجود تھے۔ مولوی اکرم کے علاوہ وہاں پہلے سے کئی لوگ دیکھ بھال کررہے تھے۔ میں تو بس کھڑا دیکھتا رہا۔

بٹھل کو گئے دو دن ہوچکے تھے۔ آج یا کل کسی وقت اس کی واپسی کا امکان تھا۔ اچھا یہی تھا کہ وہ جلد از جلد واپس آجائے۔ بٹھل کو سرہانے دیکھ کے مارٹی کو اور تقویت ہوسکتی تھی۔ میں نے دوپہر کا کھانا سب کے ساتھ گھر ہی میں کھایا۔ کھانے کے بعد چمپا بیگم مُصلّے پر بیٹھ گئی اور فرخ، فریال، فارہہ، شہ پارہ اور ریحانہ آیت کریمہ کا ورد کرتی رہیں، اکبر بھی ان کے ساتھ تھا۔ اتنے بہت سے لوگ مارٹی کے لیے دعا کررہے تھے۔ فرخ، فریال، ریحانہ اور اکبر نے تو کبھی کسی کو نقصان پہنچایا بھی ہوگا تو نادانستگی میں پہنچایا ہوگا۔ خدا کو ان کی صدا ضرور سننی چاہیے تھی۔

شام تک میں گھر ہی رہا۔ دوپہر کو جگنو اور دیوا کھانے کے لیے آئے تھے تو مارٹی کا حال بتا گئے تھے اور چراغوں کی لو تیز کرگئے تھے۔ جگنو کی زبان نسبتاً خوب چلتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی تگ ودو میں تھے کہ کون پہلے نوید سنائے۔ جگنو ہی غالب رہا۔ ہانپتی ہوئی آواز

میں اس نے بتایا کہ مارٹی کافی دیر سے ہوش میں ہے اور آرام سے ہے۔ کہنے لگا کہ کوئی گھنٹے بھر پہلے ڈاکٹر بھارگوا سے دیکھ کے گیا ہے۔ ڈاکٹر کے بت جیسے چہرے سے کچھ اندازہ ہی نہیں ہو پاتا تھا کہ مریض کی کیفیت کیا ہے لیکن آج وہ بھی کچھ مختلف دکھائی دے رہا تھا۔ برآمدے میں ڈاکٹر کیلاش' شیوا اور ان کے ساتھی ڈاکٹروں سے دیر تک باتیں کرتا رہا۔ اس نے ان کے ساتھ چائے بھی پی۔

سہ پہر کو پھر میں اوپر کے کمرے میں چلا گیا اور اس مسافر کے مانند مجھے ٹوٹ کے نیند آئی جسے دور کہیں منزل کا نشان نظر آگیا ہو اور وہ تازہ دی کے لیے کسی چھاؤں میں بیٹھ جائے۔ شام کو جب اندھیرا پھیل گیا' تب میری آنکھ کھلی۔ میں اٹھ کے نیچے آیا تو ملاقاتی کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ یہ کمرا عموماً مرد مہمانوں کے لیے مخصوص تھا مگر جب سے مارٹی اسپتال گیا تھا' وہ سب زیادہ تر یہیں بیٹھی رہتی تھیں۔ میں اندر چلا گیا اور تقریباً وہ سبھی مجھے ایک دوسرے کمرے میں مل گئیں۔ باہر سے ان کی چہکتی چہکتی آوازیں آرہی تھیں۔ میں مارٹی کی خیر خبر کی جستجو میں ادھر آیا تھا لیکن اب کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں وہاں سے لوٹ جاتا لیکن میرے قدم غیر ارادی طور پر دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ انہیں اپنی آمد کی اطلاع دینے کے لیے فرخ کو پکارتا ہوا میں کمرے میں داخل ہوا تو سب نے مجھے گھیر لیا۔ فرخ کہنے لگی کہ میری عمر بہت بڑی ہے۔ وہ میرا ہی ذکر کر رہی تھیں۔ میں نے شگفتگی سے کہا "میری برائیاں کی ہوں گی" وہ کھل کھلا پڑیں اور فرخ ناز بردارانہ لہجے بولی کہ مارٹی کے گھر آجانے پر کیوں نہ سب کہیں دور کسی پہاڑی مقام پر چلیں۔

فرخ کے لہجے میں ناز و اشتیاق بھی تھا' حسرت و یاس بھی اور تکان بھی شامل تھی۔ اپنی سکت سے زیادہ کوئی کتنا دیکھ اور سن سکتا ہے۔ وہ تو مسلسل تماشے دیکھتی رہی تھیں اور خود تماشا بنی رہی تھیں۔ میرے گھر سے اچانک غائب ہوجانے کے صدمے سے وہ کسی قدر سنبھلی ہوں گی کہ امی جدا ہوگئیں۔ آبائی گھر چھوٹا اور ابا جان ایک شہر سے دوسرے شہر' آج یہاں کل وہاں' خانہ بدوشوں کی طرح انہیں گھمائے پھرتے رہے۔ فہمیدہ روٹھ گئی' جہانگیر' بچھڑ گیا اور ابا جان ایک اجنبی گھر انہیں چھوڑ کے ایسے سفر پر روانہ ہوگئے جہاں سے واپسی قسمت کی یاوری کے بغیر ممکن نہ تھی۔ جانے کتنی منتوں مرادوں کے بعد انہیں ایک ساتھ کئی خوشیاں نصیب ہوئی تھیں' ابا جان کی واپسی' میری بازیابی اور جہاں گیر کے مل جانے کا مژدہ۔ انہوں نے جانا ہوگا کہ اندھیری رات اب ختم ہوگئی۔ خدا نے ان کی سن لی ہے مگر انہیں کتنے دن فرصت ملی تھی۔ کانتے' پیرو اور اب مارٹی۔۔۔ وہ تو مسلسل جلتی بجھتی رہی تھیں۔ سفر تو وقت سے کم' فاصلوں سے کم' راستوں سے زیادہ عبارت ہے۔ کس کے ساتھ راستے کس طرح پیش آئے۔ ابا جان کے لعل و جواہر سے لدے ہوئے صندوق کیا کیا تلافیاں کرسکتے تھے اور مجھ پر تو ان کے بہت سے قرض تھے۔ ساری عمر چکاؤں تو ادا نہ ہوسکیں۔ سب سے زیادہ خود غرضی تو میں نے کی تھی۔ میں انہیں چھوڑ کے چلا گیا تھا۔ اس رات کسی مجرم کے مانند میں گھر سے یوں فرار نہ ہوتا تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ یہ محل جیسا عظیم الشان گھر' ان کے اپنے گھر کا بدل نہیں تھا۔ اس میں امی نہیں تھیں' فہمیدہ نہیں تھی اور بھی بہت کچھ نہیں تھا۔ انہیں کون بتاتا کہ جب بھی وہ میرے سامنے آتی ہیں' میرے سینے میں کیسی ہوک اٹھنے لگتی ہے۔

جتنا فرخ نے ناز و شوق سے کہا تھا' اتنی شدت سے میں نے تائید کی "ہاں ہاں' کیوں نہیں۔ ضرور چلیں گے مگر کہاں؟"

"یہ تو آپ طے کریں" وہ مچل کے بولی۔

"کشمیر چلیں؟" میں نے پوچھا۔

"کہیں بھی۔" فرخ جھجکتے ہوئے بولی۔

"لوگ کہتے ہیں۔ کشمیر تو کوئی گوشۂ فردوس ہے۔"

"خدا کرے' مارٹی بھائی جلدی گھر آجائیں۔" فارہہ نے دعائیہ لہجے میں کہا۔ "ہم انہیں بھی لے چلیں گے۔"

"چلیں گے تو سبھی چلیں گے" فرخ تیزی سے حتمی انداز میں بولی۔

"کشمیر کا تو موسم ہوتا ہے" یکایک جولین نے چپکے سے کہا۔

میری نظر کئی بار جولین کے چہرے پر گئی تھی۔ وہ اتنی دیر سے بالکل چپ بیٹھی تھی جیسے کوئی خواب کی باتیں سن کے مسکراتا ہے یا خیالی پلاؤ سن کے۔ جولین کی زیر لب مسکراہٹ سے مجھے کچھ اسی تاثر کا گمان ہوا اور پشیمانی سی ہوئی۔ میں نے کہا "کشمیر تو ہر موسم میں کشمیر ہے۔ برف کا بھی اپنا ایک لطف ہے۔ بہت سے لوگ تو بطور خاص برف باری کے موسم میں جاتے ہیں۔"

جولین کو شاید میرے لہجے کی تندی محسوس ہوگئی تھی جبھی اس نے نظریں جھکالیں۔ فریال کہنے لگی کہ اتنے لوگ ٹھہریں گے کہاں؟ ہوٹل یا سرائے کے بجائے کچھ دن کے لیے کوئی گھر مل جائے تو بہت اچھا ہو۔"

میں نے انہیں بتایا "وہاں کشتیوں میں بھی گھر ہوتے ہیں' بڑے بڑے سجے سجائے گھر۔ انہیں ہاؤس بوٹ کہا جاتا ہے۔"

"سنا ہے' ان کشتی گھروں میں دنیا کی ہر چیز موجود ہوتی ہے۔ بالکل چھوٹے موٹے جہازوں کی طرح ہوتے ہیں" شہ رہ چہکتی آواز میں بولی۔

"پھر تو مہنگے بھی زیادہ ہوتے ہوں گے" مولوی اکرم کی بی ریحانہ نے دیدے پٹ پٹاتے ہوئے کہا۔

"دیکھنا؟ ابا جان ایسا ہی کوئی گھر لے لیں گے" اکبر وثوق سے بولا۔

میرے جی میں آیا' کہوں کہ ابا جان کی کیا بات ہے' وہ تو کچھ بھی حاصل کرسکتے ہیں۔ کشتی کیا' پورا جہاز خرید لیں۔ وہ تو ساری جھیل' سارا دریا خرید سکتے ہیں۔ وہ طرح طرح خیال آرائیاں کرتیں' منصوبے باندھتی رہیں۔ جیسے کل ہی فرو رپیش ہو۔ اتنی دیر میں گیتا اندر جاکے چائے کا طشت لے آئی۔ گیتا اب بہت سنبھلی ہوئی' ٹھہری ہوئی لگتی تھی۔ اسے اس طرح گھر میں شامل دیکھ کے مجھے بہت اچھا لگا۔ چائے کے ساتھ پاپڑ بھی تھے۔ چائے پی کے میں ملاقاتی کمرے میں آگیا۔ جولین نے مجھ سے کہا تھا کہ بہتر ہے' میں کپڑے بدل کے ہی کہیں باہر جاؤں۔ وہ اس قسم کی ہدایتیں دیتی رہتی تھی۔ میرے کپڑے خاصے اجلے تھے مگر سونے کی وجہ سے مل مل کے مکلف کرتے پر جابہ جا شکنیں پڑگئی تھیں۔ ملاقاتی کمرے میں مجھے آئے چند منٹ ہوئے ہوں گے' جولین نئے کپڑے لے کر آگئی۔ دوسرے ملحق کمرے میں جاکے میں نے لباس تبدیل کیا اور کنگھا کرکے دوبارہ ملاقاتی کمرے میں آیا تو وہ وہیں موجود تھی۔ میں ٹھہر گیا "کلینک جارہے ہو؟" اس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"ہاں" میں نے مختصر جواب دیا۔

"تمہاری کچھ ڈاک آئی ہے۔"

"ڈاک!" میں نے حیرت سے کہا "میری ڈاک؟"

"خط تو تمہارے ہی نام ہیں۔"

"کس کے خط ہیں؟"

"نہیں معلوم' میں نے کھول کے نہیں دیکھے۔"

مجھے بے چینی ہونے لگی "مگر کب' کب آئے یہ؟"

"پرسوں' جب ہم لوگ پرانے گھر گئے تھے۔"

"پرسوں آئے تھے" میں نے الجھ کے کہا "مگر تم نے کوئی ذکر نہیں کیا۔"

"تم گھرے ہوئے اتنے تھے کہ۔۔۔"

میں نے جھپٹنے انداز میں اس کے ہاتھ سے خط لے لیے۔ وہ دو لفافے تھے۔ ایک مٹیالا' دوسرا نیلے رنگ کا۔ دونوں پر میرا نام اور جولین کے گھر کا پتا لکھا تھا۔ جانے کیوں میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے اوپر والا لفافہ جلدی سے چاک کیا۔ اندر نیلے دبیز کاغذ کا رقعہ تھا' دونوں طرف لکھا ہوا۔

"کس کا خط ہے؟" جولین نے تجسس سے پوچھا۔

"فیض آباد سے آیا ہے" میں نے گہری سانس بھر کے کہا۔ "اور بٹھل بھائی کے لیے ہے۔"

"زریں بہن کا خط ہے۔" وہ دمکتی آواز میں بولی "مگر لفافے پر تو تمہارا نام لکھا ہے' کیا لکھا ہے؟"

میری مضطرب نظریں رقعے پر منڈلاتی رہیں اور چند لمحوں میں' میں نے سارا رقعہ پڑھ لیا۔ وہ زریں کی تحریر تھی۔ ایک ایک لفظ ترشا ہوا اور اٹھلاتا ہوا سا۔ زریں کا سراپا میری آنکھوں میں مجسم ہوگیا جیسے وہ کسی شہزادی کے مانند اپنا مخصوص سفید لباس پہنے سامنے کھڑی ہو۔ سفید اور ہلکے رنگوں سے اسے خاص مناسبت ہے۔

اس نے بٹھل کو' اپنے باوا کو مخاطب کیا تھا اور تسلیم و تعظیم کے بعد شکایت کی تھی کہ اتنے دنوں سے کسی کا خط نہیں آیا۔ منیر علی کے خط پابندی سے ملتے رہے تھے لیکن یہ پندرھواں دن ہے۔ انہوں نے بھی خاموشی اختیار کرلی ہے۔ میرے سوا زریں نے نام بہ نام سب کو سلام لکھا تھا اور لکھا تھا' کاش میں بھی بمبئی میں ہوتی تو شاید ان کے کسی کام آسکتی۔ کچھ اور نہیں تو ان کی دل جوئی کی کوشش تو کرسکتی تھی۔ اپنی عادت کے مطابق زریں نے اپنے بارے میں کچھ نہیں لکھا تھا۔ حویلی کا ذکر بھی سرسری طور پر کیا تھا۔ مجھے اندازہ تھا' کوئی ایسی ویسی بات ہوگی بھی تو اس نے سفر میں بٹھل کے پریشان ہوجانے کے خیال سے اپنے آپ تک محدود رکھی ہوگی۔ اپنے حصار میں رہنے میں اسے کمال حاصل ہے۔ جہانگیر کے لیے اس نے لکھا تھا کہ اپنی بہنوں اور بھائی سے ملنے کی بے قراری کے باوجود' شکر ہے' وہ اپنی تعلیم پر پوری توجہ دے رہا ہے۔ نیساں بہت سنجیدہ ہوگئی ہے۔ اسے پڑھانے کے لیے ایک اور استاد کا اضافہ کردیا گیا ہے۔ نیساں اور جہاں گیر میں شوق علم کا جیسے کوئی مقابلہ ہورہا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو زچ کردینے کے درپے ہیں۔ سرجھکائے جس طرح کوئی شکوہ سنجی کرے' زریں نے دبے دبے لہجے میں بٹھل سے مطالبہ کیا تھا کہ گھر میں کسی بڑے کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ بٹھل کے آنے میں کچھ دیر

ہے تو کم از کم منیر علی کو فیض آباد بھیج دیا جائے۔ ان کی بیٹیاں زہرہ اور سلمیٰ' بیٹا مجو اور بھانجا ارشد زبان سے کچھ نہیں کہتے تو کیا ہوا' محسوس تو کیا جاسکتا ہے' انہیں منیر علی کا انتظار ہے' ہونا بھی چاہیے۔ یہ نیا ماحول اور نیا گھر ان کے لیے بالکل اجنبی نہیں رہا ہے۔ بہ ظاہر وہ سب بہت خوش و خرم نظر آتے ہیں لیکن منیر علی کی طویل غیر حاضری انہیں دلگیر کرسکتی ہے۔ اس نے لکھا تھا' میں اپنی طرف سے پوری کوشش کرتی ہوں لیکن ہر دم یہ احساس فکر مند کیے رہتا ہے کہ کوئی چوک نہ ہوجائے۔ انہیں زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔ ادھر زمینوں کے کئی کام بھی منیر علی کے نہ ہونے کی وجہ سے ادھورے پڑے ہیں۔ زریں نے خانم کے بارے میں پوچھا تھا کہ آخر خانم کے واپس آنے میں اب اور کتنی مدت رہ گئی ہے۔ یقیناً منیر علی نے ابا جان کے نو خرید محل کا قصیدہ بھی لکھا ہوگا' جبھی زریں نے اسے دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا تھا۔ اس نے الگ سے جولین کا ذکر کیا تھا اور بٹھل کو تاکید کی تھی کہ وہ جولین کو فیض آباد ضرور ساتھ لائے۔

آخر میں زریں نے لکھا تھا کہ بٹھل کی فرمائش پر اس نے کان پور سے پیٹے کا اچار اور چوک لکھنؤ سے حقے کا درجہ اول تمباکو منگوایا تھا۔ سنا ہے' بلاقی کا یہ تمباکو دور دور تک مشہور ہے۔ اچار تو اب کسیانے لگا ہے' بارشوں کی وجہ سے۔ اس مرتبہ مسلسل بارشیں ہوتی رہیں۔ پھول پھلواری خوب آئی۔ لکھا تھا کہ صحن کی کیاریوں میں اس نے گلاب کے پودے لگائے تھے' ان میں رنگ برنگے پھول کھل رہے ہیں۔ بعض تو بالشت بھر کے ہیں۔ رات کی رانی بھی خوب کھلی ہوئی ہے' رات بھر ساری حویلی مہکائے رکھتی ہے۔

ایک بار پڑھنے کے بعد میری سیری نہیں ہوئی۔ جس طرح ٹھہر ٹھہر کے اس نے ساری باتیں لکھی تھیں' مجھے بھی اسی طرح پڑھنا چاہیے تھا۔ اس کی تحریر اس کی تصویر تھی۔ نرم و نازک' شستہ و شائستہ۔ یوں تو لفظ سبھی کو آتے ہیں' کسی کو کم' کسی کو زیادہ لیکن یہ کیا ہے کہ کسی کے لفظوں سے رس ٹپکتا ہے' خوش بو پھیل جاتی ہے' روشنی سی بکھر جاتی ہے اور کبھی یہی لفظ رگ و پے میں زہر بھر دیتے ہیں' آگ سی لگا دیتے ہیں۔ کہتے ہیں لفظوں کا ہنر اپنی جگہ' انہیں برتنے کا سلیقہ ہی اصل ہنر ہے مگر یہ تبھی کارگر ہوتا ہے جب اظہار' ظاہر و باطن کی ضد نہ ہو۔ ورنہ لفظ تو پتھر ہیں' چاہے کتنے ہی ترشے ہوئے ہوں' کتنے ہی سجے ہوئے ہوں۔ لفظوں کی ترکیب و ترتیب تو احساس کی پابند ہے۔ دل کا حال رقم کرتے ہوئے ہنر کی اتنی ضرورت نہیں پڑتی۔ لفظ تو خود سانچے وضع کرلیتے ہیں۔ زریں کا خط مختلف کیفیات کا آمیزہ تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے ابھی کچھ پڑھنے اور اخذ کرنے سے رہ گیا ہے' سو میں نے خط دوبارہ پڑھا اور گرد و پیش سے ایسا غافل ہوا کہ کمرے میں مجھے جولین کی موجودگی کا بھی خیال نہ رہا۔ اس نے مجھے ٹوکا تو میں چونک پڑا "کیا بات ہے' خیریت تو ہے نا؟" جولین نے بے تابانہ پوچھا۔

"ہاں ہاں" میں نے کئی پھٹی آواز میں کہا "سب ٹھیک ہے۔"

"کیا لکھا ہے' زری نے؟"

"تم خود دیکھ لو" میں نے رقعہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"تم تو کچھ کھوسے گئے تھے" وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

"ہاں!" میں نے بوجھل آواز میں کہا "بس ایسے ہی ساری حویلی نظروں میں گھوم گئی' تمہارے بارے میں بھی اس نے کچھ لکھا ہے؟"

"میرے بارے میں؟" وہ مضطرب ہو کے بولی "کیا لکھا ہے؟"

"لکھا ہے کہ تم سے ملنے کی اسے بہت آرزو ہے۔"

"مجھے بھی" جولین نے بے ساختہ کہا "اس کی آواز تمتمانے لگی" میں نے زریں کے بارے میں اتنی باتیں سنی ہیں کہ ایک تصویر سی ذہن میں اس کی بن گئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس تصویر سے بھی اچھی ہوگی۔"

"وہ بہت عجیب ہے" میں نے آنکھیں میچ کے کہا "آدمی اپنے وصف سے ممتاز ہوتا ہے۔ آدمی' آدمی کا فرق ہی یہ ہے کہ کون کتنا بڑا درخت' کتنا بڑا سایہ اور کتنا بڑا آشیانہ ہے۔ میں نے کہیں سنا تھا کہ آدمی مظاہر فطرت کی طرح ہوتے ہیں' درخت' ہوا' پانی' بادل وغیرہ کی طرح۔ زریں کسی درخت کی مثال ہے جو اپنی جگہ قائم ہے اور سایہ بخشا رہتا ہے جو اپنی جگہ سے تبھی ہٹتا ہے جب اسے کاٹ دیا جائے۔ کچھ لوگ بادل ہوتے ہیں' کچھ ہوا کے مانند اور کچھ پانی کی طرح۔ رواں' ٹھہرے ہوئے' دریا' جھیل' سمندر کی طرح۔ اور دیکھا جائے تو زریں پانی کے مانند بھی ہے۔"

"تم نے کتنی اچھی بات کہی ہے۔"

"میں نے نہیں' سچ پوچھو تو مجھ سے وضاحت ہی نہیں ہوپائی۔ مجھے یاد آیا' وہ ایک پروفیسر تھا جس سے قتل ہوگیا تھا۔ جیل میں اس نے مجھ سے ایسا کچھ کہا تھا۔ شاید زریں اس کی مناسب مثال ہے اور وضاحت بھی۔"

"یقیناً" جولین نے انگریزی میں کہا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ کہنے لگی "کانتے بھائی بھی زریں کے لیے یہی کچھ کہتے تھے۔ کہتے تھے' جولی! تم نے زریں کو نہیں دیکھا' اس کے سر پہ بس ایک تاج کی کمی ہے۔ کئی بار میں نے ارادہ کیا کہ خود فیض آباد چلی جاؤں لیکن موقع ہی نہیں آیا۔"

"اب سب چلیں گے" میں نے سر جھٹک کے کہا "کیسی بات ہے' ہم ابھی کشمیر جانے کی باتیں کررہے تھے۔ کسی کو خیال ہی نہیں رہا کہ پہلے تو سب کو فیض آباد چلنا چاہیے۔"

"مجھے یاد تھا لیکن میں چپ بیٹھی رہی۔"

"کیا زریں کے بغیر کشمیر چلیں گے؟" میں نے تنک کے کہا۔

"میں یہی سوچتی تھی کہ تم نے زریں کا نام کیوں نہیں لیا؟"

"بس ایسے ہی" میں نے خجالت سے کہا "کچھ دھیان ہی نہیں رہا۔"

"تمہیں حویلی بہت یاد آتی ہے؟" وہ تجسس آمیز لہجے میں بولی۔

"حویلی کیا!" میں نے بکھری ہوئی آواز میں کہا "اس دن کوئی کہہ رہا تھا کہ مکان تو مکینوں سے ہوتے ہیں۔"

"میری مراد بھی یہی ہے۔"

مجھ سے کچھ نہ کہا جاسکا۔

"زریں نے تمہارے بارے میں کیا لکھا ہے۔"

"کچھ بھی نہیں۔"

"اس سے پہلے کہ میں کوئی جرات کرتا" جولین تیزی سے بولی "اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ تمہارا نام لفافے پر لکھا ہے تو ظاہر ہے' تم ہی اس کے مخاطب ہو۔"

"یہ بھی ایک رعایت ہے' سبھی ایسی رعایتیں مجھے دیتے ہیں۔"

"ایسا کیوں کہتے ہیں" وہ کسی قدر ترشی سے بولی اور معاً اس نے پٹ پٹاتی پلکوں سے میرے ہاتھ میں دبے ہوئے دوسرے لفافے کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں ہاں" میں نے اضطراری انداز میں کہا۔ زریں کے ذکر میں' یہ دوسرا لفافہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔

میں نے دھڑکتے ہاتھوں سے اسے چاک کیا۔ سفید کاغذ پر وہ چند سطری تحریر تھی' شکستہ خط میں لکھی ہوئی۔ میرے دل کی حرکت معدوم ہونے لگی۔ میری نظر پہلے نواب ثروت یار کے نام پر گئی۔ متن پڑھتے ہوئے میری آنکھوں میں دھند اتر آئی۔ رسمی سلام و دعا کے بعد لکھا تھا۔

"جس مقصد کے لیے آپ نے غریب خانے پر آنے کی زحمت فرمائی تھی' اس بارے میں اب اس کی کوئی صورت نکلی ہے۔

مناسب ہوگا' اگر آپ فی الفور حیدر آباد تشریف لائیں' نیاز مند۔"

میرا سارا جسم منجمد ہوگیا اور مساموں سے پسینہ پھوٹنے لگا۔ جولین صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کیا بات ہے؟" اس نے بے قراری سے پوچھا۔

میری پھٹی ہوئی آنکھیں رقعے پر جمی ہوئی تھیں اور مجھے چکر سا آرہا تھا۔ جولین نے رقعہ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ اس نے کرشنا جی کی موت کے بعد باقاعدہ اردو پڑھنی شروع کی تھی اور اسے اچھی اردو آگئی تھی لیکن نواب کا خط شکستہ تحریر میں تھا' اسے دشواری ہوئی۔ میں نے لڑکھڑاتی زبان سے خط کا متن اسے بتانے کی کوشش کی۔ وہ بھی گنگ ہوگئی' پھر منتشر لہجے میں بولی "تمہیں جانا چاہیے' تمہیں فوراً جانا چاہیے۔"

"کب' کب ملا تھا تمہیں یہ خط؟" میں نے گھٹی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"پرسوں کی بات ہے' پرسوں ہی تو ہم لوگ گھر گئے تھے۔"

"اور' اور وہاں کب آیا تھا؟"

"اسی روز' میں نے خود پوسٹ مین سے لیا تھا۔ البتہ زری بہن کا خط ایک روز پہلے آیا تھا۔ زری کا خط مجھے نوکرانی نے دیا تھا۔ اگر ہم وہاں اس دن نہ پہنچ پاتے تو دونوں خط وہ دوسرے دن یہاں بھیج دیتی' اسے یہی ہدایت کی گئی ہے۔ میں نے خط اس لیے تمہیں نہیں دیے کہ کوئی بات ہوئی تو تم اور پریشان ہوجاؤ گے' یہی ہوا لیکن مجھے افسوس ہے' مجھے یہ خط اسی روز تمہیں دے دینے چاہییے تھے۔"

میرا دماغ کام نہیں کررہا تھا۔ میں بت کی طرح کھڑا رہا۔

"مگر کیا' کیا تم مارٹی کو اس حالت میں چھوڑ کے کہیں جاسکتے ہو؟" وہ بے ترتیبی سے بولی "شاید نہیں لیکن اب' اب غالباً یہ صحیح وقت ہے۔ اب تم جاسکتے ہو۔"

"میں اب بھی کیسے جاسکتا ہوں" میں نے ناتوانی سے کہا۔

"اب خدا کا شکر ہے' اس کی حالت بہتر ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر۔"

"میرا خیال ہے' تمہیں کلینک جاکے دیکھنا چاہیے اور کیلاش سے مشورہ کرنا چاہیے۔"

"کس بات کا مشورہ؟" میں نے بدحواسی سے کہا۔

"مشورے سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمہیں اس سے کوئی اجازت لینی ہے یا رائے مانگنی ہے۔ تمہیں اس سے کچھ نہیں کہنا۔ صرف مارٹی کی حالت کے بارے میں تسلی کرنا ہے' اور کچھ نہیں۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔"

"میں جانتی ہوں لیکن تمہیں خود کو تھامے رکھنا ہے۔ اپنے حوصلے ہی سے تم کسی بہتر نتیجے تک پہنچ سکتے ہو۔ تم ابھی کلینک جاؤ۔ میں موٹر کے لیے کہتی ہوں۔"

میرے ہونٹ پھڑپھڑا کے رہ گئے۔ میں اس سے اتنا بھی نہ کہہ سکا کہ موٹر کی ضرورت نہیں ہے۔ جولین باہر چلی گئی اور فوراً واپس آگئی "موٹر تو تیار کھڑی ہے" اس نے کہا "تم کہو تو میں بھی ساتھ چلوں۔"

"ٹھیک ہے" میں نے یوں ہی سر ہلا دیا۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ یہ اس وقت کلینک جاکے کیا کرے گی۔ سو میں نے اسے منع کردیا۔ مجھ سے چلا بھی نہیں جارہا تھا۔ ملاقاتی کمرے سے راہ داری کا راستہ میں نے جانے کس طرح طے کیا اور جانے کتنی دیر میں موٹر نے مجھے کلینک پہنچادیا۔ دروازے میں داخل ہونے سے پہلے میں نے اپنے حواس مجتمع کرنے کی کوشش کی۔ مجھے دیکھتے ہی زورا' شامو' جگنو اور دیوا میرے گرد اکٹھے ہوگئے۔ کیلاش بھی ان میں شامل تھا' ان کی چستی اور مستعدی سے مارٹی کے حال کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔ کیلاش بھی بہت ہشاش بشاش نظر آرہا تھا۔ تاہم میں نے خود کمرے میں جاکے مارٹی کو دیکھا۔ وہ آنکھیں موندے پرسکون حالت میں لیٹا ہوا تھا۔ میری آہٹ پر اس کی پلکوں میں جنبش نہیں ہوئی۔ میں نے کئی بار سوچا کہ اسے آواز دوں اور ممکن ہو تو اسے بتاؤں کہ چند دنوں کے لیے میں اس سے دور جارہا ہوں۔ اسے بہت کچھ معلوم ہے۔ سفر کی نوعیت جان کے وہ مجھے اجازت دینے میں ایک لمحے کا توقف نہیں کرے گا مگر میں اس کے بستر کے سرہانے کھڑا سوچتا رہا اور ایسے ہی چلا آیا۔ میرے جسم میں جیسے جان ہی نہیں رہی تھی۔ یکایک زور زور سے میرا دل دھڑکنے لگتا تھا اور ایسا لگتا جیسے کچھ اور وقت نکل گیا تو جانے کیا ہوجائے۔ مارٹی کے کمرے سے نکل کے میں صحن میں رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کیلاش بھی کچھ دیر میں میرے پاس آگیا اور میرے پوچھے بغیر اس نے بتایا "ڈاکٹر بھارگو کا کہنا ہے' یہ رات اور خیریت سے گزر جائے تو اس کے لیے بہت اچھا ہوگا۔"

میں نے کچھ نہیں کہا تو وہ کہنے لگا "ساری چیزیں درست چل رہی ہیں۔ بلڈ پریشر' ہارٹ بیٹ' ٹمپریچر ذرا سا تیز ہے لیکن یہ ایسی تشویش کی بات نہیں۔ سب سے اچھی بات تو یہ ہے کہ وہ آنکھیں کھولتا ہے اور بیشتر ہوش میں رہنے کی کوشش کرتا ہے' اس کی آنکھوں کی چمک گہری ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے اس سے چھیڑ چھاڑ کی تھی۔ میں نے پوچھا' کہو ماسٹر! کیسے جارہے ہو؟ اس نے مسکرانے کی کوشش کی اور اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ میں نے اس کے دل میں امید جگانے کے لیے بہت سی باتیں کیں۔ میں نے کہا "ماسٹر! سچ' تم بہت خوش قسمت ہو۔ خبر ہے' کتنے لوگ تمہاری وجہ سے فکر مند ہیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا کہ وہ تمہارے لیے کیا کریں۔ دھن دولت تو بس ایک دھوکا ہے۔ اصل چیز یہی ہے کہ کون کتنے آدمی سمیٹتا ہے۔ کتنے جان نثاروں کی دولت اس کے پاس ہے۔ باہر بہت سے لوگ تمہارے منتظر ہیں۔ تم جلد سے جلد گھر پہنچو تو دیکھنا' سب کیسا جشن مناتے ہیں۔ وہ سنتا رہا۔ میں نے اس سے کہا۔ آدھا ڈاکٹر تو خود مریض ہوجاتا ہے کیونکہ آدھی جنگ وہ خود لڑتا ہے۔ ہم نے اس کے ہاتھ کھول دیے ہیں اور بستر کئی بار اوپر نیچے کیا ہے۔"

کیلاش کے احتیاط آمیز جذبہ و جوش پر میں ڈھیر بنا بیٹھا رہا تو وہ بجھ سا گیا اور خاموش ہوگیا۔ یہ سب کچھ تو میں بھی دیکھ رہا تھا اور اخذ کررہا تھا۔ میں تو اس سے کچھ اور پوچھنا چاہتا تھا مگر میری زبان ہی اکڑ جاتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ میری خاموشی اسے گراں گزر رہی ہوگی' یہ ایک نازیبا' ناروا بات ہے لیکن میرے اختیار میں کچھ نہ تھا۔ کیلاش ایک صلح جو اور معاملہ فہم شخص تھا۔ اس نے یہ سکوت توڑا' کہنے لگا "کیا بات؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں' ہاں" میں نے سٹپٹا کے کہا "بالکل ٹھیک۔"

"نہیں' ضرور کوئی بات ہے' مجھے بتائیے۔"

میں نے ڈوبتی آواز میں کہا "کچھ ہو تو بتاؤں۔"

"آپ حاضر نہیں معلوم ہوتے۔ مجھے شبہ ہے کہ آپ نے میری بات بھی توجہ سے سنی ہے یا نہیں۔"

"میں نے سب کچھ سنا ہے۔"

"آپ کا چہرہ بھی کیسا اترا ہوا ہے" وہ بے کلی سے بولا۔

"ایسے ہی" میں نے بھاری آواز میں کہا "میں سو رہا تھا' اٹھ کے سیدھا ادھر چلا آیا۔"

اسے یقین نہیں آیا۔ اس نے اپنی کرسی میرے مقابل کرلی اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولا "مجھ پر آپ اعتماد کرسکتے ہیں۔"

"تم یہ کیسی باتیں کررہے ہو۔"

"پھر آپ بتاتے کیوں نہیں۔"

"میں نے کہا نا' ایسی کوئی بات نہیں۔"

چند لمحے وہ چپ رہا پھر اضطراب سے بولا "گزشتہ دو دنوں میں' میں نے آپ کو ایسا فکر مند اور نڈھال سا نہیں دیکھا جب کہ اب تو' اب تو بھگوان کا۔" وہ ٹھہر گیا اور کہنے لگا "میں گھر فون کیے دیتا ہوں۔ میرا خیال ہے' آپ کچھ دیر کے لیے کلب چلے جائیے۔ موٹر تو آپ کے پاس ہوگی اور ڈرائیور بھی ساتھ ہوگا۔ جتنی دیر میں آپ گھر پہنچیں گے' رما تیار ہوجائے گی۔ اسے گھر سے لے لیجئے اور وہ کوشلی!" وہ شانے اچکا کے بولا "ٹھیک ہے' وہ ساتھ ہوجائے تو اسے بھی لے جائیے' اچھی خاصی باتیں کرلیتی ہے۔ لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا آتا ہے اسے' کیا خیال ہے؟"

"نہیں' اس وقت نہیں" میں نے کسمساتے ہوئے کہا۔

"وقت اچھا گزر جائے گا۔ ان چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں سے کبھی کبھی اچھا اثر پڑتا ہے۔ رما بھی آج بہت الجھ رہی تھی۔ یہاں ہم سب لوگ موجود ہیں۔ یہاں کی آپ کوئی فکر نہ کیجیے۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا' یوں ہی بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ وہ بھی اپنی جگہ سے نہیں اٹھا۔ میرے مساموں سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ میں آنے کو یہاں آتو گیا تھا لیکن میرا دل اڑ رہا تھا اور بھاگ جانے کو جی کرتا تھا۔ میری خاموشی پر کیلاش نے اضطراری انداز میں میری پیشانی چھو کے دیکھی۔ اس کی انگلیاں بھیگ گئی ہوں گی۔ اس نے میری نبض دیکھی۔ میرے ہاتھ ٹھنڈے پڑے تھے۔ ایسی کیفیت کو طبی اصطلاح میں ڈیپریشن کہتے ہیں۔ خون کا کم دباؤ بھی اس کی وجہ ہوسکتی ہے۔ "آپ کہیں نہ جائیے' بہتر ہے۔ گھر جاکے آرام کیجئے" وہ متردد لہجے میں بولا "آرام ہی اس کا بہترین علاج ہے۔"

"مجھے کچھ نہیں ہوا ہے" میں نے کہا مگر میری آواز جھرجھرا رہی تھی۔

"نہیں' آپ ٹھیک نہیں ہیں۔ کاش میں وجہ جان سکتا! بہرحال میری بنتی ہے' آپ گھر چلے جائیں۔ اعصابی سکون کے لیے میں آپ کو چند گولیاں دیتا ہوں۔"

کیلاش اسی دم میرے پاس سے چلا گیا اور تیز قدموں سے ڈاکٹروں کے کمرے میں جاکے واپس آگیا۔ وہ زرد گولیوں پر مشتمل ایک چھوٹی سی شیشی ساتھ لایا تھا۔ اس نے مجھے ہدایت کی کہ نیند نہ آنے کی صورت میں ایک گولی دودھ یا پانی کے ساتھ کھالوں' دو بھی لے سکتا ہوں لیکن بیک وقت چار نہیں۔ اس کے کہنے پر میں کسی معمول کی طرح اٹھ گیا۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا۔ مجھے کلینک سے باہر جاتا دیکھ کے زورا' جگنو' شامو اور دیوا بھی مضطرب ہوگئے۔ میں اپنی نظروں میں

تماشا بن گیا تھا۔ جیسے تیسے کیلاش نے انہیں مطمئن کیا اور جب تک موٹر حرکت میں نہ آگئی' وہ باہر دروازے کے پاس کھڑا رہا۔

کچھ دور آگے جاکے ڈرائیور نے گھر واپس جانے کے لیے چوک سے موٹر موڑلی۔ چوک کے گھنٹا گھر میں ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ سڑکوں پر ابھی تک بھیڑ تھی اور بیشتر دکانیں کھلی تھیں۔ ڈرائیور نے منٹوں میں مجھے گھر پہنچادیا اور جولین مجھے ملاقاتی کمرے ہی میں مل گئی۔ وہ جیسے میرا انتظار کررہی تھی "کیسا ہے ماسٹر؟" مجھے دیکھتے ہی اس نے پوچھا۔

میں نے گہری سانس لے کے جواب دیا "پہلے سے تو ٹھیک لگتا ہے۔"

"میں نے تمہارا اٹیچی کیس تیار کردیا ہے۔ ضروری سامان اور کپڑوں کے چھ جوڑے رکھ دیے ہیں۔ اس سے زیادہ کی شاید ضرورت نہ پڑے۔ تم نے پوچھا کہ گاڑی کس وقت جاتی ہے؟"

"نہیں' مجھے نہیں معلوم" میں نے بے ربطی سے کہا "لیکن رات کو ضرور کوئی گاڑی دکن کی طرف جاتی ہوگی۔"

"کسے ساتھ لے جاؤ گے؟"

"کسی کو' کسی کو بھی نہیں" میں نے بکھری ہوئی آواز میں کہا۔

"اکیلے جاؤ گے کیا؟"

"کیوں؟ کیا میں اکیلا نہیں جاسکتا؟" میرے لہجے میں تندی آگئی۔

"جاسکتے ہو" وہ نرمی سے بولی "مگر اچھا ہوگا کہ کوئی ساتھ رہے۔"

"کون! تمہارے خیال میں کون۔؟" میں نے جھنجناتی آواز میں کہا۔

"کوئی بھی۔" وہ ہونٹ کاٹنے لگی۔

"اس وقت میرا ہی جانا نامناسب ہے' کجا یہ کہ کوئی اور بھی جائے۔"

"یہاں بہت سے لوگ ہیں' ایک شخص کی کمی سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ کوئی ساتھ رہے گا تو سفر اتنا دشوار محسوس نہیں ہوگا۔" وہ حتمی لہجے میں بولی۔

"تمہیں میری طرف سے فکر ہے' یہی بات ہے نا! میں بالکل ٹھیک رہوں گا۔ اب مجھے عادت ہوگئی ہے سب چیزوں کی۔" میری آواز بھرانے لگی۔ میں نے اس سے کہا "ایسا ہی ہے تو میں جگنو اور دیوا میں سے کسی کو ساتھ لے جاتا ہوں۔"

"میں نہیں کہہ سکتی" وہ کھوئی کھوئی آواز میں بولی "اتنی دیر کرنی چاہیے یا نہیں لیکن اچھا ہوتا کہ صبح تک باوا کا انتظار کرلیا جاتا۔ وہ کل صبح پونا سے ضرور واپس آجائیں گے۔ پھر انہی کے ساتھ جاتا۔"

"بٹھل بھائی کے ساتھ! نہیں' نہیں" میں نے شدت سے انکار کردیا "ان کے جانے کی ضرورت نہیں۔ ویسے بھی انہیں ابھی حیدر آباد کی طرف نہیں جانا چاہیے۔ تمہیں معلوم نہیں' ہم وہاں کیسی مشکلوں میں پھنس گئے تھے۔ کئی نواب ہمارے دشمن ہوگئے تھے اور انہوں نے جال پھیلادیا تھا۔ آخر میں انہوں نے اپنے دو آدمیوں کو ہمارے پیچھے لگادیا۔ کانتے انہی کے حملے میں زخمی ہوا تھا۔ ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے۔ بٹھل بھائی کے حیدر آباد جانے سے خواہ مخواہ الجھاؤ پیدا ہوسکتا ہے۔ وہ نواب اور ان کے نمک خوار کتوں کی طرح ابھی تک ہماری جستجو میں ہوں گے" میرے منہ میں جو آیا' کہتا چلا گیا۔

جولین کی حیرت سے کھلی آنکھیں دیکھ کے معاً مجھے احساس ہوا کہ میں یہ کیا ہذیان بک رہا ہوں۔ میں نے اپنی زبان کو لگام دی۔

"جیسا کہ تم بتارہے ہو' ان حالات میں تو تمہارا بھی اکیلے حیدر آباد جانا کسی طور مناسب نہیں ہے" وہ تشویش سے بولی۔

"میرے اکیلے کی ایسی کوئی بات نہیں لیکن بٹھل بھائی۔۔۔ بٹھل بھائی کی بات اور ہے' یوں بھی ان کے سامنے کوئی یوں بھی بے دست وپا ہوجاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں' پونا سے ان کے واپس آنے سے پہلے ہی مجھے نکل جانا چاہیے ورنہ وہ کبھی مجھے اکیلے نہیں جانے دیں گے۔"

"ٹھیک ہے' تم جیسا بہتر سمجھتے ہو" وہ تذبذب سے بولی "میں' میں تمہارے ساتھ چل سکتی ہوں؟" اس نے آہستگی سے پوچھا۔

"تم۔۔۔ تم!" میں نے حیرانی سے کہا "تم کیسے' کیسے جاسکتی ہو؟"

"کیوں؟ جیسے جگنو اور دیوا جاسکتے ہیں۔"

مجھے اپنی سماعت پر شبہ ہوا لیکن اس کے چہرے پر گھٹا چھائی ہوئی تھی "ہاں ہاں" میں نے اٹکتی زبان سے کہا "مگر تم۔۔۔"

وہ میری بات کاٹ کے دل سوزی سے بولی "جی چاہتا ہے' ایسے وقت میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔ تم نے اس دن کے لیے بہت انتظار کیا ہے۔ مجھے بھی یہ دن دیکھنے کی بہت آرزو ہے۔ لیکن شاید میں' میرا جانا۔۔۔" اس کی آواز جکڑی

گئی۔ چند لمحے سکوت کے بعد وہ کہنے لگی "میں ڈرائیور کو بھیج کے معلوم کراتی ہوں۔ یہاں قریب ہی اسٹیشن ہے۔ جگنو اور دیوا بھی کھانا لینے کے لیے آتے ہوں گے۔ ان میں سے کسی کو روک لینا۔"

"تم نے گھر میں کسی سے ذکر تو نہیں کیا؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"ابھی تک نہیں لیکن انہیں بتانا تو ہوگا۔"

"میرے جانے کے بعد ہی بتانا۔"

"تم چھپا کیوں رہے ہو؟"

"بس یوں ہی" میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دوں۔ "جانے کیوں اچھا نہیں لگتا" میں نے شکستہ لہجے میں کہا "ابا جان جانے کیا کہیں گے اور کس طرح اسے۔۔۔"

"وہ کیا کہیں گے' وہ تو بہت خوش ہوں گے۔ کیا تم سمجھتے ہو' انہیں اس بارے میں کوئی اندازہ نہیں ہے؟"

"ضرور ہوگا' مجھے نہیں معلوم۔"

"یوں اطلاع دیے بغیر چلے جانے سے وہ ناراض ہوں گے' ملال بھی بہت ہوگا انہیں۔"

"یقیناً ہوگا لیکن بعد میں سب ٹھیک ہوجائے گا۔ ابھی۔۔۔ ابھی شاید میرا تنہا ہی جانا مناسب ہے۔ ابا جان کے سامنے زبان کھولتے ہوئے عجیب سا لگتا ہے۔ یوں سمجھو کہ ہمت نہیں پڑتی اور ابھی کیا معلوم کہ وہاں جاکے۔۔۔" میری آواز میرے سینے میں ڈوب گئی۔

"تمہیں یقین نہیں ہے" وہ اضطراب آمیز سراسیمگی سے بولی۔

"کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ پہلے بھی کئی بار ایسا ہوچکا ہے۔ میں نے سب کو بہت تنگ کیا ہے۔ پچھلی مرتبہ جب ہم فیض آباد سے بمبئی آرہے تھے تو مراد آباد کے اسٹیشن پر جیسے ہی گاڑی ٹھہری' مجھے وحشت ہونے لگی۔ میں نے پیرو بھائی سے منت کی کہ کیوں نہ مسافر خانے جاکے معلوم کیا جائے۔ ممکن ہے' اس دوران میں مولوی صاحب کا مراد آباد آنا ہوا ہو۔ یہی ہوا' مولوی صاحب کا نام مسافر خانے کے رجسٹر میں درج تھا اور سکونت کے خانے میں حیدر آباد کا پتا لکھا ہوا تھا۔ میں نے پیرو بھائی سے ضد کی کہ میں تو حیدر آباد جارہا ہوں۔ آپ سب بمبئی چلے جائیں۔ پیرو بھائی اس طرح کیسے آمادہ ہوجاتے۔ انہوں نے ابا جان کو بھی راضی کرلیا اور دلی اسٹیشن سے سبھی حیدر آباد کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ وہاں حیدر آباد میں سب نے کیسے ستم برداشت کیے' دہراتے ہوئے بھی اذیت ہوتی ہے۔ میں تمہیں کیا کیا بتاؤں' ایک کے بعد ایک آزمائش۔ میری وجہ سے سب ہلکان ہوئے۔ بٹھل بھائی کا پیر زخمی تھا۔ انہیں حیدر آباد آنا پڑا۔ کانتے تو اپنی جان سے گیا اور نتیجہ وہی نکلا۔ وہاں جاکے معلوم ہوا کہ مولوی صاحب حیدر آباد میں نہیں ہیں' آئے تھے اور چلے گئے۔ اب بھی کیا کہا جاسکتا ہے۔ مجھے اس پر کوئی اعتبار نہیں رہا۔ ایسا کوئی دن شاید قسمت میں نہیں ہے۔" میری آواز قابو میں نہیں رہی۔

"ضروری نہیں کہ اس بار بھی یہی ہو" جیسے بچوں کو کوئی پچکارتا ہے' وہ ایسے نرم اور شفیق لہجے میں بولی "بہرحال تمہارا جانا تو لازم ہے۔ اب تک جو کچھ ہوتا رہا' اس میں تمہارا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ تم نے تو ایسا سوچا تھا' نہ چاہا تھا۔ کسے معلوم' وقت کو مہربان ہوتے بھی دیر نہیں لگتی۔ خدا نے چاہا تو اب کے تم سرخ رو واپس آؤ گے۔"

میری آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ میں نے اپنا سر جھکالیا۔

"میں ڈرائیور سے بات کرکے ابھی آتی ہوں۔" یہ کہتی ہوئی جولین کمرے سے چلی گئی اور دیر تک واپس نہیں آئی۔ کوئی اور بھی نہیں آیا۔ ہر طرف سناٹا طاری تھا۔ میں صوفے پر کسی بت کی طرح لیٹا رہا۔ دل بہت گھبرانے لگا تو میں کمرے سے نکل آیا اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ کس طرف جاؤں۔ میں اسی شش وپنج میں تھا کہ بیرونی دروازے سے جولین لپکتی ہوئی داخل ہوئی۔ وہ ساڑی پر عنابی شال باندھے ہوئے تھی۔ لگتا تھا' کہیں باہر سے آرہی ہے۔ شال پر بوندیں پڑی ہوئی تھیں "میں اسٹیشن چلی گئی تھی۔ کچھ دیر ہوگئی" وہ پشیمانی سے بولی۔

"تم اسٹیشن گئی تھیں' اتنی رات کو؟"

"ایسی رات تو نہیں ہوئی۔ ڈرائیور ساتھ تھا اور اسٹیشن یہاں سے دور ہی کتنا ہے" اس نے اپنی بھیگی ہوئی شال اتارتے ہوئے کہا "میں نے سوچا' ڈرائیور جانے کیا معلومات کرکے آئے' خود ہی ہوکے آتی ہوں۔ ایک گاڑی تو ابھی نکل گئی۔ وہ کل سہ پہر تک حیدر آباد پہنچ جائے گی۔ دوسری گاڑی دوپہر دو بجے بمبئی سینٹرل سے جاتی ہے براستہ واڑی۔"

"کل دوپہر دو بجے؟" میں نے کٹی پھٹی آواز میں کہا۔

"ہاں! میں نے کھڑکی پر پوچھا کہ کوئی اور ذریعہ بھی جلد حیدر آباد پہنچنے کا ہے تو معلوم ہوا کہ صبح نو بجے من ماڑ کے لیے چھوٹی لائن جاتی ہے۔ من ماڑ سے وہ اورنگ آباد ہوتی ہوئی حیدر آباد چلی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور صورت

بھی ہے۔ ابھی گیارہ بجے کی دلی ایکس پریس میں بیٹھ کے ناگ پور اتر جائے‘ وہاں سے حیدر آباد جانے والی گاڑی پکڑلی جائے۔ بات ایک ہی ہے۔ یہ زیادہ لمبا اور تھکا دینے والا سفر ہے۔ میں کل دوپہر دو بجے والی گاڑی کے دو ٹکٹ لے آئی ہوں۔ دونوں فرسٹ کلاس کے۔ تم یہاں سے ایک بجے کے قریب نکل جانا۔"

میں گم صم کھڑا اس کی صورت تکتا رہا۔

"اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ الٹے راستے کے بجائے سیدھی حیدر آباد جانے والی گاڑی بہتر رہے گی لیکن تم جیسا چاہو۔" میری خاموشی سے وہ منتشر سی ہو گئی اور پوچھنے لگی کہ پھر میں نے کیا سوچا ہے۔

"میرا خیال ہے" میں نے پژمردگی سے کہا "یہی گاڑی ٹھیک رہے گی جس کے تم نے ٹکٹ لیے ہیں۔"

"ٹکٹ تو واپس بھی ہو سکتے ہیں۔ کھڑکی پر ایک ہمدرد شخص بیٹھا تھا‘ اس بے چارے نے بہت سے راستے بتائے اور خود ہی رد کر دیے اور کہنے لگا کہ کل دوپہر تک آپ کو انتظار کرنا ہو گا۔"

میں سہلا کے رہ گیا۔

"اب تم میرا کہا مانو تو کچھ کہوں؟" وہ ملتجی لہجے میں بولی۔

"کیا بات ہے؟" میں نے ٹھٹک کے کہا۔

"تم یہ وقت سکون سے بھی گزار سکتے ہو اور پریشان رہ کے بھی۔ یہ وقت تو تمہیں بہرحال گزارنا ہے۔ پھر کیوں نہ صبر و تحمل سے گزارا جائے۔ میری رائے میں کھانا کھا کے تم اوپر والے کمرے میں چلے جاؤ اور کوشش کر کے سو جاؤ۔"

"کوشش سے نیند کب آتی ہے؟"

"میں جانتی ہوں‘ یہ سب کتنا مشکل ہے لیکن میرا مطلب ہے‘ تم تازہ دم ہو کے سفر کرو۔ کھانا تیار ہے‘ تم کہو تو میں لے آؤں؟"

"کچھ کھا لو تو اچھا ہے‘ پھر نیند بھی ممکن ہو جاتی ہے۔"

"کسی بات کو جی نہیں چاہ رہا۔"

"جو ہونا ہے‘ لوگ کہتے ہیں وہ تو ہو کے رہتا ہے۔ اس مرتبہ بھی وہی کچھ لکھا ہے تو تم کیا کر سکتے ہو؟"

"میں تو کچھ بھی نہیں کر سکتا۔"

"کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ ہر ایک کے ساتھ یہی ہے۔ وقت تو کسی پاگل کے مانند ہے۔ خود تو اندھا ہوتا ہی ہے‘ آدمی کی بینائی بھی چھین لیتا ہے۔"

"میں کلینک چلا جاتا ہوں۔"

"وہاں کیا کرو گے جا کے؟"

"یہاں بھی کیا کروں گا؟"

"ربا کی طرف کیوں نہ چلیں۔ وہ کئی دن سے آئی بھی نہیں۔ اس طرح کچھ وقت کٹ جائے گا۔ وہ بھی بہت خوش ہو گی۔"

میں اسے کیا بتاتا کہ میرے سینے میں کیسا شور مچا ہوا ہے۔ میرے تو ہاتھ پیر ہی سن پڑے ہیں‘ میں کسی کے ہاں کس طرح جاؤں گا۔ وہ خود ہی کہنے لگی "ربا کے ہاں نہیں تو ساحل کی طرف چلیں۔ ہلکی ہلکی بارش ہو تو کشتی کی سواری میں بہت سکون ملتا ہے۔" پھر کہنے لگی "کوئی کتاب ہی شروع کر دو۔ کتاب سے اچھا ساتھی کوئی نہیں ہوتا۔ تمہارے پاس اس روز کی کچھ کتابیں ابھی باقی ہوں گی۔ ورنہ میرے پاس بہت سی ہیں۔"

"تم اتنی پریشان مت ہو۔" میں نے کسی قدر سنبھلی ہوئی آواز میں کہا "میں اوپر کے کمرے میں جا رہا ہوں۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ میرے لیے یہ سب کچھ نیا نہیں ہے۔ مجھے ان باتوں کی عادت سی ہو گئی ہے۔"

اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی‘ میں اسے راہ داری میں چھوڑ کے اوپر ہوادار کمرے میں چلا آیا۔ یہاں ہوا خوب آتی تھی۔ باہر بوندا باندی ہو رہی تھی۔ سارے موسم آدمی کی آمادگی سے مشروط ہیں۔ کمرے میں آ کے مجھے ٹھنڈ سی لگنے لگی۔ بتی جلا کے میں مسہری پر لیٹ گیا اور دیر تک اپنی اکھڑی ہوئی سانسیں ہموار کرتا رہا۔ میں نے کتاب اٹھا کے پڑھنے کی کوشش کی۔ یہ کتاب ابھی تین چوتھائی رہ گئی تھی اور میں نے صفحے پر نشانی لگالی تھی کہ دوبارہ مجھے کہاں سے شروع کرنا ہے لیکن میری نظر بار بار دھندلا جاتی تھی۔ صفحے پر لفظ ہی بکھر بکھر جاتے تھے۔ میں نے آنکھیں موند کے سونے کی بھی کوشش کی۔ آدمی ہمیشہ یہی کرتا ہے۔ ضبطِ نفس‘ صبر و تحمل کی مشق‘ کون اپنے جسم پر زنجیریں‘ اپنے وجود میں کانٹے پسند کرتا ہے۔ کسے یہ آگ اچھی لگتی ہے جو رگ و پے میں سلگتی ہے۔ کوئی کتنا ہی دست و بازو کا مضبوط ہو اور پتھر کا‘ لوہے کا ہو۔ کس کے اختیار میں ہے کہ اپنی یہ زنجیریں کاٹ سکے‘ اپنے کانٹوں کا رخ موڑ سکے اور اپنی آگ فرو کر دے۔ یہ نادیدہ آگ تو خود بخود سلگ اٹھتی ہے۔ اور ہڈیوں تک میں اتر جاتی ہے۔ دریاؤں‘ سمندروں کا پانی بھی اس کے لیے ناکافی ہے۔ مجھے آئے ہوئے منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ایک ملازمہ کمرے میں کھانا رکھ گئی۔ خوان پوش سے ڈھکا طشت یوں ہی پڑا رہا۔ میری منڈلاتی ہوئی نگاہیں گھڑی پر آ کے جم جاتی تھیں۔ دیوار پر لٹکی ہوئی گھڑی ٹک ٹک کر رہی

تھی۔ اس کی آواز سے مجھے اور وحشت ہو رہی تھی‘ جیسے مجھے چڑاتی ہو‘ مجھ سے مذاق کرتی ہو۔ کئی بار میرے جی میں آئی کہ دیوار سے گھڑی اتار دوں یا اس کا رخ ہی بدل دوں۔ کئی بار مجھے وہم ہوا‘ وقت بہت گزر چکا ہے اور گھڑی غلط چل رہی ہے۔ گیارہ بج رہے تھے۔ پوری رات اور آدھا دن! بٹھل کو صبح کسی وقت پونا سے واپس آجانا چاہیے۔ اس کے آنے کے بعد یہ ممکن نہیں ہو گا کہ میں اس کے بغیر حیدر آباد جاسکوں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ جولین کسی سے کچھ نہ کہے۔ اور میں چپ چپاتے ایک بجے گھر سے نکل جاؤں۔ میری تاکید کے بعد جولین یقیناً زبان بند رکھے گی چاہے اسے ابا جان اور بٹھل کے سامنے کتنا ہی نادم ہونا پڑے لیکن اس کے ذہن میں الٹے سیدھے اندیشوں نے گھر کر لیا تو وہ بٹھل سے ذکر ضرور کرے گی۔

میں مسہری پر اٹھ کے بیٹھ گیا۔ یہی بہتر ہے کہ مجھے صبح نو بجے چھوٹی لائن والی گاڑی سے روانہ ہو جانا چاہیے۔ وہ بھی کم و بیش اسی وقت حیدر آباد پہنچے گی جتنی دیر میں بڑی لائن سے دو بجے چلنے والی گاڑی۔ اس طرح بٹھل سے میرا آمنا سامنا ہی نہ ہو سکے گا۔ صبح نو بجے روانگی کے ارادے سے مجھے کچھ تقویت ہوئی جیسے میری لگام میرے ہاتھ میں آگئی ہو۔ میں نے خود کو تلقین کی کہ جولین کے بہ قول یہ تو ایک جاں فزا مژدہ ہے۔ اس سے بڑی نوید میرے لیے کیا ہو سکتی ہے۔ مجھے تو شکر ادا کرنا چاہیے کہ اتنے عرصے بعد امید کی پھر کوئی صورت نظر آئی ہے۔ مجھ پر تو وقت صدیوں کی طرح بیتا ہے۔ میں تو صرف آہٹیں سنتا اور صرف پرچھائیاں دیکھتا رہا ہوں‘ میری آنکھیں تو مولوی صاحب کے گمان میں سڑک کے آخری آدمی تک منڈلاتی رہی ہیں۔ میرے لیے تو یہ صبح کی نوید ہے۔ پھر یہ دریدہ تنی اور حواس باختگی کیسی؟ جیسا کہ جولین کہہ رہی تھی اور میں نے تردید بھی کی تھی اور تائید بھی۔ کیا واقعی کوئی بے اعتباری اور بے یقینی میرے قلب و دماغ کے اس فشار و فساد کا سبب ہے؟ مجھے یقین جو نہیں رہا ہے۔ میرے رگ و پے میں یہ وہم سرایت کر گیا ہے کہ ایسی کوئی ساعت میرے نصیب میں نہیں ہے۔ میں نے جان لیا ہے کہ میرے ستاروں کی گردش کے لیے کوئی حصار طے ہو چکا ہے اور میری لکیریں اپنا مقسوم کندہ کر چکی ہیں۔ اب ان میں کسی ترمیم و تبدیلی کی گنجائش نہیں۔ کیا یہ مال کا خوف ہے کہ واپسی میں سینے کی آگ اور نہاں خانے کے اندھیرے میں اور اضافہ ہو جائے گا؟ میں کسی سراب کے پیچھے جا رہا ہوں‘ یقیناً ایسا نہیں ہے۔ ایسا کچھ ہے تو محض وہم و گمان کی حد تک۔ کوئی امید‘ کوئی آس ہی تو مجھے قائم رکھے ہوئے ہے ورنہ میں کہاں ہوتا۔ میں تو آئینے سے کب کا اوجھل ہو چکا ہوتا۔ اور کیا یہ بس یہیں تک‘ ایک نواب ثروت یار کے خط تک موقوف ہے اور حیدر آباد سے نامراد واپس آنے تک کا حصہ ہے؟ پھر کیا سارے چراغ بجھ جائیں گے؟

میں نے خود کو تسلی دی کہ آج نہیں تو کل میں روانہ ہو جاؤں گا۔ اس کے سوا میرے پاس راستہ بھی کون سا ہے۔ میرے پر نہیں ہیں جو میں اڑ کے حیدر آباد پہنچ جاؤں۔ مجھے خاطر جمع رکھنی چاہیے۔ نواب ثروت یار نے حیدر آباد میں مولوی صاحب کے مستقل قیام کے بارے میں مطمئن ہو کے ہی مجھے خط لکھا ہو گا۔ مولوی صاحب دوبارہ اس کے پاس آئے ہیں تو اس کا یہی مطلب ہے کہ وہ مسلسل خانہ بدوشی اور پناہ گیری سے عاجز آچکے ہیں ورنہ وہ لوٹ کے نواب ثروت یار کی حویلی کا رخ نہ کرتے۔ ہو سکتا ہے‘ انہوں نے تھک ہار کے نواب سے ہامی بھر لی ہو کہ وہ اس کی خواہش کے مطابق کورا کو اس کی تحویل میں دے دیں گے۔ کورا کے لیے نواب سے بہتر امیدوار انہیں نہیں ملا ہو گا۔ نواب اپنے خواب کی اس تعبیر سے بہت سرشار ہو گا لیکن اس کی یہ خوش خیالی کتنی دیر کی ہے۔ ممکن ہے‘ اب تک اس پر یہ حقیقت آشکار ہو چکی ہو کہ فیصلے کا اختیار صرف مولوی صاحب کو نہیں‘ کورا کو بھی ہے۔ وہ آخر دم تک مزاحمت کرتی رہے گی۔ میری طرح وہ بھی کسی روز آسمان کا تیور بدل جانے کے آسرے پر قائم ہے۔

نواب ثروت یار نے اب کے مولوی صاحب سے میرا تذکرہ نہیں کیا ہو گا۔ جبھی اس نے مجھے خط لکھا ہے۔ اسے یہ تجربہ ہو چکا تھا جیسا کہ نواب کی حسرت آمیز باتوں سے عیاں تھا‘ وہ کورا کا ایسا ہی طلب گار ہے تو اسے بہت محتاط رہنا چاہیے۔ مولوی صاحب کے سامنے میری دوبارہ آمد کا ذکر کرنے سے مراد مولوی صاحب سے یا دوسرے لفظوں میں کورا سے دست برداری ہے۔ میرا نام سنتے ہی مولوی صاحب پھر کہیں گم ہو سکتے ہیں اور وہ بار بار حیدر آباد نہیں آئیں گے‘ وہ تو اس گلی‘ اس شہر سے بہت دور چلے جائیں گے۔ مولوی صاحب کے دوبارہ کھو جانے کے اندیشے نے نواب کی زبان بند رکھی ہو گی۔ میں نے خود کو مولوی صاحب کا عزیز بتایا تھا۔ کوئی بعید نہیں کہ مولوی صاحب نے کورا کے سلسلے میں نواب سے اپنی معذوری ظاہر کر دی ہو یا کچھ انتظار کرنے کو کہا ہو اور کوئی چارہ نہ دیکھ کے نواب کو میری یاد آئی ہو۔ اسے اتنا تو اندازہ ہو چکا ہو گا کہ کورا اور مولوی صاحب کی

آپس میں وہ نسبت نہیں ہے جو مولوی صاحب نے بتائی ہے۔ نواب کو پھر کورا کے مدعی' اس کے دوسرے عزیزوں کی جستجو کرنی چاہیے۔ پیرو بھائی نے اور میں نے نواب سے بہت عاجزی کی تھی۔ نواب نے وعدہ کیا تھا کہ مولوی صاحب دوبارہ حیدر آباد آگئے تو وہ ہمیں ضرور مطلع کردے گا' وہ ایک خاندانی آدمی ہے۔ آدمی کتنا ہی بڑا نواب' جاگیردار ہو' آدمی ہی ہوتا ہے۔ وہ پیرو بھائی کی التجا سے بہت متاثر نظر آتا تھا۔ کیا عجب کہ اپنا وعدہ نبھانے کی خاطر اور انسانی ہمدردی کے کسی جذبے سے اس نے مجھے خط لکھا ہوا۔ ہم دوبارہ اس کے پاس گئے تھے اور ہم نے بہت تشویش و اضطراب کا اظہار کیا تھا۔ اصل ماجرا جاننے کا تجسّس بھی نواب جیسے ایک ہوش مند اور نکتہ بیں شخص کو یہ خط لکھنے پر اکسا سکتا ہے۔ وہ لوگ کون ہیں جو مولوی صاحب اور ان کی مبینہ بیٹی' ایک نوجوان لڑکی کے سلسلے میں متوحش ہیں اور مولوی صاحب آخر ان لوگوں کے قرب سے اس قدر کیوں گریزاں ہیں۔ اگر واقعی مولوی صاحب حیدر آباد میں ہیں اور نواب کسی طور کسی اتفاق کے بہانے ان سے میری روبہ روئی کا اہتمام کردیتا ہے تو بس سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔

بس ایک بار مولوی صاحب مجھے مل جائیں' پھر میرے بارے میں وہ اپنی رائے ضرور بدل دیں گے۔ پھر وہ کورا کو مجھ سے دور نہیں رکھیں گے۔ انہوں نے میرے بارے میں اپنے طور پر جو مفروضے قائم کرلیے ہیں' میرے سامنے پہنچنے پر وہ سارا تکدر چھٹ جائے گا۔ میں انہیں بتاؤں گا کہ ایک بار زنداں میں جانے سے آدمی زندگی بھر کے لیے زندانی نہیں ہوجاتا۔ اور جیل میں سبھی زندانی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ مولوی صاحب خود گواہ ہیں' کورا کو ان بد نگاہوں کی دست بردسے بچانے کے لیے مجھے چھرا نکالنا پڑا تھا۔ میں ان دونوں کو ختم نہ کرتا تو کورا جانے کہاں ہوتی۔ یہ کوئی جرم نہیں تھا۔ جرم تھا تو میں نے اس کی پوری سزا کاٹ لی ہے مگر یہ کیسی سزا ہے جو مولوی صاحب مجھے دیتے رہے ہیں۔ میں انہیں بتاؤں گا کہ جیل میں' میں نے وقت ضائع ہرگز نہیں کیا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ لوٹ کے مجھے کہاں جانا ہے۔ مجھے اس کے پاس جانا ہے اور اپنے گھر جانا ہے' زنداں کی رسوائی کے بعد میری سرخ روئی کی یہی صورت ہے کہ میں کچھ کام کا آدمی بن کے باہر جاؤں۔ جیل میں' میں کتابیں پڑھتا اور امتحانات دیتا رہا۔ اڈے سے وابستہ لوگ مجھے کاپیاں کتابیں لاکے دیا کرتے تھے۔ شہر کا سب سے بڑا دادا بٹھل اور اس کے آدمی مجھے ہمہ وقت ٹوکتے رہتے تھے۔ بٹھل اوروں کی طرح مجھے اڈے پر دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ جیل میں کوئی اس سے زیادہ کیا کرسکتا ہے۔ میں مولوی صاحب کو باور کراؤں گا کہ چاقو بازی اور اڈے پاڑے سے وابستگی کے باوجود میں اڈے پاڑے کا آدمی نہیں ہوں۔ میں تو اب اپنے باپ' بھائی اور بہنوں کے ساتھ رہتا ہوں۔ پہلے کی طرح کورا دربدر ماری ماری نہیں پھرے گی۔ وہ تو ایک گھر میں جائے گی جہاں ہر فرد اسے پلکوں پر بٹھائے گا۔ ایک بار مولوی صاحب مل جائیں' میں ان سے منت کروں گا کہ کورا تو ان کے پاس میری امانت کی طرح ہے۔ بے شک ان کا بڑا احسان ہے۔ انہوں نے اسے زمانے کی ستم کاریوں سے محفوظ رکھا۔ انہوں نے اپنی بیٹی کی طرح اس پر سایہ کیے رکھا۔ وہ کوئی نواب' جاگیردار آدمی نہیں تھے' منیر علی کی بیٹی زہرہ بتاتی تھی کہ مولوی صاحب کورا کے سکھ کا کیسا خیال رکھتے تھے۔ وہ کورا کی جنبش ابرو کے منتظر رہتے۔ کورا کوئی بھی خواہش' کوئی بھی فرمائش کرے' وہ حکم کی طرح' پلک جھپکتے اسے بجالاتے۔ انہوں نے اسے ریشم اور مخمل میں رکھا ہے۔ مجھے احساس ہے' ایک نوجوان لڑکی اور کورا جیسی لڑکی کو ہوائے حرص و ہوس' دنیا کے گرد و غبا[ر] سے بچائے رکھنا کیسا مشکل ہے۔ ادھر کہیں کسی مقام پر کور[ا] کے تعاقب میں جانگ قبیلے کے وحشی سرفروشوں کے اچانک سر پر پہنچ جانے کا دھڑکا انہیں الگ ستائے رہتا ہوگا۔ مولو[ی] صاحب نے اس کے لیے زندگی اجیرن کردی۔ میں تو زندگی بھ[ر] ان کا احسان نہیں چکا سکتا تھا۔ ان کا بہت حق ہے۔ می[را] مقصد کورا کو ان سے چھیننا' ان سے جدا کرنا ہرگز نہیں ہے' [و]ہ تو ہم سب کے ساتھ ہی رہیں گے۔ میرے لیے جیسے ابا جا[ن] بٹھل بھائی' ویسے مولوی صاحب۔ یہاں سب لوگ ان ک[ی] خدمت ہی کریں گے۔

بس ایک بار مولوی صاحب کا ملنا شرط ہے۔ پھر میں ا[ن] کی چوکھٹ سے ہٹوں گا ہی نہیں اور اتنی دلیل' حجت' دا[د] فریاد کی نوبت ہی شاید نہ آئے۔ مجھے یقین ہے' مجھے دیکھ[تے] ان کا پتھریوں ہی پگھل جائے گا۔ ان کے مل جانے کے بع[د] مجھے واپس نہیں آنا ہے۔ مولوی صاحب کی منزل کورا [کی] منزل ہے۔ مجھے اس کے پاس جانے سے پھر کوئی نہیں روک سکتا اور کورا... اس تصور ہی سے میرے رونگٹے کھڑ[ے] ہوگئے۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اتنے عرصے بع[د] میں اس کے پاس کیسے جاؤں گا۔ مجھے سکتہ ہوجائے گا۔ میر[ا] دم نکل جائے گا۔ اس کا بھی کچھ یہی حال ہوگا۔ پہلے تو ا[سے] سب خواب خواب' سراب سراب لگے گا۔ یقین نہیں آ[ئے] گا کہ قسمت اس طرح بھی مہربان ہوجاتی ہے۔ کیسا سمن[در]

اس نے اپنی آنکھوں میں چھپائے رکھا ہوگا۔ مجھے پہچاننے میں وہ ایک لمحے کا تامل نہیں کرے گی۔ یہ تو اپنی اپنی طلب اور اپنے اپنے مطلوب کی بات ہے۔ کوئی کتنا ہی دور ہوجائے' نقش اتنے ہی گہرے ہوجاتے ہیں۔ میرا چہرہ تو اسے اپنے چہرے کی طرح یاد ہوگا۔ رہا میرا تو میں تو اس کی خوشبو' اس کے سائے' اس کی آہٹ سے اسے پہچان لوں۔ زہرہ نے مجھے اس کا جو حال بتایا تھا' ہو بہ ہو وہی تھا جو میرے خیال و خواب میں بسا ہوا تھا۔ زہرہ بتاتی تھی کہ کورا مستقل گم صم' کھوئی کھوئی سی رہتی تھی' بیٹھے بیٹھے چونک پڑتی۔ اچانک بے چین سی ہوجاتی۔ زہرہ کو کیا معلوم تھا کہ پتا کھڑکنے پر کورا کو کس کی آہٹ کا گمان ہوتا ہوگا۔ اب مجھے یوں بہ ہمہ وجود' بہ تمام و کمال اپنے سامنے دیکھ کے اس کا کیا حال ہوگا۔

اس کے سامنے جانے کے تصور سے میرا جسم سن سنا رہا تھا۔ میرے دل کی حرکت جیسے معدوم ہوگئی ہو۔ جانے کب تک مجھ پر ایک نشاط انگیز' سرور آفریں ہول طاری رہا۔ میری رگوں میں چیونٹیاں سی رینگتی رہیں۔

صرف ایک دن کی دیوار حائل ہے۔ کل یہاں سے روانہ ہوکے پرسوں دوپہر مجھے اپنی منزل پر پہنچ جانا ہے۔ ضروری نہیں کہ جاتے ہی نواب ثروت یار سے میری ملاقات ہوجائے اور وہ مجھے مولوی صاحب کے سامنے جا کھڑا کرے۔ ممکن ہے' دوسرے دن یا اس سے اگلے دن۔ بہرحال حیدر آباد میں کورا مجھ سے بہت قریب ہی کہیں ہوگی۔ اگر واقعی یہ سب کچھ سچ ہے۔ مولوی صاحب حیدر آباد میں نواب کی حویلی میں' اس کے کسی دوسرے مکان میں مقیم ہیں تو ان تک رسائی حاصل کرنے میں کوئی دیر نہیں لگے گی۔ یکایک مجھے خیال آیا۔ نواب کی خوشنودی کے لیے کیوں نہ میں ایک دو ہیرے ساتھ لے جاؤں۔ لعل و جواہر نوابوں کی شہ رگ کے مانند ہوتے ہیں۔ ابا جان کا کوئی نادر ہیرا اس کی آنکھیں خیرہ کردے گا۔ میں جاتے ہی یہ بیش قیمت سوغات نواب کی نذر کردوں گا۔ ابا جان سے یوں کوئی ہیرا مانگنا مناسب نہیں ہے۔ وہ منع تو نہیں کریں گے لیکن طرح طرح کے سوال ان کے ذہن میں منڈلائیں گے۔ یہی صورت ہے' صبح صبح جیسے ہی ابا جان کلینک کی طرف جائیں' میں ان کے کمرے کی تلاشی لوں۔ ایک دو ہیرے مجھے ان کے سامان سے ضرور مل جائیں گے۔ بعد میں ابا جان کو مقصد معلوم ہوگا تو اس چوری پر ناراض نہیں ہوں گے۔ ہیرا نہیں تو میں اپنی مالا بھی نواب کی نذر کرسکتا ہوں۔ اس کے دانے بہت قیمتی ہیں۔ ایک دن ابا جان اسے دیکھ کے دنگ رہ گئے تھے۔ کورا کے بعد مجھے اس کی مالا کی کیا ضرورت رہے گی۔ یہ کورا سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔

میں بستر پر لیٹا ہانپتا رہا اور میری رگوں میں خون دھڑکتا رہا۔ کاش جولین صبح کسی وقت مجھے نواب کا خط دے دیتی تو میں آج دوپہر کی گاڑی سے نکل جاتا اور اس وقت سفر کررہا ہوتا اور کل صبح نو بجے حیدر آباد پہنچ جاتا۔ جتنی جلدی میں وہاں پہنچ سکوں' اتنا ہی اچھا ہے۔ کسے معلوم کہ مولوی صاحب کے دماغ میں کچھ سما جائے اور پہنچوں تو معلوم ہو کہ وہ کل وہاں سے روانہ ہوچکے ہیں۔ یہ موقع تو پھر ہاتھ سے نکل جائے گا۔

بارش تیز ہوگئی۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ایک بج رہا تھا۔ بائیں جانب کی کھلی کھڑکی سے بارش کی پھوار اندر آرہی تھی۔ میں بستر سے اٹھ کے کھڑکی کے پاس کھڑا ہوگیا۔ بہت دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ میں تو بھیگ رہا ہوں۔ کھڑکی بند کرکے میں کمرے کے چکر کاٹتا رہا۔ پھر بستر پر آکے کروٹیں بدلنے لگا۔ مجھے کسی پہلو قرار نہیں تھا۔ وہ کسی خواب کا نشہ تھا جو کچھ دیر کے لیے میرے حواس و اعصاب پر طاری رہا' پھر سب کچھ بکھر گیا۔ رفتہ رفتہ جیسے میری آنکھ کھل گئی اور میرے جسم و جاں میں وہی اندھیرا سرایت کرنے لگا' وہی زنجیریں اور دست و بازو کی شکستگی۔ میں نے گرداب میں مبتلا کسی راندہ زمین کی طرح ہاتھ پیر مارنے شروع کیے۔ میں نے پھر وہی کوشش کی' ترازو کے پلڑے برابر رکھنے کی۔ میں نے بار بار اپنے عزم کی تجدید کی کہ صرف ایک رات کی بات ہے' صبح نو بجے مجھے روانہ ہوجانا ہے۔ دوپہر کے بجائے مجھے صبح ہی بمبئی سے نکل جانا چاہیے لیکن جتنا میں اپنے ارادے کی تکرار کرتا' اتنی ہی وحشت بڑھتی جاتی۔

رات کا آخری پہر ہوگا کہ کسی لمحے میں نے اس ہیجان و خفقان سے نجات حاصل کرلی۔ مجھے نیند نہیں آئی لیکن ایک سکوت سا چھا گیا۔ نہ کوئی درد نہ راحت' نہ تلاطم نہ سکون۔ میں نے اپنے حال پر قناعت کرلی تھی۔ کوئی رمز نہاں مجھ پر عیاں ہوگئی تھی یا میں نے اپنی سودائیت کی تشخیص کرلی تھی۔ کہتے ہیں' مرض کی آگہی جاں بلب کو تحمل و توکل کی تلقین کرتی ہے۔ ترجیح و تقدیم کے میزان میں مجھے کوئی شافی یا حتمی جواب مل گیا تھا۔ میں نے جگ سے پانی لوٹا کے ایک گلاس پیا اور رات کا باقی حصہ کھلی آنکھوں سے گزار دیا۔ بارش کا سلسلہ جاری تھا لیکن صبح کے وقت بادل چھٹنے لگے۔

آٹھ بج رہے تھے کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے اٹھ کے دروازہ کھولا تو ملازمہ تھی۔ وہ ایک شائستہ

اور خوش اطوار لڑکی تھی۔ اس نے مجھے سلام کیا اور معذرت کی کہ بی بی کی ہدایت پر اس نے دستک دینے کی جرات کی ہے۔ بی بی سے اس کی مراد جولین ہی ہوسکتی تھی۔ جولین نے اس سے کہا تھا' مجھ سے پوچھ کے آئے کہ ناشتا اوپر کے کمرے میں پہنچادیا جائے یا میں نیچے آرہا ہوں؟ جولین کا مقصد مجھے بیدار کرنا بھی ہوگا اور میری خیریت دریافت کرنا بھی۔ میں نے ملازمہ سے کہا کہ میں نیچے ہی آرہا ہوں۔ کمرے سے غسل خانہ ملحق تھا۔ منہ ہاتھ دھوکے میں نے کنگھا کیا اور ملاقاتی کمرے میں آگیا۔ کسی ملازم نے اندر جاکے اطلاع دے دی ہوگی کہ چند لمحے بعد جولین تیز قدموں سے اندر داخل ہوئی۔ اس کی نظریں میرے چہرے پر جم گئی تھیں۔ وہ کچھ پوچھنا یا کہنا چاہتی تھی لیکن متذبذب سی ہوگئی اور گنگ سی کھڑی رہی۔

"میں کلینک جارہا ہوں" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

وہ پلکیں جھپکانے لگی اور شکایتی لہجے میں بولی کہ کیا میں ناشتا بھی نہیں کروں گا۔ رات کا سارا خوان بھی یوں ہی واپس آگیا۔ مجھے لباس بھی تبدیل کرنا چاہیے۔

میں نے کوئی تعرض نہیں کیا۔

اس نے بھی کوئی اور بات نہیں کی' تیزی سے واپس اندر چلی گئی۔ دوسرے منٹ میں وہ کپڑے لے آئی۔ جتنی دیر میں غسل خانے سے لباس تبدیل کرکے میں لوٹا' ناشتا تیار تھا' ناشتے کی پوری ٹرالی تھی۔ میرا ساتھ دینے کے لیے اس نے بھی پلیٹ اٹھالی۔ مجھے بالکل بھوک نہیں تھی لیکن جو کچھ وہ میری پلیٹ میں ڈالتی رہی' میں نے ردوقدح کیے بغیر حلق سے اتارلیا۔ اس نے بھی احتیاط کی تھی۔ کسی میزبان کی طرح اس نے مجھ سے اصرار نہیں کیا۔ میرے لیے چائے بھی اسی نے بنائی "صبح کا اخبار تو نہیں دیکھا ہوگا؟" وہ جھجکتے ہوئے آہستگی سے بولی "لکھا ہے' بمبئی میں تو خیر رات سے سلسلہ شروع ہوا لیکن آس پاس کے علاقوں میں کل دوپہر سے موسلا دھار بارش ہورہی ہے اور سیلاب کی سی حالت ہے۔"

میں ہنکاری بھر کے رہ گیا۔

میرے کچھ پوچھے بغیر وہ بتانے لگی کہ اباجان اور منیر علی کلینک گئے ہیں۔ شاید اب واپس آتے ہوں۔ جگنو اور شامو بھی ابھی ابھی ناشتا لے کے گئے ہیں۔ بتارہے تھے کہ مارٹی نے خاصی بہتر رات گزاری ہے۔ صرف ایک دوبار بے چین ہوا تھا لیکن ڈاکٹروں نے اسے پھر سلادیا۔ کہنے لگی کہ جگنو اور شامو کیلاش کا بہت ذکر کررہے تھے۔ کہتے تھے کہ آج بھی وہ تقریباً ساری رات جاگتا رہا۔

میں نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ اب تک وہی کچھ بولتی رہی تھی۔ اپنا غبار وفشار مجھے خود تک محدود رکھنا چاہیے تھا۔ میری خاموشی اسے کیا' مجھ کو ناگوار گزر رہی تھی۔ میں نے بظاہر ٹھہری ہوئی آواز میں کہا "کیلاش نے کل شام کہا تھا کہ رات اور خیریت سے گزر جائے تو گویا مارٹی نے کوئی معرکہ سر کرلیا۔"

وہ بے ساختہ بولی "خدا نے چاہا تو اب سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔"

میں صوفے سے اٹھ گیا۔ وہ مجھے دروازے تک چھوڑنے آئی اور کہنے لگی کہ بارش کا امکان ہے۔ کیوں نہ میں موٹر ساتھ لے جاؤں۔ میں ایسے ہی آگے چل پڑا۔ سڑکیں بیشتر گیلی تھیں لیکن کہیں پانی ٹھہرا ہوا نہیں تھا۔ دن کی چہل پہل ابھی شروع ہوئی تھی۔ میں تھوڑی دیر میں کلینک پہنچ گیا۔ اباجان اور منیر علی وہاں سے جاچکے تھے۔ زورا نے مجھے بتایا کہ کیلاش بھی ابھی ابھی اپنے گھر گیا ہے۔ جولین نے مارٹی کا جو حال مجھے بتایا تھا' وہی شامو اور زورا نے دہرایا۔ میں نے خود بھی مارٹی کے کمرے میں جاکر دیکھا۔ وہ اس وقت غافل تھا۔ میں زورا' شامو' جگنو اور دیوا کے ساتھ دالان میں آکے بیٹھ گیا اور دس بج گئے۔

اس دوران میں ڈاکٹر اور نرسیں مارٹی کے کمرے میں آتے جاتے رہے تھے۔ ڈاکٹر بھارگو کی آمد پر ڈاکٹر ڈیسائی بھی نیچے آگیا تھا۔ دونوں دیر تک مارٹی کے کمرے میں رہے اور باہر آکے سرگوشیوں میں گفتگو کرتے رہے۔ زورا کی زبانی معلوم ہوا کہ صبح سے ڈاکٹر بھارگو کا یہ دوسرا دورہ ہے۔ پہلی مرتبہ وہ سات بجے کے قریب آیا تھا پھر ڈاکٹر شیوا اور اس کی بیوی بھی نیچے آگئے۔ مجھے دیکھ کے وہ سیدھے میرے پاس چلے آئے۔ ان کا پرتپاک رویہ میرے لیے حیران کن تھا۔ اوپر اپنے گھر چلنے کی دعوت دے کے انہوں نے مجھے اور کشش وپنج سے دوچار کردیا۔ شیوا کے ساتھ اس کی بیوی نے بھی تائید کی اور کہنے لگی "ہم آپ کو بہت نفیس کافی پلائیں گے" کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ ان سے کیا عذر کروں تاہم وقت پر بہانہ سوجھ گیا۔ میں نے ان سے معذرت کی کہ ایک ضروری کام سے کچھ دیر کے لیے باہر جانا ہے' واپس آکے ضرور اوپر آؤں گا۔ ان دونوں کے مارٹی کے کمرے میں جانے کے بعد میں وہاں سے اٹھ گیا اور جگنو' دیوا' زورا اور شامو سے کچھ کہے بغیر کلینک سے باہر آگیا۔ سڑک پر بھیڑ اب زیادہ ہوگئی تھی۔ میں بے ارادہ چوک کی سمت بڑھتا رہا اور ذرا سا چلنے سے مجھے تھکن سی ہونے لگی۔ آگے جانے کے بجائے میں چوک کے

اردگرد باغیچے کی ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ موٹروں اور دوسری گاڑیوں کا شور ہر سو گونج رہا تھا۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی۔ ب کے پاس جیسے بہت کم وقت تھا۔ ہر شخص وقت سے پہلے پنی منزل پر پہنچ جانے کے لیے بے چین تھا۔ چوک سے گھنٹے کی آواز نے مجھے بوکھلا سا دیا۔ میں نے سر اٹھاکے دیکھا تو گیارہ بج رہے تھے۔ میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا لیکن چند قدم بعد میری رفتار سست ہوگئی۔ دوبارہ میں کلینک میں داخل ہوا تو کیلاش آچکا تھا۔ اسی بچھڑے ہوؤں والے انداز میں وہ مجھ سے لپٹ گیا اور دوسرے ہی لمحے اپنے بازوؤں سے مجھے کچھ دور کرکے متجسس ومتردد نظروں سے میرے چہرے کا جائزہ لینے لگا "نہیں! لگتا ہے' آپ رات بھر جاگتے رہے ہیں۔"

میں نے مسکرانے کی کوشش کی اور کچھ کہہ نہ سکا۔

"آج تو اس کی حالت بہت بہتر ہے" وہ دمکتی ہوئی آواز میں بولا۔ "ابھی میں نے اسے دیکھا۔ وہ آنکھیں کھولے ہوئے ہے۔ میں نے اس سے بات بھی کی۔ آپ نے اسے دیکھا؟"

"میں جب گیا تھا تو وہ سو رہا تھا۔"

"اب جاکے دیکھیے۔" وہ میرا بازو پکڑ کے تقریباً کھینچتا ہوا مجھے مارٹی کے کمرے میں لے گیا۔ مارٹی جاگ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی پھٹی سی تھیں۔ چہرے پر نسبتاً تازگی تھی۔ مجھے سامنے دیکھ کے اس کے ہونٹوں پر یاس انگیز مسکراہٹ ابھر آئی۔ میں اس کے سرہانے بیٹھ گیا اور بے اختیار جھک کے میں نے اس کی پیشانی چوم لی اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں بھینچ لیا۔ مارٹی کی سسکی نکل گئی۔ کیلاش پاس ہی کھڑا تھا۔ "تاتا" وہ مارٹی کو پچکارتے اور ڈپٹتے ہوئے بولا "ایسا نہیں' تم تو اتنے ہمت والے نوجوان ہو' یہ بچوں کی طرح کیا! اب کیا بات ہے۔ آدھی سے زیادہ جنگ تو تم نے جیت لی ہے۔ دوچار ہاتھ کی بات ہے بس۔۔۔" کیلاش کو میری تائید کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ اسی لیے وہ مڑ کے مجھ سے مخاطب ہوا "آپ ہی اس خوبصورت اور بہادر نوجوان کو سمجھائیے نا۔۔۔!" وہ ٹھہر گیا۔ میری آنکھیں بھی بھر آئی تھیں "یہ کیا؟" وہ ناراضی سے بولا "آپ بھی۔۔۔ آپ کو تو۔۔۔ نہیں نہیں' یہ تو بہت غلط ہے۔"

میں نے بہ مشکل ضبط کیا۔ کیلاش نے بستر کی دوسری جانب مارٹی کے پاس بیٹھ کے اپنے رومال سے گالوں پر بہتے ہوئے مارٹی کے آنسو پونچھے اور طرح طرح بہلاتا' پھسلاتا رہا۔ موسم کا ذکر کرنے لگا کہ باہر کیسا رنگین اور دل نشین موسم ہے۔ خوب چھما چھم بارش ہورہی ہے۔ پھول پھلواری

توجیسے زمین سے ابل رہی ہے اور بھی بہت سی دل انگیز باتیں' پھر شوخی سے بولا "ماسٹر! بس ذرا جلدی سے ٹھیک ہوجاؤ۔ دو چار داؤ آڑے وقت کے لیے ہم کو بھی سیکھنا ہے" کیلاش مکا تان کے ادھرادھر گھمانے لگا۔

مارٹی کو ہنسی نہیں آئی۔ کیلاش نے بھی پھر اسے زیادہ نہیں چھیڑا۔ یہ میری موجودگی کا اثر تھا یا مارٹی کے اندر کی قوت تھی کہ دوبارہ بحال دکھائی دینے لگا۔ اس کی الجھی ہوئی تیز تیز سانسیں ہموار ہوتی گئیں' وہ نقاہت سے بولا "گھر میں سب ٹھیک ہیں۔"

"ہاں" میں نے جلدی سے کہا "سبھی یہاں تمہارے پاس' تمہیں دیکھنے کے لیے آنا چاہتے ہیں۔ انہیں روک دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر اتنی بھیڑ پسند نہیں کرتے۔"

وہ چپ ہوگیا اور کچھ سوچتا رہا' پھر کہنے لگا "دادا نہیں آئے؟"

"بتھل بھائی!" میں نے شگفتگی سے کہا "کسی وقت بھی آتے ہوں گے۔ جولی بتا رہی تھی کہ آج صبح انہیں آنا ہے۔"

"وہ کیا بولیں گے؟" وہ سراسیمگی سے بولا۔

"کیا بولیں گے!" میں نے کہا "یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ اس میں تمہاری یا کسی کی کیا خطا تھی۔ دیکھنا' وہ ایک لفظ بھی نہیں کہیں گے۔ ان کے لیے یہ نئی بات تو نہیں ہے۔"

اس نے آنکھیں میچ لیں۔ میرے جی میں آیا' اس وقت وہ خاصا بہتر نظر آرہا ہے' مجھے نواب ثروت یار کے خط کے سلسلے میں اسے کچھ بتانا چاہیے۔ چند لمحوں کے لیے میرے حواس منتشر ہوئے تھے لیکن پھر میں نے خود کو مجتمع کرلیا۔ کیلاش کے اشارے کی باوجود کچھ دیر میں اور ٹھہر سکتا تھا۔ مارٹی کی بھی شاید یہی خواہش تھی۔ اسی اثنا میں نرس نے آکے اس کے منہ میں تھرمامیٹر لگادیا۔ کیلاش کے بستر سے ہٹ جانے کے بعد میں بھی کھڑا ہوگیا۔

کلینک سے میں سیدھا گھر آیا۔ ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ جیسے ہی میں دروازے میں داخل ہوا۔ جولین مجھے مل گئی "دیر کردی!" وہ کوئی توقف کیے بغیر تیزی سے بولی "تمہارا سامان میں نے موٹر میں رکھوادیا ہے۔ سوٹ کیس میں احتیاطاً تمہاری چیک بک بھی رکھ دی ہے' اور چند کتابیں بھی۔ کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو بتادو۔ یہ بٹوا بھی رکھ لو' اس میں دو ہزار روپے ہیں۔ بادا ابھی پونا سے نہیں آسکے ہیں۔ جانے کیا بات ہے۔ انہیں تو صبح آجانا چاہیے تھا۔ بارش کی وجہ سے ہوسکتا ہے گاڑی لیٹ ہوگئی ہو۔ بہرحال وقت کم رہ گیا ہے۔ میرا خیال ہے' کھانا کھا کے تم فوراً روانہ ہوجاؤ۔ اتفاق سے ابا جان بھی گھر پہ نہیں ہیں" وہ ایک ہی سانس میں بولتی رہی۔

میں خاموش کھڑا اس کی صورت دیکھا کیا۔

"جگنو اور دیوا میں سے کوئی تمہارے ساتھ نہیں آیا؟"

"نہیں" میں نے آہستگی سے کہا۔

"کیا کلینک سے ساتھ لوگے؟"

"نہیں" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا "میں' میں نہیں جارہا۔"

"کیا!" وہ سرتاپا سوال بن گئی "تم کیا کہہ رہے ہو؟ ماسٹر کی حالت۔۔۔؟"

"نہیں' اسے خاصا افاقہ ہے۔"

"پھر کیا ہے؟ کیا بات ہے؟"

"کوئی بات نہیں" میری آواز بکھرنے لگی۔ وہ دم بخود ہوگئی تھی۔ میں اسے راہداری میں چھوڑ کے اوپر چلا آیا۔

جوتے اتار کے میں نے پانی پیا تھا کہ وہ جھجکتی ہو کمرے میں داخل ہوئی اور مضطربانہ بولی "تم کوئی غلطی نہیں کررہے؟"

"معلوم نہیں" میں نے ہونٹ بھینچ لیے "شاید نہیں۔"

"میرا خیال ہے" وہ اٹکتی زبان سے بولی "ہوسکے نظرثانی کرلو۔ ابھی وقت ہے۔"

"ہوں" میں سرہلا کے رہ گیا۔

وہ دروازے کے پاس کھڑی رہی اور اس کے چہرے رنگ آتے رہے' جاتے رہے۔ وہ فوراً ہی چلی گئی۔ میں ا روک بھی نہیں سکا۔

ایک دم تیز دھوپ نکلی تھی پھر جانے کس تیزی بادلوں نے آسمان کو گھیرلیا۔ دیکھتے دیکھتے ہر طرف اند چھاگیا اور گھن گرج سے بارش ہونے لگی۔ میں نے مسہری لیٹ کے بہ جبر آنکھیں بند کرلیں۔ جولین جیسے مجھ سے چھیننے آئی تھی اور مجھے کسی شکنجے میں کس گئی تھی۔ میں تحاشا آئینے سے دھند صاف کرتا اور اپنا گم گشتہ آموختہ کرتا رہا۔ کچھ دیر کے لیے میں ضرور اپنے آپ سے غافل اور مسہری پر لوٹتا' تڑپتا رہا لیکن پھر سب کچھ میرے اخ میں آگیا۔

دیواری گھڑی ٹک ٹک کرتی رہی۔ ایک بجا' پھر دو گئے۔ مجھے ایسا لگا جیسے زمین ٹھہر سی گئی ہو۔ گھڑی کی آواز رفتہ ماند پڑنے لگی تھی۔ مجھ پر غنودگی طاری ہوئے گزرے ہوں گے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میرے میں آئی کہ جواب نہ دوں' ایسے ہی پڑا رہوں مگر جانے

بات ہوئی۔ کسی ان جانے وہم نے مجھے مسہری سے اٹھادیا۔ ملازمہ مجھے کھانے کے لیے بلانے آئی تھی۔ پہلے میں نے منع کردیا تھا' پھر میں نے اس سے کہا "ٹھیک ہے' میں ابھی آتا ہوں۔"

نیچے فرشی دسترخوان پر تقریباً سبھی موجود تھے۔ پلیٹیں رکھی ہوئی تھیں۔ میرے پہنچتے ہی ملازمہ' شہ پارہ اور فرخ ونگے بھی لے آئیں۔ صبح اتنے ناشتے کے بعد بھوک ویسے بھی نہیں لگ سکتی تھی' لیکن میں نیچے آیا تھا تو مجھے کھانے میں شامل رہنا چاہیے تھا اور شمولیت محض ساتھ بیٹھنے کی نہیں ہوتی۔ میں نے جولین کی ماں اور گیتا کی ماں رانی کو سلام کیا' گیتا سے خیریت پوچھی اور فرخ سے معلوم کیا کہ آج کون کون سے کھانوں پر تجربے کیے ہیں۔ ان پر اپنے ہوش حواس کی یک جائی کے اظہار سے زیادہ خود مجھے اپنے توازن اعتدال کی تصدیق مطلوب تھی۔ سبھی خاموش خاموش تھے' موت کے کھانے پر جو سوگواری ہوتی ہے۔ کھانے کے دوران میں جولین نے مجھے بتایا کہ بتھل' جمرو اور ٹنگو پونا سے آچکے ہیں اور آتے ہی کلینک چلے گئے ہیں۔ یہ اطلاع میں نے اسی سکون سے سنی جس تحمل سے جولین نے سنائی تھی۔ دسترخوان سے اٹھ کے میں ملاقاتی کمرے میں آگیا۔ فرخ' فریال' شہ پارہ اور گیتا بھی میرے پیچھے پیچھے وہاں چلی آئیں۔

ساڑھے تین بج رہے تھے کہ جگنو وحشت زدہ انداز میں اندر آیا اور اس نے مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ اس کی ابتری دیکھ کے میرا دل دھک سے رہ گیا۔ جگنو کی بے حانی' فرخ' فریال وغیرہ سے بھی چھپی نہیں رہ سکی تھی۔ گو جگنو نے ان کے استفسار پر تسلی دلاسے ہی کی بات کی لیکن اسے نہ اپنے لہجے کا کوئی اندازہ تھا نہ حال کا۔ باہر آکے اس نے اکھڑی ہوئی سانسوں سے مجھے بتایا کہ مارٹی کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی ہے۔ دوسرے ہی لمحے میں نے دروازے کی طرف بھاگنا شروع کردیا تھا۔ جگنو نے موٹر لانے کو کہا۔ موٹر زیادہ دور نہیں تھی۔ مجھے خیال آیا' میرے اس طرح چلے جانے سے اندر سبھی پریشان ہوں گے۔ انہیں کچھ بتا کے جانا ہی بہتر ہے۔ میں نے ڈرائیور سے ٹھہرنے کو کہا اور اندر جاکے انہیں بتادیا کہ جگنو کیسی خبر لایا ہے۔

چند منٹ میں موٹر کلینک پہنچ گئی۔ سامنے والان کی کرسی پر بتھل سر جھکائے تنہا بیٹھا تھا۔ زورا' شامو' جمرو' دیوا اور ٹنگو مارٹی کے کمرے کے باہر منڈلا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کے زورا میرے گلے سے لپٹ گیا اور سسک سسک کر رونے لگا۔

جمرو نے اسے میرے پاس سے ہٹایا۔ میں نے اندر جانا چاہا لیکن نرس نے مجھے روک دیا۔ نرس کی زبانی معلوم ہوا کہ ڈاکٹر بھارگو' ڈیسائی' شیوا اور کیلاش اندر مارٹی کے پاس ہیں۔ کمرے سے مارٹی کے کراہنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ پندرہ بیس منٹ بعد ڈاکٹر بھارگو اور ڈاکٹر ڈیسائی باہر نکلے۔ ہم سب نے انہیں گھیرلیا۔ وہ دونوں ہونٹ لٹکائے' سرہلاتے رہے۔

"اپنے کو کچھ بولو صاحب!" زورا نے بلکتے ہوئے کہا۔

دونوں ڈاکٹروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ڈاکٹر ڈیسائی بھاری آواز میں بولا "ابھی کچھ ٹھیک ہے' پر پہلے ہم کیا بولے تھے بابا! سارا اوپر والے کے ہاتھ میں ہے۔"

یہ کہتا ہوا ڈاکٹر ڈیسائی' ڈاکٹر بھارگو کے ساتھ اوپر اپنے گھر جانے والی سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ جو جہاں تھا۔ وہیں ساکت وصامت کھڑا رہ گیا۔

کیلاش ابھی اندر تھا۔ اس کے انتظار میں میری آنکھیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ شیوا کے ساتھ باہر آیا۔ دونوں کے چہرے سوجے ہوئے' شانے ڈھلکے ہوئے تھے۔ میں سامنے ہی موجود تھا۔ مجھے دیکھ کے کیلاش کے جسم میں ایک لہر سی اٹھی اور ڈوب گئی۔ اس کی چال میں پہلے جیسی لپک نہیں تھی۔ آہستہ قدموں سے وہ سیدھا میرے پاس آیا اور پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔

میں نے زبان کھولنی چاہی مگر مجھے اور کیا جاننا تھا۔ شامو کو قرار نہیں تھا۔ وہ گھگھیائے ہوئے لہجے میں بولا "ابھی کیسا ہے اپنا ماسٹر؟"

کیلاش اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے ڈوبی ہوئی آواز میں بولا "پہلے سے تو اب بہت سنبھل گیا ہے۔"

"ایک دم یہ کیا ہوگیا اس کو؟"

"کیا بتائیں" کیلاش کے ماتھے پر شکنیں پڑگئیں۔ وہ نرم روی سے شامو کو سمجھانے لگا کہ "مارٹی کا سینہ پہلے سے متاثر تھا اور اس کی آنتیں بھی۔۔۔" اسے احساس ہوا کہ وہ انگریزی میں مخاطب ہے۔ یوں بھی یہ طبی زبان شامو کی سمجھ میں کیا خاک آئے گی۔ چند لمحوں کے تامل کے بعد وہ شامو کی زبان میں بولا کہ کئی اور اندرونی پیچیدگیاں بھی تھیں۔ ہم نے ان پر نظر رکھی تھی۔ خیال تھا کہ شگاف ذرا سوکھ جائے تو بعد میں باقاعدہ دوسرا علاج کیا جائے مگر کئی تکلیفیں ایک دوسرے پر اثرانداز ہوتی رہیں اور سب کچھ الٹ پلٹ ہوگیا۔ مارٹی کی آنتوں کی آگ' ہم نے بجھانے اور زخم سے دور رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن۔۔۔ کیلاش کی آواز حلق میں پھنس گئی۔ کہنے

لگا "ہم سب کو ایک ہی ڈر تھا۔"

"اب' اب کیا حال ہے اس کا؟" شامو نے ہذیانی انداز میں پھر وہی سوال دہرایا۔ شامو کی خواہش ہوگی کہ اس بار جواب میں شاید وہ کچھ اور سن سکے مگر کیلاش کے پاس کچھ اور ہوتا تو وہ اتنا بخل کیوں کرتا۔

زورا نے کیلاش کے پیر پکڑ لیے اور گڑگڑانے لگا۔ جمرو نے بہ مشکل اسے اٹھایا اور دور لے گیا۔ جمرو پھر سبھی کو والان میں رکھی ہوئی کرسیوں تک لے آیا۔ سب وہیں ڈھیر ہوگئے۔

مارٹی کے کمرے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ والان میں سناٹا طاری تھا۔ میں بٹھل سے بہت قریب تھا۔ اس نے نہ مجھ سے کچھ پوچھا' نہ سر اٹھا کے دیکھا۔ سبھی گونگے بن گئے تھے یا پتھر ہوگئے تھے۔ آدھ پون گھنٹے بعد ڈاکٹر بھارگو نیچے اترا اور چند لمحے مارٹی کے کمرے میں ٹھہر کے کلینک سے چلا گیا۔ کیلاش اور دوسرے ڈاکٹر اسے باہر تک چھوڑنے گئے تھے۔ واپس آ کے کیلاش ہمارے درمیان ہی بیٹھ گیا۔ اس کی ہدایت پر کمپاؤنڈر چائے بنا کے لے آیا۔ بٹھل اور کیلاش کی موجودگی کی وجہ سے کسی نے پس و پیش نہیں کیا' میری طرح سبھی نے چائے زہر مار کی ہوگی۔

"آپ گھر چلے جاؤ بابا! سفر کی تھکن ہوگی" کیلاش نے جھجکتے ہوئے بٹھل کو مشورہ دیا۔

"تھکن تو ادھری آ کے دور ہوگئی ساری" بٹھل نے بوجھل آواز میں کہا۔

کیلاش چپ ہوگیا مگر کچھ دیر بعد بٹھل خود اٹھ گیا۔ اس کے ساتھ سبھی کھڑے ہوگئے۔ بٹھل آہستہ آہستہ چلتا ہوا کلینک سے نکل گیا۔ وہ پیدل ہی جا رہا تھا۔ میں نے دبے لہجے میں اسے بتایا کہ موٹر بھی موجود ہے۔ جمرو نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ بھی ساتھ چلے' کوئی جواب دیے بغیر بٹھل موٹر میں بیٹھ گیا۔

دھوپ رینگتی ہوئی اوپر چلی گئی۔ کلینک میں اندھیرا پھیلنے لگا۔ کیلاش میرے پہلو میں بیٹھا تھا کہ ایک نرس مارٹی کے کمرے سے لپکتی ہوئی اس کے پاس آئی۔ اس نے بے ربطی سے انگریزی میں بتایا کہ مارٹی کی آنکھ کھل گئی ہے اور وہ درد و کرب کے عالم میں ہے۔ کیلاش ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ میں بھی اٹھا لیکن کیلاش نے مجھے کمرے میں نہیں جانے دیا۔

مارٹی کی چیخیں عمارت میں گونج رہی تھیں۔ خنجر کی طرح میرے سینے' میرے جسم میں پیوست ہو رہی تھیں۔ درد سہنے والے کو کچھ احساس نہیں ہوتا کہ دوسرے' اس کے جاں پر کیا گزرتی ہوگی۔ زورا' شامو' جمرو' ٹگو کے چہرے رہے تھے۔ اتنے بہت سے آدمی ایک آدمی کا دکھ نہیں با سکتے! مارٹی بری طرح ڈکرا رہا تھا۔ ڈاکٹر شیوا بھی نیچے آ دونوں تعینات ڈاکٹر بھی اندر چلے گئے۔ زورا' شامو اور اندر جھانکنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ نرس نے دروازہ بند کر دیا۔

کمپاؤنڈر نے کلینک کی ساری روشنیاں جلا دیں جب بینائی میں اندھیرا بیٹھا ہو' آنکھوں میں ریت بھری جانے کتنا وقت گزرنے پر کیلاش کمرے سے نمودار ہوا۔ کے ماتھے پر پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ اس نے مجھے اندر آ اشارہ کیا۔ مجھے اس کا مطلب سمجھنے میں دیر نہیں لگی' چار قدم کا فاصلہ طے کر کے وہ خود میرے پاس آگیا اور ہوئی آواز میں بولا "وہ آپ کو بلا رہا ہے۔"

"مجھے' مجھے بلا رہا ہے؟" میں نے اپنا خشک گلا تر کیا ہکلاتے ہوئے پوچھا۔ میرا سارا جسم شل ہوگیا تھا۔ لر ٹانگوں سے میں اندر داخل ہوا۔ دونوں ڈاکٹر' نرسیں شیوا مارٹی کے بستر کے اطراف کھڑے تھے۔ مجھے دیکھ ہٹ گئے۔ ان کے ہٹنے پر مجھے مارٹی کا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ رہا تھا۔ میں جھپٹ کے اس کے بستر پر بیٹھ گیا۔ مجھے کچھ معلوم کہ میں نے اس سے کیا کیا کہا' کیسا ہذیان بکتا رہا لمحے لمحے بدل رہا تھا' کبھی اس کی آنکھیں ویران ہو جا کبھی ان میں آگ بھڑکنے لگتی۔ میں نے اس کے ہاتھ پکڑ اور بے تحاشا چومتا رہا۔ میں نے اس کے گال چومے' پیشانی کو بوسہ دیا۔ اپنی بے ہنری اور بے اثری کا اح آدمی کو کیسا اجیرن' کیسا پاگل کر دیتا ہے۔ میں نہ اپنے حال اسے بتا سکتا تھا' نہ اس کی دل جوئی کر سکتا تھا۔ نہ کچھ سننے کا یارا تھا۔ نہ میری اتنی استطاعت تھی۔ اس انگلیاں میری انگلیوں میں پیوست ہوگئیں "اپن کو معا راجا بھائی!" وہ تڑپتی بلکتی آواز میں بولا۔

"کیا! تم کیا کہہ رہے ہو؟ کس بات کی معافی؟" میں اسے جھڑک دیا اور میری سسکی نکل گئی۔ میں نے اس منت کی کہ وہ ایسی باتیں نہ کرے۔

اس کی آنکھیں درد کی شدت سے بار بار بند ہو تھیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کی آواز نہیں نکل تھی۔ اس کے ہونٹ پھڑپھڑا کے رہ جاتے تھے۔ میں نے کان اس کے قریب کر لیے "بولو بولو مارٹی! کیا بات ہے؟ مسلسل اس سے پوچھتا رہا۔ بہت تگ و دو کے بعد اس ہونٹوں کی جنبش سے میری سمجھ میں کچھ آسکا کہ وہ شاید کوئن کہنا چاہتا ہے۔ "کوئن! کوئن! جولی!" میں نے دھڑکتی آواز میں تائید چاہی۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ میری نگاہ فوراً دروازے کی طرف گئی۔ کیلاش دور کھڑا تھا۔ میں نے سوچا' اس سے کہوں لیکن پھر میں لپکتا ہوا باہر نکل آیا۔ میں نے جمرو کو پاس بلایا اور اس سے کہا کہ وہ کوئی تاخیر کیے بغیر جولین کو کلینک لے آئے۔

جمرو اسی لمحے دروازے کی طرف بھاگا۔ مجھے خیال آیا کہ باہر موٹر کھڑی نہیں ہوگی۔ ایک ہی صورت تھی کہ کیلاش اپنی موٹر لے کے جائے۔ جمرو نکل چکا تھا۔ مجھے کمرے سے بھاگتا دیکھ کے کیلاش بھی باہر آگیا تھا۔ میری بات سن کے اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ اپنی بے اوسانی اور منتشر حواس کے باوجود مجھے اتنا ہوش تھا کہ کیلاش کا تکدر یا تردد دور کرنے کے لیے جولین کے ساتھ چند اور نام بھی لوں۔ سو میں نے کہا۔ گیتا' فرخ فریال وغیرہ میں سے جو بھی فوراً آسکے' وہ اسے لے آئے۔ مجھے اندازہ تھا کہ جولین کے لیے اتنا ہی کافی ہوگا۔ وہ سنتے ہی چلی آئے گی۔ کیلاش بھی اسی دم باہر نکل گیا۔ جمرو ابھی اسے راستے میں مل سکتا تھا۔ میں واپس مارٹی کے پاس چلا آیا اور چپ چاپ اس کے سرہانے بیٹھ گیا۔ اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ اسے کیا تلقین' کیا تعلیم کروں۔ کون سے لفظ' کون سی زبان میں اسے امید' زندگی اور گداز کی ترغیب دوں۔ نہ پھول نہ ریشم' نہ رنگ نہ روشنی۔ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ سبھی کچھ ہیچ لگتا ہے۔ سب جھوٹ' سارا وہم و گمان' چند منٹ ہوئے ہوں گے کہ مارٹی کے پاس ٹھہر کے میں پھر باہر چلا آیا اور میں نے شامو سے پوچھا کہ کیلاش تو ابھی واپس نہیں آیا۔ وہ حیرانی سے کہنے لگا کہ وہ تو ابھی گھر تک بھی شاید نہ پہنچا ہو۔ ان سب نے مجھے گھیر لیا تھا۔ سب کچھ جاننے بوجھنے کے باوجود وہ مجھ سے سوال کرتے تھے کہ ایسی کیا بات ہے۔ میں انہیں کیا بتاتا۔ مجھ میں کچھ بتانے کی ہمت ہی کہاں تھی۔ وہ اصرار کرتے تو میری آنکھوں میں آنسو اڈنے لگتے اور جتنا میں ضبط کرنے کی کوشش کرتا۔ اتنا ہی سینہ گرجنے لگتا۔ ٹگو پھر اپنا سر پیٹنے لگا۔ میں کبھی مارٹی کے کمرے میں جاتا' کبھی واپس آتا۔ وقفے وقفے سے اس پر غشی طاری ہو جاتی اور یکایک ہوک سی اٹھتی۔ وہ ہڑبڑا کے آنکھیں کھول دیتا اور مضطربانہ دیدے گھمانے لگتا۔

جولین کے کلینک میں آتے وقت مجھے باہر ہی رہنا چاہیے تھا۔ کہیں میں اندر کمرے میں ہوں اور جولین' فرخ' فریال وغیرہ کے ساتھ سیدھی کمرے میں چلی آئے۔ پہلے مجھے جولین سے کچھ کہنا تھا۔ نرسیں ہر لمحہ مارٹی کی نگرانی کر رہی تھیں۔ ایک ڈاکٹر بھی وہاں تھا۔ کمرے میں ویسے بھی میری مستقل موجودگی سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

اس وقت میں کمرے سے باہر ہی تھا کہ موٹر کا ہارن بجنے کی آواز آئی۔ دربان نے چھوٹا دروازہ کھولا تو مجھے جمرو دکھائی دیا۔ مجھ میں ذرا سا تحمل نہیں تھا۔ جولین کو سامنے نہ دیکھ کے مجھے ہول آنے لگا۔ اس بے جواز شبہے نے کہ کہیں کسی وجہ سے جولین نہ آسکی ہو' میرا جسم منجمد کر دیا۔ اسے تو ہر حال میں آنا چاہیے۔ میری نظریں دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ جمرو کے بعد شہ پارہ اور فرخ دروازے میں داخل ہوتی نظر آئیں۔ جولین ان کے پیچھے تھی۔ اسے دیکھ کے میرے اوسان کچھ بحال ہوئے۔ وہ نیلی شال لپیٹے ہوئی تھی' سر جھکائے وہ جیسے ہی صحن میں آئی' میں نے بڑھ کے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ اتنا موقع نہیں تھا کہ میں کھل کے کوئی بات کر سکتا۔ جیسے تیسے میں نے ہانپتی سانسوں سے اسے کچھ بتانا چاہا۔ وہ ساکت کھڑی رہی اور میری بات پوری سنے بغیر آگے چل پڑی۔ اس اثنا میں کیلاش بھی موٹر بند کر کے اندر آگیا۔ فرخ' فریال' مارٹی کے کمرے میں داخل ہوا چاہتی تھیں' انہیں یوں روکنا عجیب سا لگ رہا تھا تاہم کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔ مجھے انہیں روکنا ہی تھا۔ بہ مشکل میں نے جرات کی اور ان سے کہا کہ باری باری وہ اندر جائیں تو اچھا ہے۔ جولین نے انہیں پس و پیش کی مہلت نہیں دی اور کمرے میں داخل ہوگئی۔ کیلاش بھی یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ باہر ہی ٹھہرا رہا۔ میں سوچا کیا کہ اس سے کس طرح کہوں کہ کچھ دیر کے لیے وہ کمرے میں موجود دونوں نرسوں اور ڈاکٹر کو بھی باہر بلا لے۔ میں کیلاش سے ابھی کچھ کہہ نہیں پایا تھا اور ارادہ ہی کر رہا تھا کہ اس نے میرے چہرے سے جیسے میرا مدعا جان لیا۔ اس نے دروازے کے پاس کھڑی ہوئی فرخ اور شہ پارہ کو دوسرے کمرے میں بیٹھنے کی ہدایت کی اور خود مارٹی کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ فوراً ہی واپس آگیا اور وہ اکیلا نہیں تھا۔

مجھے دالان میں رکھی ہوئی کرسی پر بٹھا کے وہ ڈاکٹر اور نرسوں کے لیے مخصوص کمرے میں جا چھپا' میں سمجھتا تھا۔ وہ جان بوجھ کے مجھ سے اوجھل ہوا ہے۔ اسے احساس ہوگا کہ اس وقت میرے سامنے اس کی موجودگی مجھے اور گراں بار کر سکتی ہے۔ میں اس کے چہرے پر بلبلاتے ہوئے سوالوں کا

جواب نہیں دے پاؤں گا یا اسے خود اپنا یارا نہیں تھا۔ وہ اپنی آنکھوں میں اٹھتا ہوا غبار مجھ سے نہ چھپا سکے گا اور یہ اس قسم کے کسی تاثر و احساس' رنج و شکایت اور ہیجان و اضطراب کا کوئی محل نہیں ہے۔ سو اسے میرے قریب نہیں رہنا چاہیے۔ تمام جور و ستم کے لیے آدمی کے پاس اپنا سینہ تو ہوتا ہی ہے' اسی کو آزماتے رہنا چاہیے۔

جولین کے اندر جانے کے بعد مارٹی کے کمرے سے کوئی آہ اور کراہ بلند نہیں ہوئی۔ سب ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ زورا کسی خانماں برباد شخص' کسی پاگل کے مانند فرش پر سر پکڑے بیٹھا تھا۔ اس کے پہلو میں ٹنگو اپنا منہ نوچ کھسوٹ رہا تھا۔ جمرو' شامو' جگنو اور دیوا' دیواروں اور کھموں سے ٹیک لگائے گم کھڑے تھے۔ کلینک پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بس دیوار کے وسط میں نصب گھڑی کی آواز دالان میں گونجتی رہی۔

جولین کو اندر گئے آٹھ دس منٹ سے زیادہ نہیں ہوئے ہوں گے کہ وہ ہانپتی کانپتی دروازے پر نمودار ہوئی۔ اس کی آنکھوں سے وحشت برس رہی تھی اور چہرہ جیسے آگ میں جل رہا تھا۔ اپنی شال کی بے ترتیبی کا بھی اسے ہوش نہیں تھا۔ دروازے پر اس کی سیمابی نگاہوں نے میری پناہ گاہ دیکھ لی تھی۔ وہ دیوانہ وار میری طرف بڑھی اور میرے پاس آ کے اس کا بدن بل کھا گیا' وہ میرے قریب کی کرسی پر نڈھال ہو کے بیٹھ گئی اور اس نے شال سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے زمین میں دھنسا جا رہا ہوں۔ میں نے اٹھ کے اس سے پوچھنا چاہا' پھر میں نے مارٹی کے کمرے کا رخ کیا اور دروازے میں داخل ہوتے ہوتے پلٹ کے ڈاکٹروں کے کمرے کی طرف بھاگا۔ کیلاش بھی آہٹوں کا منتظر تھا۔ وہ خود کمرے سے باہر آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے دونوں ڈاکٹر' دونوں نرسیں بھی۔۔۔

کیلاش دیر تک مارٹی کے کمرے سے نہیں نکلا۔ ایک نرس اوپر جا کے ڈاکٹر ڈیسائی کو بلا لائی۔ ڈاکٹر شیوا اور اس کی بیوی بھی نیچے آ گئے۔ کچھ دیر میں ڈاکٹر بھارگو بھی کلینک میں آ گیا۔ فرخ اور شہ پارہ ایک خالی کمرے میں اپنی باری کا انتظار کرتی رہیں۔ جولین بھی ان کے پاس پہنچ گئی تھی۔ یہی مناسب تھا کہ وہ گھر واپس چلی جائیں۔ کیلاش کے مصروف ہو جانے کی وجہ سے اس کی موٹر میں واپسی ممکن نہیں تھی۔ دیوا ان کے لیے سواری لے آیا۔ تینوں گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کے گھر کی طرف روانہ ہو گئیں۔

○☆○

اس وقت نو بج رہے تھے۔

رات کو دس بجے کے قریب مارٹی مر گیا۔

گیارہ بجے تک ہم اسے گھر لے آئے تھے۔ رات بھر وہ گھر ہی رہا۔ دوسرے دن صبح نہا دھو کے اور نئے کپڑے پہنا کے اسے تیار کر دیا گیا۔ اس کی میت کے جلوس میں گنتی کے آدمی تھے۔ گھر کے سارے مرد' کیلاش کے علاوہ ڈاکٹر شیوا اور وہ دونوں ڈاکٹر جو آخر تک اس کی نگہداری کرتے رہے' چھیدا اور ماہم کے باڑے کے دو چار آدمی' جہاں مارٹی کبھی حکومت کیا کرتا تھا۔ ٹنگو اس گلی میں جا کے خبر کر آیا تھا۔ اس گلی سے تین آدمی قبرستان آئے۔ ان میں ایک عمر رسیدہ عورت بھی تھی۔ ٹنگو کے کہنے کے مطابق وہ مارٹی کے دور کے عزیز تھے۔ مارٹی کا تابوت قبر میں اتارنے سے پہلے کھول دیا گیا۔ اس کے چہرے پر سکون چھایا ہوا تھا۔ ہر اذیت اور غم سے بے نیاز۔ جیسے اسے کچھ ہوا ہی نہ تھا' جیسے ابھی ابھی سویا ہو اور کوئی خواب دیکھ رہا ہو' ذرا سی آہٹ سے اٹھ جائے گا۔ عمر رسیدہ عورت تابوت سے لپٹی سسکیاں بھرتی رہی۔ ٹنگو دھاڑیں مارتا رہا۔ مارٹی سوتا رہا اور اسے جلد ہی مٹی میں دبا دیا گیا اور مٹی پر ابا جان نے بے شمار پھول بکھیر دیے۔ گلاب کے تازہ تازہ' سرخ سرخ پھول۔

سارے کاموں سے نمٹ کے ہم گھر واپس آ گئے۔

اس دن جیسے گھر کے سارے لوگ مر گئے تھے۔ کوئی کسی کی طرف دیکھتا' کسی سے بات نہیں کرتا تھا۔ زورا تو بالکل پاگل ہو گیا۔ رات کو اس نے تھانے جا کے خود کو پیش کر دیا۔ دوسرے دن صبح صبح پولیس آ گئی۔ وہ لوگ دوپہر تک طرح طرح کے سوالات کرتے رہے۔ پھر شامو' دیوا اور جگنو نے بھی اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ کہنے لگے صرف زورا نہیں' وہ بھی اتنے ہی قصوروار ہیں۔ شامل تو میں بھی ان میں تھا' مجھے بھی اپنا نام دے دینا چاہیے تھا لیکن میں بس دیکھتا اور سنتا رہا۔ ابا جان کو ڈاکٹر ڈیسائی کے پاس جانا پڑا۔ ڈاکٹر ڈیسائی' بھارگو' شیوا اور کیلاش کی یقین دہانی اور تسلی تشفی پر پولیس کو کچھ خیال آ گیا۔ ابا جان نے مدد کے لیے احتیاطاً شکلا کو بھی بلوا لیا تھا۔ ممکن ہے ابا جان نے کچھ دولت بھی لٹائی ہو۔ ان کے پاس یہ ایک بڑا ہنر تھا۔ زورا کو وہ اسی شام حوالات سے لے آئے۔ وہ آنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ گھر آ کے بھی فیل مچانے' دیواروں سے سر پھوڑنے لگا۔ بٹھل نے اٹھ کے اسے طمانچے مارے' ٹھوکریں لگائیں تب وہ قابو میں آیا۔

سارا دن پولیس کے سوال و جواب اور زورا کی دیوانگی میں گزر گیا۔ مجھے بھی سب کے ساتھ بیٹھنا پڑا۔ میں تو اپنے

کمرے ہی میں پڑا رہنا چاہتا تھا اور سب کی شاید یہی خواہش تھی۔ سب ایک دوسرے سے منہ چھپائے پھر رہے تھے۔ کبھی کوئی سامنے آ جاتا تو گلے مل کے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگتا۔ ایک غم گسار اور دوسرے غم گسار سے کہہ بھی کیا سکتا ہے' آنسوؤں کے سوا کیا دے سکتا ہے۔ میری آنکھوں میں تو آنسو بھی نہیں رہے تھے۔ میں اندر گھر کی طرف بھی نہیں گیا۔ قبرستان سے واپسی پر ملاقاتی کمرے سے گزرتے ہوئے میں نے رما کی جھلک دیکھی تھی۔ اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی سرخ سپید لڑکی کوشلی ہی ہو سکتی تھی۔ رما نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا اور صوفے سے اٹھ گئی تھی لیکن میں سیڑھیاں طے کر کے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ وہ دونوں شاید رات کو واپس گئیں۔ کیلاش تو دن بھر وہاں رہا۔ دوسرے دن بھی وہ سویرے سویرے آ گیا تھا۔ پولیس کے آنے پر ابا جان اسی کو لے کے ڈاکٹر ڈیسائی کے پاس گئے تھے۔

"یہ کیسا عالم ہوتا ہے جب نہ کوئی راحت ہوتی ہے نہ اذیت' نہ دکھ سکھ۔ آدمی سانس لیتا' اٹھتا بیٹھتا' چلتا پھرتا ہے پر نہ تازہ ہوا کی کشادہ تنی' نہ حبس کی تنگی' نہ وقت' رفتار اور موسم کا احساس۔ آدمی زندہ ہے' مردہ بھی نہیں۔ مقبرے تو زندہ آدمیوں کے بھی ہوتے ہیں۔ ابا جان کا یہ عظیم الشان مکان بھی کوئی مقبرہ بن گیا تھا۔ کھنڈر صرف عمارتوں کے نہیں ہوتے' آدمی بھی تو کھنڈر ہو جاتے ہیں اور جب آدمی کھنڈر ہو جائیں تو اونچے محل دو محلوں کی کیا حیثیت۔ ان بستیوں کو پھر کیا کہنا چاہیے جہاں کے مکین ہی کھنڈر ہو چکے ہوں۔

آدمی بھی درختوں کے مانند ہوتا ہے' قد و قامت' سائے' ثمر اور شاخوں میں بالکل درخت کے مثل۔ درخت گر جائے تو اندازہ ہوتا ہے' اس کا سایہ کتنا پھیلا ہوا' ثمر کتنے شیریں اور جڑیں کتنی گہری تھیں۔ آدمی کے جانے کے بعد ہی کچھ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتنا محیط ہے' رنگوں اور روشنیوں میں کتنا شامل۔ اس کے جانے سے رنگ مرجھا جاتے ہیں اور روشنیاں کیسی سنسان' ویران ہو جاتی ہیں۔ ایک آدمی کی صرف اپنی آنکھیں نہیں ہوتیں' وہ بہت سی آنکھوں میں رہتا ہے اور بہت سے دلوں میں دھڑکتا ہے پھر ایک آدمی کے جانے سے بینائی تو کم ہو ہی جائے گی' دل تو غریب ہو ہی جائے گا۔ اور جانے والے کو کچھ خیال نہیں ہوتا کہ وہ کیسی خودغرضی کر رہا ہے۔ موت تو ایک طرح کی خودغرضی ہے۔ کتنوں کو دکھ دے کے آدمی سکھ سے چلا جاتا ہے' چپکے سے چلا جاتا ہے۔ پلٹ کے نہیں دیکھتا' کون صدا لگاتا' کس کا سینہ جلتا ہے۔ کس کی آنکھیں خوں بار ہیں۔

تیسرے دن' اول پہر کا وقت ہوگا۔ میں اوپر کے کمرے میں پڑا تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ صبح کسی وقت ملازمہ آ کے چائے وغیرہ رکھ کے چلی گئی تھی۔ میرے تصور میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ باہر سے آنے والی چاپ کیلاش کی ہوگی اور وہ اچانک اوپر چلا آئے گا۔ میں اٹھ کے بیٹھ گیا۔ وہ مجھ سے اس طرح بے اطلاع' بے اجازت چلے آنے کی معذرت کرنے لگا اور کہنے لگا "مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے" میں چپ رہا تو وہ کچھ تامل کے بعد بولا "میں آپ کو نیچے لے چلنے کے لیے آیا ہوں" میں نے گہری سانس بھری اور پوچھا۔

"نیچے کوئی خاص بات ہے؟"

کہنے لگا "کوئی خاص بات نہیں مگر اور بھی لوگ ہیں' جنہیں آپ کی ضرورت ہے۔ جنہیں آپ کی طرح دکھ ہے۔ اس طرح تنہا رہنے سے تو جی اور خراب ہو جائے گا۔"

میں نے حجت نہیں کی "ٹھیک ہے' نیچے چلتے ہیں۔ کوئی فرق پڑتا ہے تو ٹھیک ہے۔"

وہ سر جھٹک کے بولا "ہاں پڑتا ہے۔ یوں سب ایک دوسرے سے بے پروا ہو جائیں تو پھر۔۔۔" اس نے میرا بازو کھینچ کے کہا۔ "بس آپ اٹھ جائیے اور پہلے ذرا منہ ہاتھ دھو لیجیے۔"

میں نے کسی چون و چرا کے بغیر اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ غسل خانے سے منہ پر دو چار چھپکے مار کے میں باہر آیا تو اس نے جیب سے کنگھا نکال کے میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے کنگھا اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ وہ مسہری کے پاس رکھی ہوئی کرسی پر سر جھکائے بیٹھا رہا اور جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو' ایسے کہنے لگا "ہم نے اپنے سارے جتن کیے تھے۔ اتنا زیادہ کسی کے ساتھ نہیں ہوتا۔ میں نے تو خدا سے دعا مانگی تھی کہ وہ میری کچھ زندگی ہی اسے دے دے لیکن۔۔۔"

اس کی آواز بھن بھنانے لگی' پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا "کیا' کیا جا سکتا ہے؟ اس کے سوا کہ اس نے وقت طے کر دیا ہے اور ہم بونے لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم بھی کچھ کر سکتے ہیں۔"

میں نے اس سے کچھ نہیں کہا "مجھے معلوم ہی نہ تھا کہ کیا کہنا چاہیے۔ وہ از خود بولتا رہا۔ "مگر وہ' وہ بہت سکون سے گیا ہے۔ آخر میں اسے کوئی تکلیف نہیں تھی۔ وہ تو جیسے میٹھی نیند سو رہا تھا۔ ڈاکٹر ڈیسائی اور ڈاکٹر بھارگو جیسے ڈاکٹروں کو حیرت تھی کہ یہ کون سی حالت ہے۔ انہوں نے اس کا درد دوبارہ جگانے کی کوشش کی۔ کبھی اس سے بھی فائدہ ہوتا ہے لیکن وہ تو کچھ اور ہی ٹھان چکا تھا۔ لگتا تھا' وہ تو ہر دکھ' ہر تکلیف سے۔۔۔ آپ نے اس کا چہرہ دیکھا تھا' کوئی کہہ سکتا تھا

کہ اس نے پچھلے دن کیسے بتائے ہیں؟"

کیلاش کرسی سے اٹھ گیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے وہ پھر بڑبڑانے لگا "ڈاکٹر بھارگو کو بہت صدمہ ہے کہ اچانک یہ کیا۔ ان کے لیے تو یہ سب کچھ کسی حادثے کی طرح تھا۔ ڈاکٹر بھارگو کے لیے کہا جاتا ہے کہ خدا ان سے بہت خوش ہے۔ وہ جس مریض پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں، خدا بھی اس سے راضی ہوجاتا ہے" ہم نیچے آگئے تو کیلاش چپ ہوگیا۔

اندر کسی کمرے میں جانے کے بجائے وہ مجھے عقبی حصے کی طرف لے آیا۔ عقبی حصے کے چبوترے پر چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ کچھ بھی مختلف نہیں تھا۔ موت ہوجانے پر ہر گھر میں یہی کچھ منظر ہوتا ہے۔ تقریباً سبھی موجود تھے جو چبوترے پر نہیں تھے، وہ ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ چبوترے کے وسط میں بٹھل گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ ماہم کے پاڑے پر پیرو کا جانشین پانڈے دادا، بانکے اور دوسرے چار پانچ دادا اس کے اطراف بیٹھے تھے۔ چبوترے سے کچھ دور وسیع شامیانے کے نیچے سائلوں کا ہجوم تھا۔ ایک طرف دیگیں چڑھی ہوئی تھیں۔ وہیں بید کی کرسی ڈالے منیر علی کھانے کی نگرانی کررہے تھے۔ مولوی اکرم، جگنو اور دیوا کے ساتھ بے سلے کپڑے لوگوں میں تقسیم کررہے تھے۔ ساتھ میں ایک ایک لفافہ بھی وہ حاجت مندوں کی نذر کرتے جاتے، لفافوں میں نقدی ہوگی۔ چبوترے کے پاس رکھے ہوئے کپڑے کے گٹھ لوگوں کو اچھی طرح دکھائی دے رہے ہوں گے لیکن وہ بہت بے تاب ہورہے تھے۔ بعید نہ تھا کہ وہ چھینا جھپٹی کرنے لگیں یا مولوی اکرم پر ٹوٹ پڑیں۔ مولوی اکرم باربار ڈانٹ ڈپٹ کرتے کہ اطمینان رکھو، ہر ایک کی باری آئے گی، کوئی خالی ہاتھ نہیں جائے گا۔ وہ لوگ سمجھ رہے ہوں گے کہ مرنے والا کوئی بہت مال دار آدمی ہوگا۔ امیر مرتا ہے تو غریبوں کا کچھ بھلا ہوجاتا ہے۔ پھر تو یہ لوگ امیروں کی جلد موت کی آرزو بھی کرتے ہوں گے۔ عقبی حصے میں ملازموں کے مکانات بنے ہوئے تھے۔ ملازموں کی آمدورفت کا راستہ بھی الگ تھا۔ اسی راستے سے سائلوں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ پیرو کے وقت ابا جان کو مکان کے باہر شامیانے لگوانے پڑے تھے۔ ساری گلی بھرگئی تھی۔ ابا جان کی سوجھ بوجھ کے اب سبھی قائل ہوں گے۔ اتنے بڑے مکان سے کم ازکم یہ فائدہ تو ہورہا تھا۔ ابھی اتنے ہی لوگ یہاں اور آسکتے تھے۔ مکان ایسے ہی گنجائش والے ہونے چاہئیں کہ وقت بے وقت کام آسکیں۔

دوپہر تک لوگوں کی تعداد اور بڑھ گئی۔ پانڈے اور دوسرے داداؤں نے دوپہر کا کھانا سب کے ساتھ کھایا۔ ان کے سوا کوئی مارٹی کے پرسے کے لیے نہیں آیا حالانکہ بچپن ہی سے اڈوں اور پاڑوں سے مارٹی کا تعلق رہا تھا۔ ایک بار تو وہ باقاعدہ ایک پاڑے کی گدی کا راجا بھی بنا تھا۔ میں نے بالم خاں کے پاڑے پر قبضہ کرکے اسے نگراں بنایا تھا۔ وہ زیادہ عرصے وہاں نہیں رہا۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل والی بات ہوتی ہے۔ آدھی موت تو آدمی کے سامنے نہ ہونے سے ہوجاتی ہے۔ ابا جان کی تلاش میں ہم سب کے ساتھ تبت جانے سے پہلے ہی وہ اڈوں پاڑوں سے ناتا توڑ چکا تھا۔ وہ تو جانے کب سے کسی سائے کی جستجو میں بھٹک رہا تھا۔ مجھ سے ملنے کے بعد پہلی بار کسی گھر سے اس کا واسطہ پڑا تو اس نے پھر کسی اور طرف دیکھنے، کہیں اور جانے کا خیال ہی نہیں کیا۔ میں بمبئی میں نہیں تھا تو وہ صبح وشام جولین کے گھر حاضری دیا کرتا تھا۔ تبت سے واپسی کے سفر میں وہ ابا جان کا بہت لاڈلا ہوگیا تھا۔ ان کی خدمت کا بہانہ ڈھونڈتا رہتا۔ اب تو ابا جان اسے اپنا چوتھا بیٹا کہنے لگے تھے۔ بیشتر جگہوں پر وہ اسے ساتھ لے جاتے۔ ابا جان اپنے بیٹے کی رسمیں ادا کررہے تھے۔ موت کی رسمیں ادا کیے بغیر موت مکمل کہاں ہوتی ہے اور مال وزر ہو تو رسمیں بھی صحیح طرح ادا ہوتی ہیں۔ ابا جان کے خزانے میں ویسے بھی مارٹی کا حصہ بنتا تھا۔ ابا جان کے پاس یہ بھی ایک جواز مارٹی کے نام پر زرومال صرف کرنے کا تھا۔ آدمی سب سے پہلے تو خود کو جواب دہ ہوتا ہے۔ زندگی میں نہیں تو موت کے بعد ابا جان نے اس کا حق ادا کردیا۔ ابا جان کے لیے پتھروں کے حصول میں مارٹی نے بھی زندگی داؤ پر لگائی تھی۔ تبت میں جس طرح سلطان، فن میاں اور روزیر غارت ہوگئے، وہ بھی ختم ہوسکتا تھا۔ کاش ایسا ہی ہوجاتا۔ میری بات دوسری تھی مگر پھر وہ اوروں کے اتنا سامنے، اس قدر قریب نہ آتا اور سب اتنے ہلکان نہ ہوتے۔ اوپر کے کمرے میں کیلاش جب مجھ سے نیچے چلنے اور دوسروں کا خیال رکھنے کی تاکید کررہا تھا، تو مجھے یہی بات اس سے کہنی چاہیے تھی، آدمی کو دوسروں میں بہت شامل نہیں ہونا چاہیے۔ پھر اس کے کھوجانے سے دوسرے یوں اجیرن نہیں ہوتے۔ ابا جان کے چہرے پر تو وہ زردی مل کے گیا تھا۔ کانتے اور پیرو کے موقعوں پر وہ خاصے سنبھلے ہوئے تھے، اب تو بہت لٹے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ دولت کے باوجود ایسے لٹے ہوئے، ایسے برباد۔

کیلاش، جمرو، زورا اور شامو کے ساتھ میں چبوترے کے

ایک گوشے میں بیٹھا رہا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد پانڈے، بانکے اور دوسرے دادا بٹھل کے آگے سے اٹھ کے میرے پاس آئے تو مجھے احساس ہوا کہ اتنی دیر ہوگئی۔ مجھے خود ان لوگوں کے پاس جانا چاہیے تھا۔ سب نے باری باری مجھے گلے لگایا اور میری کمر تھپکتے رہے۔ پانڈے دادا نے تو میری پیشانی کو بوسہ دیا اور کہنے لگا "اپن سے کوئی غلطی ہوگیا ہے دادا!" میں نے سٹپٹا کے کہا "نہیں دادا! بالکل نہیں" وہ میرے گال پر آہستہ سے چپت لگاتے ہوئے بولا "پھر ابھی ایسا کیا ہے، اپن کو خبر بھی نئیں کیا!" میں نے ٹوٹی پھوٹی آواز میں کہا "بس دادا! بس ایسے ہی کچھ ـــ" وہ سہلانے لگا اور آزردگی سے بولا "ایسا ہی ہوتا ہے سالا! ابھی اپن کیا بولے، یہ اوپر والا کبھی بہت مسخری کرتا ہے۔ ابھی بار کسی کا ہوتا، اٹھا کسی کو لیتا ہے۔ اس کا مرضی ہے بابا! اپن کو دیکھو، اپن پرانا ایک دم کھوسٹ لوگ کو چھوڑکے کیسا نوا، نوا ـــ ماں قسم، کندھا دیتے دیتے ابھی اپنے سے شرم آتا ہے اپن کو۔"

پانڈے، بانکے، دوسرے داداؤں کے ساتھ شام کو چلے گئے لیکن عقبی حصے میں مارٹی کے تیجے کا میلا رات تک لگا۔ جمرو، شامو اور ٹنگو بیشتر وقت میرے ساتھ ہی بیٹھے رہے تھے اور ابا جان، منیر علی اور مولوی اکرم کا ہاتھ بھی بٹاتے رہے تھے۔ زورا اپنی جگہ سے نہیں اٹھا۔ نہ میری طرح اسے کسی نے کام پر مامور کیا۔ دوسروں کے مقابلے میں دونوں شاید زیادہ معذور تھے۔ عقبی حصے سے فارغ ہوکے رات کو سب ملاقاتی کمرے میں جمع ہوگئے۔ سارے دن کی جاں فشانی ان کے چہروں سے عیاں تھی لیکن اس تھکن میں سکون بھی شامل تھا۔ اپنی ذمے داری سے حسن وخوبی سے فارغ ہوجانے کا سکون۔ آدمی کے جانے کے بعد اس کے پس ماندگان اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔ وہ اس کے ساتھ نہیں جاسکتے تو اتنا تو کرسکتے ہیں۔ تیجا، دسواں، بیسواں، چالیسواں، پہلی برسی، دوسری، تیسری، چوتھی۔ پھر رفتہ رفتہ جانے والے آدمی کے نقش مدھم پڑتے جاتے ہیں۔ کسی کے پہلے، کسی کے بعد میں اور آدمی وقت کے سمندر میں حباب کے مانند گم ہوجاتا ہے۔ جیسے کبھی اس دنیا میں آیا ہی نہیں تھا۔

کیلاش کی زبانی معلوم ہوا کہ رما بھی صبح اس کے ساتھ آئی تھی اور دن بھر یہیں رہی۔ کوشلی کی وجہ سے اسے شام ہی کو جانا پڑا۔ رات گئے پھر کیلاش نے گھر جانے کا ارادہ کیا اور سبھی اٹھ گئے۔ میں بھی اوپر اپنے کمرے میں جانے کے لیے کھڑا ہوگیا تھا کہ جمرو اور شامو نے مجھے روک لیا، کہنے لگے کہ آج میں انہی کے ساتھ رہوں۔ جمرو کہنے لگا "دل بہت لوٹ رہا ہے لاڈلے!" ہم سب ایک ہی کمرے میں آگئے اور چپ بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ کسی کو نیند نہیں آرہی تھی۔ ٹنگو پھر مارٹی کی باتیں سنانے لگا۔ ان دنوں کی باتیں جب وہ مارٹی کا ساتھی تھا اور ٹنڈے کے نام سے مشہور تھا۔ بعد میں بٹھل نے اسے ٹنگو کہنا شروع کیا تو وہ ٹنگو ہوگیا۔ مارٹی کی باتیں سناتے سناتے ٹنگو کی آواز بھٹکنے اٹکنے لگی۔ مجھے پہلے ہی بہت گھٹن ہورہی تھی مگر میں ٹنگو کو کیسے منع کرسکتا تھا۔ اس نے سبھی کے سوئیاں چبھودیں۔ زورا تو کب کا بھرا بیٹھا تھا۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ کئی بار میرے جی میں آئی، انہیں جھڑک دوں کہ اس طرح رونے پیٹنے کی کیا ضرورت ہے۔ گورکن کی طرح موت کی تو اب سب کو عادت ہوجانی چاہیے لیکن میں چپ رہا۔ یہی ہوتا آیا ہے، یہی ہوتا رہے گا۔ لوگ مرتے رہیں گے، لوگ روتے رہیں گے۔ گنتی کے وہ قول مجھے بھی اچھی طرح یاد تھے جو ایسے وقت کے لیے لوگوں نے ازبر کرلیے ہیں۔ اگر وہ مجھ سے نہیں دہرائے جاتے تھے تو کم ازکم ان کی اشک باری میں تو ساتھ دینا چاہیے تھا لیکن مجھے چڑ سی ہورہی تھی۔ رونے کے لیے شاید انہیں فراغت کا یہی وقت ملا تھا۔ وہ روتے رہے اور میں کسی اجنبی کی طرح ان کے درمیان بیٹھا رہا۔

○☆○

مارٹی کو گئے ہوئے ساتواں یا آٹھواں دن تھا۔ مجھے صحیح کچھ کچھ یاد نہیں تھا۔ میرے لیے تو ہر دن ایک جیسا تھا۔ انہوں نے صبح مجھے ناشتے کے لیے طلب کیا تھا۔ حسب معمول ناشتا کرکے میں نچلی منزل کے ایک دور افتادہ کمرے میں آکے لیٹ گیا تھا کہ یکایک بٹھل کو سامنے دیکھ کے حیران رہ گیا۔ وہ جانے کس طرح اندر آگیا تھا کہ مجھے اس کی آہٹ کا بھی احساس نہیں ہوا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا "بیٹھ جا رے" اس نے بھاری آواز میں کہا "بیٹھ جا۔"

"کیا بات ہے؟ تم، تم یہاں کیسے؟" میں نے سٹپٹا کے پوچھا۔

وہ پلنگ کی پائنتی پر بیٹھتے ہوئے بولا "چلنا نہیں ہے؟"

"کہاں؟" میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا "کہاں جانا ہے؟"

"ادھری، حیدر آباد کی طرف!" وہ آہستگی سے بولا۔

مجھے جھٹکا سا لگا جیسے کوئی خنجر سینے میں پیوست ہوا ہو اور سارے جسم میں آگ بھڑک اٹھی ہو۔ لمحوں تک میرا یہی حال رہا۔

"دوپہر کی گاڑی سے چلتے ہیں" وہ زیرلبی سے بولا۔

"مگر میں" میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا "میں تو کہیں نہیں جا رہا۔"

وہ دیر تک خاموش رہا' پھر ہنکاری بھر کے بولا "دوپہر کی گاڑی کے ٹکٹ آ گئے ہیں۔"

"مگر مجھے کہیں نہیں جانا۔"

"جانا تو ہے رے۔"

"کوئی ضرورت نہیں' کہیں بھی جانے کی ضرورت نہیں۔" میری آواز بکھر گئی "میرا جی اب کہیں جانے کو نہیں چاہتا۔"

وہ سہلانے لگا "اپنا کون سا چاہتا ہے' پر جانا تو چاہیے۔"

"پھر' پھر کبھی دیکھیں گے' ابھی تو۔۔۔"

"پھر کیا ہو جائے گا' لوٹ کے آ جائے گا وہ؟"

اپنے ہونٹ چبانے اور آہ بھرنے کے سوا میرے پاس کیا جواب تھا "تم آرام کرو۔ بھول جاؤ وہ سب۔ تمہیں یہ سب بتایا کس نے ہے' ضرور جولی نے۔۔۔"

"اسی نے بولا ہے" وہ میری بات کاٹ کے چن چناتی آواز میں بولا "نہیں بولنا چاہیے تھا اس کو؟"

"کسی طرف جانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

"کیوں رے؟" اس کی تیوری پر بل پڑ گئے "کیوں نہیں ہے؟"

"بس" میں نے تندی سے کہا "بس نہیں ہے۔"

"تو اپنے کو اکیلا ہی جانا ہے کیا؟"

"تم سے کون کہہ رہا ہے' میں نے تم سے منت نہیں کی۔"

"تو پہلے کیوں جا رہا تھا وہاں؟" وہ درشتی سے بولا۔

"مگر میں نہیں گیا" میں نے چیخ کے کہا۔

"کیسا بولتا ہے رے" وہ منہ بنا کے بولا "تجھ کو کچھ پتا نہیں' اوپر سے وقت کتنا نکل گیا ہے۔ تو تو ابھی تک وہی ہے' ویسا ہی نیم پہ چڑھا ہوا۔"

"ہاں ہاں' میں ابھی تک ویسا ہی ہوں۔ مجھ کو کیا پتا' میں تو پاگل ہوں' جنگلی ہوں' پر کسی کو کاٹ کھانے کو نہیں دوڑتا۔ مجھے اپنی حالت پر چھوڑ دو۔ میں کسی سے کیا کہہ رہا ہوں۔"

وہ خشمگیں نظروں سے مجھے گھورتا رہا اور پلنگ سے اٹھ گیا "ٹھیک ہے رے' اپنے کو زیادہ بات نہیں آتی۔ اپنے کو جاتا ہے' ساتھ چلنا ہو تو وقت پر تیار رہو جانا۔"

"تم' تم کیا کرو گے وہاں جا کے!" میں نے زہرخند سے کہا "تمہیں تو ویسے بھی اس طرف جانے کا ارادہ کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچ سمجھ لینا چاہیے۔ بھول گئے' وہاں سے کیسے آئے تھے؟"

"چوری کر کے' ڈاکا ڈال کے آئے تھے۔"

"یہ مجھ سے کیوں پوچھتے ہو' اپنے آپ سے پوچھو۔ ڈاکا نہیں ڈالا تھا تو کیا ہوا' کانتے ایسے ہی جان سے چلا گیا۔ اس رات اباجان کی حویلی میں ہونے والی نوٹنکی تو خوب یاد رہنی چاہیے۔"

میں کمرے کے وسط میں بے حس و حرکت کھڑا رہا اور میرے مساموں سے پسینہ پھوٹتا رہا۔ مجھے یہ سب کچھ عجیب سا لگ رہا تھا' اپنا آپ بھی۔ اتنے دنوں تک مجھے کسی اور طرف دیکھنے کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اتنے دنوں تک میں نے شاید آئینہ ہی نہیں دیکھا تھا۔ میں نے اپنے ہوش و حواس قائم رکھنے کی کوشش کی۔ میں بٹھل سے کیا کہنا چاہتا تھا جو نہیں کہہ سکا یا اس کی سمجھ میں نہ آسکا' میں نے سوچا' مجھے اس کے پیچھے جا کے وضاحت کرنی چاہیے کہ میری بات ذرا تحمل سے سنو' مجھ میں کسی اور طرف دیکھنے کی ہمت ہی نہیں ہے۔ مجھے تو اب ڈر سا لگتا ہے' جانے کس وقت کیا ہو جائے۔ یہ کوئی ضد نہیں ہے' ضد کاہے کی ہوتی۔ نہ یہ کوئی سزا ہے جو میں خود کو دینا چاہتا ہوں۔ میں نے اس سے کچھ غلط نہیں کہا ہے کہ میرا کچھ جی نہیں چاہتا۔ کسی بات کو بھی۔ پہلے کبھی کہیں بھاگ جانے' کسی ویرانے میں جا کے چھپ جانے کو جی کرتا تھا۔ اب یہ بھی دل نہیں کرتا۔ جب میرا ہی کوئی ادعا نہیں ہے تو بٹھل کو بھی غرض نہیں ہونی چاہیے۔ اسے اس قدر تشویش و تردد کی آخر کیا ضرورت ہے؟ میں کمرے سے نکل کے بٹھل سے بات کرنے کا ارادہ کرتا رہا مگر میرے پیروں میں جیسے جان ہی نہیں رہی تھی۔ بٹھل کو کیا معلوم تھا کہ کتنے عذاب کے بعد میں نے اپنا یہ اختیار حاصل کیا تھا۔ وہ ایک پل میں سارا کچھ بکھیر کے' الٹ کے چلا گیا۔

وہ مجھے کیا باور کرانے آیا تھا۔ جیسے کوئی دیوار تھی جو ہٹ گئی۔ مجھے اسی بات کا انتظار تھا۔ یہ رکاوٹ دور ہو گئی تو مجھے اپنا راستہ پکڑنا چاہیے۔ آدمی سے آدمی کی نسبت بس اسی قدر ہے۔ وہ اوجھل ہو جائے تو لوگ اسے اور اوجھل کر دیتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے' وہ منوں مٹی کے نیچے دب چکا ہے' اب لوٹ کے نہیں آئے گا۔ کوئی بھی پلٹ کے نہیں آتا مگر آنکھوں سے اوجھل ہو جانے اور دسترس سے نکل جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جانے والا کبھی آیا ہی نہیں تھا۔ اس کی خوشبو' اس کی بازگشت' اس کے نقش بھی مٹ گئے۔ وہ تو لمحے لمحے بعد میرے سامنے آ کے کھڑا ہو جاتا

ہے۔ مجھے دیکھ کے مسکراتا ہے' جیسے کوئی سوال کررہا ہو یا شکایت۔ وہ ہمیشہ میرے سامنے سر جھکائے آیا کرتا تھا۔ موت کے بعد اس کا تیور ہی بدل گیا تھا۔ وہ ہمیشہ میرے ہی کام آتا رہا' میں اس کے لیے کچھ بھی نہ کرسکا۔ میں اس کے لیے بہت کچھ کرسکتا تھا مگر مجھے اپنے آپ ہی سے فرصت کہاں تھی۔ ایک وہ بھی تھا۔ کسی سے اس نے کچھ نہیں کہا۔ میری طرح کوئی شور مچایا نہ کسی کو تنگ کیا۔ سب کچھ اپنے آپ میں دفن کیے رکھا۔ یہ بھی تو ایک طور ہے زندگی بسری کا۔ یہی کچھ میں بٹھل سے کہنا چاہتا تھا کہ مارٹی بھی تو ایک خودگزیدہ تھا۔ اس کی مثال بھی تو ہے۔ کوئی دوسرا بھی یوں چراغ جلا سکتا ہے۔ مارٹی کی طلب رائیگاں نہیں گئی۔ بہت دیر میں سہی مگر چند لمحوں کی سرخوشی اسے بہرحال نصیب ہوئی۔ اسی کو اس نے غنیمت جانا اور آنکھیں بند کرلیں کہ اس سے زیادہ اسے اور کیا دیکھنا تھا۔ میری طلب اور جستجو میں کوئی کمی ضرور ہوگی۔ اگر نہیں ہے تو ایک دن ساری دیواریں خود بہ خود ہٹ جائیں گی' سارے دروازے کھل جائیں گے۔

میں نے بٹھل کے پاس جاکے عاجزی کرنے کا ارادہ ترک کردیا کہ نہ مجھ سے اتنی باتیں کی جائیں گی' نہ اس کی سمجھ میں کچھ آسکے گا۔ جو لفظ مجھے خود نہیں معلوم' میں اس کے سامنے جاکے کس طرح ادا کرپاؤں گا۔ الفاظ' ہر احساس کی تشریح و توضیح نہیں کرسکتے۔ جب بٹھل یہاں موجود تھا تبھی میری زبان لکنت کررہی تھی۔ اسے قائل کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ اس نے کچھ طے کرلیا ہے تو میں کیا' کوئی بھی اسے باز نہیں رکھ سکتا۔

مجھے امید تھی کہ بٹھل کے بعد شاید کوئی میرے پاس آئے' اور جو بٹھل نہیں کرسکا ہے' ممکن ہے' میں اسے بتاسکوں لیکن دیر ہوگئی۔ کوئی بھی نہیں آیا۔ میں تنہا اس محبوس کمرے میں اپنی رسیاں جکڑتا رہا۔ مجھے کسی پہلو چین نہیں تھا۔ گھڑی نے بارہ بجائے تو مجھ سے کمرے میں نہیں ٹھہرا گیا۔ جیسے کسی نے مجھے سرزنش کی کہ میں ایسے ہی پڑا رہا تو وہ نکل جائے گا۔ دو بجنے میں اب دیر ہی کتنی رہ گئی ہے۔ دو بجے حیدر آباد کے لیے گاڑی روانہ ہوجاتی ہے۔ بٹھل باہر سے چلا جائے گا۔ وہ ایسا ہی ہے کہ پلٹ کے مجھ سے پوچھے گا بھی نہیں۔ مجھے ایک کوشش اور کرنی چاہیے۔ چاہے کتنی ہی حجت و تکرار کرنی پڑے۔ میری بات وہ جانے دے لیکن اس نے دوسری جانب توجہ نہیں کی۔ سردست حیدر آباد کا سفر اس کے لیے کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ ابھی بہت دن نہیں ہوئے۔ کانتے' پیرو اور مارٹی کے چلے جانے سے ایسا

لگ رہا ہے کہ مدت ہوگئی ہے۔ وہ نواب لوگ اتنی جلد ہمیں نہیں بھولے ہوں گے۔ وہ ان کی ریاست' ان کا علاقہ ہے۔ وہ جال پھیلائے ہماری راہ تک رہے ہوں گے۔ حیدر آباد میں اباجان کی خریدی ہوئی حویلی سے ان کے متعدد مسلح آدمی نامراد لوٹ گئے تھے۔ یہ زخم ایسا نہیں جو آسانی سے مندمل ہوسکے۔ حیدر آباد سے واپسی کے سفر میں ہمارے تعاقب میں بھیجے جانے والے ان دو آدمیوں نے بھی واپس جاکے کچھ کم حاشیہ آرائی نہیں کی ہوگی۔ ان دونوں کی ناکام واپسی ایک اور تازیانہ ہوگی۔ انہیں نواب حشمت جنگ کے مقرب خاص نے بھیجا تھا۔ نواب کے علم میں ہے کہ خانم ابھی حیدر آباد میں ہے۔ اسے وہاں سے نلے جانے کے لیے ایک نہ ایک دن ہمارا حیدر آباد کی طرف رخ کرنا لازم ہے اور ابا جان اپنی عالی شان حویلی ایسے ہی نہیں چھوڑدیں گے۔ اپنے مسلح سرفروشوں کی ذلت اور دو چار چشم طالع آزماؤں کا حشر دیکھ کے ان نوابوں کو محتاط ہوجانا چاہیے۔ ورنہ وہ دوبارہ بھی آدمی بھیج سکتے تھے۔ ان کے پاس آدمیوں کی کمی نہیں۔ بس سونے کی ہڈی چاہیے' آدمی کتا بن جاتا ہے۔ ایک فدا دولت کی شرپ ہے' جاں باز اور جاں سپار کھنچے چلے آتے ہیں۔ بمبئی میں' ہماری نشاندہی میں دو آدمی ناکافی پڑگئے تھے تو وہ نفری بڑھا سکتے تھے۔ نواب حشمت جنگ کو تو خانم کے ذریعے بھی فیض آباد میں زریں کی حویلی کا سراغ مل سکتا تھا۔ اس نے شاید کوشش بھی کی ہو لیکن خانم ایک جہاں دیدہ عورت ہے۔ اس نے یقیناً پہلو تہی کی ہوگی۔ نواب حشمت کو یہ سب کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ بعد میں اسے ہوش آیا ہوگا کہ ایک دن تو ہماری حیدر آباد واپسی یقینی ہے۔ اس وقت تک صبر و ضبط عین عقل و ہوش ہے۔ تاہم اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس دن کا اسے کس بے صبری سے انتظار ہوگا۔

اور وہ صرف دو آدمی نہیں تھے' جنہیں ہم نے اپنے پیچھے بمبئی تک آنے دیا تھا اور بعد میں ہم انہیں اندھا کرکے پیرو کے باڑے پر لے آئے تھے۔ اس سے پہلے سفر کے دوران میں دو اور آدمی ہم نے چلتی ریل سے نیچے پھینک دیے تھے۔ ان کے بہ قول وہ نواب حشمت جنگ کے بھیجے ہوئے نہیں تھے۔ کوئی عجب نہیں کہ ان چاروں ستم کشوں نے واپس جاکے یہ ناگفتنی اپنے بندگان عالی کے گوش گزار کردی ہو کہ انہیں اذیتوں کی تاب نہیں رہی تھی اور ان کی زبانیں اپنے بھیجنے والے مربیوں کے ناموں کا بھرم نہ رکھ سکیں۔ یہ جان کے نواب حشمت جنگ اور اس کے ہم قبیل نوابوں کا کیا حال ہونا چاہیے۔ ندامت کا غضب بے اندازہ

ہے۔ اس بار وہ کوئی چوک نہیں کریں گے اور دیر بھی لگائیں گے کہ ہمیں سنبھلنے اور پینترا بدلنے کی مہلت مل ... میرے اکیلے وہاں جانے کا کچھ ایسا نہیں تھا۔ میں کسی ... چھپ چھپا کے چلا جاتا۔ انہیں تو خاص طور پر ابا جان ... بٹھل کی جستجو ہوگی۔

میں فوراً ہی کمرے سے نکل گیا۔ صرف میرے لیے' ... خاطر بٹھل کسی زیاں کے درپے ہے تو مجھے اسے روکنا ... ہیے۔ ایسا کوئی قدم ہی کیوں اٹھایا جائے کہ گزشتہ کے ... ے کا ذرا بھی اندیشہ ہو۔ مجھ میں اب بالکل سکت نہیں ... میں نے یہی کچھ تو بٹھل کو جتانے کی کوشش کی تھی۔ ... نے کان نہیں دھرے۔ اس نے غور نہیں کیا۔ ... نواب ثروت نے اس سے بات کرنے سے انکار کردیا تو ... نواب نے مجھے خط لکھا ہے' بٹھل کو نہیں۔ دونوں مرتبہ ... اور پیرو اس کے ہاں گئے تھے۔ میرے اور پیرو کے بجائے ... ل کو دیکھ کے کوئی بدگمانی اس کے دل میں جگہ پاسکتی ... بٹھل سے کسی لمحے کوئی انیس بیس بات ہوگئی تو نواب ... دسری قسم کا آدمی ہے۔ نواب لوگ عام لوگ نہیں ... تے۔ وہ اپنی شکلیں چمکتے آئینوں میں دیکھتے رہنے کے عادی ... ان کے مزاج کا کوئی بھروسا نہیں۔ بہرحال میرا کام تو ... ل کو تمام عواقب و جوانب سے آگاہ کرنا ہے۔ اس کے ... اس کی مرضی ہے' وہ جو جی چاہے کرے' میں کیا کرسکتا ... ہے۔

بٹھل اپنے کمرے میں نہیں تھا۔ اس کا حقہ بھی کونے ... رکھا تھا۔ ایک ملازم نے بتایا کہ وہ ملاقاتی کمرے میں ... جاتے جاتے معاً اس خیال سے میرے قدم ٹھٹک ... رہ گئے کہ کہیں نواب ثروت یار کا خط انہی نوابوں کی فتنہ ... کی نہ ہو۔ نواب ثروت یار کو ہمارے اور نواب حشمت ... کے کسی تعلق کا بہ ظاہر کوئی علم نہیں تھا۔ میں نے اور ... نے اس کے گھر جاتے ہوئے ہر ممکن احتیاط کی تھی تاکہ ... کسی کی نظر میں نہ آسکیں۔ ہم بہت دور پہلے موٹر سے ... گئے تھے اور مختلف جگہوں سے پیدل گزرتے ہوئے ہم نے ... راستہ طے کیا تھا۔ مجھے خوب یاد ہے' ہم نے اچھی طرح ... مئن ہوکے ہی نواب ثروت کے دروازے پر دستک دی ... اس بات کا کوئی امکان تو نہیں تھا کہ نواب ثروت یار ... گھر ہماری حاضری کی سن گن نواب حشمت جنگ اور ... ں کے تمنائی دیگر نوابوں کو مل گئی ہو۔ ڈرائیور نے جہاں ... اتارا تھا' اس مقام سے ہماری بو سونگھتے ہوئے وہ نواب ... ت کے گھر تک پہنچ گئے ہوں۔ نواب ثروت کی زبانی

ہماری آمد کا ماجرا سن کے انہوں نے ایسا کوئی خط لکھنے پر اسے آمادہ کرلیا ہو۔ غریبوں میں اتنی دوستی نہیں ہوتی جتنی امیروں میں ہوتی ہے۔ نواب حشمت جنگ جیسے ذی وقار' عالی مرتبت کی خوش نودی کا موقع نواب ثروت کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیے۔ ان نوابوں سے کچھ بعید نہیں۔

میں نے تیز قدموں سے ملاقاتی کمرے کا فاصلہ طے کیا۔ ابھی میں کمرے میں داخل نہیں ہوا تھا کہ زنان خانے کی طرف سے آتی ہوئی جولین مجھے دکھائی دی۔ فرخ بھی اس کے ساتھ تھی۔ مجھے دیکھ کے دونوں رک گئیں۔ میں بھی ٹھہر گیا اور میری نظریں جولین کے چہرے پر جم گئیں۔ وہ تو کچھ اور ہی نظر آرہی تھی۔ سرتاپا سفید لباس میں ملبوس' چادر سے سر ڈھکا ہوا' گرجا کی کسی راہبہ کے مانند' جس کے چہرے کی تابانی ٹھٹھری ہوئی ہوتی ہے۔ وہ روز ہی صبح و شام مجھے ملتی تھی لیکن اتنے دنوں سے میں نے سر اٹھا کے اسے دیکھا تک نہیں تھا۔ اب یوں اچانک وہ میرے سامنے آئی تو مجھے یقین نہیں آیا۔ بوجھل پلکیں' چھلکتی آنکھیں اور سوکھے سوکھے ہونٹ۔ آدمی اندر سے ٹوٹ رہا ہو تبھی ایسا دھواں اٹھتا ہے۔ میں نے اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا کہ وہ بھی تو اپنے آپ سے دوچار ہوگی' مجھ سے کہیں زیادہ کہ اس کے لیے تو وہ سارا کچھ ایسی تعبیر کی طرح تھا جو آدمی کو ہیبت زدہ کردے۔ جولین ویسے ہی بہت نازک تھی' پھول کے مثل۔ تیز ہوا اور تیز دھوپ میں اس کا رنگ کمھلا گیا تھا۔ اس پر ابھی تک حیرت کا ایک عالم طاری تھا' جاں کنی کا عالم۔ آئینے اتنی حیرتوں کے متحمل نہیں ہوتے۔ مجھے دیکھ کے اس کی دھند اور گہری ہوگئی۔ اس کے سراپا میں تموج سا ہویدا ہوا' جیسے کسی لمحے وہ اڑتی ہوئی میرے سینے میں چھپ جائے گی اور زار زار ہوجائے گی۔ اس کے لبوں کے گوشے دھڑک رہے تھے۔ اسے میری جانب سے بس کسی دل ساز' دل نواز نگاہ کا انتظار تھا۔ میرا دل بھی بھر آیا۔ میں بھول گیا کہ میں کس ارادے سے نکلا تھا اور کہاں جانا چاہتا تھا۔ فرخ بھی میری نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی۔ میں بڑھ کے جولین کے ڈگمگاتے سراپا کو سہارا دیتا اور اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیتا کہ فرخ کی آواز پر مجھے ہوش آیا۔ وہ مجھے بتارہی تھی کہ وہ دونوں میرے ہی پاس آرہی تھیں۔ میں نے ہکلاتے ہوئے بٹھل کے بارے میں پوچھا تو فرخ نے ملاقاتی کمرے کی طرف اشارہ کیا اور دل گیر لہجے میں بولی "آپ جارہے ہیں بھائی؟"

"نہیں' کہیں بھی نہیں۔ میں کہاں...!" میں نے منتشر آواز میں کہا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور سوال کرتی یا جولین

زبان کھولتی، میں بہ عجلت کمرے میں داخل ہوگیا اور اندر قدم رکھتے ہی میرے جی میں آئی کہ وہیں سے لوٹ جاؤں۔ وہاں تو محفل جمی ہوئی تھی۔ مولوی اکرم، جگنو اور دیوا کے سوا سبھی موجود تھے۔ کیلاش بھی فراغت سے ان کے درمیان بیٹھا تھا۔

فرش پر دسترخوان بچھا ہوا تھا اور کھانا نہیں لگا تھا۔ میری آمد پر سبھی چونک پڑے جیسے میں کوئی عجوبہ ہوں۔ کیلاش صوفے سے اٹھ کے بے قراری سے میرے پاس آگیا اور اس نے مجھے پہلو میں صوفے پر بٹھالیا۔ اتنے لوگوں کی موجودگی میں بٹھل سے کوئی بات کرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ میرے داخل ہونے پر کچھ دیر کے لیے خاموشی چھائی مگر پھر سب میری طرف سے غافل ہوگئے اور بارشوں کی باتیں کرتے رہے۔ منیر علی بتا رہے تھے کہ دور دراز تک شدید بارشوں کی وجہ سے گاڑیاں شاید بروقت اپنی منزل پر نہ پہنچ سکیں۔ بیشتر وہی بولتے رہے۔ ابا جان گم صم بیٹھے تھے۔ بٹھل بھی سرہلاتا رہا۔ گویا بٹھل کا ارادہ طے تھا۔ اتنی دیر میں کھانا آگیا۔ ابھی دوپہر کے کھانے کا وقت نہیں ہوا تھا لیکن انہیں بٹھل کی روانگی کی وجہ سے جلدی ہوگی۔ کیلاش کے ساتھ میں بھی دسترخوان پر بیٹھ گیا۔ سب کوئی فرض ادا کرتے رہے اور جلد ہی اٹھ گئے۔ اس وقت ایک بج رہا تھا۔ چائے پیتے ہی بٹھل کھڑا ہوگیا اور سب سر جھکائے اس کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ سارا نظام اوقات سب کو یاد تھا۔ ایک جولین کی ماں نہیں تھی، باقی وہ سبھی دروازے پر ان کی منتظر تھیں۔ چمپا بیگم کی درخواست پر بٹھل نے ٹھہر کے اپنا بازو پھیلا دیا۔ فرخ نے بٹھل کو امام ضامن باندھا تو بٹھل نے اس کی پیشانی چوم لی اور اسے اپنے بازو میں سمیٹ لیا۔ انہوں نے جمرو اور زورا کے بازوؤں پر بھی امام ضامن باندھے۔ میں پیچھے کھڑا تھا۔ ان تینوں سے نمٹ کے وہ میری طرف بڑھیں۔ میں انہیں منع کرسکتا تھا لیکن میرے دست و بازو ہی اکڑ گئے تھے۔ میں دیکھتا رہ گیا۔ انہوں نے میرے بازو پر بھی پٹی باندھی اور چمپا بیگم کچھ پڑھ کے میرے چہرے اور سینے پر پھونکتی رہی۔ دروازے کے سامنے کیلاش کی موٹر اور ابا جان کی دونوں موٹریں آگے پیچھے کھڑی تھیں۔ بٹھل نے پیچھے مڑ کے دیکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی اور آگے والی موٹر میں بیٹھ گیا۔ جمرو، شامو اور زورا بھی اسی موٹر میں بیٹھ گئے۔ دوسری موٹر پر جگنو، دیوا اور ٹنگو نے قبضہ جمالیا۔ جگنو اور دیوا نے مجھے بھی راستہ دیا تھا لیکن میں سیڑھیوں پر کھڑا رہا۔ دونوں موٹریں آگے چلی گئیں تو کیلاش میرا ہاتھ تھام کے اپنی موٹر تک لے آیا۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔ مجھے یہ سب کچھ تماشا سا لگ رہا تھا جیسے سب مل کے میرا مذاق اڑا رہے ہوں۔ میری حیثیت کیلاش کے معمول کی سی ہوگئی تھی۔ کوئی ردوکد کے بغیر میں اس کے ساتھ چلتا رہا اور اس کی موٹر میں برابر والی نشست پر بیٹھ گیا۔

اسٹیشن زیادہ دور نہیں تھا۔ سڑکوں پر بھیڑ کی وجہ سے اسٹیشن پہنچنے میں پندرہ بیس منٹ لگ گئے۔ راستے بھر میرے دماغ میں ریت سی اڑتی رہی۔ راستے میں کیلاش نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی اور خود کلامی کے انداز میں راہ گیروں اور سواریوں کی بے قاعدگی پر جھنجلاتا رہا تھا۔ ابھی وقت تھا انہیں اپنا ڈبا تلاش کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ فرسٹ کلاس کے مسافروں کو کوئی دیر نہیں لگتی۔ ہمارے سوا ڈبے میں کوئی اور مسافر نہیں تھا۔ انہوں نے پہلے کی طرح پورا ڈبا محفوظ کرایا ہوگا۔ ان کے ساتھ مختصر سامان بھی تھا۔ اس میں یقیناً میری اٹیچی بھی ہوگی جو جولین نے پہلے سے تیار کر رکھی تھی۔ سب ڈبے میں آکے بیٹھ گئے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس طرح سلسلہ جنبانی کروں۔ ابا جان اور منیر علی بھی سامنے نہیں تھے۔ بٹھل سے بات کرنی نسبتاً آسان تھی لیکن سب کچھ میرے دماغ میں منتشر ہوگیا تھا۔ یہی صورت تھی کہ میں ڈبے سے واپس ہوجاؤں اور فرض کرلوں کہ انہوں نے میری التجا ٹھکرادی ہے۔ یہی وہ بعد میں کریں تو میرے پاس کیا چارہ ہے۔ بٹھل کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں معلوم ہوتا تھا تاہم میں اپنے حواس مجتمع کرتا اور مناسب لفظ ڈھونڈتا رہا۔ میں اتر کے کسی وقت بھی بھاگ سکتا تھا۔ وہ شاید مجھے نہ روکتے۔ انہیں میری پروا نہیں تھی۔ کسی کو کوئی بے چینی نہیں تھی جیسے انہیں یقین تھا کہ میں ان کے ساتھ ہی جاؤں گا۔ کیلاش نیچے اتر کے بسکٹوں کے بہت سے ڈبے اور گلوریاں لے آیا۔ بٹھل کے لیے وہ بیڑی کے بنڈل بھی لایا تھا۔ وقت جارہا تھا۔ وہ یہاں تک آکے واپس جانے والے نہیں لگ رہے تھے۔ میری عرض گزاری کا وقت نکلا جارہا تھا۔ صاف نظر آتا تھا کہ میں نہیں جاؤں گا تو وہ میرے بغیر چلے جائیں گے۔ اگر میرے پاس انہیں روکنے کی دہی دلیلیں ہیں تو کچھ بھی ہو، مجھے بھی ان کا ساتھ دینا چاہیے۔ وہ میرے لیے جارہے ہیں تو وہی کیوں زد پر رہیں۔ انہی کا زیاں کیوں ہو، میری دانست میں آگے کوئی جہنم ہے تو میں اس سے کیوں بچا رہوں۔ میں واپس ہوجاؤں گا تو مجھے ویسے بھی چین نہیں آئے گا۔ یہی کچھ جان کے وہ بھی میری طرف سے مطمئن تھے۔

گارڈ نے سیٹی بجادی اور انجن چیخنے لگا۔ کیلاش سب سے گلے مل کے اتر گیا۔ شامو، جگنو، دیوا اور ٹنگو بھی اتر گئے۔ جمرو ڈبے کے دروازے پر کھڑا ہاتھ ہلاتا رہا اور گاڑی کی رفتار تیز ہوئی تو اپنی جگہ پر آکے بیٹھ گیا۔ شام تک میں بے حس و حرکت کھڑکی کے پاس بیٹھا بھاگتی ہوئی زمین، پہاڑیوں اور درختوں کو دیکھتا رہا، پھر میں بھی نشست پر لیٹ گیا۔

○☆○

بارشوں کی وجہ سے کئی گھنٹے کی تاخیر سے دوسرے دن تین بجے کے قریب ریل گاڑی حیدر آباد کے نام پلی اسٹیشن پہنچ کے ختم ہوگئی۔ کسی اور ہوٹل میں جانے کے بجائے بٹھل نے اسی عالی شان ہوٹل کا رخ کیا جہاں ابا جان اور ہم بھی ٹھہر چکے تھے۔ دو ایک بیرے ہمیں پہچان گئے۔ انہوں نے درباریوں کے انداز میں تعظیم پیش کی اور ہم چاروں پورے مکان کے مانند، ہوٹل کے ایک گوشے میں ٹھہر گئے۔ بٹھل کے اشارے پر جمرو نے خدمت گاروں کو زرنقد کے عطئے پہلے سے ادا کردیے تھے۔ پورے سفر میں، میں نے خود کو بت تھامے رکھا تھا۔ کسی اجنبی کی طرح میں ان کے ساتھ سفر کرتا رہا لیکن جیسے جیسے حیدر آباد قریب آرہا تھا، مجھے خفقان سا ہورہا تھا۔ ہوٹل آکے تو میرے رہے سہے اوسان بھی جانے لگے۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا اور کبھی ایسا ڈوبتا کہ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا جاتا۔ جمرو اور زورا میری خاطر میرے اردگرد ہی منڈلاتے رہے تھے۔ بٹھل نے پہلے غسل کیا اور اجلا سا لباس پہن کے چائے منگوائی۔ جمرو اور زورا نے بھی نہا دھو کے کپڑے بدل لیے تھے۔ مجھ سے تو کچھ بھی نہیں ہو پا رہا تھا۔ چائے بھی حلق سے نہیں اتر رہی تھی، جیسے تیسے میں نے ان کی پیروی کی اور انہی کی طرح تیار ہو کے کرسی پر بیٹھ گیا۔

شام کو جب دھوپ عمارتوں سے اوپر چلی گئی، بٹھل نے جمرو سے کہا "اٹھ رے! ذرا باہر کا رنگ بھی دیکھیں۔"

"ٹھیک ہے استاد!" جمرو نے مستعدی سے کہا "قسم سے، میں بھی بولنے کو تھا" بٹھل کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا تو جمرو نے ٹوکنے کے انداز میں اس سے کہا "خالی ہی نکلوگے استاد؟"

بٹھل کسی اور دھیان میں تھا، اسے سمجھنے میں دیر لگی۔ کچھ توقف کے بعد وہ سرہلا کے بولا "ہاں ہاں، نکال لے رے۔"

جمرو نے پھرتی سے دروازہ بند کیا اور الماری سے ایک اٹیچی نکال لی۔ میری آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ اٹیچی میں کپڑوں کے نیچے تمنچے چھپے ہوئے تھے۔ پیٹیاں بھی ساتھ رکھی تھیں۔ زین یا اسی قسم کے کسی کپڑے کی دہری تہری تہ والی پیٹیاں الگ تھیں۔ یہ اس طرح دائیں جانب کے شانے سے بائیں جانب کی پسلیوں تک باندھی جاتی تھیں کہ بائیں ہاتھ کی بغل کے نیچے تمنچا چھپ جائے۔ بنڈی، کرتے اور واسکٹ کے پردوں کے بعد باہر سے کسی کو شبہ نہیں ہوتا اور گریبان کھلا نہ ہو تو دامن سے ہاتھ ڈالنے پر ضرورت کے وقت تمنچا نکالنے میں ایسی دیر بھی نہیں لگتی۔ تبت کے سفر میں بھی ہم نے کچھ اسی طرح کی پیٹیاں استعمال کی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ جو خدشے میری رگوں میں رینگ رہے تھے، بٹھل بھی ان سے غافل نہیں تھا۔ جمرو اور زورا نے چاروں تمنچے گولیوں سے بھر دیے۔ اٹیچی میں دو بڑے تمنچے بھی مجھے نظر آئے تھے لیکن انہوں نے چھوٹے تمنچوں پر اکتفا کیا۔ ہولسٹر میں تمنچے جمالینے کے بعد جمرو نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میری جیب میں چاقو ہے؟ مارٹی کے زخمی ہوجانے کے دن سے اب تک مجھے چاقو کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ میری خاموشی پر جمرو نے ایک نیا چاقو میرے حوالے کیا۔ یہ چھ انچی کا کھٹکے والا رام پوری چاقو تھا، وزن میں خاصا ہلکا۔ بٹھل کی ہدایت پر انہوں نے اسپرنگ کے موٹے گدوں کی سلائی چیر کے اور اسپرنگ کے درمیان ناریل کی چھال نکال کے دونوں تمنچے سرہانے کی طرف چھپادیے۔ یہ وزنی گدے باربار نہیں اٹھائے جاتے ہوں گے، صرف چادریں بدلی جاتی ہوں گی۔ اب اٹیچی میں کپڑوں کے سوا کچھ نہیں رہ گیا تھا اور کمرے کی تلاشی میں کسی ضرر کا اندیشہ نہیں تھا۔ بیس منٹ کے قریب اس تیاری میں صرف ہوگئے۔ پھر کہیں جمرو نے دروازے کی چٹخنی گرائی۔ اسی اثنا میں اجالا اور کم ہوگیا تھا۔ بٹھل نے ہوٹل سے باہر آکے میرا ہاتھ تھام لیا۔ مجھے ایسا لگا کہ میرے ڈگمگاتے جسم کو کسی دیوار یا ستون کا سہارا مل گیا ہو۔

سڑکوں پر خوب چہل پہل تھی۔ ہم آہستہ آہستہ نام پلی کی طرف بڑھتے رہے۔ آگے جاکے ہمیں سواری مل گئی۔ بٹھل نے مجھے اپنے برابر ہی بٹھایا اور میرا ہاتھ اپنے پنجے میں جکڑے رکھا۔ اپنی اپنی نسبت پر منحصر ہے۔ ایک کا درد دوسرے کا سینہ کاٹتا ہے۔ میرا سارا حال جیسے اس پر آئینہ تھا۔ گھوڑا گاڑی نے کچھ فاصلہ طے کیا تو وہ تھکتی ہوئی آواز میں کہنے لگا "ایسا کیا رے! سارا الٹا سیدھا ابھی سامنے کو آجائے گا" دوسرے لمحے اس کے لہجے میں ترشی آگئی۔ کہنے لگا "زیادہ کیا ہوئے گا، پچھلے جیسا ہی!"

وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں نے بھی اپنے آپ کو یہی

درس دینے کی کوشش کی کہ اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے لیکن چند ثانیوں کے سکوت کے بعد میرے جسم سے پھر وہی بچھو چمٹنے لگے۔ میں نے بٹھل سے نہیں کہا کہ یہی کچھ تو نہیں ہے۔ راستوں میں پہلے اتنے پتھر اور اتنے کتے نہیں تھے۔ پہلے ہم اپنے سائے سے بدگمان نہیں تھے۔ آگے جاکے اب ایک سوال کا ایک ہی جواب طے نہیں ہے۔

نام پلی کے اسٹیشن کے سامنے سڑک پر آکے بٹھل نے مجھے کہنی ماری "آنکھیں کھلی رکھنا ہے رے!" اس نے سرگوشی میں مجھے ہدایت کی۔

اس کے ٹھوکے پر مجھے احساس ہوا کہ بٹھل کو نواب ثروت یار کے گھر کا راستہ معلوم نہیں ہے۔ وہی احتیاط بہتر تھی جو پیرو نے نواب کے گھر جاتے ہوئے کی تھی۔ گھوڑا گاڑی نام پلی سے کچھ آگے آگئی تو میں نے جمرو سے کہہ کے گاڑی رکوادی۔ کھمبوں کے قمقمے روشن ہوگئے تھے لیکن ابھی ایسا اندھیرا نہیں تھا کہ آدمی کو آدمی نہ پہچان سکے۔ گھوڑا گاڑی سے اتر کے ہم سڑک کے کنارے کھڑے ہوگئے اور جمرو کے آنے کا انتظار کرتے رہے۔ کوچوان کے پاس ریز گاری نہیں تھی۔ اس لیے جمرو کو دیر لگی۔ وہ دس روپے کے سالم نوٹ کی فراخ دلی کرکے کوچوان کو چونکانا نہیں چاہتا ہوگا۔ جمرو کے ساتھ ہونے پر ہم مختلف گلیوں سے گزرتے ہوئے اس گلی میں آگئے جہاں کچھ فاصلے پر نواب ثروت یار کی کوٹھی تھی۔ بٹھل کے استفسار پر میں نے ہاتھ کے اشارے سے نشاندہی کی۔ گلی کے دونوں اطراف چھوٹی بڑی کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں اور خاموشی طاری تھی۔ اکادکا راہ گیر ہی دکھائی دے رہے تھے۔ قطار سے قمقمے روشن تھے لیکن درختوں کی وجہ سے سڑک پر جابہ جا روشنی کے چھینٹے سے پڑے ہوئے تھے۔ بٹھل نے ضرور کچھ کہا ہوگا جبھی زورا اور جمرو ہم سے کچھ پیچھے ہوگئے۔ مجھے نہیں معلوم کہ نواب کے مکان تک کا فاصلہ ہم نے کس طرح طے کیا۔ میرا تو سارا جسم سن ہوگیا تھا۔

کوٹھی کے دروازے پر دستک دیتے ہی دربان آگیا۔ مجھ سے کچھ پوچھا ہی نہیں گیا۔ بٹھل نے تڑختی آواز میں اس سے کہا کہ وہ اندر جاکے نواب ثروت یار کو مطلع کردے کہ کوئی اس سے ملنے آیا ہے۔

جمرو اور زورا آگے چلتے گئے تھے، دربان کے سامنے میں اور بٹھل تھے۔ اس نے سر سے پیر تک مغائرانہ نظروں سے ہمیں دیکھتے ہوئے جواب دیا کہ نواب گھر پر نہیں ہے۔

یہ سن کر مجھے سانس لینے کا کوئی موقع مل گیا۔ بٹھل نے پوچھا کہ نواب کی واپسی کی کب تک امید ہے؟ دربان نے تیوری چڑھا کے کہا کہ وہ نواب ہے، اپنی مرضی کا مختار، پھر وہ کہنے لگا کہ آنے کا وقت تو ہوگیا ہے لیکن کیا معلوم، دیر سے آئے۔

بٹھل کی پیشانی پر سلوٹیں پڑگئیں اور نتھنے پھولنے لگے۔ دربان کو کچھ خیال آیا۔ تجسس سے پوچھنے لگا کہ ہمیں نواب سے کیا کام ہے؟

"اپنے کو کتے نے نہیں کاٹا ہے رے۔" بٹھل نے تنک کے کہا۔

دربان سیدھا ہوگیا اور اس کا لہجہ بدل گیا "آپ لوگاں کا نام۔۔۔؟" اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"تجھ کو بول کے کیا کریں؟"

"آپ، آپ لوگاں بمبئی سے تو نہیں آئے کیا؟" دربان نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

میری رگوں میں خون جمنے لگا۔ صاف ظاہر تھا کہ نواب ہی نے خط لکھا تھا اور اسے ہمارا انتظار بھی تھا۔ بٹھل کے اقرار پہ دربان ہم سے اندر چل کے بیٹھنے کے لیے ضد کرنے لگا اور اس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔

"مگر نواب، نواب صاحب!" بٹھل نے تردد سے کہا "کب آئیں گے وہ؟"

"آجائیں گے صاحب! ابھی بس آنے کا وقت ہوگیا ہے۔" دربان نے مودبانہ کہا "آپ لوگاں ذرا انتظار کرلیں تو اچھا ہے۔ اندر آؤ حضت!"

بٹھل دروازے پر رکا، کچھ سوچتا رہا پھر میرا ہاتھ تھامے ہوئے وہ اندر داخل ہوگیا۔ وہی نشست گاہ تھی جہاں پہلے میں اور پیرو آکے بیٹھے تھے۔ پردے، صوفے اور قالین شاید بدل دیے گئے تھے۔ دربان نے پردے ہٹاکے کھڑکیاں کھول دیں۔ فانوس بھی روشن کردیا۔ ہمیں بٹھا کے وہ فوراً واپس چلا گیا۔ دیر تک سناٹا چھایا رہا۔ میرا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ عمارت سے ملحق ہونے کے باوجود نشست گاہ الگ تھلگ بنی ہوئی تھی۔ گھر کی طرف سے کوئی آواز کوئی چہکار نہیں آرہی تھی جیسے ہمارے سوا وہاں کوئی موجود ہی نہ ہو۔ جانے کتنا وقت گزرنے پر اندر کی جانب سے دھیمی دھیمی چاپیں سنائی دیں۔ میرے دل کی حرکت بند ہونے لگی۔ بار بار مجھے ایسا لگتا تھا کہ سامنے کے دروازے سے مولوی صاحب اندر نہ آجائیں۔ مولوی صاحب اگر یہیں مقیم ہیں۔ تو کسی وقت بھی اندر آسکتے ہیں۔ نہ جانے نواب نے انہیں کیا بتایا ہو۔ مولوی صاحب کی موجودگی کا مطلب ہے کہ کورا بھی یہیں کہیں ہوگی، چند قدموں کے فاصلے پر، دو چار دیواروں کی دوری پر۔ آنے والے وقت میں کیا دیکھنے اور سننے کو ملے، اس خیال سے مجھ پر رعشہ طاری ہونے لگتا۔

وہ ملازمہ تھی۔ ہمارے لیے بسکٹ، خشک میووں اور چائے کا طشت لائی تھی۔ وہ دبے پاؤں کمرے میں آئی اور طشت پر رکھی ہوئی چیزیں میز پر چن کے چلی گئی۔ بٹھل اس سے پوچھ سکتا تھا کہ گھر میں کوئی اور مہمان ہے یا نہیں لیکن وہ خاموش رہا۔ ملازمہ کے جانے کے بعد بٹھل نے میرے لیے بھی چائے بنائی۔

"تھوڑی تو بھی تو لوٹ لے" وہ بھن بھناتی آواز میں بولا۔

مجھ سے تو پیالی بھی نہیں اٹھائی جاتی۔ میں بے سدھ بیٹھا رہا تو اس نے بھی اصرار نہیں کیا۔ ہمیں وہاں بیٹھے ہوئے گھنٹا بھر ہوگیا ہوگا یا اس سے زیادہ۔ ایک ایک لمحہ رینگ رینگ کے گزر رہا تھا۔ بٹھل نے شاید ایسا وقت کبھی نہ کاٹا ہو۔ وہ پہلو بدلتا، ہنکاریاں بھرتا اور پلیٹ سے کاجو اٹھاکے ٹونگتا رہا۔

پھر موٹر کا ہارن بجنے، لوہے کا دروازہ کھلنے اور موٹر اندر آنے کی آواز سنائی دی اور لمحوں بعد برابر کے کمرے سے تیز چاپوں کی گونج پیدا ہوئی۔ میری آنکھیں پتھرانے لگیں۔ سیاہ شیروانی میں ملبوس وہ نواب ثروت یار ہی تھا۔ وہ تیزی سے اندر داخل ہوا۔ "ارے آپ! آپ کب آئے؟" وہ حیرت آمیز تپاک سے بولا اور معذرت کرنے لگا "مجھے کچھ دیر ہوگئی، آپ حضرات کب تشریف لائے؟"

بٹھل اور میں کھڑے ہوگئے تھے۔ پہلے نواب سیدھا میری طرف آیا، اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ مجھ سے اس نے مصافحہ کیا اور گلے لگایا۔ میرا جسم اکڑا ہوا تھا۔ وہ کہنے لگا "آپ نے بہت دیر کردی۔ مجھے شبہ ہو رہا تھا کہ آپ کو شاید میرا خط نہیں ملا؟" پھر وہ بٹھل کی طرف مڑا۔ اس کی بھویں سکڑ گئیں اور وہ ہچکچاتے ہوئے بولا "وہ کہاں ہیں؟ پہلے آپ تو نہیں آئے تھے؟"

بٹھل نے اسے سلام کیا اور بتایا کہ پیرو کی موت ہوگئی ہے۔

"ارے!" نواب کے چہرے پر غبار چھا گیا "کب؟" وہ بے چینی سے بولا۔

"دن ہوگئے" بٹھل نے گہری سانس لے کے کہا۔ چند ثانئے سکوت رہا پھر بٹھل نے بھاری آواز میں پوچھا "آپ پہلے یہ بولو نواب صاحب! ابھی مولوی صاحب ادھری ہیں؟"

نواب سٹپٹا گیا اور جلد ہی سنبھل کے بولا "جی ہاں، جی ہاں۔ مگر آپ تشریف تو رکھیے، میں تو آپ کا انتظار کر رہا تھا۔"

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

ایسا لگا جیسے یہ خواب کی کوئی حالت ہے۔ نواب ثروت یار نے کچھ اور کہا ہے، میں نے ٹھیک سے سنا نہیں یا نواب کوئی اذیت پسند ہے۔ اسے میری اور بٹھل کی کیفیت کا اندازہ ہوگیا ہے اور وہ ہم سے لطف لے رہا ہے۔ اس کا کیا جاتا ہے، دوسرے ہی لمحے وہ کوئی بھی عذر کرسکتا ہے۔ بٹھل نے عجلت بھی بہت کی تھی۔ ابھی کچھ دیر اسے تحمل کرنا چاہیے تھا۔ ممکن ہے مولوی صاحب کے بارے میں ہماری امید کے خلاف کوئی ایسی ویسی خبر سناکے نواب ہمیں صدمہ نہ پہنچانا چاہتا ہو۔ کوئی عجب نہیں کہ چند لمحوں بعد وہ تاسف کا اظہار کرے اور بتدریج وہی کچھ بتائے جس کے لیے ہم تیار ہوکے آئے ہیں اور جو ہمارے لیے کچھ نیا نہیں ہے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس کا انکار ہمارے لیے کوئی بڑا حادثہ نہیں ہے۔ ہم تو یہ سزا کب سے بھگت رہے ہیں۔

بٹھل نے صوفے سے کمر ٹکالی اور نواب سے پھر کوئی سوال نہیں کیا۔

"آپ حضرات نے کچھ چائے وغیرہ بھی لی؟" نواب فکرمندانہ شائستگی سے بولا "دربان نے بتایا ہے کہ آپ کو آئے خاصی دیر ہوگئی ہے۔ یقیناً آپ نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا ہوگا؟"

"اپنے کو بالکل ضرورت نہیں ہے، چائے ابھی ہم لوگوں نے پی لی ہے۔"

بٹھل نے سمٹی ہوئی آواز میں کہا اور نواب کو مشورہ دیا کہ وہ ابھی گھر آیا ہے، بہتر ہوگا کہ اندر جاکے لباس وغیرہ تبدیل کرلے۔

"نہ نہ، ہماری فکر نہ کیجیے، ہم بہت تازہ دم ہیں۔" نواب شانے اچکاتے ہوئے بولا "کلب سے آرہے ہیں۔ ہماری گزارش ہے کہ کوئی تکلف نہ کیجیے" اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی اور بولا "کھانے کا وقت تو ہوچکا ہے۔"

"اپنا نہیں ہوا صاحب!" بٹھل نے آہستگی سے کہا "آپ کھاؤ، ہم ادھری بیٹھے ہیں۔"

"یہ کیسے، کیسے ہوسکتا ہے" نواب الجھ کے بولا اور اس پر ندامت طاری ہوئی، کہنے لگا "ہم تو بھول ہی گئے۔ سامان وغیرہ کہاں ہے آپ کا؟ آپ کب تشریف لائے؟"

"دوپہر کی گاڑی سے آئے تھے، سامان بھی ٹھکانے سے

ہے۔"

"یہ کیا ہوا جناب!" نواب شکایتی لہجے میں بولا "آپ کو سیدھے غریب خانے پر آنا چاہیے تھا۔ یقین کیجیے، ہمیں یہی توقع تھی۔ یہاں آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی۔ مہمان خانہ الگ بنا ہوا ہے۔"

"مہربانی آپ کی نواب صاحب!"

"کہاں، کہاں قیام ہے جناب کا؟" نواب نے بے چینی سے پوچھا۔

"ادھری چارکمان کے پاس ایک ٹھکانا ہے۔" بٹھل نے نواب کو نہیں بتایا کہ ہم شہر کے سب سے بڑے ہوٹل، ویکاجی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔

میں دم بخود بیٹھا ان کی باتیں سن رہا تھا اور میری نظریں نواب پر منڈلا رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر بہ ظاہر خوشگواری کی علامات نمایاں تھیں۔ ہمیں سنانے کے لیے کوئی ناگوار بات ہوتی تو وہ ضرور نا آسودہ دکھائی دیتا۔

"کوئی عزیز ہے یہاں؟" اس نے زیر لبی سے پوچھا۔

"اپنا کوئی نہیں ہے ادھری صاحب!"

"پھر کیا کسی ہوٹل، سرائے میں؟" نواب نے جھجک سے کہا۔

"ایسے ہی سر چھپانے کی ایک جگہ ہے۔ پہلے بھی ایک دفعہ دو ایک دن ادھری کاٹے تھے" بٹھل نے نواب کو کچھ اور نہیں کہنے دیا اور کسمساتے ہوئے بولا "ہم لوگ اپنی جگہ ٹھیک ہیں صاحب! ہو سکے تو آپ پہلے تھوڑی اپنی بات کرو۔"

"کیسی بات جناب والا؟" نواب مضطرب سا ہو گیا۔

"اپنے کو مولوی صاحب کے بارے میں کچھ بولو تو مہربانی ہوگی۔"

"ہا آں" نواب چونک کے بولا۔ اس نے سر اٹھا کے آنکھیں بند کر لیں اور اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ ہم پر گزرنے والی اذیت کا نواب کو جیسے کوئی احساس ہی نہ تھا۔

"میں نے بتایا نا جناب!" چند لمحے سکون آمیز توقف کے بعد نواب نے کہا "مولوی صاحب قبلہ یہیں ہیں اور الحمدللہ خیریت سے ہیں۔"

نواب کی ٹھہری ہوئی آواز کی تپیدگی بٹھل نے بھی محسوس کی ہوگی۔ اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا "ابھی ادھری گھر میں ہیں وہ؟"

"گھر ہی میں سمجھیے" نواب کسی قدر تذبذب سے بولا "لیکن یہاں نہیں۔"

بٹھل نے سر ہلایا اور کوئی تامل کیے بغیر پوچھا "ادھری حیدر آباد شہر میں نہیں ہیں کیا؟"

"نہیں نہیں" نواب ایک ثانیے کے لیے منتشر ہوا تھا کہ سنبھل کے بولا "حیدر آباد ہی کہیے اور نہیں بھی۔ اصل میں یہاں حیدر آباد سے کچھ دور وہ ہمارے دوسرے گھر میں ہیں۔"

میری رگوں میں خون منجمد ہو گیا تھا۔ بٹھل جانے کیسے اپنے آپ کو سمیٹے سنبھالے بیٹھا تھا۔ میں دریدہ آنکھوں سے کبھی اسے دیکھتا، کبھی نواب کو۔ لگتا تھا، نواب میرا اور بٹھل کا امتحان لے رہا ہے۔ وہ از خود بھی سب کچھ بتا سکتا تھا۔ اس سے زیادہ ہماری آمد کے مقصد سے کون واقف تھا۔ وہ تو جیسے بھول ہی گیا تھا کہ اس نے ہمیں بلایا ہے۔ کچھ دیر کے لیے خاموشی رہی پھر بٹھل نے دبی آواز میں پوچھا "آپ کی زمینوں والے مکان میں ہیں کیا وہ؟"

"آپ نے بالکل صحیح اندازہ لگایا" نواب پلکیں جھپکانے لگا۔ اس کے چہرے پر حیرت امڈ آئی "مگر آپ کو کیسے علم ہوا، ہماری زمینوں اور مکانات کے بارے میں؟"

"آپ نواب ہو صاحب!" بٹھل نے نسبتاً اونچی آواز میں کہا "زمین جاگیر کے بنا کوئی نواب کیسے ہو سکتا ہے؟"

"یہ آپ نے خوب کہا" نواب نے محجوبیت سے آنکھیں موند لیں اور پہلو بدل کے بولا "بس تھوڑی بہت بزرگوں کی امانت کے رکھوالے ہیں۔"

"آپ ایسا بولتے ہو تو اچھی بات ہے۔"

"ہم تو سمجھتے ہیں، جو کچھ بھی ہے، خدا کا دیا ہوا ہے اور صرف اسی کا ہے۔" نواب سانس بھر کے بولا۔

"اتنا کون سمجھتا ہے؟"

"ہاں، آپ بجا کہتے ہیں شاید بہت ہی کم۔ مکین تو مکانوں میں مسافروں کی طرح ہوتے ہیں" نواب نے متانت سے کہا پھر یکایک اسے خیال آیا اور وہ معذرت کے انداز میں بولا "کیسی عجیب بات ہے، اتنی دیر ہو گئی۔ ہم ابھی تک اپنے محترم مہمان کے نام نامی کے بارے میں بھی نہ جان سکے؟"

"نام سے کیا بنتا ہے صاحب! نام تو شاید سب کے الٹے رکھے جاتے ہیں" بٹھل نے بھن بھناتے ہوئے کہا "اگر یہ کوئی رسم تھی تو بٹھل کو ادا کرنی چاہیے تھی۔ اس نے کچھ نہیں چھپایا اور نواب سے کہا کہ والدین نے جو نام رکھا تھا، وہ تو کب کا مٹ چکا، اب اسے لوگ صرف بٹھل کے نام سے پکارتے ہیں۔"

"بٹھل!" نواب کے ہونٹ کھنچ گئے اور ماتھے پر لکیریں ابھر آئیں "بٹھل صاحب... بٹھل خاں... بٹھل...؟"

"جو بھی آپ کو اچھا لگے، ساتھ ٹانک لو۔"

"خوب!" نواب نے تجسس سے کہا "اور جناب کے مشاغل؟"

"ہم لوگ نواب نہیں ہیں۔"

"نوابوں کے سینگ تو نہیں ہوتے جناب!"

"پھر بھی نواب نواب ہوتے ہیں" بٹھل نے بوجھل آواز میں کہا "سینگ تو ہر ایک کے ہوتے ہیں، پر دکھائی نہیں دیتے۔"

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسی باتیں کرنے لگے ہیں اور بٹھل اس فضول گوئی میں کیوں وقت ضائع کر رہا ہے۔ کئی بار مجھے وحشت ہوئی کہ نواب سے پوچھوں، اس نے ہمیں خط لکھ کے بلانے کے بارے میں مولوی صاحب کو کچھ بتایا ہے یا نہیں۔ میں نے دخل دینا چاہا لیکن مجھے اپنے ہوش و حواس کی یک جائی کا یقین نہیں تھا۔ میرے حلق میں کانٹے پڑے ہوئے تھے۔ میرے لیے شاید یہی مناسب تھا کہ بت بنا بیٹھا رہوں۔

"آپ نہایت آزمودہ کار بزرگ معلوم ہوتے ہیں" نواب کے چہرے کے مانند اس کی آواز بھی تمتما رہی تھی۔ یقین جانیے، آپ سے مل کے خوشی ہوئی لیکن آپ کچھ فرما رہے تھے، اپنے سلسلے..."

"وقت بڑا ہے صاحب!" بٹھل نے نرمی سے کہا "بولنے کو کچھ زیادہ ہو تو منہ کھولتے ہوئے بھی اچھا لگے گا۔ سمجھو، تھوڑی بہت کھیتی باڑی کا آسرا ہے، دیکھ بھال تو کوئی اور کرتا ہے۔ ہم تو بس گنتی کرتے ہیں۔ دو تین، پانچ، ہزار۔"

"بمبئی ہی میں زمینیں ہیں؟"

"بمبئی سے کچھ پرے، دور ہیں صاحب!"

"آپ بھی بمبئی کے معلوم نہیں ہوتے۔"

"اب تو دنوں سے ادھری پڑاؤ ہے، اپنا کیا نواب صاحب جدھری کو ہوا چلی، چل پڑے۔"

"آپ نے بتایا کہ آپ کو شکار سے دلچسپی ہے، ہمیں بھی کچھ ہے" نواب نے مچل کے کہا۔

"ہر نواب کو ہوتی ہے۔"

"ضروری نہیں" نواب نے بہ عجلت تردید کی "ہمارے علم میں کئی نواب ہیں جو اپنی حویلی اور محل سے باہر بھی کم ہی نکلتے ہیں۔"

"ان کے جنگل اندر ہی ہوتے ہیں۔" بٹھل نے آہستگی سے کہا۔

نواب نے بٹھل کی بات شاید توجہ سے نہیں سنی۔ تیزی سے بولا "ہمارا مقصد ہے کہ وہ شکار سے بالکل بے بہرہ ہیں۔"

"صرف آدمی کا کھیلتے ہوں گے۔"

اس موقع پر بٹھل کو کوئی ایسی ویسی بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ صوفے پر نواب کا جسم بل کھا گیا لیکن نوجوان ہونے کے باوجود وہ خاصا حلیم الطبع شخص تھا۔ اس نے جلد ہی اپنی بے کلی پر قابو پا لیا "معلوم ہوتا ہے، آپ کو نوابوں کا کوئی تلخ تجربہ ہے۔"

"اپنا اتنا نہیں، آگے کا دیکھا بولتے ہیں" بٹھل نے نواب سے اجازت لے کر بیڑی جلائی اور ایک گہرا کش لے کے بولا "جانے دو نواب صاحب! ابھی اپنی بات کرو۔"

نواب کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر ٹھہر گیا۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے خوش گواری سے کہا "ویسے انگلیوں کے فرق کے تو آپ قائل ہوں گے۔"

"پر ہوتی ساری انگلیاں ہیں چھوٹی بڑی انگلیاں۔"

نواب نے مفاہمانہ انداز میں سر کو جنبش دی مگر اسے قرار نہیں تھا، کہنے لگا "ہمارے بزرگ کو کون سا شکار زیادہ مرغوب ہے؟"

"ڈور کانٹے کے سوا سارا۔"

"وہ تو بہ خدا ہمیں بھی نہیں" نواب کو بے ساختہ ہنسی آگئی "مچھلی کا شکار تو مذاق سا لگتا ہے، اپنے آپ سے بھی اور شاید مچھلیوں سے بھی۔ بہت سے لوگوں کا معاملہ یہ ہے، ان کا بس چلے تو ساری عمر ڈور ڈالے کنارے پر بیٹھے رہیں۔ سنا ہے یہ لوگ پہلے افیون کھاتے ہیں۔"

"مچھلی کا شکار افیون ہے صاحب!"

"بے شک، پھر افیون کی کیا ضرورت رہ جاتی ہوگی" نواب شگفتگی سے بولا "میرا قیاس ہے، جناب ماہر شکاری ہوں گے۔"

"کیا بولیں صاحب! یہ تو شکار ہونے والے ٹھیک سے بولیں گے۔ وقت ملا تو کسی دن چلیں گے۔ ادھری بھی اچھا شکار ہوگا۔"

"مل جاتا ہے لیکن شکار کا اصل مزہ تو ادھر نیپال کی طرف اور ادھر وندھیا چل کے پہاڑوں میں ہے۔ ایک بار جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ واپس آنے کو جی ہی نہیں کرتا تھا۔ آپ بھی گئے کبھی اس طرف؟"

"دو ایک بار جانا ہوا ہے" بٹھل نے سرسری انداز میں کہا۔

"آپ نے وہاں کیا کھیلا؟"

"جو نشانے پر آگیا صاحب! یا یوں بولو' جس کا وقت آگیا" بٹھل نے سر اٹھا کے دیواری گھڑی پر نظر ڈالی "رہے گی صاحب آپ سے بات" نواب کے کچھ اور کہنے سے پہلے اس نے اسے یاد دلایا کہ رات ہو رہی ہے' نواب کے اپنے معمولات ہوں گے۔ وہ کوئی تکلف نہ کرے اور ہماری وجہ سے اپنے مشاغل منتشر نہ کرے۔ بٹھل کا اشارہ واضح تھا کہ نواب کو ہماری آمد کے مقصد کو اولیت دینی چاہیے لیکن نواب جیسے کچھ نہیں سمجھا' وہی کھانے کے لیے اصرار کرنے لگا۔ بٹھل نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ کھانے کے معاملے میں ذرا بھی ردوکد نہیں کرتا تاہم نواب نے فوراً تالی بجائی۔ چند ثانیوں میں وہی نوجوان ملازمہ حاضر ہوگئی جو نواب کی عدم موجودگی میں ہمارے لیے چائے لائی تھی۔ نواب نے چند منٹ کے لیے گھر میں جانے کی اجازت چاہی۔ کھانے کے لیے بٹھل کی آمادگی سے اسے خوشی سی ہوئی تھی۔ اس میں کچھ اور چستی و تیزی آگئی۔ کمرے سے اس کے جانے کے بعد سناٹا چھا گیا۔ میں نے مضطربانہ بٹھل کی طرف دیکھا۔ اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا' بس پلکیں پٹپٹاتا رہا۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے نواب کی باتوں سے کیا نتیجہ اخذ کیا لیکن میں نے جو سنا اور دیکھا تھا' وہی اس نے بھی کیا تھا۔ نواب کے دوبارہ کمرے میں داخل ہونے تک ہم دونوں گنگ بیٹھے رہے۔ وہ منٹوں میں واپس آگیا مگر لگتا تھا' پہر گزر گئے ہیں۔ وقت کا یہی دستور ہے۔ اسے کوئی غرض نہیں کہ کس پر کس طرح گزرتا ہے۔ نواب نے شیروانی اتار دی تھی اور سلک کے کرتے پر بیل بوٹوں سے کڑھی کشمیری شال سینے سے لپیٹ لی تھی۔ صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے شال شانے پر ٹھیک کی تو اس کے کسرتی جسم کا کچھ اندازہ ہوا۔ اس کے بازو مضبوط تھے اور سینہ آگے نکلا ہوا تھا۔ جسم کا یہ توازن ورزش کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ سفید شال میں اس کا سرمئی رنگ کچھ اور نمایاں ہوگیا تھا۔ بال بھی پہلے سے زیادہ سلیقے سے جمے ہوئے تھے۔ اس کے آنے پر بٹھل سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔ واپس آنے کے بعد بھی نواب نے معذرت چاہی اور کہا "کھانے میں کچھ دیر نہیں۔ البتہ جو حاضر تھا' وہی کچھ ہے۔ تیاری میں اور دیر ہو جاتی۔"

"آپ نے اچھا کیا" بٹھل نے ٹھنڈی آواز میں کہا "اپنے کو ایسی بھوک نہیں تھی۔"

"رات کا کھانا آپ عموماً کس وقت کھا لیتے ہیں؟"

"کوئی ٹھیک نہیں' پر نو سے پہلے بھی نہیں۔"

"تو پھر وقت تو ہو رہا ہے؟"

بٹھل نے کچھ نہیں کہا۔ خاموشی چھا گئی۔ نواب کو یہ سکوت گراں گزر رہا ہوگا۔ اس نے بے قراری سے ادھر ادھر دیکھا اور بٹھل سے مخاطب ہوا "یہ علاقہ آپ کو کیسا لگتا ہے؟"

"یہ سب تو آدمی سے ہوتا ہے صاحب!"

"آپ نے بہت صحیح کہا' یوں کہئے کہ یہاں کے لوگ آپ کو کیسے لگے؟"

"لوگ بھی ساری جگہوں پر ایک جیسے ہوتے ہیں' اچھے برے۔"

"لیکن یہاں آپ کو کچھ مختلف' منفرد تو لگتا ہوگا۔"

"سچ پوچھو تو صاحب! کوئی خاص نہیں' یہاں نواب لوگ کچھ زیادہ ہیں۔"

"کیا حضرت!" نواب کے جیسے کسی نے چٹکی بھرلی "یہ اچھی بات ہے یا بری؟" اس نے بہ ظاہر شوخی سے پوچھا۔

"سارے ہی ہوتے تو اچھا تھا۔ اور صاحب!" بٹھل نے بھاری آواز میں کہا "یہ تو ادھری بسنے والوں سے پوچھو۔"

نواب دیدے گھمانے لگا "یہ فرمائیے' کبھی یہاں مستقل بس جانے کو دل نہیں چاہا؟"

"آپ جیسے دو چار مل جائیں تو ضرور۔"

"اوہ!" نواب پر خجالت کا غلبہ ہوا۔ اس نے ایک جھرجھری لی اور منکسر لہجے میں بولا "یہ محض آپ کا حسن ظن ہے' ہم کیا! ہم تو ہمیشہ اپنے دوستوں' مہمانوں کے سامنے..."

"ہم ایسے نہیں بول رہے صاحب!" بٹھل نے اس کی بات کاٹ کے سادگی سے کہا۔

"ہمیں معلوم ہے' ہمیں یقین ہے" نواب نے ہکلاتے اور سرہلاتے ہوئے تائید کی اور کہنے لگا "آپ نے بتایا تھا کہ ایک دوبار ہی جناب کا یہاں آنا ہوا ہے۔ یقیناً سیروتفریح کی غرض سے۔"

"ہاں صاحب!" بٹھل نے مختصراً کہا۔

"کتنے دن قیام رہا یہاں؟"

"زیادہ دن نہیں' کوئی ہفتے بھر کو۔"

"یہ مدت تو کسی علاقے اور اس کے لوگوں کو جاننے کے لیے بہت کم ہے۔ بھلا آپ نے یہاں کیا دیکھا ہوگا۔"

"پانی پی لیا تھا صاحب!"

"اچھا کیا آپ نے" نواب پہلے کھل کھلایا پھر سنجیدہ ہو کے بولا "بہت کچھ حضرت' ہم سمجھتے ہیں کہ میزبانوں اور مہمان داری پر منحصر ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہاں آپ کا کوئی نہیں ہے' کوئی دوست' رشتے دار... تو ظاہر ہے' بے لطفی تو..."

"کانٹے پر رکھے بنا ہم دوست نہیں بناتے صاحب! رشتے داری تو پرے کی بات ہے" بٹھل نے بڑبڑاتے ہوئے کہا "ادھری چار مینارے کے پاس ایک دو سے تھوڑی سلام دعا ہوئی تھی۔"

"اور' اور ابھی ان صاحبان کے پاس بھی کیا جانا ہوا ہوگا" نواب خود کلامی کے انداز میں بولا۔

"ادھری سے نمٹ کے ضرور جاتے۔"

"ہماری مراد ہے' پھر تو نہایت مناسب ہے۔ غریب خانہ حاضر ہے' ان حضرات سے ملاقات ہو جاتی تو جناب کے لیے مشکل ہو سکتی تھی۔ حیدر آباد کے لوگ' مشہور ہے' خاصے مہمان نواز ہوتے ہیں۔"

نواب کے پاس ان بے سروپا باتوں کے سوا کوئی اور موضوع نہیں تھا۔ بٹھل بھی جانے کیوں اس تن وہی سے جواب دے رہا تھا۔ ملازم دبے پاؤں اندر آ کے دسترخوان لگ جانے کی اطلاع نہ دیتا تو یہ سلسلہ جاری رہتا۔ نواب پھر فوراً اٹھ گیا اور اس نے بازو پھیلا کے ہمیں اندر چلنے کے لیے اشارہ کیا۔ اندر کی تو دنیا ہی دوسری تھی۔ یہ وسیع و عریض حصہ کسی سائبان یا دالان کے مانند تھا۔ ایک طرف لمبی چوڑی میز لگی تھی' دوسری جانب فرشی نشست کا اہتمام تھا۔ جس حصے میں ہمیں بٹھایا گیا تھا۔ شاید اسی طرح محراب دار ستونوں پر اٹھا ہوا دالان چاروں طرف بنا تھا۔ باقی تین حصوں میں لمبی لمبی چلمنیں پڑی تھیں۔ درمیان میں پھیلے ہوئے سبزہ زار کے وسط میں فوارہ ابل رہا تھا۔ دالان کے پیچھے زمینی اور پہلی منزل پر ذرا ذرا سے فاصلے کے بعد کمرے بنے تھے۔ باہر سے دیکھ کے کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ خرم منزل اندر سے اتنی مختلف اور بڑی ہوگی۔ باہر سے جدید طرز کی کوٹھی' اندر روایتی حویلی۔ نواب سے پہلی مرتبہ جب میں اور پیرو ملے تھے تو نواب کے کہنے کے مطابق اس کے والد کے انتقال کو دو سال ہوئے تھے۔ غالباً باپ کے مرنے کے بعد ہی خوش مذاق نواب ثروت یار نے حویلی کے سامنے کا حصہ نئی طرز پر بنوایا ہوگا۔

میرا سارا جسم ڈھیر ہو رہا تھا۔ صوفے سے اٹھتے ہوئے آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ ملازم نے سلفچی میں ہاتھ دھلانے کے لیے آفتابہ بڑھایا تو مجھ سے اچھی طرح ہاتھ بھی نہ دھوئے جا سکے۔ دسترخوان پر چینی کے ڈونگے' رکابیاں اور

چمچے کانٹے سلیقے سے رکھے تھے۔ ایک لقمہ بھی لینے کو جی نہیں کرتا تھا۔ نواب نے ڈونگوں کے سرپوش اٹھائے اور عجز و انکسار کا آموختہ پڑھنے لگا۔ بٹھل کی یقین دہانی کے باوجود کہ دسترخوان پر بیٹھ کے وہ تکلف نہیں کرتا، نواب اصرار سے باز نہیں آیا، کہنے لگا "حیدر آباد کے بعض کھانے صرف حیدر آباد سے مخصوص ہیں، بریانی تو یہاں آپ نے طرح طرح کی آزمائی ہوگی۔ یہ لقمی تخمی بھی ۔۔۔ لیکن ممکن ہے، اس وضع کا مزعفر آپ نے پہلے نوش جاں نہ فرمایا ہو۔"

ہم نواب عالم تاب کی حویلی میں قیام کے دوران میں ہر قسم کے حیدر آبادی کھانے برت چکے تھے۔ وہاں کے تو رنگ ڈھنگ ہی شاہانہ تھے۔ وہ تو ویسے بھی پورا محل تھا۔ یہ سب کچھ اس کا عشر عشیر بھی نہ تھا "حیدر آباد میں ترشی کا بہت شوق ہے مگر صرف کھانوں کی حد تک" نواب ہنس کے بولا "خاطر جمع رکھیے، لوگ اس کی ضد ہیں" نواب جانے کیا کیا کہتا رہا اور بٹھل کے آگے ڈونگے بڑھاتا رہا۔ اس کی دل دہی کے لیے بٹھل کو یہی ظاہر کرنا چاہیے تھا کہ کھانوں کی یہ خوش رنگی اور خوش ذائقگی اس کے تجربے میں ایک اضافہ ہے۔ وہ اشتیاق کا اظہار کرتا رہا، اس صاحب آداب سامع کی طرح جسے شعر سننے کے بعد داد دینا لازم ہوتا ہے۔ چاہے شعر سماعت پر کتنا ہی بار گزرے۔ چار و ناچار میں بھی سر جھکائے نواب کے حکم کی تعمیل میں ہاتھ چلاتا رہا۔ لقمے میرے حلق، میرے سینے میں اٹک رہے تھے۔ سزائیں تو طرح طرح کی ہوتی ہیں۔

فرشی نشست والا حصہ پوری طرح روشن تھا۔ اطراف میں دھندلی دھندلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ بار بار میری نظریں زنان خانے کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ انہی در و بام سے اس کا بھی گزر ہوا ہوگا۔ ہو سکتا ہے، وہ اب بھی یہیں ہو اور کسی سبب سے نواب ہم سے چھپا رہا ہو۔ جب اتنا بڑا گھر ہے تو مولوی صاحب کو دور ٹھہرانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ ہماری کوئی آزمائش کر رہا ہے۔ عجب نہیں کہ کسی گوشے سے اچانک مولوی صاحب سامنے آجائیں مگر پھر نواب میں یہ اطمینان نہ ہوتا۔ زنان خانہ اتنا دور نہیں تھا کہ کوئی آواز جھنکار ہو تو ہم تک نہ پہنچ سکے۔ اس طرف ایسی خاموشی طاری تھی جیسے وہاں کوئی رہتا ہی نہ ہو۔

دونوں ملازم نواب کے اشارے کے منتظر ایک جانب مستعد کھڑے تھے۔ ملازمہ باورچی خانے سے گرم پراٹھے لالا کے دسترخوان پر رکھتی جاتی تھی۔ حاضر کھانے کی ایسی افراط، اتنی اقسام تھیں تو ہمارے لیے اہتمام کرنے پر نہ جانے کیا عالم ہوتا۔ معلوم ہوتا تھا، جیسے نواب کو ہماری آمد کی خبر ہو گئی تھی۔ کوئی کتنا ہی بڑا نواب ابن نواب ہو، شاید کسی کے ہاں بھی اتنی قسموں کے کھانے ہمہ وقت تیار نہ رہتے ہوں۔ یہ اتفاق ہی ہو سکتا تھا، کوئی مہمان نہ آسکا ہوگا یا پھر ہم کسی رسم، والد مرحوم کی برسی وغیرہ کے موقع پر آگئے تھے۔ سب کچھ تازہ تازہ تھا۔

"آپ اتنے خاموش کیوں ہیں؟" نواب دفعتاً مجھ سے مخاطب ہوا۔

میں ہڑبڑا سا گیا "نہیں تو۔" میں نے بے ربطی سے کہا "میں تو۔۔۔"

"آپ کو شاید کچھ پسند نہیں آیا۔"

"نہیں، نہیں جناب!"

"آپ تو گزشتہ مرتبہ خاصے دن یہاں رہے تھے۔ ہمیں یاد پڑتا ہے، دو تین ہفتے۔ کوئی اٹھارہ انیس روز کے وقفے سے آپ دوبارہ غریب خانے پر تشریف لائے تھے اور آپ نے بتایا تھا کہ آپ شہر ہی میں رہے ہیں۔"

"جی ہاں، جی ہاں" میں نے بدحواسی سے کہا۔

"تو آپ کے لیے تو حیدر آباد اتنا نیا نہیں ہوگا۔"

"جی ہاں" میں نے لکنت سے کہا "مگر اس وقت تو۔" میں کہتے کہتے رک گیا۔

نواب کی مشتاق اور متجسس نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں "آپ نے یہاں کیا کیا دیکھا بھالا؟ کہاں قیام رہا؟"

نواب کی یادداشت بہت تیز تھی۔ اسے دن تک یاد تھے۔ ٹھیک اتنے ہی دن بعد میں اور پیرو، حیدر آباد سے واپس جاتے وقت اس کے ہاں دوبارہ آئے تھے اور اس وقت اس نے بتایا تھا کہ اس دوران میں مولوی صاحب اور کورا نے اس کے گھر قیام کیا تھا۔ اور جب یہ کسی ضروری کام سے سکندر آباد گیا ہوا تھا، مولوی صاحب گھر میں اس کی والدہ یا کسی ملازم کو بتائے بغیر چلے گئے۔ میں نواب سے کیا کہتا کہ سترہ اٹھارہ روز کا یہ وقفہ ہم نے کہاں، کس حال میں بسر کیا تھا۔ ہمیں بمبئی جانے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ ادھر مارلی، زورا، نگو اور اباجان ہوٹل میں ہماری راہ تک رہے تھے۔ نواب کے گھر سے واپسی کے راستے میں اڈے کے آدمیوں نے ہمارا تعاقب شروع کر دیا تھا۔ ہم نے ان سے اوجھل ہو کے ہوٹل پہنچنے کی اپنی سی کوشش کی، کوئی چارہ نہ رہا تو پھر گٹی کے نسبتاً سنسان علاقے میں ہمیں ان کے سامنے آنا پڑا اور خون خرابے کے نتیجے میں حوالات جانا پڑا۔ ہمارے سان و گمان میں نہ تھا کہ نواب جہاں تاب کے ایما پر اڈے کے

آدمی سارے شہر میں کتوں کی طرح ہماری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ وہ تو کب سے جال بچھائے بیٹھے تھے۔ پولیس، حوالات، اڈے کے آدمی، سب نواب جہاں تاب نے خرید لیے تھے۔ سب کچھ پہلے سے طے کیا ہوا تھا۔ حوالات کا راستہ نواب کے زنداں تک جاتا تھا۔ بیش تر دن تو ہم نے اس شہر کے رئیس اعظم نواب جہاں تاب کے زنداں میں گزارے تھے۔

"پچھلے کے بارے میں پوچھ رہے ہو نواب صاحب!" بٹھل نے کسی طرح میری مشکل آسان کی "ان دنوں یہ ٹھیک کدھر رہا، یہ تو الٹا پڑ گیا تھا" اس سے پہلے کہ میں ہذیان بکتا، بٹھل نے نواب ثروت یار سے میری بیماری کا ذکر کیا کہ میں تو سارے عرصے ہاتھ پیر توڑے بستر پر پڑا رہا۔ طبیعت کچھ بحال ہوئی اور بمبئی واپسی کی کوئی شکل نظر آئی تو میں نے اور پیرو نے سوچا، ایک بار پھر نواب کے گھر کا رخ کیوں نہ کریں۔ ممکن ہے، اس درمیان اپنے وعدے کے مطابق مولوی صاحب وہاں آئے ہوں۔ ہو سکتا ہے مولوی صاحب کے بارے میں ہمیں نواب سے کچھ مزید معلوم ہو سکے، اور یہی ہوا بھی۔

میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ بٹھل کو یہ عذر کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ کوئی اور بات بھی پیش کی جا سکتی تھی۔ بہرحال نواب کے غیر ضروری سوالوں سے گریز کے لیے یہ فسانہ وضع کرنا بھی ایسا نامناسب نہ تھا۔ اس طرح بٹھل نے مولوی صاحب کے ذکر کا اعادہ کرنے کے لیے سلیقے سے نواب کو ترغیب دلائی تھی۔ دیر ہو گئی تھی، نواب کو ٹوکنا اب ضروری تھا۔ اسے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ ہم حیدر آبادی من و سلوا زہر مار کرنے اور ان کے قصیدے پڑھنے یہاں نہیں آئے ہیں۔ ایک ایک دن، ایک ایک لمحہ گنتے ہوئے اب کہیں برسوں میں یہ دن آیا ہے کہ کورا اور مولوی صاحب کے اتنے قریب پہنچ جانے کی صورت پیدا ہوئی ہے۔ نواب کو ہمارے حال کی کچھ خبر نہ تھی۔ مولوی صاحب کا ذکر جیسے اس نے سنا ہی نہیں۔ وہ ہمدردی کا اظہار کرنے لگا اور شکایتی لہجے میں بولا "ہمیں بتایا بھی نہیں۔ ہم نے ان سے کہا تھا کہ اس اجنبی شہر میں کوئی خدمت ہمارے لائق ہو تو ہم ہر وقت حاضر ہیں۔"

"بیمار آدمی تو اور بوجھ ہوتا ہے" بٹھل نے چڑچڑاتی آواز میں کہا "ایسے کوئی کیسے آجاتا صاحب!"

"بہ خدا ہمیں ذرا بھی علم ہو جاتا تو ہم سے کوتاہی نہ ہوتی۔ ہم انہیں یہاں لے آتے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ پہلی ہی ملاقات میں ہمیں بہت پسند آئے تھے۔ ان کے چہرے پر ایک عجب، معصوم سا ہیجان ہے۔ سترہ اٹھارہ دن تو خیر بڑی بات ہے، یہ دیکھتے ہمارے ساتھ صرف چند دن رہ کے کیسے ترو تازہ ہو جاتے۔"

"ایسا ہے صاحب تو ابھی اس کو پاس رکھ لو۔ یہ ابھی بھی کتنا ٹھیک ہے۔"

مجھے حیرت ہوئی کہ بٹھل یہ کیا کہہ رہا ہے۔ نواب کی آنکھوں سے بے چینی ہویدا ہوئی "نصیب دشمناں، کوئی عارضہ ہے انہیں؟ کیا بات ہے؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"برس ہو گئے اسے" بٹھل کی آواز ماند پڑنے لگی "کیا بولیں آپ کو، دیکھنے میں جتنا ٹھیک لگتا ہے، ایسا ہے بالکل نہیں۔"

میں نے جلتی ہوئی نظروں سے بٹھل کو دیکھا۔ میں اسے روکنا چاہتا تھا کہ نواب اضطراب سے بولا "کیا بات ہے، ہمیں بھی بتائیے۔"

"اسی کارن تو آپ کے پاس آئے ہیں" بٹھل نے گہری سانس بھر کے کہا "کتنے گھر، شہر، نگر کھوج لیے تب کہیں آپ کا ٹھکانا دکھائی دیا ہے۔"

نواب کشش و پنج کی کیفیت سے دوچار ہوا اور تردد سے بولا "ہو سکے تو ہمیں بتائیے، ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

"اب تو سارا آپ ہی کے پاس ہے۔" بٹھل نے الجھی ہوئی آواز میں کہا۔

"آپ کیا فرما رہے ہیں؟" نواب چونک کے بولا۔

"مولوی صاحب کے مل جانے پہ دیکھو صاحب! یہ کیسا رنگ بدلتا ہے۔"

"اوہ!" نواب نے ایک گہری سانس کھینچی "اچ۔ چھا، خوب! بہ خدا ہم تو پریشان ہو گئے تھے" وہ مسکرا کے بولا "ہم سمجھتے ہیں۔"

"پتا نہیں، آپ کتنا سمجھتے ہو؟"

"گزشتہ مرتبہ جب یہ آئے تھے تو انہوں نے ہمیں کچھ بتایا تھا، شاید سبھی کچھ" وہ جھجکتے ہوئے بولا "اسی لیے، اسی لئے ہم نے انہیں خط لکھا۔"

"آپ بولو، ہم آپ کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟"

نواب کی سمجھ میں دیر سے آیا کہ بٹھل کی مراد شکر گزاری سے ہے، کہنے لگا "نہیں نہیں۔ ہمارے لیے اس سے بڑی خوشی کیا ہو سکتی ہے کہ ہم بچھڑے ہوؤں کو۔۔۔" یہ کہتے ہوئے یکایک اس کے چہرے پر شکنیں بکھر گئیں۔ وہ خاموش ہو گیا پھر مجھ سے مخاطب ہو کے نرمی سے بولا "خاطر

جمع رکھیے۔ ایسی دیر نہیں ہے اب۔"

"ہم کو لگ رہا تھا' اس بار ہم خالی ہاتھ نہیں جائیں گے۔" بٹھل نے ممنونیت کے لہجے میں کہا۔

نواب کسی قدر اضطراری انداز میں سہلانے لگا۔

"آدمی کو بھی تالے لگ جاتے ہیں صاحب! توڑے سے نہ ٹوٹیں' وہ کنجی ڈھونڈتا رہتا ہے اور ادھری مکڑی جالا کاڑھتی رہتی ہے" بٹھل دھندلائی آواز میں بولا۔

"ہاں ہاں' آپ ٹھیک کہتے ہیں جناب!" نواب کی پلکیں سکڑ گئیں "آدمی واقعی بہت عجیب ہوتا ہے۔ گرہ پڑجائے تو لاکھ سر پیر ماریے' نہیں کھلتی۔ حالانکہ بہت کچھ خود آدمی کے اختیار میں ہے۔ یاد کرنا' بھول جانا' چھین لینا' بخش دینا' نقش بنانا' بگاڑ دینا' قائم رکھنا اور مٹا دینا۔ سارے کل پرزے اس کے پاس ہوتے ہیں۔ دماغ بھی دل بھی۔۔"

"سارے کل پرزے اوپر نیچے ہوجاتے ہیں۔ باگ جب ہاتھ سے چھوٹ جائے صاحب۔۔" بٹھل نے تندی سے کہا۔

"اور تقدیر! تقدیر بھی تو کرشمہ۔۔" نواب جانے کیا کہنا چاہتا تھا کہ ملازمہ کی دخل اندازی پر منتشر ہوگیا۔ ملازمہ کے ہاتھ سے شیرنی کا ڈونگا گرتے گرتے رہ گیا تھا۔ ڈونگا دسترخوان پر گرنے سے بچانے کے لیے وہ بوکھلا گئی اور اس کا سراپا ڈگمگا گیا۔ یہ دیکھ کے ایک ملازم اس کی طرف دوڑا لیکن ملازمہ نے خود کو فوراً سنبھال لیا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو نواب ضرور سرزنش کرتا۔ اس کے چہرے پر سرخی کی ایک لہر اٹھی بھی مگر اسے ہماری موجودگی کا احساس ہوگیا۔ ایک لحظے کی خفت آمیز مسکراہٹ کے بعد وہ شکایت کرنے لگا کہ ہم نے ہاتھ کیوں روک لیا' سب کچھ تو ویسے ہی رکھا ہوا ہے۔

"بس نواب صاحب! مہربانی" بٹھل نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ ہم نے کوئی تکلف نہیں کیا ہے۔

"باتوں میں ہمیں آپ سے پوچھنے کا خیال ہی نہ رہا' بہرحال یہ خوبانی کا میٹھا تو ملاحظہ کیجیے۔ یہ بھی حیدر آباد کی خاص چیز ہے۔"

بٹھل نے ایک کٹوری میری طرف بھی بڑھادی۔ میں نے جیسے تیسے اسے حلق سے اتارا۔ نواب کو شاید ہماری بے چینی و بے زاری کا اندازہ ہوچلا تھا یا یہ کہنا چاہیے کہ اسے ہماری حالت پر رحم آنے لگا تھا۔ اس نے پھلوں کے لیے اصرار نہیں کیا اور دسترخوان سے اٹھ گیا۔ ہاتھ دھونے اور کلی کرنے کے بعد ہم دوبارہ پہلے والے کمرے میں آ گئے۔ درمیان کی میز پر چائے دانی اور فنجان تیار رکھے تھے۔ ابھی چائے کا مرحلہ باقی تھا اور سہمی ہوئی ملازمہ فنجانوں میں چائے ڈالنے کے لیے کمرے میں داخل ہوئی تھی کہ نواب نے بے اعتنائی سے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ وہ سر جھکائے الٹے قدموں واپس چلی گئی۔ نواب نے اٹھ کے خود چائے بنائی اور اس سے پہلے کہ وہ ہم دونوں کے سامنے فنجان لاتا' بٹھل نے عجلت کی۔ میں نے بھی اس کی پیروی میں فنجان میز سے اٹھالیا

"یہ خالص عربی قہوہ ہے۔ آپ پسند فرمائیں تو شکر کی آمیزش کرلیں۔ عرب تو چینی کے بغیر پیتے ہیں۔"

"جان دار ہے صاحب!" بٹھل نے ایک گھونٹ لے کے کہا "بڑی کاٹ ہے۔"

"یہاں ریاست میں بہت سے عربی رسم ورواج مروج ہیں۔ ریاست سے عربوں کا تعلق بھی گہرا ہے۔ یہ قہوہ انہی کی سوغات ہے۔ آپ کو کبھی چاؤشوں کی بستی میسرم جانے کا بھی اتفاق ہوا؟"

"وہ کدھری ہے؟" بٹھل نے تجسس سے پوچھا۔

"ہاں' آپ کو موقع بھی کہاں ملا ہوگا۔ یہ تو جناب دیکھنے کی چیز ہے" نواب نے چہکتی آواز میں کہا "صورت یہ ہے کہ حضور نظام کے چوب داروں' عصابرداروں میں عرب باشندے بھی کثیر تعداد میں شامل ہیں۔ ان لوگوں کی ایک بستی' کسی جزیرے کے مانند یہاں آباد ہے۔ عمارتی اعتبار سے تو کوئی خاص نہیں لیکن وہاں جاکے بالکل عربستان کا گمان ہوتا ہے۔ زبان' بودوباش اور رسم ورواج سب عربی۔ سرزمین عرب کا خطہ ہو جیسے۔"

"ضرور دیکھیں گے صاحب!" بٹھل نے آنکھیں پھیلا کے کہا۔

"یہاں سے دور زیادہ نہیں ہے' یہی کوئی پانچ چھ میل کے فاصلے پر ہوگی۔ وہاں جاکے ہریس ضرور کھایئے گا۔ ہریس تو شہر میں بھی ملتا ہے' ادھر شاہ گنج کے قریب مسجد چوک کے پاس لیکن چاؤشوں کی بستی میں اس کا لطف ہی کچھ اور ہے۔"

"یہ کیا چیز ہے نواب صاحب؟" بٹھل نے سادگی سے پوچھا۔

"کیا عرض کریں" نواب دیدے گھماتے ہوئے بولا "غذائی لحاظ سے' کہا جاتا ہے کہ بہت مقوی چیز ہے۔ اب ہم کس طرح تشریح کریں۔ یوں سمجھئے کہ آٹے' دودھ اور گوشت کی یخنی کا آمیزہ۔ آسانی کے لیے اسے عربی حلیم کہہ لیجیے مگر اپنے ہاں کے حلیم سے بہت مختلف ہے۔ یہ عموماً بے نمک اور بے مرچ تیار کیا جاتا ہے۔ بعد میں چاہے نمک مرچ سے کھایئے یا چینی سے۔ نہایت لذیذ قسم کا کھانا ہے۔ عربوں

مرغوب غذا ہے۔ ریاست کے لوگ بھی کم شوق سے نہیں ۔۔تے۔ دیکھیے' وقت ملا تو ہم آپ کے لیے اہتمام کرتے ۔۔ کسی چاؤش سے رابطہ کرتے ہیں۔ عرب کے ہاتھ سے ۔۔ ہوئے ہریس کی لذت ہی کچھ اور ہوتی ہے۔"

بٹھل کو چاؤشوں اور ان کی بستی کا علم ضرور ہوگا۔ مجھے ۔۔ آتا تھا' ایک مرتبہ ہم نے شاہ گنج میں مسجد چوک کے پاس ۔۔ل میں ہریس بھی کھایا تھا اور نواب جہاں تاب کے ہاں ۔۔ام کے دوران میں بھی یہ تجربہ ہوچکا تھا۔ بٹھل کا لاعلمی کا ۔۔ہار نواب کا شوق کلام اور فزوں کررہا تھا۔ یہ تو طرح دینے ۔۔ے مترادف تھا۔ پہلے اجنبیت کا کوئی حجاب تھا تو اب نواب ۔۔ے ہاں یہ بھی نہیں رہا تھا۔ ہمارے کسی استفسار اور جستجو کے ۔۔یر اس نے ریاست کے تفریحی اور تاریخی مقامات و آثار' ۔۔ب شاہی مزارات' عثمان ساگر' گول کنڈے کا قلعہ' فلک ۔۔ا' نواب سالار جنگ کے نوادر' گلبرگہ میں حضرت گیسو دراز ۔۔ا مزار' ناندیڑ میں گرد گوبند سنگھ کا گوردوارہ' اورنگ آباد میں ۔۔ورنگ زیب کی قبر' اس کی بیٹی کا تعمیر کیا ہوا سرخ پتھروں کا ۔۔اج محل ثانی' اجنتا' ایلورا کے عجائب' نواب نے جانے کہاں ۔۔کہاں کا ایران توران کا تذکرہ شروع کردیا۔ بٹھل کو اب ۔۔وئی جلدی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ وہ مودبانہ دل جمعی سے ۔۔نتا رہا۔ قطع کلامی میں یوں بھی مجلسی ادب مانع تھا۔ میری ۔۔رح بٹھل کو بھی شاید یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کوئی بات ناگوار ۔۔اطر نہ ہوجائے۔ نواب ہی پر سب کچھ منحصر تھا۔ ہمارے ۔۔زنداں کی کنجی تو اسی کی پاس تھی۔ وہ کسی بھی لمحے مولوی ۔۔احب کے بارے میں کوئی خبر سنا سکتا ہے' اسی کا کیا جاتا تھا' ۔۔بھی اس نے مولوی صاحب کی شہر میں موجودی کا اقرار کیا ۔۔تھا' کچھ دیر میں وہ انکار بھی کرسکتا تھا۔ رہ رہ کے یہ خیال دل کو ۔۔لرزاتا' دہلاتا تھا کہ نواب کی یہ طول کلامی' یہ شائستگی اور ۔۔مروت کسی سبب سے نہ ہوں' کسی اتمام حجت کے لیے؟ مبادا ۔۔کوئی ایسی ویسی خبر سنانے کے لیے وہ ہمیں آمادہ کرنا چاہتا ہو مگر ۔۔پھر وہ اس طرح کی باتیں نہ کرتا' اور ایسی ویسی خبر ہو بھی کیا ۔۔سکتی ہے۔ میرا دماغ جانے کہاں کہاں بھٹک رہا تھا۔ کبھی جی ۔۔کرتا' یہاں سے اٹھ کے چلا جاؤں۔ جو کچھ ہوگا' بٹھل مجھے ۔۔باہر آکے بتادے گا۔ بٹھل کا رویہ میری فہم سے بالا تھا۔ وہ ۔۔مجھے اور نیم جاں کیے ہوئے تھا اور میں خود کو یہی باور کرانے ۔۔کی کوشش کرتا تھا کہ بٹھل کو تو مجھ سے زیادہ گراں باری ۔۔ہوگی۔ اسے اتنا وقت کرنے کی عادت نہیں ہے۔

بٹھل کو کسی موقع کا انتظار تھا۔ نواب نے ریاست کے احوال و آثار کا بیان کرتے ہوئے جیسے ہی وقفہ کیا اور تازہ دم ہونے کے لیے سامنے میز پر رکھے ہوئے قہوے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو بٹھل نے ہنکاری بھری اور دیواری گھڑی دیکھ کے حیرت ظاہر کی "رات بڑھ رہی ہے نواب صاحب! ہم کو اب اجازت دو۔"

نواب نے فنجان میں قہوہ انڈیلتے ہوئے ہاتھ روک لیا اور دستی گھڑی دیکھتے ہوئے بولا "نہیں' ایسی رات بھی کہاں ہوئی ہے۔ ہمارا خیال ہے' قہوے کا ایک دور ہوجائے۔"

"ابھی ایک دم گنجائش نہیں صاحب!"

نواب نے از خود عذر پیش کیا "یقیناً آپ کو سفر کی تکان بھی ہوگی۔ ہم تو ایسے محو ہوئے کہ اس طرف توجہ ہی نہ دے سکے۔"

بٹھل نے بیڑی کا بنڈل واسکٹ میں ڈالا اور اونچی آواز میں بولا "آپ سے بہت کچھ جانا ہم نے۔"

"کیا جناب!" نواب نے لجاجت سے کہا "ہماری تو گزارش ہے کہ رات یہیں قیام فرمائیں۔"

"ابھی جانا ہے اپنے کو" بٹھل کسمساتے ہوئے بولا۔

"وہاں کوئی انتظار تو نہیں کررہا تا آپ کا؟"

"کون کرے گا صاحب!"

"پھر کیا مضائقہ ہے۔ اطمینان رکھیے' یہاں آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی۔"

"جانتے ہیں صاحب! پر' پھر بھی۔۔"

"جیسا آپ مناسب خیال فرمائیں" نواب کی پتلیاں چڑھ گئیں۔ لگتا تھا' بٹھل کا انکار اسے کسی قدر ناگوار گزرا ہے۔

بٹھل صوفے سے اٹھ گیا۔ نواب بھی کھڑا ہوگیا۔ گویا وہ بادل ناخواستہ سہی ہمیں رخصت کرنے کے لیے آمادہ ہوگیا تھا' کچھ کہے سنے بغیر جیسے ہم اس سے ملاقات کرنے اور اس کے ہاں دعوت کھانے کے لیے آئے تھے اور بس۔۔ مجھے خفقان سا ہونے لگا۔ میں نے وحشت زدہ نظروں سے بٹھل کی طرف دیکھا۔ بٹھل دروازے کی طرف بڑھنے لگا تھا۔ ہمارے ساتھ چلتے ہوئے نواب نے دفعتاً ٹھہر کے کہا "جناب' کس طرح جائیں گے' چار کمان تو خاصی دور ہے؟"

"سواری مل جائے گی صاحب!"

"موٹر حاضر ہے' اگر آپ۔۔" نواب نے بٹھل کو انکار کی مہلت نہیں دی' تالی بجا کے ملازم کو طلب کیا۔

"چلے جائیں گے صاحب' آرام سے" بٹھل کہتا ہی رہ گیا۔ ملازم لمحوں میں حاضر ہوگیا۔ نواب نے بٹھل کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے ڈرائیور کی طلبی کا حکم صادر کیا اور

باہر نکل گیا۔ ہم دونوں نے اس کے پیچھے دروازہ عبور کیا۔
کمرے کے باہر مختصر سا باغیچہ تھا۔ چاندنی کھلی ہوئی تھی۔ اور بھن بھناتا سا سناٹا ہر سو چھایا ہوا تھا۔ "باہر کا موسم تو نہایت جاں فزا ہے" نواب نے نیم خنک ہوا سینے میں بھرتے ہوئے کہا۔

"موٹر کی تکلیف مت کرو نواب صاحب!" بٹھل دھیمی آواز میں بولا "تھوڑا پیدل چلنے کو مل جائے گا۔"

ادھر باہر جمرو اور زورا ہمارے انتظار میں بے چین ہوں گے۔ انہیں نواب ثروت یار کے مکان کے اردگرد ہی منڈلاتے رہنا چاہیے۔ ایک ہی علاقے میں رات کے وقت دو اجنبیوں کا ادھر سے ادھر گھومتے رہنا نظروں میں آسکتا ہے۔ میں نے بھی نواب سے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ وہ الٹا شرمندگی کا اظہار کرنے لگا کہ اسے پہلے ہی ہمیں موٹر کی پیش کش کرنا چاہیے تھی۔ چند قدم سبزے کا فاصلہ طے کرکے ہم پرانی طرز کے کاریڈور میں آگئے۔ کالے رنگ کی چمکتی ہوئی موٹر وہیں کھڑی تھی۔ دوسری جانب سے ڈرائیور ٹوپی اوڑھے' سفید کوٹ کے بٹن بند کرتا ہوا' موٹر کے پاس پہنچ گیا۔ ہم نے کچھ نہیں سنا' نواب نے آگے جاکے سرگوشی کے انداز میں اسے کچھ ہدایت کی۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اب نواب کو زبان کھولنی چاہیے تھی۔ یا بٹھل ہی کو اسے ٹوکنا چاہیے تھا۔ ہم موٹر میں بیٹھ گئے' ہماری طرف کا دروازہ بند کرکے ڈرائیور نے بھی اپنی نشست سنبھالی اور چابی گھمادی۔ انجن کا شور گونجنے لگا تو نواب نے اسے روک دیا۔

"کیسی عجیب بات ہے۔ ہم اپنے معزز مہمان سے آئندہ کے لیے پوچھنا ہی بھول گئے" نواب پشیمانی سے بولا "اب ملاقات کب ہورہی ہے؟"

"سوچا تھا' آپ کو بولیں پھر۔۔۔" بٹھل نے شاید ڈرائیور کی وجہ سے احتیاط کی اور نواب سے کہا کہ وہ اس کے حکم کا منتظر ہے۔

"حکم کیجئے جناب!" نواب نے متانت سے کہا "ہمارا خیال ہے' کل صبح نو دس بجے کیسا رہے گا؟ آپ کی کوئی اور مصروفیت ہو تو۔۔۔"

"کیا بولتے ہو صاحب!" بٹھل نے تنک کے کہا۔

"آپ فرمائیں تو ساڑھے آٹھ بجے موٹر بھیج دیں۔"

"آجائیں گے خود صاحب!"

"موٹر کس لیے ہے۔ یہ وقت پر آپ کو لے لے گی۔ ناشتا ہمارے ساتھ ہی کیجئے گا۔"

"آپ بولتے ہو تو ٹھیک ہے۔ ناشتے کی ہم کو ایسی عادت نہیں ہے۔"

"یہاں دکن میں تو صبح کے وقت باقاعدہ کھانا کھایا جاتا ہے" نواب نے ہنس کر کہا "یوں کہیے' دن میں تین وقت کھانا۔"

بٹھل نے سر ہلا دیا۔

"بہتر ہے' پھر صبح نو بجے انتظار رہے گا۔ منزل دور ہے لیکن اتنی بھی نہیں۔ دو ڈھائی گھنٹے میں۔۔۔"

"آپ تکلیف مت کرو نواب صاحب! ہوسکے تو ہم کو دو' ہم خود ان کے پاس پہنچ جائیں گے۔"

"نہیں جناب!" نواب مضطرب سا ہوگیا "یہ کیسے ممکن ہے۔ قبلہ مولوی صاحب کیا فرمائیں گے۔"

"آپ نے ان کو ہمارا بول دیا ہے؟"

نواب نے ایک لحظے توقف کیا "سچ پوچھیے تو اس بار ہم نے پردہ ہی رکھا۔ بابر میاں نے یہی کچھ ہمیں باور کرایا تھا۔ کیوں بابر میاں؟"

"جی' جی ہاں" میں نے ہکلاتی زبان میں تائید کی۔

"ایسی صورت میں اندازہ کیجئے' ہمارا آپ کے ساتھ ہونا کس قدر ضروری ہے" نواب نے زور دے کر کہا۔

بٹھل کو کہنا چاہیے تھا کہ ہاں ایسی صورت میں نواب کا ہمارے ساتھ نہ ہونا زیادہ مناسب رہے گا مگر وہ چپ رہا۔

"آپ کا وہاں پہنچنا بھی مشکل ہے" نواب نے خود ہی اضافہ کیا "اور یوں بھی ہم ایک زمانے سے بچھڑے ہوؤں کے ملاپ کے دل افروز منظر سے کیوں محروم رہیں۔"

نواب کے خدا حافظ اور شب بخیر کہنے پر ڈرائیور نے موٹر چلادی۔ صدر دروازہ کب کا کھلا ہوا تھا۔ دوسرے ہی لمحے موٹر سڑک پر آگئی۔ کوئی فرلانگ بھر بعد بٹھل نے ڈرائیور کو موٹر آہستہ رکھنے کی تاکید کی مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ نکل سکا۔ دروازے سے نکلتے ہی ہماری نظر زورا اور جمرو کے لیے بھٹکنے لگی۔ آمنے سامنے' دور و نزدیک وہ ہمیں کہیں دکھائی نہیں دیے۔ بٹھل نے اس ناگہانی سے نمٹنے کے لیے جانے کیا طے کیا تھا۔ نہ ہم آس پاس کی گلیوں میں موٹر گھما سکتے تھے۔ نہ جمرو اور زورا کو ساتھ بٹھا سکتے تھے۔ البتہ کہیں قریب مل جانے پر انہیں اشارہ ضرور کرسکتے تھے۔ چار کمان تک جانے اور دوبارہ اس علاقے میں آکے انہیں تلاش کرنے میں بہت دیر ہوسکتی تھی۔ جب تک ہم نواب کے مکان سے نکلتے ہوئے دکھائی نہیں دیں گے' ظاہر ہے وہ اردگرد' انہی گلیوں میں منڈلاتے رہیں گے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی وحشت بڑھتی رہے گی۔ ہر وقت نواب کا مکان نظروں میں رکھنا ان کے لیے ممکن بھی نہ تھا۔ اس سے تو اچھا تھا کہ ہم انہیں ہوٹل ہی میں چھوڑ دیتے۔ آخر انہیں ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی۔ مجھے کچھ نہیں معلوم تھا کہ بٹھل نے صورت دیگر کے لیے کیا ہدایت کی ہے۔ کتنی دیر تک انہیں نواب کے دروازے سے ہمارے برآمد ہونے کا انتظار کرنا تھا۔

وہ دونوں گزشتہ مرتبہ حیدر آباد میں ہمارے ساتھ تھے۔ اڈے کے آدمی انہیں خوب پہچانتے ہیں۔ کسی وقت بھی وہ ان کی نگاہوں کی زد پر آسکتے ہیں۔ اباجان کے ہیروں کی جستجو میں حواس کھودینے والے نوابوں کے نمک خواروں کی نظر بھی ان پر پڑ سکتی ہے۔ حیدر آباد سے واپسی کے سفر میں ہمارے تعاقب میں آنے والے ان کے چار زر خریدوں میں سے دو کو ہم نے چلتی ریل گاڑی سے نیچے پھینک دیا تھا۔ باقی دو کو پیرو کے اڈے کے زنداں میں بے حال کرکے اڈے کے آدمی بمبئی کے کسی گھورے پر پھینک آئے تھے۔ ممکن ہے' وہ چاروں صحیح سلامت اپنے آقاؤں کے پاس پہنچ گئے ہوں۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ اس ہزیمت کے بعد طالع آزما نوابوں نے امید چھوڑ دی ہے یا ابھی تک سینوں میں پھانس چھپائے بیٹھے ہیں۔ حیدر آباد میں قیام کے دوران میں اباجان نے عالی شان حویلی خریدی تھی اور خانم ابھی تک نواب جہاں تاب کے ہاں موجود تھی۔ اسی آس نے انہیں آسودہ رکھا ہوگا کہ حویلی کے لیے نہیں تو خانم کی خاطر ایک نہ ایک دن ہمیں حیدر آباد واپس آنا ہے۔ ان کی حرص و ہوس کی آگ ٹھنڈی ہونے کے لیے ایک موسم کی بارش ناکافی ہے۔ ابھی ایسا وقت نہیں گزرا تھا اور اگر پے در پے مایوسیوں کے بعد انہوں نے ہم پر خاک بھی ڈال دی ہے تو دوبارہ حیدر آباد میں ہماری موجودگی کی اطلاع انہیں پھر سے بے کل کرسکتی ہے۔ بٹھل نے انہی خدشوں کی وجہ سے زورا اور جمرو کو ساتھ رکھا ہوگا۔ ایک سے دو' دو سے چار بھلے ہوتے ہیں۔

موٹر نام پلی کی بڑی سڑک پر آگئی۔ واقعی رات اتنی گہری نہیں ہوئی تھی۔ سڑکوں پر اچھی خاصی چہل پہل تھی۔ بازار بند ہوچکے تھے لیکن چائے خانے اور پان کی دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ نام پلی اسٹیشن کے ہوٹلوں کی طرف ویسے بھی رونق رہتی ہے۔ اس طرف دن کا سماں تھا۔ سڑکوں پر سواریاں کم ہونے کی وجہ سے موٹر کو کوئی رکاوٹ پیش نہیں آرہی تھی۔ نام پلی سے گزر کے ہم عابد شاپ روڈ پر آگئے۔ یہیں ہمارا ہوٹل تھا۔ مجھے شبہ ہوا تھا کہ ڈرائیور سے کوئی بہانہ کرکے شاید بٹھل یہیں اتر جائے لیکن وہ خاموش بیٹھا رہا۔ ڈرائیور کی موجودگی میں ہمیں ایک دوسرے سے بات کرنے میں احتیاط ہی برتنی چاہیے تھی۔ عابد شاپ سے پتھر گٹی کا پل عبور کرتے ہوئے ہم جلد ہی چار کمان پہنچ گئے۔ بٹھل نے عثمانیہ بازار کے سامنے سڑک کے بیچوں بیچ والی مسجد کے قریب موٹر رکوادی "ابھی آپ کو گھر تک چھوڑتا ہوں صاحب!" ڈرائیور مستعدی سے بولا۔

"نہیں رے' ادھری کدھر جائے گا" بٹھل نے منہ بنا کے کہا "اب زیادہ دور نہیں ہے۔"

بٹھل نے جیب میں ہاتھ ڈال کے دس روپے کا نوٹ اس کے حوالے کرنا چاہا اور کہا "تھوڑا پیدل چل کے ہی نیند آئے گی۔"

نوٹ دیکھ کے ڈرائیور زیر و زبر ہوا۔ اس کا جسم لہرا گیا۔ کتراتے ہوئے انداز میں اس نے انکار کیا۔ بٹھل نے نوٹ اس کی جیب میں اڑس دیا۔ ڈرائیور نے بے قراری سے جھک کر سلام کیا اور کہنے لگا "آپ دکن میں پہلی بار کو آئے سرکار؟"

"نہیں" بٹھل کے اختصار سے ڈرائیور کا حوصلہ پست ہوا۔ وہ بھنچی ہوئی آواز میں بولا "خادم صبح کس وقت لینے کو آئے؟"

"جس ٹائم کو نواب صاحب نے بولا ہے۔"

ڈرائیور نے پہلے سر جھکایا پھر ہچکچاتے ہوئے جگہ کے بارے میں پوچھا۔

"ادھری' اسی جگہ پر۔"

"سرکار' پتا بتائیں تو خادم گھر تک آجائے گا۔ اپن حیدر آباد کا کوچہ کوچہ دیکھا ہے۔"

"ادھری مل جائیں گے رے" بٹھل نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

ڈرائیور نے کہا کہ وہ صبح ساڑھے آٹھ بجے سے پانچ دس منٹ پہلے پہنچ جائے گا تاکہ ہمیں اس کے انتظار کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ اس نے کسی اور خدمت کے بارے میں پوچھا۔ بٹھل نے اس کے شانے پر تھپکی دی تو وہ سلام کرکے اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ ہم چار مینار کی سمت چل پڑے۔ دیر تک موٹر چلنے کی آہٹ نہیں ہوئی۔ میں نے گھوم کے دیکھا تو موٹر سے باہر کھڑے ہوئے ڈرائیور سے نظریں چار ہوئیں۔ میں نے بٹھل کو ٹھوکا دیا کہ موٹر میں شاید کوئی خرابی ہوگئی ہے۔ ہمیں جاکے دیکھنا چاہیے۔ بٹھل نے مڑ کے دیکھے بغیر مجھے آگے چلتے رہنے کا اشارہ کیا۔ سامنے کچھ فاصلے پر پان کی

دکان تھی۔ ہم محراب دار بازار کے کنارے کنارے چلتے ہوئے دکان پر آگئے۔ یہاں سے موٹر صاف نظر آرہی تھی۔ ڈرائیور کے ہاتھ میں ٹارچ تھی اور وہ بونٹ کھولے کل پرزوں سے الجھا ہوا تھا۔ باربار بے بسی' بے زاری سے وہ اُدھراُدھر دیکھتا تھا۔ میرا ہاتھ غیرارادی طور پر اس کی طرف اٹھ گیا۔ میرا مقصد تھا کہ اسے کسی مدد کی ضرورت ہو تو ہم اس کے پاس آئیں؟ اس نے بھی دیکھ لیا اور ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ فکرو تشویش کی کوئی بات نہیں' وہ خود ہی نمٹ لے گا۔

پان کی دکان پر ہمیں کئی منٹ لگ گئے۔ کچھ تو پان والے کی وجہ سے کہ وہ حرفوں کا بنا ہوا تھا۔ کچھ بٹھل نے غیر ضروری طور پر اس کی لاف وگزاف میں دلچسپی کا اظہار کیا۔ بٹھل نے اس سے ملیٹھی کے پان کی فرمائش کی۔ بٹھل پان والے کے پاس نہیں تھی حالانکہ اس کی سجی ہوئی دکان میں آویزاں مختلف تختیوں پر بڑے بڑے دعوے کیے گئے تھے اور پان کی شان میں شعر تک لکھے ہوئے تھے۔ وہ حیدر آباد میں ہماری نوواردی پہچان گیا اور اس نے بٹھل سے کہا کہ اسے ایک موقع دیا جائے۔ وہ اپنی پسند کی گلوری بنا کے بٹھل کی خدمت میں پیش کرے۔ بٹھل کی آمادگی پر اس نے نہایت اہتمام سے طرح طرح کے مسالوں سے پان کو مزین ومرصع کرنا شروع کیا۔ بٹھل کو کوئی جلدی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ نہ زورا اور جمرو کا کوئی احساس' نہ یہ خیال کہ ایسی دکانوں کے آس پاس اڈے کے آدمیوں کا جماؤ رہتا ہے۔ کوئی بھی کسی طرف سے نکل کے سامنے آکھڑا ہو سکتا ہے۔ اسی اثنا میں میری نظریں تو بیش تر نواب ثروت یار کی موٹر میں اٹکی رہیں۔ ڈرائیور اپنی سی تگ ودو کر رہا تھا۔ اس وقت تو موٹر کو دھکا دینے والے بھی اسے نہیں ملیں گے۔ میں منتظر تھا کہ وہ کسی لمحے مدد کا اشارہ کر سکتا ہے۔ پان والے نے بٹھل کے بعد چاندی کے ورق میں لپٹی ہوئی ایک گلوری میری طرف بھی بڑھادی۔ میرا جی بہت گھبرا رہا تھا لیکن پان والا حجت کرنے لگتا' میں نے جلدی سے گلوری منہ میں رکھ لی۔ پان یقیناً بہت خوش ذائقہ تھا۔ منہ میں رکھتے ہی خوشبو سی گھل گئی۔ بٹھل کی تعریف پر پان والے نے چنبیلی کا ایک بار بھی ہمیں پیش کیا اور ہاتھ جوڑ کے درخواست کی کہ جب تک حیدر آباد میں ہمارا قیام ہے' ہم اس کی دکان پر آنے کی تکلیف کرتے رہیں۔ وہ ہمیں ہر بار ہندوستان کے ایک نئے علاقے کا پان کھلائے گا۔

بٹھل کی نظر بھی کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی نواب ثروت یار کی موٹر اور ڈرائیور پر لگی ہوگی۔ پان کی دکان سے ہٹ وہ چار کمان بازار کی محرابوں والی راہداری میں بڑھ گیا۔ ہم سے او جھل ہو چکی تھی۔ راہداری سے ایک تنگ را عثمانیہ بازار کے احاطے میں نکلتا تھا۔ ہم وہاں سے احا میں داخل ہوئے اور سامنے کے ایک راستے سے کسی گلی آگئے۔ یہ چار کمان اور عثمانیہ بازار کا پچھواڑا تھا۔ زیادہ اندر گلیوں میں نہیں جانا چاہیے تھا تاکہ ہم غا سڑک سے بہت دور نہ ہو جائیں۔ یہی ہوا' بٹھل سڑک قریب قریب رہنے کے بجائے آگے چلتا رہا۔ نیم تار گلیوں میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہم جانے کہاں سے کہاں گئے۔ آخر ایک سن رسیدہ چوکی دار کو روک کر ہمیں چار کا راستہ پوچھنا پڑا۔ پہلے تو اسے ہم پر شک ہوا' وہ بڑبڑا لگا لیکن اس نے وقت گنوایا نہیں تھا۔ کچھ آدمی کی ہو گئی تھی۔ بٹھل کو کسی تندی وترشی کی ضرورت پیش آئی۔ چوکیدار خود ہی ہموار ہو گیا۔ وہ کچھ دور ہمارے چلا اور چار مینار تک جانے والی سیدھی گلی کے سرے پر چھوڑ کے واپس ہو گیا۔

چار مینار چوک پر رات پوری طرح مسلط ہو چکی چاروں مینار ہلکی ہلکی دھند میں لپٹے ہوئے تھے۔ نہ کوئی کھلی ہوئی تھی نہ آس پاس کوئی سواری نظر آرہی تھی۔ دیر سواری کا انتظار کر کے ہم اپنے راستے پر پیدل ہی پڑے۔ نام پلی وہاں سے بہت دور تھا۔ سواری نہ ملے صورت میں پیدل چلتے رہنے کے سوا چارہ ہی نہ تھا۔ طرح فاصلہ تو ہر قدم پر بہرحال کم ہو رہا تھا۔ ایک فرلانگ بعد پھر چار کمان کا بازار پڑتا تھا۔ موٹر اب وہاں تھی۔ ہم مدینہ ہوٹل تک آگئے۔ مدینہ ہوٹل بھی بند تھا۔ لیکن بائیں ہاتھ کی سڑک کے کنارے ذرا اندر کی نسبتاً سنسان جگہ ایک گھوڑا گاڑی دکھائی دی۔ کوچوان کی نشست پر سویا ہوا تھا۔ اور اس کا کہیں جانے کا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ بٹھل نے اسے جگایا تو وہ بوکھلا گیا ناراض ہونے لگا اور اس نے کہیں جانے سے صاف کر دیا۔ اسے قائل کرنے کے لیے بٹھل کے پاس پہلی سکوں کی دوسری چاقو کی تھی۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے۔ آد دو بڑی مجبوریاں ہیں۔ حرص اور خوف۔ بٹھل کی جیب دونوں چیزیں تھیں۔ دوسری چیز کی ضرورت پیش نہیں روپیہ شاید چاقو سے زیاد کاٹ رکھتا ہے یا یہ وقت کی تھی۔ بٹھل کے ہاتھ میں دبے ہوئے نوٹ دیکھ کے کوچوا یقین نہیں آیا۔ قریب ہی کھونٹے سے بندھے ہوئے گھو

نے بھی جیسے نوٹوں کی بو سونگھ لی۔ کہتے ہیں جانوروں کے ساتھ رہتے رہتے آدمی پر کچھ نہ کچھ اثر پڑتا ہے۔ جانور بھی تو انسان کے ساتھ رہ کے کچھ متاثر ہوتا ہوگا۔ دونوں لمحوں میں ہشاش بشاش ہو گئے۔ بٹھل نے کوچوان سے معظم جاہی مارکیٹ چلنے کے لیے کہا تھا۔ وہاں سے نام پلی کا فاصلہ کم نہیں تھا۔ گویا اس نے جمرو اور زورا کی تلاش میں' نواب ثروت یار کے علاقے میں جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا یا پھر اس کے ذہن میں کوئی اور بات تھی۔ میں نے چاہا' اس سے پوچھوں مگر میں کیا کیا پوچھتا' اس امید میں بھی میں چپ رہا کہ آئندہ کسی لمحے وہ خود مجھ سے کچھ کہے گا۔ بٹھل خود بھی بہت منتشر معلوم ہوتا تھا اس کی خاموشی مجھے اور ہلکان کر رہی تھی ورنہ میری تسلی کے لیے سہی' دو چار لفظ اس کی زبان سے ضرور پھوٹتے۔

گھوڑے کی ٹاپیں خالی سڑک پر دور دور تک گونج رہی تھیں۔ کبھی کوئی موٹر' گھوڑا گاڑی یا گھنٹی بجاتا سائیکل سوار گزر جاتا تو آوازیں گڈمڈ ہو جاتیں۔ معظم جاہی مارکیٹ سے کچھ آگے بٹھل نے گاڑی رکوادی اور جانے کتنے روپے کوچوان کے ہاتھ میں تھمادیے۔ کوچوان نے ایک ہی سانس میں اسے بہت سی دعائیں دیں اور اپنے رویے کی معذرت چاہی۔ ریاستوں میں خطابات کی بڑی ارزانی ہوتی ہے۔ اس نے بٹھل کو سخی' حاتم' بندہ پرور' سرکار جیسے بے شمار خطابات سے نواز دیا۔ وہ گھوڑے سے مخاطب ہو کے کہنے لگا "لے بھئی سالار! آج تو تیرے بھاگ بھی جاگ گیاں' حضور کو سلاماں پیش کر" اس نے چابک کی لکڑی سے گھوڑے کے کولھے پر ٹھوکا دیا۔ گھوڑے نے کئی مرتبہ سر جھکایا اور فرش پر ٹاپیں مار کے بٹھل کو تعظیم پیش کی۔ بٹھل نے گھوڑے کی پیٹھ تھپکی اور جیب سے ایک اور نوٹ نکال کے کوچوان کی نذر کیا۔ ہم آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے ویکاجی ہوٹل میں داخل ہو گئے۔ ہوٹل پوری طرح روشن تھا۔ دن جیسی گہما گہمی نہیں تو رات کی بیابانی بھی نہیں تھی۔ ہوٹل کے کاؤنٹر سے ہمیں اپنے کمرے کی چابی حاصل کرنی تھی۔ مگر بٹھل کاؤنٹر سے گزرتا ہوا آگے چلا گیا۔ میں نے یہ سمجھ کے کہ شاید وہ چابی کی طرف توجہ دینا بھول گیا ہے' اسے ٹوکا مگر وہ چلتا رہا تاایں کہ ہم کمرے کے سامنے پہنچ گئے۔ بٹھل کی پہلی دستک پر دروازہ کھل گیا۔ میری آنکھیں پھیل گئیں۔ جمرو اور زورا اندر موجود تھے۔ ہمیں دیکھ کے دونوں کے چہرے کھل اٹھے "دیر لگادی استاد!" جمرو نے بے چینی سے پوچھا۔

"ہاں رے! کچھ چائے پانی کا بول پہلے۔"

زورا نے پلٹ کے مسہری کے سرہانے نصب گھنٹی کا بٹن دبادیا۔

"سالی خیر تو ہے استاد!" جمرو نے بٹھل کو واسکٹ اتارنے اور صوفے پر بیٹھنے کی فرصت بھی نہیں دی۔

جواب تو بٹھل کی مرضی پر منحصر تھا۔ وہ سامنے رکھی ہوئی کرسی پر ڈھیر ہو گیا اور اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اسی لمحے گھنٹی بجی۔ زورا کے دروازہ کھولنے پر بیرا باہر کھڑا دکھائی دیا۔ زورا نے دبی ہوئی آواز میں بٹھل سے پوچھا کہ چائے کے ساتھ کچھ اور تو نہیں چاہیے؟ بٹھل نے ہاتھ اٹھا کے منع کر دیا۔ بیرے کے چلے جانے پر زورا اور جمرو نے مجھے اشارہ کرتے ہوئے ملحقہ کمرے میں چلے گئے۔ میں بھی یہی چاہتا تھا۔ کمرے میں میرے داخل ہوتے ہی دونوں مجھ سے لپٹ گئے۔ "کیا بات ہے لاڈلے! استاد تو بہت بھاری لگتا ہے۔"

"ہاں!" میں نے بکھری ہوئی آواز میں کہا "کچھ ایسا ہی ہے۔"

وہ بے تابانہ وجہ پوچھنے لگے۔ میں انہیں کیا بتاتا۔

"پہلے یہ بول' کام نکلا کہ نہیں؟"

"کیا بتاؤں" میں نے گہری سانس بھر کے کہا۔

"بتانے کو کچھ نہیں ہے کیا؟"

"سمجھو کہ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

"کیا مطلب!"

"یہی مطلب ہے' اس سے زیادہ کچھ نہیں۔"

"یہ کیا ہوا لاڈلے!" جمرو ناراضی سے بولا۔

میں نے اسے بتایا کہ نواب نے کل صبح نو بجے پھر بلایا ہے۔

"پھر بلایا ہے' مطلب ہے' کچھ بات تو۔۔"

میں نے مختصراً اسے نواب کے ہاں ہونے والی گفتگو بتادی۔ وہ بھی سوچ میں پڑ گیا' پھر کہنے لگا "نواب نے ہامی تو بھر لی ہے نا؟"

"ہاں۔" میں نے شکستہ آواز میں کہا۔

"پھر کیا ہے" وہ مجھے حوصلے اور عزم کا درس دینے لگا اور کہنے لگا کہ اوپر والے پر بھروسا کرنا چاہیے۔ خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سب کچھ میری منشا کے مطابق ہوگا۔ ایک نہ ایک دن خدا ضرور سن لیتا ہے۔ وہ مجھے سمجھا رہا تھا اور خود اس کی تلقین وتاکید اعتماد سے عاری تھی۔

گھنٹی کی آواز پر ہم تینوں پہلے والے کمرے میں آگئے۔ بیرا چائے پیسٹری وغیرہ لے کے آگیا تھا۔ زورا نے سب کے لیے چائے بنائی۔ بٹھل کے استفسار پر کہ وہ دونوں کب ہوٹل آئے' جمرو نے بتایا کہ انہیں گھنٹے بھر سے زیادہ ہورہا ہے۔ نواب ثروت یار کے گھر ہمارے داخل ہونے کے کوئی آدھ پون گھنٹے تک تو انہیں ہماری ایسی فکر نہ تھی۔ کچھ دیر بعد انہوں نے ایک موٹر نواب کے گھر میں جاتی دیکھی۔ موٹر گئے وقت گزر گیا تو انہوں نے قیاس کیا کہ موٹر میں آنے والا شخص نواب ہی ہوگا۔ اسی لیے ہمیں دیر ہوگئی اور کچھ اور بھی دیر لگ سکتی ہے۔ انہیں اطمینان تھا کہ نواب کے گھر سے جلد فارغ ہونے پر ہمارے لیے انہیں ڈھونڈ لینا کچھ مشکل نہ ہوگا۔ وہ پوری احتیاط سے قریب قریب ہی رہے۔ جیسا کہ میرا خیال تھا' وہ ہروقت نواب کی حویلی نظر میں نہیں رکھ سکتے تھے۔ پھر انہوں نے طے کیا کہ ساتھ ساتھ گلیوں میں گھومتے رہنے کے بجائے الگ الگ ہوجائیں۔ اس طرح ایک نواب کے مکان سے دور ہوگیا تو دوسرا قریب آجائے گا۔ مزید وقت گزرنے پر انہیں تشویش ہونے لگی۔ بٹھل نے کسی ممکنہ اندیشے کے سبب انہیں نواب کے مکان کے ارگرد منڈلاتے رہنے کی ہدایت کی تھی اور بٹھل نے جو آخری وقت انہیں دیا تھا' وہ ابھی نہیں بیتا تھا پھر انہیں اس گمان نے آگھیرا کہ کہیں کسی وقت نواب کے مکان سے نکلتے ہوئے ہم ان سے اوجھل نہ ہوگئے ہوں لیکن اگر ایسا ہی ہوا ہے تو ہمیں ان دونوں کی جستجو میں گلیوں کا چکر لگانا چاہیے۔ پھر ان میں سے ایک گلی کے نکڑ پر کھڑا ہوگیا' دوسرا نواب کے مکان کے آس پاس گشت کرتا رہا۔

رات اور سیاہ ہورہی تھی۔ ان کی سمجھ میں ایک تدبیر آئی کہ کیوں نہ ادھر ادھر بھٹکنے کے بجائے وہ بہ راہ راست نواب ثروت یار کے دربان سے رابطہ قائم کریں۔ قریب جاکے انہیں محل وقوع کا بھی کچھ اندازہ ہوجائے گا۔ بٹھل کی ہدایت کے مطابق درمیانی رات' کوئی دو بجے تک نواب کے گھر سے ہمارے برآمد نہ ہونے کی شکل میں انہیں نواب کے مکان کی چاردیواری پھلانگنی ہی تھی۔ ریوالور ان کی بغل سے بندھے ہوئے تھے' چاقو بھی ساتھ تھے۔ جمرو نے دربان کے پاس جانے کا ارادہ کیا۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ دربان ہر کچھ دیر بعد دروازے سے باہر آتا ہے۔ دوسرے ملازمین بھی گاہے گاہے صدر دروازے سے کچھ فاصلے پر چھوٹے بغلی دروازے سے آتے جاتے ہیں۔ اس وقت دربان اندر ہی تھا کہ جمرو نے صدر دروازے پر پہنچ کے ہلکی سی دستک دی۔

اسے دوبارہ دستک کی زحمت نہیں کرنا پڑی۔ دربان فوراً باہر آگیا اور جمرو کو دیکھ کے حیران ہوا۔ جمرو نے کسی تامل کے بغیر عاجزانہ لہجے میں اس سے کہا کہ وہ دلی سے آیا ہے' نواب کے پاس ایک فریاد لے کے۔ وہ سخت مشکل میں ہے۔ دادرسی کی امید میں اس نے دلی سے یہاں تک کا طویل سفر کیا ہے۔ بڑے نواب صاحب' نواب ثروت کے والد کے پاس اس کا باپ آیا کرتا تھا اور ہمیشہ بڑے نواب صاحب اس کی مدد کرتے تھے۔ ظاہر ہے' دربان محض دربان تھا۔ یہ سن کے کہ جمرو کی حیثیت ایک سائل کی ہے' اس نے اس سے سیدھے منہ بات نہیں کی اور کہا' نواب صاحب سے اس وقت ملنا ممکن نہیں' کسی اور وقت آنا۔ جمرو کی مسلسل آہ وبکا سے وہ کسی قدر پسیج گیا اور اس کے اطوار میں نرمی آگئی۔ اس نے جمرو کو سمجھایا کہ نواب کے پاس باہر سے کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں۔ وہ لوگ کھانے سے ابھی فارغ ہوئے ہیں۔ اس وقت تو ویسے بھی نواب سے ملنا محال ہے۔ بہتر ہے کہ جمرو کل صبح آئے۔ وہ اسے نواب سے ملوانے کی کوشش کرے گا۔ بشرطیکہ نواب کا مزاج بہ خیر ہوا۔ جمرو نے اپنی تسلی کے لیے بظاہر معصومیت سے پوچھا کہ اندر بیٹھے ہوئے مہمان نواب صاحب کے رشتے دار ہیں کیا؟ دربان نے رکھائی سے کہا کہ نہیں' بمبئی سے آئے ہوئے دو مہمان ہیں۔ اس سے زیادہ اسے کچھ نہیں معلوم۔ جمرو نے کہا کہ وہ نواب کے انتظار میں دروازے کے پاس بیٹھ جاتا ہے' مہمانوں کے چلے جانے کے بعد دربان نواب سے اس کی ملاقات کی سبیل نکالے۔ دربان نے اسے جھڑک دیا۔

جمرو کو اب وہاں رکنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ گلی کے نکڑ پر آگیا۔ اتنی دیر میں زورا بھی کوچہ گردی کرتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا۔ دونوں وہیں کھڑے انتظار کرتے رہے۔ کچھ اور وقت بیت جانے پر جمرو کو پھر بے چینی ہونے لگی۔ اس نے دوبارہ نواب صاحب کے دروازے پر جاکے دستک دی۔ اس مرتبہ دربان کو باہر آنے میں وقت لگ گیا۔ اندر عمارت کی روشنیاں بھی کم ہوگئی تھیں۔ دربان نے جمرو کو دوبارہ سامنے دیکھ کے کبیدگی کا اظہار کیا۔ جمرو نے اس سے التجا کی' اگر مہمان چلے گئے ہوں تو دربان اس کے حال پر رحم کرے۔ اندر جاکے نواب کو اس کے بارے میں کچھ بتائے۔ جمرو کی اس حجت پر دربان چراغ پا ہوگیا۔ کہنے لگا "یہ کوئی وقت ہے داد فریاد کا۔ کیا جمرو کا دماغ ٹھکانے نہیں ہے۔ پھر اس نے بتایا کہ دونوں مہمانوں کو ان کی قیام گاہ پہنچانے کے لیے نواب گھر سے نکل چکا ہے۔ جمرو سے نجات حاصل کرنے کے لیے

دربان کو یہی عذر کرنا چاہیے تھا۔ ادھ کھلے دروازے کی آڑ سے جمرو نے خود تصدیق کرلی تھی کہ موٹر اب وہاں نہیں ہے جہاں پہلے کھڑی تھی۔ گلی کے نکڑ پر کھڑے ہوئے زورا اور جمرو نے کچھ دیر پہلے ایک موٹر نواب کی گلی کی طرف سے آتی دیکھی تھی۔ موٹر ادھر آئی' ادھر زن سے گزر گئی اور اندر بیٹھے ہوئے لوگ انہیں نظر نہ آسکے۔ اندھیرے میں یہ ممکن بھی نہیں تھا۔ وہ نواب کی موٹر پہچانتے بھی نہیں تھے اور نکڑ سے نواب کی حویلی کا صدر دروازہ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔

جمرو اور زورا نے فیصلہ کیا کہ وہ ہوٹل چلے جائیں۔ میرا اور بٹھل کا دوبارہ اس علاقے میں آنا مشکل ہوگا۔ اگر ہم ڈیڑھ بجے تک ہوٹل نہ پہنچے تو جمرو اور زورا ہوٹل سے نکل کھڑے ہوں گے۔ انہیں وہاں سے نواب کے گھر پہنچنے میں زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹا لگے گا اور وہ کسی لیت ولعل کے بغیر حویلی کی چاردیواری پھاند جائیں گے۔

بٹھل نے انہیں بتایا کہ اس نے گلی کے نکڑ پر ان دونوں کو کھڑے ہوئے دیکھ لیا تھا اور اشارہ بھی کیا تھا تاہم اسے شبہ تھا کہ یہ اشارہ ان تک منتقل ہوا یا نہیں۔ گویا وہ ہمیں ہوٹل میں نہ ملتے تو نواب ثروت کے مکان تک ہمارا جانا لازم تھا۔ دو بجنے میں ابھی آدھ گھنٹے سے کم وقت رہ گیا تھا۔ چار کمان کے پاس گھوڑا گاڑی دستیاب نہ ہوتی اور ہم دیر سے ہوٹل پہنچتے تو جمرو اور زورا گھڑی دیکھ کے ہوٹل سے نکل جاتے اور ہم اگر دو بجے سے پہلے نواب کے علاقے میں ان تک نہ پہنچ پاتے تو وہ حویلی کی فصیل پھلانگ چکے ہوتے۔ پھر جانے کیا ہوتا! وقت کی کچھ گنجائش تھی ورنہ بٹھل چار کمان سے سیدھا نواب کی حویلی ہی کا رخ کرتا۔

اتنی رات کو چائے کا کوئی موقع نہیں تھا۔ کسی کو بھی خواہش نہ ہوگی' بٹھل کو بھی نہیں مگر کبھی کبھی یہ غیر اختیاری شغل بھی' کچھ دیر کے لیے سہی' آدمی کا دھیان بٹا دیتے ہیں۔ جمرو' بٹھل کے پاس رہ گیا۔ میں اور زورا برابر کے کمرے میں چلے آئے۔ زورا مسہری کے سرہانے بیٹھ کے میرے سر میں انگلیاں پھیرنے لگا' مجھے بڑی وحشت ہوئی لیکن میں اسے روک بھی نہیں سکتا تھا۔ میرا سارا جسم پسینے میں شرابور ہورہا تھا۔ نواب ثروت یار کے ہاں بیٹھے ہوئے سینے میں ایسی گھٹن نہیں تھی۔ اب جیسے بہت کچھ آنکھوں کے آئینے میں عیاں ہورہا تھا اور کچھ بھی نمایاں نہیں تھا۔ ایک گمان کے بعد دوسرا گمان۔ جی میں آتا تھا' جاکے بٹھل سے پوچھوں' اب یہ خاموشی اور گراں باری کیوں ہے؟ کچھ توقع سے سوا ہے کیا! وہی بات ہوئی نا۔ بمبئی میں کچھ اتنی دور دراز

اندیشوں کی وجہ سے میں اسے روک رہا تھا۔ وہ تو اسی وقت میرا ماتھا ٹھنکا تھا جب شام کو کمرا بند کر کے جمرو نے اٹیچی سے تمنچے نکالے تھے۔ مجھ اکیلے کا اتنا کچھ نہیں تھا۔ جو کچھ ہوتا' ایک میں ہی ہدف بنتا اور میں کسی نہ کسی طرح بھگت لیتا۔ وہ مجھ اکیلے کا کتنا کچھ بگاڑ سکتے ہیں۔ میرے لیے اب اس کے چھن جانے سے بڑی اور کون سی ضرب ہوگی۔ اور میں نواب کو اس قدر قیل و قال کا موقع ہی کب دیتا۔ میں بھی تمنچے اور چاقو کے بغیر اس کے پاس نہ جاتا۔ کوئی کتنا ہی نواب ہو' ہوتا تو آدمی ہی کا تخم ہے۔ کھلے چاقو اور تمنچے کی ایک جھلک سارا پھر چشم زدن میں پگھلا دیتی ہے۔ مقابل کو چاقو کی دھار اور خالی یا بھرے تمنچے کی تمیز کا بھی ہوش نہیں رہتا۔ نواب کی زبان کی لکنت ایک ہی ہتھیار سے ختم ہو جاتی۔

زورا اونگھنے لگا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ سر سے ہٹا کے اسے آرام کا مشورہ دیا۔ بستر پر جاتے ہی زورا کے ہلکے ہلکے خراٹے کمرے میں بھن بھنانے لگے۔ میں نے بھی آنکھیں بند کرنے کی کوشش کی لیکن کبھی کبھی بند آنکھوں سے زیادہ نظر آنے لگتا ہے' آڑی ترچھی شکلیں۔ اپنے آپ پر آدمی کا اختیار سب سے کم ہوتا ہے۔ آدمی کے دروازے' دریچے اپنے آپ کھلتے بند ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں' آدمی کا تہ خانہ سات تہ خانوں سے زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ آدمی کا تہ خانہ تو ہر وقت باہر کی گرد و غبار' بجلیوں کی زد پر رہتا ہے۔ اس کے لیے روشنی' اندھیرے کا کوئی وقت نہیں۔ کوئی نہ کوئی جھری کھلی رہتی ہے۔ میرا سر دھمک رہا تھا۔ بستر سے اٹھ کے میں نے ایک نظر برابر کے کمرے میں جھانک کے دیکھا' وہاں خاموشی تھی۔ نیلا قمقما ٹمٹما رہا تھا۔ بظاہر تو بٹھل سویا ہوا ہی معلوم ہوتا تھا۔ میں کمرے کی کھڑکی پر چلا آیا اور ذرا سا پردہ کھسکایا۔ باہر ہر جانب سکوت طاری تھا۔ شہر کی روشنیوں پر دھند چھائی ہوئی تھی۔ روشنیاں بھی جیسے سو چکی ہوں۔ معاً ایک خیال میرے دل میں آیا۔ کیوں نہ میں آہستہ سے باہر نکل جاؤں اور سیدھے نواب کے گھر کا رخ کروں۔ جس طرح جمرو اور زورا کو دیوار پھلانگنے کے لیے کہا گیا تھا' اس طرح میں بھی یہ کام کر سکتا ہوں۔ ایک بار کسی طور اندر داخل ہو کے نواب کی خلوت گاہ تک پہنچنا مشکل نہ ہوگا۔ میں اس کے سر پر اچانک جا دھمکوں گا تو اسے ادھر ادھر کی باتوں کا موقع نہیں مل سکے گا۔ پھر نواب کو سچ اگلنا ہوگا۔ ممکن ہے' ہم سے ملنے کے بعد اس نے ارادہ بدلا ہو کہ کیوں نہ ایک مرتبہ پھر وہ میرے بارے میں مولوی صاحب کا عندیہ جان لے۔

حویلی سے ہمارے رخصت ہو جانے کے بعد ہی وہ مولوی صاحب سے رابطہ کر سکتا تھا۔ صبح تک مہلت لینے کی وجہ بھی یہی ہو سکتی ہے۔ رات کو بہت دیر ہو گئی تھی۔ رات ممکن نہ ہوا تو علی الصباح وہ مولوی صاحب کے سامنے میرا ذکر چھیڑ کے دیکھے گا۔ وہ انہیں آمادہ کر سکتا ہے کہ ایک بار آمنا سامنا ہو جانے میں کوئی حرج نہیں۔ میری صورت مولوی صاحب کو گوارا نہیں ہے تو روبہ رو اس بے زاری کا برملا اظہار کیوں نہ کر دیا جائے۔ یہ باب ہی تمام ہو۔ درمیان میں تو نواب موجود ہے۔ مولوی صاحب کو اطمینان رکھنا چاہیے کہ وہ ایک صاحب حیثیت شخص کی پناہ میں ہیں۔ اس کی موجودگی میں وہ کسی تردد کے بغیر حوصلے اور بے باکی سے میرا سامنا کریں اور اپنی عزیز از جان کورا کے لیے جو بہتر سمجھتے ہیں اس پر قائم رہیں۔ کچھ ایسی بات بھی ہو سکتی ہے۔ پھر تو میرے لیے نواب کے گھر جلد از جلد پہنچنا لازم ہے۔ ہو سکتا ہے' وہی بات ہو' نواب ہم سے چھپا رہا ہو' مولوی صاحب وہیں موجود ہوں۔ اتنے بڑے مکان کے کسی بھی گوشے میں انہیں ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ اس طرح تو ان کا قیام حویلی کے ملازمین کے علم میں بھی ہوگا۔ میں براہ راست مولوی صاحب تک بھی پہنچ سکتا ہوں۔ چاقو کی ایک لکیر سے کسی بھی ملازم کا سارا نمک باہر آ جاتا ہے۔ میرا دماغ گھوم رہا تھا۔ سارا وجود جیسے دھڑک رہا ہو۔ کوئی بعید نہیں کہ صبح مولوی صاحب سے گفتگو کے بعد نواب اپنے رویے اور فیصلے پر نظر ثانی کرے۔ صبح وہ یک سر ایک مختلف شخص بھی ہو سکتا ہے۔ سب کچھ اس کے اختیار میں ہے۔ وہ ہم سے کوئی عذر' کوئی بھی بہانہ کر سکتا ہے۔ صبح ابھی دور ہے۔ صبح تک جانے کیا ہو جائے۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ تین بج رہے تھے۔ ایسے وقت میں سواری مل جانا آسان نہیں لیکن کوشش تو ضرور کرنی چاہئے۔ مجھے معلوم تھا' ہوٹل میں کاؤنٹر والے بھی اپنے ہاں مقیم لوگوں کے لیے سواری کا بندوبست کر دیتے ہیں۔ باہر جا کے بہرحال کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔ میں نے جیب ٹٹولی۔ جولین نے بمبئی سے روانگی کے وقت میری جیب میں کچھ روپے ڈالے تھے' وہ میں نے نکال کے دیکھے۔ گننے کا وقت نہیں تھا۔ خاصی بڑی رقم معلوم ہوتی تھی۔ جوتے پہن کے پنجوں کے بل میں نے دروازہ عبور کیا مگر مجھے واپس ہونا پڑا۔ تمنچا تو تکیے کے نیچے رکھا تھا۔ اسے پہلے کی طرح بائیں جانب بغل کے نیچے پیٹیوں سے کس کے میں کمرے سے نکل آیا۔ چند لمحے دروازے پر ٹھہر کے میں نے بٹھل اور جمرو کی مسہری کا جائزہ لیا۔ جمرو کروٹ بدلے سو رہا تھا۔ بٹھل سیدھا لیٹا ہوا تھا لیکن

ہ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ وہ گہری نیند میں ہے یا غنودگی میں۔ ں کی طرف سے اچھی طرح مطمئن ہونے کے بعد مجھے ٹرے میں چہل قدمی کرنی چاہیے تھی۔ میں نے دبے ؛موں اس سرے سے اس سرے تک کا فاصلہ طے کیا۔ ٹھل کے جسم میں جنبش نہیں ہوئی۔ احتیاطاً ایک بار پھر ھے یہ عمل دہرانا تھا۔ اس کے بعد دروازے کی چٹخنی کھول ے اور ہینڈل گھما کے باہر نکل جانا تھا۔ دوسری مرتبہ بھی ٹرے کی ایک دیوار سے دوسری دیوار کا فاصلہ طے کرتے ہوئے بٹھل کی آنکھ نہیں کھل پائی۔ دروازے کی طرف بڑھنے سے پہلے میں نے چند ثانیوں کا وقفہ کیا۔ پھر ابھی میں نے دروازے کی جانب ایک قدم بھی نہیں بڑھایا تھا کہ بٹھل کی آواز پر میرا دل جیسے بند ہو گیا "کیا ہوا رے؟"

میرے حواس منتشر ہو گئے تھے۔ میں نے اکھڑی ہوئی سانسوں سے کہا "کچھ نہیں' کچھ بھی نہیں۔"

وہ بستر سے نہیں اٹھا' جماہی لیتے ہوئے اس نے کہا "سو جا رے۔"

"تمہیں نیند کیوں نہیں آ رہی؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"آ جائے گی رے' بولتے ہیں' سولی پر بھی آ جاتی ہے۔" وہ خوابیدہ لہجے میں بولا۔

"کسی دیوانے کو آئی ہوگی۔"

"دیوانوں ہی کو نہیں آتی بالم!"

سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا تھا۔ اس کا مزاج کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا تھا۔ میں نے سوچا' اسے کچھ بتاؤں۔ شاید اس نے توجہ نہیں کی کہ نواب کل صبح ہمیں ایک دوسرے آدمی کے طور پر بھی مل سکتا ہے۔ میں اس سے کہتے کہتے رہ گیا۔ آج رات نہیں تو کل کی رات بھی آئے گی۔ حویلی کی فصیل تو کسی رات بھی پار کی جا سکتی ہے اور کسی بھی وقت ہم نواب کا راستہ روک سکتے ہیں۔ بہتر ہے' نواب کی ہدایت کے مطابق کل صبح اسے دیکھ لیا جائے۔ کہیں ہم ہی نے زیادہ نہ سن لیا اور سمجھ لیا ہو۔ جیسا کہ وہ کہہ رہا تھا' مولوی صاحب کو اس نے اپنی زمینوں والے مکان ہی میں ٹھہرایا ہو اور اس کی طرف سے اکراہ و تامل محض اس کشمکش کے سبب ہو کہ مولوی صاحب کو مطلع کیے بغیر وہ مجھے ان کے سامنے لے جا رہا ہے۔ میری آنکھوں کی دھند کچھ کم ہوئی۔ میں نے بٹھل سے بحث نہیں کی۔ وہ تو بس خیر ہو گئی کہ میں دروازے کی جانب نہیں بڑھا تھا ورنہ پھر میں باہر جانے کا کوئی بھی عذر کرتا' سر کی گرانی اور سینے کے حبس کا عذر مگر بٹھل کو بالکل یقین نہ آتا۔ وہ تو بہت برگشتہ ہو جاتا' آزردہ خاطر بھی۔ یہ

تینوں میری وجہ سے اپنا سکھ چین برباد کیے ہوئے ہیں۔ انہیں بھی تو اسی قدر بے کلی ہے۔ میری طرح بٹھل کو بھی نیند نہیں آ رہی ہے۔ میں اپنے کمرے میں چلا آیا اور جوتے اتار کے' تمنچا تکیے کے نیچے رکھ کے بستر پر پڑ رہا۔

وقت کچھ اور گزر گیا۔ ساڑھے تین بجے' پھر چار بج گئے۔ جانے یہ گھڑیاں کس نے وضع کی ہیں۔ ان کی یکساں رفتار ایک سراب ہے۔ یہ کبھی تو بہت تیز چلتی ہیں' کبھی سست۔ صبح و شام اور ہندسہ و عدد کی نسبت سے نہیں' وقت تو کیفیت سے عبارت ہونا چاہیے۔ کس پر کیسا گزرتا ہے۔ کچھ دیر میں اذانیں گونجنے لگیں۔ ذرا آنکھ بند کرتا تو جسم ٹوٹنے اور چٹخنے لگتا..... آدمی کے لیے یہ اور عذاب ہے کہ دوسرے بھی اس کے لیے جہنم سے دوچار ہوں۔ ادھر بٹھل کروٹیں بدل رہا تھا۔ میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ عام حالت میں وہ ایسا ڈھیر نہیں ہوتا۔ اس کی یہ شب بیداری اور بے سکونی کسی بڑی بدگمانی کے سبب ہی ہو سکتی تھی۔ مجھے تو شبہ ہو رہا تھا' اسے نواب کے مرسلہ خط کا یقین ہی نہیں ہے۔ وہ میرے ساتھ آنے کو تو آ گیا ہے کہ نواب کے خط کے متن اور مندرجات کا وہی مفہوم تھا جو کوئی بھی اخذ کرتا لیکن کہیں اور سے نہیں' یہ خط حیدر آباد سے آیا تھا جہاں چند مہینے پہلے ہم نے بہت اندھے دن گزارے تھے۔ ابھی وہ تمام تاگفتنی آنکھوں میں کھبی ہوئی تھی۔ کوئی بھی اسے اتنی آسانی سے فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ خاص کر وہ رات جب نوابوں کے پروردہ مسلح وحشیوں نے اباجان کی نو خرید حویلی میں نقب زنی کی تھی۔ انہوں نے کسی رشتے ناتے کا لحاظ نہیں کیا تھا۔ میرے سامنے' سب کے سامنے اباجان سے سنگدلی کی تھی۔ انہوں نے سبھی کو بے دست و پا کر دیا تھا۔ وہ تو کانتے اپنی جان کی نذر نہ گزارتا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اس رات کے بعد صبح کس کس کو نصیب ہوتی۔

حیدر آباد جانے کے ارادے سے میرے حواس بھی ایک بار متلاطم ہوئے تھے۔ میں نے بھی نواب ثروت کا خط گزشتہ سفر کی بازگشت میں پڑھا تھا مگر خط میں کوئی پہیلی اور کہہ مکرنی نہیں تھی۔ اور تمام احساس گراں اور امکان زیاں کے باوجود مجھے تو خط کے جواب میں نواب کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہی چاہیے تھا۔ اسی لیے میں نے چھپ چھپا کے بمبئی سے نکلنے کا ارادہ کیا تھا۔ جولین کے پرانے پتے پر نواب کا خط آیا تھا۔ سو اس سے تو کچھ چھپانا ممکن نہیں تھا اور اس کا کوئی قصور نہیں تھا کہ اس نے بٹھل پر سب کچھ کیوں افشا کر دیا۔ اسے یہی کرنا چاہیے تھا۔ نوادر اور جواہر کے دیوانے نواب

حشمت اور اس کے ہم سر نوابوں سے نواب ثروت یار کی رسم و راہ کا ہمیں اس وقت تک کا کوئی علم نہیں تھا مگر حیدر آباد سے ہمارے جانے کے بعد دیر تک ہمارے چرچے رہے ہوں گے۔ نواب جہاں تاب کے محل میں میری اور پیرو کی اسیری اور رہائی۔ بٹھل کا بازار کے اڈے پر قبضہ اور اڈے کے شورہ پشت آکا دادا کی رسوائی۔ ابا جان کی طرف سے نواب حشمت جنگ کو ایک بے بہا پتھر کے تحفے کی داد و دہش اور چٹکی بجاتے ہوئے ایک عالی شان حویلی کا سودا۔ سنانے کے لیے بے شمار فسانے ہم اپنے پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ اڈے کے سارے آدمیوں نے نئے مسند نشین بٹھل کے تیور دیکھے تھے۔ ان کے لیے تو وہ سب کچھ افسانوی تھا۔ اڈے کے آدمی امرا رؤسا سے نمک کا کوئی سلسلہ رکھتے ہیں۔ دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ اڈے کے آدمیوں نے بیرون دکن سے آنے والے ہم اجنبیوں کے لیے کیا کیا سرگوشیاں اور حاشیہ آرائیاں نہ کی ہوں گی۔

وہاں نواب جہاں تاب کے ہاں بھی ملازموں کی ایک فوج تعینات تھی۔ وہ چھوٹے نواب عالم تاب کی جاں بہ لبی، خانم کی آمد اور ہماری مہمان داری کے اسرار رموز، سارے عبرت انگیز مناظر کے چشم دید شاہد تھے۔ نواب جہاں تاب کی درون خانہ داستانیں سینہ بہ سینہ کہاں سے کہاں تک منتقل ہوئی ہوں گی پھر وہ ہتھیار بند سرکش جو ابا جان کی حویلی میں ہیروں کے سراغ میں بھیجے گئے تھے اور وہ طالع آزما جنہوں نے بمبئی تک ہمارا تعاقب کرانا چاہا تھا۔ وہ ایک دو ہوتے تو جان کے ضرر میں سینوں پر بوجھ لیے پھرتے۔ ان کی تعداد تو انگلیوں سے تجاوز کر گئی تھی۔

عجب نہیں کہ اڑتے اڑتے نواب ثروت تک ہماری روداد پہنچ گئی ہو۔ انہی دنوں اس کے ہاں میں اور پیرو، بمبئی سے دو اجنبی آئے تھے۔ پہلی بار، دوسری بار۔ دونوں مرتبہ کم و بیش اتنا ہی وقفہ تھا، جتنا ہمارا احوال بیان کرنے والوں نے اسے بتایا ہوگا۔ آدمی کا ذہن بے حد و بے کنار ہے۔ نواب ثروت ویسے بھی نکتہ آفرینی کا حامل اور مہم جوئی کا شائق ہے۔ پس اسے تانا بانا ملانے میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔ اپنی تشفی کے لئے اس نے داستان سراؤں سے ہماری شکل و شباہت اور وضع قطع کی بھی تصدیق کی ہوگی پھر ایک نسبتاً فروتر نواب کے لئے لازم تھا کہ ازروئے تعظیم ریاست کے مکرم و معظم نواب حشمت یا اس جیسے کسی دوسرے ذی حشمت نواب کی خدمت میں جا کے عرض کرے کہ وہ مطلوب لوگوں کے سلسلے میں کس قدر معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

صبح نمودار ہونے لگی تھی۔ برابر کے کمرے سے جمرو دروازے پر آ کے جھانک کے دیکھا۔ میں نے اس سے کو بات نہیں کی۔ وہ شاید یہ سمجھ کے واپس چلا گیا کہ میں نیند ڈوبا ہوا ہوں۔ کچھ دیر بعد بٹھل کے اٹھ جانے کی آواز آ چھ بجے کے قریب خوب روشنی ہو چکی تھی۔ میں بستر ہی پر رہا۔ وقت تو جیسے کوئی بدلہ لے رہا تھا۔ وقت سب سے اذیت پسند ہے۔ خوشی کا موقع ہو تو آناً فاناً گزر جاتا ہے۔ آد کسی عذاب سے دوچار ہو تو چیونٹی کی طرح رینگنے لگتا ہے ہمیں آٹھ بجے ہوٹل سے نکل جانا چاہیے تھا۔ پہلے ڈرائیو کو بتائی ہوئی جگہ پر پہنچنا تھا۔ پورے تین گھنٹے کی بات ہے پھ سب ہی کچھ آئینہ ہو جائے گا۔ اگر نواب ثروت کی نیت میں وہی آلائش ہے جو بٹھل کو بے خواب کیے دے رہی ہے ٹھیک ہے۔ ہمیں تو پھر اپنی خوش گمانی کی ایک رات اسے د چاہیے۔ ہمیں بہرحال وقت پر اس کے پاس پہنچ جانا چاہیے وہاں کوئی مقتل ہی ہمارے لیے کیوں نہ سجا ہو۔

گزشتہ رات ہمیں اپنے گھر میں دیکھنے کے بعد نواب ثروت نے تحمل کیا ہوگا ورنہ کیا مشکل تھا کہ کسی بہانے اند جا کے وہ اپنے ہم شعار مربیوں کو ہماری آمد کی نوید سنانے لیے ہرکارے دوڑا دیتا۔ بٹھل نے اس سے کہا بھی تھا کہ پہلے وہ اندر جا کے لباس تبدیل کر لے۔ وہ نہیں مانا۔ نواب عجلت کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کسی اور کی تحویل میں ہمیں دینے سے پہلے اسے خود بھی مطمئن ہونا چاہیے تھا۔ اسے گمان تھا کہ شاید ہم اس کی خواہش کی تکمیل میں اس کے گھ ٹھہر جائیں۔ ہمارے انکار سے وہ افسردہ ہوا تھا لیکن یہ امر تقویت کا باعث تھا کہ صبح تو پھر ہمیں اس کے پاس آ جانا ہے نو بجے کے بعد ہمیں اپنی موٹر میں بٹھا کے جانے کہاں لے جائے۔ کسی زنداں یا عقوبت خانے کی طرف! نواب نے ہ پہلو سے تسلی کر لی تھی کہ ہم دونوں کے سوا کوئی ہمارے ساتھ نہیں ہے۔ زورا اور جمرو کو بٹھل اب بھی شاید ساتھ نہ لے جائے پھر نواب کا گھر تو انہیں معلوم ہی ہے بشرطیکہ اس سے پہلے کسی کی نظر میں نہ آ جائیں۔

وہی ہوا۔ ٹھیک ساڑھے چھ بجے جمرو نے مجھے اور زورا کو اٹھا دیا۔ زورا نے جمرو کی ہدایت پر جلدی سے منہ ہاتھ دھویا اور کپڑے بدلے۔ ناشتا کیے بغیر وہ کمرے سے نکل گیا۔ تمنچے ساتھ رکھنا، وہ نہیں بھولے تھے۔ بٹھل کمرے میں اکیلا رہ گیا تو میں نے اس سے ان کے بارے میں پوچھا۔

"ان کو پہلے سے جانا تھا۔" وہ ترشی سے بولا۔

"مگر کہاں گئے وہ؟"

"پیچھے ہی رہیں گے رے، جانا کدھر ہے۔" وہ سرسری انداز میں بولا۔

اس کے جواب سے میری سیری نہیں ہوئی تھی لیکن میں چپ رہا۔ مجھے اپنے آپ پر یقین نہیں تھا کہ میں ٹھیک طرح دیکھ اور سن بھی رہا ہوں۔ میرے تو ہاتھ پیر ہی ٹوٹے جا رہے تھے۔

مجھے خاموش بیٹھا دیکھ کر بٹھل نے چائے کے لیے بٹن دبانے اور تیار ہو جانے کا حکم دیا۔ میں نے جسم تر کرنے کی حد تک غسل کیا۔ نئے کپڑے پہن کے میں غسل خانے سے باہر آیا تو بیرا چائے لے کر آ گیا تھا۔ چائے کے ساتھ آملیٹ، مکھن، توس، شہد اور پھل وغیرہ بھی تھے۔ بٹھل نے یقیناً میری وجہ سے باقاعدہ ناشتا کیا۔ مجھے بھی اس کا ساتھ دینے کے لیے کچھ نہ کچھ حلق سے اتارنا پڑا۔ بٹھل کے کہنے پر میں نے تمنچے کی پیٹی بغل کی طرف باندھ لی تھی۔ واسکٹ کے سارے بٹن بند کر کے ہم کمرے سے نکل گئے۔ حیدر آباد میں بٹن بند رکھنا شائستگی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ عموماً لوگ شیروانی اور ترکی ٹوپی پہنتے ہیں۔ میرے پاس ترکی ٹوپی تو نہیں تھی۔ جولین نے نئے گھر میں آ کے جو شیروانی سلوائی تھی، وہ سامان میں رکھی تھی۔ اسے پہنتے ہوئے مجھے عجیب سے لگا، حالانکہ شیروانی کے بغیر حیدر آباد میں آدمی ہی عجیب سا لگتا ہے ادھورا ادھورا سا۔ کمرے کی چابی کاؤنٹر پر چھوڑ کر ہم ہوٹل سے باہر آ گئے۔

ابھی آٹھ نہیں بجے تھے۔ سڑکیں سونی سونی اور تمام دکانیں بند تھیں۔ چند قدم بعد ہمیں گھوڑا گاڑی مل گئی اور بٹھل نے کوچوان کو چار کمان کے بجائے مدینہ ہوٹل چلنے کی تاکید کی۔ موسی ندی پار کرتے ہی ہم مدینہ ہوٹل آ گئے۔ بٹھل وہیں اتر گیا۔ اس نے پان کی دکان سے ماچس اور بیڑیاں خریدیں۔ کچھ دور تک ہم پیدل چلتے رہے پھر جیسے ہی چار کمان بازار شروع ہوا، ہم محرابوں والی راہ داری میں آ گئے۔ دھوپ تیزی سے زمین پر اتر رہی تھی۔ کہیں کہیں دکانیں بھی کھلنے لگی تھیں۔ چائے خانے تو پہلے سے کھلے ہوئے تھے اور ریڈیو پر گانے بج رہے تھے۔

مجھے حیرت ہوئی، ڈرائیور موٹر کے ساتھ اس جگہ مستعد کھڑا تھا جہاں گزشتہ رات ہم اس سے رخصت ہوئے تھے۔ ہمیں دیکھ کے اسے کچھ قرار آیا۔ اس نے جھک کے بٹھل کو سلام کیا اور بتایا کہ پندرہ منٹ سے وہ وہاں موجود ہے۔ اچھا ہوا کہ وہ وقت سے پہلے آ گیا ورنہ ہمیں اس کے انتظار میں ادھر ادھر گھوم کے یا مقررہ جگہ کھڑے رہ کے وقت کاٹنا پڑتا۔

اڈے کے آدمیوں کی نگاہوں سے بچنے کے لیے محفوظ طریقہ یہی تھا کہ ہم زیادہ سے زیادہ موٹر یا کسی دوسری سواری میں سفر کریں اور اندھیرا پھیلنے کے بعد۔ اڈے کے آدمیوں کا ویسے تو کوئی وقت نہیں لیکن دن اور رات میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور پڑتا ہے۔ رات گئے سہی، رات کو انہیں تھوڑی بہت نیند کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ اب دن نکل چکا تھا۔ انہوں نے اپنے اپنے علاقوں میں پھیلنا شروع کر دیا ہوگا۔

ڈرائیور نے جلدی کی۔ منٹوں میں عابد شاپ اور نام پلی کی طرف سے گزرتے ہوئے ہم نواب ثروت کے علاقے میں پہنچ گئے۔ نواب کا گھر قریب آنے پر بٹھل نے میرا ہاتھ دبایا تو میرا دل اور ڈوبنے لگا۔ دربان باہر ہی کھڑا تھا جیسے ہماری آمد کا منتظر ہو۔ اس نے بہ عجلت دروازہ کھول دیا۔ جس نشست گاہ میں رات ہم بیٹھے تھے، اس کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا اور درمیان کی گول میز پر خشک میووں اور کھجوروں کی طشتریاں رکھی تھیں۔ کمرے میں اگر بتی کی گلابی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ کھڑکیوں کے پردے ہٹے ہوئے تھے اور کمرا خوب روشن تھا۔ بٹھل نے طشتری سے نمکین بادام کے چند دانے اٹھا کے ٹونگے۔ اسی لمحے ملازمہ نے اندر آ کے کسی قدرے گھبرائے اور سہمے ہوئے تیور سے آداب کیا اور چائے کا طشت میز پر رکھ دیا پھر ایک ملازم آیا۔ اس نے نواب کی طرف سے معذرت کی اور بتایا کہ کچھ دیر میں نواب آیا ہی چاہتا ہے، مناسب ہوگا اس دوران میں ہم چائے سے شغل کریں۔ ہم نے چائے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ میں بٹھل کے برابر بیٹھ گیا اور میری حیثیت اس مجرم سے کیا مختلف ہوگی جو عدالت میں فیصلہ سننے کا منتظر ہو، سزائے موت کا یا سرخ روئی کا۔ نواب کے آنے سے پہلے ملازمہ نے دوبارہ آ کے خاص دان رکھ دیا اور سگریٹ کیس بھی۔ بٹھل نے اسے اٹھا کے، الٹ پلٹ کے دیکھا۔ ہاتھی دانت کے کام کا نہایت نفیس اور نازک کیس تھا۔ بٹھل نے سگریٹ سونگھ کے دیکھے اور راکھ دان میں بیڑی بجھا کے سگریٹ جلا لیا۔ یہی بہتر تھا کہ کسی نہ کسی طرح خود کو مصروف رکھا جائے۔ میری نظریں تو دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ کسی بھی لمحے نواب اندر سے برآمد ہو سکتا تھا۔ اس کی زبانی کچھ سننے سے پہلے چہرے سے بھی کچھ اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ کوئی آدمی اپنے اندر کا احوال چھپانے میں ہمہ وقت اتنا مشاق تو نہیں ہو سکتا۔ اندر کی کجی کبھی نہ کبھی چہرے پر ضرور نظر آتی ہے۔

دیوار پر جمی ہوئی گھڑی ٹک ٹک کر رہی تھی۔ رات کی نسبت بٹھل اب کچھ ہلکا لگ رہا تھا۔ اس شخص کے مانند،

ایک عرصہ حیرت کے بعد جس کی آنکھیں کسی بھی نیرنگی کے لیے آمادہ ہوجاتی ہیں۔ میں نے اپنے آپ کو یک جا کرنے کی کوشش کی۔ اپنا سب سے بڑا ناصح، معلم اور دوست، آدمی خود ہوتا ہے لیکن ہر آدمی میں ایک ہی دل ایک ہی سینہ ہوتا ہے۔ اس کی مثال بھی چادر کی طرح ہے۔ کوئی چادر بس ایک حد تک بھرا ہوا ڈھانپ سکتی ہے۔ ہمیں آئے ہوئے بیس منٹ ہوگئے تھے۔ معًا دروازے کی چلمن متلاطم ہوئی۔ اس بار نواب ہی تھا۔ چکن کے سفید کرتے اور پاجامے میں ملبوس، بالکل نوابوں کی طرح اس کے چہرے پر اضطراب آمیز شگفتگی چھائی ہوئی تھی۔ ہم دونوں کھڑے ہوگئے۔ نواب اٹھتا ہوا ہماری طرف بڑھا۔ پہلے اس نے بٹھل سے مصافحہ کیا، آداب و تسلیمات کے بعد تاخیر سے آنے کی معافی چاہی پھر وہ میری طرف متوجہ ہوا اور اس نے گرم جوشی سے میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبالیے اور پوچھا "رات کیسی گزری جناب؟"

میں نے پلکیں پٹ پٹا کے کہا "جی! ٹھیک، بالکل ٹھیک۔"

"دیر تک ہمیں خیال رہا کہ ہم سے کوتاہی ہوگی۔ ہمیں آپ کو روک ہی لینا چاہیے تھا۔ یقیناً آپ کو زحمت ہوئی ہوگی۔"

"کاہے کی صاحب؟" بٹھل نے سادگی سے پوچھا۔

"یہی آنے جانے کی۔"

"کیسی صاحب! ہم آپ کو بولے تھے، ہم نواب لوگ نہیں ہیں۔"

"اوہ ہاں، ہاں۔" نواب کھل کھلا پڑا اور تیکھے لہجے میں بولا "ہم سے بھول ہوئی۔ واقعی آپ نے فرمایا تھا کہ آپ نواب نہیں ہیں۔" اس نے تالی بجا کے ملازمہ کو طلب کیا اور تازہ چائے لانے کا حکم دیا۔ ملازمہ پہلے والا طشت اٹھا کے لے گئی تو نواب نے ہم سے ناشتے کے لیے پوچھا۔ بٹھل کے کہنے پر کہ ہم نمٹ کے آئے ہیں، نواب نے اصرار بھی نہیں کیا۔ وہ کچھ مضطرب سا لگ رہا تھا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ جھجکتے ہوئے بولا "رات تو اچھی خنکی رہی۔"

"ہاں صاحب، تھوڑی سردیلی رات تھی۔"

"یہاں موسم عموماً شدت گیر نہیں ہوتا۔"

بٹھل سہلانے لگا اور بولا "بولتے ہیں، موسم کا کچھ اثر آدمی پر بھی پڑتا ہے۔"

"ضروری نہیں۔" نواب نے مسکرا کے کہا "آدمی تو یورپ جیسے سرد ترین علاقے کے بھی کچھ کم گرم مزاج نہیں ہوتے۔ گوروں کو دیکھئے، یہ ان کی گرمی ہی ہے کہ آدھی دنیا کے فاتح ہیں۔"

"سردی بھی ہوسکتی ہے۔" بٹھل خود کلامی کے انداز میں بولا "کدھر سنا تھا، زیادہ ٹھنڈک آدمی کو پتھر کر دیتی ہے۔"

"کیا خوب!" بٹھل کی برجستگی پر نواب مچل گیا۔

پھر وہی باتیں۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔ بٹھل ہی کو چپ رہنا چاہیے تھا۔ جواب دینے سے بات بڑھتی رہتی ہے۔ اس طرح تو نواب کی حوصلہ افزائی ہو رہی تھی۔ ابھی چائے آنی تھی اور نواب کو شیروانی پہننے اندر بھی جانا تھا۔ میں نے بٹھل کو نہیں ٹوکا۔ نواب کی موجودگی ہی میں یہ ممکن بھی نہیں تھا۔ بٹھل کو خود ہی احساس ہوا۔ اس نے نرم لہجے میں نواب سے کہا "اگر چائے پھر یہ رکھی جائے تو۔۔۔"

"کوئی مضائقہ نہیں۔" نواب نے تذبذب سے کہا "جیسے آپ کی خواہش ہو۔"

"سچ پوچھئے تو ایک بہانہ ہے خوش وقتی کا۔" ابھی وہ کہہ رہا تھا کہ ملازمہ چائے کا نیا طشت لے کر داخل ہوئی۔ نواب ہنسنے لگا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر ملازمہ کو چائے واپس لے جانے کا اشارہ کیا۔

"اب آگئی ہے تو ضرور پئیں گے۔" ملازمہ واپس جانے لگی تھی، بٹھل نے اسے روک لیا۔

وہ گھبرا گئی، طشت میں رکھی ہوئی پیالیاں کھڑکھڑا گئیں۔ اس نے نواب کی طرف دیکھا اور جلدی سے چائے میز پر رکھ دی اور ریشمی کپڑا طشت سے ہٹا دیا۔ وہ شاید چائے بنانے کے انتظار میں سکڑی سمٹی کھڑی تھی کہ نواب نے اسے واپس جانے کی ہدایت کی اور خود پیالیوں میں چائے لوٹنے لگا۔ بٹھل نے نواب کو ہمارے پاس آکے چائے پیش کرنے کی زحمت نہیں دی۔ اس نے اٹھ کر اپنی اور میری پیالیاں میز سے اٹھالیں۔ وہ چائے پینے لگے۔ یہ بے وقت، کیسی خوش وقتی ہو رہی تھی۔ میں نے بھی چند گھونٹ لیے۔ زہر کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک موت تک لے جاتا ہے، دوسرا موت کا عذاب دیتا ہے۔ دوسرا پہلے سے زیادہ اذیت ناک ہے۔ ایک بار آدمی ختم ہوجائے تو سارے عتابوں، عذابوں سے نجات مل جائے۔

چائے پیتے ہوئے نواب کھو سا گیا۔ بٹھل نے زیرلب سے کہا "کیا ارادہ ہے نواب صاحب؟"

نواب سنبھل گیا اور سانس بھر کے بولا "جی ہاں! ارادہ مستحکم ہے۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے اضافہ کیا "اور نیک بھی۔"

"اچھا ہے پھر۔" میری طرح نواب نے بھی دوبارہ غور کیا ہوگا مگر بٹھل کے لہجے میں کوئی گرہ نہیں پڑی ہوئی تھی۔ اسے کہنا چاہیے تھا کہ پھر دیر کیا ہے مگر اس نے کچھ نہیں کہا اور چائے ختم کر کے خاص دان سے پان کھایا۔ نواب نے بھی اپنی پیالی میز پر رکھ دی۔ بٹھل نے خاص دان اس کے سامنے بڑھا دیا۔

نواب نے اس کا شکریہ ادا کر کے ایک الائچی پر اکتفا کیا "ایک گزارش ہے۔" نواب پہلو بدل کے چرمراتی آواز میں بولا "شام کو اگر ہم اپنی منزل کے لیے روانہ ہوں؟"

میری آنکھوں میں اندھیرا اتر آیا۔ بٹھل بھی نواب کو دیکھا کیا۔

"کیا عرض کریں۔" نواب کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں اور چہرے پر غبار سا چھا گیا۔

"کیا بات ہے نواب صاحب؟"

"صورت یہ ہے۔" نواب افسردگی سے بولا "ہمارے ایک عزیز کے ہاں کوئی سانحہ ہوگیا ہے۔ صبح سویرے ہی ہمیں اطلاع ملی۔"

"کیا ہوا صاحب؟" بٹھل نے تشویش سے پوچھا۔

"بس ایسا ہی ہے۔" نواب نے بے زاری کا اظہار کیا "جا کے ہی اصل صورت حال کا علم ہوگا۔"

بٹھل سیدھا ہو کے بیٹھ گیا تاہم اس نے تھمی ہوئی آواز میں کہا "آپ کل چلو صاحب۔"

"نہیں نہیں، امید ہے، سہ پہر تک ہمیں فرصت ہوجائے گی۔ سوچتے ہیں، ہمیں وہاں جا کے عیادت کرنی چاہیے۔"

"آپ اچھا جانتے ہو، اپنی فکر مت کرو صاحب! ہم تو ادھری آگئے ہیں۔ ایسا تھا تو آپ ڈرائیور کو بول دیتے۔"

"ہم نے سوچا تھا مگر سچ پوچھئے تو مناسب نہیں معلوم ہوا۔ ہم خود بھی کوئی فیصلہ نہیں کر پائے تھے۔ ادھر آپ کو بھی الجھن ہوتی۔ سوچا، جتنی دیر میں ہم واپس آئیں۔ آپ یہیں آرام فرمائیں۔ ممکن ہے، ہمیں کچھ کم وقت لگے۔"

"جیسا آپ سمجھو، ہم کچھ دیر کو بازار گھوم کے بھی واپس آسکتے ہیں۔ آپ سے پہلے لوٹ آئیں گے۔"

"کچھ خریداری وغیرہ کرنی ہے؟"

"ہاں صاحب، تھوڑی دکن کی سوغات بھی دیکھیں۔"

"بعد میں کیوں نہ رکھیے، ہم بھی ساتھ چلیں گے۔"

"آپ کدھری صاحب۔" بٹھل نے اپنے طور سے پہلوتہی کی پوری کوشش کی۔

"کیوں نہیں، ہمیں اپنی زبان سے نہیں کہنا چاہیے لیکن یوں سمجھئے لوگ کہتے ہیں، ہمیں اچھی پرکھ ہے، اصلی نقلی کی۔"

"آدمی کی یا چیزوں کی؟"

نواب کا سارا جسم لہرا گیا، تنی ہوئی آواز میں بولا "آدمی کے بارے میں ہم کچھ نہیں کہتے، ہماری مراد چیزوں سے ہے۔"

"نواب ہوتا صاحب!"

"نواب کو کیا، آدمی کی پہچان نہیں ہوتی؟"

"ہونی چاہیے۔" بٹھل نے تحمل سے کہا "چیزوں سے وقت ملتا ہوتا تو ضرور ہوتی۔"

نواب، بٹھل کی صورت دیکھنے لگا پھر سہلاتے ہوئے بولا "آپ نے درست کہا، انہیں فرصت نہیں ہوتی۔ ہم تو اپنی بات کر رہے تھے۔ فرصت تو بے شک ہمیں بھی نہیں ہے لیکن بہ قدر استطاعت ایک جستجو سرشت میں ضرور ہے اور ہمارا خیال ہے، اس کے لیے نواب ہونا شرط نہیں ہے۔"

بیرونی دروازے پر آہستہ سے کھٹکا ہوا۔ جب تک نواب نے حکم نہ دیا، آنے والا سامنے نہیں آیا۔ وہ دربان تھا۔ اس نے ہرچرن نامی کسی شخص کے بارے میں بتایا کہ وہ نواب سے ملاقات کا آرزومند ہے۔ نواب کو ناگواری سی ہوئی۔ کسی قدر تردد کے بعد اس نے دربان سے کہا کہ سردست کسی سے ملنا ممکن نہیں۔ بہتر ہوگا، ہرچرن جی کل یا پرسوں اسی وقت آئیں۔ دربان تین چار قدم گیا ہوگا کہ نواب نے اسے آواز دی اور بٹھل سے مخاطب ہو کے بولا "زیورات کے سلسلے میں ہمی نے ہرچرن جی کو بلوایا تھا۔ ریاست کا مشہور جوہری ہے۔ آپ کو ہیرے جواہرات کا کچھ ذوق ہے؟"

بٹھل کا ماتھا ٹھنکا ہوگا تاہم اسے جواب میں جو کہنا چاہیے تھا، اس نے وہی کہا کہ اسے ایسی چیزں کا کوئی تجربہ اور تمیز نہیں ہے۔

"ہمیں شبہ ہے، یہ محض کسرِ نفسی ہے۔" نواب نے لہک کے کہا۔

"اب کیا بولیں آپ کو۔" بٹھل کی آواز بل کھا گئی تھی۔ اس نے نواب کو یاد دلایا کہ اسے کہیں جانا بھی ہے۔

"کچھ وقت ہے ابھی ہمارے پاس۔" نواب نے روانی سے کہا "امی قبلہ بھی تو ساتھ جا رہی ہیں۔ جیسے ہی تیار رہوں گی، ہمیں اطلاع مل جائے گی۔ اتنی دیر میں ہم ہرچرن جی کو

فارغ کرسکتے ہیں۔ نامی گرامی صراف ہیں۔ جڑاؤ زیورات میں دور دور تک ثانی نہیں۔ ہیروں سے ہمیں بھی اچھا شغف ہے۔ آپ کو کون سا پتھر پسند ہے؟"

"وہ سارے، جو سر سے دور رہیں۔" بٹھل سرد لہجے میں بولا۔

بٹھل نے نواب کو پھر زعفراں زار کردیا مگر خود بٹھل ازراہ وضع بھی اس کا ساتھ نہ دے سکا۔ اب شاید کسی اور شہادت کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ کوئی ابہام تھا تو اس کے آئینہ ہونے میں اب ایسی دیر نہیں تھی۔ بٹھل کو بہرحال مطمئن ہونا چاہیے تھا کہ اس استعارے میں اندھیرا بڑھنے کے بجائے چھٹنے کا اشارہ ہے۔ ہرچرن کی آمد اور ہیروں کا ذکر سب ایک ہی سلسلے سے پیوستہ معلوم ہوتا تھا۔ آنے والا ہمارا چہرہ شناس ہونا چاہیے۔ ممکن ہے، اس نے نواب حشمت اور جہاں تاب کے محلات میں ہمیں دیکھا ہو یا وہ ان زرخریدوں میں سے کوئی ہو جو ابا جان کی حویلی میں شب خوں مارنے آئے تھے۔ وہ کوئی بھی ہوسکتا تھا۔ اب یہ نتیجہ اخذ کرنا بھی بٹھل کے لیے مشکل نہ ہوگا کہ نواب ثروت اپنے کسی محترم نواب کی شرکت کے بجائے سب کچھ اپنے آپ تک محدود رکھنا چاہتا ہے۔ وہ بھی تو ایک جدی نواب ہے۔ ہر نواب کو اپنے رتبے کی فزدنی اور جاہ و حشمت کی فراوانی کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔ ہرچرن کی آمد سے ہماری شناخت مطلوب ہے تو اس کے معنی یہ نکلتے ہیں کہ نواب ہمارے سلسلے میں ابھی تک کسی کش مکش سے دوچار ہے اور ہمارے لیے بھی اس کے کوئی معنی ہیں کہ جس تعبیر کے سراب میں ہم نے مارنی کو چالیس دن کی عزت بھی نہیں دی، وہ خواب تو ایک سراب ہی ہے۔

بٹھل کو ہنوز نواب کی ہم نوائی کا جبر سہتے رہنا تھا۔ اس نے کہا کہ مناسب ہے، نواب کی یہی خواہش ہے تو ہرچرن کو بلالیا جائے۔ زر و جواہرات کی بابت ہم کوئی رائے نہیں دے سکتے تو ان کے نظارے سے کیوں محروم رہیں۔

نواب نے گھڑی دیکھی۔ دربان ہاتھ باندھے دروازے کی آڑ میں کھڑا تھا۔ جانے نواب کے دماغ میں کیا سمائی، اس نے کوئی نیا حکم صادر نہیں کیا۔ میرے نہاں خانے کے جیسے دریچے کھل گئے۔ مجھے اپنے آپ سے پشیمانی بھی ہوئی۔ آنے والا ہماری تگ و دو میں آتا تو نواب اسے یوں نہ جانے دیتا۔ کاسۂ سر بھی عجیب وہم و گماں کی افزائش گاہ ہے۔ شک خود رو پودے کے مانند ہے، ایک بار نمو پاجائے تو جا بے جا پھیلتا رہتا ہے۔ نواب کے کسی عزیز کے ہاں واقعی کوئی حادثہ ہوسکتا ہے اور نواب کے لیے تنگیٔ وقت کا مسئلہ پیدا ہوسکتا ہے۔ ہیروں کا ذکر بھی اتفاقاً ہونا ممکن ہے۔ نواب ثروت ایک نوجوان آدمی ہے۔ یہ عمر چاروں طرف دیکھنے کی ہے۔ ہر نوجوان میری طرح نہیں ہوتا۔ اسے شکار سے بھی رغبت ہوتی ہے، سیر و سیاحت سے بھی۔ زر و جواہر سے بھی اور زیب و زینت سے بھی۔ نواب لوگوں کے تو بہ طور خاص یہی مشاغل ہوسکتے ہیں۔ ادھر دربان گیا، ادھر نواب ثروت بھی اٹھ گیا "آیئے ہم آپ کو مہمان خانے لیے چلتے ہیں۔" اس نے شائستگی سے کہا۔

بٹھل نے کوئی تاویل پیش کرنا چاہا تھا مگر ایک ساعت کے اکراہ کے بعد وہ نواب کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ بیرونی دروازے سے گزر کے ہم باہر کے مختصر باغیچے میں آگئے اور بائیں طرف مڑ گئے۔ نواب کی اقامت دائیں طرف تھی۔ مہمان خانہ عمارت سے ملحق بھی تھا اور اس سے الگ بھی کیا جاسکتا تھا۔ باہر سے آنے کا راستہ بھی الگ تھا۔ نواب نے پہلے سے ہدایت دی ہوئی تھی۔ کشادہ اور روشن نشست گاہ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ سب کچھ تازہ تازہ سا تھا۔ رنگ و روغن فرنیچر، پردے، غالیچے، گل دانوں میں رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے۔ نشست گاہ کے دونوں اطراف جانے والی گلیور جیسے راستے میں غالباً کمرے بنے ہوئے تھے۔ یہ کسی نواب ہی کا مہمان خانہ معلوم ہوتا تھا۔ نواب نشست گاہ عبور کرتا ہوا سامنے کی گلی یا راہ داری میں بڑھ گیا اور سجے سجائے کمرے میں داخل ہوگیا۔ یہ خواب گاہ تھی۔ دوپٹے، کرتے اور چھوٹی موری کے پاجامے میں ملبوس بادامی رنگت، تیکھے نقش و نگار کی ایک نازک اندام نوجوان لڑکی کھڑکیوں کے پردے درست کررہی تھی۔ ہماری آمد پر اس نے اپنا کام روک دیا، جھک کر نواب کو آداب کیا اور سمٹی سمٹائی کمرے سے نکل گئی۔ کمرے میں تقریباً ہر چیز کا اہتمام تھا۔ بلوریں جگ اور گلاس، فلاسک، پھل، شیشے کی ریک میں رکھی ہوئی چند کتابیں اور رسالے اور جانے کیا کیا۔ بٹھل وہاں نہیں ٹھہرا اور نواب کے ساتھ نشست گاہ میں آکے صوفے پر بیٹھ گیا "کسی چیز کی ضرورت ہو تو ملازمہ کو آواز دینے کی زحمت ہوگی۔ وہ یہیں کہیں موجود رہے گی۔" نواب نے خوش اطواری سے کہا "تکلف نہ کیجیے گا۔ یہ ہماری درخواست ہے۔ ویسے ملازمہ بھی آپ سے معلوم کرتی رہے گی۔ اس کا نام پری بانو ہے۔"

"ادھر تو پریاں ہی ہوسکتی ہیں۔"

نواب مسکرا دیا اور کہنے لگا کہ اسے اجازت دی جائے وہ اندر جاکے والدہ کو دیکھتا ہے۔ اب ہم سے اس کی ملاقات ایسی پر ہوگی۔

بٹھل نے خدا حافظ کہنے سے پہلے اس سے کسی مرد لازم کے لیے پوچھا اور کہا کہ باغ عامہ یہاں سے بہت نزدیک ہوسکتا ہے، ہم کچھ دیر کے لیے وہاں جانے کا ارادہ رلیں۔ کسی ملازم کی رہبری مل جائے تو آسانی ہوجائے گی۔ اب جیسے شش و پنج میں پڑ گیا۔ اس نے مشورہ دیا کہ دھوپ یز ہوا چاہتی ہے۔ ایسے میں باغ عامہ کی سیر کا کیا لطف آئے گا۔ "دھوپ ہی میں تو چھاؤں کا نشہ ہوتا ہے۔" بٹھل نے جت کی اور کہا کہ آرام کے وقت ہی آرام اچھا ہے۔ بستر پہ کروٹیں بدلنے سے بہتر ہے کہ یہ وقت کسی مصرف میں لایا جائے۔ مسافر تو یوں بھی نئی جگہ کو ہر طرح لوٹ لینا چاہتے ہیں۔ کوئی ملازم ہمراہ ہو تو کیا خوب ہے ورنہ کچھ ایسی دوری بھی نہیں کہ ہم اکیلے نہ پہنچ سکیں۔ بٹھل نے کچھ ایسے حتمی اور مطالبہ آمیز انداز میں یہ خواہش کی تھی کہ نواب کو خاموش ہوجانا پڑا۔ اس نے کہا "الحمدللہ، خدمت گاروں کی کمی نہیں ہے، میں اکبر نامی ملازم کو ہدایت کردیتا ہے۔ جس وقت باہر نکلنے کا ارادہ ہو، پری بانو سے کہہ کے اکبر کو طلب کیا جاسکتا ہے۔"

نواب کے جانے کے بعد بٹھل صوفے پر نیم دراز ہوگیا اور اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ میں بھی اپنے آپ میں دھنسا اس کے بازو میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ میرے دماغ میں پھر بھن بھناہٹ ہونے لگی تھی، وہی حبس اور شور سا۔ آدمی کو پاگل کردینے والا سکوت۔ دیر ہوگئی تو مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ میں نے جھجکتے ہوئے بٹھل کو چھیڑا "کیا سوچ رہے ہو؟"

اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں اور تنی ہوئی پلکوں سے مجھے گھورتے ہوئے بولا "تجھ سے زیادہ نہیں۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔"

اس کے ہونٹ پھیل گئے، وہ اچٹتی آواز میں بولا "اب زیادہ دیر نہیں لگنے کی رے۔"

"میرا تو دل بہت گھبرا رہا ہے۔"

"واپس چلنے کو بولتا ہے؟"

"یہ مطلب نہیں ہے۔" میں نے ترشی سے کہا۔

"ٹھکانے سے رکھ رے۔ یہ جت پٹ تو چلتا رہتا ہے۔ لگتا ہے اپنے ساتھ آخری تک یہی آنکھ مچولی رہے گی۔"

"میں نے تم سے اسی لیے منع کیا تھا۔"

اس کا چہرہ کشیدہ ہوگیا۔ لوٹ جائیں رے پھر؟"

"اب کیا ہے، یہ تو پہلے سوچنے کی بات تھی۔"

"سوچ ہی کے چلے تھے سجنا۔" وہ زہرخند سے بولا "کبھی تو کیسا کٹ کھنا، مرکھنا ہوجاتا ہے۔"

"صاف کیوں نہیں بولتے، کتا کہو، بیل کہو، سانڈ...! میری حالت ان سے مختلف بھی کیا ہے۔"

غصہ آنے کے بجائے اسے ہنسی آگئی "اور بھی بہت بے پلے ہوتے ہیں۔ اپنے کو کھونٹے سے بندھا رکھ، پٹا ڈال کے۔"

"مجھے بھی کچھ بتاؤ۔ تم نے کیا اندازہ کیا ہے؟"

"بولا نا رے، تجھ سے زیادہ نہیں۔" وہ کھوسا گیا پھر کہنے لگا "دھیان رکھنا، آدھ پون گھنٹے میں اٹھنا ہے۔"

"کہاں جانا ہے؟"

"ادھری باغ کی طرف..."

"جمرو اور زورا کہاں ہیں؟"

"ٹھیک سے ہی ہوں گے حرام کے۔"

"میرے دماغ میں ایک بات آرہی ہے۔" اس نے سر اٹھایا تو میں نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا "یہ جو ملازمہ پری بانو ہے، تم کہو تو اس سے کچھ سن گن لینے کی کوشش کریں؟"

اس نے منہ بنالیا "کیسی باتیں کرتا ہے رے!"

"کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔"

"ٹھیک سے بیٹھا رہ۔" اس نے مجھے جھڑک دیا۔

اتنی دیر میں دروازے پر آہٹ ہوئی اور دوسرے لمحے دستک "بٹھل کی اجازت پر چور چور سی بنی پری بانو اندر آگئی۔ اندر آتے ہی اس نے سلام کیا "سرکار کے لیے چائے لائی جائے؟" اس کی زبان نہایت شستہ اور دھیمی ہونے کے باوجود آواز میں چوڑوں کی سی کھنک تھی۔

بٹھل اسے دیکھتا رہا۔ وہ پلکیں جھکائے جواب کے لیے منتظر کھڑی تھی۔ اس وقت نواب کے ساتھ، خواب گاہ میں دور سے بس اس کی ایک جھلک نظر آئی تھی۔ اب سامنے آنے پر اندازہ ہوا، وہ کیسی قسمت گزیدہ تھی۔ ان در و بام میں تو اس کی کوئی اور حیثیت ہونی چاہیے تھی۔ پری بانو کا چہرہ گلنار ہورہا تھا، کچھ دوپٹے کی وجہ سے بھی۔ گلابی دوپٹے میں گندم گوں رنگت اس طرح کھلتی ہے۔ "ذرا قریب تو آری۔" بٹھل نے اسے مخاطب کیا "وہ سہم گئی اور آہستہ آہستہ چند قدم آگے آکے ٹھہر گئی۔ کب سے ادھری ہے رانی؟"

اس نے تھرکتے ہونٹوں سے بہ مشکل کہا "چار مہینے سے۔"

بٹھل نے جیب ٹٹول کر سو روپے کا نوٹ نکالا اور اس

کے حوالے کرنا چاہا۔ وہ اپنی جگہ ساکت کھڑی رہی "رکھ لے بٹیا! اپنے کو یہ خالی ہاتھ اچھے نہیں لگتے۔"

اس کا سر جھک گیا "نہیں سرکار!" اس نے بھنچی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ آگے نہیں آئی۔

"کسی اور جنگل کی ہرنی ہے۔" بٹھل بدبداتے ہوئے بولا اور پری بانو سے پوچھنے لگا "کدھری سے آئے ہیں اماں باوا؟"

پری بانو جیسے کسی مشکل میں گرفتار تھی۔ اس کے رخساروں پر ایک رنگ آتا تھا' ایک جاتا تھا۔ اس نے زیر لبی سے کہا۔

"ریاست رام پور سے۔"

"ہونہہ! رم پریا پٹھانی ہے۔"

پری بانو کے سراپا میں ایک تموج سا اٹھا۔ بٹھل نے نوٹ اس کے سپرد کرنے کے لیے پھر ہاتھ بڑھایا۔

"بندی معافی چاہتی ہے۔" پری بانو کی آواز گھٹی ہوئی تھی۔ لگتا تھا' اتنا کہنے کے لیے اسے اپنے سارے بدن کی توانائی صرف کرنا پڑی ہے۔

"کیوں ری! نواب صاحب کو پتا نہیں ہوگا' ایسے نہیں ہیں ہم لوگ' اتنی اچھی بٹیا ہو کے منع بولتی ہے۔" بٹھل صوفے سے اٹھ کے اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا' اس کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ اٹھایا اور پیشانی کو بوسہ دیا اور اس کے ہاتھ میں نوٹ تھما کے مٹھی بند کر دی۔

"مان رکھ لے اپنا' تجھ کو کچھ بولا ہے ری۔" بٹھل نے بوجھل آواز میں کہا اور اس سے پہلے کہ پری بانو کی حالت غیر ہوتی' بٹھل نے اس سے چائے لانے کو کہا۔ پری بانو کو جیسے رہائی مل گئی۔ وہ چھلاوے کی طرح کمرے سے نکل گئی۔

گویا بٹھل نے پری بانو سے کچھ معلوم کرنے کی میری تجویز مان لی تھی اور یہ ابتدا تھی۔ ابتدا میں اتنا ہی مناسب تھا۔ پری بانو نے بتایا تھا کہ وہ نئی نئی آئی ہے۔ ممکن ہے' اس نے کورا کو دیکھا ہو۔ کچھ اور نہیں تو وہ اتنا تو بتا سکتی ہے کہ کورا کا کیا حال تھا' کیسی لگتی تھی وہ۔ منیر علی کی بیوی زہرہ نے جیسلمیر میں مولوی صاحب کے قیام کے دوران میں مجھے اس کی بابت کچھ بتایا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ کورا کے چہرے پر تو ہر وقت کوئی گھٹا سی چھائی رہتی تھی اور اس کی غزالیں آنکھیں ہر وقت چمکتی رہتی تھیں۔ زہرہ نہیں جانتی تھی کہ وہ آسرے کی تابندگی تھی۔ امید تو دیے میں تیل کے مانند ہے' تیل ہو تو دیا جلتا رہتا ہے۔ اس بات کو عرصہ گزر گیا۔ کورا میں ضرور تبدیلیاں آئی ہوں گی مگر ایک تبدیلی یقیناً آئی ہوگی اور وہ یہ کہ اس نے اپنی امید ترک نہیں کی ہوگی۔ وہ تو اب بھی اس کی آنکھوں میں فروزاں ہوگی۔ یہی اعتبار تو مجھے قائم رکھے ہوئے ہے۔ ہو سکتا ہے' اسے اسی مہمان خانے میں ٹھہرایا گیا ہو۔ پری بانو نے اسے دیکھا ہے تو فراموش نہیں کر سکتی۔ کوئی بھی اسے ایک بار دیکھ کے اس کا نقش نہیں مٹا سکتا۔ مجھے تھوڑا بہت اندازہ ہو گیا تھا کہ پری بانو ایسی سخت اور تنگ دل لڑکی ثابت نہیں ہوگی۔ وہ بظاہر ایک سادہ و معصوم لڑکی لگتی تھی۔ بٹھل کا سلوک بھی اس کی نظروں میں ہمیں معتبر قرار دینے کے لیے بہت تھا۔ اتنا تو اسے بھروسا ہو گیا ہوگا کہ ہم کوئی برے لوگ نہیں ہیں' ہمارا مقصد محض کسی کی خیریت دریافت کرنا ہے' اس میں نواب کے لیے ضرر کا کوئی پہلو نہیں۔

پری بانو تھوڑی دیر میں چائے لے کر آ گئی۔ چائے کے ساتھ طشتریوں میں انگریزی بسکٹ بھی رکھے ہوئے تھے۔

"تو ہی بنا دے۔" بٹھل نے بھاری آواز میں کہا۔

میز کے اس پار قالین پر پری بانو گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ برقع کی طرح اس نے دوپٹا چہرے کے ارد گرد ڈھانپ بلکہ لپیٹ رکھا تھا۔ اس نے دھیمی آواز میں دودھ اور چینی کی مقدار کے بارے میں پوچھا۔ اس کی انگلیوں میں پہلی سی لرزش نہیں تھی۔ چائے بنا کے اس نے پیالیاں ہمارے آگے رکھ دیں۔

یہی موقع تھا کہ بٹھل سلسلہ جنبانی کرتا' اس نے پیالی ہونٹوں سے لگالی اور چسکی لیتے ہوئے بولا "ساری چیزیں اپنے ہی سواد کی بناتی ہے ری؟"

پری بانو دیر میں سمجھی اور اس کے رخسار شفق زار ہو گئے۔ وہ بس چند لمحے ٹھہری اور دروازے کی طرف جانے لگی۔ میں نے بے چینی سے بٹھل کو دیکھا۔ پری بانو ابھی دروازے سے باہر نہیں گئی تھی کہ بٹھل نے اسے پکارا۔ سٹ پٹاتے ہوئے مڑی تو بٹھل نے اسے اکبر نامی ملازم بھیجنے کی ہدایت کی۔ میں نے بٹھل کو یاد دلانا چاہا مگر پری بانو تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ میں بٹھل سے کیا کہتا' صاف ظاہر تھا کہ اس کا پری بانو سے مولوی صاحب کے سلسلے میں بات کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ پری بانو کے جانے کے فوراً بعد نواب کا ملازم اکبر حاضر ہو گیا۔ وہ شیروانی میں ملبوس فربہی مائل' سیاہ رنگت کا ایک خوش شعار ادھیڑ شخص تھا۔ یقیناً نواب کا خاص ملازم ہوگا۔

چائے ختم کر کے بٹھل اٹھ گیا۔ اکبر نے بٹھل کو ہا

تھا کہ نواب جا چکا ہے۔ موٹر بھی کاریڈور میں نہیں تھی۔ بٹھل کی رفتار نہایت سست تھی۔ اقامتی علاقے کی گلی سے ہم بڑی سڑک پر آگئے۔ چلتے چلتے نہ جانے بٹھل کو کیا ہوا' کپڑے کی ایک دکان پر رک کے وہ شیشے کی الماری میں سجی ہوئی ساڑیاں دیکھنے لگا۔ اس نے ساڑی کی قیمت پوچھی۔ دکان دار نے اس سے اندر آنے کی درخواست کی لیکن بٹھل نے توجہ نہیں دی اور ساڑی کی قیمت معلوم کرکے آگے بڑھ گیا۔ دکان سے ہم زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ سامنے سے جمرو کو آتا دیکھ کر میرے پاؤں ٹھٹک گئے۔ وہ خراماں خراماں ہماری جانب بڑھ رہا تھا۔ بروقت مجھے اکبر کا خیال آگیا اور میں بٹھل کو کہنی مارتے مارتے رہ گیا۔ جمرو نے بھی ہمیں دیکھ لیا تھا لیکن دوسرے راہ گیروں کی طرح وہ بھی بے نیازانہ ہمارے سامنے سے گزر گیا۔

چند قدم بعد ہی بٹھل نے اکبر سے پان کی دکان کی بابت پوچھا۔ دکان کچھ پیچھے رہ گئی تھی۔ اکبر کو کہنا چاہیے تھا کہ بٹھل کو جس چیز کی ضرورت ہے' وہ لے آتا ہے' اس نے یہی نیاز مندی کی۔ بٹھل نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اسے اس تکلف سے باز رکھا اور پلٹ کر خود دکان کی طرف چلا گیا۔ بٹھل نے مجھے کوئی اشارہ نہیں کیا تھا مگر میں سمجھ گیا۔ اکبر نے بھی آز روئے اخلاق بٹھل کے پیچھے جانے کے لیے قدم بڑھا دیے تھے۔ مجھے رکا ہوا دیکھ کے وہ متذبذب ہوا۔ مجھے اسے مصروف رکھنا تھا۔ کوئی اور بات میرے ذہن میں نہیں آئی تو میں نے اکبر سے اس کے بارے میں معلوم کیا۔ آدمی اپنے ذکر میں سب سے زیادہ دلچسپی لیتا ہے تاہم جواب دیتے ہوئے اس کی نگاہیں دکان کی جانب منڈلاتی رہیں۔ جہاں ہم کھڑے تھے' وہاں سے دکان خوب نظر آتی تھی۔ جمرو بھی وہاں ٹھہرا ہوا کچھ خرید رہا تھا۔ بٹھل نے بھی دکان پر پہنچ کے بظاہر دکان دار سے سروکار رکھا۔ پان بنوانے اور بیڑی خریدنے کا دورانیہ جمرو سے کچھ کہنے کے لیے کافی تھا پھر جمرو دکان پر ہی ٹھہرا رہا اور بٹھل واپس آگیا۔ اکبر کو کسی قسم کی بدگمانی نہیں ہوئی ہوگی۔

باغ عامہ قریب ہی تھا۔ اس وقت خاصا ہجوم تھا' کسی اسکول کے لڑکے اور لڑکیاں سارا باغ سر پر اٹھائے ہوئے تھے۔ اکبر ہمیں مختلف گوشوں میں لے گیا اور باغ میں بنی ہوئی ایک مسجد کے بارے میں بتایا کہ یہاں حضور نظام اپنے فرزندوں اور سلطنت عمائد کے ساتھ جمعہ پڑھنے آتے ہیں۔ باغ کی سیر تو عذر لنگ تھا۔ بٹھل کو کسی طور نواب کی حویلی سے نکل کے جمرو سے بات کرنی تھی اور یہ مقصد پورا ہو چکا تھا

پھر بھی بٹھل نے ایک سنسان کنج میں کچھ وقت گزارا واپس آتے آتے دوپہر ہوگئی۔ واپسی کے راستے میں زورا میں سے کوئی دکھائی نہیں دیا' نہ بٹھل کو کسی جانے کا شوق ہوا۔ نواب ابھی تک واپس نہیں آیا سے پوچھے بغیر پری بانو اور اس کے ساتھ ایک اور ملا مہمان خانے میں واقع کھانے کے کمرے میں کھانا لگا میں منع کردیتا لیکن بٹھل اٹھ گیا تھا اور اس دسترخوان پر بیٹھنے کی کوئی تک نہیں تھی۔ دولت مند ہاں عموماً کھانا کھایا کم' سجایا زیادہ جاتا ہے۔ یہاں تک منقش زرنگار برتن آراستہ تھے۔ ایسے نفیس و نا ایک بار تو کھانے کے ساتھ کانچ اور چینی کے بر جزولقمہ بنالینے کو جی چاہے' کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا تھا قدر کھانا آدمی کو چڑانے کے لیے سامنے رکھا جاتا ہے تناسب تو ہو آخر۔

پری بانو اور اس کے ساتھ ایک پختہ کار ملازم میں سرگرداں تھی کہ کہیں مہمانوں کی جبیں پر آجائے۔ دوسری ملازمہ موجود نہ ہوتی تو شاید بٹھل سے کچھ دریافت کرنے کی سعی کرتا مگر وہ تو بس خامو کھانے کی رسم ادا کرتا رہا یا خانہ پری کرتا رہا۔ طر کے کھانے تھے۔ شیرنی بھی کئی قسم کی تھی۔ ذائقہ کے لیے ہر کھانے سے ایک لقمہ لیا جاتا تو شکم سیری اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا تھا کہ گزشتہ را خوان کی تکرار نہ ہو۔ بٹھل کو بھی بھوک نہیں میرے ہاتھ اٹھانے پر اس نے بھی ہاتھ کھینچ لیا۔ د سے ہمارے جلد اٹھ جانے سے پری بانو کچھ افسرد تھی۔ اس نے جرات کرکے بٹھل کو بابا سرکار کے لق مخاطب کیا' کچھ اور کھانے کی درخواست بھی کی "بس بٹھل نے کسل مندی سے کہا "اتنے پر تو بھوک د الٹ جاتی ہے۔" قہوہ پی کے بٹھل خواب گاہ میں بستر ہوگیا۔

میں نشست گاہ میں چلا آیا۔ ابھی صرف ڈھا تھے۔ نواب نے شام تک آنے کو کہا تھا۔ اسے دیر سکتی تھی۔ اندھیرا ہوگیا تو جانا مشکل ہوجائے گا مگر ہم کیا سکتے تھے۔ ایسی صورت میں کوئی بھی کیا کرسکتا تھا کچھ دیر نشست گاہ میں بیٹھا دیواریں تکتا رہا پھر جا مجھے مہمان خانے کا ایک جائزہ لینے کا خیال آیا اور ایک ایک کمرے میں جھانک کے دیکھا پھر ایک کمر داخل ہوگیا۔ میرا قیاس صحیح تھا۔ کمرے کی ایک کھڑکی

کھڑکی نے پر زنان خانے کی عمارت سامنے تھی مگر محرابوں کے درمیان کھنچی ہوئی چلمنوں کے پار دیکھنا ممکن ہی نہ تھا۔ میں لوٹ آیا۔ میرا دل جیسے اڑا جا رہا تھا۔ کسی جگہ پل دو پل کے لیے بھی جی نہیں نکتا تھا۔ پری بانو ایک بار مجھے کھانے کے کمرے سے نکلتی ہوئی نظر آئی۔ اس کے چہرے پر پہلے سے زیادہ اعتماد تھا۔ وہ شرماتی' مسکراتی ہوئی میرے آگے سے گزری۔ اس کے تیور سے عیاں تھا کہ میرے کسی سوال کے جواب میں اس کا رویہ شگفتہ ہی رہے گا' میری کسی خواہش کے لیے وہ سراپا تعمیل ہے۔ میں نے اس سے بات نہیں کی۔ اس خیال سے کہ بٹھل مناسب سمجھتا تو ذرا بھی تامل نہ کرتا۔

گھڑی نے ساڑھے چار بجائے تھے کہ چائے کا طشت ہاتھ میں اٹھائے پری بانو دروازے پر نمودار ہوئی اور اس نے لکتی جھجکتی آواز میں بتایا کہ نواب واپس آگیا ہے اور اس نے پیغام دیا ہے' چائے پی کہ ہم نشست گاہ میں آجائیں' اتنی دیر میں وہ بھی تیار ہو کے وہاں پہنچتا ہے۔

میں اچھل کے اٹھ کھڑا ہوا۔ پری بانو کی پوری بات میں نے بٹھل کے پاس خواب گاہ میں جاتے ہوئے سنی۔ بٹھل جاگ رہا تھا۔ وہ بھی فوراً بستر سے اٹھ گیا۔ منہ ہاتھ دھونے میں اس نے کچھ وقت صرف کیا۔ پری بانو چائے بنانے کے لیے موجود تھی۔ میں نے اسے واپس کردیا اور بٹھل کے لیے چائے بنائی۔ بٹھل کی عجلت کی وجہ سے میں نے اپنے لیے بھی ایک پیالی بنالی اور چند گھونٹوں میں ختم کرلی۔ بٹھل کی آہستہ نوشی سے مجھے وحشت ہونے لگی تھی۔ کسی نہ کسی طرح اس کی پیالی بھی تمام ہوئی۔ وہ بس شوقیہ پان کھاتا تھا اس لیے خاص دان کی طرف اس کا ہاتھ بڑھتا ہوا دیکھ کر میرے جی میں آئی کہ اسے روک دوں۔ یہ وقت شوق کرنے کا نہیں؟ اس نے گلوری منہ میں رکھی' کپڑوں کی شکنیں درست کیں اور واسکٹ کے بٹن بند کیے' تب کہیں صوفے سے اٹھا "چل بالم۔" اس نے صدا بلند کی اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

نشست گاہ کی گھڑی میں پانچ بجنے والے تھے۔ تاہم دن ابھی خوب روشن تھا۔ اکبر نے ہماری پذیرائی کی۔ اس نے بتایا کہ نواب کب کا تیار ہے اور ہمارا منتظر ہے۔ میں اسی لیے جلدی کر رہا تھا۔ نواب کو کسی بھی لمحے آجانا تھا مگر دس منٹ گزر گئے تو اکبر بھی متفکر ہوا اور ہم سے اجازت لے کے باہر چلا گیا پھر وہ فوراً ہی واپس آگیا اور اس نے نواب کی طرف سے معذرت چاہی کہ جاگیر سے ایک کارندہ آگیا ہے۔

اسے ضروری ہدایات دے کر نواب آیا ہی چاہتا ہے۔ عین وقت پر زمینوں سے کسی کارندے کی آمد کا کیا مطلب ہوسکتا ہے۔ نواب نے ہم سے یہی کہا تھا کہ مولوی صاحب اس کی زمینوں والے مکان میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ہمیں نشست گاہ میں پورا آدھ گھنٹا گزر گیا لیکن نواب اندر نہیں آیا۔ میرا سر پھٹا جا رہا تھا۔ دن کی روشنی لمحہ بہ لمحہ ڈوب رہی تھی۔ کچھ اور دیر ہوگئی تو نواب اندھیرے کا عذر کرکے سفر ملتوی کرسکتا ہے۔ اب بہت ہوگیا۔ بٹھل کو اب اپنے طور پر بات کرنی چاہیے۔

چھ بجنے میں دس منٹ تھے کہ اندرونی دروازے پر آہٹ ہوئی۔ نواب ہی تھا۔ وہ شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے تیزی سے اندر آیا۔ میری سانسیں رکنے لگیں۔ سرمئی شیروانی میں ملبوس' کہیں جانے کے لیے وہ پوری طرح تیار معلوم ہوتا تھا۔ اس نے ہم سے رسماً چائے کے لیے پوچھا۔ بٹھل کی یقین دہانی پر کہ ہم مہمان خانے سے سیر ہو کے آئے ہیں' نواب نے روانگی کا اعلان کردیا۔

کاریڈور میں موٹر کی ڈکی کھلی ہوئی تھی۔ ڈرائیور زین کے کئی تھیلے اندر رکھ چکا تھا۔ بید کی دو باسکٹیں' لوٹا' ایک چرمی بکس' دو بڑے فلاسک اس نے ہمارے سامنے رکھے' سب سے اوپر دو نالی بندوق۔"

"پوری تیاری ہے صاحب!" بٹھل نے جیسے طرح دی۔

"ہاں جناب۔" نواب اچکتی آواز میں بولا "اسباب سفر' بے شک طوالت سفر سے زیادہ ہے۔ ابی مرحوم فرماتے تھے سفر چاہے کیسا ہو' طویل یا مختصر' زادراہ میں مزید دو چار چیزیں ساتھ رکھ لی جائیں تو ان کا بار سودمند ہوتا ہے اور پھر یہ تو موٹر ہے اس میں ابھی اور گنجائش ہے' یقین کریں امی' قبلہ تو کچھ اور چیزیں بھی ساتھ کر رہی تھیں۔ ہم نے رہنے دیں۔"

ہم موٹر میں بیٹھ گئے۔ پچھلی نشست پر نواب اور بٹھل بیٹھے۔ میں ڈرائیور کے برابر والی جگہ پر بیٹھ گیا۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ میرا تو سارا جسم سن ہوگیا تھا۔ مجھے کچھ احساس نہیں ہوا کہ کب موٹر دروازے سے نکلی اور بڑی سڑک پر آئی۔ میری آنکھیں اس وقت کھلیں جب موٹر پیٹرول بھرنے کے لیے پمپ پر کھڑی تھی۔ دھوپ عمارتوں سے چلی گئی تھی۔ بہرحال' اب شاید کوئی دیوار حائل نہیں رہی تھی' راستے کے پتھروں کے سوا۔ ڈرائیور نے ہوا' پانی' پیٹرول وغیرہ کے انتظام اور معائنے میں خاصا وقت لگا دیا۔ روشنی اور ڈھلک گئی۔

دیر تک موٹر شہر کے اندر چلتی رہی۔ شیشے کھلے ہوئے

تھے۔ سڑکوں کے شور سے بچ بچا کے بٹھل اور نواب کی کوئی کوئی بات میرے کانوں میں پڑجاتی تھی۔ نواب، بٹھل کو نظر آنے والی عمارتوں اور راستوں کے بارے میں کچھ بتا رہا تھا۔ اس کے لہجے میں کسی قسم کا تکدر نہیں تھا۔ مجھے بار بار یہی خیال آتا تھا کہ نواب کہیں اپنا ارادہ ملتوی نہ کردے اور ہمارے بارے میں اپنی رائے نہ بدل دے۔ اس کے لگے بندھے مشاغل ہیں۔ ہماری خلل اندازی اور ہماری وجہ سے یہ زحمت اسے کسی بھی وقت ہم سے بیزار کرسکتی ہے۔ یہ تو بھڑے میں پاؤں اڑانے کے مترادف تھا حالانکہ اسی نے خط لکھ کے ہمیں طلب کیا تھا، مگر نوابوں کے اپنے مزاج ہوتے ہیں۔ میں نے ان کے لیے جتنا کچھ سنا تھا، اتنا آنکھوں سے بھی دیکھا تھا کہ وہ کیسے نازک مزاج ہوتے ہیں۔

تمہاری سنگ دلی کا نہیں جواب کہ تم
بڑھے ہوئے ہو نزاکت میں آبگینوں سے

نوابوں کا پارا ذرا ذرا سی بات پر بے قرار ہوجاتا ہے۔ نواب ثروت پرانے شناساؤں کی طرح ہم دور افتادگاں کی میزبانی کررہا تھا۔ بٹھل سے اس کا انداز تخاطب عزت واحترام کا تھا جب کہ ہم نے خود بھی جتادیا تھا اور اسے بھی اچھی طرح اندازہ ہوگیا تھا کہ ہم کسی پہلو سے اس کے ہم پیشہ وہم سر نہیں ہیں اور ہم میں نوابوں کی کوئی عادت، کوئی خو بو نہیں۔

شہر کے گنجان علاقے سے نکل کر موٹر کم آباد راستوں پر آگئی۔ رفتہ رفتہ پختہ عمارتوں کا سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔ موٹر کی رفتار متوازن تھی، نہ زیادہ تیز اور نہ سست۔ افق کی لالی کب کی مٹ چکی تھی اور فضا میں جیسے سرمہ گھول دیا تھا۔ موٹر کچھ اور آگے پہنچی تو جھٹکے لینے لگی، نواب الجھ گیا "کیا مسئلہ ہے؟" اس نے ناراضگی سے پوچھا۔ ڈرائیور نے اپنی سی کوشش کی لیکن موٹر کے جھٹکے کم نہ ہوئے۔ اس نے موٹر سڑک کے کنارے کرلی اور انجن بند کرکے اتر گیا۔ جگہ بہت سنسان تھی۔ دور چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کا سلسلہ نظر آرہا تھا۔ آس پاس کہیں آبادی کے آثار نہ تھے۔ اندھیرا ابھی گہرا نہیں ہوا تھا۔ ڈرائیور بونٹ کھول کے مختلف پرزے اور آلات ہلاتا جلاتا رہا۔ ہم تینوں موٹر میں بیٹھے رہے۔ میں نے چاہا کہ اتر کر ڈرائیور کی مدد کروں مگر مجھے موٹر کے بارے میں اتنا معلوم نہیں تھا۔ دوسرے میں یہ سوچ کے رہ گیا کوئی زیادہ خرابی ہوگی تو نواب خود پہل کردے گا۔ ڈرائیور نے پلگ صاف کیے اور کسی نلکی میں پھونکیں ماریں، ہوا بھری، ہوا کھینچی پھر اس نے بونٹ بند کردیا اور اندر بیٹھ کے چابی گھمائی تو موٹر چل پڑی۔

"کیا بات تھی؟" نواب نے درشتی سے پوچھا۔

"تیل میں کچرا لگتا ہے سرکار!" ڈرائیور نے مودبا[نہ] جواب دیا۔

"پھر کپڑے بغیر تیل بھروایا تھا تم نے؟"

"نکو سرکار! کپڑا رکھا تھا۔"

"پھر کیا ہے؟" نواب برہم ہوگیا۔ وہ بٹھل سے بولا[،] موٹر کی کوئی خرابی اسے سخت ناگوار گزرتی ہے۔ وہ اچھ[ی] حالت میں موٹر رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور ذرا پرانی ہو[نے] پر بدل دیتا ہے۔ اس نے ڈرائیور کو سرزنش کی کہ یقیناً اس[کی] کسی کوتاہی سے یہ نقص پیدا ہوا ہے۔ ڈرائیور نے کو[ئی] جواب نہیں دیا۔ ایک اچھے محکوم کی یہی وضع ہونی چاہیے میں نے اور بٹھل نے نواب کو نہیں بتایا کہ گزشتہ رات چ[ار] چار کمان کے علاقے میں ہمیں پہنچانے کے بعد موٹر میں گڑ[بڑ] ہوگئی تھی اور ڈرائیور جانے کب تک الجھا رہا تھا۔

موٹر کی رفتار کچھ ہلکی ہوگئی تھی لیکن پھر کوئی خرابی نہیں ہوئی۔ ہوا میں سردی کی آمیزش تھی۔ میں نے اپنی طرف شیشہ چڑھالیا۔ میرے کان پچھلی نشست پر لگے ہوئے تھے مجھے توقع تھی کہ اگر اب تک مناسب نہ تھا تو اب ضرو[ر] نواب، مولوی صاحب کے پاس جاتے ہوئے ان کے بار[ے] میں کوئی بات چھیڑے گا۔ پہلی مرتبہ جب میں اور پیرو اس[کے] ہاں گئے تھے تو مولوی صاحب وہاں نہیں تھے۔ نواب نے بتا[یا] تھا کہ وہ ڈیڑھ دو مہینے پہلے ملاقات کے لیے آئے تھے اور جل[د] دوبارہ آنے کا وعدہ کرکے گئے تھے۔ وہ انہیں اپنے والد مرحو[م] کے ایک معزز شناسا کی حیثیت سے جانتا تھا اور اس [نے] مولوی صاحب کے بارے میں اپنی بے کلی کے لیے کوئی [نہ کوئی] معقول تاویل پیش کرنی تھی۔ اس نے مولوی صاحب کا بھان[جا] بتایا اور کہا تھا کہ عرصہ گزر گیا، مولوی صاحب گھر سے ناراض ہوکے ایسے گئے کہ کوئی خیر خبر ہی نہ ملی۔ آٹھ نو سال پہلے میری ماں نے مولوی صاحب کی جائداد ہتھیالی تھی۔ اب میں، ان کا قریب ترین رشتے دار اپنی ماں کی زیادتی کی معافی چاہنے اور مولوی صاحب کی امانت انہیں لوٹانے کے لیے مضطرب ہوں۔

نواب نے یہ روداد سن کے ہمدردی کے باوجود اچھی جرح کی تھی۔ پیرو نے اسے کسی طرح مطمئن کردیا تھا اور درخواست کی تھی کہ اپنے ارادے کے مطابق، مولوی صاحب نواب کے ہاں آجائیں تو ان سے ہمارا کوئی تذکرہ کرنے کے بجائے ہمیں خط کے ذریعے مطلع کردے، ہم خود [ا]ن کی خدمت میں حاضر ہوجائیں گے اور برسوں کی رنجش [دو]ر ہونے کی شکل نکل آئے گی۔ نواب نے ہامی بھرلی تھی [لی]کن وہ اپنی بات پر قائم نہ رہ سکا۔ ہمارے آنے کے چوتھے [پا]نچویں دن بعد ہی مولوی صاحب اس کی حویلی پہنچ گئے تھے۔ [ا]ن کے ساتھ کورا بھی تھی اور اب کے وہ حیدر آباد میں [مست]قل قیام کے عزم سے آئے تھے اور نواب کے توسط سے [سر] چھپانے کے لیے بساط بھر کسی مکان کی تلاش میں تھے۔ [نو]اب کی حویلی کے کسی حصے میں رہنے کی پیش کش انہوں نے [م]سترد کردی تھی۔ نواب کے بہ قول وہ اس وقت خط لکھ کے [مج]ھے بمبئی سے بلا سکتا تھا اور اچانک مولوی صاحب کے [س]امنے پیش کرسکتا تھا مگر اسے مولوی صاحب کی ناراضگی کا [ا]ندیشہ ہوا۔ اس بدگمانی نے اس کے دل میں جگہ بنالی تھی کہ [ہم]اری داستان میں کوئی پہلو ادھورا نہ ہو۔ مولوی صاحب اگر [ک]سی سے کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتے تو وہ درمیان میں پڑنے [و]الا کون ہے۔ بہتر تھا کہ کسی موقع پر کنایتاً وہ ان سے میرا ذکر کرکے دیکھے۔ اسے یہ بھی احساس تھا کہ مولوی صاحب کی غیرت اور خودداری آڑے آتی رہے گی۔ وہ کبھی کھل کے اس سے اپنا حال بیان نہیں کریں گے۔ ان کی مالی الجھنوں کے تدارک کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ ان کی جائداد انہیں واپس مل جائے۔ شاید اسی طرح زخموں کا کچھ اندمال ہوسکے۔ مولوی صاحب کو حویلی میں ٹھہرے ہوئے چوتھا دن تھا۔ ایک شام نواب کو موقع مل گیا۔ مولوی صاحب کسی حد تک مجتمع دکھائی دیتے تھے کہ نواب نے جھجکتے ہوئے میرا نام لیا۔

نواب کے کہنے کے مطابق میرا ذکر سن کے کہ میں ان کی جستجو میں نواب کے ہاں آیا ہوں، مولوی صاحب سناٹے میں آگئے تھے۔ نواب کا کہا ہوا ایک ایک لفظ میرے ذہن پر نقش تھا۔ اس نے بتایا کہ مولوی صاحب کی اس وقت کی کیفیت بیان کرنا اس کے لیے مشکل ہے۔ ان پر تو جمود طاری ہوگیا تھا۔ نواب کے دوبارہ ٹوکنے پر کہ آخر وہ خاموش کیوں ہیں؟ مولوی صاحب نے کوئی جواب دینے کے بجائے نواب سے پوچھا تھا کہ وہ مجھ سے کیسے واقف ہے؟ نواب نے ساری روداد بے کم وکاست دہرا دی تھی اور بتایا تھا کہ اتفاق کی بات ہے، مراد آباد شہر میں میری اور مولوی صاحب کی ملاقات نہ ہوسکی۔ مراد آباد سے ان کے جانے کے چند ہی دن بعد میں بھی وہاں پہنچا تھا۔ بڑی تگ ودو کے بعد مراد آباد کے مسافر خانے کے روزنامچے سے مجھے مولوی صاحب کا پتا معلوم ہوا۔ مولوی صاحب کے تجسس پر کہ ہم کس قماش کے لوگ ہیں، نواب نے انہیں ہماری طرف سے مطمئن کیا تھا اور ان کے بہ قول اس نے ہماری تعریف ہی کی تھی۔ مولوی صاحب نے اس سے پوچھا تھا کہ کیا وہ لوگ دوبارہ آنے کو کہہ گئے ہیں؟ نواب نے انہیں بتایا تھا کہ اب تک تو ہم بمبئی واپس چلے گئے ہوں گے کیونکہ اب عرصے سے میرا قیام بمبئی میں ہے۔ میرے ساتھ آنے والا شخص تو خاص بمبئی کا رہنے والا معلوم ہوتا تھا۔ نواب نے مولوی صاحب سے کہا تھا کہ ہمارا پتا اس کے پاس محفوظ ہے اور ہم التماس کرگئے ہیں کہ مولوی صاحب حیدر آباد آجائیں تو ازراہ نوازش ہمیں مطلع کردیا جائے۔ مولوی صاحب مبہوت بیٹھے رہے تھے۔ ان کے معنی خیز سکوت نے نواب کو نادیدہ بھی کیا تھا، مضطرب بھی۔ اس نے جسارت کی اور مولوی صاحب سے ہمارے بارے میں پوچھا کہ ہم کون لوگ ہیں اور کیا واقعی ہم سے تجدید تعلق مولوی صاحب کو گوارا نہیں؟ نواب نے ان سے ہماری سفارش بھی کی تھی کہ خطا انسان ہی سے ہوتی ہے۔ معافی کے لیے دل کھلا رکھنا چاہیے۔ نواب کے پند ونصائح کے جواب میں مولوی صاحب نے صرف اتنا کہا تھا کہ ہمارا پتا انہیں دے دیا جائے۔ مناسب ہوا تو کسی وقت ہم سے رابطہ کرلیا جائے گا۔ انہوں نے عذر کیا تھا کہ اس وقت ان کا دماغ کچھ حاضر نہیں ہے، گویا یہ ذکر انہیں ناپسند تھا۔ دماغ تو واقعی ان کا حاضر نہیں رہا ہوگا۔ اس کی بعد نواب کی طرف سے کچھ اور کہنے سننے کی کیا گنجائش رہ جاتی تھی۔ رات کے کھانے پر دونوں کی ملاقات ہوئی تو بھی مولوی صاحب نے ہمارا کوئی ذکر نہیں کیا نہ پتا حاصل کرنے کے لیے بے چینی ظاہر کی۔ کھانے کے بعد وہ کچھ وقت ادھر ادھر کی باتوں میں گزارتے تھے۔ اس رات مولوی صاحب جلد ہی خواب گاہ میں چلے گئے۔ اپنی کسی ادھوری کتاب کی تکمیل کا عذر کرکے دوسرے دن نواب اپنے ایک ہندو دوست کی شادی میں سکندر آباد گیا ہوا تھا، اس کی والدہ گھر ہی میں تھیں اور آرام کررہی تھیں۔ معمول میں رخنہ اندازی سے نواب کی والدہ کو زحمت ہوتی، کسی ملازم کے سامنے یہی دلیل سپر بنائے ہوئے مولوی صاحب کورا کے ساتھ چپ چپاتے خرم منزل سے رخصت ہوگئے تھے۔

سترہ اٹھارہ روز بعد دوسری بار جب میں اور پیرو نواب کے ہاں گئے تو اس نے یہ سارا احوال ہمیں بتایا۔ وہ بہت آرزدہ تھا کہ جانے اس کے کون سے ناروا ونازیبا سلوک نے مولوی صاحب کو کبیدہ خاطر کردیا۔ وہ اس طرح گھر چھوڑ کر کیوں چلے گئے۔ دوبارہ مولوی صاحب کی آمد سے وہ قطعاً

ناامید ہوچکا تھا۔ مجھے یاد ہے' اس نے کہا تھا' جو اس طرح جاتے ہیں' وہ لوٹ کے نہیں آتے مگر نواب مولوی صاحب کے یوں اچانک گھر سے چلے جانے کی وجہ کچھ اور سمجھتا تھا۔ اس کے بہ قول اس نے ایک بار زنان خانے میں کورا کی جھلک دیکھ لی تھی۔ اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا تھا لیکن اس کے چہرے کے بدلتے رنگ معترف تھے۔ کورا کو دیکھ کے اس کی آنکھیں خیرہ ہوگئی ہوں گی۔ بے شمار پری مثال ماہ جمال لڑکیوں کے بعد اس کی ماں کی نگاہیں بھی کورا پر ٹھہر گئی تھیں اور اس نے اپنے خوش رو' خوب خو فرزند کے لیے مولوی صاحب سے اپنی خواہش کا اظہار کردیا تھا۔ نواب کے لیے اپنے ہم حیثیت خاندانوں کی کیا کمی تھی۔ نوابوں کو خاندان اور خون وغیرہ کا بھی بہت خیال ہوتا ہے۔ ان کی نظروں میں تو صرف جاہ وحشمت والے ہی اصیل ہوتے ہیں' انہی کا خون سب سے اعلیٰ ہوتا ہے۔ نواب اور اس کی ماں سے مولوی صاحب کی حالت بھی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ روایت سے انحراف کی وجہ صرف کورا تھی۔ وہ ہے ہی ایسی۔ اس کا نظارہ تو کسی طلسم کے مانند ہے جو بھی اسے دیکھنے کا اسیر ہوجائے۔ جیسا کہ کہتے ہیں' اس کا مجسمہ بناتے ہوئے خدا کو بہت فرصت ہوگی۔ خدا نے اسے پھولوں سے' ریشم سے' کانچ سے اور شہد سے بنایا تھا۔

نواب اس گمان میں تھا کہ تعلق خاطر اور وضع داری کا معاملہ ہے۔ انکار کی جرات مولوی صاحب میں نہیں تھی اس لیے ان کے پاس فرار کے سوا کوئی راستہ نہیں رہا تھا۔ پیرو نے نواب کے اس تاثر کی تردید نہیں کی تھی۔ اس کی والدہ نے کورا کو اپنی بہو بنانے کے لیے مولوی صاحب سے بات کی تھی تو یہ مراد نہیں تھی کہ ابھی اسی وقت یہ کام انجام پاجائے۔ مولوی صاحب کچھ مہلت لے سکتے تھے۔ ایسے موقعوں پر وسیوں بہانے تراش لیے جاتے ہیں۔ عقل مند کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔ یہ میں جانتا تھا اور پیرو بھی جانتا تھا کہ مولوی صاحب کے اس طرح روپوش ہوجانے کا اصل سبب کیا ہے۔ ہم نے وہ گھر دیکھ لیا تھا جہاں مولوی صاحب کی بازیابی کا امکان تھا۔ وہ عینی شاہد تھے کہ میں نے بری نگاہ رکھنے' کورا پر دست درازی کرنے والے دو آدمیوں کا کلکتے میں دریائے ہگلی کے کنارے خون کردیا تھا۔

موٹر اندھیرا چیرتی ہوئی متوازن رفتار سے آگے جارہی تھی۔ تیز روشنیوں میں دور تک کا راستہ صاف ہوجاتا تھا۔ بہت کم تعداد میں مقابل سے آتی ہوئی موٹروں' بیل گاڑیوں اور سائیکل سواروں سے ہمارا سامنا ہوا اور ایک موٹر' دو لاریوں اور دو ٹرکوں کے سوا کسی گاڑی نے ہمیں عب[ور] نہیں کیا۔

بٹھل اور نواب خاموش ہوگئے تھے۔ دونوں اپنے طور پر آنے والی ساعتوں کے خاکے بنا رہے ہوں[گے] جیسے جیسے منزل قریب آرہی تھی' میری رگوں میں سرسراتی چیونٹیاں بھی بڑھتی جاتی تھیں۔ کبھی ایسا لگ[تا] سب کچھ ایک خواب ہے' اس سے سوا اور اس کے [سوا کچھ] نہیں۔ کبھی دل اتنے زور سے دھڑ دھڑانے لگتا کہ سا[را بدن] لرز جاتا۔ نواب نے آگے بھی مولوی صاحب سے متعل[ق کوئی] بات نہیں کی۔ نواب کو معلوم تھا کہ ہماری آمد کی خبر [سن کر] مولوی صاحب کا کیا حال ہوا تھا' وہ بے دم ہوگئے تھے۔ [...]ہی نے ہمیں بتایا تھا کہ انہوں نے کیسی سرد مہری [...] سے اسے جواب دیا تھا۔ نہ انہوں نے نواب سے [...] حاصل کرنے میں کوئی دلچسپی ظاہر کی تھی۔ ایسی صور[ت میں] نواب کو مولوی صاحب کے رنج وبرہمی کی فکر کیوں [...] ہے۔ اسے تو ہم سے زیادہ مولوی صاحب کا ہم [...] چاہیے۔ ممکن ہے' اس کے دماغ میں یہ آیا ہو کہ [...] آمنا سامنا ہوجانے سے مولوی صاحب کے دل کا غبا[ر دھل] جائے گا۔ مبادا نواب اس نیکی کا آرزو مند ہو کہ [کسی] طرح دو عزیزوں کے درمیان برسوں کی تلخی ختم ہوسک[ے۔] نواب کے کہنے کے مطابق مولوی صاحب نے ہماری [آمد کی خبر] سن کے کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ اصل بات تو وہ بھی [...] سکتے تھے۔ میرے لیے کچھ الٹا سیدھا کہنے سے انہیں [نواب] کے تجسس کی افزونی کا خدشہ ہوگا۔ شاید اسی لیے انہو[ں نے] خاموشی اختیار کی مگر اس خاموشی پر باریک بین نواب [کو کب] قرار آگیا۔ یقیناً اسے کچھ اور جاننے کی بے آرا[می ہوگی۔ اسے سوچنا] چاہیے کہ کہیں کوئی اور گرہ تو نہیں؟ مولوی صاحب آ[خر] لوگوں کے ساتھ بالمشافہ ملاقات سے کیوں گریزاں [ہیں؟] میرے نام پر نواب کے بہ قول' مولوی صاحب کے چ[ہرے کا] رنگ کیوں بدل گیا تھا؟ نواب یہی پہیلی بوجھنے کے لیے [تو ہمیں] مولوی صاحب کے پاس نہ لے جارہا ہو؟ اسے اندازہ [ہوگا کہ] مولوی صاحب اس کے سامنے زبان کھولیں گے نہ [...] بتاپائیں گے۔ مولوی صاحب نے کورا کو نرجس بانو [...] سے متعارف کرایا تھا۔ نکتہ سنج نواب کو نرجس با[نو اور] مولوی صاحب کی بیٹی کی نسبت پر بھی شبہ ہونا چاہیے[۔ اس] نے ان دونوں میں مماثلتیں ضرور تلاش کی ہوں گی اد[ھر آنے] میں اس کے ذہن رسا کے انتشار میں اضافہ ہوا ہوگا۔ [مولوی] صاحب نے خرم منزل میں رہنے کے بجائے اتنی دور ر[ہنا]

[...]کیوں ترجیح دی ہے۔ اس کی ایک تو وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اتنے [...] عرصے تک بستے اجڑتے' اجڑتے بستے انہیں تھک جانا [...] ہے۔ اب انہیں سکون کی بہت ضرورت ہوگی۔ دوسرے ایک [...]ر اندیشہ تھا' کسی بھی وقت اچانک نواب کے گھر ہمارے آدھمکنے [کا خ]طرہ بھی انہیں لاحق ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ ادھر نواب نے ہمیں [...]لکھا ہو اور ادھر حفظ ماتقدم کے طور پر انہیں زمینوں والے [مک]ان پہنچادیا ہو۔ کسی طرح خرم منزل میں ان کی موجودگی کی بھنک [ہم]یں مل گئی تو نہ جانے ہمارے سر میں کیا سودا سماجائے۔ پہلے میں [او]ر پیرو آئے تھے۔ اب کے میرے حمایتیوں کی تعداد دگنی بھی [ہوس]کتی ہے' کوئی بعید نہیں کہ ہم کیسا فیل مچائیں۔ ہماری طرف سے [...]ی سوالوں کے مثبت جوابات کے بعد ہی نواب نے ہمیں مولوی [ص]احب کے پاس لے جانے کا فیصلہ کیا ہے نواب کی گزشتہ رات [او]ر آج صبح کی یاوہ گوئی کا بھی یہی مقصد ہوسکتا ہے۔

ڈرائیور سے چوک ہوگئی۔ سامنے سے آنے والی لاری [...]نے ڈرائیور کو موٹر ایک طرف کرنے پر مجبور کیا۔ سڑک کے [ک]نارے گڑھا تھا۔ ڈرائیور نے کچھ زیادہ ہی احتیاط کی۔ [ا]تنے کنارے ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ گڑھے میں موٹر [زو]ر سے اچھلی مگر شکر ہے کہ نکل گئی' اس افتاد نے ہم سب کو [زی]روزبر کردیا۔ نواب' ڈرائیور پر خفا ہونے لگا کہ وہ کس خیال [می]ں گم ہے۔ ایسی تیز روشنی میں اسے گڑھا کیوں دکھائی نہیں [د]یا۔ نواب کی ملامت درست تھی۔ اس تاریک اور سنسان [ج]گہ پر موٹر خراب ہونے سے کیسی پریشان ہوسکتی تھی۔ [ح]سب معمول ڈرائیور چپ رہا۔ نواب بھی بڑبڑاتا ہوا [خ]اموش ہوگیا اور موٹر میں وہی جاں سوز سکوت گھن گھنانے لگا۔ بٹھل بھی گونگا بن گیا تھا۔ پہلے نہیں تو اب اسے کچھ تنکے [چ]بھونے چاہئیں تھے۔ نواب کی اس بے نیازی میں کیا اسے کوئی رمز محسوس نہیں ہورہی؟ اس کی آنکھیں تو اپنے ان [...] دیکھے سے بھی غافل نہیں رہتیں لیکن اگر وہ کچھ معانی اخذ کررہا تھا تو میں بھلا کس طرح جان سکتا تھا۔ میں ہزار خود کو سمجھاتا کہ میری وحشت بے جواز ہے' اس سے کیا حاصل ہے۔ میرے لیے فی الحال ایک تماشائی کی طرح آنکھیں کھلی رکھنا ٹھیک ہے مگر بس چند لمحوں کی یکسوئی ہوتی تھی کہ سب کچھ گڈمڈ ہوکے رہ جاتا تھا۔ دو باتیں ساتھ تو نہیں ہوسکتیں۔ ایک ہی وقت میں آدمی تماشا ہو' تماشائی بھی۔ نواب کو کم از کم میرے موضوع پر اپنے علم میں اضافے کی طلب ہونی چاہیے تھی۔ میری تعلیم' شوق' معمولات وغیرہ۔ میرا دماغ جانے کہاں کہاں بھٹک رہا تھا۔ غیر ارادی طور پر میں نے پیچھے مڑ کے ایک نظر نواب کو دیکھا۔ وہ پُرسکون تھا اور کسی سوچ میں گم۔ مجھے دیکھ کے وہ مسکرایا "ہنوز دلی دور است جناب!" وہ شوخی وشائستگی سے بولا۔

میں نے کچھ نہیں کہا۔ موٹر تیزی سے بھاگتی رہی۔ یکایک ایک خیال نے مجھے گنگ کردیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کورا نے' کورا ہی نے کسی ذریعے سے رابطہ کیا ہو کہ وہ کچھ چارہ گری کرے۔ مولوی صاحب ایک زمانے سے اسے آسرے میں رکھے ہوئے تھے۔ وہ اس سے میری گمشدگی' نادست یابی کی کیسی کیسی توجیہیں اور تاویلیں پیش کرتے رہے ہوں گے۔ کیا کیا فسانہ طرازیاں نہ کی ہوں گی۔ انہوں نے اس امید میں کہ وقت سب سے بڑا درماں ہے۔ ایک نہ ایک دن تو کورا کے نہاں خانے میں فروزاں آگ کملا ہی جائے گی لیکن انہیں بہت مایوسی ہوئی ہوگی۔ یہ آگ ہی تو اسے قائم رکھے ہوئے ہے۔ جس دن کورا کی ڈوری ٹوٹ گئی' اس دن کچھ بھی نہ رہے گا پھر مولوی صاحب دیواریں نوچا کھسوٹا کریں اور دیواروں کا لکھا ایسے نہیں مٹتا۔ حیدر آباد آنے کے شروع کے چند دن تو مولوی صاحب خرم منزل میں ضرور ٹھہرے رہے ہوں گے۔ اس درمیان نواب کی بہن' ماں اور اس کی معتمد کنیزوں' باندیوں سے مانوس ہونے کا کورا کو موقع ملا ہوگا۔ ان کی زبانی نواب کے ارادہ وعزم کی توانائی صائب دماغی اور صاحب دلی کے چرچے سن کے ہی اسے لب کشائی کا حوصلہ ہوا ہوگا۔ ہوسکتا ہے انہی میں سے کسی کے توسط سے اس نے نواب کو کچھ بتایا ہو۔ مزاجاً نواب اس راہ گیر کے مانند معلوم ہوتا ہے جو عجلت کے باوجود سڑک کی بھیڑ کے اندر جھانکے بغیر اپنی راہ نہیں لیتا۔ آتے ہی مولوی صاحب نے اس سے کسی الگ مکان کے بندوبست کے لیے اصرار کیا ہوگا اور حیدر آباد میں اس مرتبہ ان کی موجودگی یقینی بنانے کے لیے کسی مستقل مکان کا انتظام ہونے تک نواب نے انہیں اپنی زمینوں والے مکان میں منتقل کردیا مگر کورا! زمانے کے سردوگرم نے اسے اتنا شعور ضرور دیا ہوگا کہ وہ اپنے مربی ومحسن مولوی صاحب کے لیے زبان کھولنے سے پہلے عواقب پر اچھی طرح غور کرلے۔ مولوی صاحب ہی اس کی ایک پناہ تھے۔ اسے تو انہوں نے شہزادیوں کی طرح رکھا۔ ان کی حیثیت تو اس کے لیے کسی ستون اور سائے کی رہی ہے۔ انہوں نے اسے اس کے طلب گار جانگ قبیلے کے سرگشتہ وسرکش عقیدہ زدگاں سے بچائے رکھا ہے۔ اس کی خاطر وہ دربدر پھرتے رہے۔ وہ ایک سیلانی آدمی تھے۔ اپنی چھوٹی سی دنیا میں مست وبے خود انہوں نے دنیا ہی اس کے

لیے ترک کردی۔ مولوی صاحب کو کہیں کورا کی اس نادانی کا علم ہوجائے تو وہ بالکل ٹوٹ جائیں گے۔ اب تک سب کچھ اسی لیے محفوظ رہا تھا کہ کورا نے ہونٹوں پر مہر لگا رکھی تھی ورنہ ایک بار حرفِ شکایت زبان پر لانے کا مطلب اپنا اختیار کھودینا ہے۔ اس میں مولوی صاحب کے زیاں اور رسوائی کے پہلو تھے۔ کورا کو یہ نہیں کرنا تھا۔ وہ ایسا کر بھی نہیں سکتی تھی۔ کبھی قسمت نے یاوری کی تو مجھ تک پہنچنے کا وسیلہ ایک مولوی صاحب ہی ہوسکتے ہیں۔ چند دن کے اجنبی رفیقوں پر اتنا اعتماد کرلینا کوئی ہوش مندی نہیں۔ کورا نے یقیناً ایسا نہیں کیا ہوگا۔

نواب نے موٹر رکوادی اور ڈرائیور کو ڈکی سے فلاسک نکالنے کا حکم دیا۔ موٹر ایک دو منٹ کو ٹھہری تھی کہ چل پڑی۔ ابھی موٹر نے رفتار نہیں پکڑی تھی کہ پیچھے سے آتی ہوئی کسی موٹر کی وجہ سے ڈرائیور کو پھر کنارے ہونا پڑا۔ گزرنے والی موٹر کی رفتار بہت تیز تھی۔ فلاسک میں قہوہ خوب گرم تھا۔ بٹھل اور نواب چسکیاں لیتے رہے۔ میں نے چند گھونٹوں میں ختم کرلیا۔ نواب کے کہنے پر بٹھل نے دوسرا فنجان بھی لیا۔ "ہم قطب شاہی مزارات سے آگے نکل آئے ہیں۔" نواب نے سرگرمی سے کہا "کچھ دیر پہلے آپ کو دور ٹیلوں کے اردگرد ٹمٹماتی روشنیاں نظر آئی ہوں گی۔ سنا ہے' یہ چھوٹی سی بستی صدیوں سے آباد ہے۔" بٹھل ہوں ہاں کرتا رہا۔ نواب کہنے لگا۔ آگے حسین ساگر ہے اور اس کے بعد ہماری منزل۔ رات کے وقت موٹر کی یہی رفتار مناسب ہے۔ دن ہوتا تو شاید ہم اب تک پہنچ چکے ہوتے۔"

"پہنچ جائیں گے صاحب!" بٹھل نے اچٹتی آواز میں کہا "اپنے کو سویرے کی گاڑی نہیں پکڑنی ہے۔"

"ہاں' یہ بھی بجا ہے' بالکل درست!" نواب نے ہمکتے ہوئے کہا "کیا عرض کریں' چلتے چلتے ایک کے بعد ایک مسئلہ۔ ہمارا خیال تھا' پانچ بجے تک نکل جائیں گے۔ ان دنوں سورج بھی جلد غروب ہوجاتا ہے۔"

"آپ بولتے تو اگلے دن کا رکھ لیتے۔"

"ہم نے سوچا تھا' آپ سے گزارش کریں لیکن پھر یہ سوچ کر رہ گئے کہ آپ کو اپنے مقصد کی تکمیل کی بے چینی ہوگی۔"

"اپنے کو عادت پڑ گئی ہے صاحب۔"

نواب کا چہرہ میرے سامنے نہیں تھا کہ کچھ اندازہ ہوسکتا۔ اس نے ایک آہ بلند کی اور جیسے کہیں کھوگیا۔

اچانک سڑک' ٹائروں کی رگڑ سے چیخ اٹھی۔ ڈرائیور نے زور سے بریک لگائے۔ سامنے سے آنے والی گاڑی نہ لالٹین تھی' نہ بیل کی گردن میں گھنٹی۔ ڈرائیور کو وقت پر دکھائی دے گئی ورنہ کوئی بھی حادثہ ہوسکتا تھا۔ [illegible] برہم ہونے لگا پھر شاید ہماری موجودگی کے باعث یا احساس سے کہ ڈرائیور کی اتنی غلطی نہیں ہے' اس کی بتدریج دھیمی پڑ گئی۔ گول کنڈے کے قلعے سے آگے [illegible] ساگر تھا۔ نواب ہی جانتا تھا کہ اب کتنی دیر کا راستہ ہے۔ بہرحال ہر لمحے فاصلہ کم ہی ہورہا تھا۔ مجھے اب بھی نہیں آرہا تھا کہ ہم اپنی منزل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ تو[illegible] کے لیے میرے سینے میں دریا سا امڈ تا تھا کہ میں اس احسان کا بدلہ کس طرح چکا سکوں گا۔ اس کے لیے تو [illegible] سے دریافت کیا ہوا ابا جان کا خزانہ بھی ہیچ ہے۔ نواب [illegible] معلوم کہ اس کا یہ عمل کس کو زندہ کرتے' زندگی بخش [illegible] کے مترادف ہے۔ مجھے سامنے دیکھ کے کورا کا کیا حال ہو[illegible] اسے تو سکتہ ہوجائے گا اور خود میرا حال؟ میرے ہاتھ پاؤ[ں] ابھی سے پھولے جارہے تھے۔ میرا دل کہیں بند نہ ہوجا[ئے] پھر تو کچھ بھی ہوجائے' کاش کچھ دیر کے لیے میرے حوا[س] معطل ہوسکتے۔ میں نے پوری کوشش کی کہ اپنے آپ [کو] سمیٹے' باندھے رکھوں مگر اپنے اختیار میں مجھ سے سوا [illegible] تھا۔ آدمی کو اتنی توفیق ہوا کرتی تو ہر آدمی اپنا حاکم' اپنا آپ ہوا کرتا۔ یہ تو رسیوں اور زنجیروں کے بس میں بھی [illegible] کہ آدمی کا دل جکڑ سکیں' دماغ جکڑ سکیں۔

معاً جیسے کسی نے میری رگ وجاں میں سوئیاں پیو[ست] کیں۔ یہ سامنے کی بات تو میرے دماغ سے اوجھل ہی ر[ہی] تھی کہ مولوی صاحب' نواب کے گھر سے فرار ہونے کے [بعد] واپس کیوں آگئے؟ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے خود کو دیکھا [illegible] ظاہر ہے انہوں نے کسی کو مطلع کیے بغیر گھر سے چلے جانے [کی] کوئی بڑی وجہ بیان کی ہوگی اور نواب نے اسے تسلیم کر[لیا] ہوگا کہ اب تو وہ واپس آہی چکے ہیں۔ رفتِ گزشت نواب [کا] یہی شیوہ ہے۔ دلیل تو گزشتہ دنوں کے بجائے مولوی صاحب کو آنے والوں دنوں کی دینی تھی۔ جن اسباب نے نواب [کی] حویلی سے رخصت ہونے پر انہیں مجبور کیا تھا' وہ تو بد ستو[ر] موجود تھے۔ انہیں یاد ہوگا کہ نواب کی والدہ نے اپنے اقبا[ل] مند فرزند کے لیے ایک عزت مندانہ پیش کش کی ہے۔ ادھر حیدر آباد میں دوبارہ نواب کے گھر جانے کی صورت میں کسی وقت میری آمد کا دھڑکا جوں کا توں قائم تھا۔ مولوی صاحب کی واپسی سے مراد پسپائی ہے۔ زوال آمادہ اعصاب' [illegible] حالی اور زمانے کی نیرنگی کیسے کیسے سورماؤں سے کتنا بھاگ [illegible]

ہے' کتنا زور کرسکتا ہے۔ کوئی توانا شخص اس طرح مراجعت پر آمادہ نہ ہوتا۔ ہر مراجعت ہزیمت نہیں ہوتی لیکن ہر ہزیمت کے لیے کوئی مفاہمت لازم ہے۔ مولوی صاحب نے بہت طویل سفر کیا تھا اور راستے کی طوالت' سفر کی طوالت نہیں ہے۔ سفر کی پیمائش تو راستے کے پتھروں' اندھیروں سے ہونی چاہیے۔ انہوں نے جانے کتنی پناہ گاہیں آزمائی ہوں گی۔ لگتا ہے' نواب ہی کے ہاں انہیں کچھ امان نظر آئی۔ وہ نواب کے خاندان کی اصالت ونجابت سے اچھی طرح واقف تھے۔ میرے لیے سارے دروازے بند کردینے کے بعد انہیں کورا کے لیے بھی کچھ سوچنا تھا۔

میرا جسم پتھر کا ہوگیا۔

پھر نواب ثروت ہمیں مولوی صاحب کے پاس کیوں لے جارہا ہے۔ مولوی صاحب کی برہمی کے یقین کے باوجود۔ شاید مولوی صاحب نے ابھی ہامی نہ بھری ہو اور گومگو کی کیفیت سے دوچار نواب کو ہماری صورت میں امید کی کوئی کرن نظر آئی ہو۔ مولوی صاحب کی آمد پر نواب کے گھر والوں نے دوبارہ ان سے کورا کے لیے بات نہیں کی ہوگی۔ یہ آداب کے منافی ہے۔ کہتے ہیں' دشمنی میں بھی نوابوں کو آداب کی فکر رہتی ہے۔ مثبت یا منفی کوئی بھی جواب مولوی صاحب ہی پر واجب تھا اور واجب ہے۔ نواب نے مولوی صاحب کی آمد اور اپنے گھر ان کے قیام کو ان کی ہاں سے مشروط نہیں کیا ہوگا۔ دونوں طرف سے کسی عجلت کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ مولوی صاحب کی آمد بجائے خود ایک اقرار ہے لیکن خاموشی اقرار نہیں ہے۔ ان کی خاموشی پر نواب کے گھر والوں کو تحمل اور بردباری کی روش اختیار کرنی چاہیے کیونکہ مولوی صاحب کو نئے گھر میں بسنے اور نئے ماحول سے موافق ہونے کے لیے بجا طور پر ایک مہلت لازم ہے۔ ازروئے وضع' نواب نے ان کے لیے دیدۂ ودل فراش راہ کیے ہوں گے۔ یکسر معذوری ... کی جرأت یقیناً مولوی صاحب میں نہ ہوگی' پھر انہیں نواب کے گھر کا رخ ہی نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ممکن ہے انہوں نے کچھ وقت طلب کیا ہو۔ یہ وقت طلبی رسم کے عین مطابق' مگر یہ پیش وپس کی علامت اور آدھے انکار کے مساوی ہے۔ نواب کے لیے یہ سبکی کی بات ہے' کشمکش ونزاع کی بھی۔ اس نیمے دروں' نیمے بروں رویے سے سینوں میں غبار اتر آتا ہے۔ رگوں میں خون چبھنے لگتا ہے۔ کہیں نواب مولوی صاحب کو آئینہ دکھانے اور ان کے ناگفتنی احوال کی آگہی کے لیے ہمیں چارہ تو نہیں بنا رہا! میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ جتنا میں سرا پکڑنے کی کوشش کرتا' میری آنکھیں اور الجھ جاتیں۔ مولوی صاحب کے اقرار کی صورت میں بھی ان کے روبرو پیش کرنے کی ایک معقول وجہ موجود ہے۔ اس سے مراد ان کی خوشنودی کا حصول ہے۔ یہ امر مولوی صاحب کے معاملات میں شمولیت اور ان کی ذات میں سنجیدگی کا مظہر ہے۔ نواب کی دانست میں مولوی صاحب کی برگشتگی بہت عارضی ہوگی۔ ہماری طرف سے معافی تلافی کے بعد وہ مآل کار نواب کا اقدام تحسین کی نگاہوں ہی سے دیکھیں گے۔ ان کی جائداد انہیں واپس مل جائے گی۔ ان کے بچھڑے ہوئے ان سے آملیں گے۔ یوں عرصے سے جاری ایک مشقِ ستم سے' اس تنگ وتند زندگی سے انہیں نجات مل جائے گی۔

مولوی صاحب کے انکار پر نواب کی دست برداری کے امکان کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ سامنے کورا کی جگہ کوئی اور ہوتا تو بات اور تھی اور مولوی صاحب واپس نہ آتے تو ٹھیک تھا۔ واپس آکے گویا خود انہوں نے مائل بہ اندمال زخم کھرچنے اور شعلہ پژمردہ کو ہوا دینے کا کام کیا ہے۔ نوابوں میں ضد کی خو بھی نہایت درجے کی ہوتی ہے۔ مولوی صاحب جیسے پست حال شخص کو یہ سرکشی زیب نہیں دیتی۔ ایک نواب کیا' کوئی اور سادہ شعار بھی اتنی آسانی سے دست بردار نہ ہوپاتا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے کورا کے ذکر پہ نواب کی دل گیری دیکھی تھی۔ اس کی کبیدہ خاطری کا اصل سبب مولوی صاحب کا اچانک چلا جانا نہیں تھا۔ مولوی صاحب جیسے لوگ بہت ارزاں ہیں' کوئی اور ملال اسے دل گرفتہ کیے ہوئے تھا۔ مولوی صاحب کی طرف سے مسلسل انتظار کا مرحلہ نواب کے لیے بہت اذیت ناک ہوسکتا ہے۔ ویسے یہ تاخیر بہ وجوہ بھی مناسب نہیں تھی۔ ریاست میں ایک سے ایک جید نواب موجود ہے۔ مولوی صاحب کو حیدر آباد میں بس جانے کے بعد اپنا حلقۂ اثر اور دیگر نوابوں سے اثر ورسوخ بڑھانے کا موقع نہیں ملنا چاہیے تھا۔

اور مولوی صاحب کا یہ ہے کہ وہ صرف انکار کے مجاز ہیں' اقرار کے نہیں۔ نواب کو کچھ نہیں معلوم کہ مولوی صاحب کا اختیار بہ قدر امکاں ہے۔ یہ تو کلیتہً کورا پر منحصر ہے۔ آدمی کو زندگی کی درازی کی قدرت نہیں مگر خاتمے کی ضرور ہے۔ مولوی صاحب کو اس صداقت کا اچھی طرح عرفان ہوگا کہ انہوں نے کورا کی منشا سے جدا کوئی ایسا قدم اٹھایا تو کورا کو فیصلہ کرنے میں پل دو پل سے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ مولوی صاحب بس وقت طلب کرسکتے ہیں۔ اس توقع میں کہ نواب ہی نظر ثانی اور حجت سے باز آجائے اور

اس توقع میں کہ ممکن ہے' خود کورا نواب کے گھر والوں کے شوق و اشتیاق' ان کے حسن سلوک سے متاثر ہو کے کبھی اپنی روش بدل لے۔ آخر کسی دن تو اس کے خوابوں میں دراڑ پڑے گی۔ مولوی صاحب کچھ اسی سراب میں مبتلا ہیں جبھی انہوں نے اسے مجھ سے دور رکھا ہے۔ مجھے تو اب شبہ ہو رہا تھا کہ مولوی صاحب سرے سے حیدر آباد سے گئے ہی نہیں تھے' نواب نے مجھ سے اور پیرو سے محض داستان سرائی کی تھی۔ مولوی صاحب کی طرف سے عائد کیا ہوا انتظار جب حد سے سوا ہو گیا تو اسے ہمارا خیال آیا۔

میں جانے کہاں کہاں سرگرداں تھا' نواب کے اس اعلان پر میں ہڑبڑا گیا کہ ہم نے حسین ساگر عبور کر لیا ہے۔ میں نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ موٹر کی روشنی کے سوا باہر ہر سو اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ بنیائی کا تعلق صرف آنکھوں سے نہیں' دماغ سے بھی ہے۔ مجھے کچھ نظر نہیں آیا تھا کہ موٹر کب حسین ساگر سے گزری اور اب وہاں سے کتنی دور آچکی ہے۔

"یوں سمجھئے کہ ہم نے منزل کا بڑا حصہ طے کر لیا ہے۔" نواب تمتماتی آواز میں بولا۔

"چھوٹا بھی نکل جائے گا۔" بٹھل نے غم زدہ لہجے میں کہا۔

نواب نے پوچھا کہ کھانے پینے کی خواہش ہو تو کوئی چیز ڈکی سے نکلوائی جائے' بٹھل نے منع کر دیا۔ نواب نے شاید تکلفاً کہا تھا' دوبارہ کچھ نہیں پوچھا۔

موٹر کچھ اور آگے آئی تھی کہ پھر جھٹکے لینے لگی۔ ڈرائیور نے اندر بیٹھے بیٹھے کسی طرح قابو پا لیا لیکن میل ڈیڑھ میل کی دوری پر پھر وہی نقص پیدا ہونے لگا۔ نواب جھنجلا گیا۔ ڈرائیور نے دوبارہ کوشش کی۔ اس بار وہ کامیاب نہیں ہوا۔ نتیجتاً اسے موٹر سڑک کے کنارے کھڑی کرنی پڑی۔ قریب میں ایستادہ درختوں پر آباد پرندے پھڑپھڑانے لگے۔ ڈرائیور بونٹ کھولے جانے کیا کیا آلات چھیڑتا رہا۔ کئی مرتبہ اندر آکے اس نے چابی گھمائی۔ انجن میں گھڑگھڑاہٹ ہوتی اور بند ہو جاتا۔ نواب کی بے موقع تلخی ڈرائیور کے ہاتھ پاؤں اور گڑبڑائے دے رہی تھی۔ سڑک کے آس پاس اونچے اور گھنے درختوں نے اندھیرا گہرا کر دیا تھا۔ دور دور تک کسی بستی کے آثار نہیں تھے۔ جھینگروں اور مینڈکوں کا الاپ کچھ دیر کے لیے ٹھہر گیا تھا پھر انہوں نے اپنا واویلا شروع کر دیا۔

ڈرائیور کو وقت لگ گیا۔ اس دوران میں دو ایک موٹریں تیزی سے گزر گئیں۔ کسی نے رک کے ہم سے استفسار نہیں کیا۔ ڈرائیور اپنے سے جتن کر رہا تھا کہ مخا[لف] سمت سے آتی ہوئی ایک تیز رفتار موٹر ہم سے کچھ فاص[لے پر] جا کے ٹھہر گئی اور ہماری طرف واپس آنے لگی۔ [پچھلی] نشست پر ہندو مارواڑی سیٹھ قسم کا ایک فربہ اندام شخ[ص] بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی' گھونگ[ٹ] کاڑھے' سکڑی سمٹی' کونے سے چپکی ہوئی سیٹھ نے [موٹر] ہمارے پاس رکوا کے خرابی کا سبب جاننا چاہا۔ نواب نے مہربانی پر اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا' بظاہر کوئی خاص با[ت] معلوم نہیں ہوتی' وہ اپنا راستہ کھوٹا نہ کرے۔ پہلے بھی [اس] طرح کا رخنہ پیدا ہو چکا ہے' ڈرائیور موٹر کے کام [کی] شدبد رکھتا ہے' یقیناً درست کر لے گا۔ مارواڑی سیٹھ کی [موٹر] آگے چلی گئی۔

ڈرائیور پسینے پسینے ہو گیا تھا۔ پہلی مرتبہ نواب [بھی] پریشان دکھائی دیا۔ ہم تینوں موٹر سے اتر آئے۔ بیٹھے [بیٹھے] جسم اینٹھ گیا تھا۔ باہر آکے ہاتھ پاؤں کچھ کھلے۔ ٹھن[ڈی] ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی لیکن سردی نہیں تھی۔ نواب [نے] ڈکی سے ٹارچ نکالی اور اردگرد نظریں دوڑانے لگا "حس[ین] ساگر سے ہم کتنی دور آگئے ہوں گے؟" نواب نے ترشی [سے] پوچھا۔

ڈرائیور نے مسمسی آواز میں اسے بتایا کہ چھ سات [میل] سے زیادہ نہیں ہوئے ہوں گے۔

نواب کی چہل قدمی اور بار بار ٹارچ جلا کے اطراف [کے] درختوں پر روشنی کرنا اس کا ہیجان و اضطراب ظاہر کرتا [تھا]۔ "نواب صاحب ماجد علی مجن کا باغ یہاں سے کتنی د[ور] ہوگا؟" نواب نے ڈرائیور سے پوچھا۔

ڈرائیور نے تذبذب سے بتایا کہ زیادہ دور تو نہیں [ہونا] چاہیے۔

نواب خاموش ہو گیا۔ ڈرائیور نے ایک بار پھر چ[ابی] گھمائی۔ انجن بس جھرجھری سی لے کے رہ گیا۔ ڈرائیور ا[بھی] مایوس نہیں ہوا تھا۔ لگتا تھا' نواب ہمارے خیال سے [رکا] ٹھہرا ہوا ہے ورنہ ڈرائیور پر بری طرح گرجتا برستا۔ کچھ ا[ور] وقت گزرنے پر موٹر کی درستی کی کوئی شکل نہ نکلی تو نواب ا[کتا] گیا۔ اس نے ڈرائیور کو جھڑکتے ہوئے کہا "آگ دکھا[ؤ] اسے۔ مجن میاں کا باغ کہیں قریب ہی ہوگا۔ رات ہم ا[س] ویرانے میں تو نہیں بسر کر سکتے۔"

ڈرائیور نے سن لیا تھا لیکن آخری کوشش کے طو[ر پر] اس نے موٹر کی کچھ اور رگیں ٹٹولیں' کریدیں اور ا[گلی] نشست پر بیٹھ کر پہلے بسم اللہ پڑھی اور چابی کو گردش دی۔

ناکام رہا' بکھرا ہوا سامان سمیٹنے' پیچ کسنے اور ہاتھ صاف کرنے میں اسے مزید دس منٹ لگ گئے ہوں گے۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا جیسے ساری خرابی اسی میں ہو اور وہی موٹر ہو۔ نوکر اور اشیا میں ویسے بھی اتنا فرق نہیں ہوتا۔

نواب بٹھل کے ساتھ موٹر کے اردگرد چکر لگاتا رہا۔ اس کے چہرے پر خجالت تھی۔ اس نے متردد لہجے میں بٹھل سے کہا کہ فاصلہ کچھ کم ہوتا تو حسین ساگر کی طرف لوٹ جانا بہتر ہوتا۔ وہاں شب بسری کا اچھا انتظام ہو سکتا تھا لیکن اتنی دور اندھیری رات میں پیدل سفر کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ ادھر اطراف میں ریاست کے نامی گرامی نواب' نواب مجن میاں کی وسیع عریض جاگیر کا سلسلہ ہے۔ زرعی زمین' سبزہ زار' چراگاہیں اور باغات وغیرہ۔ سڑک کے کنارے واقع باغ میں مجن میاں کی ایک کوٹھی بھی ہے۔ ریاست کے امراو رؤسا کے علاوہ مجن میاں کے خاندان کے افراد اور خاص احباب سیر و تفریح کی غرض سے یہاں قیام کرتے ہیں۔ امکان یہی ہے کہ زیادہ دور نہ جانا پڑے' ممکن ہے' میل سے کچھ کم یا کچھ زیادہ۔ نواب نے بٹھل کو اطمینان دلایا کہ مجن میاں سے اس کے اچھے مراسم ہیں۔ وہاں چند ملازم مستقل طور پر تعینات ہیں۔ کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ کوٹھی میں مہمان ٹھہرے ہوں تو بھی گنجائش کم نہیں۔ رات کسی طرح گزار لیں' صبح منزل تک پہنچنے کا کوئی نہ کوئی بندوبست ہو جائے گا۔ خود اس کی زمین بھی یہاں سے سات آٹھ میل کے فاصلے پر ہوگی۔ بٹھل سنتا رہا۔ وہ کیا رائے دے سکتا تھا۔ سر ہلا کے اس نے نواب کی تائید کی۔

نواب نے ڈرائیور کو ڈکی میں سے ضروری سامان کے دو ایک تھیلے اور بندوق نکالنے کی ہدایت کی۔ ڈرائیور ڈکی کھول کے سامان منتخب کرنے اور تھیلوں میں ڈالنے کے لیے باہر نکال رہا تھا کہ سامنے سے ایک موٹر کی روشنیاں دکھائی دیں۔ ڈرائیور کے ہاتھ رک گئے۔ اس نے استفہامی انداز سے نواب کو دیکھا۔ نواب نے اسے اپنا کام جاری رکھنے کا حکم دیا۔ ہمارے قریب آتے آتے موٹر کی رفتار سست ہو گئی۔ آنے والی موٹر میں سوار لوگوں کو ہم دور سے نظر آرہے ہوں گے۔ ہم سے چند گز کے فاصلے پر سڑک سے ذرا ہٹ کے موٹر رک گئی اور بڑی روشنیاں بجھ گئیں۔ موٹر ٹھہرتے ہی جو شخص تیزی سے اترا' وہ ڈرائیور ہی ہو سکتا تھا۔ وضع قطع ہی شوفرانہ تھی۔ اس نے فکر مندی سے پوچھا "کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں" نواب کے لہجے سے بے زاری نمایاں تھی۔ "موٹر خراب ہو گئی ہے۔"

"کہاں جانا تھا آپ لوگاں کو؟"

"زیادہ دور نہیں" نواب نے تنک کے کہا "چلے جائیں گے ہم۔"

موٹر اتنی قریب نہیں تھی۔ اندھیرے میں پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے لوگ دکھائی نہیں دے رہی تھے۔ شاید ڈرائیور کے سوا اس میں کوئی نہیں تھا۔

"تمہارے ساتھ کتنے آدمی ہیں؟" بٹھل نے گونجتی آواز میں پوچھا۔

"اپن کے ساتھ تھوڑا سامان ہے اور ..." ڈرائیور ہچکچا کے بولا اور اپنی بات قطع کرکے اس نے پھر سوال کیا کہ آخر ہمیں کس طرف جانا ہے؟

"ہماری فکر مت کرو" نواب نے دخل دیا "ہم چلے جائیں گے۔"

ایک شخص نے اپنا وقت ضائع کیا' ہماری خاطر موٹر روکی۔ اس کے سلوک کے جواب میں نواب کی یہ ناسپاسی بہت نازیبا تھی۔ یہ کوئی نخوت تھی تو یہاں اس کا کوئی موقع نہ تھا مگر نوابوں کے لیے نخوت کے وقت تھوڑی مقرر ہوتے ہیں۔ بٹھل نے نواب کی کجی پر توجہ نہیں کی اور ڈرائیور سے پوچھا "تم نے ادھری نواب مجن کا باغ دیکھا ہے؟"

ڈرائیور نے انکار میں سرہلایا۔

"کتنی دور ہے پھر ادھری سے؟"

حیدر آباد میں انکار اقرار میں سرہلانے کی علامت بالکل الٹی ہے۔ سارے ہندوستان سے جدا' اس خالص حیدر آبادی طریقے سے بٹھل کو بھی واقفیت تھی لیکن اسے دیر میں یاد آیا۔

"ہم تلاش کرلیں گے' جناب! ہمیں معلوم ہے" نواب نے بہ عجلت کہا "اور اب شاید ہم اس طرف جائیں ہی نہیں' ممکن ہے' ہم حسین ساگر واپس چلیں" نواب نے ڈرائیور کو اپنا سفر جاری رکھنے کی تلقین کی اور بٹھل کا بازو تھام کے شاید کوئی اشارہ کیا' بٹھل بھی چپ ہوگیا۔ ڈرائیور چند لمحے ٹھہرا رہا' پھر اپنی موٹر میں جا بیٹھا۔ اسے اب رکنا نہیں چاہیے تھا تاہم اس نے موٹر فوراً نہیں چلائی۔ نواب کے رویئے سے اسے رنج ہوا ہوگا۔ موٹر کی آواز آئی اور زن سے یہ جا وہ جا والا تیور اس کے غصے کا مظہر تھا۔ کچھ دور تک موٹر کی عقبی سرخ روشنیاں نظر آتی رہیں۔ آگے شاید کوئی موڑ تھا اس لیے روشنیاں جلد اوجھل ہوگئیں۔

نواب نے گہری سانس لی' اطمینان کی سانس اور متانت سے کہنے لگا "آپ سوچ رہے ہوں گے' اس صورت حال میں ہم نے یہ موقع کیوں کھودیا؟"

"کچھ پلے پڑتا ہے صاحب!" بٹھل نے کہا۔

"اس علاقے میں طرح طرح کی داستانیں مشہور ہیں "آپ زیادہ جانتے ہو۔"

"ہا آں" نواب سنجیدہ ہوگیا "اصل میں ہم اسے ا منزل کے بارے میں بتانا نہیں چاہتے تھے۔"

"اپنے کو کیا پتا تھا صاحب!"

"بے شک" جیسے کوئی سن نہ لے' نواب ادھر ادھر د ہوئے دھیمی آواز میں بولا "آپ نے تو سادہ دلی میں پوچھا ت آپ نے غور نہیں کیا" موٹر ہم سے ایک فاصلے پر روکی تھی اور بتدریج آہستہ ہوئی تھی۔ ہمارے پاس اس کا اچا رکنا فطری عمل ہوتا۔ اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کی اجازت سے ڈرائیور باہر آیا ہوگا۔ اندر کوئی موجود تھا تو اس ہمارے پاس آکے یا وہیں بیٹھے بیٹھے ہمارا احوال جاننے کی نہیں کی۔ کسی نے کھڑکی سے سر نکال کے باہر جھانکنے کی زحمت نہیں کی۔ ممکن ہے' یہ سب ہمارا واہمہ ہو' بہرحا ایسے اندھیرے اور سناٹے میں احتیاط ہی بہتر ہے۔ ہمیں ذرا دشواری تو ہوگی۔ امید ہے' گھنٹے بھر سے پہلے ہم نوا مجن میاں کے باغ تک پہنچ جائیں گے۔"

نواب کی دیدہ ریزی و نکتہ آفرینی پر جرح کی گنجائش تھ لیکن بٹھل نے سادگی سے کہا "ٹھیک ہے صاحب!"

اس دوران میں ڈرائیور اپنا کام کرتا رہا۔ اس نے مو مقفل کردی تھی اور سارا سامان اٹھالیا تھا۔ میں نے اس بوجھ ہلکا کرنے کا ارادہ کیا لیکن نواب کے خیال سے ملتو کردیا۔ کسی نواب کی ہم رکابی میں اطوار بھی نوابوں جیسے ہ مناسب ہوتے ہیں۔

شروع میں ہماری رفتار ست تھی' بعد میں تیز ہوگئی۔ نواب ٹارچ جلا کے راستہ روشن کرتا جاتا تھا لیکن اب روشن کی ایسی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اتنی دیر میں ہماری آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہوگئی تھیں۔ آسمان پر ٹکڑوں ٹکڑوں میں بادل بکھرے ہوئے تھے اور دھندلی دھندلی چاندنی چاروں طرف بچھی ہوئی تھی۔ سڑک کے دونوں جانب فاصلے فاصلے سے اونچے درختوں کی قطاریں کھڑی تھیں۔ ہوا بھی بہت ہلکی تھی۔

ہم نے فرلانگ ڈیڑھ فرلانگ راستہ طے کیا ہوگا کہ نواب ٹھہر گیا اور چونک کر گھوم گھوم کے دیکھنے لگا "لیجیے' ہم نے خواہ مخواہ اتنا وقت ضائع کیا" وہ فرط حیرت سے بولا "یہ جو آپ فصیل جیسی دیوار دیکھ رہے ہیں' یہی نواب صاحب مجن

یاں کا باغ ہے۔ ہم آپ سے عرض کررہے تھے' کچھ ایسا دور نہیں ہونا چاہیے۔ یہ راستہ تو ہمارا خوب دیکھا بھالا ہے۔ تاریکی نے ہمیں بھٹکائے رکھا۔"

"اندھیرے اجالے کا کیا صاحب!" بٹھل نے تپی ہوئی آواز میں کہا "اجالا بھی دیدوں سے کم مستی نہیں کرتا۔ تھوڑا زیادہ ہو تو اندھا کردیتا ہے۔"

نواب نے شاید سنا نہیں۔ اسے خاص سڑک کے بائیں جانب والی سڑک پر جانے کی بے کلی تھی۔ باغ کی چار دیواری سی کے ساتھ تھی۔ نواب اسی طرف مڑگیا۔ اتنی جلدی منزل مل جانے کی خوشی سے اس میں پھرتی آگئی تھی۔

باغ کا وسیع آہنی دروازہ بند تھا۔ نواب نے سلاخوں سے ٹارچ کی روشنی پھینکی تو اندر جاتی ہوئی کشادہ سڑک چمک اٹھی۔ پھلواری کے حاشیوں کے بیچ میں بنی ہوئی سڑک کچھ دور جاکے بل کھاگئی تھی۔ پھلواری کے پیچھے دونوں طرف درختوں کے جھنڈ تھے۔ نواب دروازے کے پاس جاکے کچھ پیچھے ہٹ گیا۔ اندر دروازے سے ملحق کمرا دربان کے لیے مخصوص ہوگا۔ نواب کے اشارے پر ڈرائیور نے بڑھ کے سلاخوں پر کسی چیز سے ضرب لگائی۔ لمحوں تک بازگشت گونجتی رہی۔ ڈرائیور نے پھر ہانک لگائی "کوئی ہے' دروازہ کھولو' دروازہ کھولو۔"

کئی مرتبہ کی تکرار کے بعد اندر سے ایک پختہ اور کھردری آواز آئی "کون ہے؟ آتا ہوں' آتا ہوں۔"

دوسرے منٹ بعد ایک ہاتھ میں لاٹھی' دوسرے میں لالٹین اٹھائے چادر میں لپٹا ایک اوسط قد کا شخص دائیں طرف سے برآمد ہوا۔ اس نے سلاخوں سے جھانک کے دیکھا۔ ڈرائیور نے سرگوشیانہ انداز میں اسے کچھ بتایا۔ دربان نے لالٹین اونچی کرکے جب تک فاصلے پر کھڑے ہوئے نواب کی موجودگی کا یقین نہیں کرلیا' دروازے کے قفل کی طرف ہاتھ دراز نہیں کیا "سرکار ہیں؟" اس نے متجسس آواز میں پوچھا۔

چند قدم بڑھ کے نواب حاکمانہ لہجے میں بولا "ہاں' ہم ہیں نبی خاں! دروازہ کھولو' آج رات ہم یہیں بسر کریں گے۔"

"آیئے' آیئے سرکار!" نواب کی آواز سن کے دربان نے جھک کے سلام کیا اور دروازے میں پڑا ہوا تالا کھول دیا۔

کوٹھی دروازے سے خاصی دور تھی۔ دربان کی لالٹین اور نواب کی ٹارچ کی مدد سے پانچ چھ منٹ میں ہم کوٹھی کے سامنے پہنچ گئے۔ وہ شہروں کی طرح لال اور سفید پتھروں پر مشتمل' قدیم وجدید طرز کی ایک دومنزلہ عمارت تھی۔ نہ اتنی مختصر نہ اتنی بڑی۔ عمارت کے آگے وسیع چبوترے کے پار اس کے نصف حصے کے برابر بارہ دری کی طرز کا متعدد ستونوں پر اٹھا ہوا دالان تھا۔ دالان کے پیچھے اصل عمارت تھی۔ نواب نے ابتدا ہی میں دربان سے معلوم کرلیا تھا کہ کوئی مہمان تو ٹھہرا ہوا نہیں ہے۔ مہمان ہوتا تب بھی ایک رات گزارنے کے لیے وہاں جگہ کی کوئی کمی نہیں تھی۔ چبوترے کے کونوں پر نصب کھمبوں کے چند ٹمٹماتے لیمپ روشن تھے۔ اندر دالان میں بھی لیمپ کی روشنی تھی۔ دروازے سے عمارت تک دربان ہمارے ساتھ ہی آیا اور راہ داری میں جمے ہوئے صوفوں پر ہمیں بٹھا کے چلا گیا۔ ہمیں بس سانس لینے کی مہلت ملی تھی کہ ایک سن رسیدہ اور دوسرا ادھیڑ عمر شخص سٹپٹاتے قدموں سے ہمارے پاس آئے۔ تسلیم و تعظیم کے بعد ایک نے اندر جاکے راہ داری کے کچھ اور لیمپ جلادیے۔ عمارت میں بجلی نہیں تھی لیکن روشنی کا اچھا انتظام تھا۔ اندر دیوان خانے کی چھت میں شیشے جڑے ہوئے تھے۔ لگتا تھا' آسمان پرکندہ ستارے بہت نیچے آگئے ہوں۔ دیوان خانے کا ساز و سامان شاہانہ تھا۔ پردے' قالین' مجسمے' تصویریں' آئینے وغیرہ۔ یہ اشیا درمیان میں نہ ہوں تو آدمی' آدمی میں تمیز کیسے ہو۔ سن رسیدہ ملازم نے نواب سے پوچھا کہ وہ فرشی منزل میں شب بسری کرے گا یا بالائی منزل پر؟ نواب نے سوچنے میں ایک لمحے کا توقف نہیں کیا اور سر اٹھا کے بالائی منزل کی طرف اشارہ کیا۔ دیوان خانے کی صبح و شام صفائی کی جاتی ہوگی۔ صوفوں اور میزوں پر ذرا بھی گرد نہیں تھی۔ آئینے بھی دمک رہے تھے۔ بوڑھا ملازم ہمیں دیوان خانے میں بٹھا کے روشنیاں کرنے اور ہمارے آگے کی میز پر پانی کا جگ اور گلاس رکھنے میں سرگرم رہا' پھر مودبانہ کھڑا ہوگیا "بہت عرصے بعد آنا ہوا سرکار؟" اس کی جھرجھراتی ہوئی آواز میں حلاوت اور نفاست تھی۔ تخم تاثیر نہیں تو صحبت کا اثر بھی کم نہیں پڑتا۔

نواب نے بے نیازی سے کہا "ہاں قطبی میاں! عرصہ ہوگیا۔ مصروفیت زیادہ رہی۔"

"کھانے میں کیا لیجیے گا سرکار؟"

"کچھ نہیں' ہمارے پاس موجود ہے۔"

"جلدی تیار ہوجائے گا۔ مرغ' چاول یا کوئی اور چیز سرکار کو پسند ہو' سبزی' پراٹھے وغیرہ۔" قطبی میاں لکنت سے بولا۔

نواب نے استغنا سے کہا کہ وہ ڈرائیور سے سامان لے کے جلد از جلد کھانا لگانے کا اہتمام کرے' اچھے خدمت گار کا شعار کم سننا' کم بولنا بھی ہوتا ہے یا مالک کو کم زحمت کلام' کم زحمت سماعت دینا۔ پھر تو گونگے خدمت گار سب سے اعلیٰ ہونے چاہئیں۔ بوڑھا ملازم فوراً دیوان خانے سے نکل گیا۔ نواب کی پیروی میں ہم بالائی منزل پر آگئے۔ عمارت کے مختلف حصوں سے اسے خوب واقفیت تھی۔ ہرچند کہ ادھیڑ ملازم بھی رہ نمائی کے لیے پیش پیش تھا۔ بالائی منزل بھی آراستہ وپیراستہ تھی۔ نواب سیڑھیوں کے پاس پہلے کمرے میں داخل ہوگیا اور کہنے لگا کہ وہ ساتھ والے کمرے میں رہے گا۔ اگر میں اور بٹھل الگ الگ رہنا چاہیں تو تیسرا کمرا بھی کھلوایا جاسکتا ہے۔

بٹھل نے اچٹتی آواز میں کہا "سونا کدھری ہے صاحب!"

"کیوں' کیوں جناب!" نواب تعجب سے بولا "ابھی بہت رات باقی ہے۔"

"نکال دیں گے صاحب!"

"خدا ناخواستہ مزاج تو ناساز نہیں؟" نواب نے تشویش سے پوچھا۔

"پاس ہو تو صاحب سازی ناسازی بھی ہو۔"

نواب کو ہنسی آگئی "ہماری مراد ہے۔۔۔" اس نے خوش طبعی سے کہا "یہ نشیب و فراز' یہ حادثے تو زندگی کا حصہ ہیں۔ ایک رات کی بات ہے۔ کچھ آرام کرلیجئے گا تو صبح تر و تازگی رہے گی۔ یہ جگہ تو بنائی ہی گئی ہے آرام وسکون کے لیے۔ ادھر شہر میں تو زندگی روز بہ روز پیچیدہ ہوتی جارہی ہے۔ نواب صاحب مجن میاں نے یہاں آدمی کو فطرت کے قریب کردیا ہے۔ صبح یہاں کا منظر دیکھئے گا' دنیا ہی الگ ہے یہاں کی۔ پھول ہی پھول' رنگ برنگے اور سارے ہندوستان کے منتخب درخت۔ کسی گوشے میں جنگل کا نظارہ ہے تو کسی جگہ موسمی فصلوں کا سبزہ لہلہارہا ہے۔ تاروں کی باڑھ کے اندر خاص خاص جنگلی جانور بھی ایک حصے میں رکھے گئے ہیں۔ گو ان کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ ایک قدرتی جھیل' ایک نہر بنائی گئی ہے جو بل کھاتی ہوئی سارے باغ سے گزرتی ہے۔ مچھلیوں کا تالاب' پیراکی کا تالاب' ٹینس کورٹ' بلیرڈ روم۔ تقریبات کے لیے نیچے کا وسیع ہال' بارہ دری اور صحن۔ چند برس پہلے یہاں ایک محفل سخن کا اہتمام ہوا تھا۔ پھر مجرے کی ایک محفل آراستہ ہوئی تھی۔ نواب صاحب مجن کا شعری ذوق خدا کی پناہ' سریلے بھی بے حد ہیں۔ کمال کا ستار بجاتے ہیں۔ یہ ان کی نوازش ہے کہ ان رت جگوں میں ہمیں یاد رکھتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو جنگل میں منگل کا سماں ہو جاتا ہے۔"

دیکھنے اور بولنے کی طرح کاش آدمی کو اپنے کان بند کرنے کا اختیار بھی ہوا کرتا۔ سماعت بھی کبھی کیسا جبر ہوتا ہے۔ نواب ذوق و شوق سے باغ کا احوال بتاتا رہا۔ میں اور بٹھل بہ ظاہر اچھے سامع ہونے کا ثبوت دیتے رہے' نواب کہنے لگا "باغ کی حدود میں جو چھوٹی پہاڑیاں اور ٹیلے تھے انہیں جوں کا توں رہنے دیا گیا ہے۔ ان پر درخت لگاکے اور دل کش بنادیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ نواب صاحب مجن میاں کے احباب یہاں آنے کے لیے' یوں کہئے کہ ہمہ وقت ہمہ دم پر تولتے رہتے ہیں۔ اب کوئی دو ایک برس سے حضرت نواب صاحب کی توجہ اس طرف کچھ کم ہوگئی ہے۔ دو برس پہلے بیگم صاحبہ اچھی بھلی تھیں' ایک رات بلاوا آگیا۔ نواب صاحب مجن میاں بجھ سے گئے بہرحال۔۔۔" نواب تاسف سے بولا "اندھیرے کی وجہ سے ممکن ہے' آپ کو احساس نہ ہوا ہو' یہ عمارت سڑک کی سطح سے خاصی اونچائی پر ہے۔ ہم نے اسی لیے بالائی منزل کو ترجیح دی ہے۔ یہاں سے باغ کے سحرانگیز مناظر کی نظارگی کا لطف ہی کچھ اور ہے۔ اصل میں' صبح ہی آپ کو یہاں کی دل فریبی اور رنگارنگی کا صحیح اندازہ ہوسکے گا۔"

"اپنے کو ٹکنا ہی کتنا ہے صاحب!" بٹھل نے بہت دیر بعد زبان کھولی۔

"جی! جی ہاں' یہ تو ہے" نواب کی آواز ڈھلک گئی "ہم سے بھول ہوجاتی ہے۔ بے شک آپ کا دل و دماغ تو کسی اور طرف مرکوز ہے۔ یک سوئی اور ذہنی فراغت ہی میں سب کچھ اچھا لگتا ہے۔ ہم تو اپنی دھن میں بس۔۔۔" وہ شرمساری سے بولا "صرف ایک رات کی فصیل حائل ہے پھر۔۔۔"

نواب اٹھ گیا۔ اسے خیال آگیا تھا کہ اس نے ملازم قطبی میاں کو کھانا لگانے کا حکم جاری کیا ہے۔ وہ منہ ہاتھ دھونے کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد لمحوں تک میں اور بٹھل ایک دوسرے کا منہ تکا کیے۔ پھر بٹھل بھی اٹھ گیا۔ غسل خانہ کمرے سے پیوست تھا۔ نواب کے بہ قول کچھ تازہ دم ہوکے ہم کمرے میں واپس آئے تو قطبی میاں منتظر تھا۔ بالائی منزل ہی پر کھانے کا کمرا تھا۔ لیمپوں کی روشنی میں بلوریں میز جگمگا رہی تھی۔ کرسیاں بھی پھر شیشے کی ہونی چاہیے تھیں۔ وسط میں لٹکے ہوئے فانوس نے سارا کمرا منور کردیا تھا۔ کھڑکیوں پر ہلکے نیلے رنگ کے

ریشمی پردے سرسرا رہے تھے۔ ریشم' شیشے اور روشنی سے امارت کو خاص نسبت ہے۔ ادھیڑ ملازم' قطبی میاں کی معاونت کررہا تھا۔ کھانے کی چند ہی اقسام تھیں۔ نواب کو بھی بھوک نہیں معلوم ہوتی تھی' ہماری وجہ سے بیٹھ گیا تھا۔ قطبی میاں نے سارا کھانا بچ جانے پر دبے لفظوں میں حیرت ظاہر کی اور ناشتے کے لیے پوچھا "جو مناسب ہو' تیار کرلینا" نواب نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

نواب نے قہوے کی فرمائش کی تھی۔ قہوہ پی کے ہم کھانے کے کمرے سے باہر آگئے۔ بٹھل کو اس وقت جانے کیا سوجھی تھی۔ اس کے عمارت دیکھنے کے اشتیاق پر نواب کسی قدر جزبز ہوا تاہم ملائمت سے بولا "اس وقت کیا دیکھ پایئے گا۔ دن کی روشنی میں عمارت کے خال و خد کچھ نظر آسکیں گے۔" بٹھل بھی بچہ بن گیا تھا' کہنے لگا کہ صبح وقت ملے نہ ملے۔ نواب کو زحمت ہوگی۔ بہتر ہے' نواب آرام کرے اور کوئی حرج نہ ہو تو قطبی میاں کو ہدایت کردی جائے۔ قطبی میاں قریب ہی موجود تھا۔ اس نے بھی نواب کی تائید کی۔ بٹھل نے پھر ضد نہیں کی اور کہا جیسی منشا ہو۔ اس کی مراد کھانے کے بعد محض چہل قدمی سے ہے۔ نیچے صحن میں وہ کچھ وقت گزار لے گا۔ ظاہر ہے' نواب اور قطبی میاں کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ بٹھل نے منع بھی کیا لیکن نواب ہمارے ساتھ نیچے آگیا۔ ہم صحن کے چکر لگاتے رہے۔ سارا فرش سنگ مرمر کا بنا ہوا تھا۔ شبنم سے بھیگی ہوئی فضا میں سبزے' مٹی اور پھولوں کی ملی جلی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ رات کی رانی کی مہک سب پر غالب تھی۔ ایک ذرا چھیڑنے کی دیر تھی' نواب' نظام دکن کے خسروانہ مشاغل' محلات اور نوادر کے بارے میں رطب اللسان رہا۔ بٹھل نے دانستہ نواب کا شوق بیاں مہمیز کیا تھا۔ اس طرح کم از کم گھنٹا بھر تو گزر گیا ہوگا۔ گمان یہ ہو رہا تھا کہ بہت رات ہوگئی ہے۔ ہم واپس کمرے میں پہنچے تو بارہ بجنے میں ابھی چند منٹ باقی تھے۔ نواب کو بھی نیند نہیں آرہی تھی۔ کمرے میں آکے وہ کچھ پریشان و مضطرب سا دکھائی دے رہا تھا۔ بار بار گھڑی دیکھتا لیکن آدمی کی مرضی پر وقت کہاں گھٹتا' بڑھتا ہے۔ اپنے کمرے میں جانے سے پہلے اس نے بٹھل سے معلوم کیا کہ طبیعت موزوں ہو تو کیوں نہ بازی جمائی جائے۔ بٹھل نے سرد آہ بھر کے کہا کہ اب کہاں' کسی زمانے میں صبح و شام کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ مہرے جب خواب میں نظر آنے لگے تو دل کچھ مضبوط کیا۔ اب تو بساط چھوٹے زمانہ ہوگیا۔ قطبی میاں نے پانی سے بھرا ہوا جگ اور گلاس میز پر رکھ دیے تھے۔ ہم سے رخصت کی اجازت لیتے ہوئے اس نے صبح کی بیداری اور ناشتے کے اہتمام کا وقت پوچھا۔ بٹھل نے سب نواب پر ڈال دیا۔ قطبی میاں دروازے سے نکلتے نکلتے لوٹ آیا۔ وہ یہ بتانا بھول گیا تھا کہ نیچے زینے کے پاس برکت نامی ادھیڑ ملازم ساری رات چوکسی کرتا رہے گا۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو مسہری کے سرہانے لٹکی ہوئی ڈوری کھینچ لی جائے ورنہ ایک آواز پر وہ خدمت میں حاضر ہوجائے گا۔

نواب کا کمرا ہمارے کمرے سے جڑا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ دروازہ کھلا رکھے گا' کسی طرح کی الجھن ہو تو ذرا بھی تکلف نہ کیا جائے۔ بس ایک تھپکی بہت ہوگی۔ سفر میں اس کی نیند ایسی پختہ نہیں ہوتی' آہٹ پر آنکھ کھل جاتی ہے۔

"پکی نہ آتی ہو تو دھیان زیادہ رکھنا چاہیے صاحب!" بٹھل نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

ایک وقفہ استعجاب کے بعد نواب کے جسم میں لہر اٹھی "نہیں' نہیں" وہ کھل کھلاتے ہوئے کہا "آپ ہمارا خیال نہ کیجئے' ہمیں رات میں ویسے بھی کئی بار اٹھنے کی عادت ہے۔"

نواب خدا حافظ کہہ کے رخصت ہوگیا۔ کمرے کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ سبزے کی وجہ سے مچھروں اور کیڑے مکوڑوں کی افراط ہوگی اس لیے باریک تاروں کی جالیاں کھڑکیوں پر نصب کی گئی تھیں۔ بیچ میں سرہانے کے پاس رکھی ہوئی مختصر میز دونوں مسہریاں جدا کرتی تھی۔ لیمپ بھی اسی پر رکھا ہوا تھا۔ بٹھل نے روشنی کم کردی اور آہستگی سے بغل اور بازو کے درمیان لپٹی ہوئی پٹی سے تمنچا نکال کے تکیے کے نیچے رکھ لیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ بستر پر کمر ٹکاتے ہی تمنچا چبھنے لگا تھا۔ ہمیں پیٹیاں بھی اتار دینی چاہیے تھیں لیکن پھر صبح نواب یا کسی ملازم کی موجودگی میں انہیں دوبارہ کسنا بھی ممکن ہوتا یا نہیں بٹھل نے شاید اسی وجہ سے نہیں چھیڑا۔ لیٹے لیٹے مجھے دروازے کی چٹخنی چڑھانے کا خیال آیا۔ دوبارہ اٹھا ہی نہیں جارہا تھا۔ آدمی چلتا پھرتا رہے تو جسم بندھا ہوا' کھنچا ہوا رہتا ہے۔ بستر پہ آکے تو جیسے سارا کچھ بکھر جاتا ہے مگر میں نے ہمت کی اور اٹھ کے چٹخنی چڑھادی۔

باہر سبزہ زار سے اٹدتا ہوا جھینگروں اور مینڈکوں کا شور کمرے میں گونج رہا تھا۔ یہ شور سناٹا اور گہرا کرتا ہے۔ بٹھل نے چادر تان لی۔ ہلکی ہلکی سردی ہونے لگی تھی۔ ابھی تو بہت رات باقی تھی۔ میں اپنے آپ کو تسلیاں دیتا رہا' اور بہت سی راتوں کی طرح کسی نہ کسی طرح یہ رات بھی گزر جائے گی۔ وقت کے پھیروں کے بغیر شاید کوئی کام مکمل نہیں

ہوتا۔ ہر کام میں کوئی نہ کوئی وقت ضرور لگتا ہے۔ تمنچے سے گولی نکلنے، زخم مندمل ہونے، پھول کھلنے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کا وقت، چاہے فاصلہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو، غاروں سے شہروں تک کا جتنا سفر ہے، دیکھا جائے تو وقت بچانے، وقت بڑھانے کے سوا کچھ نہیں۔ پہیے کی ایجاد سے بے شمار اوزار و آلات تک آدمی کا مقصد کسی نہ کسی طور وقت پر دست رس حاصل کرنا ہی رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہیے، زندگی محفوظ کرنا، زندگی بڑھانا۔ بجلی کے چولھے بن گئے، گیلی لکڑیوں پر پھونکیں مار مار کے کھانا پکانے میں اب وقت برباد نہیں ہوتا۔ بٹن دباتے ہی اندھیرا ہٹ جاتا ہے، بٹن گھماتے ہی دور دراز کی آوازیں سنی جاسکتی ہیں، جو کہا جارہا ہے، ادھر سات سمندر پار اسی دم سنا جارہا ہے۔ پہلے کے مقابلے میں آدمی کے روزمرہ کاموں میں وقت کی کھپت میں بے شک بڑی کمی ہوگئی ہے لیکن یہ محض کمی و بیشی کی بات ہے۔ وقت یکسر ختم نہیں ہوا اور شاید کبھی نہ ہو۔ بٹن دبانے اور گھمانے کے لیے ایک عرصہ حرکت بہرحال لازم ہے۔ موٹر، ریل گاڑی، ہوائی جہاز میں سفر کرنے اور اردگرد نت نئی اشیا کا انبار لگانے کی تدبیر سے وہ جادوئی چراغ اور چھڑی والی بات پھر بھی پیدا نہیں ہوتی جو آدمی کو پلک جھپکتے میں سات دروازوں پار پہنچادے۔ آدمی کو اپنے کسی بچھڑے ہوئے سے ملادے یا اس کا پتا ہی بتادے۔ آدمی روشنیوں کا کیسا ہی ہجوم کرلے، رات رات ہی رہتی ہے اور اپنی گردش کے بعد ہی تمام ہوتی ہے۔ کوئی مشین ایسی نہیں بنی جو انتظار ختم کردے۔ انتظار میں کمی کے اسباب بہت ہوگئے ہیں لیکن انتظار تو موجود ہے۔

اور آدمی کتنا ہی وقت پر قادر ہوجائے، احساس، خواب اور خیال اس کے قابو میں نہیں آئیں گے۔ ان کی رفتار کا وہ ساتھ نہیں دے پائے گا۔ خیال کا کوئی موسم طے نہیں ہے، احساس کا کوئی وقت طے نہیں ہے۔ کاش ایسا ہوا کرتا کہ ادھر خیال آیا، ادھر ارادہ کیا، ادھر کام ہوگیا۔ جب تک آدمی، خیال، یاد اور غم جیسے معاملات پر گرفت حاصل نہیں کرلیتا، سب کچھ بے کار ہے۔ آدمی خود مشین بن جائے تبھی یہ ممکن ہوسکے گا۔

وقت سے آدمی کو کہیں مفر نہیں۔ وقت ہی سب سے بڑا عذاب، سب سے بڑی جاں کنی ہے۔ آدمی کی جانے کتنی زندگی اسی کے ہیر پھیر میں گزر جاتی ہے۔ جانے کب سے آدمی وقت سے نبرد آزما ہے۔ جو زیادہ سے زیادہ وقت پر قدرت رکھتا ہے، وہی سب سے امیر ہے، جسے زخم مندمل ہونے اور نقش مٹانے کے مراحل سے نجات مل جائے، بادشاہ ہوجائے۔ اصل میں پیسہ کمانے سے مراد بھی وقت درازی ہے۔ مال و زر تو ظاہری علامتیں ہیں۔ آدمی کا سے بڑا سرمایہ ہی وقت ہے۔ آدمی زیادہ سرمائے سے وقت خرید تا ہے۔ کس طرح محدود وقت میں تیز زندگی گز جائے اور زیادہ سے زیادہ آسودگی حاصل کی جائے۔ آدمی پاس بے حد و حساب وقت ہوتا تو اسے اتنی تگ و دو ضرورت تھی۔ آنے والے زمانے میں چیزیں اور بھی جائیں گی۔ آدمی وقت کو اور کھینچ تان لے گا۔ ہند گو عددی اعتبار سے یہی رہیں گے، ان کی قدر کچھ اور ہوجائے گی۔ بیتے ہوئے دنوں کے مقابلے میں ساٹھ معین زندگی میں آدمی کو زیادہ دیکھنے، سننے اور برتنے کا ملے گا، دگنا، تگنا، چوگنا، دس گنا لیکن وقت کے پیمانے بھی یہیں رہیں گے، پیمانے ٹوٹ نہیں جائیں گے۔ را پھر بھی رات رہے گی۔ لوگ تو پھر بھی روٹھتے بچھڑتے گے۔ بجلیاں آشیانوں سے گریزاں نہیں ہوجائیں گی۔ ز جتنی تیز رفتار ہوجائے گی، احساس بھی اتنا شدید ہوجائے زندگی جتنی سہل ہوجائے گی، انتظار اتنا ہی اذیت نا ہوجائے گا۔

"کیا ٹائم ہوا ہے رے؟" میں کہاں کہاں کے تا بانے ملا رہا تھا، خود کو تھپکیاں دینے کے لیے طرح طرح جواز تراش رہا تھا کہ بٹھل کی سرگوشی پر اچھل پڑا۔ اسے نہیں آرہی تھی۔ لیمپ کی روشنی بڑھا کے میں نے گھ دیکھی۔ ڈیڑھ بج رہا تھا۔ صبح ہونے میں ابھی کئی گھنٹے تھے۔ نے بٹھل کو بتایا تو وہ ایک لمبی سانس کھینچ کے رہ گیا۔

میں اس سے معلوم کرنا چاہتا تھا لیکن دماغ میں مربوط ہی نہیں ہو رہے تھے۔ نواب کا کمرا ملحق تھا۔ ہمار پھوسیاں شاید نامناسب ہوتیں اور مجھے جاننا بھی کیا تھا۔ طرح رات کا پہاڑ اسے بھی عبور کرنا تھا۔ ہم دونوں جیسے دوسرے سے کچھ چھپائے ہوئے بستر پر بھٹکتے رہے۔

کوئی گھنٹا بھر کے قریب گھڑی نے فاصلہ اور طے ہوگا۔ یکایک مجھے ایسا لگا کہ کمرے کے باہر راہ داری میں گزرا ہو، ایک ساتھ کئی قدموں کی سرسراہٹ۔ میری سا توانائیاں کانوں میں سمٹ آئیں۔ دروازے کے پار کوئی بھی ہوا تھا۔ کسی نے شکاری سی بھری ہو، پھر خاموشی گئی۔ ذہن کی ابتری میں کبھی اپنے سائے پر بھی شبہ ہوتا میں نے اپنا واہمہ سمجھ کے درگزر کرنا چاہا۔ مجھے یقین تھا، تصدیق کے لیے میں نے کروٹ بدل کے بٹھل کی طر یکھا۔ وہ بستر پر بیٹھا ہوا تھا۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے اس نے منہ پر انگلی رکھ کے خاموشی کی تاکید کی۔ بٹھل نے جیب سے چاقو نکال لیا تھا۔ میں یک لخت بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ باہر یقیناً کوئی موجود تھا۔ دوسرے لمحے آہستہ سے کسی نے دستک دی، ہم نے دوسری دستک کا انتظار کیا۔ اسی اثنا میں بٹھل مسہری سے اٹھ کے دبے قدموں چلتا ہوا دروازے کے پاس جا کے ٹھہر گیا۔ دستک دوبارہ گونجی۔

"کون ہے؟" بٹھل نے زیر لبی سے پوچھا۔

"دروازہ کھولیے سرکار!" کسی نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیا ہے؟" بٹھل نے تنک کے پوچھا۔

"خطرہ ہے سرکار!" باہر سے وہی سہمی ہوئی آواز گونجی میں، "میں برکت ہوں۔"

"نیچے جو ملازم چوکسی دے رہا تھا، قطبی میاں نے اس کا نام برکت ہی بتایا تھا، بٹھل بے پروائی سے بولا "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، سن لیا ہے۔"

بستر کے بائیں ہاتھ پر جو الماری ہے، اس سے تہ خانے کو رستہ جاتا ہے۔ آپ لوگاں ادھر چلے جائیں تو اچھا ہے، جلدی کریں صاحب! آپ کو مشکل ہو تو خادم اندر آکے بتائے" برکت نے ٹھٹکی ہوئی آواز میں بہ عجلت تمام کہا۔

ابھی وہ تلقین کررہا تھا کہ دروازے سے کچھ دور کھڑکی پر چرچراہٹ سی ابھری۔ چند ثانیوں بعد میری سمجھ میں آیا کہ انہوں نے تاروں کی جالی کاٹ دی ہے، دوسرے لمحے کھڑکی کے پٹ دھڑ سے کھلے، پردہ لکڑی سمیت زمین پر آرہا۔ جتنی دیر میں، میں لپک کے کھڑکی تک پہنچتا۔ ڈھاٹے باندھے ہوئے دو آدمی آناً فاناً اندر کود چکے تھے۔ ان کے کندھوں پر بندوقیں لٹکی ہوئی تھیں اور پلک جھپکتے میں انہوں نے اپنے ہاتھوں میں دبے چاقو کھول لیے تھے۔ میں ان کے سامنے پہنچ چکا تھا لیکن سنبھل کے مجھے ان پر جھپٹنے کا موقع نہیں ملا۔ کھڑکی سے کودنے کے بعد میری طرف بڑھنے کا وقت ان کے پاس تھا۔ میں نے طرح دے کے ان کی گرفت سے نکل جانے کی کوشش کی مگر فوراً ہی ان کے پیچھے دو اور آدمی کھڑکی سے کود پڑے۔ انہیں دیکھ کے میں کسی قدر متردد ہوا، بدحواس بھی۔ یہ ناگہانی کچھ میری عقل میں نہیں آرہی تھی۔ دونوں نے مجھے بازوؤں سے جکڑ لیا۔ ادھر بٹھل نے میری مدد کرنے کے بجائے دروازے کی چٹخنی کھول دی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی تین آدمی پاگلوں کی طرح گھس آئے۔ بٹھل آڑ میں ہوگیا تھا۔ انہیں اندازہ تھا کہ دروازہ کھولنے والا اسی فطری حرکت کا مرتکب ہوگا چنانچہ انہوں نے تیزی سے پلٹ کے بٹھل پر بندوق تان لی۔ بٹھل نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔

اندر کمرے میں آنے والوں کی تعداد سات ہوگئی تھی۔ وہ سب کے سب مسلح تھے۔ ان کے علاوہ باہر بھی ان کے کچھ اور آدمی ہوں گے۔ ان کے جسم گٹھے ہوئے تھے اور بازوؤں میں پھرتی تھی۔ ڈھاٹوں کی وجہ سے ان کی آنکھیں اور پیشانی کا کچھ ہی حصہ نظر آرہا تھا۔ وضع قطع سے وہ شوریدہ سر ڈاکو اور لٹیرے ہی لگتے تھے۔ کچھ اس طرح کے آدمی، جنہوں نے ابا جان کی حویلی پر یلغار کی تھی، اور کانتے جن کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔

برکت کا دروازے پر آنا شعبدہ کاری تھی۔ وہ برکت ہو بھی نہیں سکتا۔ اس سے تو نچلی منزل پر سب سے پہلے ان کی مڈبھیڑ ہوئی ہوگی۔ اوپری منزل پر دروازے سے کچھ دور ہی کھڑکی تھی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ اسی منزل پر برکت ہمیں متنبہ کررہا ہو اور وہیں موجود ان وحشیوں کی آنکھوں اور کانوں سے اوجھل رہا ہو۔ انہیں تو پہلے دروازے ہی کا رخ کرنا چاہیے تھا۔ ساتھ ہی انہوں نے محض دروازے پر اکتفا نہیں کیا۔ دروازے پر دستک دینے کا مطلب ہماری توجہ منتشر کرنا تھا کہ ادھر ہم برکت سے الجھے ہوئے ہوں، ادھر انہیں کھڑکی کے ذریعے کمرے میں داخل ہونے کے لیے زور آزمائی کی مہلت مل سکے، اور کیا معلوم ہم برکت کا نام سن کے دروازہ کھول ہی دیں۔ کھڑکی کی چٹخنی پہلے سے کھلی ہوئی تھی یا وہ اتنی کم زور تھی کہ ایک جھٹکے سے اکھڑ گئی۔ جس وقت میں نے دروازے کی چٹخنی چڑھائی تھی، میں کھڑکیاں بھی دیکھ لیتا تو شاید اندر گھس آنے میں وہ اتنی جلد کامیاب نہ ہوتے۔ کھڑکیوں پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ مجھے اس کا خیال ہی نہیں رہا۔ بہرحال اب اس پچھتاوے اور سوچ بچار کا کیا محل تھا۔ وہ اندر آچکے تھے۔ کھڑکی سے ان کے داخل ہونے پر بٹھل کو دروازہ کھول ہی دینا تھا۔ کچھ اسی طرح ان کی وحشت کم ہوسکتی تھی۔

بندوقیں کندھے سے اتار کے انہوں نے بٹھل کے آگے کردی تھیں اور یوں اسے بے دست و پا بنادیا تھا۔ مجھے پہلے ہی دو آدمیوں نے باندھ رکھا تھا۔ میں نے اول اول ذرا سی مزاحمت کی تھی، پھر بٹھل کو دیکھ کے بازو ڈال دیے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے حقارت سے بستر کی جانب دھکا دے کے مجھے چھوڑ دیا۔ میں فرش پر کمر کے بل گرتے گرتے بچا۔ کمر میں دائیں طرف مسہری کا پایہ لگا تھا۔ ذرا ترچھا رہا ورنہ میں بے حال ہوجاتا۔ بٹھل کو بھی انہوں نے اشارے

سے میرے پاس کھڑے ہوجانے کا حکم دیا۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں تمنچا بھی تھا۔ دو آدمیوں کے سوا باقی نے بندوقیں کندھے پر ڈال لیں۔ "اپن جو بولتے ہیں' اس کو کان کھول کے سنو' اپن کو مال چاہیے" ایک بھاری بھرکم اوسط قد آدمی آگے آکے درشتی سے بولا۔

"کیسا مال؟" بٹھل نے ناگواری سے پوچھا۔

"اپن سے زیادہ چکری نہیں چلے گا' سمجھا! جتنا مال ہے' ادھر سیدھی طرح سے آگے کردو۔"

"تم کو دھوکا ہوا ہے" بٹھل نے نرمی سے کہا "ہم مسافر لوگ ہیں۔"

"ادھر سارے مسافر لوگاں ہی حرام خوریاں کو آتے ہیں" وہی آدمی جھڑکتے ہوئے انداز میں بولا "سور کی چربی بہت پسند ہے نا تم لوگاں کو؟"

"پہلے ہماری بات سن لو" بٹھل نے تحمل سے کہا "راستے میں موٹر خراب ہونے سے رات بھر کے لیے ہم کو ادھری ٹھہرنا پڑا ہے۔ اپنے پلے کچھ نہیں ہے بھلے مانسو!"

"ایہہ! اپن کو زیادہ بولنا آتا ہے نہ سنتا" وہ ان کا سرغنہ ہی ہوگا جو بٹھل سے مخاطب تھا۔ اس نے چند قدم بڑھ کے بٹھل کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا اور جھٹکے دینے لگا۔ بٹھل سیدھا کھڑا رہا۔ اسے بٹھل کی سردمہری پر اور طیش آیا۔ گریبان سے ہاتھ ہٹا کے اس نے پانچوں انگلیاں پھیلائیں اور بٹھل کے منہ پر زور سے پنجہ مارا۔ بٹھل کے پاؤں زمین پر جمے رہنے سے سرغنہ کو ضرور تعجب ہوا ہوگا۔

اپنے سامنے کھڑے ہوئے دو آدمیوں کی پروا نہ کرتے ہوئے میں جست بھر کے سرغنہ کی طرف جھپٹا۔ میری آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا تھا۔ میں اس کا منہ نوچ لیتا کہ پیچھے سے کسی نے میری کمر پر بندوق کی بٹ ماری' ضرب اتنی شدید تھی کہ سارے جسم میں درد ابلنے لگا تھا۔ پھر بھی میں فرش سے اٹھ کھڑا ہوا لیکن انہوں نے فوراً مجھے قابو میں کرکے میرے بازوؤں میں قینچی ڈال دی اور کنپٹیوں پر مکے مارنے لگے۔ انہوں نے اپنے پیروں سے بھی میرے پیر کچلنے کے لیے ضربیں لگائیں۔

"ٹھہر کے رے!" بٹھل نے منہ بنا کے مجھ سے کہا اور سرغنہ سے بولا "تم کو جو چاہیے' آپ تلاشی لے لو' اپنے پاس تو اپنے سوائے کچھ نہیں ہے۔ جو جیب میں دھرا ہے' بولو تو اسی کو الٹ دیں۔"

"اس کو بھی دیکھیں گے' پہلے اصلی مال جدھر کو چھپایا ہے' وہ ہم کو بولو' تھوڑے دن دنیا میں ابھی اور مستی کرنا ہے تو مال اپن کو دے دو۔"

"مال کے بنا مستی کدھری ہوتی ہے سردار!"

"کیا! کیا بولا تم؟" سرغنہ بھن بھنا گیا۔ جیسے ہی اس کی سمجھ میں بٹھل کی بات آئی' اس کے منہ سے مغلظات جاری ہوگئیں۔

"ذرا ٹھنڈے ہو کے سردار!"

سرغنہ کا پارا اور چڑھ گیا۔ اس نے بٹھل کو مزید کچھ کہنے' صبر و سکون کی درخواست کرنے کی اجازت نہیں دی۔ زمین پر پیر پٹخ کے اس نے اپنی ہی ماں کو گالی دی اور کہنے لگا "تم لوگاں سمجھتے ہو' اپن ایسے ہی... ادھر کو آگئے ہیں۔"

"اپنے کو یہی لگتا ہے۔ ضرور تمہارے سے کسی نے مسخری کی ہے۔ ہم کوئی بیوپاری' نواب لوگ نہیں ہیں بادشاہ سلامت۔"

"یہ لوگاں ایسے نکو مانیں گے" سرغنہ کی آواز شدت غضب سے بھرانے لگی۔ اس نے پلٹ کے ایک نظر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ وہ اس کے پیچھے پر تولے' اشارے کے منتظر کھڑے تھے۔ دو نے مجھے تھام رکھا تھا' دو بند دروازے کے دائیں بائیں موجود تھے۔ سرغنہ نے ہاتھ کھینچ کے پوری طاقت سے بٹھل کو طمانچہ مارا۔ وہ مرکھنا سانڈ یقیناً کوئی پاگل شخص معلوم ہوتا تھا' لگتا تھا' جیسے اسے ہم سے کوئی بیر ہو۔ بٹھل کی وجہ سے میں نے ہاتھ پاؤں باندھ رکھے تھے... اسے پہلے ہی جان لینا چاہیے تھا کہ وہ کس درجے کے لوگ ہیں۔ طمانچہ کھا کے بھی بٹھل نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ اس نے منتشر ہاتھوں سے کرتے اور اندر پہنی ہوئی صدری کی جیبیں ٹٹولیں اور ریزگاری سمیت نوٹوں کی گڈی نکال کے سرغنہ کے پیروں میں ڈال دی۔ "اپنے پاس جو کچھ ہے' تمہارے آگے کردیا ہے۔" بٹھل نے بھنچی ہوئی آواز میں کہا۔

سرغنہ کا پھڑکتا ہوا جسم ایک لمحے کے لیے ساکت ہوا پھر ایک دم اس نے ٹھوکر مار کے گڈی پیروں سے دور پھینک دی اور فرش پر تھوک کے بولا "اپن کو الو کا پٹھا سمجھتا ہے کیا؟"

میری رگوں میں خون کھول رہا تھا۔ بہت ہوگیا تھا' بٹھل کو ان سے کسی شرافت اور گداز کی توقع تھی تو اب دماغ سے جھٹک دینی چاہیے تھی۔ میرا شبہ تو کچھ یقین میں بدلتا جارہا تھا۔ یہ وہی لوگ نہ ہوں جنہیں گزشتہ مرتبہ نوابوں نے ہیروں کے سراغ میں ابا جان کی حویلی سر کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ہم بھی اس وقت گنتی میں

کم نہیں تھے۔ نسبت کے مطابق ہی ان کی تعداد تھی۔ اگر یہ وہی لوگ ہیں تو مجھے اور بٹھل کو پہچان گئے ہوں گے۔ اس رات کی ناکامی اور شرمندگی کا صدمہ یہ زندگی بھر نہیں بھول سکتے۔ دوسری بار انہیں اتنا ہی مستعد اور وحشی ہونا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہزار احتیاط کے باوجود ہم ان کی نظروں کی زد پر رہے۔ ہمارا تعاقب کرتے کرتے آخر وہ یہاں تک پہنچ گئے۔ ممکن ہے' اس بار ان کی ڈوریاں نواب ثروت یار ہی کے ہاتھ میں ہوں' وہی اس لالہ زار ویرانے میں ہمیں کھینچ کے لایا ہو۔ شب بخیر کہتے وقت نواب نے کہا تھا کہ سفر میں اسے ٹھیک طرح سے نیند نہیں آتی۔ بار بار وہ اٹھ جاتا ہے' ذرا سی آہٹ پر آنکھ کھل جاتی ہے مگر اتنی دھماچوکڑی کے باوجود اب تک اس کی آنکھ کیوں نہیں کھلی؟ تانے بانے میں کوئی جھول نہیں ہے۔ میرا جسم اینٹھنے لگا تھا۔ سینے میں یہ وہم مسلسل پیوست ہوا جاتا تھا کہ کہیں وہ نواب ثروت یار ہی نہ ہو۔ نواب ذہن کا بڑا خلاق ہے۔ قماربازوں جیسی کچھ اس کی خو ہے۔ بہرحال اگر وہ نواب ثروت ہی ہے تو کیا فرق پڑتا ہے اور اگر وہ نہیں ہے تو اس جیسے کسی دوسرے نواب نے کرائے کے ان جنگلیوں کو ہماری طرف ہنکایا ہوگا۔ ہمیں تو کسی طور اس ناگہانی سے چھٹکارا حاصل کرنا تھا۔ میں نے خود کو باور کرانے کی کوشش کی کہ کسی بدگمانی پر آزردہ و کبیدہ ہونے کا یہ وقت نہیں ہے۔ صورت حال بھانپ کے نواب کہیں چھپ نہ گیا ہو۔ درپردہ وہ نہیں ہے تو سر پر منڈلاتا خطرہ سونگھ کے اس ہوش مند کو ادھر آنا بھی نہیں چاہیے۔ باہر رہ کے وہ ہمارے لیے زیادہ مفید ہوسکتا ہے۔ اس کے پاس بندوق بھی ہے تمنچا بھی ہوسکتا ہے۔ کسی طرح نیچے جاکے وہ کوٹھی کے ملازمین کو بیدار کرسکتا ہے۔ کچھ اور نہیں تو ملازم شور مچا کے ان لوگوں کو متزلزل کرسکتے ہیں۔

"مال کدھر کو رکھا ہے؟" بٹھل کو طمانچہ رسید کرکے سرغنہ نے وہی رٹ لگائی "صاف بولتا ہے کہ..."

"اپنی زبان تمہاری سمجھ میں نہیں آتی شاید۔"

"لگتا ہے' تم لوگاں کا وقت آگیا ہے۔"

"آگیا ہے تو ٹھیک ہے رے' تو اسے روک لے گا کیا؟" بٹھل کے لہجے میں پہلی مرتبہ تندی آئی۔

مجھے حیرت تھی بٹھل کو جانے کس بات کا' کس موقع کا انتظار تھا۔ کمرے میں ان لوگوں کی تعداد ابھی تک سات تھی۔ دیر کرنے سے تعداد بڑھ بھی سکتی تھی۔ یہ حقیقت مستزاد تھی کہ بندوقوں کے علاوہ ان کے پاس خنجر بھی ہیں۔

سرغنہ نے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے یکایک بٹھل کے پیٹ میں مکا مارنا چاہا۔ بٹھل کو کچھ اندازہ تھا' وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ سرغنہ کا غضب لازماً فزوں ہوجانا چاہیے تھا۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلا کے غراتا ہوا بٹھل کی طرف بڑھا۔ بٹھل اور پیچھے ہٹ گیا۔ سرغنہ کے بازوؤں میں کھڑے ہوئے دونوں آدمیوں نے بٹھل کو اپنی گرفت میں لینا چاہا۔ بٹھل پیچھے ہوتے ہوتے مسہری پر جاگرا۔ وہ دانستہ مسہری پر آیا ہوگا۔ اسی طرح تکیے کے نیچے سے تمنچا اور چاقو نکالا جاسکتا تھا مگر ان تینوں نے بہ یک وقت اسے دبوچ لیا' بالکل بچوں کی طرح۔ انہوں نے اسے کچھ سوچنے کا وقت ہی نہیں دیا۔ اس افراتفری میں تکیہ سرہانے سے ہٹ سکتا تھا۔ تمنچا اور چاقو ان کی نظروں میں آسکتے تھے۔ بستر پر آکے بٹھل نے مزاحمت کے بجائے ایک طرح سے سپر ڈال دی یا خود کو ان کے سپرد کردیا۔ اسی طرح ان جانوروں کے شکنجوں کی گرفت کمزور پڑسکتی تھی۔ ان تینوں نے بے تحاشا الٹے سیدھے ہاتھ چلانے شروع کردیے تھے۔ بٹھل کا سارا جسم وہ بری طرح مشق ستم بنائے ہوئے تھے۔ درندگی کا یہ طور ڈاکوؤں اور لٹیروں جیسا قطعاً نہیں تھا۔ ایسا تو بدترین نفرت اور پرلے درجے کی دشمنی میں ہوتا ہے۔ انہیں تو کسی حیلے حوالے سے مال کے بارے میں ہم سے کچھ اگلوانے کی تدبیر کرتے رہنا چاہیے تھا۔ بٹھل ساری ضربیں برداشت کرتا رہا اور مچلتا' تڑپتا ہوا اپنے جسم سے تکیہ ڈھانپنے میں کامیاب ہوگیا۔ مجھے بعد میں اندازہ ہوا کہ پہلے تو اسے کسی طرح تکیے کی جگہ محفوظ کرنی تھی۔ اس کے بعد ہی وہ ان سے نمٹنے کی کوئی سبیل کرسکتا تھا۔ اسی اثنا میں نواب کے کمرے کی جانب سے شور اٹھا' کسی نے زور سے ٹھوکر ماری' دروازہ چوپٹ کھل گیا۔ کنڈی کھلی نہ ہوتی تو چول اکھڑ جاتی۔ وہ نواب ثروت تھا جسے دو آدمی دھکیلتے' دھکے دیتے ہوئے کمرے میں لے آئے تھے۔ نواب کی حالت نہایت شکستہ تھی' سر کے بال بکھرے ہوئے' کرتے کا گریبان پھٹا ہوا' آنکھیں ابلی ہوئی۔ اتنی دیر میں اس کا کیا حال ہوگیا تھا "یہ ایک اور مردار اپن کو ادھر سے ملا ہے' حرام کا چھپا ہوا تھا" نواب کے بال پکڑ کے سر کو جھٹکے دیتے ہوئے ایک آدمی نے کہا۔

سرغنہ سمیت وہ تینوں جو بٹھل کو نشانہ بنائے ہوئے تھے' ٹھہر گئے "یہ' یہ کون ہے؟" سرغنہ نے پھنکارتے ہوئے پوچھا۔

"یہ بھی کوئی نواب کا تخم' نواب کا... لگتا ہے۔"

"ہا!" وہ تینوں بٹھل کو چھوڑ کے نواب کی طرف متوجہ ہوگئے "اور ابھی کتے جنگ بہادر ہیں ادھر؟"

"بس راجا!" نواب کو لانے والے آدمی نے کہا۔
"سارا دیکھ لیا ہے؟"
"نیچے اس چڑی مارنے بھی اتنے ہی لوگاں بولے تھے۔"
سرغنہ کے نتھنے پھول گئے "ہاں! نواب صاحب!" وہ نہایت سفلے پن سے نواب ثروت یار سے مخاطب ہوا "کدھر کو چھپ گئے تم؟"
"ہماری بات سنئے" نواب گھگھیانے لگا "خدا گواہ ہے' ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔"
سرغنہ بستر سے اٹھ کے نواب کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس نے نواب کی گدی پکڑ کے چہرہ اوپر کیا "لگتا تو اصلیچ ہے' دربار مارکہ۔"
"ہمیں اپنے اجداد' اپنے ماں باپ کی قسم۔ اگر آپ سمجھتے ہیں' ہماری تحویل میں کوئی خزانہ ہے تو یہ خدا ـــ" نواب نے شدومد سے التجا کی۔
سرغنہ لحوں تک نواب کے روبہ رو کھڑا اسے گھورا کیا "انوں کون لگتے ہیں تمہارے؟"
"یہ ہمارے مہمان ہیں جناب! ہم انہیں ان کے بچھڑے ہوئے رشتے دار سے ملانے لے جارہے تھے۔ راستے میں موٹر خراب ہوگئی۔ قریب ہی نواب صاحب مجن میاں کا یہ باغ تھا اس لیے ہم یہاں چلے آئے" نواب نے ساری روداد ہکلا ہکلا کے سرغنہ کے گوش گزار کی۔
"وہی رام لیلا!" سرغنہ نے دہاڑ کے کہا "اپن کو مال چاہیے۔"
"ہم آپ کو' آپ کو کس طرح یقین دلائیں" نواب نے فریاد کی "ہمارے پاس جو کچھ ہے' وہ بے شک آپ لے سکتے ہیں' آپ کا ہے۔"
"کیا ہے تمہارے پاس؟" سرغنہ نے حقارت سے پوچھا۔
نواب نے کرتے کی بغلی جیب سے گلے کا ہار نکالا "یہ سچے موتیوں کا ہار ہے اور یہ' یہ انگوٹھیاں۔ اس میں سے ایک تو ہمارے والد محترم کی نشانی ہے" اس نے جلدی جلدی اپنی انگلیوں سے دونوں ہیرے جڑی انگوٹھیاں اتاریں "کچھ نقدی بھی ہے شیروانی کی جیب میں ہماری۔ یہ سب آپ کی نذر ہے' بندوق بھی آپ لے لیں۔ اور یہ سونے کے بٹن بھی ـــ"
سرغنہ نے نواب کے ہاتھ سے ہار اچک لیا۔ انگوٹھیوں پر ایک ہوسناک نگاہ ڈال کے اس نے قریب کھڑے ہوئے ساتھیوں کی طرف اچھال دیا "اصلی مال بولو کدھر ہے؟"
نواب نے ٹوٹی پھوٹی آواز میں اسے یقین دلا[نے کی]
کوشش کی اور عاجزی سے بولا "ہر چیز آپ کے سامنے [ہے]
آپ خود تلاشی لے سکتے ہیں۔"
"تم میں خلیفہ کون ہے؟"
"خلیفہ! ہم آپ کا مطلب نہیں سمجھے؟" نوا[ب]
اضطراری لہجے میں بولا "آپ کو یقیناً بڑی غلط فہمی ہوئی [ہے]
جناب!"
"اپن پہلے کیا بولے' بولے کہ زیادہ بات بالکل [نہیں]
چاہیے۔"
نواب نے یہی بہتر جانا کہ خاموش ہو جائے۔ سرغنہ
کشمکش سے دوچار سرنگوں نواب کے سامنے کھڑا رہا'
جانے اس کے جی میں کیا سمائی' وہ معًا پلٹ کے مجھے اور بٹھ[ل]
کو شعلہ بار نظروں سے دیکھنے لگا اور اس نے میری اور نو[اب]
کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جیلے پن سے کہا "انوں چھو[ٹے]
بڑے سرکار کی خدمت میں بعد کو حاضری دیں گے' وہی!
اپن کو انوں میں پورا حرام زادہ دکھائی دیتا ہے۔"
بٹھل بستر پر تکیے کی جانب کہنی کے سہارے ترچھا
تھا' نہ پائے رفتن نہ جانے ماندن والی کیفیت' بہ ظاہر مدا[فعت]
یا بے چارگی کی حالت میں' بہ باطن پا بہ رکاب۔ اس
تعینات دونوں آدمی بھی مسہری سے ایک قدم کے فاص[لے پر]
کسی نئے ستم کے لیے جیسے تازہ دم ہو رہے تھے۔ سرغ[نہ کا]
اعلان سن کے کہ اسے پہلے بٹھل ہی سے بازپرس کرنی پڑ[ے]
گی' انہیں بس اپنے سالار کے پاس آنے کا انتظار [تھا]
نواب کی طرف سرغنہ کے متوجہ ہو جانے کی وجہ سے میں
نہیں سکا کہ اس دوران بٹھل کو تکیے کے نیچے سے تمنچا
چاقو نکالنے کا موقع مل سکا یا نہیں۔ سرغنہ کو اپنی جانب
دیکھ کے بٹھل نے بستر سے اٹھ جانے کے ارادے سے
بدلا۔ ابھی وہ پوری طرح نہیں اٹھ پایا تھا کہ دونوں آدمی
پر ٹوٹ پڑے مگر بٹھل نے طے کر لیا تھا کہ اسے مسہری
بہر صورت اٹھ جانا چاہیے۔ تھوڑی سی مزاحمت اور کسی
زور کے نتیجے میں اس نے فرش پر پیر جما لیے۔ دونوں آدمی
کو بھی مسہری پر دھینگا مشتی پسند نہیں ہوگی۔ ان کے چہر[وں]
سے بھی اطمینان جھلکتا تھا۔ بٹھل نے فرش پر آتے
مدافعت ترک کر دی۔
اسی لمحے سرغنہ بھی اس کے سامنے پہنچ گیا۔ دونو[ں]
آدمیوں نے بازو میں بازو ڈال کے اسے اس طرح جکڑ رکھا
کہ سرغنہ جہاں چاہے' بٹھل کے جسم پر ضربیں لگا[ئے]

"اوئے' یہ گدھ کی اولاد تو بہت پھدکتا ہے" سرغنہ نے بے دریغ اس کے منہ پر مکا مارا۔ بٹھل نے نڈھال ہو کے گویا [داد]ے داد دی۔ اس کی اس خستہ و شکستہ حالت سے دونوں آدمیوں کی گرفت بھی ست پڑ جانی چاہیے تھی۔ سرغنہ نے دوبارہ ہاتھ اٹھایا کہ اچانک بٹھل فرش سے اچھلا۔ مشکیں باندھنے کی مانند دونوں آدمیوں نے اس کے گرد اپنے بازو اور جکڑنے' کسنے چاہے ہوں گے۔ ان کا یہ اضطراری رد عمل ہی کچھ ان کے لیے برا ہوا۔ ان کے سان و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ ناگہاں بٹھل کے فرش سے اچھلنے سے کیا مراد ہے۔ ایک دو پل کی مدت میں' دوبارہ فرش پر پیر ٹکاتے ہی بٹھل نے پوری طاقت سے ان کے بازوؤں کو جھٹکا دیا۔ دونوں کی ہڈیاں اپنی جگہ سے ہٹ گئی ہوں گی۔ ان کے حلق سے اٹھنے والی چیخوں سے یہی ظاہر ہوتا تھا۔ بٹھل کے ہاتھ آزاد ہوگئے تھے۔ سرغنہ پر حیرت کا عالم طاری ہوا۔ اس نے چاقو یا تمنچا نکالنے کے لیے جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ یہ وقت اس کام کا نہیں تھا۔ اتنی دیر میں بٹھل ہاتھ پھیلا چکا تھا۔ واپس سمیٹتے ہوئے دونوں ہاتھوں میں اس نے فاصلہ رکھا تھا' ترچھے بھی رکھے تھے۔ ایک سرغنہ کی پیشانی پر بھوں کے نزدیک دوسرا گردن میں پیوست ہوا۔ سرغنہ کی بینائی ضرور متاثر ہوئی ہوگی۔ اس کے قدم زمین سے اکھڑ گئے۔

دروازے پر کھڑے ہوئے مجھے اور نواب کو اپنی تحویل میں لیے ہوئے سارے آدمی بٹھل کی طرف دوڑ پڑے۔ کمرے میں افراتفری مچ گئی تھی۔ انہیں دوسرے ہی لمحے خیال آیا کہ میں اور نواب تو تنہا رہ گئے ہیں اور دروازہ بھی خالی ہو گیا ہے۔ درمیان میں ایک نے دوسرے کو ٹوکا' کسی حد تک دونوں میں چپقلش رہی کہ کون کہاں جائے۔

میرا کام آسان ہو گیا تھا۔ میں تو پہلے ہی بٹھل کے اشارے کا منتظر تھا۔ ان میں سے ایک آدمی مجھے' دوسرا نواب کو قابو کرنے کے لیے پلٹ آیا' تیسرا دروازے پر گیا' باقی تین بٹھل کی طرف بڑھ گئے۔ مجھے جلد ہی کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ جو آدمی مجھے تھامنے آیا تھا' میں نے اسے آنے دیا۔ اس نے میرے شانے پر پنجہ مارا تو بھی میں نے اسے نہیں روکا۔ اس کی آنکھیں سامنے بٹھل پر جھپٹتے ہوئے اپنے ساتھیوں میں الجھی ہوئی تھیں کہ میں نے نیچے سے یکایک اس کی ٹھوڑی پر ضرب لگائی۔ اس کی زبان دانتوں میں آجانی چاہیے تھی' ممکن ہے دانت بھی ٹوٹے ہوں۔ دونوں ہاتھوں سے منہ پکڑ کے وہ بلبلانے لگا۔ میرا دل چاہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں بھی انگلیاں گڑو دوں۔ آدمی کچھ دیر کے لیے ضرور اندھا

ہوجاتا ہے۔ ہاتھ صحیح پڑجائے تو وقت کا شمار مشکل ہے لیکن میں نے خود کو باز رکھا۔ اسے جلد ہی بے دم کردینا مناسب تھا۔ سو میں نے گردن کے نیچے' اس کی کمر پر ریڑھ کی ہڈی کی طرف وار کیا۔ وہ واویلا کرتا ایک جانب بھاگا مگر درد و کرب کی وجہ سے ابھی دور تک نہ جاسکا تھا کہ میں پھر اس کے سر پر پہنچ گیا اور ابھی وہ زمین پر کھڑے رہنے کی ناکام کوشش کررہا تھا کہ پیٹ میں گھٹنے کی ضرب نے اسے دوہرا کردیا۔

دروازے کی نگرانی کرنے والا شخص زیادہ دیر وہاں ٹھہرا نہیں رہ سکتا تھا۔ میں بھی اس پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ نواب پر قابض آدمی کو ناچار نواب کے پاس ہی ٹھہرے رہنا تھا۔ میری جانب بڑھتا تو نواب کھلا رہ جاتا۔ میں نے دیکھا تھا کہ نواب نے شروع میں اس سے کچھ حجت کی تھی بلکہ اسے اپنی طرف آتا دیکھ کے بھاگنا چاہا تھا لیکن پھر نواب پسپا ہوگیا۔ اس نے اچھا ہی کیا' مشتعل ہوکے اس پر مسلط آدمی کوئی بھی کاری وار کرسکتا تھا۔ نواب نے دیکھا یا نہیں' میں نے بہرحال اسے ضبط و تحمل کا اشارہ کیا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ نواب اڈے پاڑے کا آدمی نہیں ہے۔ شکار اور بندوق کے نشانے پر چابک دستی اور چیز ہے۔ اڈے کا آدمی تو ہر وقت نشانے پر رہتا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق دروازے پر کھڑے ہوئے آدمی سے برداشت نہ ہوسکا۔ اپنے ساتھی کو میری دست برد سے بچانے کے لیے اس نے جست لگائی۔ خنجر بھی اس نے نکال لیا تھا۔ میرے دماغ میں یہی آئی کہ میں اس کے ڈولتے' ڈوبتے ہوئے ساتھی کو اس کے آگے کردوں۔ اس طرح اس کے فیصلے کی قوت بکھر جائے گی اور مجھے اس کا خنجر والا ہاتھ قابو میں کرنے کا موقع مل جائے گا' سینے میں یا شانے میں کسی جگہ۔ وہ عین وقت پر ایک قدم پیچھے ہوگیا۔ سنبھل کے اب اسے مجھ پر حملہ کرنا چاہیے تھا۔ میرے پاس بھی اس خنجر بہ دست سے دو بہ دو ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

ہمارے درمیان فاصلہ بھی ایسا زیادہ نہیں تھا۔ ایسے مرحلے پر ایک آزمودہ حربہ یہی رہ جاتا ہے کہ لمحے لمحے بعد مخالف کو مختلف تاثر دیا جائے۔ اسی میں کوئی موقع نکل آتا ہے۔ میں نے بائیں جانب' جہاں سراسیمہ نواب کھڑا تھا' قدم بڑھائے۔ اس کا رخ بھی اسی طرف ہوا لیکن مجھے ادھر جانا ہی نہیں تھا۔ میں نے پینترا بدل کے بٹھل کی سمت بھاگنے کا تاثر دیا۔ ایک عام خنجرباز کی طرح اس نے یہی اخذ کیا کہ میں باربار اسی طرح تیزی سے رخ بدلنے کا فریب کرسکتا ہوں۔ وہ مجھ پر خنجر بھی نہیں پھینک سکتا تھا کیونکہ میں اس کے کراہتے ہوئے نیم جاں ساتھی کے آس پاس منڈلا رہا تھا اور اس پار بٹھل سے اس کے ساتھی نبرد تھے۔ نشانہ خطا ہونے کی صورت میں اسے پشیمانی کی م بھی نہ ملتی۔ مجھے توقع تھی کہ وہ فاصلہ کچھ اور کم کرے گ خنجر والا ہاتھ ادھر ادھر لہرا کے مجھے بھی متذبذب کر کوشش کرے گا بلکہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں بدلنے کی مہارت بھی آزمائے گا۔ اس نے تقریباً یہی کیا خنجر ایک ہی ہاتھ میں رکھا اور وہی گھماتا' لہراتا رہا۔ وہ تن دہی سے اس عمل میں مصروف تھا کہ دفعتاً میں بیٹھ اسے مجھ سے یہ توقع ہرگز نہ ہوگی۔ ایک خاص رویا دھ اس اچانک تبدیلی سے نمٹنے کے لیے بڑی مشاقی درکار ہے۔ اس کے لیے اب سنبھلنا مشکل تھا۔ وہ منتشر ہوا اس نے گم کردہ راہ' زیر دام خود کھنچے آنے والے شکا طرح مجھ پر خنجر اتارنے کے لیے اپنا ہاتھ دراز کیا' حالا اسے ہاتھ اوپر لے جانے میں وقت نہیں گنوانا چاہیے اس مختصر وقفے میں مجھے اس کی ٹانگوں تک اپنے پھیلانے اور جھٹکا دے کے اس کے پاؤں زمین سے ا دینے تھے۔ وہ لوٹ جاتا تو ٹھیک رہتا۔ میں نے ایڑی نزدیک اس کی ٹانگیں اپنے پنجوں میں جکڑیں تو وہ بری بوکھلا گیا اور ہڑبڑاہٹ میں ترچھے ہوتے وقت اسے اپنے والے ہاتھ پر اختیار نہ رہا۔ پسلیوں کے قریب خنجر کی اس کی جلد کے پار ہوئی ہوگی۔ وہ تڑپتا ہوا اپنے ساتھ گرا۔ اس خوں گشتہ پر مزید وار کرنا مناسب نہیں تھا لیکن اڈے کا صحن نہیں تھا۔ زخمی شیر کیا' زخمی گیدڑ سے بھی غا نہیں ہونا چاہیے۔ اس کی دوبارہ بیداری زخم کی نوعیت مشروط تھی اور مجھے اس کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ مجھے فوراً ب کی طرف جانا تھا۔ ایک دو ضربوں میں مجھے یقین ہوگیا کہ ا وہ تادیر بے حواس رہے گا۔ اس کی چیخ وپکار ختم ہونے میں اسی میں الجھا رہا۔

نواب ثروت یار پر متعین آدمی بہت مضطرب ہ ہوگا۔ میری دانست میں نواب سے بری الذمہ ہوجانا اس لیے آسان نہیں تھا۔ نواب کو ترک کردینے کا مطلب ہما تعداد میں ایک تہائی اضافہ کرنا تھا۔ وہ ایک کام البتہ کر تھا کہ کچھ دیر کے لیے نواب کو بے دست وپا کردے اور کمک کے طور پر بٹھل کو نرغے میں لیے ہوئے ا ساتھیوں میں شامل ہوجائے۔ شاید اس نے نواب کو اس نہیں چھیڑا کہ اپنے ساتھیوں کی تعداد اور ان کے پاس مو ہتھیاروں سے وہ ابھی تک پرامید تھا۔ نواب کو وہ کسی

...ے خاموش کرسکتا تھا' نواب کی حالت تو ویسے ہی بڑی ابتر ی۔ تاہم یہ اندیشہ ہر لحظے موجود تھا کہ اپنی جگہ کھڑے لڑے وحشت میں وہ آدمی کہیں خنجر نہ اچھال دے یا بندوق تان لے۔ ابھی تک اس کے محتاط رہنے کی وجہ یہی ہوسکتی ی کہ بندوق سے نشانہ لینے یا خنجر سے شست باندھنے میں لمحوں کے لیے سہی' اسے نواب سے بے نیاز ہونا پڑتا۔ ری اور بٹھل کی فعالی و مستعدی ہی اسے حیرت سے دوچار یے ہوئے ہوگی۔ ذرا سی رعایت ملنے پر نواب بھی رنگ بدل کتا تھا۔ ادھر سامنے ہر پل زاویہ بدل جاتا تھا۔ نواب کو چھوڑ ے نشانہ لینے یا بٹھل کو زیر کرنے کی تگ ودو میں مصروف پنے ساتھیوں میں شامل ہونے کا فیصلہ کرنا خاصا دشوار تھا مگر ے کے! جلد ہی اسے غلط یا صحیح' کوئی قدم اٹھانا تھا۔

اس سے پہلے اگر میں اس کے سر پر پہنچ جاؤں' اسے اب کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے میں مشکل پیش آرہی ہے یا اس سے پہلے کہ وہ نواب کے سلسلے میں کسی وحشیانہ دام پر آمادہ ہوجائے' مجھی کو نواب کی فکر کرنی چاہیے۔ اب کی نجات سے مراد ان کے ایک آدمی کی کمی' ہمارے یک آدمی میں اضافہ ہے۔ سو میں نے دروازے والے آدمی ے نمٹ کے بٹھل کے پاس جانے کے بجائے نواب کی رف جانے کا ارادہ کیا۔ میرا اندازہ تھا کہ اس پر حاوی آدمی یا زیادہ وقت صرف نہیں ہوگا۔ مجھے نزدیک پاکے نواب بھی کچھ حوصلہ پکڑے گا اور کسی قدر ہاتھ پاؤں چلا کے اس کے لیے انتشار کا باعث بنے گا۔ میں نے نواب کی طرف قدم بڑھا دیے تھے لیکن جیسے کسی نے میرے پیروں میں زنجیر ڈال دی۔ مجھے تقدیم و ترجیح کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔ ادھر بٹھل کے گرد تو چھ آدمی ہیں' گو تین ابتدا ہی میں ہوش وحواس سے ری ہوچکے ہیں لیکن کسی کی بھوبھل میں چنگاری بھڑک سکتی ہے۔ فرش پر الٹے سیدھے پڑے ہوئے آدمیوں کے پاس بندوقیں بھی ہیں۔ کوئی بھی ان میں بچی کھچی توانائی سمیٹ کے کھیل سکتا ہے۔ شکست خوردہ قمارباز کی طرح جو آخر میں اپنے آپ کو بھی داؤ پر لگادیتا ہے۔ میں نے پلٹ کے بٹھل کا رخ کیا مگر جاتے جاتے ٹھہر گیا۔ اندھادھند بڑھ جانے سے بہتر تھا کہ اچھی طرح ایک نظر سامنے کا احوال آنکھوں میں اتار لیا جائے۔ میں نے دیکھا کہ ایک شخص پیٹ میں زانو پیوست کیے فرش پر لوٹ رہا ہے۔ یقیناً ابتدا کے تین آدمیوں میں سے کوئی ایک اٹھنے میں کامیاب ہوگیا تھا اسی لیے بٹھل کے گرد بھنکتے' پھڑپھڑاتے آدمیوں کی تعداد اب تین ہی تھی۔ ان کے ہاتھوں میں کھلے خنجر تھے اور ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ بٹھل کو چیرپھاڑ ڈالیں۔ ایسے وقت بٹھل کو اپنے مقابل میں مطلوبہ احساس جگانے کا ملکہ تھا۔ مجھے معلوم تھا' کسی اچھے داؤ یا پینترے پر وہ مخالف کو واجبی داد و ستائش سے نوازنے کی گنجائش نکال لیتا ہے۔ دو ایک بار کے اس واقعے کا بھی میں شاہد تھا کہ ہاتھ اٹھا کے اس نے مخالف کو ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور اسے اس کی غلطی سے آگاہ کیا۔ اس کے اس طرز عمل سے مقابل میں اصول و آداب کا لحاظ اجاگر ہوتا تھا' اس میں ایک انفعالیت پیدا ہوجاتی تھی یا اس کا غصہ بڑھ جاتا تھا اور وہ دیوانہ ہونے لگتا تھا۔ بٹھل کو کسی ایک موقع کی جستجو رہتی تھی اور وہ اسے جلد ہی مل جاتا تھا۔ اڈے پر وہ اپنے آدمیوں سے یہی کہا کرتا تھا کہ پھرتی' زور اور ہنرمندی پہلی چیز ہے مگر حاضری کے بغیر سب کچھ ادھورا ہے۔ حاضری سے اس کی مراد تھی دماغ کی حاضری' زور آزمائی کے دوران میں جسم کے دیگر اعضا اور دماغ کا توازن۔ وہ اسے تال میل کہتا تھا۔ جیل میں شولی اس کے جسم کی مالش کیا کرتا تھا۔ بٹھل کی فرمائش پر وہ ساز بھی بجاتا تھا۔ گانا بھی اسے خوب آتا تھا۔ استاد کی اتنی خدمت کے باوجود شولی' کانتے اور اڈے کے ایسے ہی دوسرے آدمیوں کا مثیل نہ بن سکا۔ بٹھل اس پر خفا ہوتا تھا۔ "بل کرتے وقت کیوں سر سے اتر جاتا ہے رے۔ اس کی تو ہر وقت ضرورت پڑتی ہے" شولی کی خامی اس کی بے توازنی تھی۔ وہ کبھی بہت جلدی کردیتا' کبھی اس سے دیر ہوجاتی۔ رتنا نے بٹھل کی عدم موجودگی کے دوران میں اڈے پر حملہ کیا تو شولی بھی کام آگیا۔ شولی نے ضرور قبل از وقت یا بعد از وقت کوئی غلطی کی ہوگی۔

بٹھل ان تینوں کو اطراف میں گھما رہا تھا۔ پلک جھپکتے میں وہ رخ بدل لیتا۔ وہ ایک دوسرے سے بھڑ جاتے یا پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوجاتے۔ وہ شدید برہم نظر آتے تھے' بٹھل کو باربار بھپکیاں دیتے۔ وہ بھی بس بٹھل کی کسی ایک کوتاہی کے سراغ میں سرگرداں تھے۔ بڑے بڑے تال میل کے پکے' ہنرمندوں' پختہ کاروں سے چوک ہوجاتی ہے۔ یہ پہلو بٹھل کے ذہن میں غالباً ہر وقت موجود رہتا تھا۔ وہ کہتا تھا' کبھی اپنا کھونٹا' بھی دھوکا دے سکتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ مسہری کے قریب ایک طرف پڑا ہوا سرغنہ بھی کلبلا رہا ہے۔ ہوسکتا ہے' وہ اتنا ناچار نہ ہو جتنا ظاہر ہورہا تھا۔ وہ چپکے چپکے اپنے بند باندھ رہا ہوگا۔ اس کا اچانک اٹھ کھڑا ہونا خارج از امکان نہیں تھا۔

آنکھوں کو بھی شاید سانس لینے کی ایک مہلت چاہیے یا گزشتہ کو فراموش کرنے اور درپیش موجودہ جذب کرنے کے

لیے جنبش ابرو کا ایک مرحلہ لازم ہے۔ میں نے کسی تماشائی کی طرح ایک لمحے توقف کیا ہوگا کہ تیزی میں پیچھے سے ایک کی کمر پر ضرب لگائی۔ ضرب ہلکی رہتی تو بھی وہ سٹپٹا جاتا۔ وہ جیسے ہی مڑا، میں نے اس کی کلائی گرفت میں لے لی۔ جھٹکے کے علاوہ میں نے اس کا ہاتھ بھی پوری قوت سے مروڑ دیا تھا۔ اس کی چیخ سے جیسے در و دیوار بھی چونک پڑے۔ ہرچند خنجر اس کے دوسرے ہاتھ میں تھا لیکن اس افتاد سے خنجر چھٹ جانا یقینی تھا۔ اس کے قریب دو ساتھی بھی میری اس غیر متوقع دخل اندازی سے دگرگوں ہوئے۔ دونوں کی توجہ مجھ پر مرکوز ہوئی تو وہ موقع نسبتاً وقت سے کچھ پہلے بٹھل کے ہاتھ آگیا جس کا وہ متلاشی تھا۔ اس نے جھپٹ کے ایک کے کندھے سے بندوق کھینچ لی اور اسی کو زور سے بٹ ماری۔

میرا بھی یہی خیال تھا کہ بندوق ہاتھ میں آتے ہی بٹھل بٹ گھمائے گا لیکن یہ جان کے میری آنکھیں کھلی رہ گئیں کہ اس نے اپنی جگہ چھوڑ دی ہے اور نواب کی طرف دوڑ چکا ہے۔ بٹھل کو گھیرے میں لیے ہوئے تین آدمیوں میں سے ایک تو میری ضرب اور بازو اکھڑ جانے کی وجہ سے ناکارہ ہوگیا تھا۔ اس پر توجہ دینے کے بجائے بٹھل نے نواب کا رخ کیا۔ تیسرے کے دماغ نے بروقت کام کیا۔ اس نے دروازے کی جانب بھاگنا شروع کردیا۔ دونوں باتیں ممکن تھیں۔ اسے یا تو باہر نکل جانا تھا یا ایک فاصلے پر جا کر بندوق سنبھالنی تھی۔ چند لمحوں کے لیے نواب کو بے بس رکھنے والا آدمی میرے ذہن سے محو ہوچکا تھا۔ بٹھل نے اس کا کوئی ارادہ بھانپ لیا ہوگا جبھی اس نے نواب کی طرف جانے کا فیصلہ کیا۔ ویسے بھی ادھر بٹھل کی جگہ میں آہی چکا تھا اور یہاں صرف ایک شخص اپنے پیروں پر قائم رہ گیا تھا۔ وہ بھی اب دروازے پر چلا گیا تھا۔ نواب پر مسلط آدمی آخر نواب کو تنہا چھوڑنے پر مجبور ہوگیا۔ اس نے یہ ارادہ بٹھل کو اپنی طرف بڑھتا دیکھ کے کیا یا اس سے پہلے، یہ میں نہیں دیکھ سکا۔ ایک دو لمحوں میں ادھر سے بٹھل، ادھر سے وہ، دونوں ایک دوسرے کی جانب امڈے تھے۔ بیچ میں دونوں کی مڈبھیڑ ہوئی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ اس سے الجھے بغیر بٹھل جھکائی دے کے اس کے راستے سے ہٹ گیا اور اس نے نواب کے پاس جا کے بندوق تان لی "ٹھہرو!" اس کی دھمکتی ہوئی آواز کمرے میں گونجی "ایک دم ٹھہر جاؤ" کسی نے ذرا بھی الٹا سیدھا کیا تو نواب ثابت نہیں ملے گا۔"

اس اثنا میں دروازے پر جانے والے آدمی کو قابو میں کرنے کے لیے میں پر تول چکا تھا۔ بٹھل کی آواز نے میرے پاؤں لڑکھڑا دیے، میرا سارا وجود ڈگمگا گیا۔ نواب کے پا سے جانے والا آدمی بھی اپنی جھونک میں مسہری تک جا پلٹ گیا تھا اور اس نے بندوق اٹھالی تھی۔ دروازے پ ٹھہر کے اس کا ساتھی بھی بندوق اٹھا چکا تھا۔ سرغنہ بھی ا کے بیٹھ گیا تھا۔ نواب بٹھل کی زد پر تھا۔ اس کی آنکھیں پھ ہوئی تھیں اور وہ اکڑ سا گیا تھا۔

"ہم نے کیا بولا ہے، سارے اوزار ہتھیار پھینک نہیں تو پھر ادھری کوئی بھی نہ رہے گا" بٹھل نے گرج ہوئے دوبارہ تنبیہہ کی اور نواب کی کنپٹی پر بندوق کی نال ر دی۔

کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ ایک زخمی کی کراہ ضرور بلن ہوئی، پھر موت کی خاموشی طاری ہوگئی۔

میری سانسیں سینے میں اٹک گئی تھیں۔ ایک لمحے کو مجھے ایسا لگا جیسے میں اندھا اور بہرا ہوگیا ہوں، میری بینائی او سماعت ضرور کسی سراب سے دوچار ہے۔ بٹھل کا دما پھر گیا ہے یا میرا۔

سرغنہ نے اشارہ کیا یا نواب نے، میں نے کچھ نہیں دیکھا۔ نواب کے پاس سے مسہری تک جانے والے او دروازے پر ٹھہر جانے والے نے اپنے ہتھیار پھینک دیے مجھے کچھ ہوش آیا۔ بٹھل کی ہدایت پر میں نے حسب سا کسی معمول کی طرح اوندھے سیدھے پڑے ہوئے لوگوں ک بندوقیں اور خنجر جمع کرنے شروع کردیے۔ جانے کس طر میں نے یہ کام انجام دیا۔ ہتھیار اکٹھے کرکے میں نے ایک کونے میں ڈال دیے اور اسی جانب خاموش کھڑا ہوگیا۔

کسی کے لیے بھی ایسے عالم میں اپنے آپ کو منضبط او مستحکم رکھنا شاید ممکن نہ ہوتا، پھر اس شخص کے لیے بش ہونے کی شرط ضروری نہیں سمجھنی چاہیے۔ میں نے امکا بھر کوشش کی کہ جو سامنے ہے، وہی حاصل ہے۔ میرے ل اسی میں بہتری ہے کہ کسی رد و قدح کے بغیر موجود پر اپ حواس مرکوز رکھوں چاہے یہ دلیل و تاویل سے کتنا ہی زا ہو۔

"سارے حرام کے جنوں کو اٹھا کے ادھری سے نکل جاؤ" بٹھل نے سرد لہجے میں کہا "ابھی اسی وقت! نہیں تو۔"

ابھی وہ یہ کہہ رہا تھا کہ کمرے میں بجلی سی چمکی۔ یکایک مسہری کے قریب سے کسی نے خنجر پھینکا۔ بٹھل اچھل کے نواب کے پہلو میں ہوگیا۔ دوسرے ہی لمحے نواب کی چیخ بلند ہوئی۔ بٹھل نے عین وقت میں اسے کھینچنا چاہا تھا لیکن سرگرفتہ نواب جانے کیا سمجھا۔ درون خانہ اس کے ہاں ایک

طلم برپا ہوگا۔ اس نے جانا کہ بٹھل نے اس کے لیے کوئی طے کرلیا ہے۔ یہ مزاحمت نہیں تھی، اپنے آپ کو بٹھل کسی ممکنہ عتاب سے بچانے کے لیے اس نے دوسرے رے کے قریبی دروازے کی طرف جانا چاہا۔ اتنا وقت ں تھا۔ خنجر کو چند گز کا فاصلہ عبور کرنا تھا۔ بٹھل اس کا ھ چھوڑ دیتا تو شاید نشانہ اتنا کاری نہ ہوتا مگر یہ بٹھل کے میں نہیں رہا تھا۔ نواب کے دائیں میں بغل کے قریب، ے اوپر خنجر پیوست ہوا تھا۔ وہ چکرا کے وہیں ڈھیر ہوگیا۔

کمرے میں سبھی کچھ درہم برہم ہوگیا جیسے آگ لگ گئی یا سانپ نکل آیا ہو۔ وہ دونوں جو پوری طرح زمین پر ڑے ہونے پر قادر تھے، بے محابا نواب کی جانب لپک ے۔

"ادھری کوئی نہیں، کوئی نہیں" بٹھل نے دہاڑ کے کہا سارے ایک طرف کو ہوجاؤ، دیوار کے ساتھ۔"

میں بھی جست لگا کے اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اس نے ھتکارنے کے انداز میں مجھے دور ہوجانے کا حکم دیا۔ میرے سان ہی جاتے رہے تھے۔ کمرے میں ان کتوں کی موجودگی ے میں تو بالکل غافل ہوگیا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ ان کے ہتھیار ایک کونے میں پڑے ہیں اور میری ذرا سی ک سے وہ ان تک پہنچ سکتے ہیں۔ خود میرے پاس بھی کوئی تھیار نہیں تھا۔ میں نے اسی انبار سے ایک بندوق اور حتیاطاً ایک خنجر بھی اٹھالیا۔ دروازے پر جانے والا آدمی بھی سہری کے پار اپنے ساتھی کے پاس چلا گیا تھا۔ بٹھل کے حکم کے مطابق انہیں دیوار کے ساتھ لگ کے کھڑا ہوجانا چاہیے ا۔ میں نے ان کے قریب ہو کے یہی اشارہ کیا۔ انہوں نے چھ تامل کیا تھا کہ میں نے بندوق کی نال ایک کے سینے میں ھونک دی۔ خنجر کی ضرب اتنی شدید نہ ہوتی، وہ سینہ پکڑ کے رش پر گرا اور گٹھری بن کے لوٹنے لگا۔ دوسرا سٹپٹاتا ہوا یوار تک چلا گیا۔ میرے تو جی میں آئی تھی کہ ایک ایک رکے سبھوں کو گولی ماردوں۔

سرغنہ کھڑے ہونے کی کوشش میں کراہنے لگا لیکن جیسے یسے اس نے خود کو قدموں پر بحال کرلیا۔ ان میں سے کسی ر کے پاس خنجر یا تمنچا ہو سکتا تھا اور پھر کسی کا دماغ الٹ کتا تھا۔ وہ میری ہی غلطی تھی، ہتھیار سمیٹتے وقت میں ان کی لاشی بھی لے لیتا تو شاید یہ سب کچھ یوں نہ ہوتا۔ فرداً فرداً ان کے لباس ٹٹولنے کی احتیاط کا اب یہ محل نہیں تھا۔ میں ے ارادہ کیا تھا لیکن پھر میں ٹھہر گیا۔ میں بالکل اکیلا تھا۔ ٹھل ادھر نواب کے جسم سے ابلتا خون روکنے، کم کرنے کے جتن کررہا تھا۔ نواب اپنے ہی خون میں نہا گیا تھا۔ بٹھل کے کپڑے بھی رنگ گئے تھے۔

سرغنہ پر دیوانگی طاری ہوئی۔ اس کے منہ سے مغلظات جاری ہوگئیں۔ جس آدمی نے نواب پر خنجر پھینکا تھا، وہ نزدیک ہی تھا۔ سرغنہ اس کے بال پکڑ کے جھٹکے دینے لگا اور اس نے اسے بری طرح گھونسے اور طمانچے مارنے شروع کردیے۔

"اس کو چپ کرلا ڈلے!" بٹھل نے غضب آلود لہجے میں کہا۔

میری انگلی ٹریگر پر گئی تھی لیکن یہ تو اس کے لیے ایک طرح نجات کی صورت ہوتی۔ میں نے بندوق الٹی کرکے بٹ مارنے کے لیے جیسے ہی اوپر کی، وہ بلبلانے لگا اور بٹھل سے فریاد کرنے لگا "اب کیا رہ گیا ہے سرکار! اپن کو جو چاہے سزا دے لینا، تھوڑا اپن کو وخت دو" اس نے اپنی ماں کی قسم کھا کے بٹھل سے التجا کی کہ اسے نواب کے پاس آنے دیا جائے، وہ بٹھل کا ہاتھ بٹا سکتا ہے۔ اس نے ہاتھ جوڑ کے کہا کہ اس سے یا اس کے کسی ساتھی سے اب کوئی لغزش ہو تو سب کو کتوں کے آگے ڈال دیا جائے۔

بٹھل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے دیوار سے ٹیک لگا کے نواب کو بٹھا دیا تھا۔ نواب کا گریبان بھی اس نے پھاڑ دیا تھا اپنے کرتے سے خون صاف کرکے وہ اس کے زخم کی نوعیت جانچنے میں منہمک تھا۔ نواب کی آنکھیں پتھرا پتھرا جاتی تھیں تاہم اس کی بے ترتیب سانسوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ ابھی وہ ہوش میں ہے۔ سرغنہ کے واویلا پر بٹھل کو طیش آگیا "تجھ کو کیا بولا رے!" اس نے بھڑکتی ہوئی آواز میں مجھے مخاطب کیا "ماردے گولی سور کے بچے کو۔"

سرغنہ کو خاموش کرنے کے لیے میں پہلے ہی بندوق اٹھا چکا تھا لیکن وہ اسی دم نیچے بیٹھ گیا اور میرے پیر پکڑ کے آہ و بکا کرنے لگا "اپن کو ایک دم فنا کردینا، بالکل نہیں چھوڑنا، اپن کی یہی سزا ہے، پر تھوڑا وخت کی بھیک دو داتا! تم کو اپنی ماں، اپنے رسولؐ کی قسم" وہ ہذیان بکنے اور اپنا سر پیٹنے لگا۔

میں نے بہ مشکل اس کے پنجوں سے اپنی ٹانگیں آزاد کرائیں اور ٹھوکر مار کے اسے دور کیا۔ میں نے طے کرلیا تھا، اس نے پھر وہی چیخ پکار کی تو جیسا کہ بٹھل نے کہا ہے، مجھے وہی کرنا پڑے گا۔ سرغنہ نہیں مانا، کھڑے ہو کے وہ پھر میری طرف بڑھنا چاہتا تھا کہ میں نے ٹریگر پر انگلی رکھ دی مگر معین وقت کی بھی کوئی حقیقت ہے۔ اس کی ڈوریاں ٹوٹنے میں بس ایک دو پل کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ جانے کیوں اسے اس نزع

وکرب' نالہ وفریاد کی حالت میں گولی مارنے پر میرا دل آمادہ نہ ہوا۔ شاید اس لیے بھی کچھ دیر لگی' اور اچھا ہوا۔ اس سے پہلے کہ میں دوبارہ اپنا عزم استوار کرتا' بٹھل نے مجھے روک لیا "آنے دے مردار کو ادھری" بٹھل کی زہریلی آواز سرغنہ کے لیے تریاق ثابت ہوئی۔

اس نے بھی سن لیا تھا۔ اس کا جسم مائل بہ پرواز پرندے کی طرح پھڑکنے لگا اور مسہری پھلانگ کے وہ لڑکھڑاتا' ڈگمگاتا ہوا بٹھل کے پاس پہنچ گیا۔ جاتے ہی اس نے سجدے کے انداز میں بٹھل کے پیروں پر سر رکھ دیا۔ کئی اور ساتھیوں کی طرح اس کا ڈھاٹا پہلے ہی کھل چکا تھا۔ چادر بھی اس نے اتار کر ایک طرف پھینک دی۔ چند لمحوں میں وہ اور بٹھل ایک دوسرے کے پرانے شناسا دکھائی دیتے تھے۔ بٹھل کی ہدایت پر وہ مسہری کے پاس رکھا ہوا لیمپ اٹھا لایا۔ بٹھل نے مٹی کے تیل سے نواب کا زخم صاف کیا۔ زخم گیری کے ساتھ اندمال کا ہنر بھی اسے اچھا آتا تھا۔ انہیں کوئی ریشمی کپڑا نہیں مل رہا تھا۔ سرغنہ کے دماغ نے کام کیا۔ اس نے کھڑکی پر لٹکا ہوا ریشمی پردہ کھینچ لیا اور بٹھل کے اشارے پر لیمپ کی لو سے اسے جلا دیا۔ سارے کمرے میں کپڑا جلنے کی بو پھیل گئی۔ ریشم کی یہ راکھ بٹھل نے بہ عجلت نواب کے زخم میں بھر دی۔ مٹی کے تیل ہی سے بڑی حد تک خون رک گیا تھا۔ راکھ نے دو آتشے کا کام کیا ہوگا۔ بٹھل کو خوب احساس ہوگا کہ یہ ایک عارضی چارہ گری ہے۔ خنجر تیر کی طرح آیا تھا۔ نواب کا زخم خاصا گہرا ہونا چاہیے۔ اسے زخم دوزی کی' باقاعدہ علاج کی ضرورت تھی۔ اتنی رات گئے اس دور افتادہ مقام پر بہ ظاہر کسی طبیب کے جلد مل جانے کا امکان نہیں تھا۔ دیوار کے ساتھ کھڑے ہوئے دو آدمیوں کے سرگرم ہوجانے کا اب اتنا خدشہ نہیں رہا تھا۔ میں ان سے نگاہ ہٹا کے بٹھل اور نواب کی جانب بھی دیکھ سکتا تھا۔ اسی دوران میں مسہری پر پڑی ہوئی اوڑھنے کی چادر میں ان کے ہتھیاروں کی گٹھری بنانے کا موقع مجھے میسر آگیا۔ ان کی دست رس میں اب اتنی آسانی سے ہتھیار نہیں آسکتے تھے۔ پیر سے کھسکا کھسکا کے میں نے گٹھری مسہری کے نیچے کردی۔

فرش پر جابجا سرخ دھبے پڑے ہوئے تھے۔ خون سے میرے پاؤں بھی سن گئے تھے۔ نواب کے علاوہ سرغنہ کے خنجر گشتہ ساتھیوں کا خون بھی اس میں شامل تھا۔ ان کی پرسش کرنے والا کوئی نہ تھا۔ کثرت سے خون نکل جانے کی وجہ سے اب وہ تقریباً بے حس وحرکت ہوگئے تھے۔ ممکن ہے' کسی ایک میں تاب استقامت ہی نہ رہی ہو۔ میرے جی میں آیا تھا کہ ان کے دو پوری طرح ثابت وسالم آدمیوں سے اپنے بلب ساتھیوں کی دیکھ بھال کے لیے کہوں' ذرا سی توجہ شاید کسی کے دن بڑھ جائیں۔ نواب نہیں تو کیا ہوا' آدمی بھی ہیں۔ میں چپ کھڑا رہا۔ بٹھل سے پوچھے بغیر انہیں کوئی رعایت دینا مناسب نہیں تھا۔ ہرچند سرغنہ بٹھل پاس چلا گیا تھا کہ دریں حالات یہی ایک بہتر طریقہ تھا کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ باقی ساتھیوں کے لیے اپنے سرخیل کی یہ قلب ماہیت کس قدر سزاوار اعتنا ہے۔

نواب کو فرش پر لٹا کے بٹھل نے کہیں سر اٹھایا گہری سانس لے کے سرغنہ سے پوچھا کہ باہر اس کے کتنے آدمی موجود ہیں۔ سرغنہ کے جواب پر کہ نیچے صرف آدمی چوکسی دے رہے ہیں' بٹھل نے اس سے گردونواح میں کسی وید حکیم کے بارے میں استفسار کیا۔ سرغنہ وپیچ میں پڑ گیا تھا کہ بٹھل نے اسے نواب کا ڈرائیور بلا کے لیے کہا۔ میں نے سرگوشیانہ لہجے میں اسے ٹوکا کہ باغ سے دور خراب حالت میں کھڑی ہے۔ بٹھل نے بات سنی ان سنی کردی۔ سرغنہ فوراً باہر نکل گیا۔

باہر جاکے' ظاہر ہے' اپنے ساتھیوں سے اس کا لازم ہے۔ سرغنہ کے کہنے کے مطابق' اگر وہ دو سے نہیں ہیں تو بھی نہتے نہ ہوں گے۔ انہیں ساتھ لے بندوقیں تانے وہ دندناتا ہوا کمرے میں واپس آسکتا اس سے اچھا موقع اسے کیا ملے گا' پھر وہی سب کچھ تو جسم شل ہونے لگا تھا۔ ہاتھ پاؤں میں جیسے دم ہی نہ رہا ادھر سرغنہ کو اپنے زخمی ساتھیوں کا بھی کچھ خیال ہوگا ضروری نہیں کہ ڈرائیور اسے فی الفور مل جائے۔ ہو ہے' نچلی منزل کے بجائے عمارت سے ایک فاصلے پر ملازموں کے حصے کی طرف ہو۔ باغ کے ملازم اگر سرغنہ محرم اسرار نہیں ہیں تو اسے وہاں تک جانے میں پس وپیش ہوگا۔ سرغنہ کو باہر بھیجنے کی کیا تک تھی؟ بٹھل مجھ سے کہنا چاہیے تھا۔ میری عدم موجودگی میں وہ میری کمرے میں موجود لوگوں پر نظر رکھتا اور میں ڈرائیور بازیابی کے علاوہ ملازموں کے حصے کی طرف جاکے کسی کے بغیر انہیں بیدار کردیتا۔ بہرحال سرغنہ اب باہر جاچکا اور بٹھل کو ان عواقب کا احساس دلانے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔

وہ نواب کے پاس سے اٹھ گیا۔ تکیے کے نیچے سے نکال کے اس نے کمر کی پیٹی میں اڑسا' چاقو جیب میں واسکٹ پہنی' پھر میرا تمنچا اور چاقو بھی اس نے میری طرف

مارا۔ بندوق مسہری پر رکھ کے میں نے بھی اس کی پیروی کچھ معلوم نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ کاش بٹھل کو خیال کہ کبھی اس کی خاموشی دوسرے کو کیسا شکستہ کردیتی ہے۔ باہر نکلنے کی تیاری تھی مگر واپس حیدرآباد کے سفر کے لیے کی مرمت بھی تو شرط تھی۔ اس وقت سڑک پر موٹروں کی آمدورفت نہ ہونے کے برابر ہوگی۔ کسی سے مدد لینے کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ سرغنہ ہی کے ذریعے حیدرآباد کا کوئی امکان بٹھل کے ذہن میں ہوگا۔ یہاں تک یہ گھوڑوں پر تو نہیں آئے ہوں گے۔ واپسی کے لیے بھی ان نے کوئی معقول انتظام رکھا ہوگا۔

میری نگاہیں دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ سرغنہ کسی وارد ہوسکتا تھا۔ نشانے کے لیے گو میں نے بندوق نہیں اٹھائی تھی لیکن انگلی لبلبی پر تھی۔ بس لمحے بھر کی دیر لگتی' دروازے سے سرغنہ کے نمودار ہونے پر اس کے تیور کا اندازہ لگانے اور بندوق اٹھانے کا دورانیہ۔ اسے گئے زیادہ دیر نہیں ہوا تھا کہ کوئی ایک آدمی نہیں ہے۔ وہ دو ہی تھے' ایک سرغنہ دوسرا اس کا ساتھی' کندھے سے بندوق لٹکائے ہوئے۔ دونوں حواس باختہ حالت میں اندر آئے اور سرغنہ نے ہکلاتی آواز میں بتایا کہ ڈرائیور آیا ہی چاہتا ہے۔

"ادھری سے اب دفع ہونے کا کر' فوراً۔" بٹھل نے سختی سے کہا۔

سرغنہ گم صم ہوگیا۔ ہاتھ جوڑ کے وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کے ہونٹ پھڑپھڑا کے رہ گئے۔ دیوار کے ساتھ کھڑے ہوئے دونوں آدمیوں کو اس نے اشارہ کیا۔ وہ منتظر تھے۔ سرغنہ نے بھی ان کا ہاتھ بٹایا۔ انہوں نے لشتم پشتم اپنے زخمی اور بے دم پڑے ہوئے ساتھیوں کو باہر لے جانا شروع کردیا۔ وہ چار تھے۔ اٹھا کے لے جانے والوں کی تعداد اور تھی۔ ایک مرگا نتھے ہوئے تھا۔ اسے اٹھایا گیا تو وہ کسمساتا' کراہتا اپنے پیروں پر کھڑا ہوگیا۔ پہلے وہ دروازے کے باہر لے جاکے انہیں چھوڑتے رہے۔ ابھی وہ اس صبر آزما مرحلے سے دوچار ہی تھے کہ کسی پاگل کے مانند نواب کا ڈرائیور اندر داخل ہوا۔ وہ بہت تیزی میں اندر آیا تھا لیکن چند قدم چل کے رہ گیا۔ اس کی آنکھیں باہر نکل آئیں۔ پہلی نظر میں شاید اسے اپنا دلی' نعمت نواب ثروت یار دکھائی دے گیا تھا۔ بٹھل کے حکم پر اس کے جسم میں جھرجھری پیدا ہوئی' پھر وہ تن سا گیا اور اپنی جگہ ساکت کھڑا رہا۔

"کیا بولا تم کو کنجری کے ــــ" بٹھل نے چنگھاڑتے ہوئے کہا۔

میری آنکھوں میں ریت بھر گئی۔ ڈرائیور نے مزید کوئی لیت ولعل نہیں کیا۔ میں نے دیکھا' جہاں نواب کا قیام تھا' وہ سیدھا اسی کمرے کی جانب لپکا۔ گویا موٹر باغ ہی کے اندر تھی! اور وہ' وہ سب کچھ محض ایک تماشا تھا۔ آدمی کے کتنے رنگ ہوتے ہیں' آدمی کے آگے تو سمندر بھی ہیچ ہے۔ مگر آدمی کے ظاہر وباطن کی بوالعجبی سے زیادہ یہ میری اپنی پراگندگی تھی کہ اتنا کچھ دیکھنے اور سننے کے بعد مجھ پر کیسا پردہ پڑا رہا۔ مجھے اپنے آپ کو طمانچے مارنے چاہیے تھے' پر کوئی خود کو کیا سرزنش کرسکتا ہے' کتنی سزا دے سکتا ہے۔ خود کو کہاں کسی سزا وجزا کا یارا ہے۔ یہ منصب تو دوسرے کو ہی سزاوار ہے۔

نواب کے کمرے سے بھی باہر کا ایک راستہ تھا۔ غالباً اسی لیے ڈرائیور ہمارے کمرے سے ہوکے نہیں گزرا۔ میں نے جلدی جلدی مسہری کی چادر سے پاؤں صاف کیے' واسکٹ پہنی۔ اور کوئی سامان ہمارے پاس تھا ہی نہیں۔ سرغنہ اور اس کے ساتھی اپنے ساتھیوں کو کمرے سے اٹھا کے لے جاچکے تھے۔ بٹھل غسل خانے میں منہ پر پانی ڈال کے آگیا تھا۔ چادر سے میرے پاؤں اچھی طرح صاف نہیں ہوپائے تھے۔ جوتے میں خون کی چپ چپاہٹ محسوس ہورہی تھی۔ بٹھل کی دیکھا دیکھی میں نے بھی غسل خانے کا رخ کیا۔ جب تک میں نے پیر دھو نہیں لیے مجھے تسلی نہیں ہوئی۔ لمحوں میں ہم تیار ہوگئے تھے۔ کپڑے بدلنے یا دھونے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ مجھے خیال آیا کہ نواب بھی تو گھر سے لدا پھندا چلا تھا۔ اس کے سامان میں دو ایک جوڑے ضرور ہونے چاہئیں لیکن اتنی دیر میں ڈرائیور سامان اٹھا کے نکل چکا تھا۔ نواب کے کمرے میں اس کی مسہری پر رکھی ہوئی چادریں مجھے نظر آگئیں۔ میں وہی اٹھا لایا۔ کچھ اسی طرح ہمارے کپڑوں کے داغ چھپ سکتے تھے۔ ویسے چاندنی کتنی ہی کھلی ہوئی کیوں نہ ہو' رات بھی ہماری پردہ پوشی میں معاون ہوتی۔ میں نے ایک چادر بٹھل کی طرف بڑھا دی۔ وہ کسی اور دھیان میں تھا۔ چادر میرے ہاتھ سے لے کے اس نے بے پروائی بلکہ ناگواری سے مسہری پر ڈال دی اور نواب کے پاس جاکے اس کی نبض ٹٹولی۔ پھر سامنے والی کھڑکی کھول کے نیچے جھانکنے لگا۔ دروازے کے پار سرغنہ اور اس کے ساتھیوں کی آہٹیں معدوم ہوچکی تھیں۔ وہ ایک ایک کرکے اب تک انہیں نیچے بارہ دری یا صحن میں لے جاچکے ہوں گے۔ بٹھل کسی قدر مضطرب لگ رہا تھا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اسے ڈرائیور کا انتظار تھا۔ جیسے ہی ڈرائیور کمرے میں داخل ہوا۔ بٹھل نے مجھے اشارہ کیا اور بندوق اٹھا کے کھڑکی کی جانب بے دریغ فائر کرنے شروع

کردیے۔ ڈرائیور' ہیبت زدہ ہو کے ایک کونے میں چھپ ہوگیا۔ بٹھل جیسے دیوانہ ہوگیا تھا۔ میری عقل بھی خبط ہوگئی تھی لیکن میرے لیے یہی مناسب تھا کہ میں لمحہ موجود کو بعینہ بجنسہ تسلیم کرلوں اور اسباب وعلل پر تردد تفکر کے بجائے اس ناقابل یقین افتاد پر اپنی ساری توانائیاں مرکوز کردوں۔

جلد ہی میری سمجھ میں بٹھل کی دیوانگی کا سبب آگیا۔ میں نے بھی اضطراری انداز میں بندوق داغنی شروع کردی۔ کھڑکیوں کی شیشے ٹوٹ گئے۔ رات کے سناٹے میں گولیوں کی گونج نہایت سنسنی خیز تھی۔ درختوں پر خوابیدہ پرندے جاگ گئے اور ہاہا کار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر میں ہر سو شور مچ گیا تھا' جیسے جنگل میں آگ لگ گئی ہو۔ ادھر ملازموں کے حصے کی جانب سے بیدار اور خبردار ہوجانے کا غلغلہ بلند ہوا۔ ان میں سے کسی کے پاس بندوق تھی' باہر بھی وقفے وقفے سے فائر ہونے لگے تھے۔ کئی باتیں ممکن تھیں۔ بارہ دری سے صدر دروازے تک افتاں وخیزاں جاتے ہوئے سرغنہ کے آدمیوں کو اگر کہیں دیر ہوگئی اور وہ باغ کے ملازموں کو دکھائی دے گئے تو سب کا رخ اسی طرف ہوجائے گا' پھر سرغنہ کو بڑی بھاگ دوڑ کرنی پڑے گی۔ ہرچند کہ ابھی ان کے پاس دو بندوقیں تھیں۔ صدر دروازہ دور تھا۔ درمیان میں عمارت تھی اور عمارت میں مسلسل گولیاں دھمک رہی تھیں۔ اس بات کا بھی امکان تھا کہ باغ کے ملازم درمیان کی قریبی آوازوں ہی کا تعاقب کریں کہ صدر دروازے پر ان کی یلغار' سرغنہ اور اس کے ساتھیوں کی نقل وحرکت نظر آجانے کی پابند تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ان میں سے کچھ سرغنہ کے پیچھے صدر دروازے کا رخ کریں' کچھ عمارت میں داخل ہوجائیں۔ وسیع وعریض اراضی پر پھیلے ہوئے باغ کے ملازموں کی تعداد کم نہیں ہوگی۔ ان سبھوں کو گھر سے نکل آنا چاہیے۔

وہ عمارت کے قریب آچکے تھے کہ بٹھل نے اچانک فائر بند کردیے۔ میں نے بھی بندوق نیچے کرلی۔ گولیوں کی آوازیں ہماری مدد کو آنے اور صورت حال جاننے والوں کی پیش قدمی میں رکاوٹ کا باعث ہوتیں۔ لگتا تھا' ان کے کچھ ساتھی شور مچاتے ہوئے صدر دروازے کی طرف بھی دوڑے ہیں۔ کچھ عمارت میں آگئے تھے۔ آگے زمینی اور پہلی منزل کی سیڑھیوں پر انہیں پھونک پھونک کر قدم اٹھانے چاہئیں تھے مبادا کہیں سے گولی چل پڑے۔ بٹھل کمرے سے نکل گیا اور زینے پر چیخ پکار کرکے اس نے انہیں اپنی طرف متوجہ کرگیا۔ بٹھل کے اس اقدام سے انہوں نے ہمت پکڑی اور ان میں خیر طلبی اور سرفروشی کا جذبہ استوار

وہ کئی آدمی تھے۔ قطبی میاں ان میں پیش پیش تھا میں دہی ہمیں کھانا کھلا کے اور کمروں میں پہنچا کے ر ہوا تھا۔ مجھے شبہ ہوا تھا کہ سب کو نہیں تو نواب ثرو نے باغ کے چند ملازموں کو ضرور اپنے ارادے میں ش ہوگا لیکن قطبی میاں سمیت ان سب کا کمرے میں آ حال ہوا' وہ میرے شبے کی تردید کے لیے کافی تھا۔ ناقابل تصور نادیدنی سے دوچار تھے۔ صاف نظر آرہا ان کی آنکھوں کے لیے یہ مرحلہ' یہ تجربہ کیسا عبرت ہے۔ وہ دم بخود ہوگئے اور ان کی سسکاریاں نکل گئیں کی بینائی نے اس ناگہانی سے آشنائی کا وقفہ تمام کیا تو نے واویلا شروع کردیا۔ طرح طرح کے سوالات۔ بر برہمی سے وہ کہیں باز آئے۔ بٹھل نے ان سے کہا کہ نے مزید وقت ضائع کیا تو نواب کے حق میں اچھا نہ ہوگا نے انہیں جلد سے جلد نواب کو موٹر تک لے جانے دیا۔ سراسیمہ ڈرائیور بھی کمرے کے کسی گوشے سے نکا سامنے آگیا تھا۔ مریضوں کا اسٹریچر عمارت میں نہیں انہوں نے کہیں نہ کہیں سے ایک تختہ فراہم کرلیا او اور رضائیوں سے تختے کی سختی دور کردی۔ تین چار آ نے زینے پر مجھے گھیر لیا تھا۔ میں انہیں جیسے تیسے کچھ میرے بے ربط بیان سے ان کی سیری نہیں ہوئی ہوگی ملازم لوگ تھے۔ آقاؤں سے حجت ملازمت کے آدا منافی ہے۔ ان کی دانست میں تو میں اور بٹھل' نواب یار یا ان کے مالک نواب صاحب مجن میاں ہی کے ہم پیشہ وہم رتبہ ہوں گے اور ہمارے متعلق انہیں کچھ نہیں تھا تو بھی یہ کیا کم تھا کہ ہم نواب ثروت یار کے آئے تھے اور مہمان کے لیے مخصوص بالائی منزل کے کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ نچلی منزل پر زینے کے برکت نامی ان کا ساتھی خون میں لت پت بے سدھ پڑ اوپر کی منزل کو جاتے ہوئے انہوں نے لازماً اسے دیکھ اور اب دوبارہ ہمارے ساتھ واپس آتے ہوئے بھی نے بھی اس کی چارہ گری کے سلسلے میں بے صبری کا نہیں کیا۔ وہ برکت کا نمک نہیں کھاتے تھے۔ نمک تو بھی نہیں کھاتے تھے لیکن نسبتوں کی بات اور ہوتی نواب کو موٹر تک لے جانے میں کوئی وقت نہیں لگا۔ دری سے کچھ فاصلے پر موٹر کھڑی تھی۔ ڈرائیور بھاگتا اور موٹر قریب لے آیا۔ نواب کو پچھلی نشست پر لٹادیا بٹھل اس کا سر گود میں رکھ کے وہیں سمٹ کے بیٹھ گیا۔

موٹر صدر دروازے پر جا کے ٹھہر گئی۔ وہاں شور مچا ہوا تھا لیکن موٹر کے قریب پہنچنے پر سب خاموش ہوگئے۔ بٹھل کے استفسار پر ایک دست بستہ ادھیڑ شخص نے جھرجھراتی آواز میں بتایا کہ دروازے پر متعین عمر رسیدہ چوکی دار اور اس کا جوان سال بیٹا کام آچکے ہیں۔ وہ بری طرح بین کرنے لگا تھا۔ بٹھل اسے کیا تسلی دیتا کہ انہیں تو ختم ہی ہوجانا تھا ورنہ نواب ثروت یار کے تراشے ہوئے خاکے میں حقیقت کا رنگ کس طرح بھرتا؟ بے چارہ برکت بھی اسی لیے چارہ بن گیا۔ نواب کی طرف سے باغ کے ملازموں کو یہی تاثر دینا چاہیے تھا کہ سب کچھ کسی ناگہانی بلا کے طور پر پیش آیا۔ نواب کے ساتھ آنے والے اس کے دو معزز مگر بدبخت مہمان بھی باغ کے معصوم ومظلوم ملازموں کی طرح لپیٹ میں آگئے۔ نواب کے نوشتے میں وافر وقت مرقوم تھا اس لیے وہ دست قضا سے محفوظ رہا۔ انجام اب گو مختلف ہوگیا تھا' بٹھل کو بہرحال نواب کا ترتیب دیا ہوا تاثر قائم رکھنے پر اصرار کرنا چاہیے تھا۔ ہم جب چاہتے بھی نکل سکتے تھے لیکن باغ کے ملازموں کی موجودگی گواہی کی حیثیت رکھتی تھی۔ کسی پیش آئندہ ناگفتنی کے لیے شہادتیں جمع رہیں تو اچھا ہی رہتا ہے۔ اتنا وقت تھا ممکن ہے' صدر دروازے کی طرف بڑھنے والے ملازموں نے بھاگتے ہوئے سرغنہ اور اس کے ساتھیوں کی کوئی جھلک دیکھ لی ہو۔ ایسی صورت میں تعاقب کرنے والوں کو دور رکھنے کے لیے سرغنہ نے گولی چلانے کا حکم جاری کیا ہوگا۔ اور اگر وہ لوگ ملازموں کے پہنچنے سے پہلے صدر دروازہ عبور کرنے میں کامیاب ہوگئے تو بھی ایسا حرج نہیں تھا۔ باقی سبھی کچھ باغ کے ملازموں کے سامنے تھا۔ سب سے زندہ شہادت جاں بہ لب نواب ثروت کی شکل میں موجود تھی۔ اور کچھ نہیں تو ان کی نیند خراب کرنے اور گھروں سے نکالنے میں ایک یہ رمز بھی تھی کہ نواب کو بالائی منزل سے بہ عجلت تمام موٹر تک منتقل کرنے کی آسانی ہوگئی۔ ان کی اعانت نہ ہوتی تو جانے ہمیں کتنی دیر لگ جاتی۔

ادھیڑ شخص مرنے والوں کا کوئی رشتہ دار معلوم ہوتا تھا۔ وہ بلک بلک کے دہائیاں دے رہا تھا۔ اس کی فریاد میری طرح بٹھل کا دل بھی گداخت کررہی ہوگی۔ بٹھل اس سے کیا کہتا' وہی گنتی کے چند لفظ جو ماتم گساروں کو بھی حفظ ہوتے ہیں۔ بٹھل نے ڈرائیور کو موٹر بڑھانے کی ہدایت کی۔ باغ کے لیے مخصوص راستے سے گزر کر بڑی سڑک کا نکڑ تھا۔ ڈرائیور نے صدر دروازے سے نکلتے ہی رفتار تیز کردی۔ ابھی اس نے تین چار فرلانگ کی مسافت طے کی ہوگی کہ آگے کا راستہ بند دیکھ کے اسے رفتار قابو میں کرنی پڑی۔ کوئی حادثہ ہوا تھا۔ سامنے ایک لاری اور عام موٹر ایک دوسرے کے مقابل کھڑی تھیں بلکہ موٹر نے لاری کا راستہ روکے رکھا تھا۔ کئی آدمی نیچے اترے ہوئے تھے۔ انہیں نظرانداز کرکے ڈرائیور کنارے کے کچے راستے سے موٹر لے جانا چاہتا تھا کہ یک لخت بٹھل نے اس سے ٹھہر جانے کو کہا۔ میں نے بھی موٹر روک دینے کے لیے ڈرائیور کا بازو پکڑ لیا تھا۔ موٹر قریب ہونے پر روشنی میں ان کے چہرے نمایاں ہوگئے تھے۔ میری آنکھیں حیرت سے دوچار تھیں۔ وہ سرغنہ اور اس کے ساتھی تھے۔ انہیں جمرو اور زورا نے تمنچوں کی زد پر رکھا ہوا تھا۔

سرغنہ مضطربانہ انداز میں انہیں قائل معقول کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ ہمارے ٹھہر جانے پر سب منتشر ہوگئے۔ زورا نے جھٹ سے تمنچے کی نال ہماری طرف موڑ دی۔ بٹھل اٹھ نہیں سکتا تھا۔ میں دروازہ کھول کے فوراً باہر نکل پڑا۔ جمرو اور زورا بھی اچھل پڑے۔ آدمی آدمی کے لیے کبھی ہوا کے جھونکے کے مانند ہوتا ہے۔ کوئی دل نشین منظر' منتظر چہروں سے زیادہ راحت افزا نہیں ہوتا۔ مجھے تو ایسا لگا جیسے مدتوں بعد ہمارا آمنا سامنا ہوا ہے' جیسے مدتوں کے حبس کے بعد دریچے کھلے ہوں۔ انہیں اپنے سینے میں بھرنے کے لیے میرے دست وبازو ہمکنے لگے لیکن ایک قدم ہی چل کے میں رہ گیا۔ جمرو بھی رک گیا۔ اسے بھی بروقت ہوش آگیا تھا کہ سرغنہ اور اس کے ساتھیوں کے سامنے ہمارا یہ ربط والتفات مناسب نہیں ہے۔ ادھر نواب کا ڈرائیور بھی موجود تھا۔ جمرو نے آگے آکے جب تک بٹھل کو موٹر میں بیٹھا ہوا نہیں دیکھ لیا' اس کی وحشت کم نہیں ہوئی۔ بٹھل نے یقیناً انگلی اٹھائی ہوگی کہ جمرو نے پلٹ کے زورا کو سرغنہ کے راستے سے ہٹ جانے کی تاکید کی لیکن زورا نے ان لوگوں کے پاس رہ جانے والی دونوں بندوقیں اپنی تحویل میں لے کر ہی انہیں جانے کی اجازت دی۔ سرغنہ کی لاری نکل جانے کے بعد جمرو اور زورا نواب کے ڈرائیور کی وجہ سے میرے قریب آنے میں متذبذب ہورہے تھے۔ میرے خون آلود کپڑے دیکھ کے ان سے برداشت نہیں ہوا۔ وہ بے طرح مجھ سے لپٹ گئے اور بے تابانہ میرا جسم چھونے اور ٹٹولنے لگے۔

"میں ٹھیک ہوں" میری آواز بھرا گئی۔

"اور استاد؟" جمرو اضطراری لہجے میں بولا۔

میں نے سرہلا کے اسے اطمینان دلایا "مگر تم' تم یہاں کس طرح۔۔۔؟"

"ہم تو ادھری چک پھیری کر رہے تھے۔"

"یہاں!" میں نے حیرانی سے کہا "تمہیں معلوم تھا کہ ہم یہاں تک آچکے ہیں؟"

"اپن تو چلتے تیم سے آگے پیچھے کو ہے راجا! وہ تو ایدر سے اپن تھوڑا دوری پر چلا گیا تھا کہ بیچ میں یہ بے ٹکے کا' سالا ٹھیکرا لوگ باغ میں گھس پڑا" زورا نے بتایا کہ باغ کے قریب جب نواب نے موٹر خراب ہوجانے کی شعبدہ بازی کی تھی تو سامنے سے آنے والی جس موٹر کے ڈرائیور نے ہم سے مدد کے لیے پوچھا تھا' اس میں جمرو اور زورا بھی بیٹھے تھے۔ انہوں نے فاصلے سے موٹر کھڑی کی تھی۔ یعنی بٹھل سمجھ چکا تھا کہ موٹر میں سوار لوگ کون ہوسکتے ہیں اسی لیے اس نے کسی قدر کشادہ آواز میں ڈرائیور سے مجن میاں کے باغ کا پتہ پوچھا تھا۔ نواب نے رسمی شکریہ ادا کرکے انہیں چلتا کردیا تھا۔ بعد میں اس نے دبے دبے لہجے میں شکایت بھی کی تھی کہ اجنبیوں کے سامنے بٹھل کو رات گزارنے کے لیے اپنی منزل' مجن میاں کے باغ کا نام نہیں لینا چاہیے تھا۔ ان دنوں یہ علاقہ ویسے ہی خاصا پُرخطر سمجھا جاتا ہے۔ نواب نے تاویلیں پیش کی تھیں کہ بٹھل نے غور نہیں کیا۔ موٹر ہم سے اتنی دور کیوں روکی گئی اور ڈرائیور کے مانند موٹر میں سوار دوسرے مسافروں نے باہر آکر ہمدردی کا اظہار نہیں کیا' وغیرہ وغیرہ۔"

"پھر تم' تم ـــ" میری زبان اٹکنے لگی۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ جمرو اور زورا سچ کہہ رہے ہیں مگر وہ اتنی رات کو اس ویرانے میں بہ قائمی ہوش و حواس سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے نواب کے گھر سے اب تک کیسا اذیت ناک وقت گزارا ہوگا۔ ہم سے کہیں زیادہ۔ وہ تو مسلسل ادھر سے ادھر بھٹکتے' منڈلاتے رہے ہوں گے۔ تصور ہی سے جسم سن سنا رہا تھا۔

"کیا ہے رے!" بٹھل کی دھمکتی آواز پر ہم تینوں ہڑبڑا گئے۔ ان دونوں نے بھی دیکھا تھا کہ نواب کس کشمکش کی حالت میں ہے اور اسے بس لمحوں کی بھیک مل رہی ہے۔ میں واپس موٹر میں بیٹھنے کے لیے پلٹ گیا تھا کہ جمرو اور زورا نے مجھے روک لیا۔ کہنے لگے کہ ذرا سی دیر لگے گی' ہم کپڑوں کا تبادلہ کرسکتے ہیں' ابھی رات باقی ہے۔ وہ راستے میں کسی ندی نالے پر خون کے نشانات بہادیں گے۔ وہ نہایت معقول بات کررہے تھے لیکن بٹھل نے انہیں جھڑک دیا۔

نشست پر میرے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے موٹر چلادی۔ اس نے رفتار بہت تیز رکھی تھی۔ آگے کا راستہ بھی صاف تھا۔ ہم نے جلد ہی عثمان ساگر عبور کرلیا۔ جمرو اور زورا موٹر بھی ہمارے پیچھے پیچھے آرہی تھی۔ تیز رفتاری کی وجہ [illegible] جھٹکے بڑھ گئے مگر رفتار کم کرنے سے دیر ہوسکتی تھی۔ [illegible] ساگر سے نکل کے موٹر ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ اب نہ پرزوں میں کوئی خرابی تھی' نہ ڈرائیور سے کوئی غلطی ہو[illegible] تھی۔ جاتے وقت نواب وقت گزارنا چاہتا تھا' ایک مق[illegible] وقت پر جو اسے مجن میاں کے باغ پہنچنا تھا۔ اب نواب وقت کی تنگی درپیش تھی۔

بٹھل ساکت وصامت بیٹھا ہوا تھا۔ خنکی اور بڑھ [illegible] تھی۔ ذرا سا شیشہ گرانے پر ٹھنڈی ہوا جسم میں چبھنے لگ[illegible] تین بجنے والے تھے۔ میری نظریں بھاگتی ہوئی سڑک پر [illegible] ہوئی تھیں۔ روشنی میں سڑک ایک خاص حد تک ہی نظر [illegible] تھی۔ اس سے آگے اور اطراف میں اندھیرا چھایا ہوا [illegible] آسمان پر بادلوں کی ٹکڑیاں چاند کے سامنے سے گزرتیں [illegible] اندھیرا اور گہرا ہوجاتا۔ میرے سر پر باربار آندھیاں اڈنے لگتی تھیں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ صرف را[illegible] میں نگاہیں جمائے رکھوں' گزرے ہوئے وقت کا اعادہ کر[illegible] اور آنے والے کی تجسیم و تشکیل اور قیاس و تخمین سے حاصل نہیں' جو ہوتا رہا ہے' اسے روکنا کتنا مقدر میں تھ[illegible] پیش آیندہ پر تکدر و تردد کیا جائے لیکن اس درگزری صرف نظری کا اختیار آدمی کو کس قدر ہے؟ دیکھنے اور [illegible] تعلق جسم کے آلات ظاہری سے نہیں ہے۔ آنکھوں پر پٹی باندھنے اور کانوں میں روئی ٹھونسنے کے عمل سے نہیں پڑجاتا۔ سینہ سوز مناظر اور آوازوں سے تو اندھے بہرے بھی محفوظ نہیں ہوتے۔ ان کا خون بھی اسی طرح [illegible] ہے۔ میں نے ہرچند پیچھے مڑ کے نواب کو دیکھنے سے پہل[illegible] کی لیکن اس کا چہرہ نظروں سے دور نہیں ہوتا تھا۔ وہ [illegible] بدل بدل کے سامنے آجاتا تھا۔ کبھی میرے جی میں آتا' [illegible] سے کہوں کہ اس سادگی و کشادگی کا کیا جواز ہے؟ نوا[illegible] کو ہمیں کہیں ویرانے میں پھینک دیا جائے۔ کھلی جگہ [illegible] گدھوں کی کمی نہیں ہوتی۔ یہ سوال میرے سینے میں لگا تا تھا کہ نواب کو آخر ہم سے ایسا کیا علاقہ تھا؟ یہ کون [illegible] نسبت تھی؟ سرغنہ نے مال و زر کی طلب کی تھی لیکن اس [illegible] ہیروں کا ذکر نہیں کیا۔ یقیناً نواب ہیروں کے ساتھ ہما[illegible] کسی حوالے سے ناواقف تھا اور اپنے قبیلے والوں کی ندامت اور ملال کی تلافی اس کا مقصود نہیں تھا۔ یہ تو کچھ [illegible] ہی تھا۔ بٹھل نے زور آزمائی تابو یافتگی کے ساتھ ساتھ کاری کی مشق بھی اچھی کی تھی۔ ممکن ہے' وہ گرہ کشائی میں کامیاب ہوگیا ہو۔ ڈرائیور کی موجودگی مانع [illegible] میں بٹھل سے پوچھتے پوچھتے رہ جاتا تھا کہ نواب نے [illegible] مارا ستہ منتخب کیوں نہیں کیا؟

[illegible] سڑک کے کنارے .... کوئی گڑھا تھا' موٹر اچھل گئی۔ [illegible] یور ہوش قائم نہ رکھتا تو موٹر درخت سے ٹکرا جاتی۔ [illegible] کراہنے لگا اور دیکھتے دیکھتے اس کی حالت ایسی غیر ہوئی [illegible] بٹھل کو موٹر رکوانی پڑی۔ ڈرائیور نے رفتار پہلے ہی کم [illegible] تھی۔ جمرو اور زورا کی موٹر بھی ہمارے پیچھے آکے [illegible] ہوگئی۔ ڈرائیور ڈکی سے پانی لے آیا۔ بہت مشکل سے [illegible] کے حلق میں پانی اتارا گیا۔ پانی پینے سے وہ کسی طور [illegible] ملا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں ابھر آئیں اور وہ [illegible] طراب کے عالم میں ویدے گھمانے لگا جیسے وہ جگہ' وقت [illegible] صورت حال اخذ کرنے کی کوشش کررہا ہو "تھوڑی دیر کی [illegible] ہے صاحب! اپنے کو تھام کے رکھو" بٹھل نے اسے [illegible] دی۔

نواب کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں' ویران اور سنسان [illegible] تھیں' پھر ان میں دریا اتر آیا۔ بٹھل نے اس کے گال [illegible] تھپائے تو آنسو پھوٹ پڑے۔ کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر [illegible] ٹھل نے ڈرائیور کو موٹر چلانے کا حکم دیا۔ ابتدا میں موٹر [illegible] ستہ آہستہ چلتی رہی اور پھر بتدریج رفتار تیز ہوتی گئی۔

اکا دکا روشنیاں شروع ہوگئی تھیں۔ میں نے جانا کہ [illegible] طراف میں دیہی بستیاں آباد ہیں لیکن روشنیوں کا سلسلہ [illegible] راز ہوتا گیا۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ اتنی جلد ہم شہر پہنچ [illegible] ئیں گے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جاتے وقت ڈرائیور ہمیں [illegible] کماتا ہوا لے گیا تھا۔ ابھی اندھیرا باقی تھا۔ بٹھل کے پوچھنے [illegible] ڈرائیور نے نظامیہ اسپتال کا نام لیا تھا۔ کچھ دیر بعد بٹھل [illegible] کو خیال آیا اور اس نے ڈرائیور سے نواب کے کسی قرابت [illegible] ار' دوست آشنا حکیم ڈاکٹر کے بارے میں معلوم کیا۔ کم [illegible] سخنی اچھے ملازم کی خوبی ہے۔ ڈرائیور نے شاید حد ادب یا [illegible] بٹھل کے رعب کی وجہ سے خاموشی اختیار کی ہوئی تھی۔ [illegible] اس نے بدحواسی میں ڈاکٹر ناصر مرزا کا ذکر کیا اور بتایا کہ [illegible] نواب کے مرحوم والد کے زمانے سے سارے گھر کا علاج ڈاکٹر [illegible] ناصر مرزا ہی کرتا ہے۔ ڈرائیور کی رائے اس کے جواب میں [illegible] منتظر تھی۔

"کون سا پہلے کو پڑتا ہے؟" کچھ تامل کے بعد بٹھل نے بھاری آواز میں پوچھا۔

"پہلے اسپتال آتا ہے سرکار!"

"اور ڈاکٹر کا ٹھکانا کتنی دور ہے؟"

ڈرائیور نے جواب دیا کہ اسپتال سے قریب دس منٹ کی دوری پر ڈاکٹر کا گھر واقع ہے۔ بٹھل نے اسے وہیں چلنے کو کہا۔

رات کا آخری پہر تھا۔ شہر میں ہو کا عالم تھا۔ عمارتیں اور سڑکیں بھی جیسے سو رہی ہوں۔ وہ اوسط درجے کا بنگلا تھا۔ ٹھیک دروازے کے مطابق ڈرائیور نے موٹر ٹھہرائی۔ کئی بار اطلاعی گھنٹی بجانے پر اندر سے کسی بوڑھے ملازم کی گھبرائی ہوئی آواز آئی "کون ہے' کون ہے؟"

وہ باہر آنے سے جھجک رہا تھا۔ ڈرائیور اس کے نام سے واقف تھا "نور چاچا! اپن ہیں آپ کے خادم ہدایت علی' سرکار نواب ثروت یار صاحب کے یہاں سے۔ نواب صاحب بھی آئے ہیں" ڈرائیور نے بے ترتیبی سے ایک ہی سانس میں کہا۔

آہنی دروازے سے عمارت کے بیضوی برآمدے تک بیس قدم کا فاصلہ ہوگا۔ نہ زیادہ وسیع نہ مختصر لیکن برآمدہ صاحب خانہ کی خوش وضعی کا مظہر تھا۔ چھت کے وسط میں فانوس' دیوار پر ڈوبتے سورج کی روغنی تصویر' بید کا صوفہ اور میز' سہ قدی سیڑھیوں پر اور اندر فاصلے فاصلے سے رکھے ہوئے پھولوں سے لدے ہوئے گملے' چلمنوں کا بھی اہتمام تھا لیکن چلمنیں اٹھی ہوئی تھیں۔ برآمدہ لوہے کی گرل سے بند تھا۔ گرل پر کہیں کہیں بیلیں چڑھی تھیں۔ پہلے ایک قمقما ٹمٹما رہا تھا۔ اندر سے ملازم نے بٹن دبا دیا ہوگا کہ فانوس روشن ہوگیا۔ دائیں جانب کا دروازہ کھلا اور چادر ڈھانپے ایک سفید ریش شخص بڑبڑاتا ہوا نمودار ہوا۔ اس نے گرل کا دروازہ نہیں کھولا اور اندر ہی سے بولا "کیا بات ہے؟"

"ڈاکٹر صاحب سے کام ہے۔ سرکار بہت بیمار ہیں' خدا کے لیے دیر نہ کیجیے۔ ڈاکٹر صاحب کو فوراً جگا دیجیے' ہم لوگاں دور سے آرہے ہیں۔"

بوڑھے نے ٹارچ کی روشنی میں جب تک ڈرائیور ہدایت علی کی شکل نہیں دیکھ لی' اس کی آواز نہیں کھلی "اتنی رات گئے؟" وہ ناگواری سے بولا "ڈاکٹر صاحب کا حکم ہے کہ انہیں رات کو نہ جگایا جائے۔ انہیں سونے کا وقت ہی کتنا ملتا ہے۔ رات کو بھی دیر سے لوٹے تھے۔ آپ لوگاں اسپتال چلے جاؤ۔ پوری رات کھلا رہتا ہے۔ سویرے ڈاکٹر صاحب جاکے دیکھ لیں گے۔"

"اپن کو اسپتال کا رستہ معلوم ہے نور چاچا! کوئی ایسی بات ہے جو ادھر آئے ہیں" ڈرائیور نے ہیجانی آواز میں کہا "ذرا ایک بار ڈاکٹر صاحب حضور کی خواب گاہ پر دستک دیجیے اور سرکار نواب صاحب کا نام بولیے۔" ڈرائیور نے شکایت آمیز لہجے میں منت کی۔

"ہم مجبور ہیں ہدایت میاں' ہم کو اجازت نہیں ہے" بوڑھے نے رکھائی سے کہا۔

"آپ کیا باتیں کر رہے ہو چاچا! ایک آدمی کی زندگی کا سوال ہے۔ آپ اندر جاکے ڈاکٹر صاحب کو بولیے تو۔ وہ منع کردیں گے تو ہم چلے جائیں گے۔ سرکار نواب صاحب سے ڈاکٹر صاحب کی پرانی رسم داری ہے۔ کچھ سمجھ کے ہی لوگاں ان کے در پہ آئے ہیں۔"

لگتا تھا' ڈرائیور کی آہ بکا سے نور چاچا کا پتھر پگھل رہا ہے۔ وہ شش و پنج کی کیفیت میں کھڑا رہا۔ پھر جانے اسے کیا ہوا' کہنے لگا۔ "ہم کیا کریں ہدایت میاں' نوکر آدمی ہیں' ڈاکٹر صاحب نے سختی سے منع کیا ہے۔"

"نواب صاحب زخمی ہیں چاچا!" ڈرائیور وحشت سے بولا "تم کو غوث پاک' پیر دستگیر کا واسطہ۔۔۔"

بٹھل کو موٹر سے اترنا پڑا "تم کو جو بولا ہے' ویسا ہی کرو بڑے صاحب!" اس نے ترشی سے کہا "زیادہ چخ چخ مت کرو۔ ابھی اور ایک پل کی دیر کی تو دیوار اتنی اونچی نہیں۔ پھلانگ کے خود اندر آجائیں گے۔"

"آپ' آپ کیا بولتے ہو' یہ۔۔۔ یہ کیا ہے؟" بوڑھے کی زبان لڑکھڑانے لگی۔

بٹھل نے گھنٹی پر ہاتھ رکھ دیا اور زور زور سے دروازہ بجانے لگا۔ لوہے کا دروازہ تھا۔ سناٹے میں دور دور تک آواز گونجی ہوگی۔ بوڑھے کو یہ توقع ہرگز نہ تھی۔ "نکو' نکو بابا! ایسا نہ کرو" وہ چیخنے چلاتے ہوئے بولا اور اسے احساس ہوا کہ وہ تو خود اس شور و غل میں شامل ہوگیا ہے "ٹھہرو' ٹھہرو ہدایت میاں!" وہ عاجزی سے بولا "جاتا ہوں' میں اندر جاتا ہوں' کوشش۔۔۔"

نور چاچا اندر جانے کے لیے پلٹ گیا۔ جس دروازے سے وہ برآمدے میں داخل ہوا تھا' اس نے اندر جاکے اسے بند کیا۔ چٹخنی لگانے کی آواز آئی لیکن ساتھ ہی اندر سے اور آوازیں آنے لگیں۔ دوسرے لمحے گاؤن پہنے' لمبے چھریرے جسم کا ایک ادھیڑ عمر شخص تیزی سے باہر نکلا۔ ڈاکٹر ناصر ہی ہوسکتا تھا۔ نور چاچا بکتا جھکتا اس کے پیچھے تھا۔ ڈاکٹر نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور گرل کے آگے ٹھہر گیا "ہدایت میاں!" وہ اضطراب سے بولا "کیا بات ہے' خیر تو ہے؟"

"خیر نہیں ہے سرکار!" ڈرائیور نے حواس باختگی سے سلام کیا اور فریادی لہجے میں بولا "دروازہ کھولیے حضور! سرکار نواب صاحب کو آپ کی ضرورت ہے۔ خدا کے لیے جلدی کیجیے۔"

ڈاکٹر کے ہاتھ اٹھانے پر نور چاچا نے قفل کھول دیا۔ ڈاکٹر لپکتے قدموں سے نیچے اترا۔ آگے بڑھ کے نور چاچا نے خاص دروازہ بھی کھول دیا۔ ڈاکٹر تیزی سے باہر نکل آیا۔ یہاں ہدایت علی کے ساتھ ہم اجنبی بھی کھڑے تھے' گو اس نے گرل ہی سے ہمیں دیکھ لیا ہوگا لیکن دروازے کی اوٹ میں خون سے رنگے ہوئے ہمارے کپڑوں پر اس کی نظر نہ جاسکی ہوگی۔ ہم اس قدر روشنی میں بھی نہ تھے اور ڈرائیور کو اتنی فراغت کہاں تھی کہ باقاعدہ ہمارا تعارف کرا سکتا۔ ڈاکٹر کو منتشر ہوجانا چاہیے تھا۔ اس کے چہرے کے رنگ بدلنے لگے۔ ہاتھ گاؤن کی جیب میں گیا۔ جیب میں ضرور کوئی ہتھیار ہوگا تاہم وہ ایک آزمودہ کار' حوصلہ مند شخص معلوم ہوتا تھا' اس نے اپنے آپ کو استوار کرلیا۔ ڈرائیور ہدایت علی کے بتانے پر کہ نواب موٹر میں موجود ہے' ڈاکٹر نے موٹر میں جھانک کے دیکھا۔ کسی برے خواب سے جیسے کسی کا وجود زیر و زبر ہوجائے' ایک لحظے کے لیے اس کی یہی حالت ہوئی۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا "یہ' کیسے ہوا؟"

"بعد کو سارا پوچھ لینا صاحب!" بٹھل نے تندی سے کہا "ابھی پہلے اپنا کام کرو۔"

ڈاکٹر نے ہینڈل گھما کے جھٹکے سے موٹر کا دروازہ کھولا اور نواب کی نبض ٹٹولنے لگا اور اس نے ہدایت علی سے کہا کہ موٹر اندر لے جائے۔

○☆○

برآمدے سے ملحق کمرا کھلوا دیا گیا تھا۔ نواب کو وہیں منتقل کردیا گیا۔ اندر لے جاتے ہوئے اس کی آنکھ کھل گئی تھی اور اس نے کراہنا شروع کردیا تھا لیکن ڈاکٹر نے سوئی لگاکر اسے پھر غنودہ کردیا۔ ڈاکٹر کو ایک مددگار کی ضرورت تھی۔ چند منٹ بعد ہی اس نے ہدایت علی ڈرائیور کو نور چاچا کے ہمراہ روانہ کردیا تھا۔ وہ کوئی آدھ گھنٹے بعد واپس آئے تو ان کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔ اس دوران میں' میں اور بٹھل برآمدے میں بیٹھے رہے۔ ڈاکٹر کا سارا گھر جاگ گیا تھا۔ اس نے حکم دیا ہوگا کہ ایک ملازمہ ہمارے لیے استری کیے کپڑے لے آئی۔ ہم نے منع کردیا۔ کچھ وقت جاتا تھا کہ جمرو اور زورا کو آجانا تھا۔ انہوں نے ہم سے کچھ فاصلے پر موٹر ٹھہروائی تھی اور ہمیں ان سے کوئی بات کرنے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ یہ یقین کرکے ہم ڈاکٹر کے گھر میں داخل ہوچکے ہیں' انہیں ہوٹل کی طرف چلے جانا چاہیے تھا۔ یہی ہوا۔ تھوڑی دیر میں وہ میرے اور بٹھل کے لیے کپڑے لے کے واپس آگئے۔ ملازمہ نے مردانہ نشست گاہ سے متصل غسل خانے تک بٹھل کی رہنمائی کی۔ پہلے بٹھل نے کپڑے تبدیل کیے' پھر میں نے۔ ہمارے لیے سادگی اور سلیقے سے سجا ہوا بیٹھنے کا کمرا کھول دیا گیا۔

اندھیرے کا رنگ بدل رہا تھا پھر اذانیں گونجنے لگیں۔ اور پرندے چہچہانے لگے۔ ملازمہ نے چائے لاکے رکھ دی۔ نہانے اور کپڑے بدلنے ہی سے جسم خاصا ہلکا ہوگیا تھا' چائے نے گراں باری کچھ اور کم کی۔ زورا اور جمرو بھی ہمارے ساتھ بیٹھے رہنا چاہتے تھے۔ وہ بہت چاق و چوبند نظر آنے کا بہروپ بھر رہے تھے۔ ان کی حالت چہروں سے عیاں تھی۔ وہ تو مسلسل سفر کرتے رہے تھے۔ جانے کس طرح کیا کیا منت سماجت' دھونس دھاندلی سے انہوں نے ٹیکسی والے کو روکے رکھا ہوگا۔ بٹھل راضی نہیں ہوا۔ اس نے انہیں ہوٹل جاکے آرام کرنے کی ہدایت کی۔

صبح ہوچکی تھی اور دھوپ چھتوں پر اتر آئی تھی تب کہیں ژولیدہ رو ڈاکٹر ناصر مرزا کمرے میں وارد ہوا۔ اس کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے۔ ہم دونوں یک لخت اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کی صورت دیکھنے لگے۔ وہ صوفے پر بیٹھ کے گم سا ہوگیا۔ ہم نے انتظار کیا کہ وہی کچھ بتائے تو بہتر ہے۔ اسے ایک وقفہ سکون و سکوت کی ضرورت تھی۔ چند لمحوں بعد اس کے ماتھے کی لکیریں دور ہوئیں "آگے خدا کی مرضی ہے۔" وہ خود کلامی کے انداز میں بولا۔

"زخم گہرا تھا صاحب!" بٹھل نے آہستگی سے کہا۔

ڈاکٹر سر ہلانے لگا اور سینے میں سانس بھر کے بولا "ہم یہی کرسکتے تھے۔ خدا سے بہتری کی توقع کرنی چاہیے۔ خون بھی منگوایا ہے۔"

"اپنے پاس بھی کمتائی نہیں ہے۔"

ڈاکٹر نے چشمہ صاف کیا۔ اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ کی ایک لہر آکے گزر گئی "خون ایسے' ہر کسی کا ہر کسی کو نہیں دیا جاسکتا۔"

بٹھل نے کہا کہ اسے بھی معلوم ہے۔ ڈاکٹر خاموش ہوگیا اور کچھ توقف کے بعد چونک کے بولا "آپ نے چائے وغیرہ بھی پی؟ ناشتے کا وقت بھی ہوچکا ہے۔"

"بس صاحب' آپ کی مہربانی' چائے ہم نے پی لی ہے' باقی ٹھیک ہے۔ اپنے کو ضرورت نہیں ہے" بٹھل نے نرمی سے کہا۔

نہیں نہیں، یہ تو ناشتے کا وقت ہے۔" اس نے بے چینی سے ملازمہ کو آواز دی۔ ملازمہ کے بجائے نور چاچا حاضر ہوگیا اور اس نے سر جھکا کے بتایا کہ ناشتا بس تیار ہوا چاہتا ہے۔ ڈاکٹر وہیں بیٹھا رہا، پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا، ہچکچاتے ہوئے کہنے لگا "کچھ ہمیں ہدایات علی ڈرائیور نے بتایا ہے لیکن یہ تو... یہ تو نہایت عجیب واقعہ ہے۔"

"کیا بولیں صاحب!" بٹھل نے بوجھل لہجے میں کہا۔

"ہمارے لیے یہ اپنی نوعیت کا پہلا کیس ہے" وہ اضطراب سے بولا "ریاست میں بسے ہوئے اب تو ہمیں بھی ایک زمانہ ہوگیا۔ یہاں ایسا نہیں ہوتا" اس کے لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کس فکر و تردد میں گھرا ہوا ہے۔ "آپ کو اندازہ ہے کہ یہ پولیس کا معاملہ ہے، پولیس دخل اندازی کرسکتی ہے، جواب طلبی بھی۔" اس کی آواز میں شکنیں پڑ گئیں۔ "نواب ثروت نہ ہوتے تو ہم بھی اس طرح..."

"اسی لیے تو آپ کی چوکھٹ پہ آئے تھے۔ تسلی کرو صاحب! آپ پر کچھ آئی تو بولیں گے کہ ہتھیار کے بل ہم نے آپ کو..."

ڈاکٹر نے پٹپٹاتی پلکوں سے بٹھل کو دیکھا اور اس کے ہونٹ کلبلا کے رہ گئے۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ ہدایت علی نے اسے کیا باور کرایا ہے۔ ہدایت علی کو توجیہہ و جواز کی مشکل پیش آئی ہوگی۔ اس نے لفظ بہت چبائے ہوں گے۔ وہ کمرے میں داخل بھی اس وقت ہوا تھا جب اس کے آقا کو زخمی ہوئے وقت گزر گیا تھا لیکن وہ وہاں موجود نہیں تھا یا دیر سے آیا تھا تو کیا ہوا، شریک کار تو ابتدا سے تھا۔ ڈاکٹر کی سیری نہیں ہوئی ہوگی مگر اس کے پاس حجت کا وقت نہیں تھا۔ گمان یہی ہے کہ ہدایت علی نے جو کچھ بھی گوش گزار کیا ہوگا، ڈاکٹر نے کسی جرح کے بغیر تسلیم کرلیا ہوگا۔ اب اسے فراغت تھی۔ اتنی دیر میں اس سلیم العقل شخص کا دماغ جانے کیا کیا واہم کاری، اندیشہ گری کرتا رہا ہو۔ اپنی تشفی کے لیے بجا طور پر اسے ہماری زبانی بھی احوال واقعی جاننے کی بے کلی ہونی چاہیے۔ بٹھل کے لیے یہی بہتر تھا کہ وہ محض ہدایت علی کے بیان کی تصدیق کرے۔ امکان یہی تھا کہ ہدایت علی نے ڈاکٹر کو وہی کچھ تاثر دینے کی کوشش کی ہوگی جو ہم نے باغ کے ملازموں کو دینا چاہا تھا۔ اس نے ہمیں کسی طور آلودہ نہیں کیا ہوگا۔ اسے ہر نفس اپنے مخدومی نواب کی خیر خواہی کی جستجو ہوگی۔ بہ صورت دیگر بٹھل کے لیے یہ مرحلہ اتنا ہی دشوار گزار تھا۔

اچھا ہوا کہ بٹھل کو اپنی داستان سرائی میں تاثیر پیدا

کرنے کا کچھ اور وقت مل گیا، دوسرے لفظوں میں نظ
وقت۔ نور چاچا نے ناشتا لگ جانے کی اطلاع دی۔ ز
گاہ کے وسط میں پردے کے پیچھے پہیوں پر چلنے والی لک
ایک دیوار تھی۔ پردہ ہٹا کے نور چاچا نے اسے بھی
طرف کردیا۔ یہ کھانے کا حصہ تھا۔ انگریزی طرز کی م
علاوہ ایک چوکی بھی دیوار کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔
ناصر مرزا کا تعلق شمالی ہندوستان کے کسی علاقے سے
ناشتے کا اہتمام باقاعدہ حیدر آبادیوں جیسا تھا، دوپہر اور
کے کھانے کی طرح۔ آدمی کی کتنی زندگی ایک دوسر
لحاظ و تکلف میں گزر جاتی ہے، کسی کو بھوک نہیں تھی
رسم ادائی کے بغیر زندگی جو ادھوری رہ جائے۔ ڈاکٹر کو
زیادہ بات کرنی نہیں آتی تھی یا اسے کسی پچھتاوے
گھیر رکھا تھا۔ وہ بجھا بجھا، تھکا تھکا سا تھا۔ اس نے
اصرار کی خانہ پری ضرور کی، کوئی اور بات کرنے کا محل
تھا۔ نور چاچا اور ملازم مسلسل دخل اندازی کرتے ر
ہدایت علی نے ڈاکٹر سے ہمارا تعارف اپنے آقا کے مہما
حیثیت سے کرایا ہوگا مگر ایک، صرف یہ اعتبار پہل
آمنا سامنا کرنے والوں کی دھند دور کرنے کے لیے ناکافی

ناشتے کے بعد ڈاکٹر ناصر مرزا، بٹھل کو لے کر نو
ثروت کے کمرے میں چلا گیا۔ میں بھی ان کے ساتھ ج
کے لیے بڑھ گیا تھا لیکن ڈاکٹر نے معذرت کر کے مجھے ر
دیا، کہنے لگا۔ "ایک وقت میں ایک شخص مریض کے
جائے تو مناسب ہے" ڈاکٹر نے بٹھل سے سلسلہ جنبانی
لیے دانستہ مجھے درگزر کیا ہوگا۔ وہ خاصی دیر بعد واپس آ
لگتا تھا، بٹھل کے عرض حال سے ڈاکٹر کا اطمینان نہیں
ہے۔ اس کے چہرے پر جمی ہوئی گرد کچھ اور گہری ہوگئی
مگر اس نے صوفے پر کمر ٹکاتے ہی مجھے پیش کش کی کہ
چاہوں تو نواب کو دیکھ سکتا ہوں۔ میں ہاتھ پاؤں باندھے
بیٹھا رہا، مجھ سے یہ بھی نہ پوچھا گیا کہ نواب کس حال
ہے۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ میں نواب کے لیے بہت متوحش
گا۔ وہ گویا مجھے تسلی دلاسا دینے لگا کہ سردست تو نواب
کوئی بات چیت ممکن نہیں ہے۔ اس پر ابھی تک غشی طا
ہے، ڈاکٹر نے وہی کچھ کہا جو ہر حکیم ڈاکٹر کے ورد زبان
ہے کہ اس نے تو اپنے سارے ہنر آزمائے ہیں، باقی خدا
ہاتھ میں ہے۔ پھر وہ بٹھل سے مخاطب ہو کے بولا کہ اس
بہت غور و فکر کے بعد ہدایت علی ڈرائیور کو نواب کے گھر
دیا ہے۔ نواب کی والدہ اور بہن کو اس حادثے کی اطلاع
چاہیے۔

"ٹھیک کیا آپ نے صاحب!" بٹھل نے منمناتی آواز میں تائید کی۔

"کیا کرتے!" ڈاکٹر بے چارگی کے انداز میں بولا "ان کی والدہ کم زور دل خاتون ہیں، عموماً بیمار رہتی ہیں۔ شوہر کے انتقال کے صدمے سے سنبھل نہیں پائیں۔ اب یہ سانحہ! نہ جانے کس طرح برداشت کرپائیں، بہرحال، چھوٹی موٹی بات ہوتی تو ہم چھپا لیتے۔ یہ تو نہایت سنگین... خدا خیر کرے۔"

"ایسا ہی ہوتا ہے صاحب!"

ڈاکٹر کو جھرجھری سی آگئی "ہمہ وقت نگرانی کی ضرورت ہے۔ ایک تجربہ کار آدمی تو ہم نے پاس چھوڑ دیا ہے، کسی مستقل نرس کا بھی انتظام کرنا ہوگا۔ ہمیں بھی مطب اور ہسپتال سے کئی دن کی رخصت لینی پڑے گی۔"

"آپ زیادہ جانتے ہو صاحب!"

"یہ بات چھپی تو نہیں رہ سکتی" وہ بے قراری سے بولا۔

"یہ تو آپ نواب صاحب کی ماں بہن اور رشتے داروں پر چھوڑ دو۔"

"ہاں" ڈاکٹر کھوئی ہوئی آواز میں بولا "وہی اس کا فیصلہ کریں۔"

"آپ تو سب کو صاف بول دیں۔"

"جی جی ہاں" وہ تذبذب سے بولا "آپ ٹھیک کہتے ہیں، ہمارا کیا ہے؟"

"ہم ادھری ہیں صاحب! کوئی الٹی سیدھی ہوئی تو ہم نے پہلے بول دیا ہے، آپ ہماری طرف انگلی اٹھا دیں۔"

"نہیں نہیں" ڈاکٹر پر عواقب کا خوف غالب آگیا "خدا نہ کرے، ایسی نوبت آئے۔"

"فکر نہ کرو صاحب! بھروسا رکھو۔ اسپتال بیچ میں پڑتا تھا، پر سارے میں فیل مچ جاتا۔"

بٹھل کے یقین آمیز لہجے سے ڈاکٹر کا تکدر کسی قدر کم ہوا مگر میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ ڈرائیور ہدایت علی کے گھر جانے کا سن کے مجھے اور وحشت ہونے لگی تھی۔ اب کسی وقت کسی لمحے نواب کی ماں اور بہن یہاں آسکتی تھیں۔ یہاں تو کہرام بپا ہوجائے گا۔ ہمارے یہاں دھرنا دیے بیٹھے رہنے سے حاصل بھی کیا ہے؟ ہم اس طرح نواب کے لیے کیا کرسکتے ہیں، کون سی مسیحائی؟ یہ اسپتال بھی نہیں، ڈاکٹر کا گھر ہے۔ مجھے ڈاکٹر کے اٹھ جانے کا انتظار تھا، تبھی میں بٹھل کو ٹوک سکتا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اندر کمرے میں ان دونوں کے درمیان کیا گفتگو ہوئی ہے۔ بٹھل نے حیدر آباد میں اپنی موجودگی، نواب سے اپنے تعلق، سفر کے مقصد اور اپنے قیام کے بارے میں کیا کچھ بتایا ہے۔ ڈاکٹر نے اتنے سوال نہ کیے ہوں تو بھی بٹھل نے اپنے تئیں اس کا آئینہ صاف رکھنے کی کوشش کی ہوگی۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی، جیسے بٹھل نے میرے دل کا حال پڑھ لیا ہو۔ مجھے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ اتنی جلد ہمیں فرصت مل جائے گی۔ ڈاکٹر سے مزید کچھ کہے بغیر بٹھل اٹھ گیا۔ ڈاکٹر نے اسے روکا بھی نہیں۔ وہ ہمیں دروازے تک رخصت کرنے آیا اور اسے یاد آیا کہ ڈرائیور تو موجود ہی نہیں ہے۔ اس نے ہدایت علی کی واپسی تک ہم سے ٹھہر جانے کے لیے کہا اور اپنے گھر سے چارکمان تک کی مسافت کا ذکر کیا۔ مطلب واضح تھا کہ بٹھل نے ہوٹل میں قیام کے بارے میں اسے بھی نہیں بتایا ہے۔ ڈاکٹر نے ازراہ وضع معذرت کی کہ موٹر تو اس کے پاس بھی ہے لیکن وہ خود چلاتا ہے اور نواب کی وجہ سے اس وقت اس کا گھر سے نکلنا ممکن نہیں ہے۔ "آپ پسند کریں تو بالائی منزل کا کمرا کھلوا دیا جائے۔ وہاں آپ آرام کرسکتے ہیں۔" اس نے دبے لفظوں میں کہا۔

بٹھل نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہنے لگا کہ نیند تو کھونٹے ہی پہ ڈھنگ کی آتی ہے۔ بٹھل نے ضرور تھکاوٹ اور آرام کا ذکر کیا ہوگا۔ یعنی ڈاکٹر کے یہ بتانے سے پہلے کہ ہدایت علی ڈرائیور نواب کی ماں کو اطلاع دینے کے لیے گھر جا چکا ہے، بٹھل نے اس سے اجازت مانگ لی تھی۔

"ہم ملازم کو بھیج کے آپ کے لیے سواری کا انتظام کرتے ہیں" ڈاکٹر نے شائستگی سے کہا۔

"چلے جائیں گے صاحب!" بٹھل پھیلی ہوئی آواز میں بولا "سواری ملنے کا ٹائم ہے۔ تھوڑا پیدل چلیں گے تو بدن کھلے گا۔ آپ اندر جا کے نواب صاحب کو دیکھو۔ ادھری آپ کی ضرورت زیادہ ہے۔ ہم لوگ شام دام کو پلٹیں گے، اچھی بات سننے کے لیے۔"

"انشاء اللہ" ڈاکٹر کی آواز کی ناتوانی شاید بٹھل نے بھی محسوس کی ہو۔

○✲○

آہستہ آہستہ اقامتی علاقے سے گزر کے ہم بڑی سڑک پر آگئے۔

زنداں کے جیسے در کھل گئے ہوں۔ میرے پیر لپک رہے تھے۔ لگتا تھا جیسے زمین نرم ہوگئی ہے۔ دھوپ خوب نکل آئی تھی حالانکہ چوراہے کی گھڑی میں ابھی نو بج رہے تھے۔ دکانیں کھل رہی تھیں۔ دفتروں کا وقت ہوگیا تھا اور سڑک پر راہ گیروں اور سواریوں کا ہجوم تھا۔ یہ معظم جاہی مارکیٹ کے

گردونواح کا علاقہ تھا۔ عابد شاپ روڈ یہاں سے اتنی دور نہیں تھا۔ ہم پیدل بھی جاسکتے تھے مگر بٹھل نے گھوڑا گاڑی روک لی اور ہم چند منٹ میں ویکاجی ہوٹل پہنچ گئے۔ وہ دونوں جاگ رہے تھے۔ پہلی دستک پر انہوں نے دروازہ کھول دیا اور ہمیں دیکھ کے ان کی آنکھوں میں شرارے کوندنے لگے۔

"ہا استاد!" جمرو نے بے ساختہ صدا لگائی اور بٹھل سے لپٹ گیا۔ بٹھل نے بھی اسے بازوؤں میں بھرلیا۔ زورا میرے سینے سے چمٹ گیا۔ ان کے جسم دھڑک رہے تھے۔

"چائے منگا رے" بٹھل جوتا اتار کے مسہری پر نیم دراز ہوگیا۔

زورا نے فوراً گھنٹی بجادی۔ وہ دونوں مسہری پر بیٹھ کے پیر دبانے لگے۔ بٹھل نے انہیں منع بھی کیا لیکن وہ نہیں مانے "قسم سے استاد! سالی ایسی رتیا کبھی نہیں کاٹی۔" جمرو کے لہجے میں نازبرداری بھی تھی' تلخی بھی۔

"ہاں رے!" بٹھل کا منہ بگڑ گیا "ابھی دودھ کے' تیرے کاں ٹوٹے ہیں۔"

"ایمان سے رات کو تو اپنا تختہ ہوگیا تھا استاد! وہ سالا ٹیکسی والا' یتیم خانے کی اولاد موٹر کدھری پیڑویڑ میں اڑادیتا۔ بہت ٹنٹا کیا استاد حرامی نے' کیا بولوں۔ کبھی پیر پکڑتا' کبھی ہاتھ جوڑ کے بیوی بچوں کا واسطہ دیتا۔ بیچ میں منہ بند کرنے کے لیے ہم لوگ نے بار بار ہڈی ڈالی پر وہ تو ایک دم اکھڑ گیا تھا۔ آخر میں سارے پیسے منہ پر ماردیے۔ بولتا تھا' مائی باپ' اپن کا گناہ معاف کرو' اپن کو آزادی دے دو۔ بھوتنی کا ساری وقت چراند کرتا رہا لیکن وہ جو کلکتیا لوگ بولتے ہیں' پورا روڈ کا راجا تھا' اپنے کام میں سولہ آنے فٹ' کتنی بار نواب کی موٹر سے آگے لے گیا اور لوٹا کے لے آیا۔"

"پیسے میں تو ڈنڈی نہیں ماری رے۔"

"وہ تو اپن نے بھردیا دادا!" زورا تڑخ کے بولا "کیا یاد کرے گا حرام کا' چھ مہینے رگڑا لگائے کے بھی اتنی پگار نئیں بناتا۔"

بیرا چائے لے آیا۔ چائے پی کے بٹھل نے بیڑی سلگائی اور مسہری پر پاؤں پھیلادیے اور زورا سے کہا کہ وہ کھڑکیوں کے پردے برابر کردے اور بہتر ہوگا کہ سب' دوپہر کے کھانے تک آرام کرلیں۔ وہ دونوں اس کے پاس سے اٹھنا نہیں چاہتے تھے اور پہیلیاں پوچھنے کے لیے بے تاب تھے۔ گو انہیں خوب معلوم تھا کہ بٹھل سے اس کی آمادگی کی شرط ہی پر کچھ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ کھڑکیوں کے پردے

گرانے سے کمرے میں تاریکی ہوگئی تھی۔ کہتے ہیں کہ بینائی روشنی سے مشروط ہے۔ روشنی نہ ہو تو بینائی کام نہیں کر[تی] اور بینائی نہ ہو تو روشنی اندھی ہوجاتی ہے مگر یہ شرط پور[ی] ہونے کے باوجود ایک اندھیرا پھر بھی باقی رہتا ہے' اندر اندھیرا۔ باہر کے اندھیرے میں نیند اچھی آجاتی ہے پر جب اندر ہی اندھیرا جاگزیں ہو تو آنکھیں جلتی رہتی ہیں۔ سار[ی] رات وہ اسی صبر آزما اندھیارے سے دوچار رہے تھے۔ [وہ] بھی تو اتنے شامل رہے تھے جتنا میں اور بٹھل' بلکہ ہم سے کہیں زیادہ بے بسی اور بے چارگی کا وقت انہوں نے گزار[ا] تھا۔ انہیں اس فشار و غبار میں نیند کس طرح آسکتی تھی۔ [وہ] لفظ تلاش کرتے رہے۔ جمرو کو کچھ اور سجھائی نہیں دیا تو ا[س] نے ایک آزمودہ حربہ اختیار کیا' راکھ کریدنے اور بھوبھل میں پھونکیں مارنے کا۔ اس نے چیختی آواز میں کہا "رات [تو] استاد بس کنوں کی کسر رہ گئی تھی۔ باغ میں تمہارے اندر جانے کے بعد ہم لوگ ادھری اندھیرے میں پیڑ کے نیچے کھڑے ہوگئے تھے۔ وہیں ڈٹے رہتے تو وہ اٹھائی گیرے' حرام زادے ایسے اندر نہیں جاسکتے تھے۔ سالوں کی قسمت ساتھ دے رہی تھی کہ ادھری ہم جگہ سے ہٹے' جانے کون سی کھو[لی] سے لاری اپنے پیچھے آگئی۔ اپنے کو لگتا ہے' وہ سور کی اولاد تمہارے پہنچنے سے پہلے باغ کے آس پاس ہی کدھری چھپے ہوئے تھے۔"

بٹھل ہاتھ پھیلائے بے حس و حرکت پڑا جمرو کا ہذیان سنتا رہا۔ جمرو نے بھی وقفہ نہیں کیا۔ اس کے کہنے کے مطابق' انہوں نے باغ کے دروازے سے دور درختوں کی آڑ میں ایک محفوظ جگہ موٹر ٹھہروائی تھی۔ موٹر سے اتر کے چند قدم کا فاصلہ طے کرنے پر دروازہ ان کی نگاہوں کے حصار میں آجاتا تھا۔ وہ وہیں آکے کھڑے ہوگئے تھے کہ انہوں نے دو آدمیوں کو دروازے سے نکلتے دیکھا۔ کچھ دور چلے جانے پر انہوں نے موٹر میں بیٹھ کے دونوں کا پیچھا کیا۔ آگے جاکے انہیں معلوم ہوا کہ ایک نواب کا ڈرائیور ہے۔ دوسرا جمرو کے خیال میں ضرور کوئی موٹر کا کام جاننے والا باغ کا ملازم ہوگا کیونکہ انہوں نے جلد ہی موٹر درست کرلی تھی۔ میں نے اور بٹھل نے دخل نہیں دیا کہ ڈرائیور نے باغ کے کسی ملازم کو رات کی وجہ سے احتیاطاً ساتھ لیا ہوگا۔ موٹر خراب ہی کہاں تھی جو درست ہونے میں وقت لگتا۔

جمرو کے بہ قول اسی دوران میں لاری وہاں پہنچی تھی اور اس میں سوار لوگ باغ میں جاچکے تھے۔ نواب کی موٹر کا تعاقب کرتے کرتے جمرو اور زورا آگے جاکے ٹھہر گئے۔

[دیکھ]کے کہ نواب کی موٹر کا رخ باغ کی طرف ہے' انہوں نے [ٹھہر] کے پھر اس کا تعاقب کیا اور درمیان میں ایک بڑا فاصلہ [رکھا تا]کہ کوئی شبہ نہ ہونے پائے۔ نواب کی موٹر باغ میں داخل [ہوئے د]یر ہوگئی تب وہ اپنی پرانی جگہ واپس آئے اور چند منٹ [توق]ف کرکے انہوں نے لاری تک پہنچنے کے لیے پیدل بڑھنا [شرو]ع کیا۔ مخالف سمت میں باغ کی فصیل کے ساتھ [درو]ازے سے کچھ دور لاری رکوائی گئی تھی۔ انہوں نے اندر جھانک کے دیکھا۔ لاری میں کوئی نہیں تھا۔ زورا نے [اصرا]ر کیا کہ لاری کے پہیوں کی ہوا نکال دی جائے۔ جمرو کو یہ [اقد]ام قبل از وقت معلوم ہوا۔ اس نے زورا کو روک دیا اور [دلیل] دی کہ وہ دونوں تو بہرحال وہیں موجود ہیں۔ موقع پر کسی [وقت] بھی فائر کرکے ٹائروں کو نشانہ بناسکتے ہیں۔ پہلے انہیں [لار]ی میں سوار لوگوں کی آمد کا سبب اور صورت حال کی [نوع]یت سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

وقت گزر گیا۔ دروازے پر سناٹا ہی چھایا رہا۔ جمرو [مطم]ئن تھا کہ بٹھل کو باغ کے اردگرد اس کی اور زورا کی [موج]ودگی کا یقین ہوگا۔ ضرورت پڑنے پر بٹھل کسی طور ان [سے] رابطہ کرنے کی سبیل نکالے گا۔ موٹر کی خرابی کے وقت [نوا]ب کی مدد کے لیے ٹیکسی رکوا کے وہ بٹھل کو اپنی موجودگی [سے] باخبر کرہی چکے تھے۔ تمام تر وحشت اور اضطراب کے [باو]جود جمرو کو یہ اعتماد بھی تھا کہ اندر بٹھل اکیلا نہیں' ساتھ [والا] باہر بھی ہے اور دونوں مسلح ہیں۔ باغ سے لوگ یقیناً اسی [راس]تے سے باہر آئیں گے۔ سو کسی غیر معمولی علامت یا [مشک]وک صورت نظر آنے تک انہیں تحمل کرنا چاہیے۔ وقت [سسک] سسک کے گزر رہا تھا۔ ان کے پاس کھانے پینے کا [س]امان بھی نہیں تھا۔ ڈرائیور الگ عاجز کررہا تھا۔ وہ بے چینی [س]ے دروازے پر نگاہیں جمائے ٹہلتے رہے۔ دیر تک خاموشی [رہ]ی پھر اچانک فائروں کی آواز سے گردوپیش پر چھایا ہوا [سک]وت متلاطم ہوگیا۔ جمرو اور زورا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ [ک]یا کریں۔ باغ کی دیوار پھلانگیں یا سیدھے دروازے سے [ان]در داخل ہونے کے لیے ہاتھ پاؤں ماریں۔ وہ دروازے [کے] قریب ہوتے گئے اور انہیں بھاگتے' چیختے لوگوں کا شور [سن]ائی دیا۔ پھر دروازے سے چند آدمی مجنونانہ حالت میں باہر [نکل]تے دکھائی دیے۔ ان سے بھاگا نہیں جارہا تھا کیونکہ ان کے [کن]دھوں پر زخمی یا مردہ آدمی لدے ہوئے تھے۔ وہ جلدی [ج]لدی انہیں لاری میں ڈالتے رہے۔ جمرو اور زورا اسی وقت [ا]ن کے سروں پر پہنچ کے انہیں گھیر سکتے تھے لیکن شور مچاتا ہوا [ہ]جوم مسلسل دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جمرو اور زورا

بھاگتے ہوئے اپنی موٹر کے پاس پہنچے اور ادھر لاری روانہ ہوئی' ادھر انہوں نے اپنی موٹر کو حرکت دی۔ لاری ابھی خاص سڑک کے نکڑ کے پاس پہنچی تھی کہ اپنی موٹر اس سے آگے نکال کے انہوں نے بیچ سڑک پر کھڑی کردی۔ لاری اب موٹر کے اوپر ہی سے آگے جاسکتی تھی۔ انہوں نے اپنے تمنچے نکال لیے۔ اتنے میں بٹھل اور میں وہاں پہنچ گئے۔

گزری ہوئی رات کا آموختہ جمرو کے لیے تکلیف دہ تھا۔ اس کے چہرے پر جال سا پڑ گیا۔ اس کا گلا خشک ہوگیا تھا اور آواز بھی جھرجھرانے لگی تھی۔ وہ چپ ہوگیا۔

بٹھل آنکھیں کھولے بے سدھ پڑا رہا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں یا وہ وہاں موجود ہی نہ ہو۔ بہت دیر بعد اس نے زبان کھولی "سوجا رے اب!" اس نے بھاری آواز میں کہا۔

"ٹھیک ہے استاد!" جمرو ترشی آمیز پژمردگی سے بولا۔

یہ تو محض تمہید تھی۔ اس احوال سے گزشتہ رات ہڈیوں میں سوزش کرنے والے وقت کا حساب پیش کرنا مقصود نہیں تھا۔ کچھ باور کرانا یا اپنے لیے کوئی اجر چاہنا۔ یہ ان کی وضع نہیں تھی۔ یہ تو ایک طرح کا حسن طلب تھا اور بلاغت کی بات تھی۔ وہ بٹھل کے خون کی گردش تیز کرکے اس کی زبانی کچھ جاننے کے آرزومند تھے اور ہرچند انہیں اس جستجو کا پورا استحقاق تھا مگر اڈے کے استادوں سے اس طرح سوال نہیں کیے جاتے' اور وہ تو بٹھل تھا۔ جمرو نے اپنے بڑے بھائی جامو' اور زورا نے بمبئی کے سب سے بڑے دادا' پیرو دادا کو بٹھل کے سامنے نیچی پلکوں اور جھکی آواز میں بات کرتے دیکھا تھا۔

زورا سے برداشت نہیں ہوا "پر دادا!" وہ بچوں کے سے انداز میں مچل کے بولا "اپن کا سر ابھی تک گھمائے لا ہے کے سالا وہ چڑی مار کون لوگ تھا؟"

"ٹٹو تھے رے' گھورے پہ کے۔"

"بھاڑے کا ہوگا پر آخر۔۔۔" زورا کے حلق میں آواز اٹک گئی۔

"وہ کتے تو نہیں تھے استاد جو پچھلی مرتبہ ادھری باوا کی حویلی میں۔۔۔ آئے تھے" جمرو نے دبی زبان سے کہا۔

"نہیں رے' دوسرے تھے' نواب کے بھیجے۔"

"نواب کے!" ان کی آنکھیں پھیل گئیں "اپنا یہ' یہ نواب؟" دونوں نے ایک ساتھ کہا۔ انہیں یقین نہیں آرہا تھا۔

بٹھل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جمرو اور زورا کو سکتہ

سا ہو گیا تھا۔ بٹھل نے جماہی لے کے کروٹ بدلی۔ دونوں اس کی پائنتی پر گم صم بیٹھے رہے پھر جمرو نے بٹھل کے پیروں پر چادر ڈال دی اور اٹھ کے برابر کے کمرے میں آگئے اور انہوں نے مجھے نوچنا کھسوٹنا شروع کردیا۔ میں ان کے علم میں بٹھل سے زیادہ کیا اضافہ کرسکتا تھا۔ اسے بھی اس سے زیادہ کیا معلوم تھا۔ وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ آخر نواب نے کیوں، کیا نواب میں توازن کی کوئی خامی ہے؟ اسے یہ راستہ اختیار کرنے اور اتنا چکر کاٹنے کی کیا ضرورت تھی اور اسے ڈاکٹر کے حوالے کرنے میں بٹھل کو اتنی تلابیلی کیوں تھی؟ وہ طرح طرح کے سوال کررہے تھے۔ ان میں سے کسی ایک کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ آدمی کے اندر خود کچھ کم کانٹے نہیں ہوتے، برچھیاں، خنجر اور آگ۔ ذرا ہوا رخ بدل کے چلی، یہ کانٹے رگ جاں میں اٹدنے لگے، برچھیاں اور خنجر تن گئے، آگ بھڑکنے لگی۔ میں نے اپنے آپ کو بہت روک کے رکھا تھا۔ انہوں نے پھر مجھے منتشر، متزلزل کردیا۔ میں تو صرف اتنا بتا سکتا تھا کہ بہ ظاہر نواب اچھی طرح دیکھتا اور سنتا تھا۔ اس کی نشست و برخاست، لہجہ ولب میں کوئی عیب نہیں تھا بلکہ یہ سلیقہ اور شائستگی تو لوگ اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آخر مجھے سوئیاں چبھوتے چبھوتے جمرو اور زورا خود ہی تھک گئے اور انہوں نے مسہری پر جسم ڈال دیے۔

میں بھی ان کے ساتھ بستر پر ڈھیر ہو گیا تھا۔ کمر ٹکاتے ہی جوڑ جوڑ دکھنے لگا۔ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ وہ بھی میری طرح مسہری پر لوٹتے رہے۔ بٹھل اسی لیے پہلو تہی کررہا تھا۔ ان کے اعصاب کے لیے کچھ دیر کی بے حسی و خوابیدگی ضروری تھی۔ لوگ غلط نہیں کہتے، جاننے سے نہ جاننا ہی کچھ بہتر ہوتا ہے۔ آگہی کبھی کیسی تلوار بن جاتی ہے، اور ادھوری آگہی تو اور عذاب ہے۔ اور کسی نے کہا ہے، مکمل آگہی تو ہوتی بھی کہاں ہے؟

اندھیرا ہونے لگا تھا۔ مغرب کی اذانوں کے بعد ہم کمرے سے نکل گئے۔ سڑک پر آتے آتے روشنیاں جل گئی تھیں۔ عابد شاپ روڈ پر آخر شام یا ابتدائے شب کی روشنیاں بہت سہانی لگتی ہیں۔ جمرو اور زورا ہمارے ساتھ نکلے تھے لیکن ہوٹل سے باہر آکے ہم سے تیس چالیس قدم پیچھے ہو گئے۔ کوئی خاص بات تھی کہ عابد شاپ روڈ پر عام دنوں سے زیادہ گہما گہمی تھی۔ ہم متوازن رفتار سے معظم جاہی مارکیٹ کی طرف بڑھتے رہے۔ گھوڑا گاڑی میں یہ رستہ نو دس منٹ سے زیادہ کا نہیں تھا۔ ڈاکٹر کے مکان کے علاقے تک پہنچتے پہنچتے آدھا گھنٹا ہو لیا تھا۔ بہرحال اب کچھ دور اگلے چوراہے سے ہمیں بائیں ہاتھ کو مڑجانا تھا۔ پھر دو فرلانگ بعد ڈاکٹر کا مکان تھا۔ یکایک میرے قدم ٹھٹک گئے۔ میں نے بٹھل کو کہنی ماری۔ وہ بھی چوکنا ہو گیا۔ چارہ رہ گیا تھا کہ ہم پہلو کی دکان میں داخل ہوجائیں۔ دونوں اڈے کے آدمی تھے۔ مولانا کا نام مجھے خوب یاد تھا، دوسرے کا یاد نہیں آرہا تھا۔ وہ آکا کی بے دخلی اور بھورے دادا کی چوکی پر بٹھائے جانے کے تمام معاملات میں شریک رہے تھے۔ وہ کالے دادا کے قریب کے آدمی تھے۔ دادا کی چوکی پر بٹھائے جانے کے تمام معاملات میں شریک رہے تھے۔ وہ کالے دادا کے قریب کے آدمی تھے۔ اتفاق سے بروقت میری نگاہ پڑگئی۔ بٹھل بھی کہیں گم تھا۔ ان دونوں کا دھیان بھی بٹا ہوا تھا۔ دکان میں ہمارے داخل ہوتے ہی ادھر پیچھے، جمرو اور زورا بھی سنبھل گئے ہوں گے۔ وہ ہارڈ ویئر، تالے، کنڈی وغیرہ کی دکان تھی۔ ہم نے اپنے جسم ترچھے کرلیے تھے۔ بس وہ لوگ اپنی دھن میں گزرتے چلے گئے۔ حیدر آباد میں ہماری موجودگی ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگی۔ کہیں وہ ہماری ایک جھلک دیکھ لیتے تو وہیں پھیل جاتے اور آناً فاناً اڈے کے آخری آدمی تک یہ خبر پہنچ جاتی۔ بھورے دادا، کالے دادا، نام بلی کا ساجن دادا، جس جس کو معلوم ہوتا، ہماری طرف اڈا چلا آتا۔ بھورے دادا تو بالکل پاگل ہوجاتا۔ بٹھل نے آکا کو رسوا کرکے اس گوشہ نشیں، دور افتادہ کو اڈے کے تخت پر بحال کیا تھا اور کالے دادا اس کی معاونت پر تعینات کیا تھا۔ بھورے دادا نے تو خواب میں بھی نہ سوچا ہوگا کہ اڈے کی چوکی کی عزت کبھی اسے یوں نصیب ہوگی۔

برس دو برس نہیں گزرے تھے، مہینوں کی بات تھی۔ اتنی جلد اڈے پر کسی اور تبدیلی کا امکان تو نہیں تھا۔ آکا کی طرح اب کسی نئے دادا کا اڈے کی چوکی ہتھیانے کے لیے سر اٹھاتے ہوئے دس بار آگا پیچھا دیکھنا لازم ہے۔ انہیں اندازہ ہوگا کہ دو مرتبہ غیر متوقع طور پر حیدر آباد وارد ہوکے ہم نے نقشہ ہی پلٹ دیا تھا۔ اڈے پر بھورے اور کالے دادا مسند نشیں ضرور تھے لیکن کوئی وریردہ کی بات نہیں تھی۔ سب کا چشم دید تھا کہ اڈے کے اصل دعوے دار کون ہیں اور اگر، اس دوران کسی سرپھرے دادا نے واقعی بھورے اور کالے دادا کو ہٹا کے چوکی پر قبضہ جمالیا ہے تو شہر میں بٹھل دادا کی موجودگی کی خبر تو اور آگ لگ جائے گی کا مترادف ہوگی۔ علاقے کے تھانے کا انچارج بھی ابھی تک وہی کج کلاہ

در علی ہونا چاہیے۔ زنجیر کا سلسلہ اڈے سے تھانے، تھانے سے نواب راجا لوگوں تک جاتا ہے۔ ابا جان کی حویلی میں ... زن بھیجنے والے اور حیدر آباد سے ہماری واپسی کے وقت ... ل میں ہمارے پیچھے کتے دوڑانے والے ان سرگران ... اب راجا لوگوں کا خون تو رگوں میں کوندنے لگے گا۔ وہ ... ارے شہر میں ہمارے لیے جال بچھا سکتے ہیں۔

اندھیرا اور بڑھ جانے تک ہوٹل میں ٹھہرے رہنے کی ... احتیاط سے بھی کیا حاصل تھا۔ اڈے کے آدمی اور ہمارے ... طلب گار، نواب راجاؤں کے نمک خوار شام ڈھلتے ہی ... آشیانوں میں روپوش نہیں ہوجاتے ہوں گے۔ ادھر ہم ڈھاٹا ... باندھ کے تو سڑکوں سے نہیں گزر سکتے۔ بٹھل کو خوب ... احساس ہوگا کہ ایسی کسی ڈبھیڑ کے نتائج کیا ہوسکتے ہیں۔ ان ... کے لیے ہمیں تیار ہی رہنا چاہیے۔ اس وقت ہم بچ گئے ... تھے۔ آگے چند قدم بعد ہی اڈے کا کوئی دادا ٹکرا سکتا تھا۔ وہ ... زورا اور جمرو کو ابھی اچھی طرح پہچانتے تھے۔

ڈاکٹر ناصر مرزا کی گلی میں داخل ہونے تک اندھیرا اور ... تیز ہو گیا۔ جمرو اور زورا بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ ساری ... عمارت روشن تھی۔ دو موٹریں دروازے کے پاس کھڑی ... تھیں۔ بس کچھ فاصلہ رہ جاتا تھا کہ ہمیں ٹھہر جانا پڑا۔ اسی ... لمحے اندر سے ڈاکٹر ناصر مرزا دو آدمیوں کے ساتھ باہر نکلا۔ ... اس کے پیچھے نواب کا ڈرائیور ہدایت علی بھی تھا۔ اس نے ... بڑھ کے دروازہ کھولا۔ ایک معمر شخص کے موٹر میں بیٹھنے پر ... موٹر روانہ ہوگئی۔ ڈاکٹر ناصر مرزا اور دوسرا آدمی فوراً اندر ... واپس چلے گئے۔ وہ ہمیں یقیناً نہیں دیکھ پائے تھے۔ بنگلے کا ... دروازہ بند ہو گیا تو ہم نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ بوڑھا ... ملازم شاید برآمدے ہی میں بیٹھا تھا۔ گھنٹی بجتے ہی وہ باہر ... آگیا۔ جیسے اسے ہماری آمد کی توقع نہیں تھی، ہمیں دیکھ کے ... بے تاب ہو گیا اور اندر چلنے کے لیے اصرار کرنے لگا۔

بٹھل نے ہاتھ اٹھا کے اسے تحمل کا اشارہ کیا اور نواب کے بارے میں پوچھا۔

ملازم کا چہرہ کھنچ گیا۔ اس نے آہ بھری اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے حسرت سے بولا "سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔"

بٹھل کے استفسار پر شکستہ آواز میں اس نے بتایا کہ صحیح حال تو ڈاکٹر ہی کو معلوم ہے۔ وہ تو اتنا جانتا ہے کہ صبح سے اب تک اس کے مالک کو ایک پل کے لیے قرار نصیب نہیں ہوا ہے۔ ہمارے جانے کے کچھ دیر بعد نواب کی والدہ اور اس کی بہن آگئی تھیں۔ ڈاکٹر کو نواب کے علاوہ انہیں سنبھالنے کا کام بھی کرنا پڑ رہا ہے۔ سارا گھر ہی صبح سے انہی کی دل جوئی میں مصروف ہے۔ ان دونوں کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ مسلسل کلام پاک کا ورد جاری ہے۔ نواب کا ایک رشتے دار صبح گیارہ بجے آیا تھا، وہ ابھی تک موجود ہے۔ بوڑھے ملازم نے بتایا کہ دروازے پر جو موٹر کھڑی ہے، وہ اسی کی ہے۔

بٹھل سنتا رہا اور اس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ اور کوئی نہیں آیا، بڑے صاحب، نواب کو پوچھنے؟"

جیسے کسی نے مجھ خوابیدہ کے چٹکی بھری ہو، میرا کچھ یہی حال ہوا۔ مجھے شبہ ہوا کہ یہ کوئی فریب سماعت ہے۔ سو میں نے اپنے سنے ہوئے کا اعادہ بلکہ توثیق کرنے کی جستجو کی مگر بٹھل نے کچھ اور نہیں کہا تھا۔ ظاہر ہے، اس نے کسی سبب کے بغیر ڈاکٹر کے ملازم سے یہ سوال نہیں کیا ہوگا۔ ملازم کے لہجے سے ابتدا ہی میں یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ ابھی تک سب کچھ نواب کے گھر تک رکھا گیا ہے۔ پولیس تک بھی بات نہیں پہنچی ہے۔ ایسی کسی صورت میں ہمارے لیے ملازم کی پذیرائی کا تور شاید مختلف ہوتا۔ نواب ثروت یار کی عیادت کے لیے بٹھل کو اور کس کس کی آمد کی توقع ہے؟ ایک شخص کے سوا کسی اور سے اسے کیا غرض تھی؟ اس کی مراد مولوی صاحب ہی ہوسکتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے، بٹھل کو شہر میں مولوی صاحب کی موجودگی کا یقین ہے۔ نواب کے سانحے کی اطلاع سن کے انہیں لازماً یہاں آنا چاہیے۔ یہ بھی محض نواب کی فسانہ طرازی ہوگی کہ مولوی صاحب اس کی زمینوں والے مکان میں مقیم ہیں۔ سارے جسم میں چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ نواب صاحب جیسے صاحب اقبال کے لیے شہر میں مکانات کی کیا تنگی تھی کہ مولوی صاحب کو اتنی دور ٹھہرانے کی ضرورت پڑگئی مگر نواب کا اس طرح کیا مقصد...! کون سا؟ ... میرا دماغ کچھ کام ہی نہیں کرتا تھا۔

بوڑھے ملازم نے نفی میں جواب دیا، پھر اسے یاد آیا کہ ڈاکٹر ناصر مرزا نے اپنے ایک مربی، شہر کے مشہور ڈاکٹر محمود علی صدیقی کو مشورے کے لیے بلایا تھا۔ وہ ابھی ابھی نواب کی موٹر میں واپس گیا ہے۔ "بس ابھی آپ لوگاں کے آنے سے چار پانچ منٹاں پہلے بڑے ڈاکٹر صاحب گئے ہیں" بوڑھے نے بتایا۔

بٹھل سر ہلا کے رہ گیا۔ بوڑھا آدمی بھی کہیں کھو گیا تھا۔ اسے کچھ دیر بعد خیال آیا کہ ہم لوگ تو دروازے پر کھڑے ہیں۔ وہ بوکھلا سا گیا اور اندر چلنے کے لیے اصرار کرنے لگا۔

بٹھل نے کسی قدر توقف کیا اور اندر داخل ہو گیا۔

بوڑھا ہمیں اسی نشست گاہ میں لے گیا۔ جہاں صبح ہم بیٹھے ہوئے تھے۔ کمرے میں سوگوار سی خاموشی تھی۔ میرا دل ڈوبا جا رہا تھا۔

بار بار میرا دھیان مولوی صاحب کی طرف جاتا تھا۔ مولوی صاحب کی یہاں آمد کا تو نواب پر گزرنے والی افتاد کی اطلاع پر منحصر ہے۔ چاہے وہ نواب صاحب کے وسیع مکان کے کسی حصے ہی میں کیوں نہ مقیم ہوں۔ اب تک لوگ یوں رکے ہوئے ہیں کہ انہیں خبر ہی نہیں ہوئی ہے مگر تابہ کے! نواب کے زخم خشک ہونے اور پوری طرح تندرست ہو جانے کا مرحلہ کوئی دو چار دن کی بات نہیں ہے۔ خود نواب کے گھر ملازموں کا ایک لاؤ لشکر ہے۔ شہر میں اس کے رشتے داروں اور شناساؤں کی بھی کوئی کمی نہ تھی۔ دولت میں تو رشتے یوں بھی ہزار ہو جاتے ہیں۔ دولت تو شہد کے مانند ہوتی ہے اور بڑی داد طلب ہوتی ہے۔ خراج ادا کرنے والے ایک ہجوم کے بغیر اسے چین نہیں آیا۔ نواب کی عزت و جاہ کا سلسلہ تو پشتوں سے ہے۔ زیادہ دیر تک نواب کو اس کے پرسان حال سے روپوش نہیں رکھا جا سکتا۔ کسی کو ذرا سی بھنک مل گئی تو بات جانے کہاں تک پہنچے۔ بری خبر ویسے بھی آگ کی طرح پھیلتی ہے۔ ہدایت علی ڈرائیور واقف حال ہے۔ جیسا کہ بوڑھے ملازم نے بتایا ہے' ایک رشتے دار بھی اس کی ماں بہنوں کے ساتھ یہاں موجود ہے۔ ڈاکٹر ناصر مرزا اس کے گھر والوں' نرس اور معاون کے علاوہ ایک اور ڈاکٹر گزشتہ رات مجن میاں کے باغ میں آنے والے اور خود باغ کے ملازمین۔ اور آخر اس پردہ پوشی' پردہ داری کا جواز بھی کیا ہے۔ آدمی بیمار بھی ہوتا ہے' اسے حادثے بھی پیش آتے ہیں۔ آدمی کو سر راہ سانپ بھی کاٹ لیتا ہے۔ کوئی اس طرح اسے تہ خانے میں بند نہیں کر دیتا۔

ابھی تو صرف ایک پہر گزرا ہے۔ کوئی وقت نہیں جاتا کہ اطراف و اکناف میں نواب کی عبرت ساماں داستان کا شہرہ ہوگا اور ڈاکٹر ناصر مرزا کے ہاں نواب کے بہی خواہوں کی بھیڑ لگی ہوگی۔ ایسے میں تو دشمن بھی تماشا دیکھنے آتے ہیں۔ مولوی صاحب کو بھی لازماً اپنے محسن' اپنے عالم پناہ نواب ثروت یار کے سرہانے دعائے شفا اور کلمات خیر کی رسم ادائی کے لیے آنا چاہیے۔ خبر ملنے کے بعد انہیں ٹھہرنا ہی نہیں چاہیے۔ وہ تو پھر کسی وقت بھی یہاں آ سکتے ہیں۔ آج رات' کل صبح' کل کسی وقت یا زیادہ سے زیادہ ایک دو دن بعد۔ سو کہیں اور جانے کے بجائے ہمیں یہیں ڈیرا ڈال دینا چاہیے' اور یہاں ڈاکٹر ناصر مرزا کے گھر صبح شام ہمارا دھرنا دیے رہنا

ممکن نہیں تو آس پاس کی گلیوں میں کوئی ٹھکانا بنایا جا[...] ہے۔ خاص سڑک سے مکان تک آنے جانے کے را[...] اتنے پیچیدہ نہیں ہیں۔

ہمارا یہاں بار بار آنا اور دیر تک موجود رہنا کسی مناسب نہیں۔ کل صبح یہاں لوگوں کی تعداد بڑھ سکتی[...] ان میں طرح طرح کے لوگ ہوں گے اور سبھی ہم[...] حادثے کی نوعیت جاننے کا تجسس ظاہر کریں گے۔ کہنی[...] بند ہو تو لوگ چین نہیں لینے دیتے۔ ممکن ہے بعض طراز ہی کو اپنی الزام تراشیوں کا ہدف بنائیں اور بعض کی کھال نکالنے والے نواب کے جاں نثار معاملے کی [...] کے لیے پولیس کو شامل حال کرنے پر اصرار کریں۔ ا[...] ریاست کے عمائد کے لیے اس خوں آمیز واقعے کی اط[...] فکر و اضطراب کا باعث ہونی چاہیے۔ نواب مجن میاں باغ کے مرنے والے ملازمین کی خبر شہر تک پہنچنے میں ا[...] فاصلہ حائل نہیں ہے۔ ملازمین بھی وہ نواب مجن میاں عالی نسب' عالی مقام نواب کے ہیں۔ نوکروں کی حیثیت اہمیت بھی اپنے آقاؤں کی جلالت و مرتبت سے طے [...] ہے۔ سرغنہ کے ساتھ آنے والے چند آدمی بھی ز[...] کھو بیٹھے تھے۔ وہ جنگل میں نہیں رہے ہوں گے۔

ہر حاکم سے اوپر ایک حاکم' یہاں یہ سلسلہ فرماں رو[...] ریاست تک جاتا ہے اور اعلیٰ حضرت اپنے عمال سے [...] دور فروکش نہیں ہیں۔ یہ رفت گزشت والی بات نہیں۔ پردہ داری میں سنگینی اور بڑھتی ہے۔ سفید و سیاہ جلد سا[...] آگیا تو خیال کار اپنے اپنے انداز سے طبع آزمائی کریں۔ بادشاہ تک بات پہنچ سکتی ہے۔ چنانچہ ہر پہلو سے خدام با[...] واقعے کے اسباب و علل' تفصیل اور شہادتوں سے بہ[...] مسلح رہنا لازم ہے۔ جانے کب جواب دہی کے لیے [...] حکم نامہ صادر ہو جائے۔ نواب تو اوسان میں نہیں ہے [...] ڈرائیور ہدایت علی اور باغ کے ملازمین موجود ہیں۔ ان کے علاوہ سب سے زیادہ ضرورت تو انہیں ہماری ہوگی۔ ہد[...] علی موقع پر بعد میں حاضر ہوا تھا' باغ کے ملازمین اس [...] بعد۔ بہرحال یہ ایک ریاست ہے' چھوٹے بڑے نوا[...] راجاؤں کا دیس۔ ان کے اپنے قاعدے اور قانون ہیں [...] مزاج ہے اور اپنی مصلحت کاریاں۔ فیصلہ کتنا ہی ترازو[...] ہو' فیصلے میں دیر نہیں لگتی۔ میری طرح بٹھل کو بھی اند[...] ہوگا کہ ہم کیسی گردشوں سے دوچار ہو سکتے ہیں۔ ہم ویسے [...] یہاں اجنبی ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ یہاں سے اٹھ کے ہو[...] سے سامان اٹھانا چاہیے اور پہلی گاڑی پکڑنے کی کو[...]

کرنی چاہیے۔

ایک بار نظروں میں آجانے کے بعد ہماری گزشتہ روداد بھی چھپی نہ رہ سکے گی۔ چاقو' بندوقیں' اڈا گیری' ہیرے' مسلح آدمیوں سے نبرد آزمائی' شاہ کبیر اور آکا کا خاتمہ' خانم اور نواب عالم تاب کا قصہ' وسیع و عریض حویلی کی خریداری' سبھی کچھ آئینہ ہو سکتا ہے۔ وہ ہم سے ریاست میں بار بار آمد کا مقصد جاننا چاہیں گے۔ ریاست میں آمد و رفت کے لیے پروانہ راہ داری کی پابندی نہیں ہے لیکن ہم ڈھنگ سے کچھ نہ بتا سکیں گے اور ہم نے اصل ماجرا گوش گزار کرنے کی جسارت کی تو باقی کچھ انہی پر منحصر ہے۔ انہیں اعتبار آئے' نہ آئے کہتے ہیں سچ بجائے خود دلیل ہے۔ سب کہاوتیں ہیں۔ سچ کو بھی دلیل کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور دلیل کو حجت کی' ورنہ کرسی پر فائز منصف کو اتنا پس و پیش کیوں ہوا کرتا۔

میری رگوں میں خون اٹکنے لگا تھا۔ میں نے وحشت سے بٹھل کی طرف دیکھا۔ وہ بیڑی کے کش لگا رہا تھا اور سونف چبا رہا تھا۔ بوڑھا ملازم ہمیں وہاں بٹھا کے واپس جا چکا تھا۔ کچھ دیر میں وہ عربی قہوہ لے آیا اور کھجوروں' نان خطائیوں سے بھری طشتریاں بھی۔ اس نے بتایا کہ ڈاکٹر ناصر مرزا نواب کے کمرے میں مصروف ہے۔ سنا ہے' نواب کو ہوش آیا ہے۔ ڈاکٹر کو اسی لیے ہماری آمد کی اطلاع نہیں دی جا سکی ہے۔ بٹھل نے فنجان میں قہوہ بھر کے میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے ایک ہی گھونٹ میں اتار لیا۔ مجھے بہت گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی چوک ہو رہی ہو' ہم کچھ بھولے جا رہے ہیں اور وقت تیزی سے گزر رہا ہو۔

ہمیں وہاں بیٹھے ہوئے آدھ گھنٹے کے قریب ہو رہا ہوگا کہ یکایک سامنے کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر ناصر مرزا نمودار ہوا۔ ہم پہ نظر پڑتے ہی وہ پریشان سا ہو گیا اور بے اختیار اس نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔ اس کے عقب میں سلیٹی شیروانی میں ملبوس ایک گندم گوں' فربہ اندام ادھیڑ عمر شخص اور ایک برقع پوش نوجوان لڑکی تھی۔ لڑکی کی نقاب کھلی ہوئی تھی۔ اس پر چند ثانیوں کے لیے حیرت و اضطراب کا غلبہ رہا اور اس نے جھٹ نقاب ڈال لی۔ بس جیسے تیز ہوا نے کسی دریچے کی چلمن اڑائی تھی اور جھماکا سا ہوا تھا۔ میں اسی قدر دیکھ سکا۔ وہ اوسط قد' نازک خال و خد' اکہرے بدن' لال رنگ یا گلنار چہرے کی لڑکی تھی۔ لگتا تھا' دھوپ سے کبھی گزر ہی نہ ہوا ہو۔ جس دروازے سے وہ داخل ہوئی تھی' اسی میں تیزی سے پلٹ گئی۔ ڈاکٹر ناصر مرزا ادھیڑ شخص کے ساتھ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ہمارے پاس آگیا۔ "آپ' آپ کب آئے؟"

اس نے تعجب آمیز شائستگی سے کہا۔
"تھوڑا ہی ٹائم ہوا ہے" بٹھل کھڑا ہو گیا۔
ادھیڑ شخص کی نگاہیں ہم دونوں پر منڈلا رہی تھیں۔ ڈاکٹر کو فوراً ہی احساس ہوا اور ہچکچاتے ہوئے کہا "یہ نواب ثروت یار کے سگے خالہ زاد بھائی' نواب فہمید علی۔"
بٹھل نے سلام کے لیے ہاتھ اٹھایا اور مسکرا کے بولا "ہم پہچان گئے تھے اور ادھری بٹیا کو بھی ہم نے جان لیا تھا۔ وہ نواب کی بھینا تھی نا۔"
"جی' جی ہاں مگر ہمیں یاد نہیں آرہا' ہماری آپ کی شاید پہلی ملاقات ہے" نواب فہمید کی بھوئیں چڑھ گئی تھیں۔ اس کی آواز میں اچھا کس بل تھا۔
"خاندان بھی پیڑ کی طرح ہوتا ہے۔ ایسے بھی آپ نواب ہی لگتے ہو صاحب!"
"اوہ!" فہمید علی بل کھا گیا اور کسمساتے ہوئے بولا "ہمیں آپ کو دیکھنے کی بے چینی تھی۔"
"پھر آپ کو کیا خوشی ہوئی ہوگی؟"
"نہیں' نہیں جناب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں" فہمید علی نے ہکلاتی زبان میں کہا "اصل میں آپ سے مل کے ہم سمجھنا چاہتے تھے کہ یہ سب کیا ہو گیا' کیسے ہو گیا؟"
"اپنی سمجھ میں خود نہیں آیا تو آپ کو کیا بولیں۔"
"کون لوگ تھے وہ؟" فہمید علی کا چہرہ کھنچ گیا۔
"کون ہو سکتے ہیں؟"
"چاہتے کیا تھے؟"
"اٹھائی گیرے کیا چاہیں گے صاحب!"
"مال و زر چاہتے تھے؟"
"جو پلے تھا' آگے کر دیا تھا ان کے۔"
"پھر!" نواب فہمید پھٹی آنکھوں سے بولا۔
"کیا بولیں" بٹھل نے اکھڑی ہوئی آواز میں کہا "لگتا ہے ڈاکٹر صاحب نے آپ کو سارا نہیں بولا۔"
"ہم نے عرض کیا تھا" ڈاکٹر نے بہ عجلت وضاحت کی "جو صورت حال آپ نے ہمیں بتائی تھی' ہم نے عرض کر دی تھی۔"
"ڈاکٹر مرزا نے بے شک ہمیں بتایا تھا لیکن۔۔" نواب کی پلکیں سکڑ گئیں۔ چند لمحوں تک وہ چپ رہا' پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "اس قدر پیچیدگی ہے کہ ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ آئندہ حالات کیا کروٹ بدلیں۔ ڈاکٹر صاحب اور ہم یہی گفتگو کر رہے تھے کہ ہمیں اب پولیس کو مطلع کر دینا چاہیے۔"

"ٹھیک سوچا ہے آپ نے" بٹھل نے کہا۔
"دیکھیے نا" نواب فہمید علی پہلو بدل کے بولا "پولیس از خود بھی تو اس معاملے میں دلچسپی لے سکتی ہے۔ یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔"
"ہاں صاحب! بڑے آدمی کی بات بھی بڑی ہوتی ہے۔"
دونوں نے چونک کے بٹھل کو دیکھا لیکن بٹھل کے لہجے کی سادگی سے وہ غالباً مطمئن ہو گئے "نواب فہمید علی بے تابی سے بولا "ہمیں پولیس سے کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ سنا ہے اس کا طریق کار نہایت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ عجب موشگافیاں کرتی ہے۔"
"وہ بھی آدمی دیکھ کے بات کرتے ہیں' آپ بے فکر رہو۔"
"لیکن ان سے سابقہ پڑنے سے پہلے ہمیں ہر پہلو سے واقف ہونا چاہیے۔"
"ڈاکٹر صاحب نے جو آپ کو بولا ہے' سارا وہی دہرا دیں۔ اپنے پاس بھی اس سے اوپر نہیں ہے۔"
"لیکن کئی سوال اٹھتے ہیں" نواب اضطراری لہجے میں بولا "ان بدقماشوں کو معلوم تھا کہ آپ لوگ سفر میں ہیں۔ آپ کے پاس ظاہر ہے' کثیر نقدی' سونا چاندی' ہیرے جواہر وغیرہ نہیں ہونے چاہئیں۔ آپ کی ان کی کوئی ذاتی پرخاش بھی نہیں تھی۔ انہوں نے ہتھیار اٹھائے ہوں گے اور جان کی دھمکی دی ہوگی۔ یہ یقین ہو جانے کے بعد کہ جو کچھ آپ نے ان کے سپرد کر دیا ہے' اس سے مزید ہوتا تو جان سے بڑھ کے نہیں تھا' آپ کبھی ان سے نہ چھپاتے پھر وہ ایسے خون خرابے پر کیوں۔۔؟"
"ان کو اپنی زبان نہیں آتی تھی۔"
نواب نے مفہوم اخذ کرنے میں وقفہ کیا "انہیں یقین نہیں آیا" وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا "ہدایت علی نے ہمیں بتایا ہے کہ ان کی تعداد آٹھ دس کے قریب تھی۔ وہ کہتا ہے کہ وہ تو اس وقت اندر آیا' جب ثروت زخمی ہو چکے تھے اور آپ ان پر قابو پا چکے تھے۔"
"ٹھیک بولتا ہے وہ" بٹھل نے سرد لہجے میں کہا۔
"ہمیں بتائیے' پھر اس دھینگا مشتی کی نوبت کیسے پہنچ گئی؟ آپ کی تعداد تین سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ آٹھ دس تھے۔ کوئی توازن ہی نہ تھا۔"
"ہتھیار اپنے بل پر نہیں چلتا صاحب!"
"ہم' ہم سمجھ نہیں پائے" نواب نے ہڑک کے کہا۔
"ہتھیار بہت بکٹ ہوتا ہے' پہلے اس کو سدھانا پڑتا ہے

ر ہر کسی کے ہاتھ میں اچھا نہیں لگتا۔"
"جی' جی ہاں" نواب نے بے قراری سے سرہلایا۔
"ہتھیار کے ساتھ کچھ اور بھی ساتھ رکھنا پڑتا ہے۔"
"آپ کا مطلب ہے' وہ ناپختہ لوگ تھے؟"
بٹھل نے واسکٹ کی جیبیں ٹٹولیں مگر بیڑی کا بنڈل وفے پر اس کے کولھے سے دب گیا تھا۔ وہ دونوں اس کی ورت دیکھتے رہے۔ بیڑی سلگا کے بٹھل نے کش لیا اور اموش ہی رہا۔
"ہدایت علی بتا رہا تھا کہ ان کے بھی چند آدمی مارے ئے" ڈاکٹر بے ربطی سے بولا "باغ کے ایک دو نوکر بھی؟"
"ایک دو نہیں صاحب' پورے تین!"
"یہ تو نہایت سنگین واقعہ ہے' سنگین بھی' حیران کن ی" نواب کی آواز پر سراسیمگی چھا گئی۔ وہ کبھی میری طرف یکھتا' کبھی بٹھل اور ڈاکٹر کی طرف "آپ لوگ آخر کہاں رہے تھے؟"
"یہ آپ کو ہدایت علی نے نہیں بولا؟"
"اس نے ہمیں بتایا ہے کہ ثروت آپ کو زمین پر لے رہے تھے" نواب کی آنکھیں لال ہو گئی تھیں "مگر کیوں؟"
"زمینوں پر کیوں جاتے ہیں' زمیں دار لوگ؟ پہلی بار رہے تھے کیا وہ ادھری؟"
"معاف کیجیے" نواب فہمید نے کرکراتی سی آواز میں کہا ہمیں نہیں معلوم کہ آپ کے ان کے مراسم کب سے ہیں۔ روت میاں کے بہت سے معاملات کا ہمیں علم رہتا ہے۔ میں یاد نہیں' ہم نے آپ کو پہلے دیکھا ہو یا آپ کے بارے ں کچھ سنا ہو۔ ہمارے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے آپ کے تعارف میں بڑی تشنگی ہے۔"
"کبھی اس کی ضرورت نہیں پڑی نا!"
"مگر اب شاید ہے بلکہ یقیناً" نواب فہمید کے لہجے میں نی بھی تھی' حکم بھی تھا۔
"اپنا بھی یہی ہے" بٹھل نے تنک کے کہا۔
"جی! بے شک" نواب منتشر ہو گیا اور وضاحت کرنے ا "ڈاکٹر مرزا نے نواب ثروت سے ہمارے تعلق کے باری ں آپ کو پہلے ہی بتایا ہے۔"
"پر اتنا تو نہیں صاحب!"
"خاطر جمع رکھیے' ہم ان کے سب سے قریب کے آدمی ں شاید اسی لیے آپ کو یہاں نظر آ رہے ہیں۔"
"اور ہم بہت دور کے! ہماری تو نواب صاحب سے یہ وسری تیسری سلام دعا ہوئی تھی۔"
"کیا' کیا آپ سے زمین یا کسی جائداد کے سلسلے میں کوئی معاملت ہو رہی تھی؟"
میرا خیال تھا' بٹھل کو بتا دینا چاہیے کہ ہم تو مولوی محمد شفیق نامی ایک شخص کی جستجو میں یہاں آئے ہیں اور نواب ثروت نے خط لکھ کے ہمیں بلایا ہے۔ نواب فہمید اپنے خالہ زاد بھائی سے جب اتنی قربت کا دعویٰ کر رہا ہے تو ممکن ہے' مولوی صاحب سے بھی واقف ہو۔ اسی سے ہمارا مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ میرے جی میں آیا کہ میں دخل در معقولات کروں اور بٹھل کے کچھ کہنے سے پہلے نواب فہمید کو صاف صاف بتا دوں تاہم میں سوچتا ہی رہ گیا۔
"ایسا ہی کچھ سمجھ لو صاحب!" بٹھل نے بھن بھنا کے کہا۔
نواب فہمید کی آنکھیں بجھ گئیں۔ مزاج میں نخوت اور تندی کے ساتھ اس میں مروت اور معاملہ فہمی بھی کم نہیں تھی۔ اس زود فہم نے غالباً گمان کر لیا کہ بٹھل سے نواب ثروت کے ساتھ ہمارے مراسم اور معاملات کے بارے میں تجسس کے اظہار سے کچھ حاصل نہیں۔ وہ اپنی نشست پر سیدھا ہو گیا اور چند لحظے ٹھہر کے دھیمی آواز میں بولا "جناب کا قیام کہاں ہے؟"
"ادھری چار کمان کی طرف" بٹھل نے سرسری انداز میں کہا۔ اسے معلوم ہوگا کہ یہ جواب نواب فہمید کی تشفی نہیں کرے گا' وہی ہوا۔
نواب کہنے لگا "پولیس والے آپ سے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہیں تو ہم انہیں کیا بتائیں؟"
"ادھر آتے رہیں گے ہم۔ ابھی ہم شہر سے نہیں جا رہے' جب تلک نواب صاحب ٹھیک نہ ہو جائیں۔"
"ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ وقت لگ سکتا ہے۔" نواب فہمید کی آواز بکھرنے لگی۔
"اپنے کو بھی کیا جلدی ہے۔"
کسی وقت بھی پولیس یہاں آ سکتی ہے۔ یہاں یا ہمارے گھروں پہ۔" نواب خود کلامی کے انداز میں بولا "یہ کیسا عجیب ہوگا۔ ہمیں قطعاً گوارا نہیں ہے۔"
"کس کو ہوتا ہے صاحب!"
"وہ ہم سے دوسرا سوال لازماً آپ کے بارے میں کریں گے۔"
"آپ بولو تو پھر ادھر ہی بیٹھے رہیں یا خود تھانے جا کے حاضری لگا دیں۔"
"نہیں' نہیں جناب' ہمارا مقصد یہ نہیں ہے۔" نواب

نے شدت سے تردید کی اور کہنے لگا "ثروت میاں کو اس حالت میں دیکھ کر ہمارے تو حواس ہی جاتے رہے۔ آپ ہی کچھ بتائیے' آپ کی رائے کیا ہے۔ ہمیں پولیس کو خبر کرنی چاہیے؟ بعد میں کوئی پیچیدگی نہ ہو۔"

"جیسا آپ سمجھو۔" بٹھل نے اچٹتی آواز میں کہا "پر اچھا ہوگا' ایک بار اپنے نواب صاحب سے بھی پوچھ لو۔"

نواب فہمید پلکیں جھپکانے لگا "آپ کی مراد ثروت میاں سے ہے؟" وہ تیزی سے بولا۔

"ہوش آنے پہ آپ ان سے اتنا پوچھ سکتے ہو۔"

"یہ' یہ ضروری ہے کیا؟" نواب نے متوحش لہجے میں کہا۔

"ایسے ہی صاحب۔" بٹھل نے زیر لبی سے کہا "اچھا رہے گا۔"

"کیا مطلب!" نواب کے چہرے پر خاک اڑنے لگی "دیکھیے جناب۔ معلوم ہوتا ہے' آپ ہم سے کچھ چھپا رہے ہیں یا ہم سمجھ نہیں پا رہے۔ کوئی ایسی بات ہو تو بندہ پروری کیجئے۔ ہمیں اندھیرے میں نہ رکھیے۔ ہم نواب ثروت کے خیر خواہ ہیں۔ ہم ان کے بھائی ہیں۔"

"جانتے ہیں صاحب! پر آپ اتنی سرماری کیوں کرتے ہو۔" بٹھل کی آواز میں نہ ترشی تھی نہ حلاوت "ہم کو جو آتا تھا' وہ ہم نے بول دیا ہے۔ باقی تھوڑا نواب کے لیے بھی رکھو۔"

نواب فہمید کہیں گم ہوگیا۔ کمرے میں سکوت ہوگیا تھا پھر نواب کو جانے کیا ہوا' معاً وہ صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا "ہم اجازت چاہتے ہیں۔" اس نے اضطراری لہجے میں کہا اور گردن گھما کے شیروانی کا کالر درست کیا۔

ڈاکٹر کے ساتھ ہم دونوں بھی کھڑے ہوگئے۔ نواب دروازے کی طرف چل پڑا لیکن کچھ دور جا کے ٹھہر گیا اور سر جھکائے ہوئے پلٹ آیا۔ اس کے نتھنے پھولے ہوئے تھے۔ آنکھیں جیسے جل رہی ہوں۔ اس کی عمر لمحوں میں بڑھ گئی تھی۔ چہرے پر جا بجا لکیریں کھنچ گئی تھیں۔ اسے شاید لفظ نہیں مل رہے تھے اور ایک ہی بات اس کے دل و دماغ میں کھٹک رہی تھی۔ اس نے کھوئے ہوئے انداز اور بے ترتیب لفظوں میں وہی تکرار کی کہ اگر خود پولیس نے اس سے رابطہ کیا؟

"تو آپ کا کیا ہے صاحب۔" بٹھل کے لہجے میں کسی قدر درشتی آگئی "سارا آپ کا الٹایا ہوا ہے کیا؟ جتنا آپ جانتے ہو' آپ ان کو بول سکتے ہو۔ آپ ان کو کہہ سکتے ہو کہ نواب ثروت یار کے ہوش میں آنے کا انتظار کرو۔"

"لیکن وہ آپ کے بارے میں ہم سے جاننا چاہیں گے؟"

"پھر کیا ہوا صاحب! ہم لوگ آپ کا دیا ہوا نہیں کھاتے جو آپ کو پریشانی ہو' آپ ہمارے ٹھیکے دار نہیں ہو۔ ان کو بول دینا جب ہم دوبارہ ادھری نواب صاحب کو دیکھنے آئیں گے تو پولیس کو ہم بتا دیں گے۔ جب ہم لوگ واں زمینوں کی طرف جا رہے تھے تو آپ سے ٹھپا لگوا کے نہیں گئے تھے اور ادھر ہی کیا نوٹنکی ہوئی' آپ کا دیکھا ہوا نہیں ہے۔ ہدایت علی کو بھی کتنا پتہ ہے۔ باقی کا باغ کے لوگ باگ بھی تھوڑا ان کے آگے کریں گے۔"

نواب' بٹھل کے رو بہ رو ساکت و صامت کھڑا سنتا رہا۔ بٹھل کی بات شاید اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی آگ کم ہونے لگی۔ میرے سینے کی دھند بھی چھٹ رہی تھی۔ بٹھل نے نواب سے مزید کچھ نہیں کہا۔ نواب کج کلاہ ضرور تھا' کج رو اور کج فہم نہیں۔ بین السطور کا اسے خود اخذ کرنا چاہیے تھا۔ بظاہر کوئی ابہام نہیں تھا۔ جیسا کہ واقعہ تھا' نواب پولیس کو ہمارے بارے میں مطمئن کر سکتا تھا کہ ابھی ہم شہر میں ہیں اور یہی نہیں کہ صبح شکستہ نواب ثروت کو ڈاکٹر ناصر مرزا کے حوالے کر کے ہم انسانی فرض سے سبکدوش ہوگئے ہیں' ہم شام کو بھی زخمی نواب کی چارہ گری کے لیے آئے تھے۔ نواب فہمید کو اس صاف بیانی میں کیا قباحت تھی کہ ہم اجنبی نواب ثروت کے مراسم دار ہیں اور خود اس کا ہم سے کوئی ربط ضبط نہیں ہے۔ اسے ہمارے اور نواب ثروت کے تعلق کی نوعیت کا کوئی علم نہیں ہے۔ یہاں تک کہ وہ شہر میں ہماری قیام گاہ کے پتے سے بھی ناواقف ہے۔ اپنے بھائی نواب ثروت کی اس ناگفتہ بہ حالت میں اسے کسی اور طرف دیکھنے کا ہوش ہی کہاں رہا ہے۔ نواب فہمید کی ان معقول توجیہات پر پولیس کے یقین نہ کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

بٹھل نے اسے نہیں جتایا تھا لیکن نواب فہمید احساس سے بیگانہ شخص نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اسے خیال کرنا چاہیے تھا کہ ہمی لوگ نواب ثروت کو ڈاکٹر ناصر مرزا کے پاس لائے تھے اور ڈاکٹر کو علاج پر آمادہ کرنے کے لیے تھوڑی بہت تلخی ترشی بھی ہوئی تھی۔ ایک نگاہ ارتکاز پر سبھی کچھ نواب کے لیے عیاں تھا۔ ہمارے سلسلے میں اس کے پاس بہت سی شہادتیں تھیں۔ پولیس کی آمد سے مراد محض تفتیش حال ہے۔ نواب فہمید اپنی لاعلمی اور بے اعتنائی کا اظہار کرے گا تو پولیس والے اسے ہتھکڑی پہنا کے حوالات میں نہیں لے جائیں گے۔ کچھ پولیس کو نواب کی حیثیت کا پاس اور ریاست میں اس کے اثر و رسوخ کا اندازہ بھی ہوگا' اور پولیس ہی کیا' نواب فہمید تمام اعزا' احباب کے سامنے بھی یہی موقف اختیار کر سکتا ہے کہ بس اسی قدر اس کا جانا ہوا ہے "باقی خدا بہتر جانتا ہے۔" یہ قول محفوظ اور قول فیصل یوں بھی زندگی کا ایک سلیقہ ہے۔

نواب کو اپنی استقامت کی بحالی کے لیے کسی ایک دلیل کی ضرورت تھی۔ بٹھل کو اسے جو باور کرانا تھا اور اس کے' اپنے لیے گوشۂ اماں کی طرف اشارہ کرنا تھا' وہ اس نے کر دیا تھا۔ بٹھل نے گویا کوئی لمحہ ضائع نہیں کیا تھا۔ اتنی تاویل و تلقین کے بعد کہیں یہ صورت ممکن تھی۔ نواب کو اب یک سوئی سے گھر واپس جانا چاہیے تھا۔ ہم بھی اب نسبتاً کشادگی سے ہوٹل واپس ہو سکتے تھے۔ کم از کم کچھ وقت کے لیے تو فراغت کی سبیل نکل آئی تھی۔ اڈے کے علاقے کے علاوہ شہر کی ساری عوام ہماری چہرہ شناس نہیں تھی۔ ڈاکٹر کے گھر ہماری موجودگی کے وقت بھی پولیس کی آمد پر ہماری شناخت کسی کے انگلی اٹھانے پر منحصر تھی۔ بہ صورت دیگر وحشت زدہ نواب فہمید سے کچھ بھی بعید نہ تھا۔ اپنی آنکھوں کی گرد میں وہ پولیس کے سامنے ہذیان کی حد تک یاوہ گوئی کر سکتا تھا۔ نادقت اپنے لیے بھی الجھنیں پیدا کرتا' ہمارے لیے بھی شہر کے راستوں پر کانٹے بچھا دیتا۔

نواب نے ڈوبی ہوئی آنکھوں سے ہمیں سلام کیا اور رخصت ہونے لگا۔ ایک بار پھر وہ جاتے جاتے ٹھہر گیا اور اڑتی' ہمکتی آواز میں بولا کہ اگر ہم مناسب سمجھیں تو کیوں نہ اس کے گھر قیام کریں۔ وہاں الگ مہمان خانہ بھی ہے۔

"بس آنکھ سے دور رہیں گے صاحب۔" بٹھل نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیے اور دھیمے لہجے میں اس سے کہا کہ کسی مجبوری کی وجہ سے وہ معذور ہے۔ نواب ثروت نے بھی یہی پیشکش کی تھی۔ نواب چپ ہوگیا اور آہستہ قدموں کمرے سے اوجھل ہوگیا۔

اسے موٹر تک رخصت کر کے ڈاکٹر کمرے میں واپس آگیا "ہم آپ کا زیادہ ٹائم نہیں لیں گے۔" بٹھل نے اسے سانس لینے کی بھی مہلت نہیں دی۔ ڈاکٹر صوفے پر بیٹھا ہی تھا کہ بٹھل نے دبی آواز میں کہا "جس بارے ادھری آئے تھے' اس کو پوچھنے کا موقع نہیں ملا۔ اپنے کو ذرا نواب صاحب کا بولو۔"

"ہاں۔" ڈاکٹر نے چھت کی طرف دیکھا اور سرد آہ بھر کے بولا "ہر کوشش جاری ہے' جو بھی امکان میں ہے۔"

"بڑے صاحب نے بولا' کوئی اور بھی ڈاکٹر دیکھنے کو بلایا تھا آپ نے؟"

"آپ کے آنے سے تھوڑی دیر پہلے ہی ہماری درخواست پر شہر کے ایک تجربے کار ڈاکٹر آئے تھے۔ انہوں نے کچھ مشورے دیے ہیں۔ بس دعا کیجئے۔ دوپہر سے دوبار ہوش آچکا ہے لیکن وہ شدید بے چینی محسوس کرتے ہیں۔ ہاتھ پیر چلانے لگتے ہیں' ہمیں پھر سلانا پڑتا ہے۔ دماغ پر بہت بوجھ معلوم ہوتا ہے ان کے۔ غالباً واقعے کا گہرا اثر ہے۔ ہوش میں آتے ہی گزرا ہوا منظر جیسے تازہ ہو جاتا ہو۔ ابھی آپ یہاں آئے ہی ہوں گے کہ انہیں ہوش آیا تھا۔ وہ بے تحاشا آپ دونوں حضرات کا نام لینے لگے۔ دوپہر بھی یہی ہوا تھا۔ ہم نے انہیں یقین دلانے کی کوشش کی کہ آپ صاحبان خیریت سے ہیں اور اسی گھر میں ہیں' آپ سے قریب لیکن اس دلاسے سے کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ ان کی حالت غیر ہونے لگی تو ہمیں سوئی لگانی پڑی۔ وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں مگر زخم کی شدت اور ناتوانی غالب آجاتی ہے خون بھی دیا گیا' گلوکوز بھی دیا جا رہا ہے۔ اصل میں' مریض کے اندر کی بے کلی بھی علاج میں رکاوٹ کا سبب بنتی ہے۔"

دیر تک سکوت رہا۔ بٹھل سر جھکائے بیٹھا رہا۔ ہمارے پاس موجود رہنے سے زیادہ ڈاکٹر کو نواب ثروت کے قریب رہنا چاہیے تھا' شاید اسی خیال سے بٹھل ایک دم اٹھ گیا۔ ڈاکٹر نے ازراہ اخلاق اسے کچھ دیر اور رکنے کے لیے کہا لیکن بٹھل نے معذرت کرلی۔

برآمدے تک ڈاکٹر ہمارے ساتھ آیا اور ہمارے پوچھے بغیر نواب فہمید کے بارے میں مسکراتے ہوئے بتانے لگا کہ نواب عجب مخمصے میں گرفتار تھا۔ موٹر میں بیٹھتے ہوئے کہنے لگا کہ بعض قریبی اعزا سے نواب ثروت کی بات تادیر چھپائی گئی تو ہمیشہ کے لیے شکوہ ہو جائے گا۔ اسے اندیشہ تھا کہ اطلاع دینے کی صورت میں سبھی ڈاکٹر کے گھر کا رخ کریں گے۔ کسی کو یہ احساس نہ ہوگا کہ یہ ڈاکٹر کا گھر ہے' اس کا کلینک یا عام اسپتال نہیں ہے۔ اتنے لوگوں کی آمد سے ڈاکٹر کے گھر کا سکون متاثر ہوگا۔ بیک وقت مسیحائی اور مہمان نوازی ڈاکٹر کے لیے بار خاطر ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر کہنے لگا' نواب فہمید کی اس خفت اور تردد پر اسے بڑی ہنسی آئی۔ اس نے نواب کو تسلی دی کہ وہ جنگل میں نہیں رہتا ہے' زیادہ دیر تک قریب کے لوگوں سے چھپانا خلاف وضع ہے۔ کسی اور ذریعے سے انہیں علم ہوگیا تو اور نامناسب ہوگا' اور یہ بھی طے ہے کہ جن لوگوں کو مطلع کیا جائے گا' انہیں روکا بھی

نہیں جاسکتا۔ سو نواب فہمید گراں بار نہ ہو' اطمینان رکھے کہ ڈاکٹر اور اس کے افراد خانہ کو کسی قسم کی زحمت نہ ہوگی۔ اس صورت حال سے تو کسی کا بھی سابقہ پڑسکتا ہے اور ایسی بات ہے تو ڈاکٹر اپنے متعلقین کو چند دنوں کے لیے کہیں اور بھیج سکتا ہے۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ نواب فہمید علی جلد ہی واپس آجائے گا۔ نواب ثروت کے گھر والوں کے لیے بالائی منزل کھلوا دی گئی ہے اور سب کو ہدایت کردی گئی ہے کہ کسی کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ یہ نوابوں جیسا گھر تو نہیں ہے لیکن جو بھی ہے' جیسا کچھ بھی ہے' بہ سرو چشم حاضر ہے۔

بٹھل کیا رائے دے سکتا تھا۔ "ہم نے آپ کو بہت پریشان کیا۔" اس نے تندی سے کہا "پر اس کے سوا اپنے پاس کوئی راستہ نہیں تھا صاحب۔"

"اب آپ بھی نواب فہمید کی طرح۔۔۔" ڈاکٹر نے اس کا کندھا تھپتھپایا "ہماری تو یہی تمنا ہے کہ ہم کسی طور سرخ رو ہوسکیں۔"

رات گہری ہوگئی تھی۔ گلی سے نکل کے ہم خاص سڑک پر آگئے۔ زورا اور جمرو کچھ دور جانے پر ہمیں نظر آگئے تھے۔ وہ ہمارے پیچھے پیچھے آتے رہے۔ آگے پیچھے چلتے ہوئے ہم ہوٹل میں داخل ہوگئے۔

کھانا کھانے کے بعد سب بستروں پر لیٹ گئے۔ بٹھل کے منع کرنے کے باوجود زورا اس کا جسم دبانے لگا۔ انہوں نے بتایا کہ جب وہ ڈاکٹر کے گھر سے ہماری واپسی کے انتظار میں آس پاس کی گلیوں میں بھٹک رہے تھے تو ایک بار پھر اڈے کے لوگوں سے ان کا آمنا سامنا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ وہ سامنے سے آرہے تھے۔ جمرو نے پھرتی دکھائی۔ اسے قریب کوئی آڑ' کوئی پردہ دکھائی نہیں دیا تو وہ تیزی سے پلٹ گیا۔ زورا نے بھی جھٹ اس کی تقلید کی۔ دونوں تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے' جیسے کوئی چیز بھول گئے ہوں' پہلی قریبی گلی میں گھس گئے۔

بٹھل کی پیشانی پہ کوئی شکن نمودار نہیں ہوئی اس لیے کہ یہ سانحہ تو کسی وقت بھی ممکن ہے۔ وہ آنکھیں کھولے گم صم سا پڑا رہا۔ معلوم نہیں' وہ کیا سوچ رہا تھا۔ زورا اور جمرو بھی سوال بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کے رہ جاتے تھے۔ اس جاں کنی اور جاں سوزی کا کوئی حاصل نہیں تھا مگر کبھی مجھے بہت گھٹن ہوتی تھی کہ ایک صرف میرا وجود کتنے لوگوں کو داؤ پر لگائے ہوئے ہے۔ ہر لمحے ایک نئی دیوار' ہر پل ایک آزمائش۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے عزیز ترین ساتھیوں کو زندگی گنواتے دیکھا تھا۔ کسی نہ کسی کی باری آجاتی ہے۔ یہ کون سی وضع' کیسا شیوہ دوستی ہے کہ ایک آدمی کے لیے خود کو اتنا منہا کردیا جائے۔ ایک آدمی کا آزار' ایک آدمی کو بھگتنا چاہیے۔ انہیں اس طرح ٹھوکریں کھاتے دیکھ کے میرا سینہ بہت جلتا تھا۔ وہ کیوں نہیں سمجھتے تھے کہ میرے لیے تو دو طرفہ عذاب ہے۔ مجھے یہ بالکل اچھا نہیں لگنا چاہیے۔ مجھ پر تو ان کے مصائب کا بار بھی پڑتا ہوگا۔ وہ میرے زر خرید تو نہیں ہیں۔ ایک آدمی دوسرے کے لیے کتنی دور تک جاسکتا ہے۔ یہ سلسلہ تو ختم ہوتا نہیں لگتا۔ جانے کب تک چلنا پڑے اور کہاں تک جانا پڑے۔ کل رات بھی بس خیر ہوگئی۔ سرغنہ کے ساتھی کا خنجر نواب کے بجائے بٹھل کے سینے میں ترازو ہوسکتا تھا۔ میرے لیے تو' توبہ کے دروازے بھی بند ہوجاتے پھر یہی رہ جاتا کہ اپنا چاقو میں اپنے سینے میں گھونپ لوں۔ اب تو کچھ ایسا لگتا تھا کہ سب کچھ ایک فریب ہے۔ میں تو اکارت ہی گیا۔ یہ کوئی زندگی تو نہیں ہے۔ میرا نہ ہونا' میرے ہونے سے بہتر ہے۔ آدمی کی شاید کسوٹی بھی یہی ہے کہ اس کا وجود دوسروں کے لیے کس قدر زحمت اور کس قدر راحت کا سبب ہے۔

واپس آتے ہوئے راستے میں' میں نے طے کیا تھا کہ ہوٹل پہنچ کے چپ نہیں رہوں گا۔ بٹھل سے تکرار کروں گا کہ اب جناب کا کیا ارادہ ہے۔ چلتے وقت ڈاکٹر کی باتیں تو یاد ہوں گی۔ نواب فہمید کے علاوہ اب اور کس کس کو قائل معقول کرنا ہے۔ کل صبح ڈاکٹر کے ہاں نواب ثروت کی پرسش کے لیے آنے والے اجتماع سے خطاب کا قصد تو نہیں؟ اب صرف نواب فہمید کی بات نہیں۔ نواب ثروت کے دیگر اعزا' احباب خبر سنتے ہی ڈاکٹر کے گھر کا رخ کریں گے۔ اپنے زخم خوردہ رفیق و عزیز کے تئیں جوش و جذبہ دکھانے کے یہی مواقع ہوتے ہیں۔ سب کے سب عالی نسب ہی ہوں گے۔ ان میں بہت بے قرار لوگ بھی ہوسکتے ہیں۔ ایک ہم نشیں نواب سے یہ گستاخانہ سفاکی ان کی غیرت و حمیت کے لیے تازیانہ ہونی چاہیے۔ یوں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کی روش انہیں پسند نہیں آئے گی۔ صبح ہی شہر میں چہ میگوئیاں' قیاس آرائیاں شروع ہوجائیں گی۔

بٹھل کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ زورا پاؤں دباتے دباتے بڑبڑانے لگتا تھا۔ مسلسل کئی بیڑیوں کے دھوئیں نے کمرا غبار آلود کردیا تھا۔ میں بٹھل کو ٹوکنے کا ارادہ کرتا ہی رہ گیا۔ یہ تو سراسر ہرزہ سرائی ہے۔ سوئیاں چبھونے اور بوٹیاں نوچنے کے مترادف۔ بٹھل کسی شافی جواب کا پابند نہیں ہے۔ وہ یہی کچھ کرسکتا تھا۔ یہ تو اب نواب فہمید پر ہے کہ وہ اپنے مائل بہ غضب ہم دردوں' بہی خواہوں کو کس طرح تھامے رکھتا ہے۔ بٹھل نے نواب ثروت کے ہوش میں آنے تک اسے محتاط روی کا اشارہ کیا تھا۔ چاروں طرف سے سوالوں کی یورش میں نواب کے پاس یہی محفوظ طریقہ ہے کہ اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کا اظہار کرتا رہے۔ بٹھل کے اشارے کی سریت اور ایمائیت تو کیوں کروہ کسی کو منتقل کرسکتا ہے کہ یہ ابہام تو خود اس کے لیے تشریح طلب ہے۔ نوابوں کو دولت کے ساتھ اپنے خاندان کے اعتبار کی بھی بڑی فکر ہوتی ہے۔ اعتبار لٹ جانے پر دولت بھی تکیہ نہیں دیتی۔ کسی ممکنہ اندیشہ زیاں میں نواب فہمید کو پھونک پھونک کے قدم اٹھانے اور چن چن کے لفظ ادا کرنے چاہئیں۔ کچھ اسے بھی اپنے بھائی کی مہم جو سرشت کا اندازہ ہوگا۔ کوئی فسانہ در فسانہ ہے' کوئی سفید و سیاہ' تو نواب ثروت ہی آئینہ کرسکتا ہے' اور تبھی کسی طرف داد و فریاد کرنے اور سرکشوں کے سر تن سے جدا کرنے کا عزم استوار کیا جاسکتا ہے۔ طول کلامی ویسے بھی کوئی اچھا وتیرہ نہیں۔ نواب ثروت کے حواس کی بحالی تک' گزشتنی کو نقب زنی' ڈکیتی کے ایک عام واقعے سے تعبیر کرنے کی تدبیر ہی نواب فہمید کے لیے ایک قرین حکمت وظیفہ ہے۔ ایک واقعہ جو بدقسمتی سے خوں ریزی پر منتج ہوا۔ قصہ مختصر نقب زن فرار ہوگئے اور تنگ آکے وہ یہی کہہ سکتا ہے کہ جیسا مناسب ہو' ویسا ہی کیا جائے۔ ریاست کے اعلیٰ حکام سے رابطہ' دربار سرکار تک رسائی' مگر سردست اسے مجبور' معذور ہی سمجھا جائے۔ اس کے لیے سب سے مقدم کام اپنے بھائی کے سرہانے خدمت بجالانا ہے۔ دہائیاں تو بعد کی بات ہے' پہلے کوئی اس کے بھائی کی سلامتی کی ضمانت تو دے۔

ہر آنے والے لمحے میں نواب فہمید کو نواب ثروت کے اعادہ ہوش و حواس کی خوش گمانی کرنی چاہیے۔ جیسے ہی نواب اپنے زور پر حرکت کرنے یا کم از کم دیکھنے' سننے کے لائق ہوجائے گا' اس کے چارہ گروں کا پارا بھی ٹھہر جائے گا۔ نواب فہمید کے سینے کا تلاطم بھی اسی وقت سکون پذیر ہوسکتا ہے۔ خلاصہ یہ کسی طور نواب ثروت جلد سے جلد ہوش میں آجائے۔ اس کے علاوہ دوسروں کی بھی اسی میں بہتری ہے۔ تبھی ہمیں یہاں سے نجات مل سکتی ہے۔

"مت بوجھا دے رے اتنا۔" بٹھل کی دھکتی ہوئی آواز کمرے میں گونجی تو میں ہڑبڑا گیا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ اس نے زورا اور جمرو سے کچھ کہا ہے مگر وہ مجھی سے مخاطب تھا "غبارہ پھلایا ہے تو نے کبھی؟ اسی طرح کا ہوتا ہے۔"

"کیا' کیا مطلب؟" میں نے سٹپٹا کے کہا "کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"لگتا ہے' صفائی نہیں کرائی رے دنوں سے۔" وہ ہنکاری بھر کے زورا سے پوچھنے لگا "زورے! کن میلیے ادھری نہیں ہوتے؟"

زورا دیدے گھمانے لگا' پھر اس کی سمجھ میں آیا تو چمک کے بولا "دیکھتا ہوں دادا' ضرور ہوئے گا' نواب لوگ کے بھی کان ہوتا ہے' کچھ کچرا بھی سالا جمتا ہوگا' بولے تو پکڑ کے لائے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو تم؟" میری زبان ہکلانے لگی۔

"تیری ہی بھاشا بولتا ہوں بالم! سیدھی سادی۔" بٹھل منہ بنا کے بولا "بولتا ہوں' اتنی گھسائی مت کر۔"

مجھے حیرت ہوئی' جیسے وہ میرا ہذیان سن رہا تھا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی صورت دیکھا کیا۔

"جا کے ٹانگیں سیدھی کرلے۔ اوپر کے بل بھی نکل جائیں گے۔"

"مجھے نیند نہیں آرہی ہے۔" میں نے چنچناتی آواز میں کہا "دوپہر سے شام تک اور کیا کرتے رہے تھے۔"

"یہی ٹھیک ہے رے!" وہ جماہی لیتے ہوئے بولا "ایسے میں تو اور بھی نہیں آئے گی۔"

"تم سوجاؤ' تمہیں کسی نے روکا ہے۔" میں نے ترشی سے کہا "میں تم سے کچھ کہہ رہا ہوں۔"

"اور کیا کاٹ کھائے گا؟"

"ہاں' کتا ہوں میں تو۔ ہر وقت بھونکتا' غراتا رہتا ہوں۔"

اسے ہنسی آگئی "پر ہے اصیل! پٹا ڈلا ہوا' پالتو! ذرا سے ھکڑے' ذرا سی بات پر چیاؤں چیاؤں کرنے لگتا ہے۔"

"تمہارے لیے تو ہر بات ذرا سی بات ہے۔"

"لاڈلے!" جمرو مجھے پچکارتے ہوئے بولا "سالی بڑی بھی ہو تو اوکھلی میں ڈال ہی دیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا سالا۔"

"ہاں! زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا۔" میں نے بھڑک کے کہا "زیادہ سے زیادہ مارٹی چلا جاتا ہے' ماچھی' پیرو بھائی' کانتے' سلطان' کبن خاں۔۔۔ زیادہ سے زیادہ! یہی زیادہ سے زیادہ ہے نا!"

"کچھ طبیعت انیس لگتی ہے استاد' شہزادے کی۔" جمرو فکر مندی سے بولا "کیا بات ہے جانی! تجھ کو میری قسم' بول لاڈلے!" وہ میرے پاس آکے بیٹھ گیا اور اس نے میرے گلے

میں بانہیں ڈال کے مجھے دبوچ لیا "سب ٹھیک ہوجائے گا ایمان سے' اپنا دل بولتا ہے۔"

"اور جاستی دیر بھی نئیں لگنے کا دودھ پانی کے الگ ہونے میں۔" زورا نے اس کی ہم نوائی کی اور بولا "کیوں وادا! اپن ٹھیک بولتا ہے؟"

"پھر اپنے من کا بول وے رے۔" بٹھل نے تلخی سے کہا۔

"اپنے من کا۔۔۔" میری زبان لڑکھڑا گئی۔

ہاں میرے دل میں کیا ہے اور میں بٹھل پر کیا واضح کرنا چاہتا ہوں۔ یہ تو میں بھی نہیں جانتا کہ میری اس یا گو وہ گوئی کا کیا مطلب ہے۔ کیا اس طعن و طنز سے میری مراد سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے بمبئی واپسی کی تلقین ہے؟ پھر میرے لب و لہجے میں یہ کیسی بیزاری اور بے اعتباری ہے؟ کیا میری دانست میں وہ کسی ناروا خوش فہمی اور کوتاہی کے مرتکب ہو رہے ہیں اور میں جانتا ہوں کہ سیدھا اور صاف راستہ کون سا ہے؟ ان سے چھپا ہوا مجھ پر عیاں ہے اور میں اس کی نشان دہی کر سکتا ہوں؟ ان کے بس میں اس سے سوا ہے جو وہ کر نہیں پا رہے؟ یہ تو پہلے مجھے خود جاننا چاہیے کہ میں انہیں کیا جتانا' کیا باور کرانا چاہتا ہوں۔ بہتان طرازی کے لیے میرے پاس کوئی جواز تو ہونا چاہیے۔ میرے ہونٹ پھڑپھڑا کے رہ گئے۔

زورا خوش امیدی کا اظہار کر رہا تھا کہ اب زیادہ وقت کی بات نہیں ہے۔ وہ کس بنیاد پر یہ دعوا کر رہا تھا' مجھے بہلانے کے لیے! بٹھل نے بھی خاموش رہ کے گویا اس کی تائید کی تھی مگر ان کی خیال آفرینی کے برعکس نواب ثروت کی استواری میں دیر ہوئی تو؟ دو تین دن میں تو ٹھیک ہے' ایسی قیامت نہیں ٹوٹ پڑے گی۔ نواب فہید روک تھام کر لے گا اور اس کے حیرتی' شعلہ خو' متعلقین اچھی خبر سننے اور نواب ثروت کی زبانی حقیقت حال جاننے کے انتظار میں راسیں کھینچے رہیں گے لیکن اگر دیر ہو گئی؟ جتنا وقت گزرے گا' شہر میں اتنی افواہیں' داستانیں عام ہوں گی اور ہم نادیدہ' پراسرار اجنبیوں کی ٹوہ میں ہر سو بکھری ہوئی نگاہوں کا جال بچھ جائے گا اور اگر خدانخواستہ کچھ اور ہو گیا۔ شاید میں بٹھل سے یہی کچھ کہنا چاہتا تھا کہ نواب فہید کو نہیں تو ڈرائیور ہدایت علی کو یا اس جیسے نواب کے کسی اور معتمد ملازم کو ضرور مولوی صاحب کے ٹھکانے کا علم ہونا چاہیے۔ کسی نہ کسی کو تو نواب ثروت نے اعتماد میں لیا ہو گا۔ نواب کی بہن' والدہ' خادماؤں میں سے کوئی ایک! نواب ثروت کی عیادت کی فرض ادائیگی کے ساتھ ہمیں ایسے آدمی کی جستجو بھی کرتے رہنا چاہیے۔

ہدایت علی تو نمک کا پختہ معلوم ہوتا ہے۔ لگتا نہیں کہ چاقو نوک اور تمنچے کی نال پر وہ اپنے آقا کی وفاداری میں جنب[illegible] کھائے گا۔ چمڑی اور ہڈی دیکھ کے ہی بادشاہ' نواب لوگ [illegible] کو خاص ملازم کے درجے پر فائز کرتے ہوں گے۔ غالباً ا[illegible] لیے بٹھل نے اسے ٹٹولنے اور کھکوڑنے کے اقدام [illegible] اجتناب کیا ہے۔ ابھی وقت بھی کتنا ملا ہے۔ کل رات ہی ہم نواب مجن میاں کے باغ میں تھے۔ صبح سے شام تک صرف ایک دن گزارا ہے۔ اس دوران راستہ روک [illegible] ہدایت علی سے بات کرنا ممکن بھی نہیں تھا' ہدایت علی سے نواب کے کسی اور پروردہ سے۔ ہو سکتا ہے' بعد میں کس[illegible] مناسب وقت کے لیے بٹھل نے انہیں نظر میں رکھا ہو۔

میں نے خود کو سمجھانے کی کوشش کی کہ میری [illegible] آرائی اور پراگندگی شاید سب کچھ دیکھتے ہوئے' کچھ نہ جا[illegible] کے سبب سے ہے۔ اصل میں مجھے بٹھل سے کچھ کہنا نہیں کچھ جاننا ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں' اگر واقعی مولوی صاحب اسی شہر یا گرد و نواح میں مقیم ہیں تو نواب کی خبر سن کے کیا [illegible] خاموش بیٹھے رہیں گے۔ نواب کا مجھے خط لکھنا ہی مولوی صاحب کی یہاں موجودگی کی شہادت ہے ورنہ نواب کو مجھے بمبئی سے بلانے کی کیا ضرورت تھی؟ اور یہ بھی طے ہو گیا [illegible] کہ نواب ثروت اور لعل و جواہر کے جویا' ہمارے لیے سرگرداں دوسرے نوابوں کا کوئی تال میل نہیں ہے۔ ہوتا [illegible] نواب کا تیور مختلف ہوتا اور جیسا کہ نواب کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا' اس نے ہمیں بمبئی سے بلانے کے بارے میں مولوی صاحب کو مطلع نہیں کیا تھا۔ یعنی وہ اچانک ہمیں ان کے رو[illegible] برو پیش کر دینا چاہتا تھا یا اس کے دل میں کچھ اور تھا۔ کچھ اور ہی ہو گا جو وہ ہمیں اتنی دور لے گیا تھا۔ باغ میں مسلح آدمی بھی اسی کے طلب کیے ہوئے تھے۔ مولوی صاحب ہماری حیدر آباد آمد سے لاعلم ہیں تو انہیں نواب کی عیادت کے لیے کسی حیل و حجت کے بغیر ڈاکٹر کے گھر جانا چاہیے۔ یہ غلط ہے تو وہ پوری طرح اطمینان کر کے ہی ادھر کا رخ کریں گے اور اگر انہیں کسی ذریعے سے ہمارے بارے میں سن گن مل گئی۔ میری آنکھوں میں رہ رہ کے یہی وہم و گمان کھٹکتے تھے۔

ڈاکٹر کے ہاں ہمارے پڑاؤ ڈال دینے کی بے شک کوئی تک نہیں ہے لیکن نواب کی خبر سن کے مولوی صاحب سے نہ رہا گیا اور انہوں نے ڈاکٹر کے گھر جانے کا ارادہ کر لیا تو ہمیں ان کی آمد کی آس میں وہیں کہیں منڈلاتے رہنا چاہیے۔ ایک بار وہ نظر آ گئے تو بس۔ ایک بار وہ کسی طور نظر آ جائیں۔ گو اتنی سی بات ہوتی' ایسی قسمت ہوتی تو اتنے

[illegible]ں ہی کیوں لگتے۔ بہرحال اب پھر کوئی موہوم سا امکان پیدا ہوا ہے۔ ہمیں اس موقع پر پوری طرح مستعد رہنا چاہیے۔ [illegible]نا ہے' تقدیر بدلتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔ یہ تقدیر' تدبیر کا [illegible]ھیل بھی عجیب ہے۔ کہتے ہیں' قسمت مہربان نہیں ہوتی تو [illegible]کھ تدبیر کرو' مٹی ہے اور لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ قسمت کا [illegible]طلب ہاتھ پیر جکڑ کے بیٹھ جانا نہیں ہے۔ قسمت اس کا بھی [illegible]اتھ نہیں دیتی جو محض اس پر تکیہ کرتا ہے مگر ایک آدمی کو [illegible]اہ چلتے کوئی خضر صورت دوست مل جاتا ہے' سڑک پر سونے [illegible]سے بھری پوٹلی مل جاتی ہے۔ ایک آدمی زندگی بھر محنت کر کے [illegible]یک سائبان نہیں بنا پاتا۔ ایک آدمی محنت کر کے زندگی میں [illegible]قام پیدا کر لیتا ہے۔ معلوم نہیں' کیا حقیقت ہے۔ بس یہی [illegible]کچھ سمجھ میں آتا ہے کہ آدمی کو تدبیر کرتے رہنا چاہیے۔

صبح ڈاکٹر کے ہاں نواب کے عزیزوں کا ہجوم ہو سکتا ہے۔ ہمارا وہاں جانا بھی از بس ضروری ہے۔ نواب فہید از [illegible]وئے احتیاط ہمیں آڑ میں رکھنے کی کوشش کرے گا۔ [illegible]اضرین سے ہمارے تعارف میں اسے مجلسی آداب سے بھی [illegible]د گردانی کرنی چاہیے لیکن کسی کی انگلی بھٹک گئی یا کسی کی [illegible]زبان بہک گئی تو سبھی کی نگاہوں کا مرکز و محور ہمی ہوں گے [illegible]ور کیا ضروری ہے کہ نواب کی پرسش کے لیے آنے والوں [illegible]یں ہمارا آشنا کوئی نواب مہاراجہ نہ ہو۔ نواب جہاں تاب کے ہاں قیام' نواب عالم تاب کی تدفین کے موقع پر ہم نقاب [illegible]الے ہوئے نہیں تھے اور جو نواب' گزشتہ مرتبہ ہاتھوں سے [illegible]ہمارے نکل جانے اور بمبئی واپسی کے سفر میں ہمارا تعاقب کرنے والوں کی ناکام واپسی کی خلش دل میں لیے ہوں گے۔ [illegible]ن میں سے کوئی بھی وہاں ہو سکتا ہے۔ نواب ثروت کے غم کے باوجود ہمیں دیکھ کے تو ان پر شادیٔ مرگ کا ہیجان طاری [illegible]ہو جائے گا۔

میں بٹھل سے کچھ نہ کہہ سکا۔ یقیناً میری حجت سے [illegible]فترا پردازی جھلکنے لگی تھی۔ اسے برگشتہ بھی ہونا چاہیے' آزردہ بھی۔ اس نے میری طرف سے کروٹ بدل لی۔ اس کی [illegible]ند آنکھیں دیکھ کے زورا نے بھی اس کے پیروں سے ہاتھ [illegible]ٹھا لیے' مبادا اس کی نیند میں خلل پڑے' زورا نے اس کے آدھے جسم پر آہستگی سے چادر ڈال دی اور کوئی آہٹ پیدا کیے بغیر وہاں سے اٹھ گیا۔ جمرو نے دروازے کی چٹخنی چڑھا کے روشنی دھیمی کر دی۔ باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ ہم [illegible]یک دوسرے سے بے نیاز رات گئے تک جاگتے رہے۔ کسی [illegible]نے کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ مجھے ندامت ہو رہی تھی۔ کھانے کے بعد ان کی طبیعت میں کیسی شگفتگی تھی۔ میں نے

ان کی آنکھوں میں ریت بھر دی تھی۔ میں ان سے معذرت کرنا چاہتا تھا کہ میرا مطلب کچھ اور نہیں تھا لیکن مجھے ہمت نہیں ہوئی بعد میں اس لیپا پوتی سے حاصل بھی کیا تھا۔ سو میں چپ ہی رہا۔ ایک بجے کے قریب زورا کو چائے کی طلب ہوئی۔ بمبئی کے رہنے والوں کو چائے کی بڑی عادت ہوتی ہے۔ سونے سے پہلے بھی پی لیتے ہیں اور انہیں نیند بھی آ جاتی ہے۔ کروٹیں بدلتے رہنے سے کچھ شغل ہی بہتر تھا۔ اس نے چائے منگوا لی۔ جمرو نے منع کر دیا مگر زورا کے خیال سے میں نے اس کا ساتھ دیا پھر رات کے آخری پہر کہیں میری آنکھ لگی اور سویرے ہی میں اٹھا ڈاکٹر کے گھر کی چار دیواری کے باہر سجی ہوئی گھوڑا گاڑی کے علاوہ تین چار موٹریں بھی کھڑی تھیں۔ نو بج رہے تھے۔ باہر مونڈھے پر بوڑھا ملازم دربان بنا بیٹھا تھا۔ اندر برآمدے میں بھی چند لوگ موجود تھے۔ ان میں ہدایت علی ڈرائیور بھی تھا۔ چھوٹا دروازہ کھلا ہونے کی وجہ سے اس کی نظر ہم پر پڑ گئی۔ دوسرے لمحے وہ باہر آ گیا اور اضطراری انداز میں سر جھکا کے اس نے بٹھل کو سلام کیا' میری خیریت پوچھی' اس کا چہرہ زرد پڑا تھا۔ وہ بہت مضطرب ہو گیا تھا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ بوڑھے ملازم نے ہم سے اندر چلنے کے لیے کہا لیکن بٹھل نے ان سنی کر کے اسے ہدایت کی کہ اندر جا کے ڈاکٹر ناصر مرزا کو ہماری آمد کے بارے میں مطلع کرے اور کہے کہ اگر کوئی ہرج نہ ہو تو چند منٹ کے لیے باہر آنے کی زحمت کرے۔ ہمیں زیادہ دیر ٹھہرنا نہیں ہے۔

بوڑھا شخص اندر چلا گیا۔

ہدایت علی نے اس اثنا میں اپنے اوسان بحال کر لیے تھے۔ وہ دزدیدہ نظروں اور سراسیمہ آواز میں از خود بتانے لگا کہ اندر اس کے آقا کے کئی عزیز موجود ہیں۔ رات ہی سے یہ سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور ابھی صبح سے تو قطار بندھی ہوئی ہے۔ ایک جاتا نہیں کہ دوسرا آ جاتا ہے۔ نواب کی حالت کا ذکر کرتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔ اس سے ٹھیک طرح بات بھی نہیں ہو پا رہی تھی۔ وہ ابھی کچھ اور بتاتا کہ بائیں جانب سے ایک موٹر آ کے رکی۔ ہدایت علی اکڑ سا گیا اور ہاتھ باندھ کے پیچھے ہٹ گیا "حضور نواب عابد علی خاں صاحب' اس نے کانا پھوسی کے انداز میں ہمیں بتایا۔ آنے والی موٹر کے ڈرائیور نے اتر کے پیچھے کا دروازہ کھولا۔ اندر سے ترکی ٹوپی' سفید شیروانی اور چوڑی دار پاجامے میں ملبوس' ایک سرخ و سفید' جسیم شحیم' گول مٹول سا شخص برآمد ہوا۔ ہدایت علی کورنش بجا لایا اور ہمیں چھوڑ کے نواب کو

اندر لے گیا۔ چہرے بشرے ہی سے نواب عابد علی خاں کوئی بڑا نواب معلوم ہوتا تھا۔ اس نے ہماری طرف دیکھا ہی نہیں۔ موٹر سے اتر کے وہ سیدھا دروازے میں داخل ہو گیا۔ ہمارا شناسا کوئی نواب ہوتا تو اس کی نظر ہم پر ضرور ٹھہرتی۔

ملازم نے واپس آکے بتایا کہ ڈاکٹر کے آنے میں دیر ہوسکتی ہے۔ اس کا مقصد تھا کہ ہم چاہیں تو اندر نشست گاہ میں بیٹھ جائیں۔ ہم وہیں کھڑے رہے۔ دس منٹ گزرے ہوں گے کہ ڈاکٹر ناصر مرزا کسی قدر گھبرایا ہوا برآمدے میں دکھائی دیا اور ملازم پر خفا ہونے لگا کہ ہم ابھی تک باہر کیوں کھڑے ہوئے ہیں۔ بٹھل کے بتانے پر' کہ ہم نے خود ہی اندر جانے سے پہلوتہی کی ہے' ڈاکٹر کی تنی ہوئی بھویں درست ہوئیں۔ دروازے پر اس کا ہمارے ساتھ اس طرح تادیر کھڑے رہنا نازیبا تھا۔ بٹھل نے کہا کہ اسے احساس ہے' اندر کئی مہمان بیٹھے ہیں لیکن وہ زیادہ وقت نہیں لے گا۔ اسے صرف نوابؒ کا حال مطلوب ہے۔

ڈاکٹر نے جیسے اپنی الجھی ہوئی سانسیں ہموار کرنے کا وقفہ لیا اور دل سوزی سے بولا "رات تو نواب ثروت پر خاصی بھاری گزری ہے۔"

"بولتے ہیں' زخم کی پہلی رات ایسی کٹھن پڑتی ہے۔"

"ہاں!" ڈاکٹر نے یاسیت سے کہا "لیکن یہ معاملہ کچھ پیچیدگی اختیار کرتا جارہا ہے۔ بے ہوشی کی تیز دواؤں کا نواب پر تھوڑی دیر کے لیے اثر ہوتا ہے کہ انہیں ہوش آجاتا ہے' اور وہ مرحلہ ان کے لیے' ہم سب کے لیے خاصا اذیت کا ہوتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے' ایک نرس اور ایک تجربہ کار شخص مستقل ان کی نگرانی کررہے ہیں۔ گو وہ انہیں سنبھال لیتے ہیں لیکن اس طرح یک بیک بے قرار ہوجانا نواب کے لیے اور نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔ مجبوراً نرس کو ہدایت کی گئی ہے' اگر دوبارہ ان پر دورہ پڑے تو ہاتھ پیر باندھ دیے جائیں۔ رات پہلی بار انہیں ہوش آیا تو ہم نے بتانے کی کوشش کی کہ سب خیریت ہے' آپ مجن میاں کے باغ سے اب اپنے گھر' ہمارے گھر' محفوظ ہاتھوں میں آگئے ہیں اور صحت یاب ہورہے ہیں۔ یہ دیکھیں' آپ کی والدہ' بہن اور فہمی بھائی سامنے کھڑے ہیں۔ بس کچھ وقت کی بات ہے' حوصلہ رکھیں۔ انہوں نے سنا یا نہیں۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ بس آپ دونوں حضرات کا نام ان کے وردزباں رہا۔ دوسری بار کوئی پانچ بجے کے قریب پھر ان کی حالت بگڑی مگر خدا کا شکر ہے' اس وقت کسی حد تک قابو میں ہے۔ آج ہم اور دیکھیں گے پھر آپ ہی سے گزارش کرنی ہوگی کہ آپ انہیں اپنا چہرہ دکھائیں اور یقین دلائیں کہ آپ الحمدللہ بہ عافیت ہیں۔ مریض کو نفسیاتی طریقوں سے بھی افاقہ ہوتا ہے۔ شاید اسی تدبیر سے کچھ بہتری ہو۔"

"جو آپ کا حکم ہو۔" بٹھل نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا اور کچھ توقف کے بعد ترختی آواز میں بولا "نواب صاحب کو ٹھیک ہونا چاہیے صاحب!"

ایک لحظے کے لیے ڈاکٹر کے چہرے پر دھند چھائی تھی کہ بٹھل کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے بولا "ہم سے ایسا نہ کہیے۔"

"اپنے کو پتہ ہے' ایسے ہی منہ سے نکل گیا صاحب!" بٹھل نے جھنجی ہوئی آواز میں کہا اور معذرت چاہی کہ ڈاکٹر کو ہماری وجہ سے باہر آنا پڑا۔ رات کے لیے اس نے پیش بندی کی کہ اگر زیادہ مہمان ہوئے تو ممکن ہے' ہم ایک بار پھر ڈاکٹر کو باہر آنے کی زحمت دیں۔

"اچھا نہیں لگتا' آپ لوگ یوں دروازے سے لوٹ جائیں۔" ڈاکٹر کسمساتے ہوئے بولا۔

"اپنے کو بھی نہیں۔" بٹھل نے سرد مہری سے کہا "پر اچھا برا نواب صاحب کے بعد دیکھ لیں گے۔"

ڈاکٹر کے اظہار تاسف میں شدت بھی نہیں تھی۔ اس کی منشا بھی یہی معلوم ہوتی تھی کہ اتنے مہمانوں کی موجودگی میں ہماری آمد الجھن کا باعث ہوگی۔ نواب ثروت کی لحہ لحہ نگہبانی اور اس کے معزز مہمانوں کا خیال رکھنے کا بکھیڑا ہی کچھ کم نہ تھا۔ ہوسکتا ہے' میری طرح بٹھل کو بھی ڈاکٹر کے حال پر ترس آیا ہو۔ وہ ایک گوشہ گیر' صلح جو اور لیے دیے رہنے والا شخص تھا۔ اس کے بال بے ترتیب تھے' پپوٹے بھاری بھاری۔ رات میں وہ کیا سوپایا ہوگا۔ اس کے گھر کا تو سارا نظام ہی زیروزبر ہوگیا تھا۔

ہمارے پاس کوئی سات آٹھ منٹ سے زیادہ ڈاکٹر کو نہیں ٹھہرنا پڑا۔ گزشتہ رات کی طرح بٹھل نے آنے والوں کے بارے میں بوڑھے ملازم سے کوئی سوال کیا نہ ہدایت علی ڈرائیور سے سن گن لینے کی جستجو کی۔ میرا خیال تھا کہ دن شروع ہوتے ہی بٹھل نے ہوٹل سے نکلنے کا ارادہ کیا ہے تو اس کے ذہن میں ضرور کچھ ہوگا۔ ڈاکٹر کے ہاں نواب کی عیادت کے لیے آنے والوں کے بارے میں کسی کے سامنے اتنا تجسس ظاہر کرنا مناسب نہیں تھا تو ہم اپنے طور پر وہاں آنے جانے والوں پر نگاہ رکھنے کے لیے اردگرد کی گلیوں میں گھوم سکتے تھے۔ ظاہر تھا کہ بٹھل کو ڈاکٹر کے ہاں مولوی صاحب کی آمد کا یقین ہی نہیں ہے یا وہ ہی جانتا تھا کہ اس کے دل میں کیا ہے۔ کوئی دوسرا کس طرح سکتا تھا۔

ابھی دس نہیں بجے تھے۔ دھوپ ہلکی ہلکی تھیں۔ دکانیں کھل رہی تھیں۔ ہم سیدھے ہوٹل آکے اپنے کمرے کے زنداں میں محبوس ہوگئے۔

رات کو بٹھل نے عجلت نہیں کی۔ کھانا کھاکے اور چائے پی کے ہم ہوٹل سے باہر آئے۔ اندھیرا ہر سو جم چکا تھا اور قمقموں کی روشنیاں گہری ہوگئی تھیں۔ ڈاکٹر کے مکان پر اس وقت بھی کئی موٹریں کھڑی تھیں۔ سب سے پہلے بوڑھے ملازم ہی سے ہمارا سامنا ہوا۔ ہمیں دیکھ کے وہ حواس باختہ سا ہوگیا اور ہمارے کچھ کہنے سے پہلے ادھر ادھر تاکتے ہوئے اس نے سرگوشیانہ لہجے میں بتایا کہ شام کو سادہ لباس میں پولیس کے دو آدمی آئے ہیں' افسر معلوم ہوتے تھے۔ نواب فہید اور ڈاکٹر الگ کمرے میں آدھے گھنٹے تک ان سے باتیں کرتے رہے۔

بٹھل کی طرف سے کسی استفسار یا ردعمل کی توقع میں ملازم ٹھہر گیا یا بٹھل کے جمود کی وجہ سے آگے کچھ کہنے کا حوصلہ نہ ہوا' اور آگے شاید اسے کچھ معلوم بھی نہ تھا۔ بٹھل کی ہدایت پر وہ ڈاکٹر کو بلانے کے لیے اندر چلا گیا اور فوراً واپس آگیا۔ اس نے بتایا کہ نواب ثروت کی والدہ اور نواب فہید کے اصرار پر ڈاکٹر خواب گاہ میں جاچکا ہے۔ کل صبح سے اب تک اس کے معمولات ہی بدل گئے تھے۔ مسلسل جاگتے رہنے سے ڈاکٹر کے متاثر ہوجانے کا اندیشہ تھا۔ نواب فہید نے مشورہ کرکے اس کی جگہ ایک اور ڈاکٹر کو بلالیا ہے۔ ملازم نے پوچھا کہ بٹھل کی خواہش ہو تو وہ دوسرے ڈاکٹر کو ہمارے پاس آنے کے لیے آمادہ کرے۔ بٹھل نے منع کردیا' اور اسی سے نواب کی خیریت دریافت کی۔ ملازم کے کہنے کے مطابق نواب نے نسبتاً پرسکون دن گزارا تھا۔ دن میں دو بار اسے ہوش آیا اور وہ سنبھلا ہی رہا۔ پہلے کی طرح اس پر خفقانی دورہ نہیں پڑا۔

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی' جیسے ہوا میں شبنم گھل گئی ہو' ہم پیدل ہی ہوٹل واپس آگئے۔

ہوٹل کے نزدیک جمرو اور زورا فاصلہ کم کرکے ہمارے ساتھ ساتھ ہوگئے تھے۔ میں نے دانستہ انہیں ڈاکٹر کے ہاں پولیس کی آمد کے متعلق اشارہ کردیا تھا تاکہ موقع ملنے پر وہ بٹھل کو ٹوکنے ٹٹولنے کی کوشش کریں۔ یہ بھی امکان تھا کہ خود بٹھل ہی جمرو اور زورا کو آئندہ کے لیے کوئی تاکید کرے مگر کمرے میں پہنچ کے بٹھل نے اس بارے میں کوئی بات کرنے کے بجائے اناس کا شربت منگوایا اور زورا سے سر کی مالش کی فرمائش کی۔ سر تو اب کھولنا ہی چاہیے تھا۔

بمبئی میں چمپی کرنے والے اپنے فن میں بڑے طاق ہوتے ہیں۔ کم و بیش سبھی مالش کرنے والے خاص رگوں کی شد بد رکھتے ہیں لیکن بمبئی کے لوگوں کا اپنا ایک ہنر ہے۔ ہتھیلی اور پنجے کے دباؤ کے علاوہ انگلیوں سے خوب کام لیتے ہیں۔ کبھی آہستہ' کبھی تیز۔ وہ انگلیاں اس مشاقی سے چلاتے ہیں کہ سر دبتا بھی ہے' بجتا بھی ہے۔ سر بجنے سے الگ راحت ملتی ہے۔ تواتر سے گونجنے والی آوازوں کے زیر و بم میں بڑا تناسب ہوتا ہے۔ اس تواتر و تکرار اور ترتیب و تناسب سے کوئی لے سی پیدا ہوجاتی ہے اور لوری کا کام دیتی ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم تھا' زورا نے کبھی یہ پیشہ اختیار نہیں کیا تھا۔ وہ کچھ عرصے کے لیے باقاعدہ ایک باڑے کی چوکی پر بیٹھ چکا تھا۔ چھنگا کے باڑے پر اس کی ممتاز حیثیت تھی۔ زورا کے ہاتھ ماہرانہ انداز میں چل رہے تھے جیسے وہ یہی کام کرتا رہا ہو۔ کہتے ہیں' شراب کی طرح مالش کے اثر کے لیے بھی آمادگی شرط ہے۔ سرور کی آمادگی نہ ہو تو سرور مشکل سے آتا ہے۔ بٹھل نے آنکھیں میچ لی تھیں۔ کرسی پر اس کا سر ڈھلک ڈھلک جاتا تھا۔ اسے لطف آرہا ہوگا۔ اسی لیے اسے نیند بھی جلدی آگئی۔ کسی قلبی طمانیت کی حالت ہی میں ایسی آسانی سے نیند آسکتی ہے۔

بٹھل کے سکون کی ایک وجہ تو یہی ہوسکتی تھی کہ نواب فہید اور ڈاکٹر ناصر مرزا نے پولیس افسروں کو کسی طرح سنبھال لیا ہوگا۔ ہمارے ذکر پہ انہیں مثبت باتیں ہی کرنی چاہئیں ورنہ وہ پولیس کو ہم سے باز پرس کے لیے روکے رکھتے۔ بٹھل کے اطمینان کی دوسری وجہ یہ ہوسکتی تھی کہ آدمی دسترس بھر ہی تدبیر کرسکتا ہے۔ کچھ لکیروں اور ستاروں کا بھی حصہ ہوتا ہے اور کوئی سر' استطاعت سے سوا وزن نہیں اٹھاسکتا۔ وزن کیسا بھی ہو۔

سب سے بڑا جبر تو وقت ہے۔ ایک رات اور گزر گئی۔ صبح ہی صبح بٹھل کے حکم پر ہم ڈیوٹی کے لیے نکل گئے تھے اور ٹھیک آٹھ بجے ڈاکٹر کے دروازے پر موجود تھے۔ مجھے تو یہ سب کچھ مذاق سا لگ رہا تھا۔ سب جیسے راستہ بھول گئے ہوں اور ایک دوسرے کو بہلاوے دے رہے ہوں۔

ہماری درخواست پر ڈاکٹر ناصر مرزا فوراً باہر آگیا۔ اس نے اچھی طرح آرام کیا ہوگا جبھی کل کے مقابلے میں آج اس کے چہرے پر تر و تازگی تھی۔

ہمیں دیکھ کے وہ کھل سا گیا "کل رات آپ تشریف لائے اور ملاقات نہ ہوسکی' ہمیں تو قید کردیا گیا تھا۔"

"اپنے کو بابا نے بولا تھا۔" بٹھل نے مسکرا کر کہا۔

"کیا بتائیں۔" ڈاکٹر مچل کے بولا "نواب ثروت کی والدہ محترمہ اور نواب فہید نے ہمیں بہ جبر خواب گاہ میں بند کردیا تھا۔"

"اچھا کیا صاحب! ابھی آپ نئے نئے لگتے ہو۔"

"ہاں!" ڈاکٹر خوش گواری سے بولا "سچ پوچھئے تو نواب ثروت کی طرف سے کل رات پہلی بار ہمیں کچھ فراغت نصیب ہوئی تھی' شاید اسی لیے ہمیں نیند آگئی۔"

"اب کیسے ہیں خان بہادر صاحب؟"

ڈاکٹر کو ہنسی آگئی "دیکھئے' ابھی کوئی دعوا تو نہیں کیا جاسکتا لیکن کل کی نسبت آج یقیناً بہتری کے آثار ہیں۔ بس ایک بات اور۔۔۔!" ڈاکٹر کے چہرے پر سنجیدگی چھاگئی اور وہ الجھ سا گیا۔

"کیا صاحب؟" بٹھل نے تردد سے پوچھا۔

"نہیں' ایسی پریشانی کی بات نہیں۔" ڈاکٹر نے بہ عجلت سنبھل کر کہا "پہلے کی طرح اضطرابی دورہ تو نہیں پڑا لیکن اب ان پر یاسیت طاری ہے جو ناتوانی کی علامت ہے۔ وہ دیدے گھما کے چاروں طرف دیکھتے ہیں پھر جیسے ان کی آنکھیں بجھنے لگتی ہیں۔ مریض کے لیے یہ مایوسی' افسردگی بھی اچھی ہوتی' خیر!" ڈاکٹر سانس بھر کے بولا "بہرحال یہ سکوت زخم کے لیے ضروری ہے۔"

"سب ٹھیک ہوجائے گا صاحب!"

"انشاء اللہ۔" ڈاکٹر نے وثوق سے کہا پھر ہمک کر بولا "چلئے' اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔ اس وقت نواب ثروت اور نواب فہید کے خاندان کے سوا کوئی نہیں ہے اور ہاں ان کے چند ملازمین بھی۔"

"نواب نوکر کی جوڑی پرانی ہے۔"

"واقعی' خواب کہا آپ نے!" ڈاکٹر کی آواز چہکنے لگی اور وہ شائستگی سے بولا "آیئے نا' اندر آیئے۔ کم از کم چائے پی کے جایئے گا۔ ناشتا بھی کہاں کیا ہوگا آپ نے۔"

بٹھل نے اس کا شکریہ ادا کیا اور عذر کیا کہ سردست کسی ضروری کام سے کہیں جانا ہے۔ شام تک وقت ملے نہ ملے اس لیے سویرے آگئے ہیں۔ رات کو اندر بھیڑ بھاڑ نہ ہوئی تو ضرور بیٹھیں گے اور ڈاکٹر کے ساتھ عربی قہوہ پئیں گے۔"

بٹھل کے انکار پر ڈاکٹر مایوس ہوا تھا لیکن پھر شاید یہ خیال کرکے اس نے زور نہیں دیا کہ اب نہیں تو کچھ دیر بعد نواب کی عیادت کرنے والے اعزا' احباب کا ہجوم ہوسکتا ہے۔ کہنے لگا "ہم نے سوچا تھا' آج آپ کو نواب ثروت کے پاس لے جائیں گے پھر ارادہ بدل دیا کہ کہیں کوئی منفی اثر نہ ہو۔ آپ کو سامنے دیکھ کر یادیں تازہ ہوسکتی ہیں۔"

بٹھل نے سر ہلا کے تائید کی اور ڈاکٹر سے اجازت چاہی۔ اس سے رخصت ہوکے ہم چند ہی قدم دور گئے ہوں گے کہ اس کی آواز پر ٹھہرنا پڑا "ہم تو بھول ہی گئے تھے۔ کل شام وہ لوگ۔" ہمارے قریب پہنچتے ہی اس نے مضطربانہ کہا "وہ پولیس والے آئے تھے۔"

بٹھل نے تحمل سے سنا اور خاموش رہا۔

"اتفاق سے ان میں ایک افسر نواب فہید کا شناسا نکلا۔ اس کے والد سے نواب صاحب کے مراسم تھے۔ دو افسر تھے' ایک کوئی بڑا منصب دار تھا۔ ہم نے آپ کو بتایا کہ ریاست میں ایسے واقعات شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں۔ دونوں خاصے پریشان تھے۔ بہرحال نواب فہید نے متانت اور استقامت سے گفتگو کی' صبر و سکون سے اور کوئی تکرار نہیں کی۔ انہوں نے آپ کے سلوک کا ذکر کیا کہ آپ کس طرح زخمی نواب ثروت کو یہاں تک لائے تھے۔ ہماری وکالت بھی کی کہ ہم تو پولیس کو مطلع کیے بغیر علاج کے لیے آمادہ ہی نہیں تھے لیکن آپ لوگوں نے طرح طرح کے واسطے دے کے ہمیں مجبور کردیا۔ خیر پولیس افسروں کو اس بات پر کوئی تکدر بھی نہیں تھا۔ وہ یا تو واقعے کے اسباب جاننے کی فکر میں ہیں۔ حکام بالا نے رسی کھینچی ہوگی۔ انہیں نواب صاحب مجن میاں کے باغ میں ہلاک ہونے والوں کی اطلاع مل گئی ہے۔ کچھ باغ کے ملازمین نے بھی آنکھوں دیکھا بیان کیا ہوگا۔ پولیس کو ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا ہے۔ وہ آپ سے بات کرنا چاہتے تھے۔ نواب فہید نے ان سے کہا کہ یہ کوئی مسئلہ نہیں' اس وقت بھی ڈاکٹر کے لہجے میں بڑی بے تابی تھی۔ کہنے لگا کہ نواب فہید نے انہیں اطمینان دلایا کہ ہم لوگ یہیں موجود ہیں اور نواب ثروت کی عیادت کے لیے ازراہ نوازش دن میں کئی بار زحمت کرتے ہیں۔

"ہاں صاحب' ہم نے بولا تھا کہ ابھی ہم ادھری شہر سے نہیں جارہے۔" بٹھل نے بظاہر سادگی سے کہا۔

"ممکن ہے' وہ پھر آئیں' اگر جلد ہی وہ مجرموں تک نہ پہنچ پائے تو دوبارہ رخ کریں گے۔"

"آنے دیں صاحب! ان لوگوں کا یہی کام ہے۔"

ڈاکٹر کے چہرے پر ایک ثانئے کے لیے بے چینی ہویدا ہوئی مگر بٹھل اس کے سوا کیا کہہ سکتا تھا۔

"نواب فہید نے آپ کے بارے میں انہیں بتایا کہ آپ نواب ثروت کے مہمان ہیں اور شہر میں اجنبی۔ آپ

بھی ذہنی طور پر کچھ کم متاثر نہیں ہوئے ہیں۔ نواب صاحب نے کہا کہ ہم سمجھتے ہیں' مجرموں کی تلاش کا آغاز نواب مجن میاں کے باغ سے کیا جانا چاہیے۔ وہیں سے کوئی سراغ مل سکتا ہے۔ ہم چاہیں گے کہ نواب ثروت کے مہمانوں کو سب سے آخر میں زحمت دی جائے۔ ڈاکٹر راز دارانہ انداز میں بولا "معلوم ہوتا ہے' پرسوں رات' آپ کی گفتگو نواب فہیم کو ازبر تھی۔ انہوں نے صاف گوئی اور بے باکی سے پولیس افسروں سے کہا کہ سچ تو یہ ہے' ہم اس وقت تک کچھ بھی نہیں کہہ سکتے جب تک ہمارا بھائی کچھ بتانے کے لائق نہ ہو اور خدا نے چاہا تو ہماری آنکھوں کا پردہ ہٹنے میں ایسی دیر نہیں لگے گی پھر آپ کیا' وہ نطفہ تا تحقیق کسی کھوہ میں ہوں' ہم انہیں ڈھونڈ نکالیں گے' آپ کے پہنچنے سے پہلے۔"

بٹھل نے بہت دیر بعد سر اٹھایا اور ہچکچاتے ہوئے بولا "بڑے نواب صاحب کو بولو صاحب' پولیس والے زیادہ اڑی کریں تو ان سے اپنے لیے ٹائم لے لیں۔ چرہ کرا دیں گے ان کو پھر۔"

ڈاکٹر کچھ نہ کہہ سکا اور ہونٹ بھینچ کے رہ گیا۔ رات کو کسی وقت آنے کا کہہ کے بٹھل نے ڈاکٹر کو وداعی سلام کیا۔ ہم نو بجنے سے کچھ پہلے ہی ہوٹل واپس آ گئے۔

رات تک اب فراغت ہی فراغت تھی۔ دیواریں تکتے رہنا اور بستر پر لوٹتے رہنا۔ اس کے علاوہ بھی اور مشغلے تھے۔ ہوٹل میں تیار ہونے والے پکوان اور مشروبات کی فہرست کا تجربہ کرنا' کھڑکی کا پردہ ہٹا کے شیشے سے حد نظر تک پھیلی اونچی نیچی عمارات کا نظارہ کرتے رہنا۔ جگہ کی کوئی تنگی نہیں تھی۔ جیل کی کوٹھری سے بیس گنا بڑے دو جڑے ہوئے کمرے تھے۔ فرش پر قالین' چھت پر فانوس' قد آدم آئینے' میز کرسیاں' صوفے' گل دان' دیواروں پر رنگ رنگ مناظر کی تصویریں' نرم گدوں کی مسہریاں' کھڑکیوں پر دو طرح کے پردے' اوپر مخملی' نیچے ریشم کے' سب چیزیں صاف وشفاف' آرام ہی آرام۔ سکون ہی سکون۔ بٹھل کی جیب میں پیسوں کی کمی نہیں ہوگی۔ ضرورت پڑنے پر بمبئی سے اور پیسے آ سکتے تھے۔ ابا جان کے پاس تو پشتوں کا خزانہ تھا۔ ممکن ہے' چلتے وقت ابا جان نے حفظ ماتقدم کے طور پر با اثر نوابوں کی چشم خیرگی کے لیے چند نادر ہیرے بھی بٹھل کی جیب میں ڈال دیے ہوں۔

زورا نے کل کسی وقت تاش کی گڈی' شطرنج اور چوسر خرید لی تھی۔ تینوں چیزیں اس نے میز پر رکھ دی تھیں۔ کسی نے انہیں نہیں اٹھایا۔ زورا نے بھی کسی کو نہیں اکسایا۔

بٹھل ورزش کرتا رہا۔ جمرو اور زورا نے بھی اس کی دیکھا دیکھی ہاتھ پیروں کو حرکت دینا شروع کر دیا تھا۔ ڈاکٹر کے ہاں زخمی ثروت کو تین دن گزر چکے تھے۔ تین دن اور اسی طرح گزر سکتے ہیں اور تین دن کیا' ایک اور ہفتہ ایک اور مہینہ! ہر صبح و شام ہمیں پابندی سے حاضری دینا ہے۔ نواب فہیم اپنا آموختہ سناتا رہے گا اور پولیس سنتی رہے گی اور ہم ویکاجی ہوٹل کے بلوریں کمروں میں اینڈتے' مستاتے رہیں گے۔"

ورزش سے نمٹ کے بٹھل نے چائے منگوا لی۔ ہوٹل کے خدمت گاروں موقع کے منتظر رہتے تھے۔ گھنٹی بجتے ہی دروازے پر دستک ہوتی۔ ادھر منہ سے نکلتا نہیں تھا' ادھر تعمیل ہو جاتی۔ مٹھی بھرتے رہنے کا یہ کرشمہ تھا۔ پیسے پر آدمی کیسا پھرکی بن جاتا ہے۔ اسے تو جیسے پر لگ جاتے ہیں۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ کیا تعظیم بجا لائیں' کس طرح خود کو نثار کر دیں۔ دن میں دو بار کمروں کی صفائی' صبح گل دانوں میں تازہ پھولوں کی آرائش۔ کوئی بٹھل کے لیے عابد شاپ روڈ سے چاندی کے ورق میں لپٹی' لونگ ٹنکی ہوئی گلوریاں لے کر آتا تھا تو کوئی اگر بتیاں سلگا کر کمرا مہکا دیتا تھا۔

سارا دن سونے کے اس پنجرے میں کٹ گیا۔ بس اتنا تھا کہ پنجرے کی در کشائی اپنے اختیار میں تھی۔ زنداں بھی طرح طرح کے ہوتے ہیں۔ مجبوری تو سب سے بڑا زنداں ہے۔

رات کے نو بجے' کل کی طرح کھانے اور چائے پینے کے بعد بٹھل نے ہوٹل سے نکلنے کا ارادہ کیا۔ ہم آدھے گھنٹے میں ڈاکٹر کے محلے میں پہنچ گئے۔ گلی میں قدم رکھتے ہی مجھے جھٹکا سا لگا اور میں نے بھٹکتی نگاہوں سے بٹھل کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کو تو ایسا معلوم ہوا جیسے ہم غلطی سے کسی اور گلی میں آ گئے ہوں۔ بٹھل کے پیر بھی اٹکنے لگے۔ ڈاکٹر کا مکان دور سے نظر آ جاتا تھا۔ دروازہ بند تھا اور چار دیواری کے آس پاس کوئی موٹر یا دوسری کوئی سواری نہیں کھڑی تھی۔ روشنیاں بھی کم تھیں ابھی اتنی رات نہیں ہوئی تھی۔ کل ہم بھی تقریباً اسی وقت یہاں آئے تھے۔ صبح بھی اول وقت کے باوجود دو موٹریں کھڑی تھیں۔ بٹھل نے میرا شانہ تھپ تھپایا اور آگے چل پڑا۔ اس کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے گئے' عمارت پر چھایا ہوا سناٹا اور محسوس ہونے لگا۔ میں نے پہلے دروازے کی جھری سے جھانک کر دیکھا۔ برآمدہ خالی پڑا تھا اور کم روشنی کا ایک قمقما ٹمٹما رہا تھا۔ میں نے بہ عجلت گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ اندر برآمدے کا دروازہ کھلنے میں دیر نہیں لگی۔ وہ ڈاکٹر کا بوڑھا

ملازم تھا۔ اس کی صدا پر بٹھل نے اپنا نام بتایا۔ ملازم برآمدے سے نیچے آ گیا۔ وہ ابھی دروازہ کھول رہا تھا کہ پیچھے سے ڈاکٹر کی آواز آئی "آیئے آیئے' اندر تشریف لایئے۔" ڈاکٹر تیز قدموں سے دروازے پر آ گیا اور ملازم کو ہٹا کے خود باہر چلا آیا۔ روشنی اتنی زیادہ نہیں تھی لیکن ڈاکٹر کے چہرے پر جلتی ہوئی آگ صاف نظر آ رہی تھی۔

"کیا بات ہے صاحب؟" بٹھل نے جکڑی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"آپ کو کچھ نہیں معلوم؟" ڈاکٹر اضطراری انداز میں بولا۔

"کیا ہے صاحب؟"

"ڈاکٹر نے ڈوبی ہوئی آنکھوں سے بٹھل کو دیکھا اور ہاتھ پھیلا کے اس کے سینے سے لپٹ گیا۔ دوسرے لمحے وہ ہنکاریاں بھرنے لگا۔ میرا سارا جسم شل ہو گیا تھا۔ بٹھل بھی دم بہ خود کھڑا رہا۔

"آپ کو بہت تلاش کرایا' ہدایت علی سارے چار کمان کے علاقے کا چکر لگا آیا۔ کوئی گیارہ بجے سے دو موٹریں مسلسل آپ کی تلاش میں گھومتی رہیں' جانے کہاں کہاں گئے یہ لوگ۔" ڈاکٹر بے ربطی سے بولا۔

بٹھل کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ "اپنے کو کھل کے بولو صاحب!" اس نے ڈاکٹر کو سینے سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا' کیا بتائیں۔" ڈاکٹر کی آواز رندھ گئی۔

بٹھل اس کا بازو تھام کر دروازے میں داخل ہو گیا۔ ڈاکٹر کو خود بھی اپنے ہیجان اور بدحواسی کا کچھ احساس ہوا۔ بوڑھا ملازم وہیں کھڑا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے نشست کا کمرا کھولنے کا اشارہ کیا۔

"ہم آپ کا شدت سے انتظار کر رہے تھے۔ معلوم تھا کہ آپ رات کو کسی وقت آئیں گے۔ آپ نے رات ہی کو آنے کو کہا تھا نا۔" ڈاکٹر گرفتہ لہجے میں بولا "آپ نے دیر کر دی۔ بہت دیر کر دی۔ کاش ہم صبح آپ کو روک لیتے مگر ہمیں کیا۔ کیا۔"

ہم نشست گاہ میں آ کے بیٹھ گئے۔ میری رگوں میں خون جم گیا تھا۔ بٹھل بھی گنگ بیٹھا رہا۔ اب پوچھنے کے لیے باقی کیا رہ گیا تھا۔ تاہم بٹھل نے جحت کی اور بڑبڑاتے ہوئے بولا "کیسے ہو گیا صاحب؟"

"ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ خدا جانتا ہے' ہم نے تو اپنی سی کوشش کی تھی مگر اسے منظور جو نہیں تھا۔"

"اپنی سمجھ میں نہیں آ رہا صاحب!"

ڈاکٹر نے رومال سے اپنی آنکھیں خشک کیں اور ٹھنڈی سانس بھر کے بولا "ہمارا کام ہی ایسا ہے۔ موت یقینی ہے اور موت سے جنگ کرتے رہنا ہے۔ کبھی ہار' کبھی جیت' عارضی جیت کی خوشی اور یقینی ہار کا غم۔ شب و روز یہی تماشا رہتا ہے لیکن خدا گواہ ہے' ہم نے کبھی ایسا دکھ محسوس نہیں کیا۔"

"بٹھل بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔

"یہی کوئی سات بجے وہ انہیں لے گئے ہیں۔" ڈاکٹر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "ہم ابھی وہیں سے واپس آئے ہیں۔ یہاں گھر میں کہہ گئے تھے کہ آپ آئیں تو بٹھا لیں۔ صبح نواب ثروت کی تدفین ہے۔"

آدمی اپنی خواہش کے خلاف سننے کے لیے مشکل سے آمادہ ہوتا ہے۔ بار بار یہ گمان ہوتا تھا کہ ڈاکٹر ہمارا امتحان لے رہا ہے۔ کبھی کبھی بہت سلجھے ہوئے' سنجیدہ قسم کے لوگ بھی بہت ناروا مذاق پر اتر آتے ہیں۔ لگتا ہے ابھی کچھ دیر میں ڈاکٹر شاید کوئی اور خبر سنائے۔

بٹھل کی آواز پر جیسے فالج گر گیا تھا۔ وہ پتھر بنا ہوا ڈاکٹر کی صورت دیکھتا رہا۔

ملازم نے جگ اور گلاس کا طشت لا کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ بٹھل نے ایک گھونٹ کے بہ قدر پانی پیا اور بوجھل آواز میں ڈاکٹر سے کہا "ایسا سننے کے لیے ہم ادھری نہیں آئے تھے۔"

"ہم بھی نہیں چاہتے تھے۔" ڈاکٹر بلبلاتے ہوئے بولا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے' کہنے لگا "ہمیں اندازہ ہے کہ آپ کو کس قدر صدمہ ہوا ہوگا' ہونا چاہیے۔ سوچ رہے تھے کہ آپ کو یہ خبر کس طرح سنائیں گے۔ کاش کسی اور ذریعے سے آپ کو معلوم ہو جائے۔"

بٹھل نے جیب سے بنڈل نکال کر بیڑی سلگائی۔

"زخم بہت گہرا تھا لیکن ان کا یہاں تک آ جانا دوسری زندگی مل جانے کے مانند تھا۔ آپ نے وقت پر خون روکنے کی تدبیر کر لی۔ حفاظت اور احتیاط سے انہیں یہاں تک لے آئے اور سب سے اہم بات یہ کہ اس قدر جلد سے جلد ذرا سی غفلت ہو جاتی تو انہیں یہ مہلت بھی نہ ملتی' وہ تو اسی دن ختم ہو گئے تھے۔ شروع شروع میں تو ہم بھی مایوس ہوئے تھے لیکن کل سے امید بندھ چلی تھی۔ سب الٹ گیا۔"

بٹھل بیڑی کے کش لگاتا رہا۔

ڈاکٹر بھی چپ ہو گیا۔ کمرے میں موت کی سی خاموشی چھائی رہی۔ بہت دیر بعد ڈاکٹر نے سر اٹھایا اور ہونٹ چباتے

ہوئے بولا "ہم کو معاف کردیجئے۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا جناب کہ کیسے لوگ ہمارے گھر آتے رہے ہیں۔ ادھر نواب کی طرف سے بھی پل بھر کی فرصت نہیں ملتی تھی کہ ہم آپ کی کوئی خدمت' واجبی عزت کرسکتے۔"

"کیسا بول رہے ہو صاحب!" بٹھل نے دھندلائی ہوئی آواز میں کہا "اپنے کو بہت مان دیا آپ نے۔"

"سچ پوچھئے تو ہمیں آپ کے سامنے آنے کی ہمت ہی نہیں تھی۔ ہم نے تو جیسے آج ہی آپ کو دیکھا ہے۔"

"کیا صاحب!" بٹھل کے شانے سیدھے ہوگئے۔

"انہوں نے ہی آج ہماری آنکھیں کھولیں ورنہ ہم تو اندھیرے ہی میں رہتے۔ ہم سے کیسی نادانی ہورہی تھی۔" ڈاکٹر خود کلامی کے انداز میں بولا "نگران کے علاوہ ہمیں بتا بھی کون سکتا تھا۔"

"نواب صاحب نے کچھ کہا آپ کو؟"

"انہوں نے ہمیں سب کچھ بتادیا۔" ڈاکٹر کی آواز بکھرنے لگی "جو باتیں وہ آپ سے کرنا چاہتے تھے' آپ سے نہ کہہ سکے تو انہوں نے ہمیں اپنا امین بنایا۔ وہ آپ سے ملنے کے لیے اسی وجہ سے بے چین تھے۔ انہیں بہت پچھتاوا' بڑا ملال تھا۔ آخر دم تک ان کی زبان پر آپ کا نام تھا۔"

میری طرح بٹھل کا جسم بھی اکڑ گیا تھا۔ "کیا' کیا بولنا چاہتے ہو آپ؟" بٹھل نے کسی قدر ترشی سے کہا۔

"کچھ نہیں! ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ ہماری حیثیت تو تماشائی کی ہے۔" ڈاکٹر کا لہجہ میں جلی کیفیتوں کا غماز تھا۔ برہمی' حیرت' افسردگی اور طنز' کہنے لگا "ہمارے پاس تو ان کا کہا ہوا امانت ہے جسے ہم جلد سے جلد آپ کے سپرد کرکے بری الزمہ ہونا چاہتے ہیں۔ ہم سے پوچھئے تو ہمیں بار بار شبہ ہوتا تھا کہ کہیں نواب ثروت کی دماغی حالت تو غیر متوازن نہیں ہوئی ہے۔ وہ اتنے بے رحم' ایسے سنگ دل بھی ہوسکتے ہیں۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ وہ آپ دونوں کو ختم کردینا چاہتے تھے۔ یہ بات آپ کو بھی معلوم ہوگئی تھی۔ اس کے باوجود آپ نے انہیں یہاں لانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ یہ کیا فسانہ ہے؟ یہ تو ایک ناقابل یقین قسم کی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ ہم سوچتے ہیں تو ہمارا رواں رواں لرزنے لگتا ہے۔ نواب ثروت جیسے خاندانی' سلیم العقل اور بردبار آدمی اندر سے ایسے دیوانے اور خود غرض ہوسکتے ہیں۔" ڈاکٹر کی آواز سنسنا رہی تھی۔ وہ اپنا چہرہ کھسوٹنے لگا۔

"ہوجاتا ہے صاحب ایسا! آدمی پورا جنگل ہوتا ہے۔ سارے جانور ہوتے ہیں اس میں۔" بٹھل نے زہر خند سے کہا۔

"انہوں نے آپ کے لیے یہ سارا انتظام کیا تھا۔ دو آدمی انہی کے بلائے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نے جھرجھری سی لی۔ ان کے پاس وقت کم تھا اور وہ شدید اذیت میں ہم سے یہ اعتراف' یہ اقرار کررہے تھے۔ وہ کہتے رہے' ہم بت بنے ہوئے سنتے رہے۔ کسی وضاحت یا تکرار کا محل نہیں تھا لیکن اس وقت ہمارا ذہن الجھا ہوا ہے۔ ہمارے دماغ سے یہ بات جاتی ہی نہیں۔ ہمیں تو ایسا لگتا ہے جیسے ہمارا سنا ہوا خود ہمارے ذہن کا انتشار ہے۔ ہم نے سب غلط سنا ہے۔ کاش کہ ایسا ہی ہوتا۔" ڈاکٹر کی زبان بہک رہی تھی جیسے اسے لفظ نہ مل رہے ہوں' وہ بے ترتیبی سے بولا "صبح آپ کے جانے کے بعد ان کی حالت اور سدھر گئی تھی۔ ہم نے اپنے سینئر ڈاکٹر صدیقی سے آنے کی درخواست کی تھی۔ وہ تشریف لائے اور اطمینان کا اظہار کیا لیکن پھر جانے کیا ہوا۔ ادھر ڈاکٹر صاحب گئے تھے' ادھر نواب کی حالت بگڑنی شروع ہوئی پھر وہی جنونی دورہ' وہی ہذیان اور نالہ وفریاد۔ انہوں نے بارہا آپ کا نام لیا۔ نواب فہمید' اپنی والدہ' بہن اور ہماری گزارش پر وہ کسی حد تک قابو میں آگئے تھے۔ ہمیں دیکھئے' کل کتنی بار آپ آئے' ہم نے ضرورت نہیں سمجھی کہ آپ کی قیام گاہ کا مفصل پتا پوچھیں۔ چار کمان کا علاقہ خاصا بڑا ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہدایت علی کو معلوم ہوگا۔ اس نے انکار کیا لیکن نکل گیا۔ ادھر نواب فہمید کے ڈرائیور نے بھی آپ کو یہاں آتے جاتے دیکھا تھا۔ وہ بھی شہر کی مختلف جگہوں پر آپ کو کھوجتا رہا۔ دونوں ناکام واپس آئے لیکن نواب فہمید نے انہیں دوبارہ بھیج دیا کیونکہ جتنی بار نواب ثروت کی آنکھ کھلتی' وہ ہڑبڑا کر آپ کے نام کا ورد کرتے۔ سب انہیں سمجھاتے رہے کہ آپ بس آیا ہی چاہتے ہیں' کچھ دیر ہوجاتی ہے۔ انہیں جیسے معلوم ہوگیا تھا کہ ان کا وقت ختم ہورہا ہے۔ تین بجے کے قریب ان پر پھر وہی اضطراب طاری ہوا۔"

ڈاکٹر نے چند لمحوں کے لیے توقف کیا اور جگ سے پانی لوٹ کے اپنا خشک گلا ترکیا اور کٹی پھٹی آواز میں کہنے لگا "ہم نے ڈاکٹر صدیقی کو بلانے کے لیے موٹر بھیجی اور اپنے جتن کرتے رہے۔ ہمارے پاس یہی چارہ رہ گیا تھا کہ ہم انہیں خوابیدگی کا انجکشن لگادیں حالانکہ مسلسل اتنی کثرت سے انجکشن لگانے کے بعد ہمیں بڑا تامل تھا۔ ڈاکٹر صدیقی بھی منع کرگئے تھے۔ کوئی اور صورت نہ دیکھ کے ہم نے نرس کو انجکشن کا اشارہ کردیا تھا۔ نواب ثروت پوری طرح ہوش

میں تھے۔ انہوں نے نرس کے انجکشن والے ہاتھ پر ہاتھ مارنے کی کوشش کی۔ یہ حرکت ان کے لیے بہت مضر تھی۔ زخم کے ٹانکے ٹوٹ گئے۔ ہم متعدد مرتبہ ایسے مرحلوں سے گزرے ہیں لیکن ہمارے ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے تھے۔ وہ جو کہتے ہیں' مرنے والے کو اپنی موت کا علم ہوجاتا ہے اور کوئی بات کا عزم کرلیتا ہے تو اس میں ایک توانائی آجاتی ہے۔ انہوں نے ہم سے التجا کی کہ وہ ہم سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا ہم تحمل سے ان کی بات سن لیں۔ ہم نے درخواست کرکے ان کی والدہ' بہن اور نواب فہمید کو پہلے ہی باہر بھیج دیا تھا۔ وہاں ہمی تھے۔ نواب ثروت کی خواہش پر کہ وہ ہمی سے بات کرنا چاہتے ہیں' ہم نے بادل ناخواستہ نرس اور اپنے معاون کو بھی باہر چلے جانے کی ہدایت کردی۔ تب انہوں نے زبان کھولی۔ ان کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے اور انہوں نے ہم سے کہا کہ آپ آئیں تو ہم ان کی طرف سے آپ کے پیر پکڑ کے معافی مانگ لیں اور کہا کہ ان کے گناہ کے کفارے میں یہ سزا' موت کی سزا نہایت کم ہے۔ انہوں نے ہم سے کہا کہ انہیں بابر زماں خاں کے لاشے کی ضرورت تھی۔"

میں اچھل پڑا۔ ڈاکٹر نے میرا ہی نام لیا تھا اور جو میں نے سنا تھا' وہی کہا تھا۔ میرا سینہ بند ہونے لگا اور آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا۔

"نواب ثروت نے کسی مولوی محمد شفیق صاحب کو طرح طرح کے واسطے دیے اور مختلف حیلے' حربے بھی آزمائے۔" ڈاکٹر نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا "اور آخر انہیں یقین آگیا کہ مولوی صاحب ایک مجبور شخص ہیں۔ مولوی صاحب خود بابر زماں خاں سے کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتے کیونکہ وہ دوہرے قتل کے جرم میں ایک سزا یافتہ آدمی ہے اور ان کی نازک اور حساس بیٹی کے لیے کسی طور موزوں نہیں رہا ہے لیکن ان کی بیٹی جو کبھی بابر زماں خاں سے منسوب ہوچکی تھی' اسی کی آس لگائے ہوئے ہے چنانچہ اتمام حجت کے بعد نواب ثروت اس نتیجے پر پہنچے کہ وہ اس لڑکی کو کبھی حاصل کرسکتے ہیں جب بابر زماں خاں کا کوئی وجود ہی نہ رہے اور جب تک لڑکی اپنے مطلوب کا انجام اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لے۔" یکایک ڈاکٹر رک گیا اور وحشت زدہ نظروں سے مجھے اور بٹھل کو دیکھنے لگا "بابر زماں خاں آپ ہی ہیں نا؟" اس نے ہکلاتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔

مجھ سے جواب نہیں دیا جاسکا۔ مجھ پر تو سناٹا طاری تھا۔ میرے بجائے بٹھل نے کہا "ہاں صاحب!"

"ہمیں معاف کردیجئے' ہم تو صرف نواب ثروت کا کہا دہرا رہے ہیں' اس میں ہمارا کچھ شامل نہیں ہے۔"

"آپ آگے کا بولو؟"

"ج' جی ہاں۔" ڈاکٹر منتشر ہوگیا۔ نواب ثروت کے بہ قول انہوں نے اپنے آپ کو باز رکھنے کی پوری کوشش کی لیکن وہ اس لڑکی کا خیال دل سے نہ نکال سکے۔ وہ ہر صورت' ہر قیمت پر اسے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مولوی صاحب عندیہ دے چکے تھے کہ وہ اپنی بیٹی کے لیے اس سے بہتر رشتے کا تصور نہیں کرسکتے مگر جب تک بابر زماں خاں کی دیوار حائل تھی' اس قول وقرار کی حیثیت محض ایک رسم کی ادائی' خوش فکری اور خوش خیالی سے زیادہ نہیں تھی۔ نواب نے غالباً اسی وقت سے خاکے بنانے شروع کردیے تھے جب سارے انتظامات مکمل ہوگئے ہوں گے تب انہوں نے آپ کو اپنے مقتل میں بلانے کا فیصلہ کیا اور آپ کو خط لکھ دیا۔ انہوں نے یہ وضاحت بھی ضروری سمجھی کہ اس میں مولوی صاحب کی ایما کا کوئی دخل نہیں تھا۔ حادثوں کا اتفاق ہر وقت ممکن ہے۔ انہوں نے ہمیں نہیں بتایا کہ لیکن ہمارا قیاس ہے' کسی اتفاقی حادثے کا تاثر دے کے نواب ثروت کو مولوی صاحب اور ان کی بیٹی کے سامنے بابر زماں کی لاش پیش کردینی تھی' اپنی طرف سے نہیں تو کارندوں کے ذریعے۔ ظاہر ہے' انہیں اپنی ستم گری کا یہ روپ مولوی صاحب اور لڑکی سے تو بہرطور چھپانا چاہیے تھا۔"

"اپنے کو باقی کا معلوم ہے۔" بٹھل نے تند لہجے میں کہا "آگے کا آپ کو کچھ پتا ہو تو بولو صاحب! مولوی صاحب ابھی کدھری ہیں؟"

"ہم سمجھ سکتے ہیں کہ یہ ذکر آپ کے لیے کتنا تکلیف دہ ہوسکتا ہے۔ خود ہمیں یہ سب کچھ دہراتے ہوئے بہت جبر کرنا پڑ رہا ہے لیکن ہم تو مرحوم نواب کی خواہش کی تعمیل کررہے ہیں۔ ان کے کہنے کے مطابق انہوں نے بے حد تاخیر سے اس وقت آپ کو جانا جب سارا کھیل ختم ہوچکا تھا اور آپ نے ان کی زندگی بچانے کے لیے یہ تگ ودو' یہ سلوک کیا۔ وہ کہتے تھے' تب انہیں اپنے دیوانے پن کا احساس ہوا اور یہ احساس بھی مولوی صاحب نے آپ کے متعلق یقیناً ان سے غلط بیانی کی ہے۔"

"ٹھیک ہے صاحب!" بٹھل نے تلخی سے کہا "پر ہم مولوی صاحب کے بارے میں پوچھتے ہیں؟"

"ہاں۔" ڈاکٹر پریشان سا ہوگیا "وہی آپ کو بتا رہے تھے۔ نواب ثروت نے ہمیں ان کے بارے میں بتایا ہے۔ وہ اسی شہر میں ہیں۔ نواب نے غازی بنڈا محلے' میں انہیں ایک

مکان لے کر دیا ہے۔"

بٹھل کی بھویں سکڑ گئیں۔ اس نے پہلو بدلا اور بظاہر تھمی ہوئی آواز میں پوچھا "نواب صاحب نے آپ کو پتا بولا ہے؟"

"جی ہاں' جی ہاں!" ڈاکٹر نے سرہلا کے تیزی سے کہا "نواب ثروت کا مقصود یہی تھا۔ ان کے پرانے شناسا حکیم نجیب الدین کا مکان ہے۔ حکیم صاحب مکان کے نچلے حصے میں مقیم ہیں۔ بالائی منزل پر مولوی صاحب ہیں۔ نواب ثروت نے ایک خادم اور باندی بھی مولوی صاحب کی خدمت کے لیے مقرر کی ہوئی ہے۔ نواب کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہوں نے یہ مکان اپنے گھر والوں سے روپوش رکھا ہے کیونکہ انہیں تو کوئی اور کارنامہ انجام دینا تھا۔ انہوں نے ہر کام اپنی دانست میں پختہ کیا تھا مگر انہی کے الفاظ ہیں کہ ڈاکٹر صاحب! ہم نے اچھی طرح بابر زماں کو دیکھا ہے' بے شک اس لڑکی پر اسی نوجوان کا حق ہے۔ کوئی کسی کے لیے اتنے برس صرف نہیں کرتا' اتنا تعاقب نہیں کرتا۔ یہ انہی کے الفاظ ہیں۔ اس کے بعد تو جیسے نواب کو سکون سا ہوگیا تھا اور ہماری کوئی کوشش کامیاب نہ ہوسکی۔ وہ چلے گئے لیکن ہمیں یقین ہے۔ خدا انہیں زندگی دیتا تو بابر زماں خاں کو وہ خود مولوی صاحب کے پاس لے کے جاتے۔ وہ بہت پشیمان تھے۔ ہمارے پاس لفظ نہیں کہ ہم ان کی بے قراری بیان کرسکیں۔"

کمرے میں سکوت ہوگیا۔

"غازی بنڈے میں کوئی نشانی' اتا پتا صاحب؟" بٹھل نے زیرلبی سے کہا۔

"غازی بنڈا۔" ڈاکٹر بڑبڑاتے ہوئے بولا "مصری گنج کے قریب ایک محلہ ہے۔ مکہ مسجد سے کچھ آگے۔ شرفا کی بستی ہے۔ سید علی کے چبوترے کے قریب۔ مغل پورے کی کمان اور شاہ روزی قتال کا گنبد وہیں آس پاس ہے۔"

"ہم کو اب اجازت دو صاحب!" بٹھل نے سانس بھر کے کہا۔

"کیا' کیا جناب ایسے کیسے؟" ڈاکٹر حیرانی سے بولا۔

"اب تو ہمیں فرصت ہی فرصت ہے۔" اس کی آواز پر مایوسی غالب آگئی۔

"پھر آئیں گے صاحب! ضرور آئیں گے۔"

"کچھ دیر تو اور بیٹھیے۔" ڈاکٹر التجا آمیز لہجے میں بولا "اچھا نہیں لگتا کہ اس صورت حال میں آپ سے قہوے کے لیے پوچھیں حالانکہ ہمیں یاد ہے' صبح آپ نے فرمایا تھا' آپ کہیں تو۔"

بٹھل نے اس کا شکریہ ادا کیا اور دوبارہ آنے کے وعدے کی تکرار کی۔

"مگر ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ کیا آپ کا ارادہ ابھی' اسی وقت مولوی صاحب کی طرف جانے کا ہے؟"

"ہاں صاحب!" بٹھل نے مختصراً کہا۔

"مگر اس وقت! خاصی رات ہوگئی ہے جگہ بھی دور ہے۔ پہنچتے پہنچتے رات ہوجائے گی۔"

"دیکھتے ہیں صاحب!"

"ممکن ہے مولوی صاحب مکان پر موجود نہ ہوں۔ نواب ثروت کی خبر انہیں اب تک مل جانی چاہیے۔"

"نواب نے کسی کو ان کے بارے میں نہیں بولا ہے تو ان تک کون خبر پہنچائے گا۔"

"غالباً ہدایت علی ضرور جانتا ہوگا۔ وہ نواب کا معتمد آدمی ہے۔ ممکن ہے' اس کے ذریعے اطلاع مل گئی ہو پھر تو مولوی صاحب کو لازماً نواب ثروت کے گھر ہونا چاہیے۔ سات بجے وہ انہیں یہاں سے لے گئے ہیں۔ اب تک تو سارے قریبی اعزا' احباب میں شہرہ ہوچکا ہوگا۔ بہرحال نواب ثروت کا تعلق ریاست کے قدیم اور معزز خانوادے سے ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ مولوی صاحب کو اس سانحے کی خبر ہوجانی چاہیے۔"

"ہوسکتا ہے صاحب!"

"صبح تدفین کے وقت تو آپ سے ....!" ڈاکٹر آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

بٹھل اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے دروازے کی جانب قدم بڑھادیے۔

"کہیں تو ہم' ہم آپ کے ساتھ غازی بنڈے تک۔" ڈاکٹر نے جھجکتے ہوئے کہا۔ جواب میں بٹھل نے ہاتھ پھیلا کر ڈاکٹر کو گلے سے لگالیا اور کمرے سے نکل گیا۔ ڈاکٹر ہمیں دروازے تک رخصت کرنے آیا تو معاً اسے کچھ یاد آگیا۔ مضطرب لہجے میں بولا "ہم نے انہیں کمرے سے باہر بھیج دیا تھا لیکن نواب ثروت کی حالت چونکہ نہایت ابتر تھی اس لیے نواب فہمیدہ دروازے کے آس پاس منڈلاتے رہے تھے۔ ہمیں شبہ ہے' مبادا انہوں نے اپنے مرحوم بھائی کی آخری باتیں' یہ سرگوشیاں سن لی ہوں۔ چلتے وقت نواب فہمید آپ کو بہت یاد کررہے تھے' کہہ رہے تھے کہ آپ آئیں تو ہمارا سلام پیش کریں۔ ان کی طرف سے ہم آپ کو بہت پوچھ لیں۔"

○☆○

گلی میں روشنیاں اور کم ہوگئی تھیں۔ میرے پیروں میں جان ہی نہیں رہی تھی تاہم میں بٹھل کے تیز قدموں کا کسی نہ کسی طرح ساتھ دیتا رہا۔ بڑی سڑک پر آتے ہی زورا اور جمرو سامنے کی طرف سے آتے دکھائی دیے۔ بڑی سڑک اب روشن تھی لیکن سنسان ہوچکی تھی۔ بٹھل نے ہاتھ اٹھا کے زورا اور جمرو کو پاس آنے کا اشارہ کیا۔ چند لمحوں میں وہ لپکتے ہوئے ہم تک پہنچ گئے۔ انہیں کوئی سواری روکنے کی ہدایت کرکے بٹھل ایک بند دکان کے برآمدے کی آڑ میں کھڑا ہوگیا۔ میں نے بھی اس کی پیروی کی۔ زورا اور جمرو مختلف سمتوں میں روانہ ہوگئے تھے۔ میرے دست و بازو کھنچے جارہے تھے۔ جیسے جسم کے گرد رسیاں تنگ ہورہی ہوں۔ میں دکان کے چبوترے پر بیٹھ گیا۔ زورا اور جمرو کو گئے دیر ہوگئی۔ اسی اثنا میں ایک فراغت زدہ راہ گیر ٹھلکتا ہوا ہمارے سامنے آکے ٹھہر گیا اور ہمدردی ظاہر کرنے لگا۔ اس نے ہماری خیریت پوچھی۔

بٹھل نے اسے بتایا کہ سواری کا انتظار ہے' آدمی بھیجا ہے۔ بٹھل کے جواب سے اس اجنبی کی سیری نہیں ہوئی' کہنے لگا کہ سواری مل جائے گی' رات کو چلتی رہتی ہیں۔ یہ اطمینان دلا کے اسے چلا جانا چاہیے تھا لیکن وہ ٹھہرا رہا اور تجسس سے بولا "آپ لوگاں باہر سے آئے ہیں؟"

بٹھل نے سرہلا کے تائید کی۔

"کہاں کو جانا ہے سرکار کو؟"

"گھر کو جانا ہے۔" بٹھل نے بے اعتنائی سے کہا۔

"اسی کے بارے میں پوچھتا ہوں حضت!" اجنبی کے لہجے میں بھی ناگواری آگئی۔ اس کی باتیں زہر لگ رہی تھیں۔ وہ جانے اور کیا کیا سوال کرتا کہ زورا گھوڑا گاڑی لے آیا۔ متوحش اجنبی کو وہیں چھوڑ کر بٹھل گاڑی میں بیٹھ گیا۔ کچھ دور ہی ہمیں جمرو مل گیا۔ اس نے بھی ایک گاڑی روک لی تھی اور کوچوان کو آمادہ کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ جمرو بھی ہمارے ساتھ ہوگیا۔

سڑکوں پر راہ گیروں اور سواریوں کی تعداد بہت کم تھی۔ نہ ہونے کے برابر۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہونے لگی۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے اور کسی وقت بھی تیز بارش ہوسکتی تھی۔ سڑکوں پر رکاوٹ نہ ہونے کی وجہ سے گاڑی پوری رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ میرا دل ہول رہا تھا۔ بٹھل کو بھی جیسے خبر ہوگئی تھی۔ اس نے میرا بازو اپنے پنجے میں جکڑ لیا۔ ان راستوں سے ہم متعدد بار گزرے ہوں گے لیکن سب کچھ بے گانہ بے گانہ' نیا نیا سا لگ رہا تھا' زورا اور جمرو نے شروع میں فضول گوئی کرنی چاہی تھی لیکن میرا اور بٹھل کا چہرہ دیکھ کے وہ خود چپ ہوگئے۔ نیا پل عبور کرنے سے پہلے گاڑی کی رفتار سست ہوگئی۔ آگے بہت سے لوگوں کی بھیڑ تھی اور چیخ پکار مچی ہوئی تھی۔ شاید کوئی حادثہ ہوگیا تھا۔ کوچوان گاڑی ٹھہرا کے حادثے کی نوعیت جاننا چاہتا تھا لیکن بٹھل کے حکم پر شور مچاتے اور گھنٹی بجاتے ہوئے اس نے راستہ بنالیا اور آگے بڑھتا گیا۔ نیا پل ختم ہوتے ہی پتھر گٹی آگئی۔ سالار جنگ کی ڈیوڑھی' عثمانیہ بازار' چار کمان اور چار مینار۔ اتنی دیر میں رات اور گہری ہوگئی تھی۔ اب زیادہ دور کی بات نہیں رہی تھی۔ جیسے جیسے فاصلہ کم ہورہا تھا۔ میرے سینے کی دھمک بڑھتی جاتی تھی۔ میرا تو سر ہی چکرانے لگا تھا جیسے عمارتیں اور سڑکیں گھومنے لگی ہوں۔ گاڑی مکہ مسجد سے بھی آگے نکل آئی۔ یہیں کہیں ڈاکٹر ناصر مرزا نے مولوی صاحب کا پتا بتایا تھا۔

چھوٹے بڑے مکانات کے علاقے میں آکے کسی جگہ گھوڑا گاڑی رک گئی۔

اس کے معنی یہی ہوسکتے تھے کہ ہم محلہ غازی بنڈے پہنچ چکے ہیں۔ آس پاس کوئی راہ گیر نہیں تھا۔ ہر طرف سناٹا طاری تھا۔ کسی قدر تذبذب کے بعد بٹھل گھوڑا گاڑی سے اتر گیا۔ جمرو نے کوچوان کو پیسے ادا کیے۔ ہم نے سامنے کی نسبتاً تنگ و تاریک گلی میں داخل ہوگئے۔ اتنی رات کو کسی نشانی اور رہ نمائی کے بغیر کسی بھی مکان کی تلاش آسان بات نہیں تھی۔ یہی ہوسکتا تھا کہ آگے چل کے کوئی بھولا بھٹکا راہ گیر مل جائے یا کسی کھڑکی میں روشنی دیکھ کے اس مکان کے مکین کو بے آرام کیا جائے۔ بعد میں معذرت کرنے کے لیے لفظ ہی کتنے خرچ ہوتے ہیں۔ ایک گلی کے بعد ہم دوسری گلی میں آگئے پھر دوسری سے تیسری میں۔ گلی کے کتے بیدار ہوگئے تھے لیکن شاید ہماری تعداد کی وجہ سے کوئی ہمارے قریب نہیں پھٹکا۔ وہ غراتے اور بھونکتے رہے۔ کچھ دور آگے آکے ہمیں ایک پستہ قد دراز ریش شخص نظر آگیا۔ اس کے جسم پر چادر لپٹی ہوئی تھی اور ایک ہاتھ میں تسبیح تھی' دوسرے ہاتھ میں لاٹھی۔ وہ چوکیدار تو نہیں' کوئی عبادت گزار بزرگ یا کسی مسجد کا امام معلوم ہوتا تھا۔ قریب آنے پر ہم ایک دوسرے کے مقابل ٹھہر گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی سوال کرتا' بٹھل نے اسے سلام کیا اور جواب کا انتظار کیے بغیر حکیم نجیب الدین کا نام لیا۔ بوڑھے آدمی کو تامل ہونا ہی چاہیے تھا۔ اس نے سر گھما کر حیرانی سے ہم سب کو دیکھا اور

کسی حد تک برگشتہ لہجے میں ہمارے بارے میں پوچھا۔ بٹھل نے اسے بتایا کہ حکیم نجیب الدین کے مکان کی بالائی منزل پر جو مولوی صاحب رہتے ہیں، ہمیں ان سے ملنا ہے۔"

آپ کون لوگاں ہیں؟" بوڑھے راہ گیر نے کچھ تحمل کیا اور اپنا سوال دہرایا۔ جھجک کے باوجود اس کی آواز کا تناؤ دور نہیں ہوا تھا۔

اسے یکسر انکار کردینا چاہیے تھا۔ اس کے توقف سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مولوی صاحب کو جانتا ہے اور مولوی صاحب یہیں کہیں رہتے ہیں۔ آخر ہم صحیح جگہ آگئے ہیں۔ میرا سینہ بند ہونے لگا۔ اگر واقعی مولوی صاحب۔۔۔! کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں تو انہیں ملنا ہی ہے۔ چند لمحوں کے لیے میرے ہوش وحواس جاتے رہے۔ معلوم نہیں بٹھل نے بوڑھے آدمی سے کیا کہا اور اس نے بٹھل سے کیا حجت کی۔ بٹھل نے بہرحال اس اثنا میں اسے کسی طور پر قابو کرلیا تھا۔ بوڑھے شخص نے ہمارے پیچھے کی طرف اشارہ کیا۔ ہم کچھ آگے آگئے تھے۔ واپس ایک گلی عبور کرنے کے بعد دوسری گلی کے نکڑ پر بوڑھے آدمی نے ایک طرف ہاتھ اٹھایا۔ بٹھل نے جمرو اور زورا کو وہیں روک دیا۔ میرا ہاتھ اس نے جکڑ رکھا تھا۔ مجھے پسینہ آرہا تھا۔ جسم جیسے سن ہوا جاتا ہو یا پھر ہوگیا ہو۔ لرزتی ٹانگوں سے میں گھسٹتا ہوا سا ان کے ساتھ بڑھتا رہا۔ سامنے کی گلی میں چند قدم چلنے کے بعد بوڑھا آدمی قدیم طرز کے دو منزلہ مکان کے سامنے رک گیا۔ وہاں کئی دروازے تھے۔ بوڑھے نے چبوترے کی سیڑھیاں طے کرکے عمارت کے کونے میں ایک دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ لمحے گزرنے کے باوجود کوئی آواز یا آہٹ نہیں ابھری تو اس نے دوبارہ دروازہ تھپ تھپایا اور انتظار کرتا رہا۔

میری سانسیں حلق میں اٹک گئی تھیں پھر بٹھل نے خود چبوترے پر جاکے دروازے کے بیچ میں نصب لوہے کا گول کنڈا تین چار بار بجایا۔ رات کے سکوت میں کنڈے کی گونج دور تک پہنچی ہوگی۔

شاید اوپر کا دروازہ کھلا۔ دوسرے لمحے کسی عورت کی گھبرائی ہوئی آواز آئی "کون ہے؟"

آواز سے عمر کا اندازہ کیا جاسکتا تھا۔ وہ کسی لڑکی کی آواز تھی مگر وہ کورا نہیں تھی۔

میرے دل کی حرکت بند ہوگئی تھی، جیسے پیر زمین میں دھنسے جارہے ہوں، سارا جسم ہی منجمد سا ہوگیا تھا۔ اوپر سے کوئی بھی جواب آسکتا تھا۔

"نواب صاحب کے گھر سے آئے ہیں۔ مولوی صاحب کو بولو" بٹھل نے آہستگی سے کہا۔

"مولوی صاحب!" لڑکی چونک سی گئی اور مضطربانہ میں بولی "پر وہ تو۔۔۔ بڑے صاحب تو گھر میں نہیں ہیں۔"

اس کے سوا کیا جواب ہوسکتا تھا۔ میں نے ا آنکھوں سے بٹھل کی طرف دیکھا۔ اسے شاید کسی ا جواب کی امید تھی۔ چند ثانیوں کے سکوت کے بعد ا بڑبڑاتی آواز سناٹے میں گونجی۔

"گھر میں اور کون ہے؟" لڑکی کا جواب سننے سے بٹھل نے پوچھا "گھر میں کوئی مرد نہیں ہے کیا؟"

"جی ہے، ہے صاحب! ان کو اٹھاؤں؟" زینے کے ا موجود لڑکی نے بدحواسی سے کہا "آپ لوگاں کون ہیں؟"

"تم کو کیا بولا!" بٹھل کی آواز میں تلخی آگئی "ا اٹھا دو۔ ملنا ہے اپنے کو اس سے۔"

"جی، جی صاحب!" لڑکی نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

زینے سے بھاگتے قدموں کی چاپیں سنائی دیں۔ گزر گئے۔ لڑکی نے دروازے کے قریب سوئے ہوئے مرد کو جگانے کی کوشش کی تھی۔ کوئی نیند سے اچانک بید کیے جانے پر ہڑبڑا اٹھا تھا۔ پہلے سرگوشیاں ابھریں پھر معد ہوگئیں۔ دوبارہ کسی کے دروازے پر آنے میں دیر ہوئی بٹھل نے پھر لوہے کا کنڈا کھٹ کھٹایا۔

"آتا ہوں، سرکار آتا ہوں" کہیں دور سے کسی مرد۔ ٹھٹکے ہوئے لہجے میں کہا اور تیز تیز قدموں سے زینہ اترنے ا کنڈی کھولنے کی آواز آئی۔ اس نے دروازے کا ایک پٹ کھولا۔ مدھم روشنی میں اس کے خال وخط نظر نہیں آرہے تھے لیکن وہ اوسط قد کا ایک ادھیڑ شخص تھا۔ وضع ق ہی سے وہ کوئی خدمت گار نظر آتا تھا۔ اس نے بے ربطی۔ سلام کیا اور اپنے سامنے کھڑے ہوئے لوگ دیکھ کے ایک قدم پیچھے ہٹ گیا "کا، کیا بات ہے سرکار!" اس نے ا زبان سے کہا "مولوی صاحب گھر میں نائیں ہیں۔"

"سن لیا رے!" بٹھل نے تندی سے کہا اور کچھ فا پر کھڑے ہوئے زورا اور جمرو کی جانب اشارہ کیا۔ وہ دونو لپکتے قدموں سے ہمارے پاس آگئے۔ زورا بوڑھے راہ گیر۔ قریب اور جمرو بٹھل کے نزدیک آکے ٹھہر گیا۔ میں نے نہیں سنا کہ بٹھل نے ان سے کچھ کہا بھی ہے۔ میں تو گنگ نظرو سے انہیں دیکھ رہا تھا اور میرا سر بار بار چکرا جاتا تھا۔ تا مجھے اچھی طرح احساس تھا کہ آدمی کو تاب ومجال ہو نہ ہو اسے کسی طور اپنے منتشر حواس قابو میں رکھنا چاہیے۔ میں نے خود کو تھپکی دی۔ ایک بات تو ضرور طے ہوچکی ہے کہ ڈاکٹر ناصر مرزا کے بتائے ہوئے پتے پر صحیح پہنچ گئے ہیں۔ اتنے برسوں، اتنی لمبی مسافت کے بعد ایک بار پھر ہم نے مولوی صاحب کا ٹھکانا ڈھونڈلیا ہے۔ اب آگے خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

یکایک میرے اندھیرے وجود میں بجلیاں سی کوندنے لگیں۔ میں نے اپنی پراگندگی میں غور نہیں کیا۔ اگر وہ لڑکی اور یہ شخص مولوی صاحب کی خدمت یا نگرانی پر مامور ہیں تو انہوں نے محض گھر میں مولوی صاحب کی ناموجودگی کے بارے میں بتایا ہے، کچھ اور نہیں۔ مولوی صاحب کے گھر میں نہ ہونے سے یہ مراد نہ ہوگی کہ وہ یہاں رہتے بھی نہیں ہیں۔ ممکن ہے وہ نواب ثروت کی طرف گئے ہوں۔ نواب کے سانحے کی اطلاع ملتے ہی انہیں یہاں رکنا نہیں چاہیے۔ اور۔۔۔ اور یہ کیا ضروری ہے کہ کورا بھی ان کے ساتھ نواب کے گھر گئی ہو۔ مولوی صاحب نہیں تو کورا تو گھر میں ہوسکتی ہے، مولوی صاحب کے گھر سے نکلنے پر آخر وہ گھر ہی میں رہتی ہوگی۔ ہوسکتا ہے، مولوی صاحب نے بہ طور احتیاط اپنے ملازموں کو تاکید کی ہوئی ہو کہ کوئی اجنبی انہیں پوچھتا ہوا آئے تو وہ یہی جواب دہرایا کریں۔ کسی وقت بھی انہیں اچانک میرے سامنے آجانے کا دھڑکا تو لگا ہی ہوگا۔ ہوسکتا ہے، وہ اس وقت بھی گھر میں موجود ہوں اور اندر کسی کمرے میں سو رہے ہوں۔ نہ معلوم اندر سے مکان کتنا بڑا ہے۔ ورنہ اتنی دیر میں ان کی آنکھ کھل جانی چاہیے تھی اور ہمیں اوپر سے کوئی اور سن گن بھی ملنی چاہیے تھی۔ یہ بھی بعید نہیں کہ خادم نے مولوی صاحب کو جگانا ہی مناسب نہ جانا ہو۔ ادھر خدمت گاروں پر نواب ثروت کی طرف سے کوئی پابندی ہو۔ اصل میں تو وہ اسی کے ملازم ہوں گے۔ مولوی صاحب کو اس لاؤلشکر کی مقدرت کہاں ہوسکتی ہے۔

"سن رے"۔ بٹھل کی سرد آواز پر میرے کان دھمکنے لگے۔ وہ گھر سے برآمد ہونے والے آدمی سے مخاطب تھا "اپنے کو اوپر جانا ہے۔ کوئی ٹیں ٹیں کی تو۔۔۔" بٹھل کے ہاتھ میں کھلا چاقو تھا۔

اس شخص کی آنکھیں ابل پڑیں۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ جمرو نے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈال کے دروازے سے باہر کھینچ لیا۔ جمرو نے چشم زدن میں اس کی گردن پر صرف ایک ضرب لگائی کہ ہلکائی سی سسکاری کے بعد اس کا سر ڈھلک گیا۔ یہ دیکھ کے بوڑھے راہ گیر نے مزاحمت کرنا اور شور مچانا چاہا مگر زورا اس کے آگے موجود تھا۔ "اپن کوئی چور ڈاکو نئیں ہے، بڑے صاحب! ابھی ایک

دم چپ چاپ کھڑے دیکھتے رہنے کا ہے۔ اسی میں تمہارے کا بھلا ہے۔ اپن کو تمہارے سے کوئی مطلب نئیں، سمجھا!"

"مگر یہ کیا' کیا ہے بھائی! آپ لوگاں کیا چاہتے ہو؟" بوڑھا آدمی بھنچی ہوئی آواز میں بولا۔

"ابھی سارے کا پتا چل جائے گا" زورا نے اس سے کہا "اپن لوگ سبھی ایدری ہیں۔"

اس اثنا میں بٹھل سیڑھیوں پر چڑھ چکا تھا۔ اس نے مجھ سے ساتھ چلنے کو نہیں کہا۔ مجھ سے تو چلا بھی نہ جاتا۔ میرے ہاتھ پیروں میں جان ہی نہیں رہی تھی۔ اوپر زینے کے سرے پر لڑکی کو کچھ اخذ کرنے اور چیخ پکار کرنے کا موقع نہیں مل سکا کہ بٹھل سیڑھیاں پھلانگتا ہوا' آناً فاناً اوپر پہنچ چکا تھا۔ لڑکی کی گھٹی ہوئی چیخ ابھری پھر شاید بٹھل اسے اندر کی طرف لے گیا اور خاموشی چھا گئی۔

وقت جیسے رک گیا ہو اور درودیوار کے ساتھ ہوا بھی جیسے پتھر ہوگئی ہو' لگتا تھا بٹھل کو اوپر گئے پہر گزر گئے ہیں' ماہ وسال گزر گئے ہیں۔ میری رگوں میں خون دھڑک رہا تھا۔ اگر واقعی کورا اوپر موجود ہے' میرا تو سینہ پھٹ جائے گا۔ ممکن ہے بس لمحوں کی دیوار حائل ہو۔ آج ہی کا دن نصیب میں لکھا ہو۔ اس کے سامنے جا کے میرا کیا حال ہوگا! میری سانسیں پھولنے لگی تھیں اور سارا جسم پسینے میں نہا گیا تھا۔

بٹھل نہیں آیا۔ اسے ویسے بھی جلد سے جلد واپس آجانا چاہیے تھا۔ اتنی دیر کا کام بھی کیا ہے۔ اس کا کام مولوی صاحب اور کورا کی گھر میں موجودگی ناموجودگی کی تصدیق کرنا ہے۔ گلی میں بوڑھے راہ گیر کی طرح کوئی اور بھی بھولا بھٹکا گزر سکتا ہے۔ جمرو نے نیچے آنے والے ملازم کو خاموش کردیا تھا مگر اوپر والی لڑکی موقع پا کے کسی وقت بھی غل مچا سکتی ہے۔ رات میں تو آوازوں کو بھی پر لگ جاتے ہیں۔ بوڑھے آدمی نے زیرلب آیتیں پڑھنی شروع کردی تھیں۔ وہ بھی کسی لمحے پھیل سکتا تھا۔ دیر ہوگئی تو میں نے جمرو اور زورا کی طرف دیکھا۔ انہیں کچھ خیال ہی نہ تھا۔ میں ان سے کہنا چاہتا تھا کہ ان میں سے کسی کو اوپر جا کے بٹھل کو دیکھنا چاہیے۔ وہاں کسی افتاد کا امکان تو نہیں مگر بری گھڑی کہہ کے کبھی نہیں آتی۔ پھر میں نے خود ہی اوپر جانے کا ارادہ کیا لیکن نہ مجھ سے زورا اور جمرو سے کچھ کہا جا سکا نہ اپنی جگہ سے ایک قدم آگے بڑھایا گیا۔ اوپر سے کوئی سرگوشی' کوئی آہٹ نہیں آرہی تھی۔ یہ خاموشی اور عذاب تھی۔ وہی بات تھی۔ لمحے کی کمیت تو اس کی کیفیت سے طے ہونی چاہیے۔ جس پر جس طرح وقت گزرتا ہے' وہی اس کا حال جانتا ہے۔ کبھی ایک لمحہ سارا خون نچوڑ لیتا ہے' ساری زندگی سے بڑا ہوتا ہے۔ جانے کتنا عرصہ گزر گیا تب کہیں سیڑھیوں پر بھاری قدموں کی گونج اٹھی۔ وہ بٹھل کی چاپ تھی۔ اس کے ساتھ اور کوئی نہیں تھا۔ اس نے گن گن کے سیڑھیاں طے کیں اور نیچے آگیا۔ روشنی کم ہونے کے باوجود اس کے چہرے کا لکھا صاف پڑھا جا سکتا تھا۔ میں نے بہت دیر بعد گہری سانس لی اور مجھے سینے سے کوئی دھند چھٹنے' کسی تجسس سے نجات پانے کا احساس ہوا۔ یہی تو نوشتہ تھا' اسی بے چارگی کی تو عادت تھی۔ اندھیرا بھی آدمی کی عادت بن جاتا ہے اور شکست بھی تو ایک طرح کا سکون دیتی ہے۔

"آپ کا رستہ کھوٹا کیا بڑے صاحب!" بٹھل نے بھرّ بھناتی آواز میں بوڑھے سے کہا۔

"کیا ہوا جناب! کیا مولوی صاحب موجود نہیں ہیں؟" بوڑھے آدمی نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

بٹھل نے سرہلانے پر اکتفا کی۔

"ہوسکے تو کچھ بتائیں" بوڑھے نے دبی زبان سے کہا "ہوسکتا ہے' یہ ناچیز کسی کام آسکے۔"

"کیا بولیں بڑے صاحب!" بٹھل درشتی سے بولا۔ "پرا حساب ہے' پر ابھی ٹائم نہیں آیا شاید" یہ کہتے ہی بٹھل چل پڑا۔

اوپر سے آنے والا آدمی زینے سے ملحق چبوترے پر بےسدھ پڑا تھا۔ بوڑھا شخص بھی وہیں کھڑا رہ گیا۔

تین چار گلیوں کے چکر کے بعد ہم بڑی سڑک پر آگئے۔

ہر طرف رات چھائی ہوئی تھی۔ سڑک پر کہیں کہیں روشنی کے چھینٹے سے پڑے ہوئے تھے۔ دور دور تک کوئی سواری دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ سب گونگے بنے سر جھکائے چلتے رہے۔ مکہ مسجد کے اردگرد بھی کسی سواری کا نام ونشان نہیں تھا۔ ابھی تک آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے اور بارش کسی اشارے کی منتظر تھی۔ اس موسم میں سواری ملنا اور مشکل تھا۔ سواری کے بغیر ہوٹل تک طویل فاصلہ عبور کرنے میں وقت لگ جاتا۔ اس طرح اڈے کے کسی آدمی کا آمنا سامنا ہوجانے کا خدشہ الگ تھا۔ محرومی کی تھکن شاید زیادہ ہوتی ہے۔ سب کے جسم بکھر رہے ہوں گے۔ جو میرا حال تھا' کم وبیش ان کا بھی وہی ہوگا۔ ان کا تو اور سوا ہوگا۔ وہ تینوں تو بیگار بھگت رہے تھے۔ کسی کی رفتار میں تیزی نہیں تھی۔ تھوڑی دیر پہلے ہونے والی بوندا باندی نے سڑکیں گیلی کردی تھیں۔ چلتے چلتے ہم چار مینار تک آگئے۔ وہاں سواری کے انتظار میں کھڑے رہنے سے بہتر

...کم کرتے رہنا تھا۔ چار کمان اور عثمانیہ بازار کے بعد پتھر ... کا علاقہ آگیا۔ یہیں سے ایک بار ہمیں پہلے بھی سواری ملی ... مدینہ ہوٹل سے بٹھل بائیں طرف کی گلی میں مڑ گیا۔ ... کا قیاس درست تھا' کچھ قسمت بھی ایسے معاملوں میں ... دے دیتی ہے۔ وہی پرانا کوچوان گاڑی میں سویا ہوا تھا ... سے حیدرآباد آنے کی پہلی رات ہمارا واسطہ پڑا تھا۔ ...ل کے جگانے پر پہلے کی طرح وہ برگشتہ ہونے لگا لیکن جلد ...ہمیں پہچان گیا۔ بوکھلائے ہوئے انداز میں اس نے متعدد ...م کیے اور پھر کوئی سوال نہیں کیا۔ گزشتہ مرتبہ بٹھل کی ...زش کا خمار ابھی تک باقی تھا۔ گاڑی تیار کرنے میں اس ...نے پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لیے۔

ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ بس گھوڑے کی ٹاپیں اطراف پر ...چھایا ہوا سکوت درہم برہم کررہی تھیں۔ سب گم صم بیٹھے ...ہے۔ میری طرح زورا اور جمرو کے دماغ میں بھی ریت ...رہی ہوگی۔ کچھ حاصل ہونے کی امید ہی میں کوئی بٹھل ...سے بازپرس کی جرات کرتا۔ کچھ بتانا نہ بتانا اسی کی مرضی پر ...وقوف تھا۔ اسے احساس ہی نہیں رہتا تھا کہ دوسرے بھی ...اس کے ساتھ ہیں اور وہ جانور یا اس کے معمول نہیں ہیں۔ ...اسی لیے میں بٹھل کو ساتھ لانے میں پہلو تہی کرتا تھا۔ پھر جو ...کچھ بھی ہوتا' میرا اختیار تو میرے پاس ہوتا۔ وہ ایک لحظے کی ...گرانی تھی کہ دوسرے ہی لمحے جیسے کسی نے مجھے ٹھوکا دیا۔ یہ ...کیسی بے حسی' بے غیرتی ہے۔ بٹھل کا ساتھ نہ ہوتا تو نواب ...تک میں کہاں ہوتا۔ میں اکیلا ہوتا تو نواب ثروت کو اتنی دور ...جانے کی ضرورت بھی نہ پڑتی۔ اس نے تو مجھے ختم کرنے کے ...لیے کب سے بساط جمائی ہوئی تھی۔ معظم جاہی مارکیٹ پر ...آکے کوچوان نے زبان کھولی۔ پچھلی مرتبہ ہوٹل تک گاڑی ...لے جانے کے بجائے بٹھل نے احتیاطاً معظم جاہی مارکیٹ ...سے کچھ آگے گاڑی رکوائی تھی پھر ہوٹل تک پیدل گئے تھے۔ ...بٹھل نے کوچوان کو چلتے رہنے کا اشارہ کیا۔ اس کا مطلب ...یہی تھا کہ اب کسی احتیاط کی حاجت نہیں رہی ہے۔ اب ...وقت ہی وقت ہے۔ عابد شاہ روڈ پر جب ویکاجی ہوٹل سے ...گاڑی آگے نکل گئی تو زورا نے بٹھل کو ٹوکا "وادا! ابھی آگے ...جانے کا ہے کیا؟"

"ہاں' ہاں رے" بٹھل کھوئے ہوئے لہجے میں بولا "نام پلی کا بول حرام کے جنے کو۔"

نام پلی کا نام سن کے میرا ماتھا ٹھنکا اور میں بیٹھے بیٹھے اچھل پڑا۔ بمبئی کی گاڑی ملنے کا کوئی وقت نہیں تھا۔ ہمارا سامان بھی ہوٹل میں پڑا ہوا تھا۔ پھر نام پلی کی طرف جانے کی کیا تک ہے۔ کوئی مصلحت تو ضرور ہوگی۔ میری متوحش نظریں بٹھل کے چہرے پر منڈلانے لگیں۔

"اب' اب کہاں پہ جانا ہے استاد؟" جمرو سے نہ رہا گیا۔ اس نے جھنپتی آواز میں بٹھل سے پوچھا۔

"نواب کی طرف" بٹھل نے تنک کے کہا۔

"نواب کی طرف" جمرو سیدھا ہوگیا "پر ادھر' ادھر کیوں؟" اس سے آگے جمرو کی زبان لڑکھڑانے لگی۔

"دیکھتے ہیں رے" بٹھل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"کیا' کیا ادھری سے کوئی اشارہ ملا ہے استاد؟" جمرو نے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

"نہیں رے" بٹھل نے اسے جھڑک دیا۔

جمرو کا جسم اکڑ کے رہ گیا۔ اس کے چپ ہوجانے پر میں نے دخل دینے کا ارادہ کیا۔ ایسا بھی کیا تھا۔ جو لوگ ہمہ دم' ہمہ جاں شامل ہیں' ان کی حیرت ووحشت بھی فطری ہے۔ آخر اس وقت اتنی رات گئے' نواب ثروت کے گھر جانے کا کیا مقصد ہے لیکن میں بٹھل کی جانب دیکھا کیا۔ اس میں کسی تکدر د تردد کی کیا گنجائش ہے۔ نواب کی طرف جانے میں اس کے سوا کیا رمز ہوسکتی ہے کہ مولوی صاحب وہیں موجود ہیں۔ کورا بھی لازماً انہی کے ساتھ ہوگی۔ میری سانسیں اکھڑنے لگیں۔ یہی بات ہوسکتی ہے۔ نواب کے انتقال کی خبر ملتے ہی مولوی صاحب کو بلا تاخیر اس کے گھر کا رخ کرنا چاہیے۔ اس شہر میں ایک نواب ہی تو ان کا مربی ومحسن تھا۔ یہ گھر اور نوکر چاکر وغیرہ تو اسی نے فراہم کیے ہوں گے۔ میرا دل بہت گھبرانے لگا تھا۔ پھر وہی بچھو جسم سے چمٹ گئے تھے۔

گھوڑا گاڑی تیزی سے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں نام پلی اسٹیشن آگیا۔ اسٹیشن کی عمارت کے سامنے ہوٹلوں کے آس پاس چائے اور پان کی دکانیں کھلی تھیں اور خوب روشنی ہورہی تھی۔ بٹھل بے حس وحرکت بیٹھا رہا۔ گھوڑا گاڑی وہاں سے بھی گزر گئی۔ نواب ثروت کی کوٹھی اب زیادہ دور نہیں رہ گئی تھی۔ جیسے جیسے فاصلہ کم ہورہا تھا۔ میرے ہاتھ پیر اینٹھنے جارہے تھے۔ امرا کے اقامتی علاقے کے نزدیک بٹھل نے گھوڑا گاڑی رکوادی اور جیب سے نوٹ نکال کے کوچوان کے حوالے کیے کوچوان نے دیکھے بغیر مٹھی بند کرلی۔ اسے تو کسی دربار میں ہونا چاہیے تھا۔ درباریوں کے مانند وہ آدھا جھک گیا۔ بٹھل نے اس سے کہا کہ اگر وہ آدھ گھنٹے کے لیے انتظار کرسکتا ہو تو ٹھیک ہے۔ اسی جگہ ٹھہرا رہے۔ کوچوان نے دوبارہ سرخم کیا اور ہاتھ باندھ کے کہنے لگا کہ صبح تک اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرے گا۔

بڑی سڑک سے اندر جانے والی گلی خاصی چوڑی تھی۔ یہاں سے بس منٹوں کی مسافت رہ گئی تھی۔ کچھ دیر چلنے کے بعد بائیں ہاتھ کے موڑ پر نواب کی گلی آگئی۔ بٹھل وہیں ٹھہر گیا۔ سامنے کچھ فاصلے پر نواب کی کوٹھی نظر آرہی تھی۔ موت پر روشنی بھی کیسی عجیب لگتی ہے۔ وہاں تیز روشنیاں ہورہی تھیں اور متعدد موٹریں' گھوڑا گاڑیاں اور سائیکلیں کھڑی تھیں۔ کوٹھی کی دیوار کے ساتھ کرسیاں بھی لگی ہوئی تھیں۔ کلام پاک کے ورد اور طرح طرح کی دھیمی اور تیز آوازوں کا ملا جلا شور گونج رہا تھا۔ باہر کئی ملازم اور مزدور شامیانہ نصب کرنے میں مصروف تھے۔ بٹھل چند لمحے خاموش کھڑا سامنے کا منظر دیکھتا رہا۔ پھر اس نے زورا سے کہا کہ وہ کسی طرح نواب کے ڈرائیور کو اس کے پاس لے آئے۔ اس نے زورا کو احتیاط کی ہدایت کی۔ اتنی رات کو ایک اجنبی کا گھر کے سامنے نظر آنا باہر موجود ملازموں اور مزدوروں کے لیے تجسس واضطراب کا باعث ہوسکتا تھا۔ نواب کے شناسا' ہر شخص کے لیے اس کی ناگہانی موت ایک معما ہوگئی۔ لوگ اپنے اپنے طور پر جانے کیسے کیسے فسانے وضع کررہے ہوں گے۔ اس کام کے لیے جمرو زیادہ موزوں تھا۔ معلوم نہیں کیوں' بٹھل نے زورا کو ترجیح دی تھی۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ایسے وقت ڈرائیور کو تلاش کرنا اور اسے ہمارے پاس آنے کے لیے آمادہ کرنا بہ طور خاص زورا کے لیے آسان کام نہیں تھا۔ بہرحال نواب کا ڈرائیور زورا کو پہچانتا تھا۔ اس رات نواب مجن میاں کے باغ سے واپسی کے وقت ہماری خیر خبر کی جستجو میں جب زورا اور جمرو نے سرغنہ اور اس کے مردہ اور زخمی ساتھیوں کی موٹر باغ سے کچھ دور روکے رکھی تھی کہ اتنی دیر میں نواب کی موٹر میں ہم بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ جمرو اور زورا ہمیں دیکھ کے بے قابو ہوگئے تھے اور نواب کے ڈرائیور سے ہم سب کا باہمی تعلق چھپانا ممکن نہیں رہا تھا۔ اس رات ڈرائیور نے • راکو دیکھ لیا تھا۔ ادھر زورا اور جمرو کی موٹر سارے راستے نواب کی موٹر کے ساتھ چلتی رہی تھی۔ پھر علی الصباح ہمارے خون آلود کپڑے تبدیل کرنے کے لیے جب زورا اور جمرو ہوٹل سے ڈاکٹر ناصر مرزا کے ہاں ہمارے لیے نئے کپڑے لائے تھے تو بھی نواب کے ڈرائیور نے ان کے چہرے چشم نشیں کیے ہوں گے۔ اس کا ملنا شرط تھا۔ گھر میں اس کے آقا کی لاش پڑی تھی۔ سارے گھر پر قیامت سی ٹوٹ پڑی ہوگی۔ ڈرائیور کا حال بھی نہایت غیر ہوگا۔ نواب سے اس کا ایک ربط خاص بھی تھا۔ رات بہت ہوچکی تھی۔ گو اس وقت ڈرائیور کی موجودگی کا امکان زیادہ تھا لیکن اسے کوئی بھی مصروفیت ہوسکتی تھی۔

مجھے خیال آیا کہ جمرو کو نواب کے دروازے پر نہ بھیجنے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔ حیدر آباد آنے کی پہلی رات' نواب کے گھر داخل ہونے سے پہلے نہ ہمیں اس کے رویے اور پذیرائی کا کوئی اندازہ تھا' نہ اس کی طرف سے ملنے والے خط کے سفید وسیاہ کے بارے میں کچھ علم تھا۔ کوئی بھی بات ہوسکتی تھی۔ حیدر آباد میں ہماری طلبی زر و جواہر کے جویا' بے جان پتھروں کے دیوانے نواب ثروت کے ہم نفس نوابوں کے اشارے پر بھی ممکن تھی۔ گزشتہ مرتبہ ہم ان پر بہت گہرے نقش چھوڑ کے گئے تھے۔ حیدر آباد میں ہمارے قیام کے دوران میں ابا جان کی نو خرید حویلی میں ان کے بے شمار مسلح آدمیوں کی پسپائی کا صدمہ انہیں ازبر ہوگا' کسی تازیانے کے مانند بمبئی میں ہمارے تعاقب کی مہم جوئی میں بھی انہیں ناکامی ہوئی تھی۔ نواب کے خط پر شبہ کرنے کے جواز کم نہیں تھے لیکن ایک عرصے بعد کہیں سے کورا کی بازیابی کی نوید آئی تھی..... تمام خدشوں کے باوجود ہمیں تو نواب ثروت کی بارگاہ میں حاضری دینی ہی تھی۔ بٹھل نے اسی لیے زورا اور جمرو کو نواب کی کوٹھی کے اردگرد گھومتے رہنے کی تاکید کی تھی اور انہیں اجازت دی تھی کہ نواب کے ہاں سے آدھی رات تک ہمارے برآمد نہ ہونے کی صورت میں وہ کوٹھی کی چار دیواری پھلانگ جائیں۔ نواب ثروت نے اس رات بہ اصرار ہمیں دسترخوان پر بٹھا دیا تھا۔ ابھی آدھی رات کا وقت نہیں ہوا تھا لیکن واپسی میں ہمیں بہت دیر ہوچکی تھی۔ جمرو کو بے چینی ہوئی اور اس نے ایک دور افتادہ' غیر حیدر آبادی سائل کی حیثیت سے نواب کے دروازے پر جاکے دستک دی۔ اس کے بہ قول دربان سے اس کی خوب چخ چخ ہوئی۔ جمرو نے نواب ثروت سے ملنے اور اپنی حاجت عرض کرنے کی ضد کی تھی۔ دربان انکار کرتا رہا کہ سردست نواب سے ملنا ممکن نہیں ہے' وہ باہر سے آئے ہوئے مہمانوں کی نگہ داری میں مصروف ہے۔ جمرو کو بس یہی معلوم کرنا تھا۔ دربان کو جمرو کا چہرہ یاد ہوگا۔ کچھ وقت گزار کے جمرو دوسری بار بھی وہاں گیا تھا۔ اسی وجہ سے بٹھل نے جمرو کو وہاں بھیجنا مناسب نہیں جانا تھا۔ بٹھل اپنے ذہن میں سب کچھ سینت کے رکھتا تھا۔ میرا تو دماغ ذرا سی بات پر پھر جاتا تھا۔ اس بے دھیانی کا سبب کم عقلی ہی ہوسکتا ہے۔ کبھی کبھی تو اپنی اس حالت پر مجھے غصہ بھی بہت آتا تھا۔ چڑ بھی بہت ہوتی تھی۔ پر آدمی اپنے آپ کو کتنے طمانچے مارے' آدمی

...ی خوشبو کا بھی تو اسیر ہوتا ہے۔

ہم دور کھڑے دیکھتے رہے۔ زورا آہستہ روی سے نواب ...ے مکان کے نزدیک ہوتا گیا۔ اس کی رفتار میں کسی قسم کی ...لت یا جھجک نہیں تھی۔ شامیانہ آدھے کے قریب نصب کیا ...اچکا تھا اور ہر کوئی اپنے کام میں مصروف تھا۔ اتنے زیادہ ...ادمی نہیں تھے۔ زورا کے لیے یہی بہتر تھا کہ وہ چپکے سے انہی ...ں شامل ہوجائے تاکہ نواب کے گھر سے متعلق لوگ اسے ...زدور سمجھیں' اور مزدور نواب کے گھر کا کوئی فرد۔ نواب کا ...رائیور اگر گھر میں موجود تھا تو اس کے باہر ہونے کا امکان زیادہ تھا۔ اتنی رات میں زورا کو سامنے دیکھ کے ڈرائیور کی ...واس باختگی یقینی تھی۔ زورا کو اسی مرحلے پر ہوشمندی کا ثبوت دینا تھا۔

بٹھل کے آگے یوں تو سبھی مٹی کا ڈھیر معلوم ہوتے تھے لیکن صرف یہی تو نہیں تھا۔ زورا اور چھیدا نے جھنگا دادا کا اڈا حسن وخوبی سے چلایا تھا' زورا کوئی بے عقل شخص نہیں تھا۔ اسے کوئی وقت ضائع کیے بغیر ڈرائیور کو ساتھ چلنے پر ہموار کرنا تھا۔ زورا کے پاس کمر سے بندھا ہوا تمنچا بھی تھا' چاقو بھی۔ مجن میاں کے باغ میں سارا فتنہ ڈرائیور کا چشم دیدہ نہیں تھا لیکن جتنا بھی اس نے دیکھا تھا' اس کی عبرت سینے میں پیوست ہوگئی ہوگی اور بٹھل تو سرتاپا اس کی بینائی کا جزو بن چکا ہوگا۔ ڈرائیور کو یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ زورا بٹھل ہی کا ساتھی ہے۔

ہم تینوں کی نظریں زورا پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ کسی رکاوٹ کے بغیر مکان کے نزدیک پہنچ گیا تو بٹھل اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ میں نے اور جمرو نے بھی اس کی پیروی کی' پھر سب کچھ ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔

ہم نواب کی گلی سے ملحق گلی سے گزرتے ہوئے بڑی سڑک پر آگئے۔ زورا کو وقت بھی لگ سکتا تھا۔ نواب کی گلی کے موڑ پر ہمارا تادیر کھڑے رہنا احتیاط کے منافی تھا۔ نواب کے مکان کے آگے کھڑی ہوئی موٹریں اور گھوڑا گاڑیاں قریبی رشتے داروں کی آمدورفت جاری رہنے کی علامت تھیں۔ کسی کا بھی اس طرف سے گزر ہوسکتا تھا جہاں سے ہم نے زورا کو آگے بھیجا تھا۔ اب تک تو سارے شہر میں نواب کی موت کی خبر عام ہوگئی ہوگی اور موت سے زیادہ موت کی نوعیت کے چرچے ہورہے ہوں گے۔ ہر طرف ایک کہرام سا برپا ہوگا۔ پولیس تو پہلے ہی سادہ لباس میں ڈاکٹر ناصر مرزا کے ہاں آگئی تھی اور نواب کے سگے خالہ زاد بھائی نواب فہمید نے کسی طرح اسے سنبھال لیا تھا۔ نواب کی زندگی تک بات اور تھی۔ اب سادہ لباس والوں کی جگہ باقاعدہ باوردی پولیس والے بھی حرکت میں آگئے ہوں گے۔ نوابوں کی ریاست ہے' وہی حاکم' انہی کی حکومت۔ یہ واقعہ ان سب کے لیے بڑی سبکی بلکہ توہین کے مترادف ہے۔ وہ اپنے قبیلے کے ایک ممتاز شخص کے ختم ہوجانے پر ہاتھ پیر توڑے نہیں بیٹھے رہیں گے۔ آج نہیں تو کل' نواب ثروت کی تدفین کے بعد انہیں محرک کا سراغ لگانے اور دست درازوں تک رسائی کے لیے کوئی بھی شدید حکم صادر کرنے میں رورعایت نہیں کرنی چاہیے۔

بٹھل نے صرف ایک چکر کاٹا پھر دوبارہ ہم پرانی جگہ آکے کھڑے ہوگئے۔ ہم نے موڑ سے نواب کی گلی میں جھانک کے دیکھا اور میرا دل یک لخت زور سے دھڑکنے لگا۔ زورا کے ساتھ ڈرائیور آرہا تھا۔ وہ زیادہ دور بھی نہیں تھے' لمحوں میں ہم تک پہنچ گئے۔ ڈرائیور کی حالت بہت شکستہ تھی۔ آنکھیں سوجی ہوئی' چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ وہ بڑی حد تک ہیبت زدہ بھی نظر آرہا تھا۔ اس نے دزدیدہ نگاہوں سے ہمیں دیکھا اور جھجکتے ہوئے سلام کیا۔

بٹھل نے جواب نہیں دیا اور چپ کھڑا اسے گھورتا رہا۔

ڈرائیور نے سر جھکالیا اور پژمردگی سے بولا "سرکار نے یاد فرمایا" اس کے لہجے میں اضطراب نمایاں تھا۔

"ہاں رے!" بٹھل نے سانس بھر کے کہا "اپنے کو بھولا تو نہیں رے؟"

"کیا' کیا بولتے ہیں سرکار!" ڈرائیور نے جلدی سے کہا "اپن سرکار کو کیسے بھول سکتا ہے۔"

"پھر تو ٹھیک ہے" بٹھل بدبداتے ہوئے بولا "کیا نام تھا تیرا؟"

"ہدایت علی' ہدایت علی سرکار!"

"ہاں' ہدایت علی صاحب بہادر' لاٹ صاحب!" بٹھل نے پھنکارتی آواز میں کہا "نواب کا پالتو ہے نا' اشارے پر بھاگتا' دم ہلاتا تھا۔"

مجھے ایسی توقع بالکل نہیں تھی۔ بٹھل کے تیور ہی بدلے ہوئے تھے۔ جانے وہ ڈرائیور سے کیا معلوم کرنا چاہتا تھا۔ میرے تو کچھ پلے نہیں پڑ رہا تھا۔

"سرکار!" ہدایت علی کی آنکھیں پھٹ گئیں "اپن' اپن سے کوئی خطا ہوگئی ہے؟ خدا اکریم جانتا ہے اپن..."

بٹھل نے ہاتھ اٹھا کے اسے روک دیا "حرام کا جنا' بولے تو ابھی تجھ کو بھی نواب کے ساتھ بھیج دے۔ ادھری

بھی تو نواب کو تیری ضرورت پڑے گی بڑی۔"
"میں غریب آدمی ہوں حضت' بہت غریب۔ لاچار' غلام کو معلوم نہیں' کیا نادانی ہوئی ہے پر غلام کو معاف کردو' معاف کردو سرکار!" ڈرائیور گھگھیانے لگا۔
اس کی ضرورت نہیں تھی۔ زورا نے اپنا چاقو دانستہ ہی زمین پر گرایا ہوگا۔ کھلا چاقو' زمین پر چھناکا ہوا۔ زورا نے فوراً چاقو اٹھالیا اور اڈے کے داداؤں کی طرح ہوا میں اچھال کے مشاقی سے انگلیوں کی گرفت میں لے لیا۔
"پلے کتنے ہیں رے تیرے؟" بٹھل نے تلخی سے پوچھا۔
ڈرائیور کی سمجھ میں دیر سے آیا اور بدحواسی سے بولا "تین' تین سرکار' دو بچیاں' ایک بچہ' بیٹا چھوٹا ہے۔"
"پل جائیں گے سسرے پھر' نوابوں کو ادھری کمتائی نہیں ہے۔"
"آپ' آپ کیا فرماتے ہو؟" ڈرائیور کا جسم دھڑکنے لگا۔
"دیکھ رے' ہم سے الٹا سیدھا بولا تو ادھری سے بوجھا اٹھاکے لے جائے گا کوئی۔ اپنے پیروں سے نہیں جائے گا سور کی اولاد! اور سن لے' ٹائم بھی زیادہ نہیں ہے اپنے پاس۔"
یہ تو کوئی اور بٹھل تھا۔ مجھے وہ اڈے کا معمولی دادا لگ رہا تھا۔ اڈے کے عام داداؤں کی طرح وہ ڈرائیور سے مخاطب تھا۔ مجھے یاد آیا' اڈے کے آدمیوں کا طریقہ ہے کہ وہ آدمی دیکھ کے بات کرتے ہیں۔ غالباً یہی بات ہوگی۔ کسی دنگے فساد اور شوروغل کا وقت تھا نہ محل ورنہ ڈرائیور ایک ہاتھ کا بھی نہیں تھا۔
"کیا' کیا بات ہے سرکار؟" وہ بٹھل کے پیروں پر گر گیا۔
"اپن کو بولو' حکم کرو سرکار!"
"کدھری بھیجا ہے مولوی کو؟" بٹھل نے تڑختی آواز میں پوچھا۔
"مم ۔۔۔ مولوی!" ڈرائیور کی زبان میں لکنت آگئی "کون مولوی' کون حضت!"
"نہیں جانتا رے' بیلا بھی ہے سسرا۔"
اسی اثنا میں جمرو اور زورا ڈرائیور کے قریب ہوگئے۔ جیسے وہ بٹھل کے حکم کے منتظر ہوں۔
یہ ستم بھی خوب ہے کہ آدمی کو اپنے حال پر ترس آیا کرے۔ میری حالت وہی تھی جو گرداب میں پھنسے' ہاتھ پاؤں مارتے کسی شخص کی ہوتی ہے۔ میں نے اپنے ہوش وحواس قائم رکھنے اور کچھ اخذ کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ بٹھل کی باتوں سے صاف ظاہر تھا کہ مولوی صاحب' نواب ثروت کے ہاں نہیں ہیں۔ گویا نواب ثروت کے گھر میں ان کی موجودگی کی خوش گمانی میں بٹھل یہاں نہیں آیا ہے۔ بٹھل کے خیال میں ڈرائیور کو ضرور مولوی صاحب کے۔۔۔ کسی نئے ٹھکانے کا علم تھا۔ میرے جی میں آتا تھا کہ ڈرائیور کی کمر پر ایک ضرب رسید کردوں' وہ دہرا ہوجائے گا اور اتنی دیر نہیں لگائے گا۔
"آپ' آپ مولوی شفیق صاحب قبلہ کا بولتے ہو؟" ڈرائیور گھٹی ہوئی آواز میں بولا۔
"ہاں بالم! دیر میں آیا تیری کھپڑیا میں۔"
"ہاں' اپن تو کل' کل ہی ان کے پاس گیا تھا۔"
"پھر کدھری بھیجا اس قبلہ کو؟"
"کدھر بھیجا" ڈرائیور ہذیانی انداز میں بولا "آپ کیا بولتے ہو سرکار! اپن نے کدھر بھیجا ہوگا ان کو' اپن تو ان کو حضور نواب کی حالت کا بولے تھے' بس بس۔ ان بے چارے کو کچھ معلوم نہیں تھا۔"
"لگتا ہے' ٹائم آگیا ہے تیرا بھی" بٹھل نے بھڑک کے کہا۔
"خدا رسول کی قسم' آگے کا اپن کو نہیں معلوم۔ اپن بے قصور ہے سرکار۔ اس کے بعد اپن کو مولوی صاحب کے پاس جانے کا موقع ہی کہاں ملا؟"
"ہم کیا بولتے ہیں رے۔ ٹھیک سے سنا نہیں تو نے۔ ابھی کدھری ہے وہ؟"
"کون؟ مولوی صاحب' کیا وہ گھر پر نہیں ہیں سرکار؟" ڈرائیور سٹپٹاتے ہوئے بولا "اپن کو بالکل نہیں معلوم حضور۔"
"ادھری تیرے جانے کے بعد ہی اس نے گھر چھوڑدیا تھا۔"
ڈرائیور ہدایت علی کے چہرے پر حیرت امڈ آئی اور اس کے ہونٹ پھڑکنے لگے۔
"ہاں رے' پھر کدھری چھپایا ان کو؟"
"کیا بولتے ہیں حضت' اپن کہاں کو چھپاتے؟" ڈرائیور دریدہ آواز میں بولا "اپن کوئی نواب تو نہیں ہے' اپن تو بس حکم کا ۔۔۔"
"حکم ہی دیتے ہیں حرام کے تخم' تجھ کو۔ نمک کی اپنے پاس بھی کمتائی نہیں ہے۔ سیدھی طرح نہیں بولے گا تو' تو ۔۔۔" بٹھل نے تڑخ کے کہا "ہم کو زیادہ بات کرنی نہیں آتی۔"

اسی لمحے کہیں دور سے موٹر کی آواز گونجی۔ لمحہ بہ لمحہ ھتے ہوئے شور سے اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ بڑی سڑک سے وئی موٹر ہماری ہی طرف آرہی ہے۔ کچھ پیچھے ہوکے ہم بستاً اور اندھیرے میں ہوسکتے تھے لیکن موٹر کی تیز روشنی رگوشہ روشن کردیتی۔ اس طرح پانچ آدمیوں کا یہ ناوقت جتماع کسی کو بھی شک میں ڈال سکتا تھا۔ خصوصاً نواب روت کے گھر کے قریب۔ چند ثانیوں میں موٹر کی آواز اور دیک ہوگئی۔ بٹھل نے معاً ڈرائیور کو دھکادیا۔ ادھر سے مرو نے اس کے بازو میں ہاتھ ڈالا' ادھر سے زورا نے۔ مگر زورا فوراً الگ ہوگیا۔ ڈرائیور بری طرح بوکھلا گیا تھا۔ جب سے موڑ سے نواب کی گلی کی طرف دھکیلا گیا۔ تبھی اس کی سمجھ میں کچھ آیا ہوگا۔ ہم سب کا رخ نواب کی گلی کی طرف ہوگیا تھا اور ہم نے نواب کے مکان کی سمت بڑھنا شروع کردیا تھا۔ موٹر اس گلی میں داخل ہوئی جہاں ہم سب کھڑے تھے' پھر گلی کا موڑ کاٹ کے نواب کے گھر کی جانب جانے لگی۔ موٹر میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی نظر ہم پر ضرور پڑی ہوگی۔ نہیں ہمارے چہرے نظر نہ آسکے ہوں گے کہ سامنے ...... ہماری پشت تھی۔ موٹر ہمارے قریب سے گزرتے وقت ڈرائیور کے بپھر جانے کا امکان تھا۔ مگر دہشت اس کے رگ وپے میں اتر گئی تھی۔ اسے ذرا سا بھی خطرہ مول لینا نہیں چاہیے تھا۔ زورا کے ہاتھ میں چاقو دبا ہوا تھا۔ اسے چاقو کی نوک ڈرائیور کے جسم کے کسی حصے سے مس کرنے کی ضرورت بھی نہیں پڑی۔ آدمی' آدمی کی بات ہے۔ ہتھیار تو آگے کی منزل ہے۔ کبھی آدمی ہی سراپا ہتھیار ہوتا ہے۔ اس کی آنکھیں' آواز' دست وبازو اور اس کے تیور ہی چاقو' تلوار' طمنچے کا زور واثر رکھتے ہیں۔ ہنر ایک مستزاد خوبی ہے۔ انہوں نے ڈرائیور کو جیسے کسی شکنجے میں کسا ہوا تھا۔ موٹر ہمارے پاس سے گزرتی ہوئی آگے چلی گئی تھی کہ بٹھل پلٹ گیا۔ چند قدموں بعد ہم نے گلی کا موڑ طے کیا اور واپس پرانی جگہ آکے ٹھہر گئے۔ بٹھل نے توقف کے بغیر ڈرائیور سے دوبارہ مولوی صاحب کے نئے ٹھکانے کے بارے میں استفسار کیا۔ جواب میں ڈرائیور عاجزی کرنے اور گڑگڑانے لگا اور خدا رسولﷺ' غوث پاک کے واسطے دینے لگا۔ بٹھل کے اصرار میں بھی پہلے جیسی تندی نہیں رہی تھی۔ شاید اسے احساس ہوگیا تھا کہ ڈرائیور کی بس اتنی ہی استطاعت ہے۔ ہر شخص کے سینے کی ایک استطاعت ہوتی ہے' اور کوئی بہ قدر سینہ یا بہ قدر ظرف ہی امانتیں محفوظ رکھ سکتا ہے۔ اپنے آقا نواب ثروت کے بعد ڈرائیور کا ظرف ویسے بھی شکستہ ہوجانا چاہیے۔
"جا کے ادھری ہم لوگوں کا کیا بولا تھا تو نے مولوی کو؟" بٹھل نے آتش بار لہجے میں پوچھا۔
"آپ کے بارے میں" ڈرائیور نے اپنا خشک گلا تر کیا۔ "کچھ بھی نہیں' کچھ بھی نہیں سرکار" پھر وہ خود ہی چونک پڑا اور کہنے لگا "نہیں نہیں' اپن سرکار کے بارے میں بولے تھے۔ اپن بولے تھے۔ اپن نے پوری بات تو نہیں کی' ہاں ان کو بولا کہ باہر کے دو صاحب حضور نواب کے ساتھ تھے۔ سچی بات ہے' ان لوگاں کا ہی دم تھا' اناں نے نواب صاحب کو بچانے' دوبارہ زندگی دلوانے میں اپنی جان بھی جوکھم میں ڈال دی تھی۔ اپن نے حضور کا نام لیا تھا۔ اپن نے پورا نہیں پر جو کچھ بھی اس قیامت کی رات کو دیکھا تھا۔ تھوڑا بہت ان کو بولا تھا۔ مولوی صاحب قبلہ غور سے سنتے رہے' پوچھنے لگے۔ کب ایسا ہوا؟ اپن نے بتایا۔ سن کے ایک دم چپ ہوگئے۔ اپن سمجھے' ان کو بہت قلق' صدمہ ہوا ہے۔ زبان سے کچھ بولے تو نہیں پر ڈاکٹر صاحب کے پاس حضور نواب کو دیکھنے کے لیے آنے کا بولے تھے۔ وہ نہیں آئے۔ سارے شہر کو نواب صاحب کا معلوم ہوگیا ہے۔ ایک ان کو معلوم نہیں ہوا۔ آپ ٹھیک فرماتے ہیں حضور' جب وہ وہاں ہیں ہی نہیں تو اس طرف آمیں گے بھی کیسے۔ اب کچھ کچھ اپن کی سمجھ میں بات آرہی ہے سرکار۔ اپن سے ضرور کوئی غلطی ہوئی ہے' پر سب ان جانے میں' اپن تو ۔۔۔"
"زیادہ ٹیں ٹیں نہ کر بھتنیا کے' کنجر کی اولاد!" بٹھل نے برہمی سے پوچھا "ادھری شہر میں اور کون کون مولوی کا سگا ہے؟"
"اپن کیا بول سکتے ہیں" ڈرائیور دہائیاں دینے لگا "اپن نہیں جانتا' ایک دم نہیں جانتا سرکار۔ مولوی صاحب گھر سے بہت کم باہر نکلتے تھے۔ ان کو یہاں آئے ہوئے ابھی دن ہی کتنے ہوئے تھے۔ اپن جانتے ہیں' ان کا یہاں کسی سے حضور نواب جیسا واسطہ نہیں تھا۔" ڈرائیور کی زبان بھٹک رہی تھی' کہنے لگا "اپن کو معلوم ہے' نواب صاحب بہت کچھ ان کو فراہم کیے ہیں۔ مکان' سارا سازوسامان۔ نواب صاحب کے گھر والوں' ای حضور وغیرہ کو بھی شاید اس کا پتا نہیں ہے۔ ان دناں خود حضور نواب دو ایک بار مولوی صاحب کی خیر خبر لینے کو وہاں گئے تھے۔ اپن کے پیچھے بھی گئے ہوں تو کیا بول سکتے ہیں۔ کبھی مولوی صاحب ان کو ملنے آجاتے تھے یا نواب صاحب موٹر بھیج کے بلوا لیتے تھے۔"
جمرو نے ڈرائیور کا بازو چھوڑدیا۔ بٹھل نے کچھ نہیں

کہا تھا لیکن جمرو کو ضرورت محسوس ہوئی۔ اس نے ڈرائیور کی گردن پر ہاتھ جھپٹا کے گدی کی چٹکی بھرلی۔ گردو پیش میں واقع مکانات میں کسی بیدار شخص کو یقیناً مضطرب ہونا چاہیے اور سماعت کا فتور سمجھ کے درگزر بھی کردینا چاہیے۔ ایک لحظے کے لیے ڈرائیور کے ڈکرانے کی آواز گونجی تھی کہ اس کی کراہیں حلق میں گھٹ گئیں اور اس کا جسم پھڑکنے لگا۔ جمرو نے اسے متنبہ کیا کہ بہتر ہے' وہ ایک بار اور نظرثانی کرلے۔ بعد میں اس کے بیان میں ذرا سی بھی آلائش کا علم ہوا تو ہمیں اس کے سر تک پہنچنے میں بس ارادے کی تاخیر ہوگی۔ جمرو نے جب اپنی گرفت ڈھیلی کی تو ڈرائیور کی آنکھیں چڑھ گئی تھیں۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔

وہ نواب کا خاص ملازم تھا۔ نواب کے درون خانہ' درون سینہ معاملات کا شاہد' نگراں اور امین بھی۔ بعض غلام کتوں سے بدتر صفات رکھتے ہیں۔ آئینے کی طرح یوں بھی ہر ایک کی زندگی میں کسی نہ کسی بے پئے چوپائے کا ضرور دخل ہوتا ہے۔ اسے نفس ناطقہ بھی کہتے ہیں۔ پہلی رات' بہت رات گزر جانے پر جب ڈرائیور ہدایت علی ہمیں چار کمان تک پہنچانے آیا تھا تو اسے ہماری اقامت کا سراغ لگانے کی بڑی بے قراری تھی۔ وہ ہمیں گھر کے دروازے تک پہنچانے کے لیے مچلتا رہا تھا۔ موٹر کسی گھر تک لے جانے کے بجائے بیچوں بیچ چار کمان کے علاقے میں بٹھل کے اتر جانے پر اسے بہت مایوسی ہوئی تھی۔ ہماری اقامت گاہ کی سمت جاننے کے لیے اس نے موٹر کی خرابی کا عذر کیا تھا اور دیر تک وہاں ٹھہرا کل پرزے چھوتا رہا تھا' اور اس رات جب ہم نواب ثروت مرحوم کے بہ قول اس کی زمینوں والے مکان میں مقیم مولوی صاحب کی طرف جارہے تھے تو راستے میں اس نے کئی مرتبہ موٹر خراب ہوجانے کا تماشا کیا تھا۔ اس طرح وہ کچھ وقت گزار کے اندھیرا گہرا ہوجانے کا منتظر تھا۔ مجن میاں کے باغ کے قریب اس نے موٹر بالکل ہی ٹھپ کردی تھی۔ تمام راستے وہ خندہ پیشانی اور سعادت مندی سے نواب کی لعنت ملامت سنتا رہا۔ سب کچھ ہدایت کے مطابق تھا۔ باغ کی عمارت میں ہمارے ٹھہر جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی وہ خاموشی سے موٹر باغ میں لے آیا تھا۔ سرغنہ اور اس کے ساتھیوں کی اچانک یلغار اور نواب کی زہرکاری و ستم گری افشا ہوجانے پر بٹھل کو یہی باور کرنا چاہیے تھا کہ موٹر کی خرابی نوٹنکی کا حصہ ہے۔ اب تک باغ میں موٹر آچکی ہوگی۔ سوختہ نواب کو لے جانے کے لیے اس نے پورے یقین سے موٹر طلب کی تھی۔ نواب کی حالت نہایت شکستہ تھی۔

ڈرائیور ہدایت علی کی ردوقدح کی مجال نہ تھی۔ کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر اس نے عمارت کے چبوترے سے موٹر لگادی۔ ممکن ہے' اپنے طلبیدہ سرفروشوں اور جاں ہاروں کی آمد کے بارے میں نواب نے ڈرائیور کو باخبر رکھا ہو اور ہم سے نمٹ لینے کے بعد کی ہدایات بھی ازبر کرائی ہوں اور ہوسکتا ہے' نواب نے جزئیات سے پہلوتہی کی ہو۔ وہ ڈرائیور کو اپنی پاک دستی کا وہی تاثر دینا چاہتا ہو جو باغ کے مکینوں اور ریاست میں امن و عافیت کے ننگ داروں کو دینا چاہتا تھا۔ مقدار نمک سے زیادہ نمک خواروں کی آزمائش نہیں کرنی چاہیے ورنہ ان کے سینگ بھی نکل آتے ہیں۔ ہوش مندی کی جتنی ضرورت آقاؤں کو پڑتی ہے' اتنی غلاموں کو بھی۔ ایک غلام کو بھی دائرے سے سوا نہ سننا چاہیے نہ دیکھنا۔ اچھے غلام کا شعار محض تعمیل ہے۔ نکتہ رسی اور جزبینی کا شغل اسے راس نہیں آتا۔ ہمیں اس سے اب کوئی سروکار بھی نہیں تھا کہ ہمارے معاملے میں نواب نے ڈرائیور ہدایت علی کو کسی طور ہم نفسی کا شرف بخشا تھا۔ بٹھل کو تو ڈرائیور کی جانب سے مولوی صاحب کے بارے میں مبہم و موہوم ہی سہی' بس ایک اشارہ مطلوب تھا۔

زورا مطمئن نہیں ہوا۔ اسے ڈرائیور کی زبوں حالی پر کوئی شک تھا۔ سامنے سے جمرو کے ہٹتے ہی اس نے ڈرائیور کے سینے پر پوری طاقت سے ہتڑ رسید کیا۔ ڈرائیور کی پسلیاں چیخ گئی ہوں گی۔ لڑھکتا ہوا وہ دور جاگرا اور سینہ پکڑ کے دہرا ہوگیا۔ اس کی آواز بھی نہیں آرہی تھی۔ زورا نے گردن پر پنجہ ڈال کے اسے دوبارہ زمین سے اٹھایا۔

"چھوڑ دے اسے" بٹھل نے بوجھل آواز میں کہا "کھونٹے سے بندھا ہے رے' جائے گا کدھر بھڑوا۔"

ڈرائیور کے شانے ڈھلک گئے تھے اور جسم بل کھا رہا تھا۔ چند لمحے اس نے سانسوں کی استواری میں صرف کیے پھر ہاتھ جوڑ کے معذرتیں' منتیں کرنے لگا اور ساری وہی تکرار۔ اس میں کچھ نیا نہیں تھا۔ بٹھل نے پھر اس سے کلام نہیں کیا۔ اب کچھ کہنے سننے کی ضرورت بھی کیا رہ گئی تھی۔ ڈرائیور کے کہنے کے مطابق نواب کے گھر سے متعلق کسی اور شخص کو مولوی صاحب اور ان کی بیٹی کورا کے ٹھکانے کا علم نہیں تھا۔ کوئی اور نواب کا محرم راز اور دم ساز ہوتا تو ہدایت علی اس کی جانب اشارہ کرنے میں کوئی پس و پیش کیوں کرتا۔ یہ راست گوئی تو اس کے لیے ہمارے عتاب سے نجات کا موجب ہی بنتی۔ نواب کا کوئی ایسا رفیق بھی عیادت کے لیے ڈاکٹر ناصر مرزا کے ہاں نہیں پھٹکا تھا۔ ہدایت علی

ال نواب کا ملازم تھا۔ آقا اور غلام کے اپنے آداب تے ہیں۔ ملازموں کو دلیلیں نہیں دی جاتیں' فیصلے سنائے تے ہیں۔ مولوی صاحب اور نواب ثروت کے مابین کسی رده معاملت سے ڈرائیور کی ناواقفیت بہ ظاہر قریب قیاس لگتی تھی ورنہ اس زیردستی کے عالم میں کسی مرحلے پر اس زبان ضرور بہکتی۔ نواب کی اس سفاکانہ خلاقی کا بھی اسے ید کوئی اندازہ نہیں تھا کہ مجن میاں کے باغ میں نواب کے ے ہوئے زرخریدوں کی شورہ پشتی کا سرا کسی طور مولوی حب سے جاملتا ہے۔

بٹھل بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہوگا۔ جو میں نے اخذ کیا تھا۔ ب اور کیا رہ گیا تھا۔ وہی دن' وہی راتیں۔ ساری جاں کاہی ر جاں سوزی کا حاصل اتنا تھا کہ شہر حیدرآباد میں مولوی حب کی دست یابی کا اب کوئی امکان نہیں ہے۔ ڈاکٹر ناصر زا کے ہاں موت سے نبرد آزما' زخم خوردہ نواب اس لائق نہیں تھا کہ ڈرائیور ہدایت علی کو مولوی صاحب کے پاس بجے اور انہیں شہر میں ہماری موجودگی کے خطرے سے باخبر کھنے کا کوئی حکم صادر کرسکے۔ خلاصہ صرف یہ تھا کہ ڈرائیور نے از خود مولوی صاحب کو نواب پر آئی ہوئی افتاد سے مطلع رنا ضروری سمجھا اور جیسا کہ وہ کہہ رہا تھا' مجن میاں کے غ تک نواب کے ہم راہ جانے والے دو اجنبیوں کا ذکر ولوی صاحب کے سامنے بر سبیل تذکرہ آگیا تھا۔ ڈرائیور کو غ میں پیش آنے والے شعبدے سے مولوی صاحب کے سی سلسلے اور تعلق کا تھوڑا بہت اندازہ ہوگا تو لازماً اس نے ارا تذکرہ دانستہ چھیڑا ہوگا۔ مولوی صاحب کو محتاط کرنے کے لیے یا اپنی تشنگی کی تکمیل کے لیے یا محض شوشہ طرازی کے لیے۔ ہمیں اس سے بھی کیا فرق پڑتا تھا کہ یہ ذکر شعوری تھا یا غیر شعوری۔ مولوی صاحب تو اب تک نہ جانے کتنی منزلیں دور جاچکے ہوں گے۔

آخری وقت' جب شاید آدمی کو سچ ہی میں راہِ نجات نظر آتی ہے' نواب نے ڈاکٹر ناصر مرزا سے اعتراف کیا تھا کہ وہ موجود بابر زماں خاں کو کورا کے سامنے پیش کردینا چاہتا تھا۔ اس کے بہ قول مولوی صاحب نے اس سے کہا تھا کہ کورا کی آس ٹوٹنے کی ایک ہی صورت نظر آتی ہے۔ ایک مرتبہ بس کسی تدبیر سے وہ جان لے کہ بابر زماں کی امید ایک سراب ہے' کسی دیوانے کا خواب۔ یہ ایک خواب مٹ جائے تو انہیں بھلا کورا کو نواب جیسے عالی شان' عالی مرتبت شخص کے سپرد کرنے میں کوئی عذر کیوں ہوگا؟ مولوی صاحب نے اسے یہ تاثر دیا تھا کہ تامل ان کی جانب سے نہیں' کورا کے سبب سے ہے۔ کورا کے لیے نواب کے اشتیاق کے جواب میں مولوی صاحب کی یہ تاویل نہایت قابل فہم تھی۔ نواب مجھ سے بھی مل چکا تھا اور مولوی صاحب اور کورا کے لیے میری آنکھوں کی دھند کا اچھی طرح مشاہدہ کرچکا تھا۔ اسے میرا پتا بھی معلوم تھا۔ مولوی صاحب نے اس طرح ایک طرف نواب کا شوق فراواں بڑی حد تک قابو میں کرلیا تھا' دوسری طرف انہیں اس کے طفیل عرصے بعد ایک جائے سکون میسر آگئی تھی۔ حیدرآباد ویسے بھی ان کا محبوب شہر تھا' ممکن ہے مولوی صاحب کے سان و گمان میں نہ ہو کہ نواب اتنی دور تک جاسکتا ہے اور بالفرض وہ یہ معرکہ سر بھی کرلیتا ہے' میری دیوار ہٹانے بلکہ مٹا دینے میں کامیاب بھی ہوجاتا ہے تو مولوی صاحب کے لیے اس سے بڑی راحت کیا ہوتی۔ کورا کو خود سے جدا کرنے کے دشوار گزار مرحلے سے تو انہیں کبھی نہ کبھی گزرنا ہی تھا اور کورا ان سے جدا بھی کہاں ہوتی۔ اسے نواب کی تحویل میں دینے کے بعد تو نواب کی نوازشیں ان پر اور ارزاں ہوجاتیں اور نواب جیسے باوقار' بردبار نوجوان کے لیے ہزار چراغ بھی ناکافی ہوتے۔ اور اگر انہوں نے یوں ہی دفع وقتی کے لیے نواب سے میری زنجیر کا ذکر کردیا تھا اور کورا کے لیے انہیں نواب کسی وجہ سے ناپسند تھا تو بھی ان کا کیا جاتا تھا۔ کسی بھی اندھیری رات' وہ کورا کو لے کے نکل کھڑے ہوتے۔ بستیاں بدلنے اور دربہ در مارے مارے پھرتے رہنے میں انہیں ملکہ حاصل ہوگیا تھا۔ اس مرتبہ زاد راہ بھی ان کے پاس کم نہیں ہوگا۔ مکان اور سازوسامان کے علاوہ نواب نے مولوی صاحب کو زرنقد سے بھی نوازا ہوگا اور کورا کے لیے بہ طور خاص دیگر تحفے تحائف کی نذریں الگ گزاری ہوں گی۔ ہر نئی جگہ جاتے وقت مولوی صاحب' کورا کو میری بازیابی کا آسرا ہی دلاتے ہوں گے۔ اس کی تلاش میں بھٹکنے والے تبت کے جانگ قبیلے کے لوگوں کا تو اب انہیں اتنا خوف نہیں ہونا چاہیے۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد ان سرپھروں کو تو اب کورا سے مایوس ہوجانا چاہیے۔

نواب کے لیے پہلا مرحلہ مجھے نابود کرنا تھا۔ پہلے مرحلے میں نواب کی سرخ روئی پر عہد شکنی کرنے' دوسرے لفظوں میں چپکے سے کہیں اوجھل ہوجانے سے پہلے مولوی صاحب میرے لاشے کا نظارہ کورا کو ضرور کراتے۔ معلوم نہیں' اس کے لیے نواب نے کیا اہتمام کیا تھا۔ ظاہر ہے' وہ کسی ایسی حالت میں مجھے کورا کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا کہ دور دور تک اس کے سائے کا بھی گمان نہ ہو۔ وہ میری لاش مولوی

صاحب کے دروازے پر پھنکوا سکتا تھا۔ کسی اجنبی کے ذریعے وہ مولوی صاحب کو یہ پیغام منتقل کرا سکتا تھا کہ بابر زماں خاں نامی کوئی شخص اس حالت میں فلاں جگہ' کوڑے کے کسی ڈھیر پر پڑا ملا ہے اور اس کے لباس سے مولوی صاحب کا پتا دستیاب ہوا ہے۔ باغ میں سرغنہ اسی لیے ہم پر گولی چلانے سے اجتناب کررہا تھا۔ سرغنہ کو شاید باغ سے ہمیں زندہ حالت میں کہیں لے جاکے نواب کے حسب منشا تمام کرنا تھا۔ زہر دے کے یا کسی اور طریقے سے۔ موت کے بے شمار طریقے ہوتے ہیں۔ اسے حادثے کی شکل دینے کے لیے نواب نے تمام تر احتیاطیں پیش نگاہ رکھی ہوں گی۔ پھر کورا نویاس والم کی ایک مہلت دینے کے بعد وہ مولوی صاحب سے دوسرے مرحلے کے لیے سلسلہ جنبانی کرتا۔ بہت سوں کی طرح اسے بھی یہ کلیہ ازبر ہوگا کہ وقت ہر زخم کا آخری نسخہ ہے۔ کیا عجب کہ مولوی صاحب کے پاس میری مجبوری ومعذوری کا عذر کیے بغیر کوئی چارہ ہی نہ ہو' انہوں نے نواب کے تیور بھانپ لیے ہوں۔ کورا کے طلب گاروں کا انہیں خوب تجربہ ہوچکا تھا۔ مجھے تو صرف جیسلمیر کے خون خرابے کا علم تھا اور جانے کہاں کہاں انہیں کیسی کیسی قیامتوں سے واسطہ پڑا ہو۔ کیا معلوم' حیدرآباد آکے کن مصائب سے وہ دوچار تھے۔ خود ان کے اعصاب بھی تو جواب دے سکتے ہیں۔ نواب کا گوشۂ اماں انہوں نے اس وقت غنیمت جانا ہوگا۔ ایسا کوئی عذر ہی انہیں سانس لینے اور ستانے کا کچھ وقت فراہم کرسکتا تھا۔ اندر کا حال تو کچھ وہی جانتے ہوں گے کہ کوئی آس ہی تو کورا کو قائم رکھے ہوئے ہے ورنہ وہ تو پھولوں سے زیادہ لطیف' شیشے سے زیادہ نازک ہے۔ ان پے بہ پے ہجرتوں سے تو وہ کب کی کمھلا چکی' ٹوٹ چکی ہوتی۔ دولت بھی کبھی کیسی مصیبت بن جاتی ہے' خوش جمالی کی ہو یا زروجواہر کی۔ آدمی کا جینا دوبھر کردیتی ہے۔ خدا جانے یہ کیوں ہے؟ بادل' چاندنی کو ستاتے ہیں' پروانے روشنی کے دشمن ہیں۔ بھونرے پھولوں کو چین نہیں لینے دیتے۔ کہتے ہیں' بس یہی قرینہ قدرت ہے۔ منیر علی کی بیٹی زہرہ نے مجھے بتایا تھا کہ مولوی صاحب نے کورا کو برقع پہنادیا تھا اور وہ اس کے پردے کا بہت خیال رکھتے تھے۔ گھر میں پڑوسیوں کی آمد بھی محدود تھی۔ وہ اسے بری نگاہوں سے بچائے پھرتے تھے لیکن خوشبو بھی تو کوئی چیز ہے اور ہوا بھی تو کوئی چیز ہے۔ زہرہ کہتی تھی' لوگ بہانوں سے اسے دیکھنے آتے تھے' اس کی ایک جھلک۔ وہ کسی شہزادی سے آخر کیا کم ہے۔ اور وہ شہزادی ہے بھی۔ نواب کیا اسے دیکھ کے کسی کے بھی نہاں خانے میں آگ لگ سکتی ہے۔ کچھ لوگوں میں کسی کو پاگل کردینے کا ایسا ہی جادو ہوتا ہے۔

مجھے یاد آیا' مولوی صاحب نے نہیں' نواب نے ان سے میری آمد کا ذکر کیا تھا۔ نواب نے مجھے اور پیرو کو بتایا تھا میرا نام سن کے ان پر سکوت چھاگیا تھا' سکوت کیا' سناٹا طاری ہوجانا چاہیے۔ نواب کے تجسس وتردد پر وہ پریشان ہوگئے تھے' کیا کہیں' کیا نہ کہیں۔ اس وقت انہوں نے بردباری سے اسے خاموش کردیا تھا۔ نواب نے بھی اپنے بزرگ مہمان کی کشمکش محسوس کرکے چپ ہوجانے کی شائستگی کی تھی۔ اسی مرتبہ نواب کی والدہ نے مولوی صاحب سے کورا اور نواب کے رشتے کی آرزو کی تھی۔ اور اسی دن سہ پہر کو' جب نواب گھر پر نہیں تھا' مولوی صاحب کسی سے وداعی سلام دعا کیے بغیر گھر سے چلے گئے تھے۔ نواب کا خیال تھا کہ مولوی صاحب میں انکار کا حوصلہ نہیں تھا۔ مولوی صاحب کے اس ناروا انداز میں رخصت ہوجانے سے اس پر شدید یاسیت کا غلبہ تھا۔ میں نے اور پیرو نے وضاحت نہیں کی کہ مولوی صاحب اس کی وجہ سے نہیں' اس کی زبانی بابر زماں کا نام سن کے' اس کے ہاں بابر زماں کی دوبارہ آمد کے اندیشے کے سبب سے روپوش ہوگئے ہیں۔ میں نے نواب کا گھر جو دیکھ لیا تھا۔ نواب ثروت کو مولوی صاحب کی واپسی کی امید نہیں تھی۔ کچھ عرصے بعد ان کا نواب کے شہر اور گھر کا رخ کرلینا اس کے لیے حیرانی اور شادمانی کا باعث ہوگا۔ نواب کے ہاں مولوی صاحب کی آمد بے ارادہ' بے غرض نہیں ہوگی' ہرچند پیشانی عرق آلود ہوگی۔ ادھر میری طرف سے بھی انہیں اطمینان ہوگا کیونکہ درمیان میں خاصا وقت گزر گیا تھا۔ نواب کے ہاں ان کی واپسی کی امید سے مجھے تائب ہوجانا چاہیے تھا۔ میں نے نواب کی دہلیز پر پڑاؤ تو نہیں ڈال دیا ہوگا۔ بہتر ہے کہ حیدرآباد جاکے ایک بار نیازمند نواب کو ساری صورت حال سے آگاہ کردیا جائے۔ حالات کی کشاکش' مسلسل گردشوں سے تنگ آکر آخرکار نواب ہی پر ان کی نظر ٹھہری ہو۔ انہوں نے طے کیا ہو کہ نواب ہی کورا کے لیے ایک موزوں ترین شخص ہے یا پھر اس طرح نواب کو آلۂ کار بناکے میرے وجود کے عفریت سے نمٹنے کا سودا ان کے سر میں سماگیا تھا۔ انہیں بحالی نفس اور تجدید توانائی کے لیے کچھ وقت درکار تھا۔ اس کا موقع انہیں نواب کے ہاں بہ فراغت مل سکتا تھا۔ سو کچھ حقیقت' کچھ فسانے پر مبنی داستان سناکے وہ نواب کی توجہ مبذول کرنے اور منتشر کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔

جانے کیا سچ تھا۔ پر میرا دل نہیں مانتا تھا۔ کسی بدگمانی پر
ں نسوں میں سوزش ہونے لگتی تھی۔ وقت آدمی کو اتنا
ں بدل دیتا۔ مولوی صاحب ایسے سنگ دل' اتنے شقی
ب نہیں ہوسکتے تھے کہ میرے لیے انہوں نے نواب کو
ں ایسی غضب کاری وغارت گری کے لیے مہمیز کیا ہو۔
وں نے تو اپنی دانست میں نواب سے حقیقت حال کا اظہار
ہوگا۔ وہ نیک وبد کی تمیز اور جزا وسزا کا عام لوگوں سے بہتر
ر رکھتے ہیں۔ وہ ایک دین دار' مہذب' مہربان اور تعلیم
ہ شخص ہیں۔ انہوں نے تو کورا کو موسموں کی دست برد'
نے کی نیرنگیوں سے بچائے رکھنے میں اپنی زندگی داؤ پر
ی ہے' اس پر نچھاور کردی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ
ے بہ وجوہ کورا کے لائق نہیں سمجھتے۔ حالانکہ کورا تو ان کے
ں میری امانت ہے مگر کوئی کسی امانت کی اس قدر پاس بانی
ں نہیں کرتا۔ ایسی نگہ داری اور ایثار پیشگی کے بعد انہیں
را کے لیے ہر طرح کے فیصلے کا حق پہنچتا ہے۔ اس رات وہ
تھ نہ ہوتے تو میرے سپاہیوں کے ہتھے چڑھ جانے اور
ں جانے کے بعد کورا کہاں ہوتی' وہ تو وہیں' دریائے ہگلی
ے گھاٹ پر ختم ہوجاتی۔ نواب سے میری کہانی بیان کرنے
ے معنی یہ کہاں ہوتے ہیں کہ انہوں نے نواب کو کسی مذموم
ر رکیک قدم اٹھانے پر مجبور کیا ہوگا۔ یہ تو نواب پر منحصر تھا
ہ وہ کس نفاست' بلاغت' سلیقہ وتدبیر سے کورا کے قلب
نگاہ سے ایک نقش اتارنے اور دوسرا جمانے کی کوشش
رتا۔ اور مولوی صاحب تو اس سے میرے بارے میں ایک
ظ بھی نہ کہتے اگر نواب خود ان سے میرا ذکر نہ چھیڑتا۔
نہوں نے تو نواب کے تجسس' نواب کے سوال کا ایک
عقول جواب دیا تھا۔ انہوں نے نواب کو اشارہ کیا ہوگا کہ
ب تک کورا کے رگ وپے میں بابر زماں' ایک ناہنجار' نابکار
ی آس رچی بسی ہے' وہ کچھ بھی نہیں کرسکتے۔ یہ جواز ایک
طرح کا انکار تھا۔ نواب نے بین السطور میں جھانکنے کی
کوشش نہیں کی اور اپنے طور پر تشریحیں' تعبیریں وضع
کرلیں تو یہ اس کی خطا ہے۔ جیل کا تصور بعض لوگوں کے
لیے بڑا ہیبت ناک ہوتا ہے۔ ابتدا میں مولوی صاحب نے بالا
ہی بالا میری خبرگیری ضرور کی ہوگی لیکن سات سال کے لیے
جیل بھیج دیے جانے کی خبر سن کے انہوں نے شاید ہمیشہ کے
لیے مجھے ترک کردیا۔ کون جانے ان کے پاس یہ گرہ کشائی
کرتا کہ جیل میں آدمی' مجرموں کی صحبت کے علاوہ کچھ اور
جتن بھی کرسکتا ہے۔ مولوی صاحب نے نواب سے کہا تھا کہ
بابر زماں' دہرے قتل کے مجرم' ایک سزا یافتہ پر کورا جیسی گل

اندام پری جمال لڑکی کو بھینٹ نہیں چڑھایا جاسکتا۔ اس کا مطلب یہ کہاں نکلتا ہے کہ اس شخص کو نیست و نابود ہی کردیا جائے۔ بابر زماں کے مٹ جانے سے کورا کا نقش مٹ جانے کا دعویٰ وہ کس طرح کرسکتے تھے۔ اتنے عرصے میں انہیں کورا کے ثبات کا اندازہ خوب ہوگیا ہوگا۔ انہیں تو میرے لیے اس کی امید اور فزوں کرتے رہنا چاہیے کہ تارِ نفس پر آنچ نہ آئے۔ انہیں احساس ہوگا کہ اس کے سامنے میرے بارے میں کوئی ایسی ویسی بات کرنے کے نتائج کیا ہوسکتے ہیں۔ ہر شخص کے ضبط کا ایک پیمانہ ہوتا ہے۔ نواب کے کامیاب ہوجانے پر بھی انہیں کورا کی آزمائش کرنے کی جرات نہ ہوتی۔ انہیں تو اس وقت کا انتظار ہوگا۔ جب کورا خود ہی اپنے خوابوں کی ناسپاسی سے مایوس ہونے لگے۔ زندگی ترغیب و تحریص سے عبارت ہے۔ رنگ کا جادو' روشنی کا جادو۔ زندگی طرح طرح کے جادو کرتی ہے اور بڑے بڑے گوشہ گیروں کو ناتواں کردیتی ہے۔ وہ دن چاہے کبھی نہ آئے مگر مولوی صاحب کو اسی دن کا انتظار ہوگا۔ نواب نے مجھے خط لکھ کے حیدر آباد طلب کرنے اور اپنے عزم کے بارے میں مولوی صاحب کو لازماً بے خبر رکھا ہوگا۔ امکان یہی ہے اس نے ساری خطاکاری خود تک محدود رکھی تھی۔ مولوی صاحب کی نظروں میں اس ہوش مند کو اپنی قدر و منزلت' اپنی عالی نسبی کا بھرم بہرصورت قائم رکھنا چاہیے تھا۔

ڈرائیور یہی کچھ کہہ رہا تھا۔ مجن میاں کے باغ میں پیش آنے والا ماجرا سن کے مولوی صاحب دم بہ خود رہ گئے تھے۔ ڈرائیور غلط نہیں کہہ رہا ہوگا۔ پھر مولوی صاحب کو نواب کی عیادت کے لیے ڈاکٹر ناصر مرزا کے ہاں جانے میں وقت بالکل ضائع نہیں کرنا چاہیے تھا۔ انہوں نے ڈرائیور سے معلوم کرلیا تھا کہ نواب کے مہمان' ہم دو اجنبی اس وقت کہاں ہیں؟ ادھر انہیں کسی دم میری آمد کا دھڑکا لگا ہوگا' ادھر باغ کے عبرت ساماں واقعے میں کسی طور ان کے ملوث ہوجانے کے دور دراز خدشے نے انہیں بے چین کردیا ہوگا۔ انہیں تو پھر بہت دور' ریاست کی حدود سے بہت دور چلا جانا چاہیے۔

جانے کتنی دیر مجھے گرد و پیش کی خبر ہی نہیں رہی۔ کہتے ہیں زندگی بھر آدمی دل اور دماغ کی آویزشوں کا نشانہ بنا رہتا ہے۔ دل کچھ کہتا ہے' دماغ کچھ۔ کاش آدمی کا دل ہی ہوا کرتا یا پھر دماغ۔ لوگ کہتے ہیں' دماغ جب ساتھ نہ دیتا ہو تو دل پر تکیہ کرنا چاہیے اور جب دل اضطراب آمادہ ہو تو دماغ کا کہا ماننا چاہیے لیکن جب دونوں ہی بے اختیار ہوں تو آدمی کیا کرے' کس سے سوال کرے اور جواب چاہے؟

جمرو نے مجھے کہنی ماری تو میں ہڑبڑا گیا۔ میں تو جیسے وہا موجود ہی نہ تھا۔ مجھ پر ایک ثانیے کی ندامت طاری ہوئی او میں نے پٹپٹاتی پلکوں سے دیکھا کہ لرزہ بر اندام ڈرائیو بٹھل کے سامنے سر جھکائے کھڑا ہے۔ بٹھل بھی کسی فک میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے سوچا' اب فکر کرنے کو کیا رہ گ ہے۔ یکایک بٹھل نے تیز و تند لہجے میں پوچھا "بڑا نواب کدھری ہے۔"

"کون' حضور نواب فہمید علی؟" ڈرائیور ہکلاتے ہو۔ بولا۔

"ہاں ہاں' وہی رے۔"

"سرکار ادھری ہیں اور جاگ رہے ہیں۔ کیا بولوا حضور' گھر میں تو ایک قیامت مچی ہے۔" ڈرائیور کی آوا بھرا گئی "امی حضور کی حالت تو بہت نازک ہے۔ چھوٹی سرکا بھی سکتے میں ہیں۔ شام سے لوگاں کی قطار بندھی ہے۔ طر طرح کی باتاں بولتے ہیں۔"

بٹھل نے کچھ نہیں کہا اور سر اٹھا کے جمرو کو سامنے طرف اشارہ کیا۔ موڑ سے گزر کے انہوں نے نواب ثرو کی گلی میں اس کے مکان کی جانب بڑھنا شروع کردیا شامیانہ تقریباً نصب کیا جاچکا تھا اور کل صبح نواب ثروت تدفین کے انتظامات میں مصروف لوگ کرسیاں سیدھ کررہے تھے۔ ہم نے جلد ہی درمیانی فاصلہ طے کرلیا ڈرائیور کے ساتھ ہم چاروں کے پیدل جتھے کو دیکھ کے لوگ حیران ہوئے لیکن کسی نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ نواب گھر جانے کی وجہ میری سمجھ سے باہر تھی۔ اب کیا نواب فہ علی کی باری تھی؟ اسے کھکھوڑنے' جھنجوڑنے کی باری تھ بٹھل کو علم میں کسی اضافے کی توقع ہوگی۔ میری منتش نظریں زدرا اور جمرو پر منڈلائیں مگر شاید انہیں کچھ جا بوجھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ بے خبری بھی صحت کے مفید ہوتی ہے۔ بہت سے آزار سے بچائے رکھتی ہے دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر بٹھل ٹھہر گیا اور اس زیر لبی سے ڈرائیور کو کوئی ہدایت کی۔ ڈرائیور پہلے تو ہچکچا کئی بار اس نے پہلو بدلے' پھر دروازے میں داخل ہوگیا۔

ہمیں دروازے کے قریب کھڑے ہوئے تین چار منٹ سے زیادہ نہیں ہوئے ہوں گے کہ ڈرائیور نمودار ہوا۔ ا نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اس کے عقب جامنی رنگ کی شال شانوں پر ڈالے نواب فہمید علی بہ عجلت باہر آگیا "آپ!" وہ حیرت آمیز شائستگی سے بولا "آپ با کیوں کھڑے ہیں' اندر آیئے' آیئے نا۔"

"نہیں صاحب!" بٹھل نے آہستگی سے کہا "اپنے کو زیادہ ٹائم نہیں لینا۔"

"ہمیں شبہ تھا کہ شاید آپ سے ملاقات نہ ہوسکے۔"

"ادھری ڈاکٹر صاحب کے پاس ہم دیری سے پہنچے۔" بٹھل نے تپیدہ لہجے میں کہا "آپ نکل چکے تھے۔"

"وہاں ٹھہرنے کو رہ بھی کیا گیا تھا" نواب کی آواز بکھرنے لگی۔

بٹھل نے گہری سانس لی اور توقف کے بعد بولا۔ "اپنے کو یہی ٹائم ملا' صبح ادھر آنا ہو کہ نہ ہو' سوچا کہ۔۔۔"

"مگر آپ اندر تو تشریف لایئے" نواب کی زبان اٹک رہی تھی۔ اس نے ہیجانی انداز میں ادھر ادھر دیکھا۔ اس کی ایک نظر قریب کھڑے ہوئے ہدایت علی کے لیے کاری ہوئی' وہ اپنی جگہ سے ہٹ کے دور چلا گیا "آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ گو یہ کوئی موقع تو نہیں ہے تاہم مناسب ہو تو کچھ دیر کے لیے اندر آنے کی زحمت کیجیے۔ خلوت بھی ممکن ہے" نواب کے اصرار میں عاجزی بھی تھی' کرب بھی شامل تھا۔

"بس صاحب! پھر آئیں گے کبھی ادھری۔ ریاست میں دوبارہ آنا ہوا تو ضرور۔۔۔" بٹھل نے بے ربطی سے کہا "اور کیا بول سکتے ہیں' لگتا تو ایسا نہیں ہے۔"

نواب کی پیشانی پر سلوٹوں کا جال پھیل گیا۔ اس کے نتھنے دھڑک رہے تھے "کیا ہوگیا یہ سب۔۔۔!" وہ فریاد کناں لہجے میں بولا "ایسا بھی کہیں ہوتا ہے؟"

"اس سے بھی اوپر ہوتا ہے" بٹھل نے زہرخند سے کہا "دوسرا پل پرایا ہوتا ہے صاحب! جھپکنے کا ٹائم بھی نہیں دیتا۔ سامنے کا سارا اوپر نیچے کردیتا ہے۔"

"کہتے ہیں' بس بہانے ہوتے ہیں' دن تو ایک ہی معین ہے' مقرر ہے۔ ہم سے لوگ کہتے ہیں' وہ اتنی ہی زندگی لے کر آیا تھا۔ آپ ہی بتائیں" نواب گرفتہ آواز میں بولا "یہ' یہ اس کے جانے کے دن تھے۔"

"جانے کو تو صاحب' ہر پل جانے کا ہوتا ہے۔ ٹل جائے تو اور بات ہے" بٹھل نے تنک کے کہا "تخم کے ساتھ موت کا پھیرا شروع ہوجاتا ہے۔ کبھی کسی مستانے سے سنا تھا صاحب! بولتا تھا' جب تک میں ہوں' موت نہیں ہے' جب سالی موت آئے گی تو میں نہیں ہوں گا۔ تھوڑی سی بات ہے۔ ایک چیز ایک بار ہی کو رہ سکتی ہے۔ زورا زوری تخم ٹھہرتے ہی شروع ہوجاتی ہے۔ اور بازی سدا بھاری پنجے کی ہوتی ہے۔ سب مٹی کا کھیل ہے۔ نواب صاحب! اپنے پلے تو یہی پڑتا ہے۔ مٹی کھلونے بناتی اور تھوڑی نوٹنکی کے بعد برابر کردیتی ہے۔"

نواب کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔ وہ سنتا رہا اور دل دوز لہجے میں بولا "آپ درست فرماتے ہیں لیکن ہم کہاں جائیں' کسے اپنا سینہ کھول کے دکھائیں۔ کس سے اپنا حال بیان کریں۔ خدا نے ہمیں کس آزمائش سے دوچار کیا ہے۔ ثروت کیسے چپکے سے چلے گئے۔ سبھی کو حیران کرگئے۔ ہم آپ کو کیا بتائیں' وہ ہمیں کتنے عزیز تھے۔ خالہ زاد تو کہنے کی بات ہے۔ ہم تو انہیں اپنا سگا ہی سمجھتے تھے۔ ہمیں ان پر بہت ناز تھا۔ ذہین' طباع' ہر لحاظ سے مکمل۔ لوگ تو ان کی مثال دیتے تھے۔ ہمارا بھائی کیسا بے بدل' بے مثل تھا۔ یہ ہم سے نہیں' غیروں سے پوچھیے۔" نواب فہمید کی آواز رندھنے لگی۔

"آدمی دوسروں ہی کے لیے مرتا ہے" بٹھل نے سرد لہجے میں کہا "اپنا تو اس کو پتا بھی نہیں ہوتا۔"

نواب اضطراری انداز میں سر جھٹکنے لگا "مگر یہ تو' یہ تو خودکشی ہے جناب! یہ تو سراسر اپنے آپ سے دشمنی تھی۔ ثروت ایسے تو نہیں تھے۔"

"ہاں صاحب! پر سارے وقت تو آدمی ایک جیسا نہیں ہوتا" بٹھل کے لہجے میں ترشی کی آمیزش تھی "کبھی سے کوئی بھول ہوجاتی ہے۔ کبھی چھوٹی بھول کا بھگتان بڑا ہوتا ہے۔"

"ہم نہیں سمجھتے' یہ چھوٹی سی بھول تھی۔ یہ تو بہت بڑی' ہم اسے کیا نام دیں' نادانی' پاگل پن ہی اسے کہا جاسکتا ہے۔ ثروت میاں سے ہمیں اس کوتاہی' کج روی اور ہمیں کہنا چاہیے' بدنیتی' سفاکی کی توقع ہرگز نہیں تھی۔"

"جانے دیں صاحب! بیتا ہوا' منہ کا اگلا ہوا ہوتا ہے" بٹھل نے نرمی سے کہا "ہم نے پورا جتن کیا تھا ان کو روکنے کا۔ پر کیا بولیں' اپنے بس میں اس سے زیادہ نہیں تھا۔"

"ہمیں معلوم ہے" نواب نے بہ شدت تکرار کی "ہم آپ سے عرض کریں' ڈاکٹر ناصر مرزا نے ثروت میاں کی طرف سے آپ کو جو کچھ بتایا ہوگا' ہم نے بھی اسے سن لیا تھا۔ ثروت میاں کی حالت اچانک خراب ہوگئی تھی۔ وہ بری طرح آپ کو یاد کررہے تھے۔ آپ کو بہت تلاش کروایا لیکن آپ کہیں نہ مل سکے۔ انہیں معلوم ہوگیا تھا کہ ان کے پاس وقت کم ہے' ان کی سانسیں آپ کے انتظار میں رکی ہوئی تھیں۔ مجبوراً انہوں نے پھر ڈاکٹر ناصر مرزا کو اپنا امین بنایا۔ ان کی خواہش تھی کہ کمرے میں کوئی اور موجود نہ رہے لیکن ایسے وقت ہم وہاں سے نہیں ہٹ سکتے تھے۔ ہم وہیں نزدیک ہی پھٹکتے رہے اور ہم جو تصور نہیں کرسکتے تھے' وہ ہم نے اپنے

کانوں سے سنا' اپنے عزیز بھائی کی زبانی۔ کوئی اور کہتا تو ہمیں یقین نہ آتا۔ بہ خدا ہم اس کی زبان کھینچ لیتے۔" نواب کی سرخ آنکھوں میں چنگاریاں سی لپکتی تھیں کہ آنسوؤں میں ڈوب گئیں۔

بٹھل نے شانے پر تھپکی دی تو اس کا چہرہ اور دھندلا گیا۔ اسے زاروزبوں دیکھ کے میری رگیں بھی کھنچنے لگی تھیں۔ "ہمیں آپ سے شرمندگی ہے" اس نے رومال سے چہرہ خشک کیا اور نسبتاً تھمی ہوئی آواز میں بولا "ہمیں معاف کردیجیے۔ ہمارے دل میں بہت سی بدگمانیوں نے گھر کیا تھا۔ خدا نے ہمیں گناہ سے بچالیا۔ اس روز آپ سے ملاقات کے بعد ہم پر عجب کشمکش کا وقت گزرا ہے۔ آپ نے اعلیٰ ظرفی کی تھی' ایک بھائی کی نظر میں دوسرے بھائی کی پردہ پوشی کی اعلیٰ ظرفی۔ کچھ اسی وقت سے ہم ثروت میاں کے متعلق کھٹک گئے تھے۔ دوسری جانب اس کے حال سے ہمارا دل کٹتا تھا اور آپ کے لیے کدورت پر اکساتا تھا۔ آپ نے کچھ واضح نہیں کیا تھا۔ سب کچھ ثروت میاں کے ٹھیک ہوجانے پر اٹھا رکھا تھا۔ سچ پوچھیے تو یہ سربستگی اور احتیاط کی تاکید ہمیں اور مضطرب کیے ہوئے تھی۔ ڈاکٹر ناصر کے گھر تفتیش احوال کے لیے دو مرتبہ پولیس کے کارندے آئے۔ ہمارے دل میں آیا کہ آپ کی طرف اشارہ کردیں' بعد میں جو ہوگا' دیکھا جائے گا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم سے کوئی لغزش نہیں ہوئی۔ آپ کے متعلق ہم نے انہیں مطمئن ہی کیا۔ ہم نہیں کہہ سکتے۔ آج اگر ڈاکٹر ناصر مرزا اور ثروت میاں کی گفتگو ہم نہ سن پاتے یا ڈاکٹر صاحب' اپنے دوست ثروت میاں کی ہدایت کے مطابق سب کچھ خود تک ہی محدود رکھتے تو ہم کیا فیصلہ کرتے؟ ثروت میاں کے سانحے کے بعد ہم کچھ بھی کرسکتے تھے" نواب فہید نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھے اور آسمان کی طرف نگاہیں اٹھا کے بولا "اس نے ہم پر بہت کرم کیا۔ ہم اپنے بھائی کی طرف سے معذرت چاہتے ہیں۔ ہمیں احساس ہے کہ آپ کے حوصلے' استقامت اور ایثار کے آگے اس معذرت کی کیا حیثیت ہے لیکن آپ ہی فرمائیں' ہم اور کیا کہیں' ہم اور کیا کرسکتے ہیں۔ آپ کے تحمل اور تدبر نے ہمارے خاندان کو رسوائی سے محفوظ رکھا ہے ورنہ اپنے ثروت میاں نے تو کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ حیرت ہے' ان جیسے چار آنکھیں رکھنے والے شخص سے دوسرا رخ کیوں اوجھل رہا۔ صورت دیگر پر تو ذرا سی سوجھ بوجھ رکھنے والوں کی نظر ہوتی ہے۔ انہوں نے دوسرے پہلو کی شرم ناکی' اذیت ناکی پر غور کیوں نہیں کیا؟ وہ ایسے اندھے کیوں ہوگئے تھے؟ ان جیسا نرم خو' شائستہ مزاج آدمی ایسے قبیح اور رکیک فعل پر کس طرح آمادہ ہوگیا؟ اپنی ضعیف ماں کا' جوان بہن کا اور ہمارا خیال انہیں بالکل نہیں آیا۔ ہم سوچتے ہیں تو یقین کیجیے' دماغ پھٹنے لگتا ہے۔ ہمارا رواں رواں لرز جاتا ہے۔ ایسی سنگ دلی' یہ بے حسی تو ان میں کبھی نہ تھی۔ آدمی کے پاس ایک ضمیر بھی ہوتا ہے۔ وہ کامیاب ہوجاتے اور یہ معرکہ سر بھی کرلیتے تو کیا ان کا ضمیر انہیں قرار سے رہنے دیتا" نواب مچلتی تڑپتی آواز میں بولا "ہم آپ سے بہت نادم ہیں۔ ہمیں یہ گزارش کرنے کا بھی یارا نہیں کہ آپ' آپ ہوسکے تو ہمارے خود سر بھائی کو۔۔۔"

"نہیں صاحب! ابھی کچھ اور مت بولنا" بٹھل نے نواب فہید کا ہاتھ تھام کر سینے سے لگالیا "آگے ابھی کچھ مت بولنا صاحب! اپنا حساب سامنے والوں سے رہتا ہے۔ جانے والوں کا اوپر والا ہی دیکھتا ہے۔"

"سچ ہے' کوئی شک نہیں" نواب فہید کے ہونٹ پھڑپھڑانے لگے "ہمیں خیال آتا ہے کہ آخر میں ثروت میاں نے ازخود ڈاکٹر ناصر مرزا کے سامنے جو اعتراف گناہ کیا ہے' وہ آپ پہلے ہی جان سکتے تھے۔ اس کا کچھ اندازہ تو آپ کو نواب مجن میاں کے باغ ہی میں ہوگیا ہوگا۔ ثروت میاں کے مغلوب ہوجانے' بے دست و پا ہوجانے کے بعد مزید عقدہ کشائی کے کتنے موقع آپ کو ملے تھے۔ نواب مجن میاں کے باغ سے ڈاکٹر ناصر مرزا کے گھر تک ثروت میاں مستقل آپ کی دسترس میں تھے۔ یہ کیسا حسن سلوک ہے۔ باغ میں اپنے ستم گر کو اس کی حالت پر چھوڑ کے آپ اپنی راہ لے سکتے تھے۔ اپنے مجرم کو ڈاکٹر ناصر مرزا کے ہاں پہنچانے میں آپ نے جو' آپ نے جس۔۔۔" نواب کی آواز حلق میں پھنس گئی۔ اس کے سینے سے آہ بلند ہوئی اور اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔

"آگے نا ہی بولو صاحب!" بٹھل نے ناگواری سے کہا۔

"ہاں' اس ذکر کا اعادہ آپ کے لیے تکلیف دہ ہونا چاہیے" نواب یاسیت سے بولا پھر جیسے کسی نے اسے کچھ یاد دلایا اور وہ بے تاب ہوگیا "ہم اپنی خودغرضی میں یہ معلوم کرنا تو بھول ہی گئے' یہ تو فرمائیں' مولوی شفیق صاحب کی طرف بھی جناب کا جانا ہوا؟"

بٹھل نے اقرار میں سر کو جنبش دی۔

"گئے تھے آپ وہاں؟" نواب نے گھبرائے ہوئے انداز میں پوچھا "تو' تو ملاقات ہوئی ان سے؟ خدارا' کم ازکم اسی جانب سے ہمیں اطمینان دلائیے۔"

"وہ ادھری اب نہیں ہیں۔"

"جی!" نواب نے تذبذب سے کہا "کیا فرمارہے ہیں آپ؟ کہیں آپ کسی غلط پتے پر تو نہیں پہنچے؟"

"وہ ادھری سے نکل گئے ہیں۔"

"نکل گئے! مگر کہاں؟" بٹھل کی خاموشی پر وہ جیسے خود سے ہم کلام ہوا۔ "ہمیں یہی تعجب تھا کہ ثروت میاں کے ایسے رفیق' دم ساز اپنے مربی کی عیادت کے لیے ڈاکٹر صاحب کے گھر کیوں نہیں آئے' اور ہم نے سمجھا' ہوسکتا ہے انہیں ثروت میاں کے متعلق کوئی اطلاع ہی نہ ہوسکی ہو۔ پھر ہمیں جستجو ہوئی کہ اطلاع نہیں مل پائی تھی تو اتنے دنوں تک ثروت میاں کی جانب سے خاموشی کی صورت میں مولوی صاحب نے خود کوئی رابطہ کیوں نہیں کیا' اور یہ سوچ کے ہم چپ ہوگئے کہ ممکن ہے ثروت میاں نے انہیں اپنے گھر آنے سے اجتناب برتنے کی تلقین کی ہو۔ ظاہر ہے' اپنی منشا کی تکمیل تک وہ یہ سارا معاملہ پوشیدہ رکھنا چاہتے ہوں گے لیکن' لیکن آخر یہ مولوی صاحب کہاں چلے گئے؟"

بٹھل نے ڈرائیور ہدایت علی کا نام نہیں لیا اور نواب کو بتایا کہ کل کسی نے جاکے مولوی صاحب کو نواب ثروت کی شکستہ حالت کی خبر کردی تھی۔

"کس نے' کس نے؟" نواب نے ٹھٹک کے پوچھا "مگر پھر تو انہیں لازماً ڈاکٹر صاحب کے گھر۔۔۔" وہ ٹھہر گیا اور سانس لے کے بولا "اچ چھا۔۔۔ اچ۔ چھا۔ ہماری سمجھ میں آرہا ہے' ازراہ کرم آپ بھی کچھ وضاحت فرمائیں۔"

"اور کچھ نہیں ہے صاحب!"

"اس کے معنی یہ ہوئے کہ مولوی صاحب کو ثروت میاں کے ارادے سے۔۔۔" اس کی نظریں بٹھل کے چہرے پر مرکوز ہوگئیں اور وہ جھجکتے ہوئے بولا "ثروت میاں کا حال بتانے والے نے کہیں آپ کا تذکرہ تو ان سے نہیں کردیا؟"

بٹھل نے کچھ نہیں کہا۔

"کچھ سفر کی سمت' جگہ وغیرہ کے بارے میں بھی سن گن ملی؟ وہ گھر تو ثروت میاں نے انہیں لے کے دیا تھا۔ ملازم بھی یقیناً ہوں گے وہاں۔ ہماری مراد ہے' ملازمین نے کچھ نہیں بتایا؟"

"کچھ بول کے ہی چلے ہوں گے ان سے؟" بٹھل نے تلخی سے کہا۔

"کیا کہا انہوں نے؟"

"اس کو آپ مان لوگے صاحب!"

نواب کی آنکھیں جلنے بجھنے لگیں "یعنی آپ کہنا چاہتے ہیں' انہوں نے ملازمین سے۔۔۔" اسے اپنے لفظوں کی بے وقعتی کا احساس ہوا اور وہ چپ ہوگیا' پھر تیزی سے بولا "ممکن ہے وہ شہر ہی میں ہوں۔"

"کیا بولتے ہو صاحب!" بٹھل نے چنچناتی آواز میں کہا۔

نواب گم صم ہوگیا۔

"اب اجازت دو صاحب! اندر آپ کے مہمان بھی بیٹھے ہیں" بٹھل نے سلام کے لیے ہاتھ اٹھایا۔

"ٹھہریے' براہ کرم کچھ دیر کے لیے ٹھہریے" نواب وحشت آمیز عاجزی سے بولا "آج ہی ہم نے ثروت میاں کی زبانی مولوی شفیق کا ذکر سنا تھا' اور ہم انہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ ہمارے اختیار میں ہوتا تو ہم آپ سے پہلے ان کے گھر پہنچنے کی کوشش کرتے لیکن ثروت میاں نے کوئی مہلت ہی نہ دی۔ ان کے سینے کا بوجھ ہی انہیں تھامے ہوئے' باندھے ہوئے تھا۔ یہ غبار چھٹتے ہی وہ بکھرنے لگے۔ ذرا بھی کسی کی پروا نہیں کی۔ ہم سے تو کچھ کہنے سننے کی انہیں کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔ ان کے منہ پھیر لینے کے بعد' آپ اندازہ کرسکتے ہیں' ہمارا کیا حال رہا ہوگا۔ کئی بار خیال آیا' ثروت میاں کی خبر کرنے کے لیے کسی کو مولوی صاحب کے پاس بھیجیں۔ پتا تو ان کا ڈاکٹر ناصر مرزا سے معلوم ہو ہی گیا تھا۔ ہم ارادہ کرتے رہ گئے۔ ادھر یہ گمان بھی غالب تھا کہ جیسے ہی ڈاکٹر صاحب سے آپ کی ملاقات ہوگی' آپ سیدھے مولوی صاحب کے گھر کا رخ کریں گے اور اس طرح انہیں اطلاع ہو ہی جائے گی۔ گویا' کیا یہ نتیجہ اخذ کیا جائے" نواب کا جسم اکڑ سا گیا "کہ مولوی صاحب نے ثروت میاں کو اس اہم کام' اس فریضے کی ادائی کے لیے آمادہ کیا تھا اور ناکامی کا علم ہوجانے کے بعد انہوں نے روپوش ہوجانے میں عافیت جانی؟"

"یہ تو وہی ٹھیک سے بول سکتے ہیں" بٹھل کے لہجے میں تندی و بے زاری نمایاں تھی۔

لمحے گزر گئے۔ سب جیسے ایک دوسرے کے وجود سے بے خبر ہوگئے تھے "ابھی' ابھی کچھ قیام رہے گا جناب کا؟" نواب کی چڑ مراتی' ہچکچاتی آواز نے یہ سکوت توڑا۔

"اب کیا ہے صاحب!"

"ہاں' اب کیا" نواب نے حسرت سے کہا "اب کیا رہ گیا ہے' ہم تو سمجھ رہے تھے' کہیں ہم سے ملے بغیر نہ رخصت ہوجائیں۔ آپ تشریف نہ لاتے تو ہمیں بہت خلش رہتی۔"

"اپنے کو بھی ہوتی' ایسا کیسے صاحب' اپنے کو ضرور آنا تھا۔"

"خدا نے آپ کو کس کس طرح نوازا ہے۔ خسروی پھر

اور کیا ہے" نواب نے بے ساختہ کہا "ہم آپ کے بہت ممنون ہیں۔ بڑی نوازش ہے کہ آپ نے یہاں آنے کی زحمت کی۔ خصوصاً اس وقت تو۔"

"آپ سے بولاتا' یہی ٹائم ملا اپنے کو' اور ٹھیک بھی یہی تھا شاید۔"

"جی' جی بے شک' ابھی تو کچھ نہیں' صبح یہاں تجہیز و تکفین کے وقت جانے کتنا ہجوم ہو۔ نہ ہم آپ سے کوئی بات کرسکتے تھے' نہ غالباً آپ کے لیے مناسب تھا۔ کسی کو ذرا سی بھنک مل جاتی کہ آپ دونوں حضرات ہی ثروت میاں کے ہم راہ تھے' آپ ہی عینی شاہد ہیں تو آپ سمجھ سکتے ہیں' بلکہ آپ اجازت دیں تو ہم کچھ عرض کریں؟"

"معلوم ہے صاحب! آپ کیا بولیں گے' ہم پہلی گاڑی سے نکل جائیں گے۔"

نواب پر حیرت طاری ہوئی "ہم' ہم یہی گزارش کرنا چاہتے تھے۔ ابھی رات نو بجے کے قریب دو پولیس افسر پوری نفری سمیت یہاں وارد ہوئے تھے' اور باتوں کے علاوہ وہ آپ کے بارے میں بھی پوچھتے تھے۔ ہم نے جہاں تک ہوسکا ان کی توجہ ہٹانے کی کوشش کی۔ آپ کے لیے اپنے سپاس کا اظہار ہی کیا لیکن ثروت میاں کی زندگی تک بات مختلف تھی۔ یوں کہئے کہ ہم نے انہیں روکے رکھا تھا۔ اب ہمارے بس میں کچھ نہیں ہے۔ پولیس کی زبانی علم ہوا کہ دربار تک خبر پہنچ گئی ہے اور سارا عملہ حرکت میں آگیا ہے۔ پولیس کا ہمیں کوئی تجربہ نہیں ہے۔ سنتے ہیں' انہیں بحث و تکرار' بال کی کھال نکالنے کا شوق ہوتا ہے۔ کچھ بھی ان کے دماغ میں سماسکتا ہے اور ہم سچ کہیں' ہمارے لیے اسی میں بہتری ہے کہ معاملہ حد سے تجاوز نہ کرسکے۔ ثروت میاں جو تاثر دینا چاہتے تھے' وہی قائم رہے۔ ورنہ طرح طرح کی داستانیں عام ہوسکتی ہیں "

نواب کے چہرے پر دھواں سا چھایا ہوا تھا' کہنے لگا "ہماری خواہش تھی کہ جناب غریب خانے پر قیام فرما ہوں' کچھ ہمیں بھی جناب کی میزبانی کا شرف حاصل ہو لیکن اس موقع پر ہم کیا کہیں' کیا نہ کہیں۔ ہمیں تو آنے والے دنوں کی فکر کھائے جاتی ہے۔ کس کس کو سنبھال پائیں گے۔ اس زرنگار محلے کی ویرانی ہم سے کس طرح دور ہوسکے گی۔ کیا ہوگیا یہ سب۔۔ کیوں' آخر کیوں' ہم نے تو خدا بہتر جانتا ہے' کبھی کسی کا برا نہیں چاہا ہے۔ یہ کس بات کی سزا ملی ہے ہمیں۔ ثروت میاں تو سبھی کو اجاڑ گئے۔ کیا تماشا ہے یہ۔۔"

نواب فہمید آہیں بھرنے لگا۔ اس کی آواز کپکپا رہی تھی اور گریے جیسی کیفیت ہوگئی تھی۔

"نہیں نواب صاحب' جدھری دیکھو' ایسا ہی ہوتا ہے۔ آگے پیچھے' کوئی نیا نہیں ہے آپ کے ساتھ"۔ بٹھل سے کچھ کہا نہ جاسکا۔ اس نے نواب کے دونوں بازو پکڑ لیے۔

نواب بے تحاشا اس کے سینے سے لپٹ گیا اور جانے کیسا طوفان چھپا رکھا تھا اس نے' وہ بچوں کی طرح سسکنے' ہڑکنے لگا۔ بٹھل نے اسے بازوؤں میں بھینچ لیا۔

جمرو اور زورا نے میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھیں بھی بھری ہوئی تھیں۔ میرا دل تو پہلے ہی امڈ رہا تھا اور وہاں سے بھاگ جانے کو کرتا تھا۔ ہم تینوں سر جھکائے کھڑے رہے۔

نواب کا یہ حال دیکھ کے ڈرائیور ہدایت علی بھی لپکتا ہوا قریب آگیا لیکن ایک فاصلے پر آکے ٹھٹک گیا۔

ایک عرصہ دل ریزی و جاں سوزی کے بعد بٹھل نے اپنے بازو وا کیے تو نواب کو کچھ ہوش آیا۔ اس کی سانسیں اکھڑی ہوئی تھیں۔ بٹھل اس کی کمر پر ہاتھ رکھ کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ دروازے میں داخل نہیں ہوا اور نواب کو وہاں چھوڑ کر پلٹ پڑا۔ نواب ہماری نظروں سے اوجھل ہوگیا تھا کہ دوسرے لمحے پھر دروازے پر نمودار ہوا "جب بھی حیدر آباد آنا ہو تو ہمیں عزت ضرور دیجئے گا۔" اس نے ٹوٹی پھوٹی آواز میں کہا۔

"ضرور صاحب۔" بٹھل نے سادگی سے کہا "کبھی ادھری آنا ہوا تو ضرور آئیں گے۔"

"اب کیا آنا ہوگا جناب کا۔" نواب کا لہجہ خود ہی یقین سے عاری تھا۔

"دیکھو صاحب! کیا بول سکتے ہیں۔"

"اس طرف سے یک سوئی ہوجانے پر ہم خود حاضر ہوں گے جناب کی خدمت میں۔ بمبئی ہمارے لیے ویسے بھی اجنبی نہیں ہے۔ ہوسکے تو دولت کدے کا پتا عنایت کردیجئے۔"

"اپنا کیا ٹھور ٹھکانا صاحب' ادھری ماہم کے علاقے میں پیرو دادا کے پاڑے پر کسی سے نام لو تو بول دے گا۔" بٹھل نے بہ عجلت اسے سلام کیا اور پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

نواب ثروت کے گھر سے ہم ابھی دور نہیں ہوئے تھے کہ کسی کے بھاگنے کی آہٹوں پر ہمیں ٹھہر جانا پڑا۔ ہدایت علی ڈرائیور دوڑتا ہوا آرہا تھا۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا "سرکار فرماتے ہیں' جناب موٹر میں واپس جائیں۔"

"نہیں رے۔" بٹھل نے سر جھٹک کے بولا "سواری ہے اپنے پاس۔"

ہدایت علی نے بٹھل کا انکار تکلف پر محمول کیا۔ بٹھل

ے مزید اصرار کا موقع نہیں دیا اور ساتھ لیے ہوئے آگے
ر قدم اور بڑھ آیا۔ جلد ہی گلی کا موڑ آگیا۔

"اچھا ہوا تو خود ہی ادھری آگیا۔" بٹھل نے بڑبڑاتے
ئے کہا اور جیب ٹٹول کر معلوم نہیں کتنے نوٹ نکال کر
ائیور کے ہاتھ میں تھمادیے۔

ہدایت علی اس طرح اچھل پڑا جیسے بچھو نے ڈنک ماردیا
۔ "نہیں سرکار' نہیں سرکار۔" ہدایت علی نے تمام تر
جزی سے انکار کیا لیکن بٹھل کی گرجتی آواز پر اسے چپ
جانا پڑا۔ اس کے جسم پر رعشہ سا طاری تھا۔ بٹھل نے
پس ہوجانے کی ہدایت کی تو جیسے ہدایت علی نے سنا ہی
یں۔ بٹھل کے اشارے پر ہم آگے چلے آئے۔ ہدایت علی
ت بنا ہمیں وہاں سے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

کوچوان نے سچ کہا تھا کہ وہ صبح تک انتظار کرتا رہے گا۔
ی سڑک پر گھوڑا گاڑی موجود تھی اور کوچوان جاگ رہا
ا۔ جس گلی سے ہم باہر نکلے تھے' اس کی نظریں اسی طرف
گی ہوئی تھیں۔

سارا شہر سویا ہوا تھا۔ دور دور تک سڑکیں سنسان پڑی
تھیں۔ کتوں کا شور رات کا سناٹا اور فزوں کردیتا ہے۔ نام پلی
سٹیشن کے آمنے سامنے چائے اور پان کے کئی دکانیں ابھی
تک کھلی تھیں۔ عابد شاپ روڈ تک پہنچتے پہنچتے بارش ہونے
لگی مگر اتنی تیز نہیں تھی جتنے بادل گڑگڑا رہے تھے۔ گھوڑا
اور کوچوان دونوں شرابور ہوگئے۔ گاڑی کی رفتار میں بھی کمی
آگئی تھی۔ بٹھل نے ہوٹل سے نزدیک و دور کے بجائے
ہوٹل کے عین سامنے گھوڑا گاڑی رکوائی۔ اب شاید کسی
احتیاط کی حاجت نہیں رہی تھی۔ بہرحال اس طرح ہم مزید
بھیگنے سے بھی محفوظ رہے۔

کوچوان کو صبح سویرے حیدر آباد کے مختلف اسٹیشنوں سے جانے والی گاڑیوں کے اوقات ازبر تھے۔ بٹھل کے استفسار پر اس نے اپنا آموختہ فر فر سنادیا۔ سامنے ہوٹل کا دربان دروازہ کھولنے کے لیے مستعد کھڑا تھا۔ ہم چاروں اندر داخل ہوگئے۔ استقبالی کمرا پوری طرح روشن تھا' فانوس بھی جل رہا تھا لیکن ساری کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ دربان کی کھنکار سے کاؤنٹر پر اونگھتا ہوا شخص چونک پڑا۔ اسی دم کہیں سے' کسی کھوہ میں چھپا ہوا ایک اور ایک آدمی بھی کاؤنٹر پر آگیا۔ دونوں نے یک زبان ہوکے مودبانہ انداز سے انگریزی میں شب بہ خیر کہا تھا کہ ان کی نظر گھڑی پر گئی۔ اپنی دانست میں اس کی کوتاہی پر انہوں نے معذرت چاہی اور مسکراتے ہوئے فوراً ترمیم کی۔ یہ بدحواسی بے جواز تھی لیکن ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے مسافروں کے لیے سرگرمی اور تپاک کا مظہر تھی۔ ان آداب کی انہیں باقاعدہ مشق کرائی جاتی ہوگی۔

"اپنی پرچی کاٹو۔" بٹھل نے کسی قدر بلند آواز سے کہا اور کاؤنٹر کے سامنے تھم سے لگی ہوئی آرام کرسی پر پھیل گیا۔

دونوں آدمیوں کو سمجھنے میں دیر لگی کہ پرچی سے مراد حساب کتاب ہے۔ جمرو اور زورا کو بٹھل نے کوئی اشارہ نہیں کیا ہوگا کہ وہاں ٹھہرنے کے بجائے وہ اوپری منزل جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔ میں نے بھی اسی طرف کا رخ کیا لیکن بٹھل نے روک دیا اور مجھے وہیں بٹھل کے قریب کی کرسی پر بیٹھ جانا پڑا۔ کرسی پر کمر سیدھی کرتے ہی سارا جسم بکھرنے سا لگا۔ بٹھل کا ارادہ صاف ظاہر تھا۔ ابھی اور نہ جانے کتنی دور اور کب تک اسی طرح وقت گزارنا تھا۔ بٹھل نے آنکھیں موندلی تھیں۔ میں نے کوشش کی تو جی اور گھبرانے لگا۔ مجھ سے تو اب اٹھا بھی نہیں جارہا تھا اور اٹھ کے جاتا بھی کہاں؟ باہر بارش ہورہی تھی۔ اوپر کمرے میں جمرو اور زورا سامان سمیٹ رہے ہوں گے۔ سامان ہی کتنا تھا۔ بستر کے گدوں میں چھپے ہوئے ہمیانے نکالنے میں انہیں کچھ دیر لگنی چاہیے تھی۔ ابھی کاؤنٹر والوں نے بل تیار نہیں کیا تھا کہ وہ دونوں نیچے آگئے۔ ان کے پیچھے سامان اٹھائے ہوئے ایک خدمت گار بھی تھا۔ جمرو اور زورا اس کے ساتھ باہر چلے گئے۔

طشتری میں روپے رکھ کے بٹھل اٹھا ہی چاہتا تھا کہ باہر سے کئی موٹروں کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ دربان کے دروازہ کھولنے پر شیروانی میں ملبوس ایک پختہ کار نوجوان تیزی سے اندر داخل ہوا۔ اس کے عقب میں دو نسبتاً ادھیڑ آدمی اور بھی تھے۔ دونوں صحت مند اور چاق و چوبند تھے۔ طشتری ہاتھ میں لیے بٹھل کے پاس کھڑا کاؤنٹر کا آدمی روپے گننا اور شکریہ ادا کرنا بھی بھول گیا اور سپاہیوں کی طرح سیدھا ہوگیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا کہ بھاری جسم کا ایک پستہ قد فرنگی مسکراتا ہوا اندر آیا۔ اس کا چہرہ انگارا ہورہا تھا۔ آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ یہ عہدہ و نصب سے زیادہ کسی اور چیز کا نشہ معلوم ہوتا تھا۔ لمحے بھر بعد شیروانی کی شکنیں درست کرتا ہوا جو شخص دروازے سے برآمد ہوا' اسے دیکھ کر میرے دیدے پھٹے رہ گئے۔ میں نے متوحش نظروں سے بٹھل کو دیکھا۔ وہ شاید مجھ سے پہلے مہاراجا دھرم دیر کو پہچان چکا تھا۔ وہی دھرم دیر جو نواب حشمت کے پاس ابا جان کا نادر ہیرا دیکھ کر بے قرار ہوگیا تھا۔ اسے ہیروں سے خاص واقفیت تھی۔ ابا جان نے

کوئی بہت نادر ہیرا نواب حشمت کو پیش کیا تھا۔ ابا جان کو اس کی قدر و قیمت کا اتنا احساس بھی نہیں ہوگا لیکن راجا دھرم ویر ہیروں کے سلسلے میں وسیع معلومات رکھتا تھا۔ وہ ان کی تاریخ سے بھی واقف تھا۔ ہیروں کی ٹوہ میں وہ ابا جان کی نو خرید حویلی میں آکے طرح طرح کی منتیں کرتا رہا تھا۔ ہماری خاموشی پر وہ بہت مایوس واپس ہوا تھا۔ مایوسی کا تو اس نے اظہار کیا تھا' ہماری تاویلوں سے وہ قطعاً مطمئن نہیں تھا۔ کوئی بعید نہیں کہ حویلی میں جس رات مسلح آدمیوں نے ہمیں نرغے میں لے لیا تھا' وہ اسی کے فرستادہ ہوں۔ وہ پتھروں کا ایسا ہی دیوانہ معلوم ہوتا تھا۔

بٹھل کرسی سے نہیں اٹھا۔ میں بھی منجمد بیٹھا رہا۔ فرنگی اور دھرم ویر زور زور سے باتیں کرتے اور قہقہے لگاتے ہوئے استقبالی کمرے میں آئے تھے۔ وہ انگریزی میں باتیں کررہے تھے اور اندازہ ہوتا تھا کہ رقص و سرور کی کسی محفل سے اٹھ کے آئے ہیں۔ دھرم ویر ہمارے سامنے سے گزرتا ہوا' اپنی دھن میں مست کاؤنٹر سے راہ داری کی طرف بڑھ گیا۔ چہرے سے بھی وہ کچھ دھوندو لگ رہا تھا۔ شراب پی کے آدمی کا چہرہ ایسے ہی سوج جاتا ہے۔ ہم سے چند قدم آگے چلے جانے پر اسے خیال آیا اور معًا اس نے پلٹ کے دیکھا۔ وہ سٹ پٹا گیا تھا لیکن ایک تو کچھ آگے چلے جانے کی وجہ سے ہم پر اس کی نگاہ چھچلتی ہوئی ہی پڑسکتی تھی' دوسرے اسے اپنے معزز و محترم مہمان کا ادب ملحوظ ہوگا۔ وہ گورے کے ساتھ ہی بڑھتا رہا۔ جیسے ہی وہ کچھ دور ہوئے' بٹھل کرسی سے اٹھ گیا اور سیدھے دروازے کا رخ کیا۔ موٹروں کی وجہ سے گھوڑا گاڑی کو اپنی جگہ سے ہٹ جانا پڑا تھا۔ ہم لپکتے قدموں سے بارش میں بھیگتے ہوئے گھوڑا گاڑی میں سوار ہوگئے۔ بظاہر دھرم ویر کی جلد واپسی کا امکان نہیں تھا۔ گورے سے عاجلانہ انداز میں رخصت نہیں لی جاسکتی تھی۔ کچھ گورے نے بھی ازراہ وضع روکنے کی کوشش کی ہوگی لیکن دھرم ویر نے مجھے اور بٹھل کو اچھی طرح پہچان لیا ہوگا۔ مہمان گورے کے پاس اس کا جی پھر بالکل نہیں لگنا چاہیے۔ وہ رسیاں تڑا رہا ہوگا۔ جس طرف کوچوان گھوڑا گاڑی ہنکانا چاہتا تھا' بٹھل نے اس کے مخالف رخ چلنے کا حکم دیا۔ خاصی دور جا کے ہم بائیں ہاتھ کی ایک سڑک سے مڑ گئے۔ کاچی گوڑ اسٹیشن پہنچتے پہنچتے پانچ بج چکے تھے۔ کوچوان نے گاڑی کا وقت بھی یہی بتایا تھا۔ راجا دھرم ویر نے اپنے مہمان سے جلد از جلد رخصت ہو کے تعاقب بھی کیا ہوگا تو اسے ہم سے پہلے کاچی گوڑا اسٹیشن پہنچ جانا چاہیے تھا۔ وہاں کوئی موٹر نہیں تھی۔ ممکن ہے تیز بارش نے اسے باز رکھا ہو یا ہمارے راستہ بدلنے کی تدبیر کارگر ہوئی ہو۔ گاڑی ابھی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ گھوڑا گاڑی چھوڑ کر کوچوان بھی ہمارے ساتھ پلیٹ فارم پر آگیا۔ اس نے قلی کو آواز دی۔ ادھر سیٹی بجی' ادھر گاڑی نے رینگنا شروع کردیا۔ بھاگتے بھاگتے ہم اول درجے کے پہلے ڈبے تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ ڈبے کے دروازے پر پتلون اور قمیص میں ایک سن رسیدہ' اوسط قد کا شخص راستہ روکے کھڑا تھا۔ "یہ ریزرو ڈبا ہے۔" اس نے انگریزی میں کہا۔ قلی نے اس کی بات سنی ان سنی کرکے سامان اندر دھکیلا تو وہ ناراض ہونے لگا "یہ فرسٹ کلاس کا ڈبا ہے۔ اس بار اس نے ہندوستانی میں کہا۔"

"اپنے کو پتا ہے۔" زورا چڑ کر بولا۔

"زیادہ سے زیادہ رات کو یہاں دو مسافر سفر کرسکتے ہیں۔"

"اگلے اسٹیشن پر اتر جائیں گے صاحب!" یہ کہتے ہوئے بٹھل اوپر چڑھ گیا۔ وہ شخص دروازے سے نہیں ہٹا تھا کہ بٹھل نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کے اسے کچھ پیچھے کیا۔ "آپ کو تھوڑی تکلیف ہوگی۔ دوسرا ڈبا پکڑ لیتے' پر ادھری سالی گاڑی چل پڑی۔"

"گاڑی کا وقت ہوتا ہے۔" معمر آدمی نخوت سے بولا۔

"بارش سے الٹا ہوگیا صاحب! آپ دیکھ رہے ہو' آسمان آپے میں نہیں ہے۔" بٹھل نے دھیمی آواز میں کہا "آدھ گھنٹے میں کوئی اسٹیشن آجائے گا۔"

"میں زنجیر کھینچتا ہوں۔ تم لوگ کو پھر جگہ مل جائے گی۔"

"ابھی آپ سے کیا بولا بابا' بولا کہ دوسرا اسٹیشن پر اتر جانے کا ہے۔" زورا سر پر ہاتھ رکھ کے بولا۔

وہ کوئی سخت گیر' کٹ حجت قسم کا شخص تھا۔ نواب تو نہیں معلوم ہوتا تھا' افسر ضرور ہوسکتا تھا۔ اس کی تیوریاں اور چڑھ گئیں۔ "ٹرین رک سکتی ہے۔ اتر کے تم لوگ دوسرا ڈبا تلاش کرو۔"

اس کے لہجے میں تحکم بھی تھا' تکبر بھی۔ اس نے زنجیر کھینچنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا کہ جمرو نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ٹھہر کے صاحب! ایسا کیسے' آپ ہندوستانی نہیں سمجھتے کیا؟"

"جمرو جیسے کوئی اچھوت ہو' بازو پکڑنے پر اس آدمی کو آگ سی لگ گئی۔ فرش پر اس نے کئی بار جوتے پٹخے اور جمرو سے اپنا بازو چھڑا کے جو منہ میں آیا' بکنے لگا۔

"اپنے کو بھی بول چال آتی ہے۔" جمرو نے ترخ کر کہا "اتنی گرمی آپ کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔"

"اوہ نان سینس' یہ بہت زیادہ ہے۔" وہ بھنچی ہوئی آواز میں بولا "تم لوگ نہیں جانتے' کس سے بات کررہے ہو۔"

"آپ لاٹ صاحب ہیں' ایدر کا مائی باپ!" زورا نے ہاتھ جوڑ کر تلخی سے کہا "بس ابھی آرام سے رہو اور تھوڑا انسان کے مافک بات کرو۔"

"دیکھو' دیکھو زیادہ بات بالکل نہیں۔" اس شخص کی آواز بگڑنے لگی۔ دائیں ہاتھ کی انگلی اٹھا کر وہ تنبیہی اور تہدیدی انداز میں بولا "تم قانون کی خلاف ورزی کررہے ہو۔ یہ ڈبا ایک سرکاری افسر کے لیے مخصوص ہے' ایک پولیس افسر کے لیے' جو دلی شہر کا ڈی آئی جی ہے اور یہاں نظام سرکار کی درخواست پر پولیس کے محکمے کی درستی کے لیے آیا ہے اور وہ سرکاری افسر ہم ہیں۔ نام ٹھاکر بھیم سنگھ ہے۔ سنا تم نے اب یہاں سے فوراً نکل جاؤ۔ کوئی اور بات نہیں۔"

"کیسا بولتا ہے ابھی آپ۔" زورا پر اس تقریر کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ ہاتھ نچا کے بولا "ابھی ایدر سے چھلانگ لگا دے کیا! اور صاحب' ابھی پولیس کا تڑی ایک دم مت دیو' اپن بھی فرسٹ کلاس کا پسنجر ہے۔"

بارش تیز ہوجانے سے گاڑی کی رفتار سست ہوگئی تھی۔ ٹھاکر بھیم سنگھ بیماری کی حد تک ضدی شخص معلوم ہوتا تھا۔ ہمارا حال وہ دیکھ رہا تھا۔ اکھڑی ہوئی سانسوں' بھیگے ہوئے کپڑوں کے ساتھ ہم ڈبے میں داخل ہوئے تھے۔ بٹھل نشست پر اجنبی کی طرح بیٹھا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اسے زورا ہی کو کچھ تھمے رہنے کی تاکید کرنی چاہیے تھی۔ بات اور بڑھ سکتی تھی۔ ٹھاکر کے ساتھ پولیس کے دیگر آدمی بھی لازماً دوسرے ڈبوں میں ہوں گے۔ بہتر یہی تھا کہ اگلے اسٹیشن تک اسے کسی طرح قابو میں رکھا جائے ورنہ تو وہ آمادہ فساد تھا۔ منصب کا اسے کچھ زیادہ ہی نشہ معلوم ہوتا تھا۔ زورا کی تیز کلامی نے تیل چھڑکنے کا کام کیا۔ ٹھاکر کا منہ پھول گیا۔ وہ معنی خیز لہجے میں بولا "تم لوگ مجھے دوسرے قسم کے آدمی لگتے ہو' تم جیسوں سے نمٹنا ہم کو اچھی طرح آتا ہے۔"

"اپنی بھی عمر گزر گئی ہے۔" جمرو نے درشتی سے کہا "کیا کرلوگے آپ! اسٹیشن پر سولی چڑھا دینا۔"

"اس سے پہلے ہی انتظام کرتے ہیں۔ اسٹیشن تو دیر میں آئے گا۔"

"دیکھو صاحب' ابھی زیادہ تو ٹکائیں مت پڑو۔" جمرو نے اسے سمجھانے اور یقین دلانے کی کوشش کی کہ ہمارا ارادہ ڈبے پر قبضہ کرنے اور گھر لے جانے کا نہیں ہے۔"

"کیا بولا ہے تم سے۔" ٹھاکر بھیم سنگھ کی آواز میں نفرت بھری ہوئی تھی۔ "زیادہ بات بالکل نہیں۔ یہاں سے نکلنے کا کرو' ابھی اسی وقت!" ایک قدم آگے آکے اس نے زنجیر کھینچنے کے لیے جھٹ ہاتھ بڑھایا۔ جمرو اسے نگاہ میں رکھے ہوئے تھا۔ زنجیر کھنچ جانے کے بعد کچھ بھی ممکن تھا۔ اس بارش میں اترنا اور دوسرا ڈبا تلاش کرنا آسان نہیں تھا۔ پہلے تو گارڈ اور ٹھاکر بھیم سنگھ کے سپاہیوں سے مڈبھیڑ لازم تھی۔ ہمارے پاس ٹکٹ بھی نہیں تھے۔ ٹھاکر کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ صرف یہی سلوک نہیں کرے گا کہ ہمیں ڈبے سے اتروا دے گا۔ ماتحتوں کو سامنے دیکھ کر ٹھاکر اور بھی بپھر ہوسکتا تھا مگر جمرو کے پاس بھی کیا چارہ تھا یہی کہ ٹھاکر کے بازو پر پنجہ ڈال کے اسے اس سنگ دلی سے روکے رکھے۔ جمرو نے یہی کیا۔ میں بھی یہی کرتا بلکہ میرے جی میں آتا تھا کہ اٹھا کر اسے باہر پھینک دوں پھر جو ہوگا' دیکھا جائے گا۔ جمرو کی دخل اندازی سے ٹھاکر کے جسم میں ہیجان برپا ہوا' وہ بری طرح گرجنے برسنے لگا۔ کسی کو بھی یہ توقع ہرگز نہ ہوگی کہ جانے کہاں سے چشم زدن میں وہ تمنچا نکال لے گا۔ "دور کھڑے ہوجاؤ۔" اس نے کچھ پیچھے ہٹ کے دہاڑتے ہوئے کہا "اپنی جگہ سے ایک دم بھی حرکت کی تو جان سے جاؤ گے۔"

برسوں سے بٹھل اور میں مسلسل سفر کررہے تھے۔ کام ہی یہ رہ گیا تھا۔ سفر میں طرح طرح کے آدمیوں سے واسطہ پڑتا ہے مگر ایسا کبھی نہیں ہوا۔ ذرا سی بات پر کوئی اتنا پاگل بھی ہوسکتا ہے۔ آدمی شاید سب سے بڑا جانور ہے۔ کاش ہم ٹرین کے ابتدائی حصے ہی میں' تھرڈ کلاس' انٹر یا سکینڈ کلاس کے کسی ڈبے میں جگہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ اس وقت تو ایسا ہوش بھی نہیں تھا۔ ٹرین چھوٹ جانے کی بدحواسی الگ تھی۔ کچھ قلی اور کوچوان نے بھی تیزی دکھائی۔ بار بار یہی کچھ ہوتا رہتا تھا۔ معلوم نہیں' ہم نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ یہ کیسی سزا تھی جس کا کوئی خاتمہ نہیں تھا۔ ہزار احتیاط کرو' لاکھ پھونک پھونک کر قدم رکھو' کوئی پتھر' کوئی مرکھنا' بیل اچانک سامنے آجاتا تھا۔ اس کمینے راجا دھرم ویر کو بھی اسی وقت ہوٹل میں آنا رہ گیا تھا۔ اتنے دن کسی کی نظر نہیں پڑی۔ ہوٹل سے ہمارے نکلنے اور راجا دھرم ویر کی آمد منٹوں کی بات تھی۔ ذرا کچھ آگے پیچھے ہوجاتا تو ہم وقت سے پہلے ہی اسٹیشن پہنچ جاتے۔

جمرو وہیں کھڑا رہا بلکہ وہ زنجیر کے اور قریب ہوگیا۔ مجھے بٹھل پر حیرت ہو رہی تھی۔ وہ اپنی نشست سے نہیں اٹھا۔ اس نے وہیں سے صدا لگائی "ہاں صاحب! چھٹی کرو حرام کے جنے کی۔ اپنے کو بھی گھوڑے پہ پڑا ملا تھا۔ اوپر نیچے کوئی بھی نہیں ہے اس کے بہت دن ستالیا چھنال کا۔"

ٹھاکر کی آتش بار نظریں بٹھل پر جم گئیں۔

"ماں قسم، ایک دم فالتو ہے سالا چڑی مار، خلاصی کرو ہاں صاحب۔" زورا جلی ہوئی آواز میں بے ترتیبی سے بولا۔ ابھی ایک کا کیا صاحب، سبھی کا چھٹی کرو نئیں، دو گولی پھر بھی بچ جائے گا، ابھی سات والا ہے تو اکھا تین۔" زورا نے ٹھاکر کے ہاتھ میں دبے ہوئے تمنچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "سنا ہے، وردی والا کو سات خون معاف ہوتا ہے، ایسا؟"

پولیس افسر بھیم سنگھ کو کش مکش سے دوچار ہوجانا چاہیے تھا۔ اس کی پیشانی کی شکنوں میں اضافہ ہوگیا۔ چہرہ بھی کھنچ گیا۔ اس نے تمنچے پر گرفت اور مضبوط کرلی ہے۔

"اپنے کو تو کھلونا لگے ہے استاد!" یہ صاف جھوٹ تھا۔ جمرو کو اس ہرزہ سرائی کی ضرورت نہیں تھی۔

بٹھل کے بجائے زورا نے استہزائی انداز میں کہا "نئیں بھڑو۔ ابھی پولیس افسر لوگ ہے۔"

ٹھاکر بھیم سنگھ نے سامنے کی دیوار پر بے دریغ گولی چلادی۔ بارش اور ٹرین کے شور میں گولی کی گونج ڈبے تک محدود رہی ہوگی۔

"زنجیر کھینچ۔" ٹھاکر قہرزدہ آواز میں بولا۔ اس بار اس نے جمرو ہی کو حکم دیا "ہم کہتے ہیں، زنجیر کھینچ ورنہ جان سے جائے گا۔"

"جان تو ادھار پر ہے صاحب! اپنا ہی بھلا ہوگا۔ مکتی مل جائے گی۔ چار دن ادھر ادھر کی بات ہے۔ پہلے جائیں گے تو دنیا اوندھیا نہیں جائے گی۔" جمرو کے لہجے میں ذرا بھی تردد نہیں تھا۔

زورا نے فوراً لقمہ دیا "اور جدر بھی آپ جیسا لوگ ہوئیں گا، ادر جی بھی کس حرامی کا لگے گا۔"

"لگتا ہے، صاحب بہادر کو ادھر سدا کے لیے نفیری بجانا ہے۔" جمرو نے زہریلے لہجے میں کہا۔

اب بہت ہوگیا تھا۔ کسی کو خیال ہی نہیں تھا کہ کوئی سرگشتہ لمحہ ٹھاکر پر حاوی آسکتا ہے۔ دوسری گولی جمرو پر چل سکتی ہے۔ میں نے طے کیا کہ میں ٹھاکر سے بات کروں اور انگریزی میں مناسب رہے گی۔ یہ انگریزی بھی اس قماش کے لوگوں کو زیادہ متاثر کرتی ہے۔ ڈبے میں داخل ہوتے وقت ہمارا حال بھی نہایت شکستہ تھا۔ سب کی وضع قطع ہی بدلی ہوئی تھی، بال چپکے ہوئے، پیروں سے پانی رستا ہوا، پائنچوں اور جوتوں میں کیچڑ بھری ہوئی۔ ہم نے ڈبے کا فرش گندہ کردیا تھا۔ آدمی کا تخمینہ کوئی نہیں لگتا۔ لباس اور لب ولہجہ کا وزن ہی کتنا ہوتا ہے۔ دستور کے مطابق ٹھاکر کو ہمارا تخمینہ لگانا چاہیے تھا اور ہر آدمی یوں بھی اپنی عقل سے دوسروں کو پرکھتا ہے یہ اور بات ہے کہ خود اپنے رتبے کے تعین میں عموماً لوگوں سے مبالغہ سرزد ہوجاتا ہے۔ ٹھاکر بھیم سنگھ ایسے لوگوں میں معلوم ہوتا تھا جو اپنی خوش گمانیوں کے طلسم کے اسیر ہیں، چار آنکھوں، چار ہاتھوں کا گمان، بینائی، ساعت کی بے کرانی کا فریب۔ زندگی میں سبز رنگ کا ایک عمل ہو تو خود فریبی لازمی ہے۔

اس وقت ٹھاکر ڈبے میں اکیلا تھا۔ اسٹیشن پر ماتحتوں کی موجودگی، اس کے زور واثر، اثر و رسوخ کا عالم دگر ہوگا۔ ہماری راہ میں کوئی بھی رکاوٹ ڈال سکتا ہے۔ بدتمیزی، فرسٹ کلاس کے مسافر کی حق غضبی ایک عالی مرتبت سرکاری افسر سے بدسلوکی؟ اس کے سوا بھی ٹھاکر کی زبان کون روک سکتا ہے۔ اس کا فرمایا ہوا مستند قرار پائے گا۔ ہم وضاحتیں کرتے رہ جائیں گے۔ سامان میں ہمارے پاس تمنچے بھی ہیں، چاقو بھی، کارتوس کا اچھا ذخیرہ موجود ہے۔ وہی ریاست، وہی پولیس ہے۔ نواب کے بہ قول، نواب ثروت کے ساتھ مجن میاں کے باغ تک سفر کرنے والے دو اجنبیوں سے ملنے کی ریاستی پولیس یوں بھی بہت مشتاق ہے پھر اس دوران میں دھرم ویر کے مانند کسی اور گم گشتہ راہ پر نواب راجا سے تصادم کا اتفاق بھی ہوسکتا ہے۔ حیدر آباد کے اڈے کے آدمیوں اور اڈے کے علاقے میں متعین ہمارے صورت آشنا پولیس والوں کی دسترس سے سکندر آباد بھی دور نہیں ہے۔ دونوں شہروں کا فاصلہ ہی کتنا ہے۔ تقریباً ایک ہی شہر ہیں۔ بیچ میں حسین ساگر عبور کرتے ہی ادھر سے حیدر آباد، ادھر سے سکندر آباد آجاتا ہے۔"

اس چپقلش سے نجات کی ایک اور صورت بھی تھی۔ ٹھاکر بھیم سنگھ اپنے گھٹے ہوئے جثے کے باوجود ایک ہاتھ کا بھی نہیں تھا۔ ایک ضرب دیر تک اسے خود سے بے گانہ رکھ سکتی تھی۔ اتنی دیر میں اسٹیشن آہی جاتا۔ اسے نشست پر لٹا کر اور پلیٹ فارم کی طرف کھلنے والا دروازہ بند کرکے ہم مخالف دروازے سے اتر سکتے تھے۔ اسٹیشن پر ٹھاکر کی خیر خبر لینے اس کے ماتحت آئیں گے تو دروازہ بند دیکھ کر لوٹ جائیں

گے کہ صاحب کے آرام میں مداخلت سوئے ادب ہے۔ یہ تبھی ممکن تھا کہ سکندر آباد اسٹیشن پر موجود گاڑی ہم ترک کردیں مگر بات تو ہی تھی۔ سکندر آباد اسٹیشن پر کون سا گوشہ اماں ہم ایسے بے کساں و بے چارگاں کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ اسی ٹرین کے کسی دوسرے ڈبے میں ٹھاکر کے ساتھ سفر کرتے رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایک رات اور تقریباً آدھے دن کے سفر کے بعد کہیں ریاست کی حدود ختم ہوتیں اور ضروری نہیں تھا کہ ٹھاکر کے کمرے کا بند دروازہ دیکھ کر اس کی خبر گیری کرنے والے سادہ لوح یوں ہی لوٹ جائیں۔ سکندر آباد پولیس کے بڑے بڑے افسر اس کی پذیرائی کو آسکتے ہیں۔ اسٹیشن پر ٹھاکر کی پہلے سے طے شدہ مصروفیات بھی ہوسکتی ہیں۔ ہوش میں آنے پر ٹھاکر جس اسٹیشن پر پولیس طلب کرکے ہمارے حلیوں کی تفصیل بیان کرے گا' یہاں سے وہاں تک ریاست کی پولیس حرکت میں آجائے گی۔ بس یہی ایک طریقہ تھا کہ ٹھاکر بالکل ہی خاموش کردیا جائے۔ اسٹیشن آنے پر مخالف دروازے سے اتر کر ہم مسافروں کے ہجوم میں گم ہوجائیں گے اور اسی گاڑی کے کسی دوسرے ڈبے میں اطمینان سے سفر کرسکیں گے۔ اس تصور سے مجھے جھرجھری آگئی۔

ٹھاکر سے بات کرنے کی ایک کوشش کرلینے میں کچھ نہیں جاتا تھا۔ مجھے گونگوں کی طرح کھڑا نہیں رہنا چاہیے تھا۔ میں مناسب لفظ جمع کررہا تھا کہ بٹھل کی آواز پر سب کچھ منتشر ہوگیا۔ وہ کسمساتا ہوا اپنی نشست سے اٹھا اور ٹھاکر کے مقابل جاکے ٹھہر گیا۔ "دیکھ لیا صاحب!" اس نے رسان سے کہا "پٹاخا اصلی ہے' آواز بھی کراری ہے۔ ولایتی لگتا ہے' پر ہم نے بہت دیکھے ہیں۔"

ٹھاکر کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ہونٹ بھینچ کے رہ گیا۔ اس کی آنکھیں بٹھل کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں اور سخت ذہنی انتشار سے دوچار نظر آتا تھا۔

"آپ بھی اپنے کو اصیل ہی دکھائی دیتے ہو۔" بٹھل کے لہجے میں تیزی نہیں تھی "بس صاحب' ابھی آرام سے بیٹھ جاؤ۔ اسٹیشن آنے والا ہے۔ آپ کو بول دیے ہیں۔ چلے جائیں گے۔ ادھری سے۔"

"وہ تو ہم کو معلوم ہے۔" ٹھاکر کی تلملاتی آواز جھرجھرا گئی "تم یہاں ٹھہر بھی نہیں سکتے لیکن آگے بھی کہاں جانا ہے۔ یہ تم کو۔۔۔ تم کو۔۔۔"

بٹھل نے اس کی بات قطع کرکے آہستگی سے کہا "لگتا ہے کڑا ڈلوا کے ہم کو دم لوگے آپ! پھر کیا ہوگا صاحب!"

"تم نے کیا سمجھا ہے پھر جیل ہوسکتی ہے۔"

"کب سے پولیس میں آئے ہو صاحب؟"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" ٹھاکر پھنکارتی آواز میں بولا۔

"اپنے کو آپ نے زنخا' بھانڈ لوگ سمجھا ہے کیا؟" بٹھل نے تیکھے لہجے میں کہا "نظام نے آپ کو چوکی دینے کے لیے تو نہیں بلایا ہے۔"

"ابھی تم کو سارا معلوم ہوجائے گا۔" ٹھاکر جھنجلا کر بولا۔ "تم ایک سرکاری افسر کی مسلسل توہین کررہے ہو۔"

"اور آپ اپنے کو حلوہ چٹا رہے ہو' لوری سنا رہے ہو صاحب!" بٹھل نے تیور سے کہا "جنگل کے نکالے نہیں ہیں صاحب! آپ کی طرح کھونٹے کے پالتو ہیں۔ ہم نے پہلے آپ سے بنتی کی تھی۔ آپ تھوڑا اونچا سنتے ہو کیا۔"

"اونچا تم سنتے ہو۔" ٹھاکر نے ڈپٹ کے کہا "ہم نے بھی تم سے کہا تھا۔"

"مجبوری تھی صاحب! آپ کو کیا بولیں "جانا ضروری ہے اپنے پاس ٹکٹ خریدنے کا ٹائم بھی نہیں تھا۔"

"ٹکٹ بھی نہیں ہے تمہارے پاس؟" ٹھاکر حیرت سے بولا۔ اسے جیسے ایک جواز اور مل گیا تھا۔

"پیسہ ہے جیب میں' جرمانے کا بھی ہے صاحب اور ریل وئی کے کالے پیلے کا بھی اپنے کو کچھ پتا ہے۔"

"کہاں' کہاں جانا ہے تم کو؟" ٹھاکر کی دھمکتی آواز میں کسی حد تک طنطنے کی کمی تھی۔

"دور جانا ہے' پر ادھری ڈبے میں نہیں۔ بھروسا رکھو صاحب۔ اسٹیشن آنے پر ڈبے کی صفائی کرادیں گے۔"

ٹھاکر کے جسم میں ابال سا اٹھا اور اس نے خود پر قابو پانے کی کوشش بھی کی۔ وہ تاسف آمیز برہمی سے بولا "تم نہیں جانتے ہو کہ۔۔۔ نہیں جانتے! اچھا ہوگا کہ بات کم کرو۔"

"ٹھیک ہے صاحب! تالا مار لیتے ہیں۔" پیچھے سے جمرو نکیلی آواز میں بولا۔

"ابھی آپ بھی اپن سے مسخری کرتا ہے کہ مخول ے' زورا کو اب چپ ہی رہنا چاہیے تھا' منہ بنا کے کہنے لگا "ابھی سچ بولے نئیں۔ اپن آپ کو اپنا مافک آدمی کا اولاد ہی سمجھتا ہے۔ آپ تو سیدھا اوپر آیا پڑا ہے۔ غلطی ہوگیا مہادیو!" زورا نے ہاتھ جوڑ کر پیشانی پر مارتے ہوئے کہا "ابھی اپن کو بخشنے کا ہے کہ الٹا لٹکانے کا۔ یہ ڈبا آپ کا جاگیر ہے بابا! ساتھ ہی باندھ کے لے جانا اس کو۔ ٹھیک ہے!"

"تم ایک نمبر کے ہٹ دھرم ہو اڈیٹ۔" ٹھاکر کا پارا پھر چڑھنے لگا۔ "تمہیں اس کی سزا ضرور ملنی چاہیے۔"

"جیل کرادینے کا ہے نا! اور آپ کیا کرے گا۔ ماں قسم اپن بھی ماں کا جنا نئیں۔ لوٹ کے ایک بار پھر آپ کے پاس ضرور آئے گا۔"

"دھمکی دیتا ہے باسٹرڈ!" ٹھاکر بھنا کے بولا۔

"سبھی اپن ہی کرتا ہے۔ ابھی جیسا دادا بولا آپ تو ٹھمری سنا رہا ہے۔ ابھی زمین پر رہو صاحب! ابھی دکھاوے کا اپن لوگ چار ہے' گنتی کا چار' پر ایک دس کا برابر ہے۔ بیچ میں ایدر آپ کو کھڑکی سے نیچے لوٹ پلٹ بھی سکتا ہے۔ اتنا اپن بھی سننا نہیں مانگتا۔"

ٹھاکر کی رگوں میں بلبلاتا ہوا خون ایک لمحے کے لیے ضرور منجمد ہوگیا ہوگا۔ اس کی آنکھوں سے وحشت برسنے لگی۔

"یہ کیا ہورہا تھا۔ میں نے بٹھل کو ٹوکنا چاہا مگر وہ تو ٹھاکر کے سامنے سے ہٹ کر دوبارہ نشست پر بیٹھ گیا تھا اور جیسے اسے کسی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

"کون ہو تم لوگ! کیا کرتے ہو؟" ٹھاکر نے اپنے اعصابی کشیدگی پر غلبہ پالیا تھا کہ جکڑی ہوئی آواز میں بولا۔

"آپ کیا سمجھتے ہو؟" جمرو نے بے اعتنائی سے کہا۔

"ہم جو پوچھتے ہیں' اس کا جواب دو۔"

"سچ بولیں گے تو پلٹی کھا جاؤ گے آپ۔"

ٹھاکر آتش بار نظروں سے جمرو کو گھورتا رہا پھر درشتی سے بولا "ت۔۔۔ ت۔۔۔ تم ضرور جرائم پیشہ لوگ۔۔۔" وہ خود ہی چپ ہوگیا۔

"آپ کو بس کالا ہی ٹیپتا ہے۔" جمرو نے کسی قدر جھڑکتے لہجے میں کہا "ایک بات بول دیں صاحب! ذرا سوچ کے زبان سے کچھ نکالنا' دلی کا نشہ اتار کے' یہ دوسری جگہ ہے۔ ادھر چمڑی دمڑی دونوں کے پورے ہیں' اور پیچھے ٹھکانے لگانے والوں کی بھی کمی نہیں ہے۔"

جمرو کو باز رکھنے کے لیے میں نے اس کی کمر پر آہستہ سے کہنی ماری۔ اس نے پیچھے مڑ کے بھی نہیں دیکھا۔ زورا نے الٹا ایک آنکھ مار کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ زورا کی یہ تلقین میرے لیے ناقابل فہم تھی۔

گاڑی کی رفتار سست پڑنے لگی۔ انجن سیٹیاں بجا رہا تھا۔ اسٹیشن آہی جانا چاہیے تھا۔ رینگ رینگ کر گاڑی ٹھہر گئی۔ شاید سگنل نہیں مل رہا تھا مگر جلد ہی گاڑی چل پڑی۔ بارش اسی شدت سے ہورہی تھی۔ ٹھاکر اپنی جگہ خاموش کھڑا ہوا تھا۔ یہ خاموشی بے سبب نہیں ہوگی۔ چہرے کے رنگ میں خون کی حدت نمایاں تھی۔ پتا ابھی تک اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ میرا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ اسٹیشن آنے پر ٹھاکر سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ سب کچھ اسی پر منحصر تھا۔

چھ بجا چاہتے تھے لیکن گہرا اندھیرا چھا رہا تھا۔ گاڑی لائنیں بدلنے لگی اور کھڑکیوں سے قمقموں کی روشنیاں ڈبے میں در آنے لگیں۔ زورا اور جمرو نے سامان اٹھانے میں عجلت نہیں کی۔ بٹھل بھی بے حرکت بیٹھا رہا پہیوں کی رگڑ کے ساتھ گاڑی سکندر آباد اسٹیشن پر ٹھہر گئی۔ زورا نے پلیٹ فارم کی طرف کھڑکیوں کے شیشے اوپر چڑھا دیے اور جھٹ دروازہ کھول دیا۔ پلیٹ فارم کا شور ڈبے میں امڈ آیا۔

ٹرین ٹھہرے چند لمحے گزرے ہوں گے کہ بندوق بردار سپاہی ہمارے ڈبے کی طرف لپکتے نظر آئے۔ ان کے پیچھے دو مستعد اور بے تاب پولیس افسر بھی تھے۔ ٹھاکر بھیم سنگھ نے ایک لمبی سانس کھینچ کے اپنی جگہ سے جنبش کی۔ کمر سے بندھی ہوئی بیلٹ کے ہولسٹر میں تمنچا رکھا' بالوں پر ہاتھ پھیرا' قمیص کی شکنیں درست کیں' نشست کے قریب ٹنگا ہوا کوٹ پہنا اور ہیٹ سر پر جما کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ پولیس افسروں کے ہاتھوں میں گوٹے کے ہار اور گل دستے تھے۔ ان کے عقب میں درجن بھر سپاہیوں کی نفری الگ موجود تھی۔ بٹھل بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ٹھاکر ابھی دروازے سے نیچے نہیں اترا تھا کہ بٹھل نے اس کے نزدیک جاکے آہستہ سے کہا "آگے جانے والوں سے کبھی ایک بات سنی تھی' آپ نے بھی ضرور سنی ہوگی' اس کا خیال رکھنا۔"

ٹھاکر نے سر گھما کر اضطراری نگاہوں سے بٹھل کو دیکھا اور ایک لحظے کے تامل کے بعد تیزی سے نیچے اتر گیا۔ ہاتھوں میں ہار اٹھائے پولیس افسر اس کے اترنے کے منتظر تھے۔ انہوں نے اس کے گلے میں ہار ڈال دیے اور بھی پولیس افسر ہجوم میں راستہ بناتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ ٹھاکر ان میں گھر گیا تھا کہ میں جمرو اور بٹھل بھی ڈبے سے اتر آئے۔ جمرو نے قلی روک کے سامان اٹھانے کی ہدایت کی۔ قلی کے ساتھ زورا بھی نیچے آگیا۔ پولیس افسروں کے پیچھے کھڑے ہوئے سپاہیوں کے دستے نے ایڑیاں بجا کر ٹھاکر کو سلامی دی۔ جواب میں ٹھاکر نے ہیٹ اتار کے سر جھکایا اور مسکرا دیا۔ منٹ سے کم عرصے میں اس کی مضطرب نگاہیں کئی بار ہم پر منڈلائیں۔ ادھر سامان بدوش قلی کو روک کے بٹھل' افسروں سے باتیں کرتے ہوئے ٹھاکر کے پاس جاکے ٹھہر گیا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا۔ اسے سامنے دیکھ کر ٹھاکر بھیم سنگھ کا جسم اکڑ گیا تھا۔ "یاد رکھیں گے صاحب

آپ کو۔" بٹھل نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ ٹھاکر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بٹھل بھی فوراً پلٹ گیا۔

میری سانسیں سینے میں اٹکی ہوئی تھیں۔ اپنی آنکھوں پر مجھے کسی خواب کا گمان ہوا۔ دیر تک مجھے اپنے گردوپیش سپاہیوں کی آہٹیں سنائی دیتی رہیں۔ دور جاکے میں نے مڑ کے دیکھا تو درمیان کے مسافروں کی بھیڑ میں سب کچھ گم ہوگیا تھا۔ گاڑی خاصی طویل تھی۔ ہم انجن کے حصے کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ انجن سے چند قدم کے فاصلے پر بٹھل ایک خالی بینچ پر بیٹھ گیا۔ اسٹیشن پر چھائے ہوئے شور میں کمی آگئی تھی۔ منتشر ہجوم بھی پرسکون ہوگیا تھا۔ بینچ کے پاس قلی نے سامان اتار دیا۔ زورا اور جمرو اس کے ساتھ چلے گئے۔ اندھیرا نسبتاً چھٹ چکا تھا۔ بارش کچھ اور تیز ہوگئی تھی یا ڈبے سے اترنے کے بعد زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ مسافر ڈبوں میں بیٹھ چکے تھے۔ دیر ہوگئی جمرو اور زورا واپس نہیں آئے۔ اسٹیشن پر گاڑی ٹھہرے رہنے کا وقت بیس منٹ سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس مختصر وقت میں انہیں جگہ اور ٹکٹ دونوں کا بندوبست کرنا تھا۔ میں نے سوچا، بٹھل سے کہوں گا کہ کوئی دوسری گاڑی کیوں نہ دیکھی جائے۔ مجھے اپنی یہ خواہش خود ہی بے محل، بے جواز لگی۔ سو میں چپ بیٹھا رہا۔ وقت گزارنا دوبھر ہو رہا تھا۔ امکان تو نہیں تھا لیکن آدمی تو گرگٹ کی طرح ہوتا ہے۔ ٹھاکر بھیم سنگھ کا دماغ کسی بھی لمحے پلٹ سکتا تھا۔ ابھی تک سب کچھ جوں کا توں تھا۔ اسٹیشن، پولیس، ٹھاکر اور ہم۔۔۔

جمرو اور زورا تقریباً بھاگتے ہوئے واپس آئے اور جمرو نے ہانپتے ہوئے بتایا کہ مشکل سے سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں جگہ مل پائی ہے۔ وہ بھی بہت منتیں کرکے اور رشوت دے کے۔ آگے نظام آباد میں شاید کوئی معقول جگہ مل جائے۔ جمرو کی روداد ادھوری چھوڑ کے بٹھل بینچ سے اٹھ گیا۔ ڈبا اتنے فاصلے پر نہیں تھا۔ ڈبے میں موجود مسافروں نے دروازہ اندر سے بند کر رکھا تھا۔ قلی کی چیخ وپکار پر ایک مسافر دروازے پر نمودار ہوا۔ وہ چھریرے جسم، درمیانہ قامت اور اوسط عمر کا شخص تھا۔ تانبے جیسی رنگت، تیکھے نقش ونگار، سفید دھوتی اور کرتے میں ملبوس، ماتھے پر قشقہ، گلے میں سونے کی زنجیر۔ شکل وصورت سے کوئی نواب معلوم ہوتا تھا۔ راستہ روک کے وہ بیزاری سے بولا کہ ڈبے میں ایک عورت موجود ہے۔ کوئی اور ڈبا تلاش کیا جائے۔

زورا نے اس سے کہا، عورتوں کے لیے زنانے ڈبے ہیں اور ہم نے باقاعدہ ٹی ٹی سے اس ڈبے کے لیے اجازت حاصل کی ہے۔ قلی نے بھی شدومد سے زورا کی ہم نوائی کی اور ٹکٹ دکھائے۔ دروازے پر کسی پاسبان کی طرح کھڑے ہوئے مسافر اچھی خاصی بک بک جھک جھک کی لیکن زورا کی ایک ہی پھنکار تیر بہدف ثابت ہوئی۔

سامنے کی نشست پر کونے میں دبکی ہوئی ایک عورت بیٹھی تھی۔ وہ ساڑی میں ملبوس تھی۔ صرف ہاتھ نظر آرہے تھے اور کلائیوں میں آراستہ کانچ کی چوڑیاں۔ اگر مرد مسافر اس کا شوہر یا بھائی تھا تو وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ نہ تو عورت آرام سے سوسکتی تھی نہ سکون سے بیٹھ سکتی تھی مگر ڈبے میں چھ مسافروں کی گنجائش تھی۔ ہم پھر کہاں جاتے۔ زورا کے بقول ٹی ٹی نے اس ڈبے کی نشستیں ہمارے لیے تفویض کی تھیں۔ ڈبا بدلنے کا وقت بھی نہیں تھا۔

ہمارے بیٹھنے کے چند منٹ بعد گاڑی چل پڑی۔ گاڑی چل پڑنے پر ایسا لگا جیسے بند کھل گئے ہوں، دریچے کھل گئے ہوں۔ مجھے تو یقین نہیں آرہا تھا مگر گاڑی آہستہ آہستہ رفتار پکڑ رہی تھی۔ سکندر آباد شہر دور ہوتا جارہا تھا۔ اجالا بھی بڑھ رہا تھا۔ کھڑکیوں کے قریب اونچے نیچے ٹیلے اور کھیت دکھائی دینے لگے تھے۔ حد نظر تو دیوار سے بھی مشروط ہے۔ موسلا دھار بارش کی دیوار نے دور کے مناظر چھپادیے تھے۔ یکے بعد دیگرے سب نے کپڑے تبدیل کیے اور بٹھل اوپر کی برتھ پر چلا گیا۔ میرا ہاتھ دبوچ کے جمرو میرے پہلو میں بیٹھ گیا۔ اس کی گرفت سے اس کے سینے کے تلاطم کا اندازہ ہوتا تھا۔ جانے کب تک ہم یوں ہی بے سدھ سے بیٹھے رہے۔ کچھ دیر بعد کسی اسٹیشن کے آنے پر زورا نے چائے منگوائی۔ ساری رات ایسے ہی گزر گئی تھی۔ رات کو ڈاکٹر ناصر مرزا کے گھر جانے کے لیے جس وقت ہم ہوٹل سے نکلے تھے تب سے کسی نے کچھ کھایا تھا نہ پیا تھا۔ گرم چائے سے اوسان کسی قدر بحال ہوئے۔

گاڑی سکندر آباد سے میلوں دور آچکی ہوگی کہ زورا اور جمرو کو ٹھاکر بھیم سنگھ یاد آگیا، یاد کیا، اس کا نقش اتنی آسانی سے مٹنے والا نہیں تھا۔ وہ تو کسی بھوت کے مانند مستقل ان کے ذہنوں پر چھایا ہوا ہوگا۔ ان کے لب ولہجے کی بے چینی ظاہر کرتی تھی کہ انہیں بھی ٹھاکر کی رخنہ اندازی کی اتنی ہی فکر تھی۔ جتنی مجھے بلکہ مجھ سے کچھ زیادہ۔ کوئی بلا ٹل جانے پر جس اضطراب آمیز اطمینان اور تشکر سے چہرہ تمتمانے لگتا ہے، کچھ وہی ان کی کیفیت تھی۔ میں تو مسلسل ان پر پیچ و تاب کھاتا رہا تھا اور میری عقل میں نہیں آیا تھا کہ ٹھاکر سے ان کی حیل وحجت، بحث وتکرار ارادتاً ہے۔ ٹھاکر کی زبانی یہ

معلوم ہونے کے بعد کہ وہ ایک بااثر پولیس افسر ہے، انہیں بٹھل نے کوئی رو رعایت روانہ رکھنے کا اشارہ کردیا تھا۔ ہماری مجوبیت اور انفعالیت سے ٹھاکر کے تیوروں پر اور بل پڑسکتے تھے۔ جھکی ہوئی شاخوں سے بعض لوگوں کو بیر ہوتا ہے۔ کم عقل ہی اتنے خود سر اور نااندیش ہوسکتے ہیں یا ایسی بے نیاز جو استغنا کے درجے پر فائز ہوں یا کسی چیز کو خاطر میں نہ لانے والے اپنے پس منظر کے مضبوط و مستحکم لوگ۔ انہیں ٹھاکر کو کچھ اسی قسم کا، اسی کج روی و کج کلاہی کا تاثر دیتے رہنا چاہیے تھا۔ بالا دست، بالادستی کی توانائی سے خوب واقف ہوتا ہے۔ جمرو کہہ رہا تھا، انہیں یقین نہیں تھا کہ ان کی کوششیں بار آرہی ہوں گی مگر اڈوں سے تعلق رکھنے والوں، سامان میں ہتھیار ساتھ لے کے چلنے والوں اور نواب ثروت جیسے رئیس کی موت کے سفر میں ساتھ رہنے والوں کے پاس اس کے سوا راستہ بھی کیا تھا۔ بصورت دیگر تو سب کچھ ٹھاکر کے اختیار میں تھا۔ اس نے زنجیر کھینچنے کی ٹھان رکھی تھی۔ بٹھل کو احساس ہوگیا تھا کہ اس آمادہ غضب شخص سے دادو فریاد کا کچھ حاصل نہیں۔ اچھا ہوا جو میں نے منہ سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ ورنہ ٹھاکر کا پتھر گداخت کرنے کے لیے میں عاجزی ہی کرتا۔ میری انگریزی دانی ٹھاکر کی جستجو مہمیز بھی کرسکتی تھی۔

میں بھی انہی کے ساتھ تھا لیکن میں کسی کے ساتھ کہاں رہتا ہوں۔ میں تو صرف اپنے ساتھ رہتا ہوں۔ مجھے تو صرف اپنے فشار و غبار سے غرض ہے۔ صرف میرا ہی جسم ٹوٹتا، میرا ہی سینہ دکھتا ہے۔ میں جمرو اور زورا سے ندامت کا اظہار بھی نہ کرسکا۔ نہ انہوں نے مجھ سے شکایت کی کہ وہ مجھے اچھی طرح جانتے تھے۔ کسی معذور، مفلوج شخص سے شکایتیں بھی کون کرتا ہے۔ میرا شمار تو در گزر کردیے جانے والوں لوگوں میں تھا۔

ہمارے ہم سفر مسافر کو ہماری آمد بہت ناگوار گزری تھی۔ گاڑی چلنے پر مسافر ایک دوسرے سے گھل مل جاتے ہیں۔ اس نے ازراہ وضع بھی منزل مقصود وغیرہ کے بارے میں ہم سے کوئی سوال نہیں کیا۔ نہ جمرو اور زورا نے پہل کی۔ زورا نے اسے چائے کی پیشکش کی تھی مگر مسافر نے بے دلی، بے رخی سے انکار کردیا۔ گاڑی منزلیں طے کرتی رہی۔ وہ دونوں ایک ہی برتھ پر بیٹھے رہے۔ عورت نے ذرا کھسک کے کھڑکی کی طرف منہ کرلیا تھا۔ مرد کبھی اس کے قریب ہوکے کھسر پھسر کرنے لگتا یا تیزی سے گزرنے والے مناظر تکتا رہتا۔ اسے چین نہیں تھا۔ اسٹیشن آنے پر وہ اٹھ کے دروازے پر کھڑا ہوجاتا۔ چھوٹے چھوٹے اسٹیشن ہی آتے رہے۔ ہر اسٹیشن پر دو تین منٹ سانس لے کر گاڑی پھر چل پڑتی۔ ڈبے کی روشنیاں کب کی بجھ چکی تھیں۔ اجالا ہی اتنا ہوگیا تھا کہ قمقموں کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ عورت کو سردی لگ رہی تھی یا مزید پردہ مطلوب تھا۔ مرد نے کینوس کے ایک بڑے بیگ سے منقش شال نکال کے اس کی پشت پر ڈال دی۔ عورت نے اس سلیقے سے کہ بدن کا کوئی حصہ عیاں نہ ہوجائے، چادر لپیٹ لی۔ حلیے اور طور طریق سے مرد خالص ہندو معلوم ہوتا تھا۔ ظاہر ہے، وہ خاتون بھی روایتی ہندو ہوگی۔ مسلمان عورتوں کی طرح ہندو عورتیں اتنی شدت سے اپنے آپ کو چھپائے نہیں رکھتیں۔ چار پانچ گھنٹے کے سفر میں یا تو انہیں ہم پر اعتبار نہیں آیا تھا یا کچھ ایسا ہی شدید ستر پوشی کا رواج ان کے یہاں ہوگا۔ ہندوستان تو ویسے بھی رسم و رواج کا جنگل ہے۔ شہر شہر قاعدے، ضابطے بدل جاتے ہیں۔

بٹھل اوپر کی برتھ پر سوتا رہا۔ زورا پر غنودگی نے غلبہ کیا تو پھر جمرو بھی گردن ڈالنے لگا۔ میری آنکھیں بند نہیں ہوئیں۔ بے ارادہ میری نظریں اپنے سامنے کے مسافر پر چلی جاتی تھیں۔ اس کا بھی یہی حال تھا۔ کبھی ہماری نظریں ٹکرا جاتیں تو وہ بے کل سا ہوجاتا، سر جھکالیتا یا منہ دوسری جانب کرلیتا، میرا اندازہ تھا کہ نظام آباد میں وہ کسی دوسرے ڈبے میں جگہ حاصل کرنے کی کوشش کرے گا یا عورت کو زنانہ ڈبے میں بھیج دے گا۔ اگر نظام آباد ان کی منزل نہیں ہے تو عورت کب تک گٹھری بنی رہے گی۔ ان کے پاس نہایت مختصر سامان تھا۔ کینوس کے بیگ کے علاوہ درمیانہ سائز کا صرف ایک سوٹ کیس۔ طویل سفر کے لیے بستر بند بھی لازم ہوتا۔ ان کے پاس کھانے پینے کی چیزیں بھی نہیں تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ حیدرآباد، سکندر آباد میں ان کا گھر نہیں ہے۔ مرد کی ہندوستانی صاف تھی اور وہ شمالی علاقوں کا رہنے والا معلوم ہوتا تھا۔ اس سے سلسلہ جنبانی کو میں سوچتا ہی رہ گیا۔

بارہ بج چکے تھے کہ گاڑی کی رفتار سست پڑنے لگی۔ کھڑکیوں سے نظر آنے والی پختہ عمارتیں کسی شہر کی علامت تھیں اور وہ نظام آباد ہی ہوسکتا تھا۔ مرد فوراً اٹھ گیا اور اس سے پہلے کہ گاڑی پلیٹ فارم میں داخل ہوتی، اس نے لمحے بھر عورت سے کوئی سرگوشی کی اور دروازے پر جاکے کھڑا ہوگیا۔

گاڑی سست ہوجانے سے جمرو کی آنکھ بھی کھل گئی۔ ہمارا ڈبا خاصا آگے تھا۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کے دیکھا۔ میرے سامنے سے پلیٹ فارم کا تقریباً تین چوتھائی ہجوم گزر

گیا۔ تب گاڑی نے سپر ڈالی۔ گاڑی کچھ آگے نکل گئی تھی۔ قریب ہی پلیٹ فارم کا سرا تھا۔ یہاں سے وہاں تک، سارے پلیٹ فارم پر فاصلے فاصلے سے سپاہیوں کی تعداد دیکھ کے میرا ماتھا ٹھنکا۔ یہ ریلوے پولیس نہیں تھی۔ میں نے جمرو کو ٹھوکا دیا تو وہ بھی پلکیں جھپکانے لگا۔ پلیٹ فارم پر اٹھنے والے شور سے زورا بھی جاگ گیا اور نیچے آگیا۔ سکندر آباد کی طرح یہاں بھی پولیس کا ایک دستہ الگ سے موجود تھا اور وہی پھولوں اور گوٹے کے ہار اٹھائے پولیس افسر۔ یقیناً یہ ٹھاکر بھیم سنگھ کی پذیرائی کا اہتمام ہوگا۔ پلیٹ فارم پر چھائی ہوئی پولیس دیکھ کے زورا نے مخالف سمت کی کھڑکیوں سے نظر کی تو اس کے ہونٹ پھیل گئے۔ اس طرف لائنوں پر بھی پولیس کھڑی تھی۔ گاڑی رکتے ہی مرد مسافر نے پہلی بار ہمیں مخاطب کیا اور عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تیزی سے بولا "بھائی صاحب! ذرا دھیان رکھنا ہم ابھی آتے ہیں۔"

اس کی آواز پر عورت کے سراپا میں لہری اٹھی۔ بے اختیار اس نے مڑ کے اپنے ہم سفر مرد کو دیکھا اور دوسرے ہی لمحے سنبھل گئی۔ اس کی بس ایک جھلک ہی نظر آسکی تھی۔ چھٹی چھٹی چوڑی آنکھیں، کالے بال اور چمکتی دمکتی پیشانی کا جھماکا اور مرد نیچے جاچکا تھا۔ اسے ڈبے سے اترے ابھی چند منٹ بھی نہیں ہوئے ہوں گے کہ تین مسلح، غیر مسلح سپاہی درانہ ڈبے میں چڑھ آئے۔ ان کا انداز جھپٹ پڑنے کا تھا۔ اب کوئی چارہ نہیں تھا۔ شاید سب کچھ اکارت گیا تھا۔ ہم اپنی جگہوں پر ٹھٹک کے رہ گئے۔ سپاہیوں کی متجسس نگاہیں ڈبے میں چاروں طرف بھٹکتی رہیں۔ جیسے وہاں کونے کھدرے میں بھی مسافر چھپے ہوئے ہوں۔ ایک سپاہی نے جھک کے برتھوں کے نیچے دیکھا۔ دوسرے نے ضرورت خانہ کھول کے تسلی کی کہ اندر تو کوئی نہیں ہے۔ ان کے تذبذب سے میری طرح جمرو اور زورا کو بھی کسی قدر فراغت نصیب ہوئی ہوگی لیکن ابھی کیا کہا جاسکتا تھا۔ یہ تو پہلے ہی سمجھ میں آگیا تھا کہ وہ ٹکٹ چیکنگ کے لیے نہیں آئے ہیں۔ ان کی بکھری ہوئی نظریں پھر عورت پر جاکے ٹھہر گئیں۔

"کیا ہے حوالدار، کیا کھو گیا ہے؟" جمرو نے آنکھیں مسلتے ہوئے اچٹتی آواز سے پوچھا۔

"یہ، یہ کون ہے؟ ان میں سے ایک نے عورت کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ وہ باقی دونوں کا افسر معلوم ہوتا تھا۔

"تم لو ٹھیک سے نہیں سوجھتا۔" جمرو ناراضی سے بولا "اپنی ماں بہن کو نہیں پہچانتے انسپکٹر صاحب۔"

"یہ، یہ تمہارے ساتھ ہے؟" انسپکٹر نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"تم کو اعتراض ہے کیا؟"

"یہ کون ہے تمہارا؟"

"تم سے مطلب!" جمرو نے بگڑ کے کہا۔

"ہم پوچھتا ہے، یہ کون ہے؟"

جمرو کو جواب دینے میں تامل ہوا کہ یکایک اوپر کی برتھ سے بٹھل کی بھاری آواز گونجی "کیا بات ہے حوالدار! تھوڑا سنبھل کے بات کرو۔ دھیرج سے۔"

تینوں سپاہیوں کی نظریں بٹھل پر جم گئیں "ہم پوچھتا ہے، کون ہے یہ تمہاری؟" انسپکٹر کی آواز اکڑی ہوئی تھی۔

"تم کو بولنا ضروری ہے۔ تم پولیس کا آدمی ہے کہ خدائی فوج دار! یہ کوئی بھی ہے اپنا۔ تم کو کیا ہے۔" بٹھل نے دھمکتی آواز میں کہا۔

انسپکٹر بوکھلا سا گیا "دیکھو، ٹھیک سے بات کرو۔" اس کے لہجے میں مدافعت بھی تھی، تلخی بھی "کیا پوچھا ہے تم سے؟"

"اور ہم کیا بولتے ہیں۔" بٹھل نے برگشتگی سے کہا "یہ اپنی بٹیا ہے، بولو، ابھی کیا کرنے کا ہے؟"

"بیٹی ہے تمہارا!" انسپکٹر نے بے یقینی سے دہرایا۔

"اور اپن کا نہیں ہے۔" زورا سینے پر ہاتھ مار کے بولا "ابھی تم کس لیے پوچھتا ہے؟"

"ہم، ہم ایک عورت کی تلاش میں ہے۔"

"تو اپن اس کو تمہارے ساتھ کردے؟ ایسا!" زورا گرج کے بولا۔

"ایسا کب بولا ہے ہم نے۔" انسپکٹر تنک گیا۔

"پھر کیسا بولتا ہے۔" زورا کا پارہ چڑھنے لگا "تم ڈبا میں ابھی ایسا پوچھے بغیر کیوں آیا۔ اپن سیکنڈ کلاس میں بیٹھا ہے اور پھوکٹ میں نئیں۔"

"اے! زیادہ گرمی مت دکھاؤ۔" بندوق بردار سپاہی نے بپھر کے کہا "ہم کو اوپر سے حکم ملا ہے۔"

"اسی ڈبا کا! اور کوئی دکھائی نئیں پڑا تم کو؟" زورا مشتعل لہجے میں بولا

"ہم کو تمہارے سامان کا تلاشی چاہیے۔"

"ٹھیک ہے، تلاشی کا رسید ہے تمہارے پاس؟"

"کیسا رسید! کیا بولتا ہے یہ؟" سپاہیوں نے جز بز ہوکے اپنے ساتھیوں کو دیکھا۔

"تیرے باپ کا راج ہے۔" مرد بھی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا "سامان کو ہاتھ لگا کے دیکھ۔ ابھی تھوڑا کتاب پڑھ کے آتا۔ نوا نوا آیا ہے پولیس میں!"

تینوں سپاہی الجھ گئے تھے "دیکھو، ہوش سے بات کرو، ہم کو آرڈر ہے۔"

"آڈر ہے تو اپنے کو دکھاؤ، ایک کیا، سارے تلاشی دیں گے اور پگڑی اچھالنے پہ بعد کو تالی ہی بجائیں گے۔"

"کدھر سے تم لوگاں ٹرین میں بیٹھا ہے؟" جو سپاہی ابھی تک خاموش کھڑا تھا، اس نے نرمی سے کہا۔

"ایسا! ابھی تھوڑا تھام کے زبان کھولنے کا، ہاں! تمہارا دیا نئیں کھاتا اپن لوگ۔" زورا دھیمی آواز میں مگر رکھائی سے بولا "اپن سکندر آباد سے ٹرین پکڑا ہے اور کچھ؟"

"اور یہ، یہ عورت۔۔۔؟"

"عورت نہیں!" زورا پھر اکھڑ گیا "اپن کیا بولا، ایک دم ماں بولنے کا ہے کہ بہن بولنے کا، سمجھا! اگر وردی والا تڑی دکھایا تو اپن، اپن۔۔۔"

"نہیں نہیں، ایسا غصہ نہیں مہاراج!" نسبتاً خاموش طبع سپاہی نے کہا "ہم لوگوں کا تم سے دشمنی نہیں ہے۔"

"تم لوگ اپنے کو سمجھتا کیا ہے ابھی؟"

"تم ایسا ہی بہت آگے کا بولتا ہے، ہم پولیس کا آدمی ہے اور ڈیوٹی پر ہے۔"

"اور اپن تمہارا نوکر ہے، تمہارا غلام۔"

"اوپر سے حکم ہے، ہم سارا گاڑی کا تلاشی لے سکتا ہے۔"

"دے گا، تلاشی بھی ضروری دے گا، تمہارے آگے اکھا کپڑا اتار دیں گا، پر پہلا، پہلا اپن کو کاغذ دکھانے کا ہے، سمجھا!"

سپاہی شش و پنج میں پڑ گئے تھے۔ بے شک پولیس کی وردی اور نشانات سے ان کے جسم بھی مزین تھے مگر وہ ٹھاکر بھیم سنگھ جیسے عالی رتبہ افسر نہیں تھے۔ اسی نسبت سے ان کے ہاں کروفر اور زود اثر کی کمی تھی۔ جمرو اور زورا کا تجربہ تازہ تازہ تھا۔ ان کے ہاں مشاقی اور روانی بھی اسی سبب سے تھی۔ کچھ وہی حال تھا مگر پہلے جیسی دہشت نہیں تھی۔ میری دانست میں اتنا ہی کافی تھا۔ جمرو اور زورا کو زیادہ الجھنا، اڑنا نہیں چاہیے تھا۔ پولیس والے تلاشی کے لیے ضد کرسکتے تھے اور تلاشی ہمارے لیے زہر کے مترادف تھی۔ تلاشی کے بعد ان میں اور ٹھاکر میں کوئی فرق نہ رہتا۔ ٹھاکر تو ویسے بھی ہماری طرف اشارہ کرکے اپنی راہ لیتا، اس کے بعد تو ہمیں انہی لوگوں سے سابقہ پڑنا تھا۔ شاید ہمیں شروع ہی سے ملوث نہیں ہونا چاہیے تھا۔ عورت اکیلی تھی تو کچھ دیر میں اس کے ساتھی کو واپس آجانا تھا۔ معلوم نہیں، کیوں زورا اور جمرو نے عورت سے وابستگی کا اظہار کیا اور بٹھل نے بھی توثیق ضروری سمجھی۔ ایک حل تو صاف تھا۔ یہ اطمینان ہوجانے پر کہ وہ ٹھاکر کے فرستادہ نہیں ہیں اور ان کی آمد کا مقصد کچھ اور ہے، ہمیں خاموش رہنا یا بتا دینا چاہیے تھا کہ عورت کے ساتھی مرد کا انتظار کریں۔ وہ جلد واپس آنے کو کہہ گیا ہے۔

"آپ لوگاں کیا کام کرتے ہو؟" کسی حد تک مہذب سپاہی نے رک رک کر پوچھا۔ اس نے پہلی مرتبہ ہمیں احترام سے مخاطب کیا تھا۔

"تم کو کیا دکھائی پڑتا ہے، چور، اچکا، اٹھائی گیرا!" زورا نے برہمی سے جواب دیا۔

"کسی کے ماتھے پر نہیں لکھا ہوتا۔ ہم نے بہت لوگاں دیکھا ہے۔"

"لگتا ہے، آدمی نئیں دیکھا تم نے!" جمرو نے بہ ظاہر طنز کیا۔

سپاہی سر ہلانے لگا اور اس نے انتظار کیا کہ اس کے ساتھی بھی کچھ بولیں۔ وہ خاموش رہے تو سپاہی جھجک کے بولا "تم لوگاں ساتھ ساتھ ہے؟"

"تم کو الگ الگ دکھائی پڑتا ہے کیا۔" جمرو نے زورا کے گلے میں بازو ڈال دیا۔

"ٹھیک ہے، تم سامان دکھاؤ، ہم چلا جائے گا۔" انسپکٹر نے خاصی دیر بعد زبان کھولی۔ اس کے لہجے میں گرمی نہیں تھی۔

"سامان کا پہلے بول دیا ہے۔ ابھی زیادہ لفڑا نئیں کرو انسپکٹر صاحب! اپن پاس اتنا فالتو ٹیم نئیں ہے۔ اپن کو جاستی بولنا بھی نہیں آتا۔ اپن کو ابھی پیٹ پوجا بھی کرنے کا ہے۔ ایک بات اس کا بعد بھیجا چاٹنے کا نئیں۔ تلاشی کا کاغذ لاؤ اور سامان کھول کے دیکھو۔ اچھا لگے تو تھوڑا بال بچہ لوگ کے لیے بھی لے جاؤ۔"

"کاغذ کا تم کیا کرلے گا؟"

"اچار ڈالیں گا ابھی، ٹھیک ہے۔"

"تم ایسا نہیں دکھائے گا؟"

"ایک دم یہی بولا ہے۔"

"تم نہیں جانتا، پولیس کا کام میں روڑا ڈالنے کا مطلب کیا ہے؟" انسپکٹر نے کرخت آواز میں کہا۔

"تم سے جاستی جانتا ہے، پر تم ابھی کچھ نئیں جانتا، اپن کون لوگ ہے۔"

"کون ہے تم۔۔۔"

"بولے گا تو تم ابھی۔۔۔ ابھی۔"

"جانے دے رے۔" اوپر سے بٹھل نے ہانک لگائی اور انسپکٹر سے مخاطب ہوکے غنودہ لہجے میں بولا "جاؤ صاحب! ٹائم کھوٹا متی کرو۔ ادھری سے کچھ نہیں ملے گا۔ اتنی دیر میں پلے پڑجانا چاہیے تھا تم کو۔ نہیں تو اپنے کسی بڑے کو بلا کے لاؤ۔ اس کو بولتے ہیں' تلاشی کا پرچا بھی کاٹا جاتا ہے' ٹھپا لگا کے۔"

انسپکٹر اور دونوں سپاہیوں کے چہروں کے رنگ بار بار بدل رہے تھے۔

"کیا بولتے ہیں لاڈلے اس کو فرنگی میں؟ ان لوگ کی سمجھ میں بھاشا نہیں آتی شاید۔"

بٹھل کے تخاطب پر میں گڑبڑا سا گیا اور سرچ وارنٹ کا لفظ میرے ذہن سے اوجھل ہوگیا۔ جب یاد آیا' اور میں نے انگریزی میں ان سے کہنا چاہا کہ حکم نامہ دکھائے بغیر کسی کے گھر یا سامان کی تلاشی لینا ناجائز بھی ہے اور غیر قانونی بھی۔ تو دیر ہوگئی تھی۔ مجھے قانون کا کچھ علم نہیں تھا' بس بٹھل کا عندیہ میری سمجھ میں آگیا تھا۔ مجھے یہی کہنا چاہیے تھا لیکن ضرورت ہی نہیں پڑی۔

انسپکٹر کی نظریں مجھ پر اور بٹھل پر بپھری ہوئی تھیں' پھر آنکھوں آنکھوں میں انہوں نے ایک دوسرے سے کچھ کہا اور انسپکٹر تلخ و تند لہجے میں بولا "ٹھیک ہے' ہم ابھی تم کو دیکھتا ہے۔"

"ایک کو ایدری چھوڑ جاؤ صاحب!" روزا نے مضحکہ آمیز آواز میں کہا "سامان میں ابھی اپن ہیرا پھیری نئیں کروے۔"

"اس کا ضرورت نہیں' ہم پاتال سے نکال لیتا ہے۔" انسپکٹر نے ڈبے سے اترتے اترتے ایسے حتمی انداز میں کہا جیسے ابھی واپس آکے ہمارا خون پی لے گا۔

ان کے جانے کے بعد زورا اور جمرو کو قہقہہ لگانا چاہیے تھا۔ آخر وہ دوبارہ نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ دونوں نے نشست پر ہاتھ پیر ڈال کے آنکھیں میچ لیں۔ بٹھل بھی نیچے آگیا۔ لمحوں تک سکوت رہا۔ کہتے ہیں' ہر تلاطم کے بعد ایک سکون اور ہر شور کے بعد ایک سکوت لازم ہے۔ سکون کی شدت تلاطم کی شدت سے مربوط ہے۔ شور کا بھی یہی ہے ورنہ شاید آدمی ریزہ ریزہ ہوجائے اور سمندر میں آگ لگ جائے۔

"استاد! بولو تو نکال کے پٹھانوں کو گدے میں بٹھادیں۔ چاقو سے سالی سیون اتار لیتا ہوں' پتہ بھی نہیں چلے گا۔" جمرو نے بٹھل سے سرگوشی کی کہ کہیں عورت نہ سن لے۔

"دیکھیں گے رے۔" بٹھل نے بوجھل آواز میں کہا۔

جمرو کچھ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ یہ تمنچے' کارتوس اور چاقو سامان میں چھپے نہ ہوتے تو ٹھاکر بھیم سنگھ اور سپاہیوں سے اتنی توتکار' منہ ماری کی نوبت نہ آتی مگر سردست یہ کام ممکن بھی نہیں تھا۔ گاڑی پلیٹ فارم پر ٹھہری ہوئی تھی۔ پولیس والے بھی پلٹ سکتے تھے۔ کوئی اور شخص بھی اس دوران ڈبے میں داخل ہوسکتا تھا اور عورت کا ساتھی بھی واپس آسکتا تھا۔ بٹھل نے اسی لیے توجہ نہیں دی۔ گدے میں نہیں تو آگے راستے میں ہتھیار کہیں پھینکے جاسکتے تھے مگر ہتھیاروں سے دستبرداری اڈے کے لوگوں کے لیے اتنی آسان نہیں ہوتی۔ تمنچے اور کارتوس تو خاصے قیمتی تھے پھر ان کی اصل قیمت تو موقع و محل سے طے ہوتی ہے۔ قیمت کی بھی اتنی بات نہیں جتنی دستیابی کی ہے' کبھی بڑی پہیلیاں بوجھنے اور اندھی گلیوں کی بھول بھلیاں گزارنے کے بعد کہیں یہ حاصل ہوتے ہیں۔

پولیس کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد انجن سیٹیاں بجانے لگا۔ پلیٹ فارم کا ہجوم بھی سمٹ چکا تھا۔ گاڑی ایک جھٹکے سے چل پڑی۔ عورت کا ساتھی ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ عورت نے کئی بار گھونگھٹ کی اوٹ سے دروازے پر نظر کی۔ میں نے بھی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ دور دور تک پلیٹ فارم پر کوئی شخص ایسا دکھائی نہیں دیا جو گاڑی چھوٹنے پر کسی ڈبے کا پائدان چڑھنے کی کوشش کررہا ہو۔ گاڑی کی رفتار معمول پر آنے تک دروازہ کھلا رہا۔

نظام آباد شہر کی حدیں کب کی ختم ہوگئی تھیں کہ جمرو نے بٹھل کو عورت کی جانب اشارہ کیا۔ عورت اپنی پناہ گاہ میں کسی اضطرابی کیفیت سے دوچار تھی۔ لگتا تھا' سسک رہی ہے "ابھی سب ٹھیک ہے ری' اپنے ساتھ تجھ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔" بٹھل نے بے ربطی سے کہا۔

عورت کی سسکیاں اور تیز ہوگئیں تو بٹھل اٹھ کے اس کی نشست پر چلا گیا "نا نا' ایسا نہیں ری۔" بٹھل نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "اب یہ گٹھری اتار دے۔ کوئی نہیں آئے گا اب اور' اور وہ بھی شاید اب نہیں آئے تیرا۔۔۔!" بٹھل کی زبانی عورت کے ساتھی کے بارے میں یہ قطعی فیصلہ سن کے میرے کانوں کی لویں سلگنے لگیں۔ اس کے معنی یہی نکلتے تھے کہ جس عورت کی تلاش میں پولیس نظام آباد اسٹیشن پر پھیلی ہوئی تھی' وہ کوئی اور نہیں ہے۔ چند

ں کے لیے تو خود اپنے حواس میرے لیے بیگانہ ہوگئے۔

بٹھل نے اس کی کمر پر تھپکیاں دیں تو وہ ہچکیاں بھرنے
ی۔ اسے پردے اور گھونگھٹ کا بھی خیال نہیں رہا
ادھری کوئی پرایا نہیں' سمجھ لے سب تیرے اپنے ہیں' اور
م نے تجھ کو اوپر سے بھیجے گئے ان تیس مار خانوں کے سامنے
بچھ بولا تھا۔ سنا تھا تو نے؟"

عورت کا سارا بدن دھڑک رہا تھا۔ روتی ہوئی عورت
رد کے پتھر کے لیے ایک آزمائش ہے "جیسا ہم بولتے ہیں'
ی کو ٹھیک جان۔ اس سے آگے کو تیرے پاس اب ہے بھی
یا۔ چھلانگ مارنے کو ڈبے کا دروازہ ہے' پر ہم تجھ کو ایسا
میں کرنے دیں گے۔" بٹھل کی آواز میں بہت تپش تھی۔
یی تپش جس میں بڑی چھاؤں' بہت ٹھنڈک ہوتی ہے۔
ٹھل نے کہا "اس سے اچھا ہے تو اپنے کو ہم پر چھوڑ دے۔
ر آدمی کتا نہیں ہوتا۔"

عورت کا چہرہ میری جانب نہیں تھا۔ اس نے بٹھل کو
شک بار آنکھوں سے دیکھا ہوگا۔ میرے لیے یہ منظر دیدنی
ما۔ جب اس ناتواں نے بٹھل کے شانے پر اپنا سر ڈال دیا
ور بے تحاشا ہمکنے' بڑکنے لگی۔ اس کی شال فرش پر گرگئی
ھی۔ نیم رخ اب وہ میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ دمکتی
وئی بادامی رنگت' سیاہ بال' بڑی بڑی سراسیمہ سیاہ آنکھیں'
ستواں ناک' ترشے ہوئے ہونٹ' بھرے ہوئے خد و خال'
بچیس سے تیس کے درمیان اس خوش چہرہ کی عمر ہوگی۔
بٹھل نے کوئی بند کھول دیا تھا۔ ایک دریا سا اس کی آنکھوں
یں موجزن تھا۔ میں' جمرو اور زورا سن بیٹھے رہے۔

"اب کچھ نہیں ہوئے گا ری' ہم ادھری ہیں۔ تیرے
بدلے جائیں گے۔" بٹھل نے حتمی لہجے میں کہا اور نہ جانے
دھیمی آواز میں وہ اس سے اور کیا کچھ کہتا رہا۔

دوسرا اسٹیشن جلد ہی آگیا۔ تب تک عورت کی یہی حالت رہی پھر بٹھل کے ٹوکنے اور شانے سے جدا کرنے پر اسے کچھ ہوش آیا۔ بٹھل نے اس کی دل جوئی کا سلسلہ جاری رکھا۔ زورا اور جمرو نے بھی اسے اطمینان دلایا کہ وہ بالکل محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ گاڑی کسی چھوٹے اسٹیشن پر ٹھہری تھی کہ فوراً ہی چل پڑی۔ بہت دیر تک پھر [illegible]ل نے اس سے کلام نہیں کیا۔ وہ بھی بت بنی سر جھکائے بیٹھی رہی اور اس کے ثبات و قرار' اس کے ہوش و حواس کی یک جائی کا یقین ہوا تو بٹھل نے اس کا نام پوچھا۔

عورت نے دہشت زدہ نظروں سے بٹھل کو دیکھا اور سسکتے ہوئے ہونٹوں سے کچھ بتایا۔ اس کی آواز اتنی ہلکی تھی کہ میں سن نہیں سکا۔ بٹھل کے دہرانے پر معلوم ہوا کہ اس کا نام سلمٰی بانو ہے۔

"تو' تو ہندنی نہیں ہے ری؟" بٹھل نے تعجب سے کہا۔

عورت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا سر اور جھک گیا۔

"پھر' پھر یہ ٹیکا! بندی!"

"اس نے' اس نے۔۔۔" سلمٰی بانو کی پلکیں مرتعش ہوگئیں۔ اس کی آواز ہی گھٹ گئی۔

"اس نے ایسا بولا تھا۔" بٹھل نے کہا "کون ہے رے وہ تیرا؟"

"سلمٰی بانو نے کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہ سکی۔

"تیرا میاں ہے؟" بٹھل نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

سلمٰی بانو کے لیے جواب دینا پھر مشکل ہوا۔ اس طرح کی کوئی بھی عورت اتنی جلدی اجنبی مردوں کے سامنے زبان نہیں کھولتی۔

"اچ چھا' اچھا' ٹھیک ہے۔" بٹھل نے قدرے تامل کیا اور پوچھا "تیرا بھائی ہے؟"

سلمٰی بانو کا چہرہ پھر متغیر ہونے لگا۔

"دیکھ ری' ایسے گپ چپ میں دونوں کا گھاٹا ہوگا۔ اپنا بھی' تیرا بھی۔" اسے عواقب سے آگاہ کرنا اور باور کرانا ضروری تھا کہ ہم اسی صورت میں اس کے کسی کام آسکتے ہیں جب ہم سے کچھ ڈھکا چھپا نہ رہے۔ بصورت دیگر دونوں ہی کسی ناگہانی میں گھر سکتے ہیں' اور ہمارے لیے اتنا نہیں' یہ آدھا اعتماد بطور خاص اس کے لیے مزید الجھنوں' اذیتوں کا باعث ہوسکتا ہے۔ بٹھل نے اس سے کہا کہ وہ ایک پڑھی لکھی اور سمجھ بوجھ والی عورت معلوم ہوتی ہے۔ امکان تو نہیں ہے لیکن اگلے کسی اسٹیشن سے پھر سامنا ہوسکتا ہے اور ضروری نہیں کہ ہر بار اسی طرح نجات مل جائے۔

سلمٰی بانو کو بھی اس کا احساس ہوگا۔ اس کے چہرے کا رنگ' ہاتھوں کا اضطراب اور سانسوں کا زیر و بم یقیناً اندرونی خوف' حجاب یا حوصلے کی کمی کا مظہر تھا۔ نئے گرد و پیش سے مطابقت کے لیے اسے ایک مہلت تو چاہیے تھی۔ کبھی لفظ بھی کھو جاتے ہیں۔ ناگفتنی اور کسے کہتے ہیں؟ عرض مدعا کی مقدرت بھی ہر کس و ناکس کو نہیں ہوتی۔ یہ تو مدعا کی نوعیت پر بھی منحصر ہے۔

"کدھری جاتا ہے تجھ کو؟" بٹھل نے نرم لہجے میں پوچھا۔

سلمٰی بانو نے کچھ ہمت مجتمع کی اور کہا کہ دلی سے آگے

کسی بھی شہر میں۔
سلمٰی بانو نے بمشکل بتایا کہ اس کے ساتھی نے اس سے یہی کہا تھا۔
"تیرا گھر کدھری ہے ری؟" بٹھل نے الجھ کے پوچھا۔
"اب' اب کوئی گھر نہیں ہے۔" سلمٰی کی آواز بھرا گئی۔
"دیکھ ری! صاف صاف بول۔"
"ہاں بہنا! اپن کو پتہ ہے۔ ابھی تم کو یہ سارا بولنا کیسا بھاری ہے پر ٹیم ایک دم نئیں ہے۔ آگے اسٹیشن کسی ٹیم پر بھی آسکنے کا ہے۔ ابھی چپ رہے گا اور ٹھیک ٹھیک اپن کو نئیں بولے گا تو اپن سے کوئی بھی الٹ پلٹ ہو سکتا ہے' سمجھا!" زورا نے شفیق لہجے میں سلمٰی بانو کو جتانے کی کوشش کی۔
سلمٰی نے کچھ کہا تو نہیں' ایک ذرا پہلو بدل کے اس نے اپنے لباس میں کہیں دائیں طرف سے ایک بڑی سی پوٹلی نکال کے بٹھل کے سامنے کردی۔
"یہ' یہ کیا ہے؟" بٹھل نے حیرت سے کہا۔
"آپ' آپ' دیکھ لیں۔" سلمٰی زیر لبی سے بولی۔
"پر کیا ہے ری یہ؟"
"یہی تو' یہی تو۔۔۔" اس سے کچھ نہ کہا جاسکا۔
بٹھل نے کھدر کی پوٹلی اس کے ہاتھ سے اچک لی اور کچھ اوپر اٹھا کے اس کے وزن کا اندازہ کیا اور ہلا کے دیکھا۔ پوٹلی بھاری تھی اور کھنک رہی تھی۔ بٹھل نے اس کا بند کھول کے اپنے کرتے کے دامن میں لوٹ دی۔ جمرو' میں اور زورا اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ زرو جواہر کا ایک انبار بٹھل کے دامن پر بکھر گیا تھا۔ ترشے ہوئے ہیروں کی چمک آنکھیں خیرہ کررہی تھی۔ بٹھل نے مٹھی بھری اور واپس لوٹ دی "یہ' یہ کیا ہے ری! یہ تو بہت زیادہ ہے۔ یہ کدھری سے لیا تونے؟" زورا کی مدد سے بٹھل نے جواہر پوٹلی میں واپس بھرے اور گانٹھ لگادی "سنبھال کے رکھ ان کو۔" بٹھل نے سلمٰی بانو کی طرف پوٹلی بڑھاتے ہوئے کہا۔
"یہ میرے نہیں ہیں۔" سلمٰی نے آہستگی سے کہا۔
"پھر کس کے ہیں ری؟"
"آپ انہیں رکھ لیں۔"
"ہم رکھ لیں' ہم کیوں؟" بٹھل ناگواری سے بولا "ایسا کیسے۔ ہم کو ان کی کوئی ضرورت نہیں' اور تیرے پاس یہ زیادہ ٹھکانے سے رہیں گے۔"
"آپ انہیں رکھ لیجیے۔" سلمٰی بانو نے دوبارہ کہا۔ اس بار اس کی التجا میں قوت زیادہ تھی۔

"کیا' کیا بولتی ہے! کدھری سے لائی ہے یہ سارا۔ بچھو ہیں ری۔"
سرنگوں سلمٰی بانو بری طرح سسکنے لگی "مجھے بھی چاہئیں یہ۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں' یہ سانپ بچھو ہی ہیں" سلمٰی بانو کی حالت اضطراری ہوگئی تھی۔ اس کی آنکھوں مسلسل آنسو امڈ رہے تھے۔
"پھینک دیں ری پھر ان کو؟"
"آپ جیسا چاہیں' جو آپ کی مرضی ہو۔"
"کیسی ہے ری تو۔۔۔"
"میں چور نہیں ہوں' خدا جانتا ہے' میں چور ہوں۔" سلمٰی بانو سراسیمگی سے بولی۔
"کون بولتا ہے سسرا' ہم کو پتہ ہے' تو ہو بھی نہیں سکتی۔ اس کا دم اور ہوتا ہے۔ پر' پر یہ کیا ہے پھر؟"
"یہ چوری کے ہیں اور' اور چوری بھی۔۔۔" وہ بین کرنے لگی اور اس نے اپنا منہ چھپالیا۔
"تونے ہی کی ہے۔ اس حرام کے جنے کے بولنے پر تجھ کو اکیلی چھوڑ گیا ہے۔ ایسا ہی نا؟"
"جی' جی۔" سلمٰی بانو پھٹی پھٹی آنکھوں سے بولی "اس نے زور دیا تھا' اسی نے مجبور کیا تھا۔ میں نے بہت منع کیا' بہت منع کیا۔ میں تو پانچ برس سے انکار کررہی تھی۔"
"پانچ برس سے!" بٹھل کی تیوری چڑھ گئی "دیکھ اپنے کو چاپ چاپ کے بولنا اچھا نہیں لگتا۔ جو بولنا ہے سیدھی طرح بول۔"
میں' زورا اور جمرو قریب کی نشست پر بیٹھ گئے۔ شروع میں سلمٰی بانو کی زبان اٹک رہی تھی لیکن پھر اس کی استقامت استوار ہوتی گئی۔ اس دوران اس نے اتنا تو سمجھ لیا ہوگا کہ وہ جانوروں کے نرغے میں نہیں ہے۔ اس کی آواز کی لرزش سینے کی سوختگی کے بغیر ممکن نہیں تھی' چھلکتی ہوئی آواز۔ چہرے پر گھٹا سی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کا تعلق روہیل کھنڈ کے شہر پیلی بھیت کے ایک زمیندار گھرانے سے ہے۔ شملے میں تعلیم کے دوران اس کے باپ نے لاہور کے کسی بڑے خاندان کی لڑکی سے شادی کرلی۔ لڑکی کے والدین بادل ناخواستہ تیار ہوئے تھے۔ سلمٰی کا باپ اپنی بیوی کو لے کر پیلی بھیت شہر واپس آیا تو اس کے کلاہ بھائی بہنوں نے باہر کی بہو اور اس طرز کی شادی قبول نہیں کی اور ایک طرح سے سماجی انقطاع کرلیا۔ ناچار سلمٰی کے باپ نے اپنے حصے کی جاگیر اور زمینوں کا مطالبہ کر کے خاندان سے الگ ہونا چاہا تو بھائیوں نے باہر سے لائی ہوئی

رت سے دستبردار ہونے کی شرط عائد کی۔ خاندان کے ارے چھوٹے بڑے اس کے خلاف سینہ سپر ہوگئے۔ انہوں نے قدم قدم پر اپنے منحرف بھائی کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کیں' الغرض سکون کی زندگی اس کے لیے محال بنا دی۔
بات عدالت تک پہنچی۔ عدالت کے اپنے مرحلے ہوتے ہیں۔ عدالت تو کسی کارخانے کے مانند ہوتی ہے۔ سو مرحلوں سے گزر کے انصاف کہیں صورت پذیر ہوتا ہے۔ طرح طرح کی قانونی' موشگافیوں' سخن طرازیوں سے بد دل ہو کے آخر سلمٰی کے باپ نے اپنا آبائی شہر ترک کیا اور دلی آ کے بس گیا۔ تھوڑے بہت اندوختے سے اس نے لال کنویں کے علاقے میں ایک چھوٹا سا گھر خریدا اور باقی پیسہ تجارت میں جھونک دیا۔ اس نے کئی کاروبار کیے لیکن تجارت کا نہ تو کوئی تجربہ تھا نہ مزاج سے مناسبت تھی۔ سو وہ ناکام رہا اور کشاکش روزگار میں دق کا مریض ہوگیا۔ وہ حساس اور غیرت مند شخص تھا۔ دق ہی مرض الموت ثابت ہوا۔ اس نے ترکے میں اپنے جواں سال بیٹے شہریار' نوخیز بیٹی سلمٰی اور قسمت گزیدہ بیوہ جہاں آرا کے لیے ایک ویران گھر چھوڑا تھا۔ اس کے انتقال کے وقت سلمٰی کی عمر پندرہ اور شہریار کی بیس سال کے قریب تھی۔ باپ کے بعض اوصاف بیٹے کو وراثت میں ملے تھے۔ خودداری اور عزت نفس کے اوصاف۔ گھربار چلانے کے لیے تعلیم چھوڑنا لازم تھا۔ ادھر ماں باپ نے اپنے خاندان کے جور و ستم کی آگ اس کے سینے میں کب سے فروزاں کی ہوئی تھی۔ ادھوری تعلیم کی وجہ سے شہریار کو معقول ملازمت نہیں ملی اور ملازمت اس نووارد بساط کی طبع نازک سے کوئی میل بھی نہیں کھاتی تھی۔ اس نے تجارت شروع کی بے سرمایہ تجارت عموماً شرمندگی سے دو چار کرتی ہے۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر اس نے ضروریات کی اشیاء کا خوانچہ بھی لگایا کہ ممکن ہے' اسی راستے پر کل کامیابی کا سورج طلوع ہو۔ وہ تو باپ سے زیادہ ناتجربہ کار تھا۔ اسے پھر ملازمت کرنا پڑی۔
ماں نے دوسروں کے گھر کام کاج کر کے کچھ لانا شروع کردیا تھا۔ مناسب پڑھی لکھی تھی اس لیے محلے کی بچیوں درس و تدریس سے بھی کچھ آمدنی ہونے لگی۔ زری کا کام بھی اس نے سیکھ لیا تھا۔ سلمٰی بھی اس کا ہاتھ بٹانے لگی۔ سلمٰی گھر پہ باقاعدگی سے پڑھتی تھی اور اس نے کلام پاک کب کا مکمل کرلیا تھا جیسے تیسے بہرحال ان کی گزر بسر ہوتی رہی۔ بہن کی دیکھا دیکھی بھائی نے بھی تعلیمی سلسلہ جاری رکھنے کی کوشش

کی لیکن نہ تو وہ مزید تعلیم حاصل کرسکا نہ ٹھیک سے زمین پر اپنے قدم جما سکا۔ سلمٰی نے پرائیویٹ طور پر پہلے ہائی اسکول' پھر انٹرمیڈیٹ کا امتحان دیا۔ پاس پڑوس کے گھروں سے اس کے متعدد پیام آئے لیکن ماں کو اپنا خاندانی پس منظر بہت یاد آتا تھا اور وہ کسی اچھے دن کی آس میں تھی۔ پر خواب الگ چیز ہے۔ تعبیر الگ چیز۔ اس زمانے میں سلمٰی کے بھائی کے ایک پختہ کار دوست ارشاد علی کی آمدورفت خوب ہوگئی تھی۔ ابتدا میں سلمٰی اس سے پردہ کرتی تھی۔ بعد میں ارشاد علی کی دقت بے وقت آمد اور گھریلو معاملات میں غیر معمولی عمل دخل کی وجہ سے پردہ برقرار نہ رہ سکا۔ ارشاد علی نکتہ رسی و دیدہ ریزی میں طاق تھا۔ دل داری و اشک شوئی کا فن بھی اسے اچھا آتا تھا۔ زبان میں لوچ تھا' لہجے میں تپاک۔ نرم خوئی شیوہ تھی۔ صاف ستھرا لباس پہنتا تھا' صاف ستھری باتیں کرتا تھا۔ ہر کام کے لیے ہمہ دم آمادہ' ہر مشکل کا ایک حل اس کے پاس موجود ہوتا تھا مگر ارشاد علی جیسے جاں فشاں' سرگرم دوست کی قربت کے باوجود روز بہ روز بڑھتی ہوئی دھوپ اور بڑھتے ہوئے اندھیرے نے شہریار کا چہرہ دھندلا دیا۔ ارشاد علی کی پیہم ترغیب اور حوصلہ افزائی پر اس نے باپ کی جاگیر پہ جاکے اپنا حق طلب کرنے کی ٹھانی۔ وقت کی گردشوں میں اس کے چچاؤں کا خون اور سفید ہوگیا تھا۔ کہتے ہیں' دولت ہمیشہ نشے میں ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنے بھتیجے کو کسی اعتنا کے لائق نہیں سمجھا اور بری طرح دھتکار دیا۔ آگ تو شہریار کے جسم و جاں میں ایک زمانے سے بھڑک رہی تھی۔ یہ ذلت و ہزیمت اس پر مستزاد تھی۔ پے در پے شکستوں نے اسے مجہول اور قنوطی بنا دیا تھا۔ ایک روز اس نے اپنے بڑے چچا کی بدسلوکی پر بندوق اٹھالی اور بے دریغ گولی چلا دی۔ وہ گرفتار کرلیا گیا۔ عدالت میں کئی برس مقدمہ چلا۔ ماں نے اونے پونے مکان بیچ کے وکیلوں کے اخراجات بھگتائے۔ بڑے بڑے حاکموں کے در پر جاکے عرضیاں گزاریں' بہت داد و فریاد کی' دامن پھیلایا۔ کوئی تدبیر کارگر ہوئی نہ دعا مستجاب۔ شہریار کو پھانسی کی سزا سنادی گئی۔

ارشاد علی ہر مرحلے پر سلمٰی کی ماں کے ساتھ رہا تھا لیکن وہ بھی ایک تہی دست شخص تھا۔ واللہ اعلم' اس کے کہنے کے مطابق ایک دفعہ تو اس نے اپنے عزیز از جاں' برادر مثال دوست شہریار کے مقدمے میں الٰہ آباد ہائی کورٹ کے وکیل کی خطیر فیس چوری کرکے ادا کی تھی۔ اکلوتے بیٹے کے صدمے سے جہاں آرا دیکھتے دیکھتے کھنڈر ہوگئی۔ اندر ہی اندر وہ گھلتی رہی۔ اسے اپنی جوان بیٹی کی بھی کوئی فکر نہ رہی۔ چار مہینے اس نے بیٹے کی جدائی میں بتائے اور کسی سے کچھ کہا سنا' ایک رات چپکے سے بیٹے کے پاس چلی گئیں۔

پھر ایک ارشاد علی' ایک وہی سایہ' چارہ گر و دم ساز سلمٰی بانو کے لیے باقی رہ گیا تھا۔ ارشاد علی عمر میں اس سے خاصا بڑا تھا۔ سلمٰی بانو نے کبھی سوچا تک نہ تھا کہ ایک روز ناشدنی و ناکردنی بھی پیش آئے گی۔ ارشاد علی بھائیوں کی طرح گھر آتا تھا۔ جہاں آرا کی زندگی میں اشارتاً بھی اس نے کبھی اس خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا۔ مہربان' درد آشنا نے غم گساری کا یہ طور اختیار کیا کہ سلمٰی بانو کو شادی کی پیشکش کردی۔ سلمٰی بانو میں اب کسی حیرت اور غم کی استطاعت نہ تھی۔ انکار تو دور کی بات ہے۔ خودکشی کا ایک راستہ لیکن خودکشی تو وہ ستم کش کرتے ہیں جن کے ہاں زندگی پر غور کرنے کے لیے کچھ بچا ہوتا ہے۔ سلمٰی بانو کا تو کوئی مدعا' کوئی مطالبہ ہی نہیں رہا تھا۔ یہ دنیا عورتوں کے لیے شاید بنی نہیں۔ ایک مرد تو یہاں تنہا رہ سکتا ہے' کوئی عورت اور جوان عورت بالکل نہیں رہ سکتی۔ ماں کے چلے جانے کے بعد اردگرد والے چیل کوؤں کی طرح منڈیروں پر منڈلانے لگے۔ ارشاد علی نے وہ محلّہ ہی چھوڑ دیا اور کئی بستیاں دور جا کر سلمٰی کو محفوظ کیا یا محبوس کردیا۔ درد مندی کا دعوا کرنے والوں میں کسی ایک معتبر کا انتخاب کیا جاسکتا تھا۔ ہجوم میں کوئی ایک وفا پیشہ' قول و فعل کا پائیدار تو ضرور ہوگا۔ یہ دنیا ابھی اتنی جہنم بھی نہیں ہوئی ہے۔ پھول ابھی تک کھلتے ہیں خوشبو کے ساتھ۔

تنہائی بہت بڑا عذاب ہے اور بے اختیاری سب سے بڑی تنہائی' نوجوان سلمٰی اس دنیا سے بہت سہم گئی تھی۔ حسن و جمال کی حامل عورتوں کو تو یوں بھی دریچوں' روزنوں سے محتاط رہنا چاہیے۔ حسن و جمال بھی خزانے کے مانند ہے' سانپ بٹھانے پڑتے ہیں اور سایوں پر شک کرنا پڑتا ہے۔ ارشاد علی بھی دنیا کی نیرنگیوں اور شعبدہ کاریوں کے فسانے سلمٰی بانو کو بہت شد و مد سے سنایا کرتا تھا۔ ایک دن عصر کے بعد وہ محلے کے چند اجنبی لوگوں اور ایک قاضی کو گھر لے آیا پھر اسے سلمٰی کو تصویر کے دوسرے رخ' زندگی آمیز اور زندگی آموز قصے کہانیاں سنانے کی ضرورت پڑگئی۔ زندگی کا یہ ہے کہ کسی نہ کسی طور اپنی حیثیت پر مصر رہتی ہے۔ اہل عرفان کامل کے باوجود کہ مال کیا ہے' آدمی زندگی کی ترغیبوں یا اس کے بہکائے میں آجاتا ہے۔ موت کا خوف شاید بہت زیادہ ہوتا ہے کہ آدمی کانٹوں پر رات بسر کرلیتا ہے اور سورج کے غروب ہونے کے آسرے میں شعلہ بار دن گزار دیتا ہے۔

اندھوں کو بھی ایک کنارہ تو ضرور دکھائی دیتا ہے۔

ارشاد علی کو جانے کہاں سے کوئی دفینہ ہاتھ لگ گیا تھا کہ دو ایک مہینے بعد وہ سلمٰی کو مسوری اور نینی تال کے کوہساروں میں لے گیا' وہاں سے لکھنؤ' کان پور' جے پور کی سرگشت میں کئی ہفتے گزار کے اس نے حیدر آباد دکن کے لیے کوچ کیا اور وہیں پڑاؤ ڈال دیا۔ سلمٰی بانو نے کبھی اس سے کہیں ٹھہر جانے کو کہا تھا نہ چل پڑنے کو۔ وہ ارشاد علی سے کوئی فرمائش کرتی تھی نہ شکوہ۔ وہ اپنے ہی پیروں سے چلتی تھی لیکن اپنا کوئی ارادہ نہ منزل۔ وہ آئینہ بھی دیکھتی تھی لیکن آئینے کی داد کی فکر نہ بے دادی کی۔

حیدر آباد میں کچھ دن خاموشی سے گزار کے ارشاد علی نے سلمٰی بانو سے کہا کہ اب وہ بالکل قلاش ہوگیا ہے۔ زندگی بسری کے لیے کوئی معقول کام بھی سردست ہاتھ نہیں آرہا' اب سلمٰی بانو کچھ اس کا ساتھ دے۔ یہ حیدر آباد نواب راجاؤں کا شہر ہے۔ یہاں ان کی بڑی بڑی حویلیاں' محل دو محلے ہیں۔ دولت کی بہت ریل پیل ہے۔ انہوں نے ذرا احتیاط اور عقل سے کام لیا تو یہاں سے ایک نئی زندگی شروع کرسکتے ہیں۔ انہوں نے آخر کیا گناہ کیا ہے۔ کس جرم کی پاداش میں ان کے لیے زندگی کا یہ طور ہے۔ کیا یہی کسمپرسی و بے بسی مقدر رہے گی۔ اب کسی اور طرح بھی سوچنا چاہیے۔ یہ دنیا غریبوں اور ناداروں کے لیے نہیں ہے۔ یہ طاقت والوں کے لیے ہے اور طاقت صرف مال و دولت کی ہوتی ہے۔ بادشاہ غریب ہوجاتے ہیں تو تخت سے اتار دیے جاتے ہیں۔ ارشاد علی نے سلمٰی بانو سے کہا کہ شہریار کا غم اسے چین نہیں لینے دیتا۔ شہریار تو جیسے اس کے سینے میں دفن ہے۔ وہ اچانک سامنے آکے کھڑا ہوجاتا ہے اور کہتا ہے' دوست! تم تو بس تماشائی بنے رہے۔ شہریار کی وجہ سے اماں بھی چلی گئی۔ وہ اس کی ماں بھی تو تھی۔ اب اس کی ایک ہی تمنا ہے کہ جو کام شہریار سے نہ ہوسکا' اسے وہ انجام دے' تبھی شاید شہریار اور ماں کی روحوں کو کچھ قرار آئے۔ ایک روز وہ سلمٰی کے باپ' اپنے خسر کی جاگیر پہ ضرور جائے گا اور شہریار کی طرح نہیں۔ اسے اندازہ ہے کہ وہاں جاتے ہوئے شہریار کے پاس کس چیز کی کمی تھی۔ ارشاد علی اس کوتاہی کا اعادہ نہیں کرے گا۔ حق نہیں ملتا تو چھین لینا چاہیے مگر چھیننے کے لیے ایک تحمل شرط ہے۔ اس کے دماغ میں ایک تدبیر ہے۔ سلمٰی کا کام یہ ہے کہ وہ اس کی ہدایت پر عمل کرتی رہے اور یقین رکھے کہ ایک دن ضرور ایسا آئے گا جب تیر بھی ان کے ہاتھ میں ہوں گے' کمان بھی۔ ارشاد علی نے بتایا کہ ایک بزرگ شناسا نے اس کی درخواست پر ریاست کے ایک مشہور نواب کے زنان خانے میں خادمہ کے طور پر سلمٰی کی ملازمت کے لیے بات کی ہے۔ سلمٰی کو وہاں اپنے حسن خدمت' سلیقہ شعاری اور پارسائی کے نقش ثبت کرنے ہیں اور خاطر جمع رکھنی ہے کہ ایک روز اسے اپنے گھر واپس آنا ہے۔ ایسے گھر میں جو اپنے مکینوں سے عداوت نہ رکھتا ہو' آندھیوں اور بلاؤں سے محفوظ ہو' جہاں زندگی ان کے اشاروں کی مرہونِ منت ہو۔

ارشاد علی نے سلمٰی کو تاکید کی کہ اس نے بوجوہ سلمٰی سے اپنے ازدواجی رشتے کے بارے میں اپنے شناسا کو نہیں بتایا ہے۔ سلمٰی کو بھی نواب کی حویلی میں ارشاد علی کے متعلق یہی تاثر دینا ہے۔

سلمٰی نے ارشاد علی سے کوئی جرح نہیں کی۔ وہ سر جھکائے سنتی رہی اور اگلے روز ارشاد علی نے اپنے مربی کے ہمراہ حویلی کا رخ کیا تو چوں و چرا کیے بغیر وہ ان کے ساتھ چلی گئی۔

حویلی کی دنیا ہی اور تھی۔ چاروں طرف سبزہ زار کے وسط میں دودھیا مائل سرمئی رنگ کے پتھروں سے بنی ہوئی ایک وسیع و عریض عمارت' حوض' فوارے' منقش در و بام' قالین' زرنگار پردے' فانوس۔ حویلی میں ریشم اور شیشے کی افراط تھی۔ اور پھولوں سے مکینوں کو خاص شغف تھا۔ وہاں دھوپ مکینوں کی اجازت سے در آتی تھی۔ پریوں کے دیس کی بہت سی کہانیاں سلمٰی نے سنی اور پڑھی تھیں۔ حویلی میں صرف پریاں نہیں تھیں' باقی سب کچھ پریوں کے دیس جیسا تھا۔ سلمٰی کو وہاں تازہ ہوا کا احساس ہوا۔ جیسے آنکھ کھل جائے اور کوئی رنگین خواب آمادہ تعبیر ہو۔

سلمٰی نے حال ہی میں شہروں' شہروں ارشاد علی کی ہم سفری میں جانے کتنی طلسماتی اشیا اور عمارتیں دیکھی تھیں مگر اشیا آدمی کا بدل کہاں ہوتی ہیں۔ عمارتوں کی شان و شوکت سے مراد آدمی کی آسودگی نہیں ہے۔ سو اس نشاط خاطر کا سبب حویلی کی نادر و نایاب اشیا کی سحرکاری نہیں تھا۔ اصل تو حویلی کے مکین تھے۔ شستہ و شائستہ' خوش وضع و خوش گفتار۔ وہ اونچی آواز میں بات نہیں کرتے تھے۔ زنان خانے میں حویلی کی معزز خواتین کی حکومت تھی۔ ان کے گرد محکوم باندیاں چہچہاتی پھرتی تھیں۔ زنان خانے میں معدودے چند خاص خاص مردوں کا گزر ہوتا تھا۔ شروع شروع میں وہاں سلمٰی کو کچھ اجنبیت محسوس ہوئی تھی مگر رفتہ رفتہ وہ در و دیوار سے اور در و دیوار اس سے مانوس ہوگئے۔

سلمیٰ بانو کے انکسار' حجاب' کم سخنی و نرم خوئی' سلیقہ شعاری و مستعدی نے زنان خانے کی مالک و مختار خواتین کو جلد ہی اس کا گرویدہ کردیا۔ یہ بات حویلی کی پرانی خادماؤں کو بہت ناگوار گزری لیکن سلمیٰ کی بے نیازی اور بے غرضی سے الٹا انہیں شرم سار کیا۔ بعد میں تو وہ سلمیٰ سلمیٰ کا درد کرنے لگیں۔ سلمیٰ نے نہیں بتایا لیکن قیاس کیا جاسکتا تھا' خوش اطواری اپنی جگہ' حویلی میں سلمیٰ کی قبولیت اور پذیرائی میں کچھ اس کی خوش رخی و خوش اندامی کو بھی دخل ہوگا۔ حویلی کے مرصع و مسجع ایوانوں سے اس کے تاب ناک چہرے' قامت زیبا' رفتار گفتار کی بڑی مناسبت ہوگی۔ وہ تو حویلی ہی کا حصہ معلوم ہوتی ہوگی۔ خوش روئی کا ظاہری وصف اضافہ ہی ہوتا ہے۔ اتنے صدموں کی تپش کے بعد حویلی کی لطیف' عطر بیز ہواؤں میں اس کا روپ اور نکھر جانا چاہیے۔ وہ تو وہاں ویسے بھی بہت سوں میں ممتاز ہوگی۔ تمکنت تو اب بھی اس کے چہرے پر خوب تھی۔

آدمی کو کبھی خود احساس نہیں ہوتا کہ کون سا رنگ آنکھوں کے لیے خار ہے اور کون سا کلام سماعت کے لیے آزار اور لوگوں کا بھی یہی ہے' کون سے لوگ سینے میں گھٹن کرتے ہیں۔ ان کے دور ہوجانے ہی پر ان کی گراں باری کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ حویلی میں آکے سلمیٰ بانو کو معلوم ہوا کہ ارشاد علی تو کابوس کے مانند تھا۔ وہ تو اس کے لیے کوئی پنجرا تھا۔ ماں اور شہریار کی یاد اسے بہت رلاتی تھی لیکن کبھی زندہ آدمی کا غم مرنے والے سے کہیں شدید ہوتا ہے۔ ارشاد علی کا خیال سلمیٰ کے لیے زیادہ سوہان روح تھا۔

تین مہینے گزر گئے۔ ارشاد علی' سلمیٰ کی خیر خبر لینے نہیں آیا۔ زبان سے نہیں تو دل ہی دل میں جانے کتنی بار سلمیٰ نے دعا کی کہ خدا کرے' اب ارشاد علی کبھی نہ لوٹے۔ حویلی کی بیگمات اور سلمیٰ کی ساتھی باندیوں نے کئی مرتبہ اس کا ماجرا جاننے کی جستجو کی۔ ارشاد علی کے تعلیم کیے ہوئے آموختے کے مطابق سلمیٰ نے پوری احتیاط کی اور دلی کے بجائے پانی پت سے تعلق ظاہر کیا اور صرف خلاصہ بیان کرنے پر اکتفا کی کہ سر پہ ماں باپ میں سے کوئی نہیں ہے۔ صرف ایک بھائی ارشاد علی ہے۔ ہر بار وہ اسی بیان کی تکرار کرتی رہی۔ اس نے اپنی تعلیم کے بارے میں بھی زیادہ کچھ نہیں بتایا' بس اتنا کہ حرف شناسی کی معمولی شد بد رکھتی ہے مگر علم بھی مشک کے مانند ہوتا ہے۔ اس کے رکھ رکھاؤ' ٹھہراؤ' معاملہ فہمی' جز رسی اور نفاست و نزاکت نے حویلی کے مکینوں کو حیران کن مسرتوں سے دوچار کیا تھا۔ ہر ایک کی کوشش ہوتی تھی کہ سلمیٰ اس کی جناب میں حاضر رہے۔ وہ اسے قیمتی ملبوسات' زر نقد' خوشبوؤں اور زیوروں سے نوازتی تھیں۔ یہ تحائف سلمیٰ انہی کی تحویل میں دے دیا کرتی تھی کہ جب ضرورت ہوگی' وہ انہیں واپس لے لے گی۔

تین ماہ سے کچھ دن اوپر ہوئے تھے کہ ایک شام اسے حویلی میں ارشاد علی کی آمد کی خبر دی گئی۔ سلمیٰ کے بقول اس کا دل دھڑ دھڑانے لگا۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ مفر کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اسے ارشاد علی کے روبرو حاضر ہونا پڑا۔ توقع کے خلاف ارشاد علی نہایت متانت سے پیش آیا۔ اس نے حویلی میں سلمیٰ کا جی لگنے اور حویلی کے مکینوں کی نگاہ میں سلمیٰ کی قدر و منزلت پر شکر ادا کیا اور کہا کہ بس وہ اسی خوش اسلوبی سے حویلی میں کچھ عرصہ اور گزار دے۔ اپنے بارے میں ارشاد علی نے بتایا کہ وہ ہر سمت ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ حیدر آباد سے وہ بمبئی چلا گیا تھا۔ وہاں کسی کی شراکت میں تھوڑا بہت کاروبار شروع کیا تھا اور فریب کھا گیا۔ جو ہاتھ میں تھا' وہ بھی گنوا دیا۔ ارشاد علی نے سلمیٰ بانو کی ماں اور بھائی کے لیے پھر اپنے حسرت و الم' کرب و اضطراب کا اظہار کیا۔ شہریار کے ذکر پر ارشاد علی کی آنکھیں بھر آئیں اور آواز جلنے لگی۔ اس کے جذبہ و جوش کا وہی عالم تھا کہ چاہے کچھ ہوجائے' ایک دن اسے سلمیٰ کا گھر اجاڑنے والوں کے پاس ضرور جانا ہے۔ وہ اسی لیے ایڑیاں رگڑ رہا ہے۔ وہی جانتا ہے کہ سلمیٰ کی جدائی اس پر کیسی شاق گزرتی ہے۔ اس کا تو اب کوئی گھر ہے نہ در۔ اس نے خاکستر کرید کے سلمیٰ کو اور بے حال کیا۔ اس کی آہ زاری میں ایسا تاثر تھا کہ ایک بار تو سلمیٰ بھی متزلزل ہوگئی۔ اس کے جی میں آئی کہ خنجر لے کر نکل کھڑی ہو اور اپنی آبائی جاگیر پر جاکے دم لے۔ اس جاگیر کا اس نے ذکر ہی سنا تھا' دیکھی کبھی نہ تھی۔ سلمیٰ بانو نے خود پر جبر کیا اور آنسو بہا کے رہ گئی۔ ارشاد علی ایک پہر ٹھہر کے واپس چلا گیا۔

دوسری مرتبہ وہ خاصے طویل وقفے بعد آیا۔ اس کا حال ایسا شکستہ نہیں تھا۔ سلمیٰ نے کچھ نقدی اور حویلی کے عطا کردہ تحائف اس کے حوالے کرنے چاہے۔ ارشاد علی نے انہیں ہاتھ نہیں لگایا' کہنے لگا کہ یہ سلمیٰ کے پاس زیادہ محفوظ رہیں گے۔ وہ انہیں سنبھال کے رکھے۔ اگلی منزلوں میں کام آئیں گے۔ وہ اپنی گزر اوقات کسی طرح کرلیتا ہے۔ جس روز ستارے مہربان ہوگئے اور وہ اپنی مساعی میں کامیاب ہوگیا' سلمیٰ کو یہاں سے لے جائے گا۔ اس نے سلمیٰ کے تئیں حویلی کے مکینوں کے رویے کے بارے میں پوچھا۔ سلمیٰ نے ازراہ احتیاط انکسار سے کام لیا کہ وہ بہ قدر توفیق اپنی سی کرتی ہے۔ بہ ظاہر تو سبھی مطمئن نظر آتے ہیں' دلوں کا حال خدا جانتا ہے۔ وہ بہرحال ایک باندی ہے اور اپنی حد سے تجاوز نہیں کرتی۔ ارشاد علی آہ بھر کے بولا' اسے اس تلخ حقیقت سے اچھی طرح آگہی ہے کہ یہ تو ایک مستقل ایثار ہے۔ ہر ایثار ایک مشقت' ایک جبر ہے لیکن یہی ایک راستہ ہے اور یہ تو ایک مرحلہ ہے۔ سلمیٰ کو یہی جفاکشی کرتے رہنا ہے۔ خدمت سے قرب عبارت ہے۔ قرب' اعتماد کی علامت ہے' اور اعتماد سے مراد ہے کہ ان کی منزل دور نہیں ہے۔ ارشاد علی نے نمک پاشی کی کہ سلمیٰ تو خود گواہ ہے۔ دہائیوں سے انصاف نہیں ملتا۔ سلمیٰ کو یہ نکتہ ہر دم پیش نگاہ رکھنا ہے کہ وہ ایک مقصد سے حویلی میں موجود ہے اور اس پر کئی قرض واجب ہیں۔ کچھ صاف تھا اور بہت کچھ مبہم و موہوم۔ ارشاد علی کے لفظ پہلو دار تھے اور لہجہ بین السطور کے مانند رمز آمیز تھا۔ سلمیٰ کشمکش میں پڑ گئی۔ ارشاد علی نے مزید صراحت نہیں کی۔ سلمیٰ نے بھی خاموشی میں مصلحت جانی کہ مبادا عقدہ کشائی بہت زہریلی ہو۔ دوسری سانس میں ارشاد علی سمائی سے باہر کوئی بات نہ کہہ دے۔ ارشاد علی اسے حیرت زدہ' خوف زدہ چھوڑ کے چلا گیا۔ کئی دن تک وہ گم صم رہی اور اپنے طور پر گرہیں کھولتی رہی۔ جتنا وہ سوچتی تھی' اتنا ہی اسکا دل ڈولنے ہونے لگتا تھا۔ دن گزر گئے۔ ارشاد علی واپس نہیں آیا تو سلمیٰ کو کچھ چین نصیب ہوا۔ اس سکون کی وجہ کچھ اس کی اپنی استواری بھی تھی۔ اسے اپنا عزم پختہ کرنے کا اچھا وقت مل گیا تھا۔

سلمیٰ کو حویلی میں ٹھہرے ڈیڑھ سال ہوگیا تھا۔ کئی ماہ بعد ارشاد علی خستہ حالت میں اس کے پاس آیا۔ سلمیٰ نے طے کرلیا تھا کہ اگر اس نے کوئی ایسی ویسی ہدایت دی تو وہ صاف انکار کردے گی مگر ارشاد علی کے سامنے جانے پر سب کچھ گڈ مڈ ہوگیا۔ ارشاد علی نے بتایا کہ اسے ایک سودے میں بہت بڑا گھاٹا ہوگیا ہے۔ کاروبار شاید اسے راس نہیں ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا' کون سی چوک ہوجاتی ہے۔ جلد سے جلد زیادہ پیسہ سمیٹنے کی جستجو میں یا تو وہ بروقت فیصلے نہیں کرپاتا یا اسے آدمی کی پہچان نہیں ہے۔ لوگ اسے دھوکا دے جاتے ہیں۔ سلمیٰ کو پہلی بار اس پر ترس آیا۔ اس نے جمع کی ہوئی ساری نقدی اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ ارشاد علی نے دبے لہجے میں کہا کہ یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ سلمیٰ کے پاس بیگمات کے عطا کیے ہوئے چھوٹے موٹے زیور محفوظ تھے۔ وہ بھی اس نے ارشاد علی کی نذر کردیے۔ ارشاد علی کی تسلی نہیں ہوئی۔ سلمیٰ پر بیگمات کی خاص توجہ اور عنایات تھیں۔ وہ اگر ان سے کچھ طلب کرتی تو کبھی منع نہ کریں لیکن ان کے آگے ہاتھ پھیلانا اسے گوارا نہیں ہوا۔ ارشاد علی وہیں ٹھہرا رہا' ایک دن' دو دن' تین دن۔ سلمیٰ کی کچھ عقل میں نہیں آتا تھا کہ وہ کس طرح ارشاد علی کو مطمئن لوٹائے۔ آخر ارشاد علی نے ندامت زدہ لہجے میں کہا کہ وہ سلمیٰ پر بوجھ بننا نہیں چاہتا لیکن پھر وہ کہاں جائے' سلمیٰ ہی بتائے کہ وہ کس دروازے پر جاکے دستک دے۔ قرض داروں نے اس کی زندگی عذاب کردی ہے۔ وہ ان سے منہ چھپائے چھپائے پھر رہا ہے۔ کیا وہ نہیں سمجھتا کہ سلمیٰ کے لیے کچھ مانگنا مناسب نہیں ہے۔ سلمیٰ اگر واقعی اس کی مدد پر آمادہ ہے تو اس کی ایک تجویز ہے۔ یہی ایک صورت ہے کہ سلمیٰ کوئی قیمتی پتھر یا زیور اس کے حوالے کردے۔ بیگمات کے پاس جواہر کا انبار ہوگا۔ عرصے تک تو شاید کسی کو پتہ بھی نہ چلے اور کبھی چلا تو زنان خانے کی مقرب خاص سلمیٰ بانو پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ ارشاد علی کی یہ شرم ناک صلاح سلمیٰ کے ہوش و حواس کے لیے تازیانہ تھی۔ اس نے یکسر منع کردیا کہ وہ ایسا کام ہرگز نہیں کرسکتی' وہ ایسا کر ہی نہیں سکتی لیکن ارشاد علی وہیں جم گیا تھا۔ اسے ایک بڑی رقم کی ضرورت تھی۔ اس نے وعدہ کیا کہ جو کچھ سلمیٰ اس کے سپرد کرے گی' وہ اسے گروی رکھ کے مطلوبہ رقم حاصل کرے گا اور جیسے ہی حالات موافق ہوئے' وہ یہ امانت واپس کردے گا۔ سلمیٰ کی تو راتوں کی نیند اڑ گئی۔ کھانا پینا حرام ہوگیا۔ بزرگ بڑے نواب بھی اس سے کمال مہربانی سے پیش آتے تھے۔ سلمیٰ ارادے باندھتی رہی کہ ان کی خدمت میں جاکے عرض گزارے۔ سلمیٰ کی ہم عمر' بڑے نواب کی بھتیجی نجستہ بھی سلمیٰ کی والہ و شیدا تھی۔ کسی کے پاس جاکے اپنی راہ و رسم آزمانے کی ہمت ہی سلمیٰ کو نہیں ہوئی۔ اس سے ارشاد علی کی منتیں اتنی ہی شدید ہوگئیں۔ جب تک بڑی بیگم کا ناپسندیدہ' قدیم طرز کا ایک جڑاؤ ہار سلمیٰ نے ارشاد علی کی جھولی میں نہیں ڈال دیا' وہ حویلی سے نہیں ٹلا۔

دوسرے چاہے کتنا ہی ذلیل کریں' سب سے بڑی ذلت تو آدمی کا اپنی نظروں سے گر جانا ہے۔ ارشاد علی بہت بہت شکریہ ادا کرکے اور وعدے وعید کرکے چلا گیا لیکن سلمیٰ کے لیے حویلی میں کانٹے بچھا گیا۔ سلمیٰ کو بہت پچھتاوا ہو رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ کس طور ازالہ کرے۔ کنویں میں ڈوب مرے یا زہر پی لے۔ اس نے ہر ممکن احتیاط برتی تھی۔ کئی ماہ تک کسی کو خبر نہیں ہوئی پھر کسی تقریب کے موقع پر زیوروں کے انتخاب کے دوران ذخیرے میں ایک ہار کی کمی کا

چرچا ہوا تو حویلی میں کہرام مچ گیا۔ کسی نے سلمٰی پر شک نہیں کیا۔ اس سے تو پوچھا بھی نہیں گیا۔ تمام باندیاں بڑی بیگم کے سامنے پیش کی گئیں۔ حلف اٹھوائے گئے اور تلاشیاں لی گئیں۔ ستاروں کی شعبدہ بازی پھر کسے کہتے ہیں۔ تلاشی میں گل چہر نامی ایک نوجوان خادمہ کے سامان میں کسی بیگم زادی کی بالی دستیاب ہوئی۔ یہ بالی معمولی قدر و قیمت کی تھی اس لیے اس کی گمشدگی پر اتنی توجہ نہیں دی گئی تھی۔ گل چہر اچھی شکل و صورت کی ایک سلیقہ شعار' شگفتہ مزاج لڑکی تھی۔ ہر وقت چہکتی رہتی تھی۔ وہ بین کرتی رہی کہ گمشدہ ہار سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ کسی کو بھی یقین نہیں آیا۔ اسے بے لباس کرکے کیڑے مکوڑوں سے بھری ہوئی ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں کئی دن تک بھوکا پیاسا رکھا گیا۔ اس کی دل دوز چیخیں حویلی میں دور دور تک گونجتی تھیں۔ اس کے مسلسل انکار پر مزاج خسروی اور مکدر ہوا۔ گل چہر کے ناخن کھینچے گئے۔ اس کے بال بہت لمبے اور گھنے تھے' گھٹنوں تک دراز ہوتے تھے۔ بڑی بیگم کے حکم پر اس کا سر مونڈ دیا گیا۔ سلمٰی اپنا سینہ کھرچتی' اپنا چہرہ کھسوٹتی رہی' کئی بار اس نے عزم کیا کہ بے گناہ گل چہر کو عتاب سے بچانے کے لیے وہ اقرار کرلے مگر اس کے اعصاب نے جواب دے دیا۔ تا ایں کہ بڑی بیگم نے گل چہر کی ناک قطع کرنے کا فرمان جاری کیا۔ کسی کو صدا بلند کرنے کی مجال نہیں تھی۔ بڑی بیگم کو حکم دینے کی دیر لگتی تھی۔ سلمٰی کے لیے اب تماشائی بنے رہنا ممکن نہ رہا۔ جتنا گل چہر بھگت چکی تھی' اس کا تو کوئی مداوا نہیں تھا۔ سلمٰی اب یہی کرسکتی تھی کہ اپنے آپ کو پیش کردے۔ کسی بہتری کی تاریک امید میں وہ بڑی بیگم کی بارگاہ میں حاضر ہوئی اور اس نے بیگم کے پیروں پر سر رکھ کے پیر پیغمبروں کے' اولاد کے' اقبال کے واسطے دیے۔ سلمٰی نے خود سے عہد کیا تھا کہ بڑی بیگم نے اس کی بات نہ مانی تو اپنے جرم کا اعتراف کرلے گی۔ سلمٰی اسے بہت عزیز تھی۔ گل چہر کو بوڑھی ماں' تین چھوٹے بہن بھائی سمیت اسی دم حویلی سے نکال دیا گیا۔ گل چہر اپنے ہوش سے بے پروا ہوگئی تھی' جیسے کسی کو نہ پہچانتی ہو' کسی سے اس کا کبھی کوئی ناتا نہ رہا ہو۔ وہ لوٹ لوٹ کے حیران و پریشان نظروں سے حویلی کے در و بام دیکھتی رخصت ہوگئی۔

کچھ عرصے بعد ارشاد علی واپس آیا تو نسبتاً بہتر حال میں تھا۔ آنکھیں ممنونیت سے لب ریز تھیں۔ کہنے لگا کہ سلمٰی کی بر موقع اعانت نے اس کی عزت رکھ لی۔ وہ دن بھر کے لیے حویلی میں ٹھہرا اور اس نے سلمٰی کو کسی اور امتحان سے دوچار نہیں کیا۔ وہ اپنی روداد سناتا رہا اور اسے سلمٰی کی ماں اور شہریار یاد آگئے۔ بھولی بسری یادیں دہراتا اور آہیں بھرتا تھا۔ مختصر مختصر وقفوں سے وہ حویلی میں آتا رہا' کبھی ایک پہر' کبھی دن رات کے لیے پھر ایک طویل غیر حاضری کے بعد وہ آیا تو بہت الجھا ہوا تھا' برگشتہ اور بے زار سا۔ اس نے سلمٰی سے کہا کہ اب مزید تاخیر اس کی برداشت سے باہر ہے۔ اس نے ہر جتن کرکے دیکھا اور حاصل یہ نکلا کہ قسمت ہی اس کے ساتھ نہیں ہے۔ شاید اسے یک سوئی جو میسر نہیں ہے۔ وہ پورے انہماک سے کوئی کام شروع کرتا ہے' ذرا آگے چل کے جب کام میں جماؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے' اس کا دماغ بھٹکنے لگتا ہے۔ اسے ماں اور شہریار کی یاد ستانے لگتی ہے' اس کا خون رگیں کاٹتا رہتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ دل جمعی سے کر بھی کیا سکتا ہے۔ اس نے کسی تمہید اور تکلف کی ضرورت نہیں سمجھی اور سلمٰی سے کہا کہ وہ حویلی سے زر و جواہر کا ذخیرہ غائب کردے۔ یہ لوگ برباد نہیں ہوجائیں گے۔ ان کے پاس صرف یہی نہیں' زمینیں' جاگیر بہت کچھ ہے۔ ان کے پاس جانے کتنے بے کسوں کا خون ہے۔ یہ سن کر سلمٰی کا جو حال ہونا چاہیے تھا' وہی ہوا۔ اس کا سر گھومنے لگا۔ وہ تو بالکل ہی گنگ ہوگئی۔ ارشاد علی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کے دل سوز لہجے میں کہا کہ وہ ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرے اور سوچے بغیر کوئی جواب نہ دے۔ وہ اپنی ماں اور اپنے بھائی کو بھولی تو نہ ہوگی۔ ان کے لاشے انہی ہاتھوں نے اٹھائے ہیں۔ ان پر کیا کیا ستم نہیں ٹوٹے تھے۔ اس کا باپ بھی تو انہی حالات کی بھینٹ چڑھ گیا تھا پھر اس نے آخر سوچا کیا ہے۔ کیا بس یہی منزل ہے کہ سلمٰی ان امرا اور بیگمات کی خدمت کرتی رہے اور ارشاد علی دربدر مارا مارا پھرتا رہے۔ جہاں سلمٰی کی حکمرانی ہو' کیا سلمٰی کو ایسے کسی گھر کی طلب نہیں ہے؟ کیا اسے بچوں اور گھرداری کی خواہش نہیں ہے؟ ارشاد علی نے تکرار کی کہ وہ سلمٰی کو محض اس لیے خود سے جدا کرنے اور حویلی میں رکھنے پر تیار ہوا تھا کہ دونوں کو جمعیت خاطر کے لیے کچھ وقت مل جائے اور ممکن ہے' اس دوران ہوا کا رخ بدل جائے' آسمان ان پر مہربان ہوجائے' اور وہ صاف صاف بتائے۔ بے شک سلمٰی کو حویلی میں ٹھہرانے کا ایک مقصد اور بھی تھا کہ اگر ارشاد علی اپنی تگ و دود میں ناکام ہوجائے تو مجبوراً حویلی والوں سے کچھ حاصل کیا جائے۔ جن کے پاس ہر چیز کی افراط ہے مگر خدا گواہ ہے' اس کے ذہن میں اس مذموم ارادے کو اولیت نہیں تھی۔ اس نے تو پہلے اپنے ہی بل پر کچھ کرنے کو ترجیح دی تھی۔ سلمٰی کے باپ کی جاگیر پہ جانے

کے لیے تیر کمان' خنجر و بندوق سے مسلح ہونے کی اتنی اہمیت نہیں' جتنی مال و زر کی ہے۔ ارشاد علی نے کہا کہ سلمٰی ایک سادہ دل اور معصوم لڑکی ہے۔ اس پاک باطن کے لیے یہ کام بہت مشکل ہے لیکن اس کے بغیر وہ دونوں یوں ہی گھٹ گھٹ کے تمام ہوجائیں گے۔ اسے معلوم ہے' یہ ایک گناہ بھی ہے پر انہوں نے کیا گناہ کیا تھا۔ انہیں کن گناہوں کی سزا دی گئی ہے۔ ارشاد علی نے اور بھی بہت کچھ کہا۔ اس کی بہت سی باتیں دل کو چھوتی تھیں اور تن بدن میں آگ لگاتی تھیں۔ تاہم سلمٰی نے انکار کردیا۔ ارشاد علی نے اس وقت زیادہ اصرار نہیں کیا اور چلا گیا۔

تین سال اور گزر گئے۔ اس مدت میں ارشاد علی سلمٰی کو ہموار کرنے کے لیے نت نئی دلیلیں وضع کرتا اور آزماتا رہا۔ جرات کی کمی' خوف' حویلی میں بڑھتی ہوئی بندشیں' باندیوں پر بیگمات کے اٹھتے ہوئے اعتماد' زر و جواہر کے ذخیرے کی محفوظ جگہ منتقلی اور پہلے سے زیادہ نگرانی۔ سلمٰی سے بڑی بیگم کی ناراضی وغیرہ۔ سلمٰی بھی ارشاد علی کو باز رکھنے کے لیے طرح طرح کی حیلہ جوئیاں کرتی۔ طرح طرح کے فسانے تراشتی رہی۔

تین سال بڑی مدت ہوتی ہے۔ سلمٰی کے پاس عذر ختم ہوگئے تھے اور ارشاد علی بھی تاویلوں سے غالباً تھک چکا تھا۔ یہ مدت کسی کا بھی پیمانہ لبریز ہونے کے لیے کافی ہے۔ ابھی چند دن پہلے کی بات ہے' ارشاد علی نے سلمٰی کو متنبہ کیا اور کہا کہ لگتا ہے' سلمٰی کو اس پر اعتبار نہیں ہے اور لگتا ہے' سلمٰی نے ازدواجی رشتہ دل سے قبول نہیں کیا ہے۔ کوئی بات نہیں۔ یہ سلمٰی کا حق ہے۔ جہاں تک ارشاد علی کا معاملہ ہے' سلمٰی ہی اس کی زندگی ہے۔ ارشاد علی تو ابتدا سے ایک در ماندہ شخص ہے۔ ماں تو پہلے ہی چلی گئی تھی' پندرہ برس کا تھا کہ باپ بھی جدا ہوگیا۔ اعزا نے بھی ازاں بعد گھر کے دروازے بند کرلیے۔ وہ تو کب سے ٹھوکریں کھا رہا تھا کہ اسے شہریار جیسا بھائی مل گیا اور جہاں آرا جیسی ماں نصیب ہوگئی۔ اس نے تو پھر انہی کے گھر کو اپنا گھر جانا۔ ان کی چھاؤں میں آکے ایسا لگا' اب ساری کلفتوں' اذیتوں سے نجات مل گئی۔ اس کا بھی سلمٰی کے سوا کوئی نہیں۔ سلمٰی تو اس کے بارے میں سبھی کچھ جانتی ہے۔ سلمٰی خود بتائے' وہ دن یاد کرے۔ ماں کے چلے جانے کے بعد جب گھر کی چھت بے سایہ' دیواریں بے پردہ ہوگئی تھیں۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور گلی میں کتوں نے بھونکنا شروع کردیا تھا۔ سلمٰی کے تحفظ کے لیے پھر ارشاد علی کیا کرتا۔ یقیناً وہ کسی طور سلمٰی کے لیے موزوں نہیں تھا لیکن لوگوں کی زبانوں کو لگام دینے کے لیے یہی ایک طریقہ' یہی ایک راستہ رہ گیا تھا۔ اسی صورت وہ سلمٰی کے لیے مددگار ثابت ہوسکتا تھا جب سلمٰی پر اسے کوئی استحقاق ہو۔ وہ سلمٰی کو شجرۂ نسب جانے بغیر کسی ایرے غیرے کے حوالے تو نہیں کرسکتا تھا۔ اب اس سے علیحدگی کی کوئی خواہش سلمٰی کے دل میں چھپی ہو تو سلمٰی ایک اشارہ کردے اور یقین رکھے کہ وہ اس کی راہ میں مزاحم نہیں ہوگا اور نہ سلمٰی سے اس کا روحی تعلق ختم ہوگا۔ ارشاد علی نے کہا کہ بس اس کی ایک درخواست ہے۔ اسے اپنے عہد کی تکمیل کا ایک موقع ضرور دیا جائے۔ اس کے بعد سلمٰی کو کوئی بھی فیصلہ کرنے کا اختیار ہے۔ اس کے بعد ارشاد علی کو خود سے' سلمٰی سے اور دنیا سے کوئی شکوہ نہ ہوگا۔

ارشاد علی کی باتوں میں بڑی حد تک سچ تھا۔ حویلی میں سلمٰی کے آنے کے بعد اتنی بار وہ حویلی آیا' اس نے کبھی سلمٰی کو اپنے ازدواجی تعلق کی یاددہانی نہیں کرائی۔ جیسا کہ حویلی کے مکینوں کو تاثر دیا گیا تھا' وہ سلمٰی سے ایک بھائی کے بہروپ ہی میں ملتا رہا۔ اس نے روزنوں کو بھی شک کرنے کا موقع نہیں دیا۔

سلمٰی کو اس نے بری طرح منتشر کردیا تھا۔ دو دن ہوئے' اس نے تین سال پہلے چرایا ہوا بڑی بیگم کا جڑاؤ ہار سلمٰی کے آگے رکھ دیا۔ ہار دیکھ کے سلمٰی ششدر رہ گئی۔ ششدر بھی' بدحواس بھی۔ ارشاد علی کو جتانے کی ضرورت نہیں پڑی کہ وہ یہ ہار بڑی بیگم کی خدمت میں پہنچا کے سلمٰی کے لیے کیسا عذاب مقسوم کرسکتا ہے۔ اس نے اپنی زبان سے ایسی کوئی پست بات نہیں کہی۔ سلمٰی اس کا اشارہ سمجھ گئی۔ کیونکہ تین سال پہلے ہار وصول کرتے ہوئے ارشاد علی نے جو وعدہ کیا تھا' ایفا نہیں کیا اور ہار دوبارہ اندرونی جیب میں محفوظ کرلیا۔ سلمٰی نے پھر کوئی حیلہ نہیں کیا۔

کل شام حویلی کے بیش تر مکینوں کو ایک بہت قریبی رشتے دار کی موت پر جانا پڑگیا۔ سلمٰی ایسے موقع کی منتظر تھی۔ زنان خانے کی نگراں وہی تھی۔ اس نے جتنا کچھ ممکن تھا' پوٹلی میں بھرلیا۔ ارشاد علی نے کئی دن سے حویلی میں ڈیرا ڈال رکھا تھا۔ سلمٰی سیدھی اس کے پاس چلی آئی۔

وہ حویلی میں دوسری باندیوں کو مطلع کرکے آئی تھی۔ ارشاد علی نے باہر نکلتے وقت اپنے شناساؤں کو حضرت یوسفین شاہ کے دربار جانے اور منت ماننے کی معقول توجیہہ پیش کی تھی۔ بیگمات اور باندیاں عموماً درگاہ پر حاضری دینے جایا کرتی تھیں۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جس پر کسی کو اعتراض ہوتا

یا تشویش ہوتی پھر وہ سلمیٰ تھی' حویلی کی سب سے با اثر باندی' بیگمات کی نفس ناطقہ۔ سنجیدگی اور دیانت کی الگ دھاک ہوتی ہے۔ وہ آسانی سے ارشاد علی کے ہمراہ حویلی سے نکل آئی۔

ارشاد علی نے سرائے سے سامان اٹھایا اور کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر سکندر آباد کا رخ کیا۔ سکندر آباد میں اس نے سلمیٰ کو برقع اتارنے اور ساڑی پہننے کی ہدایت کی۔ اپنی وضع قطع بھی اس نے سلمیٰ کی مناسبت سے بدل لی۔

سلمیٰ بانو چپ ہو گئی اور سسکنے لگی۔

○☆○

گاڑی تیز رفتاری سے بھاگ رہی تھی۔ درمیان میں جانے کتنے اسٹیشن گزر گئے۔ کسی کو احساس ہی نہیں ہوا۔

کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ سلمیٰ بانو سے کیا کہے۔ آدمی کی سماعت کا جتنا حوصلہ ہوتا ہے' کاش اس کے ہاتھوں کی بھی اتنی استطاعت ہوا کرتی۔

بہت دیر بعد بٹھل نے ہنکاری بھر کے سر اٹھایا اور تنی ہوئی آنکھوں سے سلمیٰ بانو کو دیکھا اور اس نے سلمیٰ کے شانوں پر بازو ڈال کے بے اختیار اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ سلمیٰ کی ہچکیاں بندھ گئیں "تاتا" ایسا نہیں ری۔ اب کیا ہے' سمجھ لے' اب سارا پیچھے چھوڑ کے آئی ہے۔" بٹھل نے کھردری اور ریتیلی آواز میں کہا۔

"ہاں ہاں' اب ہم لوگ ہیں' اب فکر کی کوئی بات نہیں۔" جمرو بے قراری سے بولا "بہت ہو گیا تمہارے ساتھ' کیا بولیں۔ اپنے کو کبھی لگتا ہے' اندھا بہرا ہونے میں ٹھیک تھا۔"

"دادا! ماں قسم' ایک بار کو وہ کتے کا اولاد ابھی اپن کو ٹکر جائے۔ کیا نام بولا تھا اس کا؟" زورا کی آواز تمتما رہی تھی۔

جمرو نے اسے ارشاد علی کا نام بتایا اور کہنے لگا "ہاں استاد! ایک بار اپنے کو بھی دیکھنے کا ارمان ہے سامائی کے جنے کو۔"

"اپن کو ایک نمبر کا حرامی لگتا ہے سالا۔"

"چپ رے۔" بٹھل نے زورا کو جھڑک دیا اور سلمیٰ بانو کی کمر تھپ تھپاتے ہوئے آہستگی سے بولا "اچھا کیا جو اپنے کو سارا بول دیا۔ اب تھوڑا سنبھل کے بیٹھ ری۔ ہوتا ہے ایسا۔"

سلمیٰ کی آنکھوں سے اڈ اڈ کے آنسو برس رہے تھے۔ زورا نے بھی ٹوٹی پھوٹی آواز میں تسلی دینے کی کوشش کی اور خود کلامی کے انداز میں بولا کہ کتنا اچھا ہوا' ہم اس ڈبے میں آگئے۔

"اب رونا نہیں' میری ماں' میری بھنیا!" جمرو نے ہاتھ جوڑ کے سلمیٰ سے کہا "رونے کا مطلب ہے' تم کو اپنے پہ بھروسا نہیں۔"

جمرو کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا کہ بٹھل کی خشمگیں نگاہیں دیکھ کے خاموش ہو گیا۔

سلمیٰ کے چہرے پر چھائی ہوئی گھٹا اترنے میں دیر لگی۔ آنکھوں کی آگ بھی عجیب ہے۔ آگ لگتی ہے تو دریا سا اُمڈ آتا ہے۔ آنسوؤں کے سیل کے بعد' لمحوں کے لیے سہی' پر آنکھیں ٹھنڈی ضرور ہو جاتی ہیں۔

ڈھائی بجے کے قریب گاڑی ایک بڑے اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ یہ مدو کھیڑ جنکشن تھا۔ میں' زورا اور جمرو ڈبے سے اتر گئے۔ پیچھے پیچھے بٹھل بھی آگیا۔ کسی کو سلمیٰ کی دسراہٹ کے لیے ڈبے ہی میں رہنا چاہیے تھا۔ مجھے خیال آیا کہ بٹھل دانستہ نیچے آیا ہوگا۔ سکندر آباد سے اب تک سلمیٰ اپنی جگہ سکڑی سمٹی ہوئی بیٹھی رہی تھی۔ دو ایک پہر کی قربت میں اجنبیت ختم نہیں ہوتی۔ اسے بھی تو ہاتھ پاؤں سیدھے کرنے کے لیے کچھ مہلت ملنی چاہیے تھی۔ اعتماد کی بحالی کے لیے بھی یہ خلوت مفید تھی۔

ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اسٹیشن پر بھیڑ بہت کم تھی۔ ڈبوں سے اترنے والے مسافروں کی وجہ سے کچھ ہجوم ہو گیا۔ جمرو اور زورا کھانے پینے کے سامان کے لیے آگے نکل گئے۔ میں اور بٹھل ڈبے کے قریب ہی کھڑے رہے۔

باہر کی کھلی ہوا مصنوعی سی لگ رہی تھی۔ آدمی کے اندر حبس جاگزیں ہو تو باہر کی روشنی اور ہوا بھی پھیکی پڑ جاتی ہے۔ میری طرح سبھی کے جسم بوجھل ہوں گے۔ گزشتنی کا احوال سنانے والے کا غبار چھٹ جاتا ہے لیکن سننے والے کا سینہ بھی تو زد پر آجاتا ہے۔ بٹھل میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے آہستہ قدموں سے کچھ دور ہو گیا اور واپس آگیا۔ اس کی خاموشی کسی غبار و فشار ہی کی غماز تھی۔ زورا کہہ رہا تھا کہ اچھا ہوا جو ہم اس ڈبے میں آگئے۔ وہ یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ کاش ہم کسی اور ڈبے میں چلے جاتے مگر ایسا ہی ہوتا ہے۔ آدمی کو اپنی مرضی میں دخل ہی کتنا ہے۔ سارا کچھ تو ان ہونیوں پر منحصر ہے۔ حادثات اور اتفاقات۔ لوگ کسی اور طرح بھی اس کی تشریح کرتے ہیں کہ ہر بات کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ زریں بھی اسی طرح مجھے ریل گاڑی میں ملی

تھی۔ اس کی ہم سفر عورت نسترن بیگم کو دیکھ کے میں ٹھٹک گیا تھا۔ جب میں کورا کے ساتھ کلکتے کے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا تو نسترن سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ مجھ پر اور کورا پر دل و جاں سے فریفتہ ہو گئی تھی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ تو کورا کو مجھ سے جدا کرنے اور اس کا سودا کرنے کے درپے ہے۔ ریل گاڑی میں تو میں زریں سے کچھ نہ کہہ سکا۔ ہر لمحے نسترن سامنے رہی لیکن میں نے طے کر لیا تھا کہ زریں کو یوں اس کے ساتھ نہیں جانے دوں گا۔ سات سال کا عرصہ درمیان میں تھا۔ نسترن مجھے پہچان نہیں پائی تھی' سو میری عاجزی پر اس نے مجھے گھریلو ملازم کی حیثیت سے قبول کر لیا تھا۔ اسی وجہ سے میں زریں کو اس حرافہ کے چنگل سے نکال لانے میں کامیاب ہو گیا ورنہ مجھے اور دیر لگتی۔ میں زریں کو نسترن کے پاس چھوڑتا تو نہیں گو سلمیٰ کی بپتا سے بہت مختلف تھی لیکن کردار وہی تھے' کردار تو وہی دو ہوتے ہیں' دو یا تین۔

زورا اور جمرو لدے پھندے واپس آئے۔ کھپچیوں کی ٹوکری میں وہ کھانے پینے کا سامان بھر لائے تھے۔ صراحی' مٹی کے بھولوے (کلھڑ) پھلوں کی تھیلیاں اور جانے کیا کیا۔ ڈبے کا پائے دان عبور کرنے سے پہلے بٹھل نے جھانک کے دیکھا پھر ہمیں ڈبے میں جانے کا اشارہ کیا۔ سلمیٰ منہ پھیرے بیٹھی تھی' ہماری آہٹ پر سیدھی ہو گئی۔ وہ کچھ تازہ تازہ' بدلی بدلی سی نظر آتی تھی جیسے برسات کے بعد پودوں اور پھولوں پر نکھار آجاتا ہے۔ زورا اور جمرو نے ٹوکری اس کے آگے رکھ دی اور جمرو نے کہا کہ اب باقی کام سلمیٰ کا ہے۔ جمرو کے لہجے میں دل جوئی بھی تھی اور استحقاق کی آمیزش بھی۔

وہ دونوں سارا بازار سمیٹ لائے تھے۔ پوری کچوری' پراٹھے' سادی روٹیاں' کئی قسم کی سبزیاں اور حلوہ' مٹھائی وغیرہ۔ پلیٹوں کی جگہ وہ کیلے کے تازہ پتے بھی لائے تھے۔ سلمیٰ نے سلیقے سے ایک ایک چیز نکالی۔ دسترخوان پر کھانا رکھتی ہوئی عورت کی نسوانیت اور فزوں ہو جاتی ہے۔ جمرو اور زورا بے صبری سے اس کا ہاتھ بٹاتے رہے۔ سلمیٰ بانو کو بالکل بھی بھوک نہیں ہوگی۔ بھوک تو شاید کسی کو نہیں تھی لیکن ایسے شغل تندی وقت میں اکسیر کا وصف رکھتے ہیں۔ سبھی نے کچھ نہ کچھ شکم پری کی یا ایک دوسرے کے سامنے خوش وضعی نبھائی۔ سلمیٰ بھی جھجکتے ہوئے بظاہر لقمے ٹونگتی رہی۔ اس کی حرکات و سکنات میں شائستگی رچی ہوئی تھی۔

مدو کھیڑ جنکشن کے بعد کوئی چھوٹا اسٹیشن آیا اور آدھے گھنٹے سے کم وقت میں گاڑی ناندیڑ آگئی۔ ناندیڑ اوسط درجے کا شہر ہے اور سکھوں کے پیشوا گرو گوبند سنگھ کے گردوارے کی وجہ سے سارے ہندوستان میں مشہور ہے۔ یہ سکھوں کا تیرتھ استھان ہے۔ کورا اور مولوی صاحب کی امید میں شہروں شہروں گھومتا ہوا ایک بار میں یہاں بھی آچکا تھا۔ ناندیڑ میں سلمیٰ اور ارشاد علی کی تلاش میں پولیس کی موجودگی کا اب امکان تو نہیں تھا۔ نظام آباد اسٹیشن پر تلاشی کے بعد آگے آنے والے اسٹیشنوں کے لیے پولیس کو یہ گاڑی مستثنیٰ قرار دے دینی چاہیے تھی' مگر کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ پلیٹ فارم آنے سے پہلے احتیاطاً زورا دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ سلمیٰ ابھی تک ہندو عورت کے روپ میں تھی۔ جمرو نے ٹکٹ کے بارے میں اس سے پوچھ لیا تھا۔ بدحواسی میں ارشاد علی اس کا ٹکٹ بھی ساتھ لے گیا تھا۔ بہرحال ٹکٹ چیکنگ کے مرحلے پر ہم میں سے کسی کا ٹکٹ سلمیٰ کو دیا جا سکتا تھا اور ہم سے کوئی ٹکٹ چیکر سے نمٹ سکتا تھا۔

پلیٹ فارم پر پولیس کا ہجوم دیکھ کے زورا نے سیٹی بجا کے سب کو محتاط رہنے کی تاکید کی مگر جلد ہی عقدہ کھل گیا کہ پولیس ٹھاکر بھیم سنگھ کے استقبال کے لیے اسٹیشن پر موجود ہے۔ ٹھاکر وہیں اتر گیا اور اس کے آگے پیچھے سارے سپاہی لیفٹ رائٹ کرتے ہوئے پلیٹ فارم سے باہر چلے گئے۔

ارشاد علی واپس نہیں آیا۔ وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے' ایسے لوگ زمین و آسمان کو بھی اتنی جلد مرغوب نہیں ہوتے۔ دو ہی باتیں ہو سکتی تھیں۔ یا تو وہ نظام آباد اسٹیشن پر پولیس کی غیر معمولی تعداد سے ایسا منتشر ہوا کہ اسٹیشن سے نکل گیا اور اسے لوٹنے کا وقت نہیں ملا یا وہ اسی گاڑی کے کسی اور ڈبے میں اس خیال سے الگ سفر کر رہا تھا کہ مختلف ڈبوں میں وہ اور سلمیٰ نسبتاً زیادہ محفوظ ہیں۔ آگے دو تین اسٹیشنوں پر پولیس کی جانب سے پوری طرح مطمئن ہو جانے کے بعد اسے سلمیٰ کی خیر خبر لینے آنا چاہیے تھا۔ اپنے مخدومی نواب کے اثر و رسوخ سے وہ خوب واقف ہوگا۔ ابھی گاڑی ریاست کی حدود میں تھی۔ اورنگ آباد کے بعد نظام سرکار کی عمل داری ختم ہوتی تھی۔ ارشاد علی نے سکندر آباد سے نظام آباد تک ہم لوگوں کے ساتھ خاصا طویل سفر کیا تھا۔ اس عرصے میں اس باراں دیدہ نے ہمارے بارے میں کوئی رائے ضرور قائم کی ہوگی۔ ہو سکتا ہے' دریں حالات اس نے ڈبے میں ہماری موجودگی سلمیٰ کے لیے سپر تصور کی ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ نظام آباد اسٹیشن پر کہیں وہ پولیس کے ہتھے چڑھ گیا ہو۔ پولیس والے تو اپنے سائے پر بھی شک کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں آگے چلی جانے والی سلمیٰ کے بارے میں

ارشاد علی نے پولیس کو ذرا بھی ہوا نہیں لگنے دی ہوگی کیونکہ سلمٰی کے عافیت سے نکل جانے پر اس کے دوبارہ ملنے کی امید کی جاسکتی تھی۔ ارشاد علی جہاں کہیں بھی ہوگا' اس کا دل' اس کا سارا وجود سلمٰی کی تحویل میں نوادر و جواہر کے ذخیرے کے لیے دھڑک رہا ہوگا۔ پولیس کی دہشت میں سلمٰی کو اس کے حال پر چھوڑ کے اپنی جان بچانے اور گویا مال و زر سے دست کش ہوجانے کی توقع اس شخص سے نہیں کی جاسکتی تھی۔ جس نے اسی دن کی آرزو میں اتنے برس خواب دیکھے ہوں۔ پولیس اس کے لیے کوئی نئی چیز بھی نہیں ہونی چاہیے۔

ناندیڑ سے گاڑی چلنے پر بٹھل نے سب کو اوپر کی برتھوں پر چلے جانے کی ہدایت کی اور سلمٰی سے کہا کہ وہ بھی کچھ آرام کرلے۔ بٹھل کے اصرار پر وہ نیم دراز ہوگئی۔ بٹھل نے اس کے بدن پر چادر ڈالی تو اس کے سمٹے ہوئے پیر اور پھیل گئے تاہم اس کا منہ دیوار کی جانب ہی رہا۔ ڈبے میں اندھیرا سا کردیا گیا تھا۔

ڈیڑھ گھنٹے بعد پھر کوئی بڑا اسٹیشن آیا تھا۔ گاڑی دیر تک وہاں کھڑی رہی اور دروازے پر مسلسل دستک کی وجہ سے زورا کو اٹھنا پڑا۔ وہ ارشاد علی نہیں تھا' کوئی اور مسافر تھا۔ زورا کے بتانے پر کہ ڈبے میں جگہ نہیں ہے' مسافر نے جرح نہیں کی اور آگے چلا گیا۔ یہ پورنا جنکشن تھا۔ گاڑی پورنا سے چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر دم لیتی ہوئی سات بجے کے قریب پربھنی پہنچ گئی۔ کسی کو نیند نہیں آئی تھی۔ سب کروٹیں ہی بدلتے رہے تھے۔ پربھنی پر سبھی اٹھ گئے۔ زورا اور جمرو چائے لے آئے۔ چائے کے ساتھ وہ پان بھی لائے تھے۔ بٹھل سفر میں بڑے شوق سے پان کھاتا تھا۔ ویسے اسے پان کی کوئی عادت نہیں تھی۔ جمرو کی خواہش کے احترام میں سلمٰی نے بھی خوشبودار مسالوں کی آمیزہ گلوری منہ میں رکھ لی۔ پان کی اتنی بات نہیں ہوتی جتنی منہ کی ہوتی ہے یا ہونٹوں کی ہوتی ہے۔ سلمٰی کے ہونٹوں پر لالی خوب رچ گئی اس کے چہرے پر خاصا سکون تھا۔ سوگوار سا سکون۔ کتنا ہی اس نے خود کو ترک کردیا ہو' آنے والے وقت کے بارے میں اس کے دل و دماغ میں طرح طرح کے وہم و قیاس' اندیشے منڈلا رہے ہوں گے۔ اس کی حالت سمندر میں ڈوبتی' ڈولتی کشتی کے مانند تھی۔ اب جو بھی وہ' تقدیر جہاں لے جائے۔ کاش کسی کنارے پر لگ جائے۔ عورت تو یوں بھی کشتی کے مانند ہوتی ہے۔ نہ خود میں کھینے کی قوت' نہ لہروں سے نبرد آزمائی کا حوصلہ۔

پربھنی اسٹیشن گزر جانے کے بعد بٹھل سلمٰی بانو کی برتھ پر بیٹھ گیا اور اس نے دھیمی آواز میں پوچھا "کیوں ری! کیا ہے اب تیرے من میں؟"

سر راہ جیسے کانٹا چبھ جائے یا ٹھہرے ہوئے پانی میں کوئی کنکر پھینک دے' سلمٰی کا وہی حال ہوا۔ اس کی آنکھوں میں حیرانی اتر آئی۔ حیرانی بھی' ویرانی بھی' اور وہ بٹھل کی جانب نگاہیں اٹھا کے رہ گئی۔

"اپنا مطلب ہے' تو بھی کچھ بول۔" بٹھل نے وضاحت کی "تیرے من میں گر کچھ ہو۔"

"میں کیا کیا۔۔۔" سلمٰی نے بمشکل کہا۔

"کدھری جانے کا ارادہ ہو تو بتا ری۔"

"میں' میں نے آپ سے کچھ نہیں چھپایا ہے۔" سلمٰی بانو کی آواز بھرا گئی "میں نے سب کچھ۔۔۔"

"وہ ٹھیک ہے' اپنے کو پتہ ہے پر تیری اپنی بھی کوئی اچھا (مرضی) ہوگی ری۔ اسی کو بولتے ہیں۔"

سلمٰی بانو پر سناٹا چھایا رہا۔

"اپنی مان تو یہ مال ان بادشاہ زادوں کو جا کے واپس کردے۔ وہ اس کے لیے بہت سر پیٹ رہے ہوں گے۔"

سلمٰی کا رنگ بدل گیا "نہیں نہیں۔" وہ ہیجانی انداز میں بولی "وہ معاف نہیں کریں گے۔ وہ کبھی معاف نہیں کریں گے۔"

"تو بول سکتی ہے' اس حرام کے تخم کے بولنے پر تو نے ایسا کیا تھا جو سچ ہے' وہی جا کے بولنا۔ ان کو مال سے مطلب ہے۔"

"وہ لوگ بہت سخت ہیں۔ آپ' آپ ان کو نہیں جانتے۔ ذرا ان کے ناگوار خاطر کوئی بات ہوجائے' کسی کے مخالف ہوجائیں تو زمین آسمان ایک کردیتے ہیں۔"

"جانتے ہیں' بہت دیکھے ہیں ہم نے بھی۔ ایک سے ایک۔" بٹھل نے تلخی سے کہا "پر مال تو لوٹایا جاسکتا ہے۔ تو چاہے ادھری مت رہنا۔"

"نہیں' میں ان کے سامنے نہیں جاسکتی۔ میں جا ہی نہیں سکتی۔" سلمٰی کی آواز لرزنے لگی "ان لوگوں کو چھیڑنا بالکل ٹھیک نہیں ہے۔"

"پھر' پھر کیا کریں ری اس کا؟"

سلمٰی بانو نے بے چینی سے ہم تینوں کی طرف دیکھا اور بل کھا کے رہ گئی۔

"دیکھ ری! اس کو کدھری ٹھکانے بھی لگاتا ہے۔"

"میں کچھ نہیں جانتی' مجھے کچھ نہیں معلوم۔"

"ایسا کیسے ری۔"

"آپ اسے پھینک دیں۔ کہیں دفن کردیں۔ کہئے تو میں پھینک دیتی ہوں۔"

بٹھل کی بھویں چڑھ گئیں۔ چند لمحے خاموشی کے بعد اس نے کہا "سوچ کے بول' پھینکنے سے اچھا ہے' جن کا ہے' ان کو لوٹ جائے۔"

"کسی حاجت مند کو دے دیجئے' کسی کو بھی' کسی مسجد' یتیم خانے کو۔۔۔"

بٹھل سر ہلانے لگا اور تذبذب سے بولا کہ فی الحال ہماری حیدر آباد واپسی ممکن نہیں ہے۔ وقت ہوتا تو ہم سلمٰی کے ساتھ خود حویلی جاتے اور نوابوں سے بات کرتے۔

"انہیں بھول جائیے۔" سلمٰی نے التجا کی "اسی میں بہتری ہے۔"

"ٹھیک ہے ری پھر' دیکھیں گے بعد میں۔" بٹھل کھوسا گیا یا الجھ سا گیا۔ اس کی سیری نہیں ہوئی تھی یا اسے سلمٰی سے کچھ اور جاننے کا تجسس تھا۔ میرے خیال میں تو اب مزید تفتیش و استفسار' تلقین و تاکید کی گنجائش نہیں تھی۔ سلمٰی بانو کا چہرہ کملا گیا تھا۔ شیشے کی گرد سبھی کو گراں گزرتی ہے۔ میری دخل اندازی بٹھل کی برہمی کا سبب ہوتی سو جمرو اور زورا کی طرح میں بھی چپ بیٹھا رہا۔ بٹھل کے لہجے کی تیزی برقرار تھی۔ اس نے تنبیہی انداز میں دوبارہ سلمٰی کو ٹوکا کہ سلمٰی نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ ابھی من ماڑ آنے میں دیر ہے۔ وہ اچھی طرح غور کرکے جو اس کی خواہش ہو' کسی تردد کے بغیر بتائے۔

"میرا کیا!" سلمٰی گھٹی ہوئی آواز میں بولی "میرا کوئی بھی نہیں ہے۔" وہ پھر سسکنے لگی۔

"تیرے بھلے کو بولتے ہیں ری' پہلے تجھ سے جانکاری کرنا ٹھیک ہے۔"

"میں آپ' آپ کو کیا بتاؤں۔" وہ ناتوانی اور سرگرانی سے بولی "ایسا ہے تو مجھے زہر دے دیجئے۔"

"تاری' ایسا نہیں ہے۔" بٹھل نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کے کہا کہ وہ ایک تعلیم یافتہ اور باہوش لڑکی ہے۔ اپنا اچھا برا سمجھ سکتی ہے مگر سلمٰی کے پاس کہنے کے لیے اور کسی دوسری طرف دیکھنے کے لیے کچھ ہوتا تو وہ اس قدر گریزاں کیوں ہوتی۔ بلکتے ہوئے بولی کہ حیدر آباد واپس بھیجنے کے بجائے بٹھل اس کے لیے جو تجویز کرے گا' وہی مناسب ہوگا۔

"دھیان سے سن ری۔" بٹھل نے اسی تندی سے کہا "پلے نہیں پڑا تیرے' کیا بولتے ہیں ہم۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا کہ سلمٰی اطمینان رکھے' ہم اس سے جدا نہیں ہو رہے یا اسے کسی رہ گزر پر تنہا چھوڑ کے نہیں جا رہے۔ اس کا عندیہ جاننے سے مقصود محض اس کی تالیف قلب ہے۔ مراد یہ ہے کہ آئندہ کے لیے کوئی آرزو اس کی آنکھیں بے خواب اور کوئی خواب اس کا دل متلاطم کرتا ہو تو ہم اسے ممکن کرنے کی کوشش کرسکتے ہیں۔ اسے سمجھنا چاہیے کہ ہم اسے اپنی مرضی کا راستہ اختیار کرنے کی ترغیب دے رہے ہیں۔ وہ اشارہ کردے۔ بعد میں ہمارا کام ہے کہ ہم کس طور اس کی اعانت کرتے ہیں۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا' کچھ بھی نہیں۔" سلمٰی کا انداز خفقانی تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ ابھی یہ سب کچھ قبل از وقت ہے۔ سب سے بڑی شکستگی آدمی کا خود پر سے اعتبار اٹھ جانا ہے۔ پہلے تو اس کی بحالی لازم ہے اور یہ عمل ایک مرحلہ وقت سے مشروط ہے۔ گھڑی کا چکر تو ضرور پورا ہوتا ہے۔

"وہ حرام کا جو تیرے چاچاؤں کے پاس جانے کا بولتا تھا' وہ نہیں گیا تو ہم ادھری جاسکتے ہیں۔" بٹھل کا لہجہ عزم سے عاری نہیں تھا۔

"میرا ان لوگوں سے کیا واسطہ ہے۔" سلمٰی کٹی پھٹی آواز میں بولی "میں انہیں نہیں جانتی۔"

"پر تجھے تیرا حصہ ملنا چاہیے۔"

"مجھے کچھ نہیں چاہیے' کچھ بھی نہیں۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" سلمٰی پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے' اب چپ ہوجا ری ایک دم! اپنے کو تجھ سے کوئی بات نہیں کرنا۔" بٹھل نے اس کا بازو تھپکتے ہوئے کہا "بہائے چلی جاتی ہے۔ دوسرے کی سنتی نہیں۔"

جمرو اور زورا بھی قریب جا کے سلمٰی کو تسلی تشفی دینے لگے اور جمرو نے مشفقانہ' مربیانہ لہجے میں کہا کہ وہ ہم لوگوں کو نہیں جانتی۔ اسے بھی ہم سے کچھ پوچھنے کا حق ہے۔

"مجھے کچھ نہیں جاننا۔" سلمٰی بسورتے ہونٹوں سے بولی۔

بہت مشکل سے اس کے آنسو تھمے۔ کسی نے پھر اس سے کچھ نہیں کہا۔

دس بجے گاڑی جالنا پہنچ گئی۔ دوپہر کا کھانا خاصا بچا ہوا تھا۔ جمرو اور زورا نے ٹوکری کسی فقیر کو دے دی اور ڈبے سے اتر کے تازہ کھانا اور پانی لے آئے۔ کھانے کے دوران

وہ مسلسل سلمیٰ کی دل جوئی میں لگے رہے۔ بٹھل اپنی برتھ پر چلا گیا۔ میں بھی اوپر کی برتھ پر آ کے لیٹ گیا۔ جمرو اور زورا سلمیٰ کے قریب بیٹھے چپکے چپکے جانے کیا باتیں کرتے رہے۔ یہی ہو سکتا تھا کہ وہ سلمیٰ کو اپنے بارے میں کچھ بتانے کی کوشش کر رہے ہوں تاکہ بعد میں سلمیٰ حیرت و تاسف کے کسی صدمے سے دو چار نہ ہو یا وہ اسے یقین دلا رہے ہوں گے کہ اگر واقعی سلمیٰ نے خود کو ہماری جواب دہی' ہماری صوابدید پر چھوڑ دیا ہے تو آنے والا وقت شاید اس کے لیے ایسا زہر نہ ہو' شاید اس کی محرومیوں اور تشنگیوں کا کچھ ازالہ کر سکے۔

رات کی وجہ سے گاڑی نے چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر ٹھہرنا کم کر دیا تھا۔ گیارہ بجے اورنگ آباد آ گیا۔ چائے کا کوئی وقت نہیں تھا لیکن کسی کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ بٹھل کی ہنکار پر جمرو نے دیر نہیں لگائی اور پلیٹ فارم سے چائے لے آیا۔ مٹی کے کوزے میں چائے سوندھی سوندھی ہو جاتی ہے۔ سبھی نے خوش دلی سے نوش جاں کی۔ زورا اور جمرو نے تاش کی گڈی نکال لی اور یوں ہی کچھ وقت دھکیلتے رہے۔ وقت کاٹنا' گزارنا اور دفع کرنا سب ایک گمان ہی ہے۔ ہر فرد' ہر چیز کو ایک مقام' کسی ایک مرحلے پر جا کے خود ہی تمام ہو جانا یا اپنی شکل بدل لینا ہے۔ شاید وقت کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ یہ نہ ساکن ہے نہ متحرک۔ آدمی نے اپنی اور اشیا کی ابتدا و انتہا کی نسبت سے وقت کی حرکت کا مفروضہ وضع کر لیا ہے' اپنی سہولت کے لیے۔ سورج یوں ہی جانے کب سے طلوع و غروب ہو رہا ہے اور چاند کا کب سے ایک ہی معمول ہے۔ یہ گھڑی تو بہت بعد کا کھلونا ہے۔

ابھی گاڑی من ماڑ سے دور تھی۔ زورا اور جمرو کا دل تاش میں نہیں لگا۔ وہ اوپر کی برتھوں پر چلے گئے۔ یکایک بٹھل نے اٹھ کے سلمیٰ کو مخاطب کیا "جاگتی ہے ری۔" اس نے اونچی آواز میں پوچھا۔

"سلمیٰ جاگ رہی تھی اور کسی خیال میں گم تھی کہ ہڑبڑا گئی۔

"تو نے حویلی والوں کا نام نہیں بولا۔"

سلمیٰ کی پلکیں مرتعش ہو گئیں۔ اس نے جھجکتی آواز میں جواب دیا "بڑے نواب کا نام عابد علی خاں ہے۔"

"عابد علی خاں۔" بٹھل اوپر میری طرف دیکھ کے بدبداتے ہوئے بولا "یہ تو سنا ہوا لگتا ہے۔ تو نے بولا تھا کہ کل شام کو حویلی کے لوگ کسی کے پرسے میں گئے ہوئے تھے؟"

"جی' جی ہاں۔" سلمیٰ گھبرا گئی اور تیزی سے بولی "ان کے قریبی عزیز نواب ثروت یار کا انتقال ہو گیا تھا۔"

میں اٹھ کے بیٹھ گیا' زورا اور جمرو بھی۔

"نواب ثروت یار۔" بٹھل نے شش و پنج سے کہا۔

"جی ہاں۔" سلمیٰ اٹکتی زبان سے بولی "آپ انہیں جانتے ہیں؟"

"آگے کا بول۔"

"سنا ہے' وہ زمینوں پر جا رہے تھے۔ راستے میں ڈاکوؤں سے سامنا ہو گیا۔ وہ بہت زخمی ہو گئے تھے۔ نواب ثروت کے خالہ زاد بھائی نواب فہمید کے گھر میں بڑے نواب عابد علی خاں کی سگی بہن ہیں۔ ویسے بھی سب کی قرابت داری ہے۔"

"ایک نال سے جڑے ہوئے ہیں سب۔" بٹھل بڑبڑانے لگا "وہ تو پھر دیر سے حویلی لوٹے ہوں گے؟"

"آپ کی ان سے کوئی واقفیت ہے؟" سلمیٰ نے مضطرب لہجے میں پوچھا۔

"نہیں ری' پر نواب ثروت کو جانتے تھے۔"

سلمیٰ کی آنکھوں سے حیرت چھلکنے لگی' ہچکچاتے ہوئے بولی "وہ تو بہت اچھے آدمی تھے' مہذب' تعلیم یافتہ۔ سارے خاندان میں ان کی عزت تھی اور سبھی ان کے ذوق کے قائل تھے۔ ان کی عمر بھی اتنی نہیں تھی۔ شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ ان کی والدہ اور بہن بھی بہت نرم دل' اعلا اخلاق کی ہیں۔ اللہ جانے والدہ یہ صدمہ کس طرح برداشت کر پائیں گی۔ وہ تو بیمار بھی ہیں۔"

نواب عابد علی کا نام میرے ذہن میں گردش کر رہا تھا۔ بہت دیر میں مجھے یاد آیا۔ دوسرے دن صبح کے وقت جب ہم نواب ثروت کی خیریت دریافت کرنے ڈاکٹر ناصر مرزا کے گھر گئے تھے اور ابھی دروازے پر کھڑے تھے کہ سفید شیروانی میں ملبوس ایک لحیم شحیم' گول مٹول سا شخص موٹر میں وہاں آیا تھا۔ چہرے بشرے ہی سے وہ کوئی بڑا نواب معلوم ہوتا ہے۔ اس نے صرف سامنے کی جانب نظر رکھی۔ بڑے آدمیوں کا جو شیوہ ہوتا ہے۔ وہ ادھر ادھر نہیں دیکھتے۔ کبھی نگاہ کرتے ہیں تو چھچلتی ہوئی۔ موٹر سے اتر کے وہ سیدھا دروازے میں داخل ہو گیا۔ ایسے لوگوں کو دروازے بھی کھلے ہوئے ملتے ہیں۔ میں نے بٹھل کو نہیں بتایا کہ نواب عابد علی خاں کو تو اس نے بھی قریب سے دیکھا ہے۔

"ادھری نواب ثروت کے گھر بھی تیرا کبھی جانا ہوا؟" بٹھل نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"جی' بیگمات کے ساتھ کئی بار۔" سلمیٰ نے شائستگی سے جواب دیا۔

بٹھل نے سلمیٰ سے نہیں پوچھا کہ نواب ثروت کے ہاں اس نے کبھی نرجس بانو نامی ایک لڑکی تو نہیں دیکھی یا اس کے والد مولوی محمد شفیق کا تذکرہ تو نہیں سنا۔ بٹھل کو اس سوال کا جواب معلوم ہو گا۔

ٹھیک تین بجے گاڑی من ماڑ آ گئی۔

اسٹیشن پر دن کا سماں تھا۔ ہر طرف تیز روشنیاں۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ سلمیٰ کی وجہ سے ڈبے سے اترنے میں کچھ دیر ہوئی۔ اس دوران ساری گاڑی خالی ہو گئی۔ پلیٹ فارم پر قدم رکھ کے عجیب سا لگ رہا تھا۔ دست و بازو کی اینٹھن کا اب کچھ اندازہ ہو رہا تھا۔ سارا جسم ہی جکڑا ہوا تھا۔ اب جیسے رسیاں کھل رہی تھیں۔ سب نے گہری سانسیں لیں اور جسم کو جھٹکے دیے۔ لگتا تھا' ہفتوں مہینوں سے سفر کر رہے ہوں۔ سفر بھی کیسی سزا ہوتی ہے۔

ہمارا اور سلمیٰ کا سامان ایک ہی قلی نے اٹھا لیا۔ آدمی بس اپنی خواہش یا اپنے ذہن میں جمی ہوئی بات کی صورت گری چاہتا ہے۔ بٹھل نے قلی سے بمبئی کے بجائے دلی کی گاڑی کا وقت پوچھا تو مجھے بہت اچنبھا ہوا۔ میری حیرانی ایسی بے جواز بھی نہیں تھی۔ من ماڑ بمبئی سے بہت قریب تھا۔ اصولاً یہاں سے بمبئی کا رخ کرنا چاہیے تھا۔ ادھر ابا جان الگ پریشان ہو رہے ہوں گے۔ گزشتہ مرتبہ حیدر آباد میں گزارے ہوئے روز و شب وہ کبھی نہیں بھول سکتے۔ دلی جانے کے ایک معنی تھے کہ بٹھل نے سلمیٰ کی وجہ ہی فیض آباد جانے کا ارادہ کیا ہے۔ میں نے سوچا' بٹھل سے کہوں کہ چند روز کے لیے بمبئی جا کے بھی فیض آباد کا سفر کیا جا سکتا ہے لیکن میں نے زبان بند رکھی۔ بٹھل کو زریں کی حویلی میں سلمیٰ کی پذیرائی کی توقع زیادہ ہو گی۔ میں تو ابا جان کے خیال سے بٹھل کو ٹوکتا ورنہ میرے لیے دونوں جگہیں ایک جیسی تھیں' دونوں کیا' ہر جگہ ایک جیسی تھی۔ مجھے خود احساس تھا کہ زریں بہت انتظار کر رہی ہو گی۔ اس کا شکوؤں بھرا خط بھی آیا تھا۔ دن بھی بہت ہو گئے تھے۔ منیر علی کو بھی ابا جان نے بمبئی میں روک کے رکھا تھا۔ زریں تو اب دل برداشتہ ہونے لگی ہو گی۔ بٹھل کو اس کی فکر بھی بہت رہتی تھی۔ ایک زریں ہی' اس سے اپنے لہجے میں بات کرتی تھی۔ زریں کی خاطر بٹھل نے کلکتے کے اڈے کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ وہ تو بیش تر فیض آباد میں رہنا چاہتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اسے اس کا موقع نہیں مل پاتا تھا۔

قلی نے بتایا کہ دلی کی گاڑی کی روانگی میں پورے ڈھائی گھنٹے ہیں۔ گاڑی کی آمد میں اوپر سے تاخیر ہوئی تو اور دیر ہو سکتی ہے۔ طوفانی بارشوں نے گاڑیوں کے اوقات بری طرح متاثر کر دیے ہیں۔ ہم انتظار گاہ میں آ گئے۔ یہ ایک صاف ستھری جگہ تھی۔ بڑی بڑی آرام دہ کرسیاں' صوفے' میز اور خدمت گار۔ وہاں پہلے سے ایک ادھیڑ مارواڑی جوڑا بیٹھا تھا۔ ہماری آمد سے دونوں پریشان سے ہو گئے اور اپنی جگہوں سے اٹھ کے ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ بٹھل کی فرمائش پر خدمت گار چائے لے آیا۔ دودھ اور شکر الگ الگ برتنوں میں تھے۔ سلمیٰ نے چائے بنائی۔ اس چائے کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔ ابھی ہم نے چائے ختم نہیں کی تھی کہ کمرے کا دروازہ کھلنے پر جو تین آدمی نمودار ہوئے' انہیں دیکھ کے سبھی چونک پڑے۔ وہ ارشاد علی تھا۔ دائیں بائیں دو آدمی اسے سہارا دیتے ہوئے اندر لائے تھے۔ اس کی حالت نہایت ابتر تھی۔ الجھے ہوئے بال' کپڑوں پر شکنیں پڑی ہوئی' بدحواس سا' برسوں کا بیمار نظر آتا تھا "تم یہاں ہو!" سامنے بیٹھی ہوئی سلمیٰ بانو پر نظر پڑتے ہی اس نے سٹ پٹاتے ہوئے کہا "میں نے ساری گاڑی چھان ماری۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے دونوں آدمیوں کا شکریہ ادا کیا۔ وہ دونوں پہلے ہی بیزار کھڑے تھے۔ ارشاد علی کو دروازے کے قریب رکھی ہوئی کرسی پر بٹھا کے رخصت ہو گئے۔ کرسی پر بیٹھتے ہوئے ارشاد علی کی آہ بلند ہوئی "شکر ہے' تم مل گئیں۔" اس نے اکھڑی ہوئی سانسوں سے کہا۔

بٹھل کے پاس بیٹھی ہوئی سلمیٰ بانو کے رخساروں کا خون خشک ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ ارشاد علی کوئی وضاحت کرنا چاہتا تھا کہ بٹھل نے نرمی سے پوچھا "کدھری چھپ گئے تھے بلما۔"

ارشاد علی کراہنے لگا "کیا بتاؤں صاحب! لمبی کہانی ہے۔" وہ نحیف آواز میں بولا۔

"اپن تو سمجھا تم ابھی اودر ہی خلاص ہو گیا۔" زورا نے کسی قدر حقارت سے کہا اور بٹھل کی نگاہ دیکھ کے ٹھٹک گیا۔

ارشاد علی کے چہرے پر شکنیں پڑ گئی تھیں لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا "ٹھیک کہتے ہو بھائی۔ کسر بھی کیا رہ گئی تھی۔ بس کچھ وقت اور لکھا تھا۔"

کسی نے اس سے کچھ نہیں پوچھا تاہم سب کی نظریں اس پر مرکوز تھیں۔ وہ خود ہی بتانے لگا کہ نظام آباد اسٹیشن پر اسے کچھ احساس ہوا کہ پولیس اس پر شبہ کر رہی ہے۔ کسی جھنجٹ سے بچنے کے لیے وہ پلیٹ فارم سے باہر نکل گیا اور یوں ہی کسی خواہش کے بغیر اس نے ایک ہوٹل سے شربت کا گلاس پیا تھا کہ جی متلانے لگا۔ اسی اثنا میں گاڑی نے سیٹی بجا

دی۔ جیسے تیسے وہ گاڑی کے آخری سرے تک پہنچنے اور ایک ڈبے کا دستہ پکڑنے میں کامیاب ہوا۔ ڈبے میں موجود مسافر بھی گھبرا گئے۔ سبھی اس کے گرد اکٹھے ہوگئے اور ہمدردی کا اظہار کرنے لگے۔ کسی نے زنجیر کھینچنے کا مشورہ دیا' کسی نے کمر سہلائی اور پیر سہلائے کسی نے کوئی ٹونکا کیا۔ طرح طرح کی تشخیصیں' تجویزیں۔ جو کھایا پیا تھا۔ ارشاد علی نے لوٹا دیا پھر اسے ہوش نہیں رہا۔ ایک مسافر نے اپنی برتھ اس کے لیے خالی کردی۔ آگے کسی اسٹیشن پر گاڑی ٹھہری تو انہوں نے کسی وید حکیم کے لیے دوڑ دھوپ کی' ان کی کوششیں بار آور نہ ہوسکیں۔ پھر شاید وہ ناندیڑ اسٹیشن تھا کہ ایک مسافر کہیں سے لیموں لے آیا۔ نمک شکر اور لیموں کے سہ آتشہ پانی نے کچھ اثر کیا۔ ارشاد علی کی آنکھیں کھلنے لگیں اور وہ مسافروں کو بتانے کے قابل ہوسکا کہ آگے سیکنڈ کلاس کے ایک ڈبے میں اس کی بیوی کامنی دیوی راہ تک رہی ہوگی۔ جانے اس کا کیا حال ہوگا۔ براہ مہربانی کوئی جاکے اسے خبردار کردے۔ پربھنی میں ایک شخص ساری گاڑی کا چکر لگا کے واپس آگیا۔ مسافروں کی قیاس آرائیوں نے ارشاد علی کو اور ہولا دیا تھا۔ کوئی کہتا تھا کہ اس کی بیوی بوکھلاہٹ میں درمیان کے کسی اسٹیشن پر تو نہیں اتر گئی۔ کسی کی رائے تھی کہ ارشاد علی کو کیوں نہ ریلوے حکام کے حوالے کردیا جائے' وہ اس کی بیوی کو تلاش کرلیں گے اور ارشاد علی کے علاج معالجے کا بھی بندوبست ہوجائے گا۔ پربھنی کے بعد ارشاد علی کی طبیعت اور زیادہ خراب ہونے لگی لیکن وہ ضبط کرتا رہا پھر جس اسٹیشن پر گاڑی ٹھہری' ارشاد علی نے اتر کے اپنے ڈبے میں جانے کا عزم کیا۔ چند قدم چلنے پر اس کی سانسیں پھولنے اور ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں۔ مسافر اسے واپس ڈبے میں لے آئے۔ سلمٰی کی فکر نے ارشاد علی کو اور آزردہ کر رکھا تھا۔ رات کو جالنا اسٹیشن پر اس نے پھر ایک مسافر سے التجا کی۔ مسافر نے مطلوبہ ڈبا تلاش کرلیا تھا لیکن بتایا کہ ڈبا بند ہے۔ اس نے کئی بار دستک دی۔ کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔ ارشاد علی کے بقول سلمٰی کے تحفظ' اس کی استقامت اسے کسی ناگہانی سے بچائے رکھنے کے لیے وہ دعائیں مانگتا رہا۔ اسے کم از کم اس طرف سے یہ اطمینان تھا کہ ڈبے میں ہم شرفا بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہماری موجودگی میں سلمٰی کا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ اورنگ آباد میں جب اضطراب حد سے سوا ہوا تو ارشاد علی پھر ڈبے سے اترنے لگا۔ مسافروں نے اسے روک لیا کہ کسی طور اس کی طبیعت قابو میں آئی ہے۔ اب من ماڑ دور ہی کتنا رہ گیا ہے اور کچھ دیر کے لیے وہ سینے پر پتھر رکھ لے اور بہتر ہے کہ آرام کی کوشش کرے۔ من ماڑ اسٹیشن پر مسافروں کو بہت جلدی تھی۔ گاڑی ٹھہرتے ہی سب اجنبی سے ہوگئے۔ وہ اسے گیٹ کے پاس بینچ پر بٹھا کے چلے گئے اور ارشاد علی نے خود ہمت مجتمع کی۔ وہ سلمٰی کو ساری گاڑی میں کھوجتا رہا۔ دیکھتے دیکھتے گاڑی خالی ہوگئی اور ایک ایک کرکے سب مسافر گزر گئے تو اس نے دو آدمیوں سے درخواست کی کہ وہ اسے انتظار گاہ تک لے چلیں۔

ارشاد علی اپنی زیر و زبر سانسیں ہموار کرنے کے لیے بار بار رک جاتا تھا۔ اس نے ہم سب کا شکریہ ادا کیا کہ ہم نے باکمال شرافت سلمٰی کا خیال رکھا۔ اس کے پاس ممنونیت کے لیے لفظ نہیں' خدا ہی اس کا اجر دے گا۔

کسی نے دخل نہیں دیا۔ سب خاموشی سے اس کی تاویلیں سنتے رہے۔ یہ ایک کہانی تھی۔ ارشاد علی کو اپنے طویل غائب ہونے کا کوئی نہ کوئی عذر تو تراشنا تھا۔ اس کے سوا وہ کہہ بھی کیا سکتا تھا۔

سکندر آباد سے نظام آباد تک کا سفر اس نے ہمارے ساتھ کیا تھا۔ ہماری باتوں سے اسے معلوم ہوگیا ہوگا کہ ہماری منزل بھی من ماڑ ہے۔ یہی ایک خدشہ اس کے پیروں کی زنجیر بنا ہوگا کہ نظام آباد کی طرح پولیس کسی اور اسٹیشن پر یلغار نہ کردے۔ یہی قرین مصلحت تھا کہ وہ اور سلمٰی الگ الگ سفر کرتے رہیں۔ گاڑی اورنگ آباد پہنچنے کے بعد پولیس کی دست اندازی کا خدشہ بڑی حد تک دور ہوگیا تھا۔ ارشاد علی اپنے ڈبے میں واپس آسکتا تھا لیکن من ماڑ اسٹیشن پر اچانک ہمارے سامنے نموداری اس داستان سرا کی خلاقی کا اثر سوا کرتی تھی۔

ارشاد علی کے خاموش ہوجانے کے بعد کسی نے کچھ نہیں کہا۔ اس صورت حال سے اسے پریشان ہوجانا چاہیے تھا۔ سلمٰی بھی بے جنبش بیٹھی رہی۔ ارشاد علی کرسی پر پہلو بدلنے لگا۔ یہ جمود کسی کے لیے بھی نہایت اعصاب شکن اور صبر آزما ہوتا ہے۔ ارشاد علی کی سمجھ میں کوئی اور بات نہ آئی تو اس نے بے تابی سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پانی کی خواہش کی۔

جگ اور گلاس میز پر رکھے ہوئے تھے۔ ہم میں سے کوئی نہیں اٹھا۔ اسے سلمٰی سے توقع ہوگی۔ سلمٰی نے بھی جیسے کچھ نہیں سنا۔ زدرا کے تالی بجانے اور صدا لگانے پر خدمت گار حاضر ہوا۔ زدرا نے اسے ارشاد کو پانی پلانے کی ہدایت کی۔ پانی پی کے ارشاد علی نے نقاہت سے آنکھیں میچ لیں۔

"تم کو اسپتال بھجوا دیں لالا؟" جمرو نے آخر زبان

کھولی۔

ارشاد علی خالی خالی نظروں سے جمرو کو دیکھا کیا اور بے بسی کے انداز میں دونوں ہاتھ پھیلا کے رہ گیا۔

"تمہاری حالت تو بہت الٹی لگتی ہے۔" جمرو نے تیکھی آواز میں کہا "جلدی دوا دارو نہیں ہوئی تو اور مٹی نہ ہوجائے۔"

"کیا بتاؤں بھائی! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" ارشاد علی نے شکستگی سے کہا "گھر پہنچنا بھی ضروری ہے۔"

"کدھری ہے گھر تمہارا؟" جمرو نے بظاہر سادگی سے پوچھا۔

"ادھر نینی تال سے پہلے' سمجھو رام نگر جانا ہے۔" ارشاد علی نے ایک لمحے کے توقف کے بعد کہا۔

"وہ تو بہت دوری پے ہے بھیا!"

"دور تو ہے۔" ارشاد علی پژمردگی سے بولا "لیکن' لیکن گھر ہے۔"

"نہ۔۔۔ نہ' لالا! پہلے کسی وید حکیم کے پاس جاکے اپنے کو کسواؤ' ہم کو بولو' ہم کس کارن ادھری بیٹھے ہیں۔"

"آپ گاڑی میں سوار کرادیں۔" ارشاد علی نے ناتوانی سے کہا "اب پہلے سے کچھ اچھا ہے۔ آپ کا بہت شکریہ۔ گھر پہنچ کے سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

"جیسی تمہاری مرضی مہاراج!" جمرو شانے اچکا کے بولا "دلی کی گاڑی میں ابھی دیری ہے' بیٹھو ادھری شانتی سے۔"

"دادا! بولے تو اپن لالا کے لیے ایک ٹونکا کرنے کا۔" زورا نے مچل کے بٹھل سے کہا' پھر ارشاد علی سے پوچھنے لگا "لالا! ابھی کیا نام بولا تم نے اپنا؟"

ارشاد علی نے ابھی تک اپنا کوئی مصنوعی نام ہی نہیں بتایا تھا' وہ کسمسانے لگا اور ہکلاتے ہوئے بولا "میرا نام پوچھتے ہو بھائی! ایشوری پرشاد' ایشوری پرشاد۔"

"لالا ایشوری پرشاد!" زورا نے آنکھیں چوڑی کرکے کہا "نام تو ایک دم فسٹ کلاس ہے۔" ابھی بولے تو اپن ایک پرانا ٹونکا کرکے دیکھے۔

"کیسا ٹونکا؟" ارشاد علی چونک کے بولا۔

"اپن کا باپ دادا سے چلتا پڑا ہے۔ ایک باری میں آدمی اکھا سیدھا ہوجاتا ہے۔" زورا نے وثوق سے کہا۔

"بس بھائی!" ارشاد علی کی گردن ڈھلک گئی "بہت تماشے کرلیے ڈبے کے لوگوں نے۔ بس کچھ اور نہیں' کوئی جادو ایسا کرو کہ جلد سے جلد گھر پہنچ جاؤں۔"

"وہی تو بولتا ہے' ایک ابھی اپن کا چمتکار بھی دیکھو۔ دوڑ کے ایک دم ابھی ایدر سے نئیں گیا تو ماں قسم' اپن آدمی کا جنا نئیں۔"

"ہاں دادا ہوجائے قسم سے۔" جمرو نے زورا کو مہمیز کیا اور ارشاد علی سے بولا "ابھی دیکھو لالا' دادا اتنا اونچا بولتا ہے تو خالی نہیں ہوگا۔"

"رہنے دو بھائی" ارشاد علی نے بیزاری سے کہا "میں نے آپ کو بتایا نا' اب پہلے سے بہت آرام ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ کامنی اور آپ لوگوں کو دیکھ کے آدھی تکلیف تو ویسے بھی دور ہوگئی۔"

"آدھا ابھی اپن خلاص کردے گا۔" زورا اپنی آواز کی گرمی نہ چھپا سکا۔

ارشاد علی ایک پرکار آدمی تھا۔ اسے کھٹک جانا چاہیے تھا لیکن اس کے پاس مفر کا کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ اس پہلو تہی' درگزری کے رویے ہی میں اس کے لیے عافیت تھی۔ سلمٰی کی خاموشی اس کے سینے میں بہت شور مچا رہی ہوگی۔ بار بار اس کی نظریں سلمٰی پر منڈلانے لگتی تھیں۔ زورا کرسی سے اٹھ کے اس کے قریب پہنچا تو اس کی حالت اور اضطراری ہوگئی۔ اس نے ہاتھ جوڑ کے زورا سے کہا کہ اسے معاف رکھا جائے۔ وہ ٹوٹکوں پر یقین نہیں رکھتا۔

"ایسا کیسے لالا۔" زورا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ارشاد علی کو کرسی سے اٹھا کے پٹخ دے۔ اس نے آناً فاناً پیروں سے پشاوری طرز کا جوتا اتار لیا "ابھی ایک دو میں اکھا دھول اتر جائے گا۔"

ارشاد علی کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ وہ بھی کرسی سے اٹھ گیا "یہ' یہ آپ کیا کررہے ہو۔ میں' میں آپ کو منع کررہا ہوں۔"

"دیکھا دادا۔" زورا نے بٹھل سے کہا "اپن ابھی چالو بھی نہیں کیا' کیسا جان پڑ گیا لالا میں۔"

بٹھل نے سنی ان سنی کردی۔ اسے تو جیسے کوئی واسطہ ہی نہیں تھا۔ وہ بیڑی کا دھواں اڑاتا رہا۔ اس کا سکوت زورا کے لیے صاف اقرار تھا۔ زورا کو اب روکنا ممکن نہیں رہا تھا۔ اس نے ذرا بھی تاخیر نہیں کی' مبادا کسی جانب سے تحمل اور احتیاط کی صدا بلند ہوجائے' کسی اور طرف سے نہیں تو سلمٰی ہی کی طرف سے' جوتا اٹھا کے اس نے زور سے ارشاد علی کے کندھے پر رسید کیا۔ ارشاد علی بلبلا گیا اور فرش پر پیر مارنے لگا۔ زورا نے دوسری ضرب میں بس ہاتھ اٹھانے کا وقفہ کیا۔

مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن خود کو اچھا لگنے کی کوئی متبادل صورت بھی میرے ذہن میں نہیں تھی۔ ارشاد علی کسی رعایت کا حقدار نہیں تھا اور اس کے لیے شاید یہی طریق کار موزوں تھا۔ وہ اڈے کا آدمی بھی نہیں تھا' ورنہ اس سے اڈے کے آدمیوں کے طور نمٹا جاتا۔

سلمٰی کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اس پر حیرت اور ہیجان کا عالم طاری تھا' رنج و ملال کا بھی۔ ارشاد علی دروازے کی طرف بھاگنے لگا تھا کہ زورا نے اس کا راستہ روک لیا۔ مارواڑی اور اس کی بیوی اپنی نشستوں سے اٹھ کے دیوار سے چپک گئے۔ چیخ پکار سن کے خدمت گار بھی لپکتا ہوا اندر آگیا۔ میرا خیال تھا' زورا طول نہیں دے گا یا بٹھل کسی لمحے اسے ہاتھ روکنے کا اشارہ کردے گا لیکن بٹھل نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں' وہ تو جیسے وہاں تھا ہی نہیں۔ اس کے' زورا اور جمرو کے دماغ میں لازماً ایسی کوئی خوش فہمی نہیں ہوگی کہ ارشاد علی اس تحقیر و تذلیل پر ہماری نظروں سے دور ہو جائے گا یا سلمٰی سے دستبردار ہو جائے گا۔ پھر انہوں نے کیا سوچ کے یہ ابتدا کی تھی' یہ جگہ تو ویسے بھی ارشاد علی کی تہدید و تادیب کے لیے ناموزوں تھی۔ انتظار گاہ سے اٹھنے والا شور نزدیک سے گزرنے والوں کو متوجہ کر سکتا تھا۔ زورا تو دیوانہ سا ہو گیا تھا۔ اڈے کے آدمی کو یوں بھی عام آدمی سے مڈبھیڑ میں بڑی جھنجلاہٹ ہوتی ہے۔ ارشاد علی نے زورا کا ہاتھ گرفت میں لینے اور زورا کو خود سے دور رکھنے کے لیے شدومد سے اپنی جیسی کوشش کی تھی۔ اس کشمکش کے دوران زورا نے اس کی کمر پر ایک اور ضرب لگائی۔ ارشاد علی دہرا ہو گیا اور ڈکرانے لگا۔

زورا پھر ٹھہر گیا۔ ارشاد علی ہانپ رہا تھا۔ وہ کئی بار سلمٰی کو فریاد کناں نظروں سے دیکھ چکا تھا۔ ان نظروں میں برہمی بھی تھی' شکایت بھی۔ سلمٰی نے اپنا چہرہ ہی چھپا لیا۔ ارشاد علی نے اتنی دیر میں ہمارے تیوروں سے بہت کچھ اخذ کیا ہوگا۔ کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے تک یا کسی موہوم خوش خیالی میں اسے بہرطور اپنی سادہ دلی و سادہ لوحی کا تاثر ہی دیتے رہنا چاہیے تھا۔

وہ کرسی پر سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔ اس کا جسم اب ڈھلکا ہوا نہیں تھا۔ چہرے پر رنگ آ جا رہے تھے۔

"اب کیسا ہے لالا؟" کچھ دیر بعد زورا نے ٹھہری ہوئی آواز میں پوچھا۔

ارشاد علی نے دونوں ہاتھ اٹھا دیے اور عاجزی سے بولا "بس بھائی! ٹھیک' بالکل ٹھیک ہوں۔"

"ایسا نا!" زورا نے چہک کے کہا "اپن کیا بولا تھا۔ ابھی ایک بار بھاگ کے اکھا کمرے کا چکر لگانے سے بالکل پھڑ پھڑانے لگے گا' سمجھا!"

کمرے میں سناٹا سا ہو گیا۔ مارواڑی سیٹھ اپنی بیوی کے ساتھ دبے پاؤں باہر نکل گیا۔ اس دوران میں نے اس سکوت میں کسی عناد و فساد کی بو سونگھ لی ہوگی۔ بٹھل کی ترغیب پر سلمٰی میز کے گرد والی کرسی سے اٹھ کر آرام کرسی پر نیم دراز ہو گئی۔

بٹھل بھی اس کے قریب آگیا کہ سلمٰی کو سکون اور سائے کا احساس رہے۔ خدمت گار نے جمرو کی اجازت سے روشنیاں کم کر دیں۔

ارشاد علی کے انتشار کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ ہر لمحہ اس پر عذاب ہوگا۔ سب کچھ اس کے سامنے تھا۔ اپنی داستان کی بے اثری کا احساس اسے اچھی طرح ہو جانا چاہیے تھا اور داستان تو اس نے بعد میں سنائی تھی۔ اس کا خستہ و شکستہ حال بھی تو کچھ کہہ رہا تھا۔ نظام آباد سے من ماڑ تک کئی پہر کی گمشدگی کے بعد وہ سلمٰی کے سامنے آیا تھا۔ اسے دیکھ کے سلمٰی بے قرار ضرور ہوئی تھی لیکن ارشاد علی کو اس کی جانب سے شادیٔ مرگ کی سی کیفیت کی توقع ہوگی۔ شکایت یا ناراضی کے اظہار کی یا غصے کی۔ ممکن ہے ارشاد علی نے سلمٰی کی بے زبانی کسی بے بسی و بے چارگی پر محمول کی ہو اور کسی دم اسے گمان ہوا ہو کہ اس کی عدم موجودگی کے دوران ہم مختلف قسم کے اجنبیوں کے پاس سلمٰی پر اپنی دہشت بٹھانے کا اچھا وقت تھا۔ ارشاد علی کو یہ خدشہ بھی بجا طور پر لاحق ہونا چاہیے کہ ہم لوگوں کو کہیں سلمٰی کی تحویل میں نوادر و جواہر کے ذخیرے کا علم تو نہیں ہو گیا ہے۔ اس کی ایک جھلک آدمی کو اندھا کر سکتی ہے۔ واپس ارشاد علی کی پناہ میں آنے کے لیے اتنی دیر تک کوئی تو اضطراب سلمٰی کی آنکھوں' اس کے چہرے پر ہویدا ہونا چاہیے تھا۔

کوئی ایک گھنٹا ایسے ہی گزر گیا۔ ارشاد علی کے لیے یہ مدت برسوں کے برابر ہوگی۔ وہ ریت پر نقش بناتا رہا ہوگا۔ ہو سکتا ہے اس نے ہواؤں سے بچا کے کوئی خاکہ مکمل کر لیا ہو۔ گھنٹے بعد خدمت گار نے آ کے مطلع کیا کہ اوپر سے گاڑی آدھے گھنٹے کی تاخیر سے آ رہی ہے۔ دلی روانگی میں بھی کچھ یہی تاخیر ہوگی۔ سکندر آباد میں جمرو اور زورا نے من ماڑ تک کے ٹکٹ بنوائے تھے۔ باقی سفر کے ٹکٹ خریدنے کے لیے جمرو اور زورا خدمت گار کے ساتھ باہر چلے گئے۔ انتظار گاہ میں اب ہم صرف چار رہ گئے۔ بٹھل' سلمٰی' ارشاد علی اور

میں۔ ارشاد علی کے پاس اپنی منزل کے ٹکٹ ہوں گے۔ اس لیے ٹکٹوں کے ذکر پر اس کے ہاں کوئی حرارت اور حرکت نہیں ہوئی۔ سلمٰی چادر لپیٹے ترچھی ترچھی کرسی پر سمٹی رہی۔ اس نے ارشاد علی کی طرف سے منہ پھیر رکھا تھا۔ میرا خیال تھا کسی بہانے ارشاد علی' سلمٰی سے سلسلہ جنبانی کی کوشش کرے گا۔ وہ بت بنا بیٹھا رہا۔ کوئی بیس پچیس منٹ میں جمرو اور زورا واپس آگئے۔ انہوں نے جوشیلے انداز میں بتایا کہ انہیں فرسٹ کلاس کے ٹکٹ مل گئے ہیں۔

ایک لحظے کے لیے ارشاد علی کی آنکھوں میں بجلیاں کوندی تھیں اور ہونٹ بھی پھڑکے تھے لیکن کسی احتیاط میں اس نے زبان ہی بند رکھی۔

گاڑی میں کچھ اور تاخیر ہو گئی تھی۔ چھ بجے اچھا خاصا اندھیرا ہو گیا تھا۔ گاڑی کی آمد سے آدھ گھنٹے پہلے خدمت گار نے ہمیں تیار ہو جانے کی مودبانہ تاکید کی۔ بٹھل کی ایما پر پہلے سلمٰی' پھر ہم سب نے انتظار گاہ سے پیوستہ غسل خانے میں۔۔۔ ہاتھ منہ دھویا۔ جمرو کے کنگھے سے سب نے بال درست کیے۔ صبح کی ہوا میں خنکی اور بڑھ گئی تھی۔ من ماڑ اسٹیشن پر گاڑی دیر تک رکنے کا امکان تھا۔ پلیٹ فارم پر جانے کے بجائے بٹھل وہیں بیٹھا رہا اور چند لمحوں بعد اس نے سرد لہجے میں ارشاد علی سے پوچھا کہ اس کا کیا ارادہ ہے؟

"کیسا ارادہ جناب؟" ارشاد علی نے تعجب سے کہا۔

"بٹیا تو اپنے ساتھ جا رہی ہے۔"

"آپ کے ساتھ! کون' کون؟" ارشاد علی اچھل گیا "کون بٹیا؟"

"ادھری ایک ہی بیٹھی ہے۔"

"آپ' آپ کامنی کے۔۔۔"

"ہاں رے۔" بٹھل نے دھیمی آواز میں کہا "اس نے بولا ہے' یہ اپنے ساتھ جائے گی۔"

"پر کہاں' کہاں؟" ارشاد علی بری طرح بوکھلا گیا۔

"جدھری بھی ہم لے جائیں۔"

"کیا' کیا کہتے ہیں آپ!"

"ٹھیک بولتے ہیں' اسی سے پوچھ لے۔"

ارشاد علی گنگ ہو گیا۔ اس نے سلمٰی کی طرف دیکھا۔ وہ منہ چھپائے اور سر جھکائے ہوئے تھی "کامنی میری بیوی' میری پتنی ہے۔" وہ وحشت زدگی سے بولا۔

"پتہ ہے' اپنے کو سارے کا پتہ ہے۔"

"کیا' کیا پتہ ہے۔" ارشاد علی نے سٹپٹا کے کہا "کیا کیا۔۔۔"

بٹھل نے ہاتھ اٹھا کے اسے روکا "اتنا نہیں پوچھ اپنے سے۔ گاڑی آنے کو ہے۔ تجھ کو جو بولا ہے' اتنا ہی ٹھیک ہے۔ زیادہ چڑ چڑ کی تو تجھ کو کھاتا ہوگا۔ تجھ کو آخری بار سلمٰی بٹیا سے بات کرنے کو ہے تو کر لے۔"

ارشاد علی کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ بٹھل کی زبانی سلمٰی کا نام سن کے اس کی رگوں میں خون منجمد ہو گیا ہوگا اور سانسیں سینے میں اٹک گئی ہوں گی۔ اس کا چہرہ ہی بگڑ گیا تھا۔ آگے اس سے کچھ نہیں کہا گیا۔ آگے کہنے کے لیے اسے کچھ اخذ کرنا بھی لازم تھا۔ جسم و جاں میں کتنی ہی پتھر کی آمیزش ہو' ارشاد علی پورا پتھر کا بنا ہوا تو نہیں تھا۔ اپنے حواس کی درستی تک اسے لب کشائی کی جرات نہیں کرنی چاہیے تھی۔

"کیا ہو گیا مہاراج؟ جاپ الٹا ہو گیا!" جمرو نے زہریلے لہجے میں کہا۔

ارشاد علی کی پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آئے تھے۔ اس نے گہری سانس لی اور ڈوبتی آواز میں بولا "آپ کو سب بتا دیا ہے بانو نے! اور' اور سچ ہی بتایا ہوگا۔"

"اپنے کو بھی تھوڑی پہچان ہے۔" بٹھل نے ترشی سے کہا۔

"اس نے کم ہی بتایا ہوگا۔"

"پھر میری بھی کچھ عرض سن لیجیے۔" ارشاد علی کی آواز پر ویرانی چھائی ہوئی تھی۔

"تو کیا بولے گا اب؟"

"ہاں۔" ارشاد علی نے ماتمی لہجے میں کہا "آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ آپ نے سب جان لیا ہے تو اب مجھے کیا کہنا ہے۔ میرے پاس اب کیا ہے۔"

"اچھا ہے' جلد تیرے سامنے میں آگئی۔ بہت تماشا کر لیا تو نے۔ اب راستہ لے اپنا۔"

"آپ نے کتنی آسانی سے فیصلہ کر دیا۔ میں' میں کہاں جاؤں گا۔ میرا تو سلمٰی بانو کے سوا کوئی بھی نہیں ہے۔ بانو کو معلوم ہے کہ میرا کوئی بھی نہیں ہے۔"

"تیرا ٹھیکا نہیں لیا ہے بانو نے یا تو نے اس کا۔"

"آپ کو' آپ کو معلوم ہے' یہ میری منکوحہ ہے۔" ارشاد علی نے لکنت سے کہا۔

"معلوم ہے۔ سارا بول دیا ہے اس نے۔ چار آدمی کے بیچ بول پڑھوائے تھے تو نے۔ پر تو اب اس کی چھٹی کر دے۔ جیسا تو نے نکاح کیا تھا' ویسے ہی ادھر حویلی میں بہن بھی بولا تھا اس کو۔"

"خدا جانتا ہے۔ میں تو سب کچھ سلمٰی بانو کے لیے کرنا چاہتا تھا۔ مجھ اکیلے کا کیا۔ میرے آگے پیچھے کون ہے۔ بانو میری بیوی ہی نہیں' میری ذمے داری بھی ہے۔ اس نے بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ میری تو ہر پل یہی کوشش' یہی آرزو رہی ہے کہ ایک دن ایسا آئے جب میں اس کے سارے دکھ دور کرنے کے قابل ہو جاؤں۔"

"اپنے پاس تو تکاری کا ٹائم نہیں ہے۔" بٹھل نے ناگواری سے کہا۔

"بانو میری زندگی ہے جناب' میری دنیا ہے' میں تو اس کے بغیر مر جاؤں گا۔"

"زمین تھوڑی ہلکی ہو جائے گی۔" بٹھل نے اچٹتی آواز میں کہا۔

"ایسا نہ کیجئے' خدا کے لیے ایسا نہ کیجئے' آپ کو بہت بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔" ارشاد علی دہائیاں دینے لگا۔

"اپنے کو کیا ہوئی ہے رے' اس کو تیری بانو کو ہوئی ہے۔ ہم کو کیا بولتا ہے' اسی سے پوچھ۔"

"بانو اب کیا۔ کیا کہے گی۔" ارشاد علی یاسیت سے بولا۔

"ابھی تو مینا کی طرح بولے گی۔ تیرے ساتھ نہیں ہے۔ اب تیرے سارے پنجرے تالے توڑ دیے ہیں ہم نے۔ اپنے سامنے نہیں تو اندر کمرے میں اسے لے جا۔"

ارشاد علی کو کسی پہلو قرار نہیں تھا۔ بانو سے مخاطب ہونے یا اسے اندر کمرے میں لے جا کے داد و فریاد کرنے سے کچھ حاصل ہونے کی توقع ارشاد علی کو نہیں رہی تھی اس لیے اس نے بٹھل کی پیش کش پر توجہ نہیں دی اور مایوسی سے کہا "ہو سکے تو پھر مجھے بھی ساتھ لے چلئے۔"

"تیرا کیا اچار ڈالیں گے بھیا!" جمرو نے لہرا کے کہا۔

"میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ میں بھی کہیں پڑا رہوں گا۔" ارشاد علی نے عاجزی سے کہا "مجھے ایک موقع دیجئے۔ میں اس دربدری سے تنگ آ چکا ہوں' بہت تھک چکا ہوں۔"

"پھر کسی مسجد یا آستانے کی طرف نکل جا۔"

"دیکھئے بڑے صاحب! میری بات سنئے۔" ارشاد علی نے شکستہ آواز میں کہا "میں نے بہت کوشش کی ہے بانو کو خوش رکھنے کی۔ قسمت نے ساتھ نہیں دیا۔ میں آپ کو کیا بتاؤں' کہاں کہاں مارا مارا پھرتا رہا ہوں۔ جب کچھ نہ بنا تو بے شک الٹے سیدھے راستے بھی اختیار کیے۔ بچپن میں والدین جدا ہو گئے۔ گھر چھوٹا' شہر چھوٹا پھر ایک گھر ملا تھا' وہ بھی برباد ہو گیا۔ میں تو شروع سے بد نصیب ہوں۔ بانو کو میں نے سہارا دیا تھا لیکن بانو خود میرے لیے بہت بڑا سہارا بن گئی تھی۔ پھر میں نے اسی کے لیے سوچا' اسی لیے کیا ہے جو نہیں کر سکا' اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا جو کر سکا' اس سے زیادہ میرے بس میں نہیں تھا۔ عورت کی طرح مرد کو بھی کسی چھت' کسی سائبان کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"بہت بیلا ہے استاد قسم سے۔" جمرو سے برداشت نہیں ہوا' ہاتھ نچا کے کہنے لگا "کاشی والی نوٹنکی میں اچھا چلے گا۔"

"اپن پہلے ہی بولا تھا۔ ایک نمبر کا حرامی ہے۔" زورا منہ بنا کے بولا "ابھی کیسا طوطے کی مافک ٹیں ٹیں کرتا ہے سالا۔" گاڑی کی آمد کا وقت قریب آ رہا تھا۔ بٹھل نے ہمیں اٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ ہماری دیکھا دیکھی ارشاد علی بھی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی حالت دیوانوں کی سی تھی۔ وہ ہذیان بکنے لگا۔ کسی نے اس کی جانب پھر جیسے دیکھا ہی نہیں۔ یکایک وہ جھپٹتا ہوا بٹھل کے مقابل آ کے ٹھہر گیا۔ سلمٰی بھی کھڑی ہو گئی۔ میری طرح سب یہی سمجھے ہوں گے کہ اب ارشاد علی سلمٰی سے منت کرے گا یا بٹھل کے پاؤں پڑ جائے گا لیکن پلک جھپکتے میں اس نے جیب سے چاقو نکال لیا اور ایک قدم پلٹ کے سلمٰی پر تان لیا۔ یہ کھٹکے والا رام پوری طرز کا چاقو تھا۔ اڈے کے آدمیوں کو اس قسم کا چاقو بہت مرغوب ہوتا ہے۔ ارشاد علی کی گرفت میں مشاقی تھی۔ ایک ہاتھ سے اچھال کے دوسرے ہاتھ میں چاقو پکڑنے کی مشق کا اظہار اس نے کمال چابک دستی سے کیا۔

"یہ تو اپنا ہی کوئی آڑی لگتا ہے استاد!" جمرو نے پٹ پٹاتی آنکھوں سے کہا۔

"کسی نے ایک قدم بھی اپنی جگہ سے حرکت کی تو بہت برا ہو جائے گا۔" ارشاد علی سرگشتگی سے بولا "اسے مجھ سے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔" اس کی آواز بھی بدل گئی تھی۔

"سب اپنی اپنی جگہ ٹھہر گئے۔ ارشاد علی کی آنکھوں میں آگ بھڑکنے لگی تھی۔

"استاد! اب اصل روپ میں آیا ہے سور کی اولاد۔" جمرو نے من مناتے ہوئے کہا۔

بٹھل نے جھڑکتی نظروں سے جمرو کو دیکھا اور مفاہمانہ لہجے میں ارشاد علی سے بولا "پر یہ تو خود تجھ سے الگ ہونا چاہتی ہے۔"

"جانتا ہوں' تم لوگوں نے اسے کیا پٹی پڑھائی ہے۔ کوئی ایک اجنبی عورت پر یوں ہی مہربان نہیں ہو جاتا۔ تمہاری ہمدردی کی وجہ میں جانتا ہوں۔" ارشاد علی چیخ کے بولا۔

"یہ تو پاگل ہو گیا ہے رے۔" بٹھل نے تردد سے کہا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

"پاگل تو تم سارے مجھے لگتے ہو۔" ارشاد علی نے آتش باز لہجے میں بٹھل کو حکم دیا کہ وہ کرسی سے فوراً اٹھ جائے۔

"تسلی سے رے۔ ایسا کیا ہے۔" بٹھل نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے کہا۔

"بہت ہو گیا اب۔ بہت تسلی کر کے دیکھ لی تم سے۔" ارشاد علی پھنکارتے ہوئے بولا "تمہارا خیال ہے' میں دیکھتا رہوں گا۔ بانو کو ان لوگوں کے حوالے کر دوں گا جن کے آگے پیچھے کا کوئی پتا نہیں۔ بانو کے لیے میں نے پورے پانچ سال رات دن ایک کیے ہیں۔ اب ایک گھر بسانے' بانو کے دکھ درد دور کرنے' اسے سکھ دینے کا کوئی آسرا ہوا تو تم لوگ خدائی فوجدار بن کے بیچ میں آ گئے "ہا' کیسا مذاق ہے یہ۔"

"بیچ میں تو' تو آیا تھا اپنے۔ چاقو ہاتھ میں دھر کے بھی گھما پھرا کے بولتا ہے اور کم کیوں بولتا ہے۔ شروع سے لے۔ بانو کے گھر نقب لگانے کے ٹائم سے۔ پہلے بھائی کو بلی پہ چڑھا کے منکا تڑوا دیا پھر ماں کی ڈور کاٹ دی۔ پھر تو تو ہی تھا جنگل کا شیر ببر' وہیں سے حساب کر۔"

"یہی سب کچھ تم نے بانو کو سمجھایا ہے نا۔"

"اس نے کتنا بولا "ہم نے کتنا' یہ تو یہی جانتی ہے رے۔" بٹھل نے ملامت سے کہا۔

"اس وقت ڈبے کی بات اور تھی۔ بانو کو میری واپسی کی امید نہیں رہی ہو گی۔ اس وقت اسے گھبرا جانا' خوف زدہ ہو جانا چاہیے تھا۔ عورت ذات ایسے میں کیا کر سکتی ہے۔ بانو نے لاچاری میں آنسو بہائے ہوں گے لیکن اب میں' میں اس کا نگہبان' اس کا رکھوالا واپس آ گیا ہوں۔"

"دیر بہت ہو گئی تجھ کو آنے میں۔" بٹھل کی آواز ابھی تک ٹھہری ہوئی تھی "لاچار تو' تو ہی اسے بنا کے گیا تھا۔ اپنا گلا بچانے کو۔ اپنی عزت کو غیر مردوں کے بیچ چھوڑ کے چلا گیا تھا' پولیس اس کو ڈبے سے لے جاتی تو کدھری سے چھاتی پھلا کے آتا۔"

"تم کیا سمجھتے ہو۔" ارشاد علی سر جھٹک کے بولا "ایسے تھوڑی چلا گیا تھا' جان کے گیا تھا' بانو کے خیال سے۔ بانو کے لیے اور میرے لیے یہی بہتر ہے۔ میرے چلے جانے سے یہ زیادہ محفوظ ہو گئی تھی۔"

"پولیس کو ہم تلاشی سے روک کے نہ رکھتے تو تیری یہ گھر والی' تیری زندگی ادھری حوالات میں سلاخیں چاٹ رہی ہوتی۔" بٹھل نے بیڑا جلاتے ہوئے کہا۔

"ذرا بانو سے پوچھ بھتنیا کے' وہ تیری ماں کے یار' وردی والوں کو ہم نے کیسے روکا تھا۔" جمرو کو پھر تاؤ آ گیا۔

"دیکھ رے' زبان سنبھال کے بات کر۔ مجھ کو بھی یہ زبان اچھی آتی ہے۔" ارشاد علی نے طیش میں کہا۔

"تجھ کو کیا نہیں آتا کتے' گھوڑے کی اولاد۔" جمرو کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ جھپٹ کر ارشاد علی کی گردن دبوچ لے۔

بٹھل نے جمرو کو ڈپٹ دیا اور ارشاد علی سے بولا "پولیس اس کو دھر لیتی تو اپنا بھی تختہ ہو جاتا۔ تو نے اپنے کو پھندا ڈلوانے کا پورا چکر چلا دیا تھا۔"

"یہ تو کہنے کی باتیں ہیں' تمہارا کیا بگڑتا۔ وقت پڑنے پر صاف الگ ہو جاتے۔" ارشاد علی ڈھٹائی پر اتر آیا۔ کہنے لگا "ڈبے میں چار مرد تھے اور سامنے ایک کمزور عورت بیٹھی تھی۔ تمہاری جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی کرتا۔"

"سب تیرے باپ کا نمک کھاتے ہیں نا؟"

"ٹھیک ہے' تم نے بہت احسان کیا۔ میرے باپ دادا پر احسان کیا۔" ارشاد علی دکھاوے کی بے زارگی سے بولا "اب کیا ہے' کیا چاہتے ہو تم؟"

"اپنی بول رے' چاہنا تو سارا تیرا ہی لگتا ہے۔ چاقو تیرے ہاتھ میں ہے۔"

"میرے راستے سے ہٹ جا۔"

"پھر تو کیا کرے گا؟"

"پھر خون خرابہ ہو سکتا ہے۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ میں بانو کو نہیں چھوڑ سکتا۔ کسی حالت میں بھی۔" ارشاد علی نے دو ٹوک انداز میں بولا "تمہیں معلوم ہے' بانو کس خاندان کی بیٹی ہے؟"

"بولا ہے بانو نے۔" بٹھل نے سر ہلا کے کہا "اور یہ بھی بولا ہے کہ تو نے اسے حویلی میں نوکرانی رکھوا دیا تھا۔"

"ایسی ویسی جگہ نہیں۔" ارشاد علی جھلا کے بولا "وہ بہت بڑے' بڑی عزت و شان والے لوگ تھے۔ وہاں بانو پھول کی طرح رہی' بیگمات کی طرح۔"

"کیسا ہے رے' انہی کے گھر کا کونڈا کر دیا۔"

"تم کیا جانو اور تمہیں جاننے کی ضرورت بھی نہیں' ہم پر کیسی کیسی قیامتیں ٹوٹی ہیں۔" ارشاد علی کے پاس کوئی دلیل نہیں ہو گی۔ وہ یہی کہہ سکتا تھا جو سلمٰی ہمیں پہلے بتا چکی تھی کہ ان عالی شان محل والوں کو اس معمولی خرد برد سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان کے لیے تو یہ آٹے میں نمک کے برابر ہے۔"

"پر تو نے اپنا خاندان نہیں بتایا حرام کے جنے۔" جمرو

نے لہک کے کہا "تو اپنے کو اٹھائی گیروں کے خاندان سے جان پڑتا ہے۔ بانو کی جوتی دیکھی ہے تونے؟"

"جانتا ہوں' تم ایسی گھٹیا' اوچھی باتیں کرکے بانو کو کیا جتانا چاہتے ہو۔ تم نے ڈبے میں بھی کیا کیا سبز باغ نہ دکھائے ہوں گے۔ اس سے سب کچھ اگلوانے کے لیے کیسا جال بچھایا ہوگا لیکن وہ وقتی بات تھی۔ بانو اب تمہارے جھانسے میں نہیں آسکتی۔ بانو اتنی نادان نہیں' اپنا اچھا برا سمجھ سکتی ہے اور وہ نہ سمجھے تو میں' اس کا شوہر' اسے سمجھانے والا ہوں۔ ہر طرح میرا حق اس پر ہے۔ وہ مجھے تم سے زیادہ جانتی ہے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کا دکھ درو بانٹا ہے۔ تم کون ہو' کہاں سے آئے ہو' کیا کرتے ہو۔ بانو پوری تسلی تشفی کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھائے گی۔"

سلمٰی کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ اس کا سارا بدن لرز رہا تھا۔ ارشاد علی اس کا بازو جکڑے ہوئے تھا۔ سلمٰی کا دم گھٹ رہا ہوگا۔ وہ کبھی ہماری طرف دیکھتی' کبھی ارشاد علی کی طرف' کبھی کھلے چاقو کی طرف۔ گاڑی کی آمد میں بہت کم وقت رہ گیا تھا۔ خدمت گار یا کوئی اور کسی لمحے بھی انتظار گاہ میں آسکتا تھا۔ ارشاد علی کو قطعاً اس کی پروا نہیں تھی۔

"پر تونے یہ تلوار بانو پر کیوں تان رکھی ہے؟" بٹھل نے آخر وہی سوال کیا جو شروع سے میرے دماغ سے چمٹا ہوا تھا۔ بٹھل یا ہم میں سے کسی کو ہدف بنانے کے بجائے اس نے سلمٰی کا انتخاب بے سوچے سمجھے نہیں کیا ہوگا۔

"یہی تو بنیاد ہے۔" ارشاد علی نے دہکتی آواز میں کہا "تم لوگوں کو اس سے بہت ہمدردی ہوگئی ہے نا! اس کا اتنا خیال ہے تو اسے اس کی حالت پر چھوڑ دو۔"

"پھر وہی الٹی بات کرتا ہے۔" بٹھل نے بزرگانہ ناراضی سے کہا "ہم نے اس کا راستہ کب کھوٹا کیا ہے۔"

"پھر سیدھی طرح ہم کو جانے دو۔"

"پر ایسا کیسے رہے۔" بٹھل نے نسبتاً اونچی آواز سے کہا "بانو سے ہمارا بھی کوئی ناتا ہے۔"

"تمہارا ناتا!" ارشاد علی بپھر کے بولا "تمہارا کیا ناتا ہے؟"

"ہم نے بھی اس کو کچھ بولا ہے۔"

"کیا' کیا بولا ہے تم نے؟" ارشاد علی بھن بھنا گیا "رشتے ناتے بولنے سے تھوڑی سے ہوجاتے ہیں۔"

"بول کا ناتا تو تیرا بھی ہے۔"

"میرے پاس سلمٰی بانو کسی کی امانت بھی ہے۔"

"تالی بجا میں' تونے امانت کا بہت دھیان رکھا۔"

"فضول باتوں سے تمہارا نقصان ہوگا۔" ارشاد علی نے زچ ہوکر کہا "تم چاہتے کیا ہو آخر؟ پیسہ! پیسہ چاہیے تم کو؟"

"ہاں' اب تو تو بڑا مال والا ہے۔"

"تم اپنا حصہ مانگنا چاہتے ہو؟"

"ہم نے اپنا حصہ بول دیا ہے۔"

"کون! کون سا حصہ؟"

"بانو کو ہم لے جارہے ہیں۔"

"کیا' کیا مطلب ہے تمہارا؟" ارشاد علی بدحواسی سے بولا۔

"کون سی بھاشا سمجھتا ہے' بولا کیا ہے رے۔" بٹھل کی آواز کی برف پگھلنے لگی تھی۔

"بانو کو بیچ میں مت لاؤ۔"

"تو مال اپنے کو دینا چاہتا ہے۔"

"ہاں!" ارشاد علی نے استہزائی لہجے میں کہا۔ "اب آئے نا اصلیت پر' مال چاہیے تمہیں؟"

"جیسی تیری مرضی' مال پھر ادھری کردے۔"

"مال پھر ادھری کردے۔" ارشاد علی نے غصے میں بٹھل کی نقل اتاری "مال مفتی کا ہے۔"

"پھر بانو کو ہم لے جاتے ہیں۔"

"دیکھو' دیکھو بڑے صاحب! اب تک تمہارا بہت لحاظ کیا ہے۔ وہ بھی اس وجہ سے کہ تم نے ہم دونوں پر احسان کیا ہے۔ اب زیادہ ہوشیاری مت دکھاؤ۔ میں نے تم کو کہا ہے' بہت برا ہوجائے گا۔" ارشاد علی بھنچے ہوئے ہونٹوں سے بولا "بانو کو اس طرح کسی ایرے غیرے کی بھینٹ چڑھانے سے بہتر ہے کہ اسے ختم کردیا جائے۔ میں اسے ختم کردوں گا اور پھر میں بھی نہیں رہوں گا لیکن اس سے پہلے تم میں سے بھی دو ایک ضرور جان گنوا بیٹھو گے۔ نشانہ میرا برا نہیں ہے اور اسے ایک چاقو مت سمجھنا۔ واقف کار ایک سے دس کا کام لیتا ہے۔" ارشاد علی نے چاقو اچھال کے تیزی سے دوبارہ گرفت میں لے لیا۔ "سیدھی طرح اندر کے کمرے میں چلے جاؤ۔ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ بڑے صاحب! کچھ بھی۔ ہوش میں رہو تو اچھا ہے۔ ایک بات کان کھول کر سن لو' دنیا ادھر سے ادھر ہوجائے' میں بانو کو نہیں چھوڑ سکتا۔"

"تو پھر مال پہ سودا کرلے۔" بٹھل نے کھردری آواز میں کہا۔

"مال میں تمہارا حصہ تم کو مل جائے گا۔" ارشاد علی تلخی سے بولا۔

"کتنا دے گا تو؟"

"تسلی ہوجائے گی تمہاری۔ آدھا آدھا چلے گا۔"

"دونوں میں آدھا آدھا۔" بٹھل نے دھیرے سے کہا۔

"دونوں میں۔۔۔؟" ارشاد علی کی آنکھیں ابل پڑیں۔

"بانو میں حصہ نہیں دے گا کیا؟"

"کیا بکتے ہو' تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔"

"بانو کو بھی آدھا آدھا کردے رے۔ دونوں میں اپنا حصہ بنتا ہے۔ مال کے ساتھ اس کو بھی ہم نے روکے رکھا تھا۔"

"تم ایسے نہیں مانو گے۔"

"دیکھ رے' آرام سے سن' آدھے آدھے کو بولتا ہے نا۔ بانو آدھی نہیں ہوسکتی تو اس کو تو پاس رکھ۔ مال پلے باندھنا چاہتا ہے تو بانو کو ادھری کردے۔"

بکھرا ہوا کچھ کچھ میرے ذہن میں سمٹ رہا تھا۔ واپس آکے ارشاد علی کو ایک دوسری سلمٰی بانو سے واسطہ پڑا تھا۔ اس دوران میں سلمٰی کے پر نکل آئے تھے۔ اس کے عزم اور پرواز کی قوت کے تخمینے کے بعد ہی ارشاد علی کو کوئی فیصلہ کرنا چاہیے تھا۔ اور سلمٰی کی نظروں میں ہمیں مطعون کرنے' عواقب سے آگاہ کرنے اور اپنا اترا ہوا رنگ جمانے کی تدبیر یہی ہوسکتی تھی کہ ارشاد علی' سلمٰی کو ہدف پر رکھے۔ خاکستر کی نئی آگ سے کتنا فرق پڑتا ہے۔ ہتھیار نکل آیا تھا۔ ہر ہتھیار سے خون کی بو آتی ہے۔ خون خرابے کی باتیں سن کے پہلے سے فشار زدہ سلمٰی کی استقامت جواب دے جانے کا امکان تھا۔ یہی کسی شریف النفس کی وضع ہونی چاہیے کہ اپنے محسنوں کو کسی اور آزمائش میں ڈالنے کے بجائے ترک وایثار کی روش اختیار کرے۔ ادھر زروجواہر کی نگراں سلمٰی کے قریب رہنا اور ہردم اس پر نگاہ رکھنا ارشاد علی کے لیے ہر چند ضروری تھا۔ اسی چپقلش میں ذخیرہ اپنی تحویل میں لینے کا کوئی موقع نہیں نکل سکتا تھا۔ یہ ذخیرہ ارشاد علی کا مقصود ومطلوب تھا۔ اس کی جان اسی میں اٹکی ہوئی ہوگی۔ اس کے بعد ارشاد علی کے لیے ایک ہی مرحلہ رہ جاتا تھا' خوش اسلوبی سے فرار ہوجانے کا' سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کے اوجھل ہوجانے کا۔ بٹھل نے جبر کی حد تک اسے رعایت دی تھی۔ جس لمحے ارشاد علی نے چاقو نکالا' اسی وقت اسے منتشر کرنے اور اس پر قابو پانے کی کوشش کی جاسکتی تھی لیکن بٹھل کے تامل کا کوئی ایک سبب نہیں تھا۔ ارشاد علی کے تیوروں کا اندازہ لگانے کے لیے اسے کچھ وقت درکار تھا۔ ہماری دخل اندازی ارشاد علی کے خواب لٹ جانے کے مترادف تھی۔ سب کچھ ہاتھ سے جاتا دیکھ کے آدمی کبھی بہت باؤلا ہوجاتا ہے۔ کہتے ہیں' چور کے لیے ایک دروازہ کھلا رکھنا چاہیے ورنہ وہ درندہ بن سکتا ہے۔ ہماری چستی ومستعدی سے ارشاد علی' سلمٰی کے لیے مہلک ہوسکتا تھا اور شاید سلمٰی پر بھی کوئی خوش گوار اثر مرتب نہ ہوتا۔ یہ تیزی وتیزدستی سلمٰی کے لیے مستقل ہیبت کا موجب ہوسکتی تھی۔ رفتہ رفتہ ہم ہی اٹھائی گیروں کا ادراک مناسب تھا۔ ایک نہ ایک دن تو اسے ہمارا سارا عرفان ہو ہی جانا تھا مگر اس دن کوئی دل افتادگی نہ ہوگی کہ رفتہ رفتہ آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہوجاتیں' روشنی سے بھی۔

ارشاد علی نظرثانی کے لیے طرح طرح سلمٰی کو دگرگوں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ بٹھل کو بھی سلمٰی کا عزم استوار رکھنے کے لیے ارشاد علی سے کٹ حجتی کو طول دینا لازم ہوگیا تھا۔ یہاں تک کہ ارشاد علی نے چاقو نکال لیا تھا۔ بٹھل کی یہی خواہش ہوگی کہ ارشاد علی کے پاس اپنے سوزوگداز کی کوئی دلیل باقی نہ رہے۔ ازروئے احتیاط آئندہ بھی سلمٰی کے ارادے کی توانائی کے لیے یہی بہتر تھا کہ ارشاد علی کے جسم پر محض لباس ہی کی پوشیدگی رہے۔ بٹھل کے ذہن میں پھر یہ نکتہ بھی رسا ہونا چاہیے کہ چاقو بردار ارشاد علی' سلمٰی کے لیے ایک صدمہ' ایک اور تازیانہ تھا تو اس انتہا کاری میں ارشاد علی کے لیے مثبت پہلو بھی نکلتا تھا۔ اس سے یہ مطلب بھی برآمد ہوتا تھا کہ ارشاد علی' سلمٰی کے لیے کتنی دور جاسکتا ہے۔ سلمٰی کے لیے اس کی جانب سے کیے جانے والے دعووں کا زور دراثر یوں کچھ اور فزوں ہوتا تھا۔ الغرض ارشاد علی نے سلمٰی کو متزلزل کرنے کے لیے کوئی گوشہ نہیں چھوڑا تھا۔ ڈبے میں اپنی روداد سناتے وقت سلمٰی کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے تھے۔ اس سے توقع نہیں تھی کہ وہ ارشاد علی کی سخن سازیاں بھول جائے گی مگر کوئی بھی کم زور لمحہ کسی پر غالب آسکتا ہے۔ جب تمام سفید وسیاہ سے آگہی' تمام تر ہوش وحواس کے باوجود آنکھوں پر پردہ پڑجاتا ہے۔

دروازہ کھلنے کی چرچراہٹ پر سب چونکنے ہوگئے۔ خدمت گار متنبہ کرنے آیا تھا کہ گاڑی کی آمد میں بس لمحوں کی دیر ہے۔ دروازے سے لپکتا ہوا وہ چند قدم آیا تھا کہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ ایک لمحے کی حیرانی کے بعد وہ واپس جانے کے لیے فوراً مڑ گیا تھا کہ ارشاد علی کی للکار پر جہاں تھا' وہیں ساکت ہوگیا۔ ارشاد علی نے اسے اندر کمرے میں جانے کا حکم صادر کیا۔ خدمت گار نے متوحش نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔ بٹھل نے سرہلا کے گویا اسے کسی چوں وچرا کے بغیر ارشاد علی کے حکم کی تعمیل کا مشورہ دیا۔

خدمت گار کے اندر جانے کے بعد بٹھل نے فیصلہ کن لہجے میں ارشاد علی سے پوچھا "گاڑی آرہی ہے رے۔ کیا گھومتا ہے دماغ میں پھر تیرے۔"

"تم سے کیا کہا ہے' سیدھے اندر چلے جاؤ۔" ارشاد علی نے گرج کے کہا "کوئی دوسری بات نہیں۔ تمہارے لیے اب کچھ نہیں ہے۔"

"پر' پر مال تو اپنے پاس ہے رے۔" بٹھل نے زورا کی جانب دیکھتے ہوئے ہاتھ کا اشارہ کیا۔

ارشاد علی کے جسم کو جھٹکا لگا۔ بجلی سی اس پر گری ہوگی۔ اس جانکا سانحے سے سنبھلنے کا موقع نہیں ملا تھا کہ یکا یک زورا دروازے کی طرف بھاگ پڑا۔

زورا کے اس اچانک اقدام سے زرو جواہر کے ذخیرے کا اس کی تحویل میں ہونا ظاہر تھا۔ ارشاد علی نے یہی جانا اور وہ اوسان میں نہیں رہا۔ سلمیٰ کا بازو چھوڑ کے بے اختیار اس نے بھاگنے والے زورا کے تعاقب میں جست لگائی۔ وہ چند قدم ہی بڑھا ہوگا کہ اوندھے منہ گر پڑا۔ زورا کے بعد دوسرے لمحے جمرو نے بھی دروازے کا رخ کیا تھا لیکن ادھر سے دروازے کی طرف اڈتے ہوئے ارشاد علی کی ٹانگوں میں ٹانگ اڑانے کے لیے جمرو ایک قدم بعد ہی ٹھہر گیا تھا۔ سلمیٰ کے سامنے یہی طفلانہ طریق کار مناسب تھا۔ گرنے کے باوجود چاقو ارشاد علی کے ہاتھ میں تھا۔ جمرو اس کے بہت نزدیک تھا۔ زورا کو بھی دروازے سے پلٹنے میں پل بھر کی دیر لگی ہوگی پھر دونوں کو ارشاد علی پر قابو پانے میں کوئی زحمت نہیں ہوئی۔

بٹھل کی آواز پر خدمت گار فوراً باہر آگیا۔ اس نے جلدی جلدی سامان اٹھایا۔ میں نے بھی اس کی مدد کی۔ بٹھل کی تاکید پر حیران و پریشان سلمیٰ نے معمول کے مانند عجلت کی جمرو اور زورا' ارشاد علی کو فرش سے اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ سلمیٰ ان کے پاس سے گزرتے ہوئے ٹھہر گئی۔ اس کی اداس نظریں ارشاد علی پر بھٹکنے لگیں اور اس نے چادر میں چھپی ہوئی پوٹلی نکال کے بٹھل کی جانب بڑھادی "یہ انہیں ہی دے دیجیے۔" وہ ڈگمگاتی ہوئی آواز میں بولی۔

"نہیں' ری' ابھی دبوچ کے رکھ اسے۔" بٹھل نے حکمیہ لہجے میں کہا "ٹائم آنے پر جن کا ہے' ان کے منہ پر مارنے کا ہے۔ نہیں پھر ساری عمر کاٹا اٹکائے پھرے گی کیا۔"

سلمیٰ نے پھر کچھ نہیں کہا۔ بٹھل اس کی کمر پر ہاتھ رکھ کے تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات چھٹے حصے میں ملاحظہ فرمائیں جو کہ ساتھ ہی شائع ہورہا ہے۔